شاہی ملازمت چونکہ میں اس ملک میں پہنچ کر غارت گروں کے ہاتھوں لٹ جانے اور پانچ ہفتہ کے سفر کے کثیر اخراجات کی وجہ سے، جو سورت سے آگرہ اور دہلی تک پہنچنے میں پیش آئے تھے، تنگ دست ہوگیا تھا۔ اس لئے میں نے طبیبوں کی ذیل میں سرکارِ شاہی میں نوکری اختیار کرلی تھی اور پھر تھوڑی مدت بعد دانشمند خاں[1] کی سرکار سے میرا تعلق ہوگیا جو اول میر بخشی کے عہدہ پر مامور تھا۔ اور نہایت ذی اقتدار اور ممتاز ترین امرائے دربار میں سے ہوگیا تھا۔ یہ شخص تمام ممالک ایشیا میں بہت بڑا عالم و فاضل سمجھا جاتا تھا۔ آٹھ برس کے طویل تعلقات کے سبب سے جو دربار مغلیہ سے رہے تھے۔ میں نے اس جنگ وجدال کے بعض اہم واقعات بچشم خود دیکھے ہیں اس لئے میں اُن کو بیان کرنا چاہتا ہوں۔

شاہجہاں کی اولاد شاہجہاں کے بڑے بیٹے کا نام دارا شکوہ، دوسرے کا سلطان شجاع تیسرے کا اورنگ زیب، چوتھے کا مراد بخش اور دونوں بیٹیوں میں سے بڑی کا نام بیگم صاحب[2] اور چھوٹی کا روشن آرا بیگم تھا۔ اس ملک میں یہ دستور ہے کہ خاندانِ شاہی کے سلاطین اور بیگمات کے نام ایسے رکھتے ہیں جو شان و شوکت سلطنت پر دلالت کریں۔ چنانچہ شاہجہاں کی بیگم جو حسن و جمال میں مشہور تھی اُس کا نام تاج محل[3] تھا۔ جس

---

[1] شاہجہاں اور اورنگ زیب کے عہد کی فارسی کتابوں میں دانشمند خاں کا نام اُن صاحبِ کمال لوگوں کی فہرست میں لکھا ہوا ہے جو اُس وقت اس سلطنت میں علم و فضل کے لئے مشہور تھے۔ یہ ایرانی عالم شہر یزد کا رہنے والا تھا اور کمالِ علمی کے باعث ملا شفیعا نے یزدی کے نام سے مشہور تھا۔ اور ہندوستان میں تجارت کی تقریب سے آیا تھا۔ لکھا ہے کہ جب یہ اپنے وطن کو واپس جانے لگا تو شاہجہاں نے اُس کے علم و فضل کا چرچا سُن کر ازراہِ قدردانی بندر سورت سے واپس بلا کر امرائے دربار میں داخل کرلیا۔ اور تا عہدِ سلطنت اورنگ زیب بہت معزز و مکرم رہا اور ۱۰۸۱ھ میں مر گیا۔ یہ شخص فلسفہ ہیئت اور ہندسہ میں بہ تخصیص مشہور تھا۔ اور ایسا عالم تھا کہ نعمت خاں عالی سا شخص اس کا شاگرد تھا۔

[2] عہدِ شاہجہاں کے مورخوں نے اس کا نام جہاں آرا بیگم بتایا ہے۔ اور لکھا ہے کہ بیگم صاحب تو بطور خطاب تھا۔ م ح

[3] یہ نام نہ تھا بلکہ خطاب تھا جس کو مصنف نے عوام کے محاورہ کے موافق ممتاز محل کی جگہ تاج محل لکھ دیا ہے۔ اور نام ارجمند بانو بیگم تھا۔ م ح

شاہجہاں کے ایّامِ اسیری

اور

عہدِ اورنگ زیبؒ

مشہور فرانسیسی سیّاح ڈاکٹر برنیر کا بارہ[۱۲] سالہ روزنامچہ (سنہ ۱۶۵۶ء ـ سنہ ۱۶۶۸ء)

جس میں

شاہ جہاں کے آخری دور کا حال، اورنگ زیبؒ کی بھائیوں کی
کشمکش، مغل شہنشاہیت کے پسِ پردہ واقعات، اور اس دور کے
سیاسی، معاشرتی اور مذہبی حالات کو نہایت دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے

مُترجمہ

RARE BOOK

خلیفہ سیّد محمّد حسین مرحوم
میر مُنشی ریاست پٹیالہ

نفیس اکیڈمی
بلاسس اسٹریٹ، کراچی ۲

قیمت مجلّد بارہ روپیہ

ناشر:- چوہدری محمد اقبال سلیم گاہندری
مالک نفیس اکیڈمی
بلاسس اسٹریٹ کراچی

طبع اوّل:- نفیس اکیڈمی، کراچی - اپریل ۱۹۶۰ء

کتابت:- انوری بیگم دہلوی

مطبوعہ:- انٹرنیشنل پریس، کراچی

پاک اکیڈمی

عہدِ اورنگ زیبؒ کے چشم دید حالات

از محمد اقبال سلیم گاہندری

ڈاکٹر برنیر ایک فرنگی طبیب تھا جس نے محض ذوق جہاں بینی میں اپنی عمر کے بارہ سال ۱۶۵۶ء سے ۱۶۶۸ء تک مغل دربار میں گذارے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں شہاب الدین محمد شاہجہان صاحبقران ثانی کا دورِ حکمرانی ختم ہوتا ہے اور محی الدین محمد عالمگیر ہندوستان کا سب سے بڑا بادشاہ زمام شہنشاہی اپنے ہاتھوں میں لیتا ہے وہ عالمگیر جس کی شمشیر جہانگیر کبھی تندھار و کابل میں چمکتی ہے اور کبھی برصغیر پاک و ہند کے آخری جنوبی گوشوں میں، اور جس کی مقناطیسی طاقت حکمرانی نے تاریخ کے وسیع و طویل دور میں سب سے پہلی مرتبہ اور مابعد کے واقعات گواہ ہیں کہ سب سے آخری مرتبہ بھی اس برصغیر کے حدود متعین کئے۔ اتنے وسیع اور اس قدر عظیم الشان حدود جن کی پہنائیوں میں موجودہ دولت افغانستان، دولت پاکستان، آج کا بھارت، اور ملحقہ جزائر سب ہی داخل تھے۔

یہی وہ زمانہ ہے جس کو مغل تاریخ کا طالب علم "جنگ برادران" کے نام سے یاد کرتا ہے شاہجہان کو نظر بند کر دیا جاتا ہے۔ دارا شکوہ، شجاع، اورنگ زیب اور مراد یعنی ہر چہار برادران کے مابین شاہی و شہنشاہی کے لئے آویزش ہوتی ہے۔ بڑی پرانی مثل ہے۔ "دہ فقیر در گلیمے بخسپند و دو پادشاہ در اقلیمے نگنجند"

یک کمبل میں دس فقیر تو گذران کر سکتے ہیں لیکن ایک ملک میں دو بادشاہوں کی سمائی ممکن نہیں۔ "جنگ برادران" کا حقیقی سبب تو یہی کلیہ ہے جس میں شاید چشم فلک نے بھی کبھی کوئی استثنا نہیں دیکھا۔ دارا شکوہ اور عالمگیر کے مابین آویزش ایک لازمی اور لابدی چیز تھی۔ اور اس کا نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا چاہیے تھا۔ اس کائنات آب و گِل کے تمام حوادث کا یہی نتیجہ نکلا کرتا ہے۔ فطرت عالم ہمیشہ سے بقاء اصلح کے اصول پر قائم ہے، جو سب سے بہتر ہوگا وہی کامیاب ہوگا اور وہی باقی رہے گا۔ دوسرے اور تیسرے درجہ کی ہر چیز مٹ کر بہتر اور اصلح کیلئے اس جہان میں جگہ خالی کرتی ہی رہتی ہے۔ "جنگ برادران" کا نتیجہ بھی یہی نکلا۔ ڈاکٹر برنیر کو بھی اس کا اقرار ہے کہ سب سے بہتر صلاحیت رکھنے والا ان چاروں بھائیوں میں شہزادہ اورنگ زیب ہی تھا لیکن ڈاکٹر برنیر اپنے مزاج سے مجبور ہے وہ طبعاً کچھ حزب مخالف کی ذہنیت کا حامل ہے! اس نے کامیاب و کامران فریق کی طرف سے اس کے دل میں ایک قسم کی نفرت سی ہے، اسے عالمگیر کے اعمال و افکار میں عیوب دکھائی دیتے ہیں۔ اور وہ اپنے سفرنامے میں جا بجا اس پر کڑی تنقید کرتا ہے۔ اس کی نظر سے اسباب و وجوہ کہیں کہیں چھپ جاتے ہیں۔ اور وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ جو کچھ ہوا وہ محض بے رحمی اور قساوت قلبی تھی، حالانکہ حقیقت یہ نہیں تھی، بلکہ جو کچھ ہوا ان حالات میں وہی ہونا چاہیے تھا۔ اگر نہ ہوتا تو برا ہوتا۔

فاضل ڈاکٹر برنیر نے جو رائیں قائم کی ہیں، ان کے پیچھے علاوہ ڈاکٹر کی افتاد طبع کے ایک اور چیز بھی ہے، وہ یہ کہ وہ ایک

غیر ملکی اور غیر مانوس آدمی ہے۔ نہ مغل صوبہ حکمرانی کو جانتا ہے نہ پاک و ہند کی اجتماعی صورت حال سے پوری طرح واقفیت رکھتا ہے۔ اس لئے بھی وہ اکثر غلط اپنی رائے قائم کرتے ہیں غلطی کر جاتا ہے۔ اور صحیح اسباب و وجوہ تک اس کی نظر نہیں پہنچتی۔ پھر ایک سب سے بڑی دقت اُسے یہ بھی تھی کہ وہ مقامی زبان سے ناواقف تھا۔ بہت سی باتیں اُس کی سمجھ ہی میں نہیں آسکیں۔

لیکن بہرحال! آراء و افکار کیلئے نہیں بلکہ حوادث و واقعات کیلئے یہ سفرنامہ تاریخ پاک و ہند کے مطالعہ کیلئے انتہائی اہم اور بے مثال کتاب ہے۔ اس سفرنامہ میں ہمیں بعض ایسی جزئی تفصیلات اور ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات ملتے ہیں جو ملکی مورخ عموماً نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ایک غیر ملکی مبصر کے نزدیک روزمرہ کے معمولی واقعات بھی عجیب نظر آتے ہیں اور وہ انھیں اپنی یادداشت میں نوٹ کرتا ہے حالانکہ مقامی مورخ اسی ملک کا پروردہ ہونے کے باعث قابل اعتنا نہیں سمجھتا ہے۔ ایسے سفرنامے مطالعہ کیلئے بہت ہی کارآمد اور نہایت ہی کارآمد مواد مہیا کرتے ہیں اور ہمارے لئے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

اُردو ترجمہ بڑی مدت ہوئی کہ اس سفرنامہ کا انگریزی سے اُردو ترجمہ جناب سید محمد حسین صاحب میر منشی ریاست پٹیالہ نے کیا تھا۔ اور نہ صرف ترجمہ کیا تھا بلکہ اصل کتاب سے کہیں زیادہ قیمتی تشریحات کے فٹ نوٹ کا اضافہ بھی کیا تھا۔ یہ تشریحی نوٹ اتنے معلومات آفریں اور اتنے قیمتی ہیں کہ حقیقتاً ایک اعلیٰ درجہ کی تحقیقی کتاب اپنے موضوع پر معلوم ہوتی ہے۔ ایسے نوٹ بہ کثرت ہیں۔ اور نہایت کارآمد تفصیلات مہیا کرتے ہیں۔

یہ کتاب مترجم کی زندگی میں دو جلدوں میں شائع ہوئی تھی اور ملک کے ارباب علم و بصیرت کی نظر میں بڑا کارنامہ قرار پائی تھی۔ اب اس کے نسخے کمیاب اور کمیاب سے نایاب ہو گئے تھے۔

نفیس اکیڈیمی جس نے بہت سے بہتر علمی کتابوں کی اشاعت کا کام شروع کر رکھا ہے۔ اور جو اس سے پہلے مورخ اسلام مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کی ضخیم تاریخ اسلام تین جلدوں میں آئینہ حقیقت نما، مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم کی معرکۃ الآراء کتاب حضرت امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی اور دوسری بہت سی ضخیم اور کارآمد کتابوں کے جدید ایڈیشن بہتر لکھائی چھپائی سے مزین کر کے آپ کے سامنے پیش کر چکی ہے اب اس مشہور و کارآمد سفرنامہ کا جدید ایڈیشن بہترین طباعت و کتابت کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کر رہی ہے۔

ہمیں یہ خوشی ہے کہ اہلِ علم جن کتابوں کے نسخے حاصل کرنے کی تمنا رکھتے ہیں۔ اہل دانش کو جن کتابوں کی تلاش رہتی ہے اور اعلیٰ تحقیقی کام کرنے والے اساتذہ اور اسکالرس جن کتابوں کے حصول کے لئے سرگرداں رہتے ہیں۔ ہم اپنی مساعی سے ان کتابوں کو قابلِ حصول بنانے کی خدمت نہایت کامیابی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ اور خداوند تعالیٰ کے شکر گذار ہیں کہ اُس نے ہمیں توفیق عطا فرما کر اور اسباب و ضروریات مہیا کر کے ہمارے لئے یہ خدمت آسان فرما دی۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہ۔

آئندہ کے چند مہینوں میں انشاء اللہ تعالیٰ ہم اسی طرح سفرنامہ ابن بطوطہ کا اردو ترجمہ، اقبال نامہ جہانگیری مصنفہ معتمد خاں بخشی کا اُردو ترجمہ، تاریخ ابن خلدون کا مکمل ترجمہ اور البرامکہ، و نظام الملک طوسی مصنفہ مولانا عبدالرزاق کانپوری اور خلافت اندلس، کارنامہ نواب ذوالقدر مرحوم بھی پیش کر رہے ہیں۔

اورنگ زیب کی سیاسی زندگی

از جناب ڈاکٹر ریاض الاسلام ایم اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

برصغیر ہندو پاکستان تاریخ کے آغاز سے ہی دنیا کی دلچسپی کا مرکز رہا ہے۔ یہاں کی دولت کی شہرت دور دراز ممالک کے فاتحین اور تجار کو یہاں کھینچ کر لاتی تھی۔ بدھ مت کی نوعیت سے ہندوستان کو ایشیا میں ایک نئی مرکزی حیثیت دی۔ چین اور دیگر ممالک سے بدھ یاتری ہزاروں میل کا دشوار گذار راستہ طے کر کے ادھر آنے لگے۔ پھر جب اسلام نے اس دیار میں قدم رکھا تو ہندوستان عالم اسلام کا حصہ ہو گیا۔ اور تمام مشرق وسطیٰ یہاں کا دیوار بیچ پڑوسی بن گیا۔ اور آمد و رفت کے تمام بحری اور بری راستے آباد رہنے لگے۔ اور جب یورپ میں بیداری کی تحریک شروع ہوئی اور وہاں کے دلیر ملاح نئے دیاروں اور نئی راہوں کی کھوج میں نکلے تو کولمبس ہندوستان کو ہی تلاش کرتا ہوا امریکہ جا نکلا۔

ہندو پاکستان سے اس عالمگیر دلچسپی کا کچھ اندازہ اس ضخیم سیاحتی ادب سے ہو سکتا ہے۔ جو یہاں کے بارے میں موجود ہے۔ میگاستھنیز اور فاہیان سے لے کر برنیر اور منوچی تک بے شمار سیاح سفیر اور تاجر یہاں آئے اور ان میں سے بہتوں نے یہاں کے حالات اور اپنے تاثرات لکھے ہیں۔ سیاحتی ادب کا ایک وقیع حصہ مسلمانوں کا ہی مرہونِ منت ہے۔ مسلمان سیاحوں کی طویل فہرست میں مسعودی اور ابن بطوطہ کے نام سب سے ممتاز ہیں۔ سیاحت نگاری کی وسیع اصلاح میں کئی قسم کی تحریرات شامل ہیں۔ اولاً وہ کتب جن میں سیاحوں نے اپنے چشم دید حالات قلم بند کئے ہیں۔ دوسرے وہ تحریرات جن میں مؤلفین نے مسافروں تاجروں اور دوسرے آنے جانے والوں سے مختلف ممالک کے حالات اہتمام اور احتیاط کے ساتھ جمع کئے اور انھیں ترتیب دیا۔ اس کی ایک اچھی مثال مسالک الابصار ہے۔ جس کا مؤلف شہاب الدین ابن فضل اللہ العمری خود ہندوستان نہیں آیا۔ لیکن اُس نے یہاں کے حالات معتبر تجار سے جو ادھر آتے جاتے رہتے تھے، جمع کئے۔ تیسرے بعض کتابیں ایسی بھی ہیں جو بمجموعی طور سے تو نہیں البتہ ان کے بعض حصے سیاحت نگاری کے ذیل میں آتے ہیں۔ مثلاً البیرونی کی کتاب الہند اور بابر کی تزک اسی نوعیت کی ایک غیر معروف لیکن اہم کتاب بحر الاسرار ہے۔ یہ توران کی تاریخ ہے۔ اور ۱۶۴۰ء کے قریب لکھی گئی۔ کتاب کے آخر میں تتمہ کے طور پر اس کے مصنف محمود بن امیر ولی نے اپنے سفر کا حال لکھا ہے۔ جس کے دوران میں وہ سندھ۔ لاہور۔ دہلی۔ متھرا۔ آگرہ۔ پٹنہ۔ دکن اور لنکا وغیرہ گیا۔ اس کتاب کا ایک نادر الوجود

نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ ہے۔

ہند و پاکستان کے تاریخی مواد میں سیاحت ناموں کو ایک الگ مقام حاصل ہے۔ ایران۔ توران۔ ممالک عرب شمالی افریقہ فرانس۔ اٹلی۔ انگلستان۔ روس اور چین وغیرہ سے آنے والے سیاحوں نے اپنی تحریرات میں یہاں کے متعلق بڑا متنوع اور دلچسپ مواد مہیا کیا ہے۔ ان کی تحریرات میں سیاسی تاریخ کے بعض اہم اور مفید حوالے بھی ملتے ہیں۔ لیکن ان کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے۔ کہ وہ یہاں کی معاشرتی اور معاشی حالات کو اُجاگر کرتے ہیں۔ رسم و رواج بود و باش کے طریقے اور مقامی حالات کے مطالعہ کے لئے ان سے اہم شاید ہی کوئی ماخذ ہو۔ عہد وسطیٰ کی لکھی ہوئی تاریخی کتب عموماً سماجی حالات کو یکسر نظر انداز کر دیتی ہیں۔ اس کمی کو سیاحتی ادب ایک حد تک پورا کر دیتا ہے۔ چنانچہ بعض یورپی سیاحوں کی تصانیف میں جنوبی ہند کے سماجی حالات کی بھرپور تفصیل ملتی ہے۔ سیاحتی ادب کے بیش قیمت مواد سے بعض جدید مورخین نے اپنی تحقیقات میں پوری طرح استفادہ کیا ہے۔

ہر عہد کے سیاحتی ادب میں بعض مشترک خوبیاں اور خامیاں ہیں سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ باتیں جو اہلِ وطن کے لئے روزمرہ دیکھتے رہنے سے لائق توجہ نہیں رہتیں، دور دیس سے آنے والوں کے لئے نادر اور عجیب ہوتی ہیں۔ اگر اہلِ وطن ان کو پائمال سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں تو غیر ملکی سیاح انھیں دلچسپی اور حیرت سے دیکھتے ہیں اور ان کی جزئیات کو بالتفصیل تحریر کرتے ہیں۔ سب سے نمایاں خرابی یہ ہے کہ سیاح اپنے مختصر دوران قیام میں عموماً صرف سطحی باتیں دیکھ پاتے ہیں اور وہ اپنے مشاہدات کو ان کے تاریخی پس منظر اور تمدنی ماحول کی روشنی میں سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ ایک اور نقص جو کم و بیش سب سیاحت ناموں میں پایا جاتا ہے۔ یہ ہے کہ سیاحت نگار سنی سنائی باتوں اور بازاری افواہوں کو اس طرح بیان کرتے ہیں جیسے وہ مصدقہ حقیقت ہوں۔ مارکوپولو اور منوچی کے سیاحت نامے ان بے بنیاد باتوں سے بھرے پڑے ہیں ع جہاں دیدہ بسیار گوید دروغ

سرزمین پاک و ہند کے اسلامی عہد میں جتنے یورپی سیاح آئے ان میں غالباً سب سے زیادہ ذہین اور باعلم شخص ڈاکٹر برنیر تھا۔ وہ سند یافتہ ڈاکٹر تھا فلسفہ سے اُسے غیر معمولی شغف تھا۔ وہ فلسفی گیسنڈی کا بڑا مداح تھا۔ اسی کی صحبت میں برنیر کی صحیح معنوں میں ذہنی تربیت ہوئی تھی۔ گیسنڈی کا انداز فکر ناقدانہ تھا۔ اور اس کے حلقہ میں شریک ہونے والے اس کے تنقیدی رجحان سے متاثر ہوتے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ برنیر کا علم محض کتابی نہ تھا۔ وہ چل پھر کر دنیا کو دیکھنے کا خواہش مند تھا۔ طبی تربیت کی تکمیل سے پہلے ہی وہ یورپ کے بیشتر ممالک کا سفر کر چکا تھا۔ سند ستاریخ کے دو سال بعد وہ دنیا کی سیاحت کے لئے چل پڑا۔ فلسطین۔ شام اور مصر ہوتے ہوتے وہ ۱۶۵۸ء کے اواخر میں بحری راستہ سے سورت پہنچا۔ برصغیر میں آٹھ نو سال مقیم رہا۔ اور کشمیر سے گولکنڈہ اور بنگال سے گجرات تک سب اہم مقامات اس کی نظر سے گذرے۔ ۱۶۶۶ء میں اُس نے اس سرزمین کو الوداع کہا اور ایران کے راستہ سے عازم وطن ہوا۔ ۱۶۸۸ء

میں اڑسٹھ سال کی عمر میں برنیر سفر آخرت پر روانہ ہو گیا۔

برنیر جب ہندوستان پہنچا تو شاہجہاں کے بیٹوں میں تخت و تاج کی جنگ آخری مراحل میں تھی۔ دارا گجرات میں پناہ کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ برنیر کی بھی اس سے ملاقات ہوئی۔ اور چند روز تک لئے وہ شہزادہ کے ساتھ معالج کی حیثیت سے رہا۔ برنیر نے اپنی کتاب کا آغاز اس جنگ کے بیان سے کیا ہے اور ایسی تفصیل کے ساتھ کہ کتاب کا پہلا ربع اسی پر ختم ہو جاتا ہے۔ بقیہ کتاب شاہی دربار کے حالات آگرہ اور دہلی کے شہر، بل اور کشمیر اور بنگال کے صوبوں کے بیان، شاہی فوج کے نقشہ، سلطنت مغلیہ کے نظم و نسق اور معاشی حالات اور اہل ہنود کے رسوم و عقائد کے بیان پر مشتمل ہے۔ برنیر کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے جن معاملات سے بحث کی ہے انھیں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ بعض مقامات پر وہ غیر معمولی بصیرت کا ثبوت دیتا ہے۔ انیسویں صدی کے انگریز مورخوں نے سلطنت مغلیہ کے نظم و نسق کو یورپی قرون وسطیٰ کے جاگیرداری نظام FEUDALISM کی اصطلاحات میں بیان کیا ہے اور یہ ایک بنیادی غلطی ہے۔ بیسویں صدی کے مورخین نے اس غلطی کا ازالہ کیا۔ لیکن برنیر نے سترھویں صدی ہی میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی تھی کہ سلطنت مغلیہ کا انتظام جاگیردارانہ نہ تھا۔ ہندوستانی فوج کے نقائص، صفوی ایران کی داخلی کمزوری اور دولت عثمانیہ کے آنے والے زوال کے بارے میں بھی برنیر نے جو کچھ کہا اُسے وقت نے صحیح ثابت کر دکھایا۔ ان باتوں سے اس کی غیر معمولی ذہانت اور تاریخی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس ذہانت کے باوجود برنیر نے معاصرانہ واقعات اور مغلیہ اداروں کو سمجھنے میں کئی جگہ ٹھوکر کھائی ہے شاہجہاں کے نجی کردار پر جو اس نے نا روا حملے کئے ہیں وہ اب درخور اعتنا نہیں۔ کوئی ثقہ مورخ اب انھیں لائق توجہ نہیں سمجھتا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے سیاسی طرز عمل پر جو اس نے جا بجا نکتہ چینی کی ہے ان میں سے بیشتر باتوں کا جواب مولانا شبلی نعمانی اور ظہیر الدین فاروقی دے چکے ہیں۔ اور یہاں ان کا دہرانا بے محل ہوگا۔ سیاحت نگاروں کو بازار کی چاشنی دار افواہوں کو نمک مرچ لگا کر بیان کرنے کا جو لپکا ہوتا ہے، برنیر اس سے یکسر بری نہیں۔ پھر بھی وہ دوسرے سیاحوں سے زیادہ محتاط تھا۔ منوچی کے من گھڑت افسانے اس کے یہاں کم ہی پائے جاتے ہیں۔ اورنگ زیب کے نام شاہ ایران کے ملامت آمیز خط کے بارے میں افواہ بیان کر کے وہ یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ اسے اس پر یقین کرنے میں تامل ہے۔ شاہجہاں کے دربار میں ایرانی سفرا کی گستاخیوں کے قصے سنا کر وہ ان قصوں کی بے بنیادی کی طرف اشارہ بھی کر جاتا ہے۔ اورنگ زیب پر وہ کہیں کہیں نکتہ چینی کرتا ہے لیکن اس کی خوش خلقی اس کی تن دہی اور مدبرانہ دیانت داری کا مداح بھی ہے۔ سلطنت مغلیہ میں امن و امان کی کمی اور عمال کی بے عنوانیوں کا شاکی ہے۔ لیکن یہ بھی کہتا ہے کہ یہاں دیہات میں ذخیروں اور فصلوں کی لوٹ کھسوٹ نہیں ہوتی ہے کیونکہ ہندوستان میں ایک ایک بسوہ زمین خاصہ شریفہ سمجھی جاتی ہے۔ اور رعیت پر دست درازی اور تعدی کرنا گویا بادشاہ کے مال میں دست اندازی کرنا

ہے۔" اسلام کے خلاف برنیر کو جو تعصب تھا اُس کا وہ کئی جگہ اظہار کرتا ہے۔ اس بارے میں اس کی کم نظری کو اس کی ضلالت پر محمول کر کے اُسے معذ ور تصور کیا جا سکتا ہے۔ ستی کی رسم جگن ناتھ کی پوجا اور سورج گرہن کے موقعہ پر ہندؤں کی عبادات کا ذکر کرنے کے بعد وہ ایک کلیہ بیان کرتا ہے: "کیسے ہی فضول اور بے معنی خیال کیوں نہ ہوں پھر بھی انسان کے دل میں جگہ پاتے ہی ہیں۔" لیکن اس کلیہ کا اطلاق غالباً وہ اپنے عقائد پر نہیں کرتا تھا۔ شعبدہ بازی کا برنیر سخت دشمن تھا، اور جب بھی اُسے پنڈتوں وغیرہ نے کوئی بات از قسم کرامات دکھائی تو وہ کھوج لگا کر معلوم کر لیتا کہ اس کے پیچھے کیا راز ہے۔ اور ان کی کرامات کو شعبدہ ثابت کر دیتا۔

مجموعی طور سے برنیر کی کتاب دنیا کے بہترین سیاحت ناموں میں شمار کی جا سکتی ہے۔ تاریخ کے طلبا اور عام قارئین سب کے لئے اس میں دلچسپی کا سامان ہے۔ اصل سیاحت نامہ فرانسیسی میں ہے۔ یورپ کی کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ انگریزی میں اس کے کئی ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ اور اُردو میں اس کا ترجمہ سب سے پہلے کرنل ہنری مور نے ۱۸۲۶ء میں کیا۔ یہ ترجمہ زبان کے لحاظ سے ناقص تھا۔ خلیفہ سید محمد حسین میر منشی ریاست پٹیالہ نے کرنل مور کے مسودہ کو پیش نظر رکھ کر برنیر کے سفرنامہ کا از سر نو ترجمہ کیا۔ پھر اس پر مزید نظر ثانی اُن کے بھائی خلیفہ سید محمد حسن وزیر اعظم ریاست پٹیالہ نے کی۔ اس ترجمہ کا پہلا ایڈیشن دو جلدوں میں امرتسر اور مراد آباد سے بالترتیب ۱۸۸۴ء اور ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا۔ کتاب کے اصل مترجم خلیفہ محمد حسین نے اُسے اپنے خرچ پر چھپوایا اور اس کی تمام آمدنی مدرستہ العلوم (محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج) علی گڑھ کے سپرد کر دی۔ ۱۹۰۶ء میں مدرستہ العلوم علی گڑھ کے ڈیوٹی بک ڈپو نے کتاب کا دوسرا ایڈیشن آگرہ میں طبع کرا کے شائع کیا۔ یہ کتاب اب ایک عرصہ سے نایاب ہے۔ چوہدری محمد اقبال سلیم گاہندری صاحب مالک نفیس اکیڈیمی تحسین کے مستحق ہیں کہ ان کی کوشش سے برنیر کا سیاحت نامہ پھر شائع ہو رہا ہے۔ اُمید ہے کہ اس کے بعد چوہدری صاحب کی توجہ ہند و پاکستان کے دوسرے مشہور سیاحت ناموں کے ترجمے شائع کرنے کی طرف منعطف ہوگی۔

زندہ پیر

از جناب مرزا علی اظہر بی، اے۔ بی ایل،

ڈاکٹر فرانسس برنیر نے بارہ سال (۱۶۵۶ء تا ۱۶۶۸ء) تک ہندوستان میں رہ کر یہاں کی سیاسی اور معاشی حالات کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شاہجہاں تخت طاؤس پر جلوہ افروز تھا اور آخر میں اورنگ زیب نے اپنے بھائیوں کو شکست دے کر سلطنت حاصل کر لی تھی۔ چونکہ یہ زمانہ تاریخ ہندوستان میں بہت اہمیت رکھتا ہے اس لئے برنیر کے وقایع کو بھی خاص امتیاز حاصل ہے۔

یورو پین مصنفین برنیر کے سیاحت نامہ کو زیادہ اہمیت اس لئے دیتے ہیں کہ وہ بحیثیت وقائع نویس کے تاریخی واقعات کو صحیح خدوخال میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر جن لوگوں نے خاندان تیموریہ کی تاریخ پر گہری نظر ڈالی ہے اور واقعات کے مختلف عوامل کو پیش نظر رکھکر کسی نتیجہ پر پہنچنے کے عادی ہیں وہ برنیر سے اکثر متفق الرائے نہیں ہو سکتے۔

برنیر کے لئے سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ وہ ہندوستان میں اجنبی تھا ملکی زبان اور معاشرے سے بھی ناواقف تھا اسی لئے باوجود ذہانت و کدوکاوش اُس نے اکثر تاریخی واقعات میں غلطیاں کی ہیں اس کے علاوہ کتاب پڑھنے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ برنیر بھی مثل دیگر اہل یورپ کے احساس برتری میں مبتلا تھا مشرق کے مقابلے میں مغرب کو بہتر سمجھتا تھا اور یورپین تہذیب و تمدن کے تفوق کا داعی تھا۔ اکثر مقامات پر اُس نے واقعات کے سمجھنے میں غلطی کی اور غلط نتائج پر پہنچا۔

یہ ہر شخص مانتا ہے کہ اورنگ زیب اپنے بھائیوں میں سب سے زیادہ قابل حوصلہ مند اور خوش فکر تھا فطرتاً جفاکش اور دماغ سوزی کا عادی تھا اور جس کام کا بیڑا اٹھاتا تھا اُس کو انتہائی حزم و احتیاط سے انجام دیتا تھا۔ جو مہم درپیش ہوتی اس پر ہر پہلو سے غور و فکر کر کے نقشہ تیار کرتا اور مثل ایک شاطر کھلاڑی کے دشمن کی کوئی چال ایسی نہ ہوتی جس کی کاٹ کے لئے وہ تیار نہ ہوتا۔

جذبات پر اورنگ زیب کو چونکہ پورا قابو حاصل تھا اس لئے جب کبھی دل و دماغ میں آویزش ہوتی تو دلی جذبات و محسوسات کو کچل کر دماغی کدوکاوش اور واقعات کی منطقی رَو کا وہ ساتھ دیتا۔ اُس کے زہد و تقوے اور مذہبی عصبیت نے اُس کی سادہ زندگی کو دنیا کے سامنے اس طرح پیش کیا کہ وہ "زاہد خشک" مشہور ہو گیا۔ بدقسمتی سے "دورِ جہانگیری"

اور عہد شاہجہانی کے بعد عالمگیر "زندہ پیر" کا تخت طاؤس پر بیٹھنا قیامت ہوگیا۔

اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے زمانے میں جن قوموں نے بھی مغلوں[1] کے مقابلے میں سر اٹھایا وہ کچل دیئے گئے۔ ۱۵۵۶ء[2] (جنگ پانی پت) سے لے کر ۱۶۵۸ء تک یعنی پورے ایکسو سال تک ہندوستان میں کوئی طاقت ایسی باقی نہ رہی تھی جو مغلوں کا مقابلہ کامیابی سے کر سکتی۔ حکومت و طاقت کے ساتھ ساتھ دولت و ثروت حکمران طبقے میں سمٹ کر آگئی تھی۔ آلِ تیمور میں گھن لگ چکا تھا مگر اثرات چونکہ نمایاں نہ ہوئے تھے اس لئے رو بہ انحطاط ہونے کے باوجود وہ اپنے تنزل کو محسوس نہ کرتے تھے۔ بگڑے ہوئے معاشرے میں خرابیاں روز بروز بڑھتی جاتی تھیں۔ امراء عیش پسند ہوگئے اور متوسط طبقہ نے رئیسوں کی دیکھا دیکھی اپنی بساط سے بڑھ کر تعیش میں زندگی بسر کرنا شروع کر دی۔ پورا معاشرہ رنگ رلیاں منانے لگا۔ ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں کوئی "زاہد خشک" مقبول نہیں ہو سکتا اور جب کہ وہ تخت شاہی پر بیٹھ کر ایک باجبروت بادشاہ کی حیثیت سے مسموم فضا کو درست کرنا چاہتا ہو تو خاص و عام کا ممدوح ہونا محال ہے۔

بخلاف اس کے داراشکوہ، شاہ شجاع اور مراد بخش تینوں بھائی کم و بیش اپنے زمانے کی پیداوار تھے۔ داراشکوہ ولی عہد اور پنجاب و دہلی کا صوبیدار تھا مگر اپنے والد شاہجہاں کے ساتھ رہا کرتا تھا جو ۱۶۵۷ء میں آگرے بغرض تبدیل آب و ہوا چلا آیا تھا۔ شجاع بنگال کا اور مراد گجرات کا صوبیدار تھا اور یہ تینوں شہزادے اپنے اپنے صوبے میں بیٹھ کر داد عیش دیتے تھے۔ اس زمانے کے مذاق کے مطابق شاہانہ زندگی بسر کرتے تھے اور خاص و عام کی نظروں میں محبوب تھے۔

شاہجہاں کی علالت کی خبر سنتے ہی شہزادوں نے اپنی اپنی قسمت آزمائی کے لئے تیاریاں شروع کر دیں۔ اورنگ زیب نے حسب عادت سوچ سمجھ کر نقشہ جنگ تیار کیا۔ وہ خوب سمجھتا تھا کہ داراشکوہ ولی عہد ہونے کی وجہ سے اس پر فوقیت رکھتا ہے اور اس کی ذاتی قوت کے ساتھ ساتھ شاہی قوت بھی اس کی ممد و معاون ہے۔ لہٰذا داراشکوہ کو پریشان کرنے کے لئے دوسری تدبیروں کے علاوہ ایک خاص تدبیر یہ اختیار کی کہ شاہ ایران کو ورغلایا کہ وہ افغانستان پر حملہ کر دے جو اس وقت سلطنت مغلیہ کا ایک صوبہ تھا۔ غرضیکہ مختلف سیاسی چالوں سے اورنگ زیب اس مقولے پر عامل تھا کہ "جنگ و محبت میں ہر چیز جائز ہے" اور اپنی ہمت و جرأت سے جس کا اس نے ہر میدان کارزار میں

---

[1] میں نے لفظ "مغل" یہاں انہی معنوں میں استعمال کیا ہے جو اس زمانے میں مستعمل تھے۔ جیسا برنیر کہتا ہے۔ اب لفظ مغل اُن سب غیر ملک کے رہنے والوں پر بولا جاتا ہے جو فی زمانہ ہندوستان پر (جس کے معنی ہیں ہندوؤں یا ہندوؤں کا ملک) حکومت کرتے ہیں" (برنیر)، ورنہ آل تیمور نسبتاً ترک برلاس تھے۔ مزید تحقیق کیلئے میرے مضامین "تیمور اور اُس کا نسب" مطبوعہ اخبار "مژوان" مورخہ ۱۲ و ۱۹ اپریل ۱۹۵۹ء ملاحظہ ہوں۔

[2] ۵ نومبر ۱۵۵۶ء کو میدان پانی پت میں اکبر نے ہیمو کو شکست دے کر ہندوستان میں مغلوں کا جھنڈا گاڑ دیا۔

[3] ۳۱ جولائی ۱۶۵۸ء کو اورنگ زیب دہلی میں تخت نشین ہوا۔

مظاہرہ کیا، تینوں بھائیوں کو شکست دے کر ۳۱ جولائی ۱۶۵۸ء کو دہلی میں تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوا۔

عام طور پر مورخین اورنگ زیب پر اپنے باپ کو گرفتار کرنے کا الزام لگاتے ہیں۔ مگر ہمیں اس پر بھی غور کرنا چاہیئے کہ شاہجہاں نے داراشکوہ کی حمایت میں کیا کچھ نہیں کیا۔ اگر اورنگ زیب مجبور ہو کر شاہجہاں کو معطل نہ کر دیتا یا یوں کہیئے کہ قلعہ میں نظر بند نہ کر دیتا تو ظاہر ہے کہ داراشکوہ کی نئی فوجی طاقت اور بادشاہ وقت کی پوری پشت پناہی اورنگ زیب کو یقیناً شکست فاش دیتی جس کے معنی لازمی موت کے تھے۔ لہٰذا جب کبھی اورنگ زیب پر باپ کو گرفتار کرنے کا الزام لگایا جائے۔ (ہمارے خیال میں شاہجہاں "نظر بند" تھا گرفتار نہ تھا) تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ شاہجہاں کی اُن حرکتوں پر بھی نظر رکھنا چاہیئے جنھوں نے اورنگ زیب کو اس اقدام پر مجبور کیا۔ ع عیب اُو جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

خود برنیئر جو اورنگ زیب کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتا ہے کہیں کہیں اُن باتوں کے ذکر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے جس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ اورنگ زیب بادشاہ کے ساتھ سختی کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ مثلاً جب اورنگ زیب کے بیٹے محمد سلطان نے قلعہ پر قبضہ کر لیا اور شاہی ملازمین مغلوب ہو گئے تو شاہجہاں نے نوجوان شہزادے محمد سلطان کو تخت اور قرآن مجید کی قسم کھا کر سلطنت کی لالچ دی اور اُس کو باپ (اورنگ زیب) کے خلاف اُبھارا، اگر محمد سلطان اس لالچ میں آجاتا تو اورنگ زیب کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ اس سے بھی زیادہ جس واقعہ نے اورنگ زیب کو شاہجہاں کی طرف سے متنفر کر دیا اور اُس کو یقین ہو گیا کہ بادشاہ مجھکو تباہ کرنا چاہتے ہیں وہ شاہی خط کا پکڑا جانا تھا۔ قلعہ پر محمد سلطان کے قبضہ کے بعد شاہجہاں اور اورنگ زیب میں پیام و سلام ہونے لگے۔ ایک روز اورنگ زیب اپنے باپ کے سلام کے لئے جانے لگا۔ اتفاقاً اسی روز اُس کے سامنے وہ شاہی رقعہ پیش ہوا، جو شاہجہاں نے اپنے ہاتھ سے داراشکوہ کے نام لکھا تھا اور چھپا کر اُس کے پاس روانہ کیا تھا۔ اس خط کو دیکھتے ہی اورنگ زیب نے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ ترک کر دیا۔ جو کچھ بھی لگاؤ باپ سے تھا وہ ختم ہو گیا اور شاہجہاں کی نگرانی میں زیادہ سختی ہونے لگی۔

اورنگ زیب کی زندگی پر اگر شروع سے نظر ڈالی جائے تو اُس کی لیاقت، تدبر اور حکمرانی کی اہلیت تسلیم کرنا پڑتی ہے۔ بعض وجوہ سے دس سال کی عمر میں اورنگ زیب کی تعلیم شروع ہوئی مگر فطری ذہانت کی بنا پر تھوڑے ہی عرصہ میں عربی فارسی ترکی اور ہندی میں کافی استعداد حاصل کر لی۔ قرآن و حدیث میں چونکہ خاص شغف تھا اس لئے علم القرآن و علم الحدیث میں اچھا خاصا عالم مانا جانے لگا۔ سولہ سال[۱] کی عمر میں ۱۶۳۴ء میں وہ منصب دار رہا۔ اور بوندیلوں کے خلاف فوج کشی کی۔ بعد کو دکن کا صوبیدار مقرر ہوا۔ (۱۶۳۶ء-۱۶۴۴ء) اور بحیثیت سپاہی اور سیاست داں کے کافی شہرت حاصل کی انتظامی اُمور میں بھی اُس نے اپنا سکہ لوگوں پر بٹھا دیا۔ ۱۸ مئی ۱۶۳۷ء کو اُس کی شادی مرزا بدیع الزماں شاہ نواز خاں کی بیٹی دلرس بانو بیگم سے ہوئی۔ ۱۶۴۴ء میں داراشکوہ کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے اُس نے دکن کی صوبیداری سے استعفا دیدیا۔ فروری ۱۶۴۵ء

---

[۱] اورنگ زیب ۳ نومبر ۱۶۱۸ء کو اُجین کے قریب (جہانگیر کے عہد میں) پیدا ہوا تھا۔

میں گجرات کا صوبیدار مقرر ہوا اور سنہ ۱۶۴۷ء تک اس عہدے پر نیک نامی کے ساتھ کام کرتا رہا۔ وہاں سے یہ بلخ[1] کی مہم پر بھیجا گیا۔ اور وہیں سے ملتان کی صوبیداری پر سنہ ۱۶۵۲ء تک فائز رہا۔ سنہ ۱۶۴۹ء میں شاہ عباس ثانی شاہ ایران نے قندھار پر جو اُس وقت مُغلوں کی حکومت میں تھا۔ قبضہ کر لیا۔ اورنگ زیب نے[2] دو مرتبہ سنہ ۱۶۴۹ء اور سنہ ۱۶۵۲ء میں قندھار واپس لینے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ شاہجہاں نے دوسری مرتبہ پھر اورنگ زیب کو سنہ ۱۶۵۲ء میں دکن بھیج دیا جہاں وہ سنہ ۱۶۵۷ء تک نہایت خوش اسلوبی سے کام کرتا رہا۔ ستمبر سنہ ۱۶۵۷ء میں شاہجہاں بیمار ہوا۔ اُس کی علالت کی خبر سنتے ہی شہزادوں نے قسمت آزمائی کے لئے تیاریاں شروع کر دیں۔

داراشکوہ میں بعض خوبیاں ضرور تھیں اسی لئے اُس کو اورنگ زیب کا سب سے بڑا حریف مانا جاتا تھا مگر بعض کمزوریاں بھی ایسی تھیں جن سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ ڈاکٹر مانکی (Manucci) جو وینس (Venice) کا باشندہ تھا اور داراشکوہ سے وابستہ تھا اُس نے اپنی کتاب میں دارا کے متعلق اچھی رائے کا اظہار نہیں کیا ہے۔ وہ صاف صاف لکھتا ہے کہ "دارا اچھائیوں اور بُرائیوں کا ایسا مجموعہ تھا کہ وہ مغل امیر کی حیثیت سے زیادہ بہتر تھا بہ نسبت سلطنت کے نظم و نسق[3] سنبھالنے کے"۔ دارا کے مذہبی عقائد کے بارے میں مانکی لکھتا ہے کہ جلاد نے اُسے آخر وقت یہ کہتے سُنا کہ "محمد نے مجھے تباہ کر دیا، مسیح مجھے بچا لیں گے"۔

مانکی کی شہادت کے بعد جو داراشکوہ کا خاص آدمی تھا، یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ شاہجہاں کے چاروں[4] بیٹوں میں اورنگ زیب ہر لحاظ سے بادشاہت کے لئے موزوں ترین تھا۔ اگر بعض سیاسی غلطیاں اُس سے سرزد نہ ہوتیں تو شاید سلطنت مغلیہ اُس کے زمانے میں پہلے سے زیادہ مستحکم ہو جاتی۔

بہر حال برنیر، مانکی اور ٹورنیئر کے قلم سے لکھے ہوئے ہندوستان کے حالات پڑھنے میں ایک ندرت ضرور ہے۔ اُن کے بیانات میں غلطیاں بہت ہیں مگر پھر بھی اگر فارسی تاریخوں کے ساتھ ساتھ یہ سیاحت نامے پڑھے جائیں تو ایک تجربہ کار مورخ صحیح نتائج تک پہنچ سکتا ہے۔

وقائع برنیر کے لائق مترجم نے بہت ہی قابل قدر حواشی لکھ کر کتاب کی افادیت میں کافی اضافہ کر دیا ہے۔

---

[1] جس وقت اورنگ زیب بلخ میں اُزبک سردار عبدالعزیز کے خلاف لڑ رہا تھا تو عین میدان جنگ میں نماز کا وقت آ گیا۔ اورنگ زیب فوراً گھوڑے پر سے کود پڑا اور وہیں نماز عصر ادا کی۔ جب ہی سے اُس کا نام "عالمگیر زندہ پیر" ہو گیا۔ (؟)

[2] تیسری مرتبہ سنہ ۱۶۵۳ء میں داراشکوہ نے بھی کوشش کی مگر وہ بھی کامیاب نہ ہوا۔

[3] صفحہ ۱۰۱ و ۱۰۲ سیاحت نامہ برنیر (انگریزی) کانسٹیبل ایڈیشن سنہ ۱۹۱۶ء

[4] شجاع اور مراد بخش کے حالات بخوفِ طوالت درج نہیں کئے۔ اور عام طور سے یہ مسلّمہ ہے کہ علمی استعداد و دیگر صلاحیتوں
[illegible]

جہاں جہاں برنیر نے غلطی کی ہے اُس کی تصحیح مستند تاریخوں سے کر دی ہے۔

قارئین کرام کی دلچسپی کے لئے میں نے یہ مناسب سمجھا کہ مترجم صاحب مرحوم یعنی مشیر الدولہ[1] ممتاز الملک خان بہادر خلیفہ سید محمد حسین صاحب کے ضروری حالات زندگی کا بھی اضافہ کر دیا جائے تاکہ آنے والی نسلیں یہ سمجھ سکیں کہ مسلمانوں کے دور انحطاط میں بھی بعض علم دوست اور ادب نواز ہستیاں ایسی تھیں جو ریاستی جھمیلوں میں پھنس کر بھی کچھ وقت علمی کاوشوں کے لئے نکال لیا کرتی تھیں۔ خلیفہ صاحب مرحوم نے چونکہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدۂ علی گڑھ (۱۹۰۵ء) کی صدارت کی تھی اس لئے میں نے اپنے قدیم دوست و کرم فرما جناب سید الطاف علی صاحب بریلوی سکریٹری آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس سے رجوع کیا اور انھوں نے ازراہ دوست نوازی حسب ذیل حالات سید محمد اسلم صاحب پٹیالوی نبیرۂ خلیفہ صاحب مرحوم کے مقالے سے ماخوذ کر کے بھیج دیئے۔ میں اُن کا انتہائی ممنون و مشکور ہوں کہ انھوں نے اس فراخ دلی سے میری مدد کر کے اپنی علم دوستی کا ثبوت دیا۔

حالات مشیر الدولہ ممتاز الملک خان بہادر خلیفہ سید محمد حسین صاحب مرحوم

پیدائش ۱۸۳۹ء۔ وفات ۱۹۰۸ء

مرحوم خلیفہ محمد حسین صاحب کے بزرگ سید جلال الدین حسین صاحب المعروف بہ سید جلال بخاری بخارا سے شہر ملتان میں ۶۳۵ھ ہجری میں تشریف لائے۔ حضرت جلال بخاری کا مزار (اُچ شریف) ریاست بھاولپور میں اس وقت تک مرجع خاص و عام ہے۔ اور ریاست کی طرف سے اس کے انتظام کے لئے ایک معقول جاگیر مقرر ہے۔ سید جلال بخاری کے پوتے سید جلال الدین ثانی المعروف بہ "مخدوم جہانیاں جہاں گشت" نہایت باخدا بزرگ گذرے ہیں جن کے محاسن کریمہ آج تک پنجاب و ہندوستان بھر میں معروف و مشہور ہیں۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی اولاد میں سید نظام الدین صاحب دہلی سے ۸۰۲ھ میں آکر سامانہ میں آباد ہوئے یہ ایک پرانا اور مشہور قصبہ ہے جو پٹیالہ سے اٹھارہ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

انھیں بخاری سادات سامانہ میں سے حکیم سید غلام حسن جو اپنے زمانہ کے ایک مشہور طبیب گذرے ہیں خلیفہ

---

[1] خطبات عالیہ حصہ اول ص ۲۵۹ تا ص ۲۶۱ (مطبوعات آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس)

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ: میں اگر کوئی اورنگ زیب کا حریف ہو سکتا تھا تو وہ داراشکوہ تھا۔ اورنگ زیب کو بھی اگر فکر تھی تو داراشکوہ کی۔ اسی لئے اُس نے پوری فراست ذہانت اور تدبر سے داراشکوہ کے خلاف تیاری کی تھی۔ شجاع اور مراد کی وہ زیادہ اعتنا نہ کرتا تھا اور واقعات نے اُس کے فیصلے کو صحیح ثابت کیا۔

سید محمد حسین بیگ ۔ ہوا تھے ۔ ان کے بیٹے حکیم سید سعادت علی صاحب عرصہ دراز تک طبیب شاہی کی حیثیت سے اپنے فرائض منصبی مہاراجہ کرم سنگھ رئیس پٹیالہ کی خدمت میں بجالاتے رہے اس کے بعد مہاراجہ موصوف نے مرحوم کی علمی قابلیت اور لیاقت پر نظر کرکے ان کو اپنے ولی عہد مہاراجہ نرندر سنگھ کا اتالیق مقرر فرمایا اس نسبت سے سید صاحب موصوف کا خاندان اب تک خلیفہ کے لقب سے مشہور ہے ۔ لفظ (خلیفہ) سے مراد اتالیق کا بیٹا ہے ۔ سید سعادت علی کے بعد اتالیق کا عہدہ ان کی اولاد میں مختلف ولی عہدوں کے لئے سلسلہ وار قائم رہا اس لئے لفظ "خلیفہ" اس خاندان کے لئے عام طور سے استعمال ہونے لگا ۔

خلیفہ سید محمد حسین مسلمانوں کی قدیم تہذیب اور شائستگی کا بہترین نمونہ تھے جو فضیلت علمی کے ساتھ نہایت باوقار اور سنجیدہ بزرگ تھے ۔ انھوں نے اپنے نامور اسلاف کے قدم بہ قدم ریاست پٹیالہ کی اہم خدمات نہایت وفاداری اور تدبر کے ساتھ انجام دیں ، جس کے صلہ میں باوقات مختلف مہاراجگان سے انعامات لے اور جاگیریں عنایت ہوئیں ۔ برٹش گورنمنٹ نے بھی ان کی نمایاں حیثیت ، قابلیت اور عمدہ کارگذاریوں کے اعتراف میں خطابات مشیر الدولہ ممتاز الملک اور خان بہادری سے مخاطب کرکے سرفراز کیا ۔ اور پنجاب کی سب سے پہلی لیجسلیٹو کونسل میں ریاست پٹیالہ کے بہترین عہدہ دار کی حیثیت سے کونسل مذکورہ آپ کو ممبر منتخب کیا ۔

خلیفہ صاحب کو اپنی قوم کی علمی ترقی سے بدرجۂ اتم ذوق و شوق تھا ۔ وہ اور اُن کے بڑے بھائی خلیفہ سید محمد حسن المخاطب وزیر الدولہ ، مدبر الملک ابتداء سے سر سید احمد خاں کی تحریک تعلیمی کے دست و بازو اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے نامور ٹرسٹی تھے ۔ ان کے اثر سے اور ان کی توجہ سے بیش بہا عطیات کی امداد مختلف زمانوں میں مدرسۃ العلوم کو حاصل ہوئی وہ مذہبًا راسخ العقیدہ شیعہ تھے لیکن انھوں نے شیعہ سنی کے اتحاد و اخوت باہمی کے رشتہ کو قومی ترقی کا نصب العین سمجھ کر ہمیشہ سلوک اور اتحاد کی سخت کوشش کی ۔ وہ تعصبات مذہبی کی طرف سے نہایت فراخ دل واقع ہوئے تھے ۔ ان کی طبع سلیم مدت العمر نہ صرف اپنی قوم کی ہواخواہی میں گذری بلکہ پنجاب یونیورسٹی کو بھی اُنھوں نے بہت سے وظائف اور تمغہ جات قابلیت اپنی طرف سے بلا امتیاز قومی عطا کئے جن سے اب تک کامیاب طلبہ فیض پا رہے ہیں ۔

جب پنجاب میں سر چارلس ایچیسن لفٹیننٹ گورنر کے زمانہ میں اردو ہندی کا سوال اٹھا تو اس تجویز کی نہایت قابلیت کے ساتھ خلیفہ صاحب نے پر جوش طریقہ سے مخالفت کی اور عدالتوں میں بجائے اُردو کے ہندی کا رسم الخط جاری ہو جانے سے جو نقصان پہنچتا اُس سے ان کو محفوظ رکھا ۔

جب مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں شیعوں اور سنیوں کے واسطے جدا جدا دو مسجدیں تعمیر کرنے کی تجویز اراکین کمیٹی کے سامنے پیش تھی تو اس تجویز کی خلیفہ صاحب اور اُن کے بڑے بھائی خلیفہ وزیر الدولہ نے سختی کے ساتھ مخالفت کی اور سر سید کو لکھا کہ یہ تجویز اس اتحاد و یک جہتی کے اُصول کے

منافی ہوگی جس کے قائم کرنے کے لئے ہم سب نے کالج کی بنیاد قائم کی ہے چنانچہ مذکورہ بالا رائے کا جملہ ٹرسٹیان مدرسۃ العلوم علی گڑھ نے احترام کرکے ایک مسجد تعمیر کرنے پر اتفاق رائے کیا۔ مرحوم کو تصنیف و تالیف کا بھی شوق تھا۔ اعجاز التنزیل اور ترجمہ سیر و سیاحت ڈاکٹر برنیر دو مفید کتابیں آپ کے علمی شغف کی یادگار باقی ہیں۔ ۱۹۰۱ء میں بہ جگہ نواب محسن الملک ایجوکیشنل کانفرنس کی مجلس کے علی گڑھ میں صدر منتخب ہوئے۔ مجلس ہذا کی ترقی نے اور اس کے ذریعہ سے ہر صوبہ کے مسلمانوں میں اتحاد باہمی کی وسعت کو دیکھکر اور عام طور پر تعلیمی خواہش کا رجحان دیکھکر آپ کو خصوصیت کے ساتھ دلچسپی تھی اور اس لحاظ سے انھوں نے اجلاس کے لئے کانفرنس میں شریک ہونے کے واسطے باوجود کبر سنی کے بے لیے اور دور دراز مقامات مثلاً ۱۹۰۶ء میں پٹیالہ سے ڈھاکہ اور کراچی کے سفر کئے۔

بالآخر ہر کمالے را زوالے، بزرگوں اور بزرگ زادوں کی یہ آخری یادگار بھی جو اپنی ذاتی خوبیوں اور اوصاف انسانی کے لحاظ سے سچائی، ہمدردی، نیکی، بلند ہمتی، علمی اور عملی اخلاق کا ذخیرہ تھی۔ ۱۹۰۸ء میں لباس فنا پہن کر اس شمع حیات کو جس کے نور سے ایک عالم فیضیاب تھا ہمیشہ کے لئے بجھا دیا۔

بالآخر یہ بیان کردینا بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ اس کتاب کا مقدمہ لکھنے کے لئے میں کیوں چنا گیا۔ میرے شفیق محترم مولانا محمد سلیمان صاحب بدایونی عجیب مجموعۂ صفات و کمالات ہیں۔ بعد مغرب اُن کا "بیت البدایوں" مختلف مسالک احباب کے بے لاگ و بے لوث نقد و تبصرہ سے دانشکدہ بنا رہتا ہے۔ جلیسین کے اس جھرمٹ میں ایک روز ایک نئے چہرے پر نظر پڑی۔ تعارف پر معلوم ہوا کہ آپ محمد اقبال سلیم گاہندری مالک نفیس اکیڈیمی ہیں۔ ایک روز جناب اقبال سلیم صاحب نے وقائع برنیر کے لئے مقدمہ لکھنے کو کہا۔ اپنی بے بضاعتی و عدیم الفرصتی کا ہر چند عذر کیا مگر سلیم صاحب نے نہ مانا اور

ع۔ قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

معلوم نہیں اپنی ذمہ داری سے کہاں تک عہدہ برآ ہوسکا ہوں، مگر مجھے یقین ہے کہ اورنگ زیب کی سیاسی زندگی اور تخت و تاج کے لئے نبرد آزمائی پر جو حضرات آئندہ قلم اٹھائیں گے وہ اُن نقوش کو زیادہ اُبھار کے پیش کرسکیں گے۔ جن کی طرف میں نے صرف اشارہ کیا ہے۔

دیباچہ وقائع سیر وسیاحت ڈاکٹر برنیر

ازجناب کرنل ہنری مور صاحب بہادر سی. بی (و) سی۔ آئی. ای

ترجمان ہز اکسیلنسی کمانڈر انچیف صاحب بہادر

ڈاکٹر برنیر کے وقائع سیر وسیاحت کا اُردو ترجمہ ۱۸۵۸ء میں اس غرض سے میں نے کیا تھا کہ اس کتاب کے ذریعہ جو ایک غیر جانب دار اور محض ضمنی شخص کی عینی شہادت ہے شاید لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ شہنشاہ اورنگ زیب کے پُر سواوث عہد میں سلطنت اور حکومت کا طرز اور رعایا کی حالت وکیفیت ٹھیک ٹھیک کس طرح پر اور کیا تھی۔ اور مغلیہ سلطنت کی بے حد فیاضی۔ انصاف پسندی اور رعایا کی عام خوش حالی اور فارغ البالی کی نسبت بہت سے غلط خیالات جو ملک میں پھیلے ہوئے ہیں وہ دور ہو جائیں گے۔ جن کو اُس وقت کے مورخوں اور شاعروں اور خوشامدیوں اور بادشاہوں کے انعام یافتہ لوگوں کی تحریروں نے عوام میں اس طرح پھیلا دیا اور ان کے ذہن نشین کر دیا ہے کہ وہ آج تک عوام الناس کے دلوں میں اس یقین کے ساتھ قائم ہیں کہ گویا یہ اوصاف محض اُسی سلطنت سے مختص تھے۔

ہم لوگ، جو بالفعل ہندوستان پر متسلط ہیں ڈاکٹر برنیر چونکہ ہمارا ہم قوم نہ تھا اس لئے جو حالات کہ اُس نے اپنے چشم دید لکھے ہیں امید ہے کہ وہ اس زمانہ کے ہندوستانی رؤسا اور اکثر تعلیم یافتہ لوگوں کے نزدیک اعتماد کے لائق سمجھے جائیں گے کیونکہ وہ اس قسم کے بیانات کو جو ایک ایسے غیر جانب دار اور بے غرض شخص کی طرف سے ہوں بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ اگر میرا یہ قیاس صحیح ہے تو ملک کی موجودہ حالت کا اُس زمانہ کی حالت سے مقابلہ نہایت مفید اور دلچسپ ہوگا۔ منشی احمد الدین صاحب جو ایک ذی علم شخص ہیں اور اس کتاب کے ترجمہ کے وقت نواب کمانڈر انچیف بہادر سپہ سالار افواج ہند کے ترجمان فارسی کے دفتر میں مامور تھے اُنھوں نے مجھے اس کام میں بہت مدد دی تھی اور میں اُن کا بہت مرہون منت ہوں۔

جب ترجمہ ہو چکا تو میں نے اُس کی ایک نقل ڈائرکٹر صاحب سررشتہ تعلیم اضلاع شمالی ومغربی کے پاس جہاں زیادہ تر اردو زبان بولی جاتی ہے روانہ کی۔ مگر اُنھوں نے مجھے یہ لکھا کہ "اگرچہ ترجمہ اچھا ہے لیکن نظر ثانی کی ضرورت ہے اس لئے مناسب ہے کہ کسی ایسے مستند اور زبان دان شخص کو دکھا لیا جائے جو اس اردو کا ماہر ہو جسے اہلِ دہلی کی

اردو کہتے ہیں میں نے اس راستے پر عمل کیا اور کتاب کو دہلی کے ایک مشہور معروف معزز شخص کے سپرد کر دیا جو اردو کا مشہور زبان داں تھا۔ لیکن یہ کتاب اگرچہ ایک مدت تک ان کے پاس رہی مگر انہوں نے صرف چند ہی ورق تک کچھ اصلاح کی اور پھر واپسی کی ریسپی میرے پاس بھیج دی۔ بظاہر یہ کام بسبب پیرانہ سالی وہ انجام نہیں دے سکے

کچھ دنوں بعد یہ تمام سرگذشت میں نے اپنے دوست خلیفہ سید محمد حسین صاحب میر منشی ریاست پٹیالہ سے بیان کی۔ جو اردو، عربی، فارسی اور انگریزی زبان کے جاننے میں مشہور ہیں اور جن کو کچھ عرصہ ہوا کہ گورنمنٹ عالیہ قیصریہ کی حضور سے مشیر الدولہ ممتاز الملک کا خطاب مرحمت ہوا ہے۔ انہوں نے نہایت مہربانی سے اس کتاب پر دوبارہ نظر ڈالنے کا کام اپنے ذمہ لے لیا۔ اور نہ صرف اول سے آخر تک اس کی اصلاح پر اکتفا کیا بلکہ جن مقامات کا ترجمہ میں نے مصنف کی فلسفیانہ تحقیقات سمجھکر اس خیال سے چھوڑ دیا تھا کہ ناظرین اہل ہند کے لئے شاید کچھ دلچسپ نہ ہوں ان کا بھی ترجمہ کر ڈالا۔ اور اس غرض سے کہ یہ کتاب زیادہ مشرح اور زیادہ دلچسپ ہو جائے بہت سے مفید حاشیے بھی اضافہ کر دیئے۔

جب خلیفہ صاحب موصوف جیسا کہ میں بیان کیا ہے اس کتاب کی ترمیم اور اصلاح سے فارغ ہو چکے تو میں نے ہز ایکسیلنسی سر فریڈرک صاحب بہادر "جی۔ سی۔ بی۔" "جی۔ سی۔ ایس۔ آئی۔" وغیرہ سے جو اس وقت ہندوستان کے کمانڈر انچیف" تھے اور جن کے پرسنل شاف میں میں مامور تھا یہ درخواست کی کہ میری اس کتاب کو گورنمنٹ عالیہ ہند کے حضور میں اس غرض سے بھیج دیں کہ مجھے اتنی مدد حاصل ہو جائے جس سے میں اس کو چھپوا سکوں اور منشی اسد الدین صاحب کو ان کے تعاون کا صلہ دے سکوں۔ اور یہ بھی عرض کر دیا کہ اس میں میں اپنی ذات کے لئے کچھ روپیہ کا متمنی نہیں ہوں۔ چنانچہ جناب ممدوح نے از راہ کرم میری درخواست کو گورنمنٹ ہند کی خدمت میں بھیج دیا اور تھوڑے عرصہ کے بعد صاحب فارن سکرٹری گورنمنٹ موصوف نے زبانی وعدہ فرمایا کہ اس معاملہ پر توجہ کی جائے گی مگر کچھ ظہور میں نہ آیا جس کی شاید کوئی وجہ ہوگی اور غالب تو یہ ہے کہ کوئی بھی وجہ نہ ہو۔

جب ادھر کی طرف سے مایوس ہوا تو میں نے صاحب ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب کی خدمت میں تحریر بھیجا اور صاحب موصوف نے وعدہ فرمایا کہ ہم اس کتاب کو صاحبان منتظمین پنجاب یونیورسٹی کی خدمت میں پیش کریں گے۔ مگر میں اس عرصہ میں ایک برس کی رخصت لے کر ولایت چلا گیا۔ اور وہاں سے واپس آتے ہی مصر کی لڑائی پر بھیجا گیا۔ اور جب مصر سے واپس آیا تو معلوم ہوا کہ کتاب کے بارہ میں ابھی کچھ بھی ظہور میں نہیں آیا۔ حالانکہ کرنل ہالرائڈ صاحب بہادر ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب اس معاملہ میں ذاتی توجہ ظاہر فرماتے تھے — جس سے بوجہ معقول مجھکو یہ امید ہوتی تھی کہ سال کے اختتام سے پہلے ضرور کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔

مگر کچھ نتیجہ نہیں نکلا۔ آخر میں مسٹر ... صاحب فضل ... صاحب

نے (جو اس کتاب کی تصحیح اور نظرثانی میں بہت ہی تکلیف اٹھا چکے تھے اور جن کو اس بات کا کامل یقین ہے کہ یہ اُن کے ہم وطنوں کے لئے مفید ثابت ہوگی اور اس کی اشاعت میں مدد دینے سے گویا وہ ایک طرح سے سرکار عالیہ قیصریہ کی ایک خدمت بجا لائیں گے) اس کی اشاعت میں زیادہ تساہل اور تامل کو گوارا نہ فرمایا اور مجھکو یہ لکھا کہ میں اس کتاب کو خاص اپنی ذمہ داری اور اپنے ہی خرچ سے چھپوانے کے لئے آمادہ ہوں اس تحریر کے پہنچتے ہی میں نے اُن کی اس ہمت فیاضانہ اور ارادہ افادہ عام سے کرنل ہالرائڈ صاحب کو آگاہ کیا اور اُن کے مشورہ سے آخر یہ قرار پایا کہ کتاب خلیفہ صاحب ممدوح کی خدمت میں بھیج دی جاوے۔

کسی یوروپین زبان کی کتاب کا ایک مشرقی زبان میں ترجمہ کرنا شاید بعض لوگوں کو ایک آسان سا کام معلوم ہوتا ہو مگر ایسی صحت کے ساتھ ترجمہ کرنا کہ مطلب اور معنی تو ہوبہو وہی ادا ہو جائیں اور اِیں ہمہ ٹھیٹھ لفظی ترجمہ بھی نہ ہو اور حتی الامکان وہ زور بھی قائم رہے جو مصنف کے اصل بیان میں پایا جاتا ہو اور مشرق کے طرز انشا کی خوبی و لطافت بھی ہاتھ سے نہ جانے ہرگز آسان نہیں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ کسی کتاب کے ترجمہ میں طرزِ بیان اور اس قسم کے امور کی نسبت کہ ترجمہ کس ڈھنگ پر کرنا چاہیے اور اس میں مصنف کے الفاظ کی پابندی وغیرہ کس حد تک کرنی یا نہ کرنی چاہیے معترضین کو (جو اپنے اپنے مذاق کے موافق اعتراض کیا کرتے ہیں) مطمئن کرنا بہت مشکل ہے مگر بہرحال چونکہ کرنل ہالرائڈ صاحب بہادر نے یہ رائے دی کہ اس ترجمہ پر ایک دفعہ اور بھی نظر ڈال لی جائے تو بہتر ہے۔ اس لئے میرے عنایت فرما جناب خلیفہ صاحب نے نہایت خوشی سے اُس کو بھی منظور کر لیا ہے کہ وہ اپنے لایق فایق اور صاحب علم و فضل بھائی جناب وزیر الدولہ مدبر الملک خلیفہ سید محمد حسن خاں صاحب بہادر وزیر اعظم ریاست پٹیالہ کی مدد سے ایک دفعہ اس کتاب کو پھر بغور دیکھ ڈالیں گے چنانچہ نظرثانی کے بعد یہ کتاب ہر طرح مکمل و مرتب ہو گئی ہے اور ہم نہایت مسرت کے ساتھ اس کو غیر جانب دارانہ و منصفانہ مطالعہ کے لئے پیش کر رہے ہیں۔ اُمید ہے یہ عام دلچسپی اور افادہ کا باعث ہوگی فقط

راقم

ہنری مور

دیباچہ

از خلیفہ سید محمد حسین میر منشی ریاست پٹیالہ

یہ کتاب جس حالت اور حیثیت میں میرے پاس پہنچی تھی وہ میرے معزز دوست جناب کرنل ہنری مور صاحب بہادر نے اپنے "انٹروڈکشن" میں مشروحاً لمصدق ہے۔ کرنل صاحب نے اصل کتاب کے بعض مضامین کا ترجمہ بھی نہیں کیا تھا کیونکہ مقصد زیادہ تر انہیں مطالب کے ترجمہ سے تھا جو سلطنت مغلیہ سے کچھ تعلق رکھتے تھے۔ لیکن میرا خیال یہ تھا کہ جو واقعات ہندوستان سے متعلق ہیں وہ سب ترجمہ ہو جائیں اس لئے ایسا ہی کیا گیا۔ البتہ ڈاکٹر برنیر کی ایک چٹھی کا جو اس نے شیراز سے اپنے ایک دوست کو لکھی تھی ترجمہ نہیں کیا گیا۔ کیونکہ اُس میں صرف مسئلہ جزلا یتجزیٰ کی فلسفیانہ اور عام بحث ہے جس کو ہندوستان سے کوئی خصوصیت نہ تھی اور چونکہ نفس کتاب میں بعض مطالب قابل تصحیح تھے یا روایات مسلمہ مشہورہ عام کے برخلاف معلوم ہونے کی وجہ سے مصنف کا بیان توثیق طلب تھا۔ یا ناظرین کی مزید واقفیت اور بصیرت کے لئے کسی تشریح و تفصیل کی احتیاج تھی یا مقابلہ کے لئے موجودہ زمانہ کی بعض حالتوں کا دکھانا مفید تھا اس لئے معتبر کتابوں اور صحیح ماخذوں سے جہاں کہیں موقع تھا حاشیوں کا لکھنا مناسب سمجھا اور چونکہ زمانہ حال کے یوروپین مصنفوں کے دستور کے موافق عبارت میں عنوانات نہ تھے جس سے کسی مضمون کی تلاش اور حوالہ دینے میں بڑی دقت تھی لہذا اس کو بھی رفع کیا گیا۔ اور نظم و ترتیب کے لحاظ سے کچھ ایسے تغیرات بھی کئے گئے کہ بعض مضامین کو ایک جلد سے دوسری جلد میں منتقل کیا گیا۔ اگرچہ ان امور کے باعث خصوصاً حاشیوں کے التزام سے محنت بہت ہی بڑھ گئی مگر الحمد للہ کہ یہ کام جناب برادر معظم وزیر الدولہ مدبر الملک خلیفہ سید محمد حسن خان صاحب بہادر وزیر اعظم ریاست پٹیالہ کی اعانت سے باوجودیکہ مجھے اپنے منصبی کاموں سے فرصت کم تھی انجام کو پہنچ گیا۔ اور یہ دلچسپ کتاب جس کو اُس وقت کی طرز حکومت اور حالت ملک کی ایک صحیح اور بے نظیر تصویر کہنا چاہیئے نہ صرف ترجمہ بلکہ ایک طور کی تالیف کی صورت میں چھپ کر تیار ہو گئی۔ اس کی جلد ثانی اخیر ۱۸۸۵ء میں تیار ہو گئی تھی۔ مگر افسوس ہے کہ جلد اول کے کام میں بسبب کم فرصتی اور حاشیوں کے التزام کے خلاف توقع ایسی تاخیر ہوئی کہ اس وقت سے پہلے تیار نہ ہو سکی۔ اس لئے بعد تکمیل اب دونوں جلدیں ہدیہ ناظرین کی جاتی ہیں۔

اس کتاب کے ترجمہ کرنے اور چھپوانے سے جو امور مجھکو مدِ نظر تھے اُن کا بیان کرنل مور صاحب بہادر نے

اپنے انٹروڈکشن میں مشروحاً لکھدیا ہے مگر اس کے علاوہ میرا ایک اہم مطلب یہ بھی تھا کہ اس ذریعہ سے راقم اور جناب موصوف کی خالص اور بے غرض دوستی کی ایک دیرپا یادگار قائم رہے۔ اس موقعہ پر اگر میں کچھ مختصر حال اپنے معزز دوست کا بیان کروں تو یقین ہے کہ بے محل نہ ہوگا۔

پس واضح ہو کہ جناب ممدوح فنون سپاہ گری کے علاوہ بڑے صاحب کمال زبان دان ہیں اور اُن کی لیاقت اور قابلیت اسی سے ظاہر ہے کہ اپنی انگریزی زبان کے علاوہ فرانسیسی۔ اٹالین۔ زمانہ حال کی یونانی ترکی عربی۔ فارسی۔ اُردو۔ سندھی۔ مرہٹی۔ اور ہندوستان کی اور مختلف چھوٹی چھوٹی بولیوں سے جو علیحدہ زبانیں تصور نہیں کی جاتیں بخوبی واقف و ماہر ہیں۔ اسوائے اس کے فن نقاشی میں بھی عمدہ دست گاہ رکھتے ہیں چنانچہ جب کبھی فرصت پاتے ہیں تو مناظر قدرت کے نقشے بھی کھینچا کرتے ہیں۔ اور علاوہ اور جنگی کارگذاریوں کے چونکہ جنگ ایران۔ حبش۔ افغانستان۔ اور مصر کے واقعات عظیم اور مشہور ہیں وہ اپنی سلطنت کی عمدہ خدمات بجالاتے ہیں اس لئے پیش گاہ علیا حضرات ملکہ معظمہ قیصرہ ہند سے کمپینین آف دی موسٹ نوبل آرڈر آف دی باتھ۔ اور کمپینین آف دی موسٹ ایمی نینٹ آرڈر آف دی انڈین ایمپائر کے خطابوں سے معزز و ممتاز ہیں۔

صاحب ممدوح کا اصل تعلق بمبئی پریزیڈنسی کی افواج سے ہے مگر بہ لحاظ اپنی لیاقتوں اور کمال زبان دانی کے لارڈ نیپیر آف مگڈالا اور فریڈرک ہنس اور سر ڈانلڈ سٹورٹ صاحبان کمانڈر انچیف بہادر افواج ہند کے ایام حکومت میں متواتر پندرہ برس تک ان کے پرسنل اسٹاف میں پرشین انٹرپریٹر کے عہدہ پر رہے ہیں۔ اور باوجودیکہ ہر صاحب کمانڈر انچیف کو "پرسنل سٹاف" کے عہدہ داروں کی نسبت یہ اختیار ہوتا ہے کہ اپنے اپنے ایام حکومت میں جس کو وہ افسران فوج میں سے چاہیں منتخب کرکے اپنے پاس بلالیں مگر بہ لحاظ اُن کی مسلمہ قابلیت کے تینوں صاحبان موصوف الصدر نے ان ہی کو پسند فرمایا اور اپنے پاس سے علیحدہ ہونے نہیں دیا۔

لقب پرشین انٹرپریٹر کے لفظی معنی ہیں "ترجمانِ فارسی" شروع سلطنت انگریزی میں جب کل کاروبار زبان فارسی میں ہوتا تھا اور اس قدر رواج انگریزی کا نہ ورنہ تھا اور حکام انگریز اکثر بات چیت بھی زبان فارسی ہی میں کیا کرتے تھے۔ یہ لقب اُس وقت کا مقرر کیا ہوا ہے۔ مگر در اصل یہ عہدہ دار بطور پرائیویٹ اور پولٹیکل سکرٹری کے ہوتا ہے۔ اور اس کا کام یہ ہے کہ جو مراسلات کسی مشرقی زبان میں کسی والی ملک کی طرف سے یا جو عرضی پرچہ ہندوستانی فوج کے سپاہیوں اور سرداروں کی جانب سے صاحب کمانڈر انچیف کے پاس آتے ہیں اپنے دفتر سے اُن کا ترجمہ کرا کر پیش کرانا اور اُن کا جواب وغیرہ بھجوانا۔ اور رئیسوں اور امیروں کی ملاقاتیں صاحب کمانڈر انچیف سے کرانا اور اُن کے مدارج مختلفہ کے موافق اُن کے مراسم تعلیم و تکریم کا بندوبست کرنا جو ایک بڑا نازک کام ہے) اور نیز اُن کے اور صاحب کمانڈر انچیف کے حق کے لئے زبان ہندوستانی کا قاعدہ کوئی امر

لازمی نہیں۔ عند الملاقات ترجمانی کرنا صاحب ممدوح نہایت خوش اخلاق وسیع الملاقات خوش تقریر اور متواضع اور بڑے جفاکش شکار دوست ہیں۔ اور ہندوستانی امرا و شرفا سے محبت و ارتباط رکھتے ہیں۔ اور دل اُن کے بہی خواہ ہیں۔ اور یہی وجہ تھی کہ صاحب ممدوح نے علاوہ اپنے ذاتی شوق و رغبت کے جو اُن کو مشرقی زبانوں سے ہے محض ہندوستان کے والیان ملک اور اُمرا و شرفا کے فائدہ کے لئے باوجود مشاغل کار سرکار اس کتاب کے ابتدائی ترجمہ کرنے کی تکلیف اپنے اوپر گوارا کی تھی۔ پس خدا کا شکر ہے کہ اُن کی اور ہماری برسوں کی محنت ٹھکانے لگی۔ اب یہ دعا ہے کہ میرے اہل وطن اور ہندوستانی والیانِ ملک عموماً جن کے لئے یہ کتاب گویا سرمایۂ بصیرت ہے اس کے مطالعہ سے فائدہ پائیں۔ اور خصوصاً بندگان حضور فیض گنجور ہز ہائنس فرزند خاص دولتِ انگلشیہ منصور زمان امیر الامرا مہاراجہ دھیرج راجیشر سری مہاراجہ راجگان راجندر سنگھ مہندر بہادر فرمانروائے ریاست پٹیالہ دام اقبالہم کی نظر شرف سے گذرے جن کے خوانِ نعمت سے میں نے اور میرے بزرگوں نے پرورش پائی ہے۔ اور جن کی قدیمی رعایا اور نمک خوار ہونے کا مجھے افتخار حاصل ہے۔ اور حضور ممدوح الشان اس کی مورخانہ اور دلچسپ حکایات اور حکیمانہ اور عبرت خیز بیانات کے ملاحظہ سے محظوظ اور متمتع ہوں۔

خاتمہ پر ناظرین اہلِ زباں کی خدمت میں التماس ہے کہ چونکہ خاکسار نہ لکھنؤ کا رہنے والا ہے اور نہ دہلی کا۔ بلکہ پٹیالہ اور سامانہ میرا اور میرے بزرگوں کا مولد و مسکن ہے جہاں زبانِ اُردو صحیح طور سے بولی نہیں جاتی پس اگر کسی محاورہ میں کوئی غلطی معلوم ہو تو معذور تصور فرمائیں۔

اَلْعُذْرُ عِنْدَ کِرَامِ النَّاسِ مَقْبُوْلٌ

شاہجہاں کے ایّامِ اسیری اور عہدِ اورنگ زیب

حصہ اوّل

ضمیمہ ۲

حصہ دوم

ڈاکٹر برنیر کے خطوط کا مجموعہ

برنیر کے خطوط مانشیور دی مرویلسن کے نام
(جو اورنگ زیب کے کشمیر کے سفر سے متعلق ہیں)

ڈاکٹر برنیر کی ہندوستان میں آمد

شاہجہاں، اُس کی اولاد اور اُسکے بیٹوں کی باہمی لڑائیاں اورنگ زیب کی تخت نشینی کے دلچسپ حالات

میں ہندوستان کس طرح پہنچا چونکہ دنیا کی سیر کا مجھے نہایت شوق تھا۔ اس لئے ملکِ شام اور مصر کے دیکھ لینے کے بعد میں نے اپنے دل میں یہ ٹھیرایا کہ اپنی اس سیاحت کو جاری رکھوں اور وسعت دول اور دریافت و تحقیق حالات کے لئے اس سرے سے اس سرے تک بحر احمر کا سفر کروں۔ چنانچہ اپنے اس ارادہ کے پورا کرنے کے لئے ملک مصر کے دارالسلطنت قاہرہ[1] سے کہ جہاں میں ایک برس سے زیادہ مقیم رہا تھا روانہ ہوا اور بتیس گھنٹے کے عرصہ میں (کارواں کے سفر کے حساب سے) شہر سوئیز میں آپہنچا اور یہاں سے ایک جہاز پر سوار ہو کر سترہ دن میں بمقام جدہ جو مکہ (معظمہ) سے قریب دو پہر کی مسافت پر ہے جا پہنچ گیا۔ میرا یہاں پہنچنا توقع کے بر خلاف تھا۔ اور اُس وعدہ کے بھی جو مجھے بحر احمر کے ترکی حاکم کی طرف سے دیا گیا تھا۔ پس مجبوری میں مسلمانوں کی اُس مقدس زمین پر جہاز سے اترا جہاں کوئی عیسائی تاوقتیکہ غلام نہ ہو قدم رکھنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ الغرض ایسی حالت میں اُس جگہ پانچ ہفتے قیام کرکے میں ایک چھوٹے سے جہاز پر سواحل یمن کو جارہا تھا

---

[1] اس شہر کو ۳۵۸ تین سو اٹھاون ہجری مطابق ۹۴۷ نو سو اکتالیس عیسوی میں المعز لدین اللہ خلیفہ فاطمی مغربی کے سپہ سالار جوہر نے (جن کی سلطنت پہلے پہل افریقہ کے شہر قیروان میں قائم ہوئی تھی اور جو اپنے خاندان میں تیسرا خلیفہ تھا) آباد کیا تھا۔ اور مصر کو قہر و غلبہ سے فتح کرنے کی وجہ سے قاہرہ نام رکھا تھا۔ س م ح

[2] اصل کتاب میں بی آف دی ریڈ سی ہے۔ س م ح

سوار ہولیا اور پندرہ دن کے عرصہ میں بمقام مخاجو آبنائے باب المندب کے نزدیک ہے پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر میرا یہ قصد تھا کہ معوع اور ارکی کو کے جزیروں سے جو راستہ میں ملیں گے گذرتا اور ان کو دیکھتا بھالتا ملک حبش کے پایۂ تخت گونڈار کو چلا جاؤں لیکن مجھے معلوم ہوا کہ حبش میں رومن کیتھلک مذہب والوں کے لئے (جس کے ہم فرانسیسی پیرو ہیں) سخت خطرہ ہے۔ یہاں یہ صورت حال اُس وقت سے پیدا ہوئی جب سے کہ بادشاہ حبش کی ماں نے اپنی کارسازیوں سے پرتگیزیوں کو قتل کرادیا تھا اور باقی ماندہ کو فرقہ جیسوئیٹ[۱] کے اس بڑے پادری سمیت جن کو پرتگیز گوا[۲] سے اپنے ساتھ لائے تھے خارج کرادیا تھا۔ بس اُس وقت سے حبش میں رومن کیتھولک محفوظ اور بے خطر نہیں رہے تھے۔ بلکہ میں نے یہ بھی سُنا کہ ابھی تھوڑا عرصہ ہوا کہ بمقام سواکن ایک بیچارے بدنصیب رومن کیتھلک درویش تک کا اس جرم میں سر کاٹا گیا۔ کہ اس نے اُس ملک میں داخل ہونے کا ارادہ کیا تھا۔ اس لئے یہ تدبیر مناسب اور کم خطر معلوم ہوئی کہ میں ایک یونانی یا ارمنی کا[۳]

---

[۱] جیسوئیٹ کے معنی ہیں، منسوب بہ جی زس یا جی سس جو فرنگی زبانوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام ہے۔ یہ ایک شاخ فرقہ رومن کیتھلک کی ہے۔ جس کو ۱۵۳۴ء میں ہسپانیہ کے رہنے والے اگناتیوس لائلا نامی ایک مشہور شخص نے جو ۱۴۹۱ء میں پیدا ہوا اور ۱۵۵۶ء میں مرا تھا قائم کیا تھا۔ س م ح

[۲] گوا ہندوستان کے ساحل مالابار پر بمبئی سے جنوب کے رخ تقریباً دو سو میل کے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جو کئی سو برس سے معہ مختصر سے علاقہ کے پُرتگیزوں کے قبضہ میں ہے اور جس کو آج کل انگریزی اصطلاح میں پورچوگیز انڈیا یعنی ہندوستان مقبوضہ اہل پُرتگال کہتے ہیں۔ یہاں ان کا ایک گورنر رہتا ہے۔ اور ان کی نسبت اسی کتاب کے ایک اور مقام میں مفصل ذکر آئے گا۔ س م ح

[۳] میرے دوست کرنل ہنری مور صاحب بہادر جنھوں نے اس ملک کو دیکھا ہوا ہے میرے نام کی ایک چٹھی میں مصنف کے اس ارادہ کی نسبت اپنا خیال یوں لکھتے ہیں کہ گرچہ حبش کے نصرانیوں کو کلیسائے ارمنی یا یونان سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ بلکہ حبشی کلیسا پندرہ سو برس سے کمال خود علیحدہ چلا آتا ہے مگر چونکہ ارمنی عیسائی تجارت پیشہ ہونے کے سبب سے ممالک مشرقی میں بعض ... ہمیشہ دکھائی دیتے رہے ہیں اور ... لباس بھی نہیں پہنتے تھے۔ اس ... فرنگستانی لباس ... یورپین عیسائی کی طرح ایسے اجنبی مقامات ... ہو سکتے تھے۔ س م ح

بھیس بنالوں۔ جب بادشاہ کو یہ اطمینان ہو جائے گا کہ میں اُس کے واسطے کچھ مفید اور کارآمد ہو سکتا ہوں تو غالب گمان یہ ہے کہ وہ مجھے کچھ زمین دے دیگا اور حسب مقدور میں غلام خرید کر اس کا بندوبست کر سکوں گا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ کھٹکا پیدا ہوا کہ اس صورت میں مجھے وہاں شادی بھی ضرور کرلینی پڑے گی جیسے کہ ایک یوروپین راہب کا جس نے اپنے آپ کو یونانی یا شندہ اور طبیب ظاہر کیا تھا جبراً بیاہ کر دیا گیا تھا۔ وہ پھر اس حالت میں مجھے اس ملک سے چھوٹنے کی اُمید قطع کرلینی ہوگی۔

ان اندیشوں اور چند وجوہ کی بنا پر جن کا ذکر آگے کیا جائے گا۔ میں نے گوندار جانے کا ارادہ چھوڑ دیا اور ایک ہندوستانی جہاز پر سوار ہو کر آبنائے باب المندب کی راہ سے بائیس دن میں بمقام سورت جو سلطنت مغلیہ میں ہندوستان کی ایک بندرگاہ ہے آپہنچا۔

شاہجہاں اور اُس کا نسب یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ بادشاہ وقت کا نام شاہجہاں ہے جو جہانگیر کا بیٹا اور اکبر کا پوتا اور ہمایوں کا پڑپوتا ہے اور ہمایوں سے اوپر اُس کا سلسلۂ نسب تیمور لنگ سے جا ملتا ہے جس کو ہم فرنگستانی عموماً تمرلین کہتے ہیں۔ شاہجہاں سلسلہ وار تیمور سے دسویں پشت میں[1] ہے۔

---

[1] یعنی شہاب الدین محمد شاہجہاں صاحبقران ثانی کا باپ نورالدین محمد جہانگیر۔ اُس کا جلال الدین محمد اکبر اس کا نصیرالدین محمد ہمایوں اس کا ظہیرالدین محمد بابر اُس کا عمر شیخ مرزا اُس کا سلطان ابو سعید مرزا اس کا سلطان محمد مرزا اس کا جلال الدین میراں شاہ مرزا اس کا امیر تیمور گورگان صاحبقران اول جو تیمور، تیمر اور تمرلنگ مشہور ہے۔ اس کے لنگڑے ہونے کی وجہ کتاب عجائب المقدور فی احوال التیمور میں جو اس کی ایک سخت ہجو آمیز تاریخ ہے یہ لکھی ہے کہ ابتدائے حال میں کسی شخص کی بکری کی چوری کرتے ہوئے تیر کے زخم سے اُس کی ایک ٹانگ لنگڑی ہو گئی تھی۔ اور چونکہ اُس نے ترکوں کے اکثر خاندانوں میں اپنی شادیاں کرلی تھیں اس لئے اُس کے ہم قوم اُس کو گورگان کہنے لگ گئے تھے جو ترکی میں داماد کو کہتے ہیں۔ اور تمر کے معنی ترکی میں لوہا۔ اور صاحبقران کہلانے کی یہ وجہ تھی کہ اس کے بادشاہ ہو جانے کے بعد خوشامدیوں نے اس کا زائچہ طالع بنا کر اس میں یہ لکھ دیا تھا کہ زہرہ و مشتری جو نجومیوں کے عقیدے میں دو بڑے سعد ستارے ہیں اپنے طالع میں قرن کی حالت میں ہیں۔ س م ح

ہندوستان میں لفظ مغل کا اطلاق

تیمور جس کی ملک گیری کے واقعات مشہور و معروف ہیں۔ اُس نے اپنی ایک رشتہ دار عورت یعنی اُس بادشاہ کی اکلوتی بیٹی سے شادی کر لی تھی جو اُس وقت تاتاریوں کی اس نامور قوم کا جن کو مغل کہتے تھے فرماں روا تھا۔ مگر اب لفظ مغلی اُن سب غیر ملک کے رہنے والوں کے

لہ کتاب ظفر نامہ میں جو تیمور کی ایک نہایت خوشامد آمیز تاریخ ہے اُس کے عروج کا حال یوں لکھا ہے کہ ۱۳۳۳ء میں تیمور اغلق کا بیٹا قزان سلطان جو چغتائی خاں کی اولاد سے تھا ترکستان اور ماوراءالنہر میں ایک ایسا جابر اور خون ریز بادشاہ تھا کہ سردار لوگ دربار میں جاتے ہوئے کنبہ والوں کو ہیتیں کر کے رخصت ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ آخر کار امیر قزغن نے جو اس کے سرداروں میں ایک نہایت قابل اور دانا شخص تھا تنگ آکر اور یعنی قبیلہ چغتائی کے امیروں وغیرہ سے اتفاق کر کے بغاوت کی اور ۱۳۴۶ء میں فتحیاب ہو کر اُسے مار ڈالا۔ مگر سلطنت کی یہ صورت رہی کہ اگرچہ حقیقتاً حکومت امیر قزغن اور اُس کی اولاد کے قبضہ میں تھی۔ لیکن تاہم بادشاہی خاندان میں سے برائے نام کسی کو خان یعنی بادشاہ بنائے رکھتے تھے مگر جب قزغن کے بیٹے عبداللہ نے اپنے ہم عصر نام نہاد بادشاہ کو بے گناہ قتل کر ڈالا اور اسی علت میں خود بھی تباہ و برباد ہوا تو ملک میں کچھ عرصہ طوائف الملوکی کی صورت رہی۔ مگر امیر قزغن کا پوتا امیر حسین جو امیر مسلا کا بیٹا تھا۔ پھر ایک ذی اقتدار فرماں روا ہو گیا۔ اور اپنے دارالحکومت شہر بلخ کے پاس ایک پرانے قلعہ کو جو قلعہ ہندوان کے نام سے مشہور تھا از سرِ نو تعمیر کر کے اُس میں رہنا شروع کیا۔ اور چونکہ اُس کی بہن کی شادی تیمور سے ہوئی تھی۔ ابتدائے حال میں اُس کا اور تیمور کا نہایت اتحاد تھا مگر رشک و حسد کے باعث آخر کار عداوت ہو گئی۔ اور چونکہ امیر حسین کی بہن بھی مر چکی تھی تیمور نے اپنی جائے قیام کش معروف بہ شہر سبز سے جو سمرقند کے قریب اب روسیوں کے قبضہ میں ہے قلعہ ہندوان پر فوج کشی کی اور امیر حسین ۱۳۷۰ء میں گرفتار ہو کر مع اپنے دو بیٹوں کے قتل ہوا۔ اور باقی دو بیٹے ہندوستان کو بھاگ آئے۔ اور تیمور نے اُس کی زوجہ سرائے ملک خانم دختر قزان سلطان اور تین اور بیگموں کو غالباً ذی عزت قبائل ترک کی بیٹیاں سمجھ کر مصلحتاً گھر میں ڈال لیا۔ اور اُس کی بڑی بیگم کو مع اس کی بیٹیوں اور بیگموں کے اپنے بڑے بڑے سرداروں میں تقسیم کر دیا اور قلعہ ہندوان اور اُن کے محلات وغیرہ جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیئے اور اس طرح امیر حسین کا نام و نشان مٹا کر خود بادشاہ بن گیا اور آخر کار ایسا نامور ہوا کہ آج تک اُس کا نام مشہور ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ برنیئر نے اپنی تحریر میں غالباً اسی سرائے ملک خانم زوجہ سابق امیر حسین کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کیونکہ اُس کو کتاب حبیب السیر میں خان زادہ یعنی شاہزادی اور دختر قزان سلطان لکھا ہے ورنہ تیمور کے اٹھارہ بیبیوں اور بائیس حرموں کی تفصیل میں جو بہت سے ترک اور مغل سرداروں کی بیٹیاں

لئے بولا جاتا ہے جو کہ زمانہ ہندوستان پر (جس کے معنی ہیں ہندوؤں یا ہندیوں کا ملک) حکومت کرتے ہیں۔ مگر یہ قیاس نہ کرنا چاہئیے کہ سلطنت مغلیہ میں بڑے بڑے معزز اور معتبر منصب صرف مغلوں ہی کو ملتے ہیں یا صرف یہی لوگ فوج میں عہدے پاتے ہیں۔ بلکہ یہ منصب اور عہدے مغلوں اور سب ولایتوں کے نو وارد مسلمانوں کو بلا کسی امتیاز و خصوصیت کے دیئے جاتے ہیں۔ چنانچہ اکثر تو ایرانیوں کو اور بعض بعض عربوں کو اور کچھ ترکوں کو۔

جن لوگوں کو آج کل یہاں مغل کہا جاتا ہے اُن کی پہچان کے واسطے یہ نشان کافی ہے کہ چہرہ کا رنگ گورا ہو اور مذہب اسلام۔ اور یورپ کے عیسائیوں کی جن کو یہاں فرنگی کہتے ہیں یہ پہچان ہے کہ رنگ سفید ہو اور مذہب عیسائی۔ اور ہندوؤں کی یہ علامت ہے کہ رنگ گندمی ہو اور مذہب بُت پرستی۔

شاہجہاں کی ضعیفی اور اُس کے بیٹوں کی باہمی آویزش مجھے یہاں آکر یہ بھی معلوم ہوا کہ شاہجہاں کی عمر اس وقت قریب ستر برس کے ہے اور اس کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں اور چند سال ہوئے کہ اُس نے چاروں بیٹوں کو اپنی نیابت اور قائم مقامی کے طور پر ہندوستان میں بڑے بڑے چار صوبے جن کو سلطنت کے حصے کہنا چاہئیے دے دیئے ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ بادشاہ ایک سال کے عرصہ سے ایسا بیمار رہتا ہے کہ جس سے اُس کی زندگی کو خطرہ ہے۔ اور اُس کے بیٹوں نے باپ کی یہ حالت دیکھکر حصولِ سلطنت کے لئے منصوبے باندھنے اور چالیں چلنی شروع کر رکھی ہیں اور اُن کی باہمی جنگ و جدال جاری ہے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کہیں خان زادہ کا لفظ اور کسی کی نسبت نہیں لکھا۔ مگر برنیر کی تحریر سے جو یہ مفہوم ہوتا ہے کہ تیمور کی اس بیگم کا باپ جو تمام تاتاریوں کا بادشاہ تھا۔ جن کو مغل کہتے تھے۔ اُس وقت کی تاریخوں سے غلط معلوم ہوتا ہے کیونکہ جس زمانہ میں بلخ اور بخارا وغیرہ میں قران سلطان خاں مرزا رہا تھا اُسی زمانہ میں تغلق تیمور خان ترکوں اور مغلوں کی قوم جتہ میں علیحدہ بادشاہی کر رہا تھا اور ایران میں سلطان ابوسعید بہادر خاں جو مغلوں کے ابواالآبا چنگیز خاں کی اولاد سے تھا بہت بڑا بادشاہ تھا اور یہ اشارہ بھی غلط پایا جاتا ہے کہ تیمور لنگ اس مذکورہ بالا رشتہ کے سبب سے مغلوں کی قوم میں داخل ہو گیا تھا۔ کیونکہ وہ اُلُوس جغتائی کی شاخ برلاس سے تھا جو اپنے تئیں سلسلۂ نسب میں مغلوں سے علیحدہ نہیں سمجھتے۔ س م ح

[1] اصل انگریزی میں لفظ براؤن ہے۔ یعنی کھورا س م ح

کا وہ عالی شان اور عجوبۂ روزگار مقبرہ آگرہ میں ہے جس کے مقابلہ میں اہرام مصر[1] جو منجملہ عجائبات دنیا سمجھے جاتے ہیں محض ناتراشیدہ پتھروں کے ڈھیر اور ناموزوں

---

[1] مصر کے مخروطی نما جو پہل مینار اہرام کہلاتے ہیں۔ ان پر جو کتبے ہیں وہ ایسے حروف میں ہیں جن کو اس زمانہ میں ہر شخص نہیں پڑھ سکتا۔ اور مصر کے قدیمی باشندے ان کو اپنی مقدس چیزوں میں استعمال کرتے اسرار الٰہی سمجھ کر چھپاتے تھے اگرچہ بعض لوگوں نے یہ خیال کیا ہے کہ اہل عرب ان میناروں کو بلحاظ ان کے نہایت وسیع بیہمال اور پرانا ہونے کے اہرام کہتے ہیں جو ہرم سے مشتق ہے اور جس کے معنی بڑھاپے کے ہیں مگر محیط المحیط نے (جو لغت عربی کی ایک نو تالیف مستند کتاب ہے) لکھا ہے کہ اہرام ہرم کی جمع ہے جو اصطلاح اہل مساحت (پیمائش) میں کسی ایسی مخروطی شکل کی عمارت کو کہتے ہیں جس کا قاعدہ مربع یا مثلث یا کثیر الاضلاع ہو۔ ان میں سے تین مینار بہت مشہور ہیں جن میں ایک چھوٹا اور دو بڑے ہیں۔ دونوں بڑے مینار جن کو عرب بصیغۂ تثنیہ الہرمان کہتے ہیں چی آپس اور کیفرینس کے نام پر مشہور ہیں۔ اور چی آپس والا مینار تو ایسا عمدہ ہے کہ دنیا کی عجائبات میں شمار ہوتا ہے۔ یہ عمارت ایک چوکھونٹے چبوترے پر بنی ہوئی ہے جس کا ہر ایک ضلع سات سو تینتیس فٹ لمبا اور چار فٹ آٹھ انچ اونچا ہے اور اس کے اوپر کچھ گھٹا کر ایک اور چبوترہ ہے۔ اور اسی طرح دو سو تین چبوترے اوپر تلے بنے ہوئے ہیں۔ یہ مینار ساڑھے سولہ بیگھہ زمین میں ہے اور اس کی بلندی چار سو چھپن فٹ اور چوٹی دس گز مربع کا چبوترہ ہے مشہور یونانی مورخ ہیرودوٹس جو حضرت عیسیٰ سے چار سو برس پیشتر مصر کی سیر کو آیا تھا لکھتا ہے کہ یہ مینار چی آپس بادشاہ کے عہد میں بیس برس کے عرصہ میں تیار ہوا تھا۔ اور اس پر ایک لاکھ آدمی کی مدد ہمیشہ لگی رہتی تھی۔ اور اس پر مصری حروف میں لکھا ہوا ہے کہ کاریگروں کی صرف لہسن پیاز کی چٹنی میں ڈھائی لاکھ روپیہ خرچ ہوا تھا۔ اصل میں یہ مینار مصری بادشاہوں کے مقبرے ہیں جن میں اُن کی لاشیں اب تک پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ خلیفہ مامون عباسی جب ۲۰۰ھ میں مصر میں آیا تو اُس کو اس چی آپس والے مینار کے اندر کی عمارت کے دیکھنے کا بڑا شوق ہوا اور اُس نے فولادی ٹانکیاں بنوا کر پتھر کو کھدوایا۔ اور ایک راہ پائی اور جب اُس میں گئے تو ایک چوکونٹی باولی ملی جس کے چاروں طرف کی دیواروں میں کمروں کے دروازے تھے۔ اور ایک کمرے میں بہت سی لاشیں کتان میں خوشبوؤں سے لپٹی ہوئی جسے مومیا کہتے ہیں رکھی ہوئی تھیں۔ پھر اور ایک کمرے میں اس کے اوپر پتھر کے صندوق میں آدمی کی ایک مورت ملی جس کے سینہ پر جواہر سے جڑا ہوا سونے کا سر بند رکھا تھا۔ اور سونے کے پترے پر ایسے حروف کندہ تھے جن کو کوئی نہ پڑھ سکا۔ بعض محققوں نے اس بڑے مینار کی پیمائش کے وقت یہ بھی دریافت کیا ہے کہ اس مینار کے چاروں پہلو بنانے

تو وہ ہائے سنگ نظر آتے ہیں۔ علی لہذا القیاس جہانگیر کی بیگم کا نام اول نور محل[1] تھا۔ پھر نور جہاں بیگم ہوا جس نے مدت تک اپنے شوہر کی ایسی حالت میں کہ بجز شراب خوری اور عیش پسندی کے اُس نے سب کاموں کو چھوڑ رکھا تھا امورِ سلطنت اور ملک داری کو خود انجام دیا۔

اُمرائے سلطنت اور خطابات ہندوستان میں جو یہ بڑے بڑے اور ممتاز نام اعیان خاندان شاہی اور امرا کے رکھے جاتے ہیں اور فرنگستان کی طرح ویسے خطاب نہیں دیئے جاتے جو اراضیات وممالک کے قبضہ و مالکیت سے مشتق ومنسوب ہوتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہاں تمام ملکیت کی زمینیں خالصہ شریفہ یعنی ملک سرکار شاہی سمجھی جاتی ہیں۔ اس لئے فرنگستان کی طرح یہاں کوئی ارل یا مارکویس یا ڈیوک نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ امرائے دربار کو خواہ جاگیر خواہ نقد جو کچھ دیا جاتا ہے وہ صرف بطور پنشن اور ذاتی مدد معاش کے دیا جاتا ہے جس کا مقرر کرنا صرف بادشاہِ وقت کی مرضی پر موقوف ہے۔ اور جب وہ چاہتا ہے اُس میں کمی یا بیشی کر دیتا ہے۔ یا ضبط کر لیتا ہے۔ اس لئے یہ بات کچھ قابل تعجب نہیں کہ امرائے سلطنت پر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) والوں نے دنیا کی چاروں سمتوں کے ٹھیک مقابل بنائے ہیں۔ جس سے وہاں کا نصف النہار نہایت صحیح طور پر معلوم ہوتا ہے۔ دوسرا مینار جو کیفرنیس والا کہلاتا ہے اس کے نیچے کے چبوترے کا ہر ایک ضلع چھ سو چوراسی فٹ لمبا اور بلندی چوٹی تک چار سو چھپن فٹ ہے۔ اس مینار پر چڑھ کر دیکھنے سے دکن کی طرف دریائے نیل اور اُتر کی جانب پہاڑ اور ریگستان اور پچھم کے رخ نیون کا جنگل اور پورب کی سمت مقام جیزہ اور فسطاط کے برج اور شہر قاہرہ کا مینار اور سلطان صلاح الدین کا قلعہ سب عجیب لطف سے دکھائی دیتے ہیں۔ پرانے زمانہ کے مورخوں نے اول الذکر مینار کے بانی کے نام اپنے اپنے لہجہ کے موافق مختلف لکھے ہیں جن میں سے ایک نام یہاں لکھ دیا گیا ہے اور یہ بادشاہ دو ہزار تین سو باون برس قبل مسیح علیہ السلام کے تھا۔ اور نہایت ہی خون ریزی اور سفاکی کے ساتھ پچاس برس تک حکمران رہا تھا۔ اور اسی طرح دوسرے مینار کے بانی کے نام بھی کئی طور پر لکھے ہیں اور اس کو بعض مورخوں نے پہلے مینار کے بانی کا بیٹا اور بعض نے بھائی اور جانشین بتایا ہے اور یہ بھی ویسا ہی ظالم اور خون ریز تھا اور چھپن برس تک بادشاہ رہا تھا۔ س م ع

ماخوذ از ترجمہ تاریخ اقوام قدیم مصنفہ ڈاکٹر رالن مطبوعہ سین ٹیفک سوسائٹی علی گڑھ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا وغیرہ

[1] اس کا نام مہر النساء بیگم تھا۔ اور نور محل اور نور جہاں خطاب تھے س م ع

شکوہ اور شان دار خطابات سے مشرف و ممتاز کیے جائیں۔ مثلاً کوئی شیر افگن خاں، کوئی صف شکن خاں، کوئی رعد انداز خاں، کوئی برق انداز خاں، اور علیٰ ہذا القیاس دیانت خاں دانشمند خاں فاضل خاں وغیرہ وغیرہ۔

شاہجہاں کا بڑا لڑکا داراشکوہ

داراشکوہ گفتگو میں بہت شیریں زبان، حاضر جواب، نہایت خوش خلق اور بے حد فیاض و دریادل تھا۔ مگر باایں ہمہ بڑا ہی خود پسند اور خود رائے تھا اور اس کو یہ گھمنڈ تھا کہ میں اپنی عقل کی رسائی اور خوش تدبیری سے ہر امر کا بندوبست اور انتظام کرسکتا ہوں۔ اور کوئی فرد بشر ایسا نہیں جو مجھے صلاح و مشورہ دے سکے۔ وہ اُن لوگوں سے جو اُسے ڈرتے ڈرتے کوئی صلاح دینے کی جرأت کر بیٹھتے تھے۔ تحقیر اور اہانت سے پیش آتا تھا۔ چنانچہ اس ناپسندیدہ سلوک ہی کے سبب سے اُس کے دلی خیر خواہ بھی اُس کے بھائیوں کی پوشیدہ اور مخفی سازشوں سے اُسے آگاہ نہ کر سکے۔ وہ ڈرانے اور دھمکانے میں بڑا تیز تھا۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے امرا کو برا بھلا کہہ بیٹھتا اور اُن کی ہتک کر ڈالتا تھا۔ لیکن اُس کا غصہ اور بدمزاجی ایک آن کی آن میں جاتی رہتی تھی۔ یہ شہزادہ اگرچہ شعائر مذہب اسلام کی بجا آوری کے موقعوں میں ہمیشہ شریک ہوتا رہتا تھا اور اس مذہب کے تبع اور پیرو ہونے کا بھی علانیہ اقرار کرتا تھا۔ لیکن بس وہ پیدائشی مسلمان ہی تھا کیونکہ وہ اپنے اوقاتِ تخلیہ میں ہندوؤں کے ساتھ ہندو اور عیسائیوں میں عیسائی تھا۔ چنانچہ پنڈتوں اور ہندو سادھوؤں کو ہمیشہ اپنی صحبت میں رکھتا تھا۔ اور اُن کے بڑے بڑے وظائف مقرر کر رکھے تھے۔ ان حالات سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان لوگوں ہی کے اثر صحبت سے اُس کے عقیدۂ اسلام میں ضعف پیدا ہوگیا تھا۔ لیکن اس بارے میں ہم اپنی رائے اُس موقعہ پر بیان کریں گے جہاں ہندوؤں کے طریق عبادت اور پرستش کا ذکر لکھیں گے۔ اس کے علاوہ کچھ دنوں تک پادری بوزی صاحب مقتدائے فرقہ جیسوئیٹ کے مواعظ دینیہ کو بھی بہت رغبت سے سنتا رہا تھا اور اُن مواعظ کی خوبیوں اور صداقت پر کچھ اعتقاد بھی رکھنے لگا تھا۔ مگر بعض یوں کہتے ہیں کہ درحقیقت وہ کسی مذہب کا بھی معتقد نہ تھا۔ اور یہ سارا دکھاوا اُس نے محض دل لگی اور شوق تحقیقات کے لئے اختیار کر رکھا تھا۔ اور بعض کی یہ رائے ہے کہ کبھی جو وہ اپنے عیسوی

میلان کا مظاہرہ کرتا تھا تو اُس میں یہ مصلحت تھی کہ وہ عیسائی جو اُس کے توپ خانہ میں بھرتی تھے اور جن کی تعداد بھی ذرا زیادہ تھی اُس کو پسند کریں۔ اور اپنی ہندویت ظاہر کرنے سے اُس کی یہ غرض تھی کہ باج گذار ہندو راجاؤں کی تالیفِ قلوب کر کے اپنی محبت اُن کے دل میں پیدا کرے۔ اور حقیقت میں ذی اقتدار راجاؤں سے باخلاق و محبت پیش آنا وہ ضروری سمجھتا تھا۔ تاکہ ضرورت کے وقت اُن کا تعاون اور رفاقت حاصل کر سکے۔ لیکن عیسائیوں اور ہندوؤں کے مذاہب اور عقائد کی طرف میل کرنے کے یہ جھوٹے حیلے کسی طرح اُس کے منصوبوں کی کامیابی میں کارآمد اور مفید نہ ہوئے بلکہ برخلاف پڑے۔ چنانچہ اس تاریخ[1] کے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ اورنگ زیب نے جو اُس کا قتل جائز ٹھیرایا تھا تو اُس کی وجہ یہی ظاہر کی تھی کہ وہ کافر اور لامذہب ہوگیا ہے۔

---

[1] عالمگیرنامہ میں جس کے مسودے بادشاہ کے ملاحظہ کے بعد صاف ہوتے تھے اور جس میں مورخوں کے شیوہ کے برخلاف عالمگیر کے مخالفوں کا ذکر جابجا نہایت ہی سخت کلامی کے ساتھ کیا گیا ہے داراشکوہ کے مذہب کی نسبت جس طرح پر لکھا ہے اُس کے بہت سے نا ملائم اور مکرر الفاظ کو چھوڑ کر اس جگہ نقل کیا جاتا ہے قولہ واز شنایع اطوار آں برگشتہ روزگار (یعنی داراشکوہ) کہ منجر بہ وبال آں گرفتار آید و باعث التہاب لوایہ قہر و انتقام ایں خدیو اسلام (یعنی اورنگ زیب) بیشتر ہماں شد ایں بود کہ در اواخر حال از بدگشتہ بختی باظہار مراتبِ اباحت والحاد کہ در طبع او مرکوز بود و آں را بتصوف نام نہادہ اکتفا ننمودہ بدین ہندواں مائل شدہ بود۔ ہموارہ با برہمنان و جوگیان و سناسیان صحبت می داشت۔ وآں گروہ را مرشدانِ کامل و عارفان بحق واصل می دانست و کتاب ہا نہارا کہ بہ بید موسوم است کتاب آسمانی می دانست و مصحف قدیم می خواند واز کمال اعتقادے کہ بہ بید می داشت برہمنان و سناسیان را از اطراف و اکناف بسعی ہائے بلیغ و رعایت ہائے عظیم جمع آوردہ در صدد ترجمہ آں شدہ ہموارہ اوقاتش مصروف ایں شغل ناصواب و تفکر و تدبر در مضامین آں کتاب می شد و بجائے اسمائے حسنہ الٰہی اسمی ہندوی کہ ہنود آں را پربھو می نامند و اسم اعظم می دانند بخط ہندوی بر نگینہ ہائے جواہرے کہ می پوشید منقش کردہ بآں تبرک می جست و چوں معتقدش آں بود کہ تکلیف عبادات ناقصاں راست و عارف کامل را عبادت در کار نیست و کریمہ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ابشرب ملاحدہ فراگرفتہ دلیل ایں معنی می ساخت و بنا بریں عقیدہ فاسدہ نماز و روزہ و سایر تکالیف شرعیہ را خیرباد گفتہ بود و ایں خدیو دیں پرور پاک اعتقاد را ہمیشہ حمایت دین مبین نصب العین ضمیر منیر است از استماع ایں عقاید ردیہ و اطوار باطلہ از منبع سعادت عرق حمیت دیں بحرکت می آید الخ =

سلطان شجاع کے عادات و خصائل

شاہجہاں کا دوسرا بیٹا سلطان شجاع اپنی وضع و عادات میں اپنے بھائی دارا شکوہ کے مشابہ تھا لیکن یہ زیادہ فہیم اور اپنے عزم اور ارادوں میں زیادہ قائم و مستقل اور دارا شکوہ کی نسبت حسن تمیز اور ہوشیاری اور ایسے اوضاع و اطوار میں جو شاہزادوں کے لئے زیبا ہیں بڑھا ہوا تھا۔ سازشوں اور زیر زمین کارروائیوں میں بڑا ماہر تھا۔ اور بڑے بڑے ذی قدرت امرائے دربار خصوصاً بڑے بڑے ذی اقتدار راجاؤں مثلاً جونت سنگھ[1] وغیرہ کو مخفی طور پر انعامات دے کر اُن کی دوستی حاصل کرنے کا گر بھی اُسے خوب آتا تھا۔ مگر باوجود ان اوصاف کے نہایت عیاش اور عشرت پسند تھا اور جب اپنی بے شمار حرموں اور ارباب نشاط وغیرہ کے حلقہ میں ہوتا تو تمام دن اور رات رقص و سرود اور شراب نوشی میں بسر کرتا اور کوئی مصاحب جس کو اپنی جان پیاری ہوتی ایسے اوقات میں اُس کو ان حرکات سے روکنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے اُس کے امور سلطنت اکثر درہم و برہم رہتے تھے اور اُس کی محبت رعایا کے دل میں بہت کم تھی۔ اگرچہ اُس کا باپ اور بھائی ترکانِ روم یعنی اہلِ سنت و جماعت کا مذہب رکھتے تھے۔ مگر سلطان شجاع ایرانیوں کے عقائد یعنی مذہب شیعہ کا علانیہ معتقد اور مقر تھا۔ واضح ہو کہ دینِ اسلام میں بہت سے فرقے ہیں جیسا کہ کتاب گلستاں کے نامور مصنف شیخ سعدی کے ایک شعر کے ترجمہ سے جو ذیل میں درج ہے دریافت ہوتا ہے۔ ترجمہ بیت[2] "میں ایک درویش بادہ نوش اور شخص رند مشرب ہوں اور بہتر فرقے مجھکو خوب جانتے ہیں" منجملہ ان فرقوں کے دو فرقے ایسے ہیں جن کا باہمی تعصب اس درجہ کو پہنچا ہوا ہے کہ دونوں آپس میں جانی

---

[1] مہاراجہ جسونت سنگھ راٹھور والی جودھپور مراد ہے جس کو شاہجہاں کے عہد میں بادشاہ کے ننہال میں ہونے کی وجہ سے بڑا اقتدار اور خطاب مہاراجگی حاصل ہو گیا تھا۔ ہمارے اس زمانہ میں بھی یہ ریاست اُسی خاندان میں قائم ہے اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس طرح مصنف کے زمانہ میں اس ریاست کے فرماں روا کا نام جسونت سنگھ تھا مترجم کے زمانہ کے فرماں روا کا نام بھی جسونت سنگھ ہی ہے۔ اس ریاست کی خالص آمدنی سوائے جاگیرداروں کے معافیات کے بموجب کتاب تاریخ جلسہ قیصری واقع دہلی مصنفہ تالبائے ویلر صاحب اب چھپن ۵۶ لاکھ روپیہ اور رقبہ پینتیس ہزار چھ سو ستر میل مربع اور آبادی بیس لاکھ آدمی کی ہے۔ س م ر

[2] یہ شعر باوجود تلاش دستیاب نہیں ہو سکا۔ س م ح

ث ال ب اے دعی ل۔

دشمن ہیں۔ ایک اُن میں سے تُرک یعنی رومی ہیں جن کو ایرانی لوگ عثمانی یعنی پیروانِ عثمان کہتے ہیں اور یہ عثمان کو اپنے پیغمبر کا سچا اور اصلی قائم مقام اور خلیفہ سمجھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ خلیفہ (یعنی سب اہل اسلام کا فرمان فرما جو تاویلات الفاظ قرآنی اور اجتہاد کر سکتا ہو اور فیصلہ قضایا اور مباحث اور تنازعات شرعیہ کا استحقاق رکھتا ہو) صرف وہی ہے۔ دوسرا فرقہ ایرانیوں کا ہے جن کو ترک لوگ رافضی یا شیعہ اور علی مردان کہتے ہیں۔ ان لفظوں کے معنی ہیں ایک ایسا فرقہ جو عام فرقۂ اہل اسلام سے خارج ہو یا بدعتی اور طرف دارانِ علیؓ۔ کیونکہ ایرانی یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ خلافت و امامت حضرت علیؑ کا حق تھا جو پیغمبر کے داماد تھے۔ سلطان شجاع نے جو مذہب شیعہ قبول کر لیا تھا۔ بظاہر اس میں یہ مصلحت تھی کہ اس بات کو اپنے امورِ سلطنت کی مطلب براری کا ذریعہ جانتا تھا کیونکہ شاہجہاں کی سلطنت میں ایرانی بڑے بڑے مقتدر عہدہ دار اور دربار میں بے حد صاحبِ اختیار تھے۔ اور شجاع کو یہ اُمید تھی کہ جب کبھی کوئی معرکہ آن کر پڑے گا اور موقعہ پیش آئے گا۔ تو مجھے ان سے بوقتِ ضرورت ہر قسم کی مدد ملے گی اور فائدہ پہنچے گا۔

اورنگ زیب تیسرا بھائی اورنگ زیب اگرچہ اس قدر خوش اخلاقی اور کشادہ روئی اور فراخ مزاجی کی صفات سے جو دارا شکوہ میں موجود تھیں موصوف نہ تھا۔ لیکن نہایت مردم شناس تھا۔ چنانچہ اُس کی رائے ایسے معتمد اور وفادار اشخاص کے انتخاب میں جو اُس کی خدمات کو نمک حلالی اور قابلیت کے ساتھ بجا لانے کی

لہ مصنف کی یہ معلومات جو اکثر غلط ہیں بعینہ ترجمہ کی گئی ہیں۔ ترکان روم کو عثمانلو یا عثمانلی صرف اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ اس سلطنت کا فرمان روا خاندان سلطان عثمان خاں کی اولاد سے ہے جو دراصل سلطان علاؤالدین سلجوقی کا ایک ملازم تھا۔ اور اپنی لیاقت کی وجہ سے اول سپہ سالاری اور پھر اس بادشاہ کی دامادی کے درجہ تک پہنچا۔ اور آخر کار اُس کے بے اولاد مر جانے پر سنہ بارہ سو ننانوے عیسوی مطابق سنہ چھ سو ننانوے ہجری میں رضامندی عام سے اُس کا جانشین ہوا تھا۔ کتاب سنین اسلام میں لکھا ہے کہ یہ بادشاہ ایسا کریم اور سپاہ پرور تھا کہ ایک حبہ اپنے پاس نہ رکھتا تھا۔ اور جو اُس کو ملتا تھا۔ سپاہ پر خرچ کر دیتا تھا۔ یہاں تک کہ اُس کے مرنے کے بعد سوائے ایک خفتان اور کمربند اور تلوار کے کوئی شے جواہرات۔ سونا چاندی وغیرہ کی قسم سے اُس کے پاس برآمد نہ ہوئی اور اُس کا انتقال ۷۶ برس کی عمر میں ۱۳۲۶ء مطابق سنہ ۷۲۶ھ میں ہوا تھا۔ س م ح

بہت زیادہ لیاقت رکھتے تھے۔ نہایت سلیم اور صائب تھی۔ اور اگرچہ انعام و اکرام بھی کثرت سے دیا کرتا تھا لیکن موقع اور امتیاز سے اور صرف اُن لوگوں کو دے دیتا تھا جن کی رضامندی اور تالیف و ترغیب ضروری سمجھتا تھا۔ وہ اپنے بھید کو چھپانے پر پوری طرح قادر تھا۔ اور ظاہرداری و چالاکی میں تو کامل اُستاد تھا۔ چنانچہ جب اپنے باپ کے دربار اور دارالسلطنت میں حاضر و موجود ہوتا تو بناوٹ سے عابدانہ وضع قطع اختیار کرلیتا اور دنیاوی جاہ و حشمت سے نفرت ظاہر کرتا۔ حالانکہ اپنی شوکت اور سربلندی کے لئے در پردہ راستہ نکالنے میں بڑی دل جمعی کے ساتھ کوشاں رہتا۔ یہاں تک کہ جن دنوں اُس کو دکن کا صوبہ دار مقرر کیا گیا تب بھی اہلِ دربار کو کبھی جتلاتا رہا کہ اگر مجھے ترکِ دنیا اور درویشی کی اجازت مل جاتی تو زیادہ خوش ہوتا کیونکہ میری دلی تمنا یہی تھی کہ باقی زندگی ریاضت اور عبادت ہی میں صرف کروں۔ اور انکار دنیوی اور امورِ سلطنت کی ذمہ داری میں اُلجھنا مجھے نامرغوب اور ناپسند ہے۔ حالانکہ اُس کی ساری عمر سازشوں اور منصوبوں ہی میں گذری۔ وہ اپنی چال اس عقلمندی سے چلتا تھا کہ دربار میں سوائے اُس کے بھائی دارا شکوہ کے ہر ایک نے اُس کے رویہ کو سمجھنے میں دھوکا کھایا۔ شاہجہاں کے حسن ظن پر جو اُس کو اپنے اِس چھوٹے بیٹے کی نسبت تھا۔ دارا شکوہ کو بہت حسد ہوتا تھا۔ چنانچہ کبھی کبھی اپنے ہمدرد مصاحبوں سے کہا کرتا تھا کہ مجھے اپنے سب بھائیوں میں کسی سے اندیشہ اور خوف ہے تو بس انھیں نمازی اور دیندار حضرت سے ہے۔

شہزادہ مرادبخش مرادبخش جو شاہجہاں کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا اپنے بڑے بھائیوں سے دانائی اور ہوش مندی میں کم تھا۔ اور صرف خوش خوری اور شکار ہی کا اُس کو زیادہ شوق تھا۔ مگر تاہم وہ سخی اور خلیق بھی تھا اور اکثر یوں شیخی بگھارا کرتا تھا کہ ہمیں بھید اور رازداریوں سے سروکار نہیں ہے۔ وہ سازشوں اور تخیلوں کو حقیر و خوار سمجھتا تھا۔ اور اس بات کا اعلان و اشتہار اُس کو منظور خاطر تھا کہ میں صرف تلوار اور قوتِ بازو پر بھروسہ رکھتا ہوں۔ اور فی الواقع مرادبخش شجاعت اور دلیری کا پُتلا تھا۔ اور شجاعت کے ساتھ اگر کسی قدر بیداری اور ہوشیاری بھی اُس میں ہوتی تو غالباً اپنے تینوں بھائیوں پر غالب آتا۔ اور بے خلش ہند کا فرماں روا ہو جاتا۔ [1]

---

[1] اورنگ زیب نے اپنی اور اپنے بھائیوں کی خصلت کی نسبت جو کچھ خود دیکھا ہے مناسبت مقام کی

شاہجہاں کی بڑی بیٹی شاہجہاں کی بڑی بیٹی بیگم صاحب بے حد حسین اور خوش اندام اور باپ کی نہایت پیاری تھی۔ ایسے غیر طبعی میلان کی افواہ کی نسبت اشارہ کرنا ایک بہت ناگوار واقعہ ہے کہتے ہیں کہ وہ عذر بے گناہی و برائت جس پر شاہجہاں کے دل کو اس معاملہ میں اطمینان ہو گیا۔ مُلا اور فقہ کے لوگوں کا وہ جھوٹا فتویٰ[1] تھا جو اس تمہید سے دیا گیا تھا کہ بادشاہ کو اُس درخت کے میوے سے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ کو دو سے بطور خلاصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ چنانچہ سلطان محمد معظم کو جو محمد سلطان کی وفات کے بعد اورنگ زیب کے بیٹوں میں سب سے بڑا ہی تھا۔ لکھتا ہے "مہین پور خلافت باوجود سلامت نفس فتح اللہ خاں را چنانا خوش کرد بود ما در ایام پادشاہزادگی با اُمراہم چہ سلوک می کردیم کہ ہمہ راضی بودند و در حضور و غیبت بہ خوش دلی تعریف و توصیف ما می کردند بل با وصف اقتدار برادر نامہربان (یعنی دارا شکوہ) بعضے ترک رفاقت او کردہ ملازمت ما اختیار کردند چنانچہ باشارہ برادر نامہربان حرکات نالائم کردہ حرفہائے بے ادبانہ بزبان آوردند بہ تا ریانہ اغماض وتحمل متنبہ شدہ از سر انصاف اقرار بہ صاحب حوصلگی ما کردند تا نقش سرداری و بہادری ما بر لوح خاطر اشرف اقدس اعلیحضرت (یعنی شاہجہاں) مرتسم گشت و کمر ملازمت وست بستہ بر وریا نمودئے این مورضیف صورت گرفت"

ایک دوسرے رقعہ میں سلطان محمد اعظم کو لکھتا ہے۔ "فرزند عالی جاہ روزے اعلیحضرت در خلوت بہ دارا شکوہ ارشاد نمودند کہ در حقِ امرائے بادشاہی کج خلق و بدگمان نباشد وہمہ را مشمول عواطف و الطاف دارد و عرض غرض آمیز سخن سازان در حق این جماعت نشنود کہ این حرف وقتے بکار خواہد آمد از لہکہ دل می سوزد حرف ناگفتنی می گو بہم نفاق با مردم کار ضائع کار لیست" پھر ایک اور رقعہ میں محمد اعظم کو لکھتا ہے "فرزند عالی جاہ این نقل زبانی شخصے معتبر بگوش رسیدہ بود در رشتہ تحریر کشیدہ شد کہ بگوش آن فرزند ہم برسد روزے اعلیحضرت علی مردان خاں و سعد اللہ خاں را در خلوت خاص عزاختصاص بخشیدہ از زبان گوہرفشاں فرمودند کہ بعضے اوقات اندیشہ بخاطر راہ می یابد کہ مہین پور خلافت (یعنی دارا شکوہ) اگرچہ اسباب شان و شوکت و سامان تجمل و صولت ہمہ دارد لیکن عدوئے نیکوان و دوست بدان واقع شدہ بتجابح بغیراز سیہ چشمی وصفے ندارد۔ و مراد بخش مجہول الکیفیت باکل و شرب ساختہ دائم الخمر است مگر فلانی یعنی این عاجز فانی ذی عزم و آل اندیش بنظر می آید۔ اغلب کہ متحمل امر خطیر ریاست تواند شد"

(ماخوذ از کتاب کلمات طیبات معروف بہ رقعات عالمگیری) س م ح

[1] یہ افواہ خواہ اصل میں صحیح ہو یا غلط مگر جو لوگ اس ملک کی راہ و رسم سے واقف ہیں بخوبی جانتے ہیں کہ ایسے معاملہ میں کوئی بے حیا سے بے حیا شخص بھی ایسا استفتا نہیں کر سکتا۔ س م ح

متمتع ہونا جس کو اس نے خود لگایا ہے جائز اور درست ہے۔ شاہجہاں کو اپنی اس منظور نظر دختر پر بے حد اعتماد تھا اور وہ اُس کی سلامتی کی محافظ اور نگہبان تھی اور یہاں تک احتیاط رکھتی تھی کہ کسی قسم کا کھانا کیوں نہ ہو جب تک خاص اُس کے روبرو تیار نہ ہوتا تھا بادشاہ کے دسترخوان پر نہیں لگایا جاتا تھا۔ پس بیگم صاحب کو امور شاہجہانی میں اس قدر اقتدار و اختیار کا حاصل ہونا اور بادشاہ کے مزاج کی باگ اُس کے ہاتھ میں ہونا اور سلطنت کے بڑے اور اہم معاملات میں اُس کی قدرت اور اختیارات کا ایسا کامل ہونا کوئی عجیب امر نہیں ہے۔

اس شاہزادی نے اپنے کثیر المقدار شاہی جاگیروں اور وظیفوں سے جو اس کے لئے مقرر تھے اور اُن بے بہا پیش کشوں اور نذرانوں سے جو چاروں طرف سے بطور نذر اور شکرانہ اُن بے شمار معاملات کی درستی کے اُس کے پاس آتے تھے جو صرف اُسی کی رائے پر انتظام و انصرام پاتے تھے بہت کچھ دولت جمع کی تھی[ل]۔ یہاں تک کہ اُس کے بھائی داراشکوہ کے معاملات کی کامیابی اور سرسبزی بھی اُسی کے وسیلے سے تھی اور بادشاہ کی مہربانی اور نظر عنایت صرف اسی وجہ سے اُس کو حاصل تھی کہ بیگم صاحب نہایت مستعدی اور سرگرمی سے اُس کی حمایت کرتی تھی اور خود کو علانیہ اُس کا طرفدار ظاہر کرتی تھی ادھر داراشکوہ کے دل پر بھی بیگم صاحب کی رفاقت اور امداد کا نقش بخوبی جم گیا تھا چنانچہ اکثر اگے یہ خیال کیا کرتے تھے کہ اس کے عوض میں اُس نے بیگم صاحب سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اپنی تخت نشینی کے وقت میں آپ کو نکاح کر لینے کی اجازت دے دوں گا۔ داراشکوہ کا یہ وعدہ سلاطین ہندوستان کے آئین کے برخلاف تھا جس کی رو سے شاہزادیوں کی شادی بالکل ممنوع[ل] ہے۔ اس ممانعت کی وجہ اول تو یہ ہے کہ

[ل] بیگم صاحب کا بے حد اقتدار و اختیار اور اُس کا شاہجہاں کو اپنی اولاد میں سب سے زیادہ عزیز ہونا اس خاندان کی فارسی زبان کی تاریخوں سے بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی نہایت بڑی آمدنی کی جاگیر ہی ... لاکھ روپیہ سال تھی یہ بات بخوبی ثابت ہے۔ س م ح

[ل] قطعی ممنوع ہونا تو صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اسی خاندان کی کئی شاہزادیوں کی شادی کا اس خاندان کے بعض شاہزادوں ... شاہزادوں کے ساتھ ہونا اس خاندان کی فارسی زبان کی تاریخوں میں مندرج ہے۔ مگر ہاں اکثر یہ عادت بھی تھی جو مصنف نے بیان کی ہے۔ س م ح

کوئی شخص بادشاہی خاندان کے رشتہ اور قرابت کے لائق نہیں سمجھا جاتا۔ دوسری یہ کہ یہ کھٹکا رہتا ہے کہ کہیں شاہزادی کا شوہر اس تقریب سے اقتدار پا کر تاج و تخت کی جستجو اور حرص نہ کرنے لگ جائے۔

میں اس جگہ دو داستانیں جو اس شاہزادی کی عشق بازی سے متعلق ہیں بیان کرنی چاہتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ کوئی شخص میری نسبت یہ گمان نہ کرے گا کہ میں نے ان مضامین کو افسانہ طرازی اور اعجوبہ نگاری کے شوق میں بیان کرنا چاہا ہے۔ کیونکہ جو کچھ میں لکھ رہا ہوں وہ ایسے واقعات ہیں جو تاریخ میں کارآمد ہیں۔ اور میرا خاص مدعا اور مطلب یہ ہے کہ یہاں کے لوگوں کے رسوم و عادات کے صحیح اور درست حالات بیان کروں۔

عشق و محبت کے واقعات اگرچہ ہر ملک میں مذموم اور جرم ہیں مگر جس شدت سے ممالکِ ایشیا میں خطرناک ہیں اس قدر فرنگستان میں نہیں ہیں۔ چنانچہ ہمارے ملک فرانس میں ایسی حرکتوں کے تذکرے اگرچہ چند روز کے لئے لوگوں کی ہنسی اور خوش طبعی کا ذریعہ رہتے ہیں جس کو تھوڑے عرصہ میں سب بھول جاتے ہیں۔ لیکن مشرقی ملکوں میں ایسی صورتیں بہت کم پائی جاتی ہیں کہ جن میں عشقیہ تعلقات سے بدانجام واقعات اور نہایت ہیبت ناک مصائب اور حرکات سرزد نہ ہوتی ہوں۔

بیگم صاحب کا پہلا معاشقہ

کہتے ہیں کہ بیگم صاحب اگرچہ محل سرا میں حسب معمول محصور رہتی تھی۔ اور محل کی اور مستورات کی طرح اس کی بھی نگہبانی ہوتی تھی۔ مگر کسی مخفی طور سے اس کے پاس ایک نوجوان شخص کی آمد و رفت ہوگئی جو اگرچہ کوئی خاندانی آدمی نہ تھا مگر حسین بہت تھا۔ لیکن ظاہر ہے اس بات کا سہیلیوں اور محافظوں سے مخفی رہنا ممکن نہ تھا۔ اور جب کہ عورتیں بیگم صاحب کے رشک و حسد سے پہلے ہی جل رہی تھیں تو محل کی اکثر خواصوں پر اس بھید کا کھلنا لازمی تھا۔ الغرض شاہجہاں بھی بیگم صاحب کی خطا و لغزش سے واقف ہوگیا۔ اور حقیقت حال معلوم کرنے کے خیال سے ناگہاں محل میں چلا گیا۔ چونکہ بادشاہ کے آنے کی خبر بیگم صاحب کو جلدی نہ مل سکی کہ وہ اس شخص کو کسی مناسب جگہ چھپا دیتی اس نے مجبوراً اسے اپنے خوف زدہ جوان عاشق کو حمام کی ایک بڑی دیگ میں چھپایا

پڑا۔ اس واردات پر بادشاہ کے چہرہ سے نہ تو کچھ تعجب ہی کے آثار ظاہر ہوئے اور نہ کچھ غصہ اور ناخوشی ہی معلوم ہوئی بلکہ بیٹی سے معمولی باتیں کرتا رہا۔ لیکن کسی قدر بات چیت کے بعد کہا کہ معلوم ہوتا ہے تم نے آج حسب معمول غسل نہیں کیا۔ حمام گرم کرنا چاہئے اور خواجہ سراؤں کو حکم دیا کہ دیگ کے نیچے آگ جلائیں۔ اور جب تک انھوں نے اُسے یہ یقین نہ دلا دیا کہ وہ قسمت کا مارا بدنصیب جل کر خاک ہوگیا ہے وہاں سے نہ ہلا۔

بیگم صاحب کا دوسرا معاشقہ چند مدت بعد بیگم صاحب نے ایک اور مشغلہ پیدا کیا۔ جس کا نتیجہ اور انجام بھی ایسا ہی دردناک ظہور میں آیا۔ یعنی آپ نے اپنی خانسامانی کے عہدہ کے واسطے ناظر خاں[1] یا نذیر خاں نامی ایک ایرانی نوجوان کو جو مشہور و معروف صاحب جمال اور نہایت قابل و دانشمند اور بے حد شجاع و صاحب حوصلہ امیر تھا۔ اور جس کو تمام اہل دربار عزیز رکھتے تھے پسند فرمایا۔ چونکہ اورنگ زیب کا ماموں شائستہ خاں بھی اس کو بہت اچھا اور معقول شخص سمجھتا تھا اس لئے اُس نے جان پر کھیل کر بادشاہ سے عرض کیا کہ یہ شخص اس قابل ہے کہ بیگم صاحب کا عقد اس سے کیا جائے۔ مگر شائستہ خاں کی اس تجویز کو شاہجہاں نے نہایت ناشائستہ اور ناپسندیدہ سمجھا اور چونکہ وہ پہلے ہی سے کسی قدر کھٹکا ہوا تھا کہ اس کے اور شاہزادی کے درمیان کسی قسم کا ناجائز تعلق ہے اس سے اُس کا یقین اور بھی پختہ ہوگیا۔ اور یہ سنتے ہی بادشاہ نے اس بے چارے نوجوان کو اس دنیا سے چلتا کرنے کے لئے کسی بڑی تدبیر یا زیادہ سوچ بچار کی ضرورت نہ سمجھی اور فوراً اظہار مہربانی کے طور پر دربار عام میں اپنے ہاتھ سے ایک پان کا بیڑہ اس صاف باطن جوان کو جس کے دل میں کسی طرح کا شک و شبہ نہ تھا عنایت کیا۔ چونکہ اس سلطنت میں یہ ایک نہایت اعزاز و امتیاز کی علامت ہے۔ اس لئے وہ اس پان کو بے کھٹکے حسب دستور چبانے لگا۔ اور کم بخت نے ذرا بھی خیال نہ کیا کہ مجھے اس منحوس گھڑی بادشاہ نے اپنے ہاتھ سے زہر دیدیا ہے۔ بلکہ اس خیال باطل میں کہ غالباً اب بادشاہ کی نظر الطاف سے

---

[1] انگریزی رسم الخط میں ناظر خاں اور نذیر خاں ایک ہی طرح لکھا جاتا ہے مگر غالباً نذیر خاں صحیح ہوگا کیونکہ ناظر خاں محاورے کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ مترجم

میرے لئے روزافزوں ترقیاں ہونے والی ہیں مسرور و محظوظ دربار سے رخصت ہو کر اپنی پالکی میں سوار ہوا۔ مگر زہر کی تیزی اور سرعت اس درجہ تھی کہ وہ گھر پہنچنے سے پہلے ہی دوسرے گھر پہنچ گیا۔

ہندوستان کے لوگ پان میں ایک چیز کے کچھ باریک اور نازک سے ورق اور تھوڑا سا چونہ جو کوڑیوں سے بنتا ہے اور کچھ اور مصالحہ ملایا کرتے ہیں۔ اور پان کھانے سے منہ معطر اور خوشبودار اور لب سرخ ہو جاتے ہیں۔

روشن آرا بیگم شاہجہاں کی چھوٹی بیٹی روشن آرا بیگم اگرچہ بہن سے حسن و جمال میں کم اور خوش فہمی میں بھی کچھ ایسی مشہور نہ تھی۔ مگر باوجود اس کے وہی زندہ دلی اس کے مزاج میں بھی موجود اور ویسی ہی عیش پسند تھی اور جس قدر بیگم صاحب داراشکوہ کی طرفدار تھی ——— اتنی ہی یہ اورنگ زیب کی مخلص جانبدار اور ان دونوں کی علانیہ دشمن تھی۔ اور یہی سبب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پاس نہ تو اتنی دولت ہی تھی اور نہ امور سلطنت ہی میں اُس قدر اختیار اور دخل تھا۔ مگر پھر بھی چونکہ محل میں بود و باش کی شریک اور فن فریب میں کامل تھی جاسوسوں کی معرفت کام کی باتیں اور ضروری خبریں اورنگ زیب کے پاس پہنچاتی رہتی تھی۔

شہزادوں کا دور دراز صوبوں پر تقرر لڑائی سے چند سال پہلے شاہجہاں کا دل اپنے مفسد مزاج بیٹوں کی طرف سے خوف اور اضطراب میں تھا۔ اور اگرچہ وہ چاروں عاقل و بالغ اور صاحب اہل و عیال تھے۔ لیکن برادرانہ سلوک اور ایسے مضبوط رشتہ کی رعایت کو بالائے طاق رکھکر سلطنت کی ہوس میں ایک دوسرے کے جانی دشمن ہو رہے تھے یہاں تک کہ دربار میں اُن کے طرفداروں کے بھی جدا جدا دھڑے بندھ گئے تھے۔ ان اسباب کی بنا پر بادشاہ جو اپنی سلامتی ہی کے لئے لرزتا کانپتا رہتا تھا جب ان کی ایسی ناگوار حرکتیں مشاہدہ کرتا (جن کے خمیازے آخرکار اُس کو خود اٹھانے پڑے) تو خود کو ایک عجیب طرح کے عذاب میں گرفتار سمجھکر نہایت آرزو کے ساتھ یہ چاہتا تھا کہ اِن کو گوالیار کے قلعہ میں جو بڑا مضبوط اور مستحکم اور ایک بلند اور کڈھب چٹان دار پہاڑی پر بنا ہوا ہے۔ اور جس کا فتح کرنا مشکل ہے۔ اور جس میں بادشاہی خاندان کے سلاطین وغیرہ اکثر مقید اور نظر بند رہا کرتے ہیں قید کردے

لیکن اُس نے سوچ سمجھ کر آخرکار اپنے دل میں اس بات کو مان لیا تھا کہ حقیقت میں یہ اب ایسے زبردست ہوگئے ہیں کہ اُن سے اس قسم کا سلوک کرنا ایک سرسری امر نہیں رہا اُس کو اِن کی طرف سے رات دن یہی تردد اور تفکر لاحق رہتا تھا۔ کہ اگر یہ باہم بھڑ گئے تو اپنے لئے علیحدہ علیحدہ مستقل سلطنتیں قائم کرلیں گے یا پایۂ تخت کو میدانِ جنگ بنا کر خلق خدا کی خوں ریزی اور قتل و غارت کے بعد اپنی اپنی قسمت کا فیصلہ کریں گے۔ چنانچہ اُس نے اِن پیش آنے والی آفتوں اور فتنوں سے بچنے کے لئے یہ تجویز نکالی کہ چاروں کو چار دور دراز صوبوں کی حکومتیں دے کر الگ الگ کردیا جائے پس سلطان شجاع کو بنگالہ۔ اورنگ زیب کو دکن۔ مراد بخش کو گجرات۔ اور داراشکوہ کو ملتان اور کابل کا حاکم مقرر کیا[1]۔

داراشکوہ کے سوا یہ سب شاہزادے بلا توقف اپنے اپنے صوبوں کو چلے گئے۔ مگر وہاں پہنچتے ہی اپنی مفسد طبیعتوں کے بخار نکالنے لگے۔ اور خودسر بادشاہوں کی سی حکمرانیاں شروع کردیں۔ چنانچہ ملک کی آمدنی اپنے ذاتی امور میں صرف کرنے لگے۔ اور ہر ایک نے بڑی بڑی مہیب فوجیں اس بہانہ سے بھرتی کرلیں کہ پایۂ تخت کی کمک اور ملک میں امن و امان قائم رکھنے اور حدود ممالک غیر پر رعب وداب کے لئے اُس کی ضرورت ہے۔

داراشکوہ دارالسلطنت میں

لیکن داراشکوہ نے جو سب سے بڑا اور اسی وجہ سے تخت نشینی کا[2] متوقع تھا پایۂ تخت کو نہ چھوڑا اور

[1] میر عسکری المخاطب بہ عاقل خاں جو اورنگ زیب کے مشہور امیروں میں سے تھا لکھتا ہے کہ ۱۰۶۲ھ میں جب کہ شاہجہاں کابل میں مقیم تھا اُس نے دور اندیشی کی راہ سے ان شاہزادوں کو اُن کے نامزد کئے ہوئے صوبوں کو رخصت کیا اور کابل سے چل کر جب شجاع اور اورنگ زیب آگرہ میں پہنچے تو داراشکوہ کے مزرسے بچنے کے لئے آپس میں بڑے بڑے مستحکم عہد وپیمان کئے اور کہا کہ اگر ہم باہم ملے رہیں تو داراشکوہ کے شر سے جو ہمارے خون کا پیاسا ہے بچے رہیں گے اور اس معاہدہ کے مزید استحکام کے لئے شجاع نے اپنی بیٹی اورنگ زیب کے بیٹے محمد سلطان سے منسوب کی اور اورنگ زیب نے اپنی لڑکی کا رشتہ شجاع کے بیٹے سلطان زین العابدین سے کیا۔ س م ح

[2] فارسی زبان کی تاریخوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہجہاں نے داراشکوہ کو حقیقتاً اپنا ولیعہد مقرر کرکے شاہ بلند اقبال کا خطاب دیا تھا۔ اور صاحب سیر المتاخرین نے بضمن وقائع ۱۰۶۷ھ لکھا ہے کہ آخر اس کے سالانہ مواجب دو کروڑ ساڑھے سات لاکھ روپیہ مقرر ہوگیا تھا۔ یعنی تیئس کروڑ دام۔ س م ح

شاہجہاں نے بھی اُس کو احکام شاہی کے اجرا کے اختیارات سپرد کر دیئے تھے اور یہ بھی اجازت دیدی تھی کہ ایک چھوٹے تخت پر جو بادشاہی تخت سے نیچا ہو خود بادشاہ کے سامنے دربار میں جلوس کیا کرے۔

ایک ہی وقت میں دو مساوی الاختیار فرماں روا دربار میں جلوہ گر نظر آنے لگے۔ ان باتوں سے اگرچہ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ خود بادشاہ ہی داراشکوہ کی امیدوں کی تائید کرتا تھا۔ لیکن اس بات کے باور کرنے کی معقول وجہ موجود ہے کہ اگرچہ داراشکوہ باپ کے ساتھ ادب و محبت کے طریقوں سے پیش آتا تھا۔ مگر شاہجہاں ریاکاری اور دورنگی برتتا تھا۔ اور اس کہن سال بادشاہ کو برابر یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں مجھ کو زہر نہ دیدیا جائے۔ اور ظن غالب ہے کہ بادشاہ کی پوشیدہ خط و کتابت اورنگ زیب سے جاری رہتی تھی جس کی نسبت اُس کو ہمیشہ یہ اعتقاد تھا کہ سلطنت اور ملک داری کے لئے یہ لڑکا بہت لایق و فایق ہے۔

اس کتاب کے اُن مطالب کی توضیح و تشریح کے لئے جن کا ذکر آئندہ آنے والا ہے بطور تمہید شاہجہاں اور اُس کے بیٹوں کی باہمی حالت اور اسی طرح اُس کی دونوں بیٹیوں کا بھی کچھ کچھ حال درج کر دینا ضروری تھا۔ کیونکہ یہ بھی ان دردناک واقعات میں بڑی حصہ دار تھیں۔ واضح رہے کہ ہندوستان اور قسطنطنیہ اور اور ایشیائی ملکوں میں بڑی بڑی سنگین اور اہم وارداتیں اکثر عورتوں کے اختیار و اقتدار کے باعث سرزد ہوتی رہی ہیں۔ اور اکثر لوگ اُن کے وقوع کے اصل اسباب سے ناواقف ہوتے ہیں اور اُن کا باعث بعض اور باتوں کو سمجھ لیا کرتے ہیں۔

میر جملہ اب شاہجہاں کے بیٹوں کے جنگ و جدال کے واقعات لکھنے سے پہلے اگر اسی طرح کچھ حالات اورنگ اور شاہ گولکنڈہ اور اُس کے وزیر میر جملہ کے بھی مجمل طور پر لکھ دیئے جائیں تو امید ہے کہ ناظرین کو مطالب کتاب کے سمجھنے میں زیادہ آسانی اور غالباً اُس شخص کی چالاکیوں اور فیلسوفیوں کی نسبت جو اس تمام تاریخی کارنامہ کا رستم اور ہندوستان کا آئندہ بادشاہ ہے ایک بصیرت حاصل ہو جائے گی۔

میر جملہ نے جن تدبیروں اور حکمتوں سے شاہجہاں کے فرزند ثالث کے اقتدار اور سلطنت کی بنیاد قائم کی اُس کی تفصیل یہ ہے۔

جس وقت اورنگ زیب کو دکن کی صوبہ داری سپرد کی گئی تھی میر جملہ شاہ گولکنڈہ کا وزیر اور اس کی تمام فوج کا سپہ سالار اور تمام ہندوستان میں ایک مشہور و معروف شخص تھا اور اگرچہ خاندانی امیر یقینی امیر نہ تھا۔ لیکن نہایت ہی قابل اور لائق انسان تھا اور جیسا کہ سپاہ گری میں کامل تھا ویسا ہی معاملات تجارت کو بھی خوب سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی دولت جو بہت زیادہ تھی صرف گولکنڈا کی متمول سلطنت کی وزارت کے وسیلہ سے نہیں بلکہ اپنی وسیع تجارت کے ذریعہ سے جو اکثر ملکوں میں جاری تھی اور ہیروں کی کانوں کے ٹھیکوں سے جو اور شخصوں کے ناموں سے لے رکھے تھے حاصل کی تھی۔ ان کانوں کی کھدائی اُن تھک محنت اور سرگرمی سے جاری رہتی تھی اور ہیروں کی برآمد اس کثرت سے تھی کہ اس کے ہاں یہ قاعدہ اور معمول تھا اُن کا شمار نہ کیا جاتا تھا۔ بلکہ ہیروں سے بھری ہوئی ٹاٹ کی تھیلیوں کو گنوا لیا جاتا تھا۔[۲]

---

[۱] اصل کتاب کے حاشیہ اور بعض فارسی زبان کی تاریخوں میں اس نامور شخص کا حال یوں لکھا ہے کہ یہ قوم کا سید اور ایران کا باشندہ تھا اور اردستان میں جو نواح اصفہان میں ہے پیدا ہوا تھا۔ اس کے والدین اگرچہ خاندانی تھے مگر بہت ہی غریب تھے بہرحال اس نے کسی طرح کچھ لکھنا پڑھنا سیکھ لیا اور ایک جوہری کے پاس جو تجارت کے لئے اکثر گولکنڈا کو آیا کرتا تھا گماشتہ بن گیا۔ بعض کا تو یہ قول ہے کہ نوکری چھوڑ کر گولکنڈا کی سلطنت میں بطور خود تجارت کرنے لگ گیا تھا۔ اور بعض یوں کہتے ہیں کہ وہ سوداگر اپنی وفات کے وقت اپنا سب مال و دولت اسی کو دے گیا تھا۔ خواہ کوئی صورت ہو یہ نوجوان بہرحال اسی تجارت کے ذریعہ نہایت مالدار ہو گیا اور کچھ روپیہ خرچ کر کے سلاطین قطب شاہی کے دربار میں جو ملک تلنگانہ اور گولکنڈہ کے بڑے حصے کے بادشاہ تھے ایک عہدہ حاصل کر لیا۔ اور اس عہدہ کے فرائض ایسی خوبی سے انجام دیئے کہ بادشاہ نے نہایت خوش ہو کر ترقی منصب تلنگانہ پر مامور فوج کا اُس کو اعلیٰ افسر مقرر کر دیا اور آخرکار سلطان عبداللہ قطب شاہ والی گولکنڈا کا وزیر مقرر ہوا اور میر جملہ یعنی سردار کل کا خطاب پایا۔ س۔م۔ح

[۲] مترجم انگریزی نے اس موقعہ پر بطور حاشیہ یہ لکھا ہے کہ "ہیرے زیادہ تر سلطنت گولکنڈا بیجاپور بنگالہ اور جزیرہ بورنیو میں دستیاب ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک کان تو راول کنڈا میں ہے جو گول کنڈا سے پانچ منزل پر ہے۔ دوسری کانیں جسے گولور بھی کہتے ہیں گول کنڈا سے مشرق کی طرف سات منزل پر ہے۔ بنگالہ میں قصبہ سلیم پور کے نزدیک جو گندبل نامی ایک ندی ہے اُس کے ریت میں سے بھی ہیرے نکلتے ہیں اور اس نے سلیم پور کی جگہ اس کان کو گوپل والی کہنا زیادہ مناسب ہے اور جزیرہ بورنیو میں سکادن ندی میں سے ہیرے

اور اگر یہ بات پیش نظر رہے کہ وہ صرف اپنے بادشاہ کی فوج ہی کا سپہ سالار نہ تھا بلکہ خاص اپنے خرچ سے اپنی جرار فوج معہ ایک توپ خانہ کے جس میں اکثر عیسائی لوگ ملازم تھے ہمیشہ تیار رکھتا تھا تو ہر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ اُس کا رعب و داب اور اختیار و اقتدار کس قدر بڑھا ہوا ہوگا۔ اور یہاں یہ بات بھی ذکر کے قابل ہے کہ اس نے ملک کرناٹک کی فتح کا بہانہ بنا کر وہاں کے ہندوؤں کے تمام مندروں اور قدیمی عبادت خانوں کو لوٹ لیا تھا۔ اور اس طرح اپنی دولت و حشمت بے قیاس حد کو پہنچا لی تھی۔

بادشاہ گولکنڈا سے میر جملہ کی مخالفت میر جملہ کی اس طاقت و شوکت کو دیکھ کر شاہ گول کنڈا کے دل میں رشک و حسد کا پیدا ہونا ایک طبعی امر تھا چنانچہ اُس نے بڑی سرگرمی سے لیکن نہایت خفیہ اور پوشیدہ طور پر اُس کے قتل کرانے یا اپنے ہاں سے نکال دینے کی تدبیریں سوچنی شروع کیں۔ کیونکہ بجائے ایک مطیع نوکر کے وہ اب اس کو ایک خطرناک رقیب سمجھنے لگا تھا۔ اور وزیر کے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۱۔ نکلتے ہیں اور اب سے ایک سو برس پہلے تک بجز ہندوستان یا اُس کے جزیروں کے اور کسی جگہ ہیرے کی کان معلوم نہیں ہوئی تھی۔ البتہ ایک کان ۱۷۲۸ء میں ملک برازیل میں جو جنوبی امریکہ میں ہے دریافت ہوئی ہے۔ اب اس زمانہ میں بندیل کھنڈ کی بعض چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے سوا ہندوستان میں ہیرے کسی جگہ برآمد نہیں ہوتے۔ اور وہاں بھی بہت کم اور بہت چھوٹے چھوٹے نکلتے ہیں اور غیر ملکوں کا یہ حال ہے کہ افریقہ کے ایک حصہ یعنی کیپ آف گڈ ہوپ میں بھی چند سال سے ہیرے نکلنے لگے ہیں اور بڑے بڑے اور بہت کثرت سے نکلتے ہیں۔ مگر رنگت اکثر زردی مائل ہوتی ہے۔ اور ہندوستان کی پُرانی کانوں کے سفید ہیروں کے برابر خوشنما اور بیش قیمت نہیں سمجھے جاتے اور تراشنے میں بھی ویسے سخت نہیں ہیں۔ اور اگرچہ فن طب کی خواص ادویات کی عربی اور فارسی زبان کی کتابوں میں لکھا ہے کہ جزیرہ قبرص (سائپرس) اور مقدونیہ میں بھی ہیرا نکلتا تھا۔ مگر مسٹر ایڈون سٹریٹر صاحب جن کی بیش بہا کتاب سے جو خاص جواہرات کے باب میں بہت عمدہ اور حکیمانہ تحقیق سے لکھی گئی ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں ہیرا ہندوستان اور اس کے قریب کے جزائر سماٹرا اور بورنیو اور ملک برازیل واقع جنوبی افریقہ اور جزیرہ آسٹریلیا کے کوہستان یورال ہی میں نکلتا ہے۔ اور بقول ان کے صرف سفید اور زرد ہی نہیں ہوتا بلکہ سبز اور نیلا اور سرخی مائل اور داغ دار اور لوہے کے رنگ کا بھورا اور شفاف اور غیر شفاف دونوں طرح کا ہوتا ہے۔ س۔م۔ح

ق ب رس - اے ڈون س ٹ ے ٹ رس م اٹ را - ی و رال

خیر خواہ اور جاں نثار لوگوں کی وجہ سے جو اس کے گرد و پیش موجود رہتے تھے اپنے اس ارادہ کو احتیاطاً بہت مخفی رکھتا تھا۔ لیکن ایک موقعہ پر جب کہ پہلی دفعہ اس کو یہ خبر ملی کہ میر جملہ اور اس کی والدہ کے درمیان[1] صاحب حسن و جمال تھی ایک نامناسب تعلق ہے وہ عداوت جو اس کے دل میں پہلے سے تھی پوشیدہ نہ رہ سکی اور بے اختیار بول اٹھا کہ اس زبردست مجرم سے اس حرکت کا انتقام لینا ضروری ہے۔ میر جملہ اگرچہ اس وقت کرناٹک میں تھا لیکن اس سبب سے کہ دربار کے سب بڑے بڑے عہدہ دار اس کے رشتہ دار تھے۔ اس خطرناک واقعہ کی اس کو بہت جلد خبر پہنچ گئی اس لئے اس چالاک اور حیلہ ساز وزیر نے پہلے تو یہ کام کیا کہ اپنے اکلوتے بیٹے محمد امیر خاں[2] کو جو بادشاہ کی خدمت میں حاضر تھا اس مضمون کا خط لکھا کہ جس حیلہ اور بہانہ سے ممکن ہو اس مہم میں اپنے شریک ہونے کی ضرورت شدید ظاہر کرکے فوراً میرے پاس چلے آؤ۔ اور جب بادشاہ کی سخت نگرانی کی وجہ سے اس کے وہاں سے بچ کر نکل آنے سے مایوس ہوگیا تو فوراً ہی اس کے بے باک ذہن نے وہ تدبیر اختیار کی جس نے شاہ گولکنڈا کو بربادی اور تباہی کے کنارے پہنچا دیا۔ عقلمندوں نے سچ کہا ہے کہ "جو بادشاہ اپنے بھید اور مشورے پوشیدہ نہیں رکھ سکتا وہ اپنی سلطنت کو نہیں بچا سکتا"

میر جملہ اور اورنگ زیب کا گٹھ جوڑ | میر جملہ نے اورنگ زیب کو جو دولت[3] آباد میں تھا۔ اس مضمون کا عریضہ لکھا۔ کہ "میں نے بادشاہ

---

[1] یہ بات ہندوستان کی کسی فارسی زبان کی تاریخ میں راقم کی نظر سے نہیں گذری۔ س۔م۔ح

[2] صحیح نام محمد امین خاں ہے اس لئے آئندہ اس ترجمہ میں اس کو اسی نام سے لکھا جائے گا۔ س م ح

[3] اس کا قدیم نام دیوگڈھ تھا جس کو غلطی سے اکثر مسلمان مصنفوں نے دیوگیر لکھا ہے۔ چنانچہ بدرچاچ جو محمد شاہ تغلق کے دربار کا ایک مشہور شاعر تھا اپنے ایک قصیدہ میں کہتا ہے شعر "دیوگیر مخوانش کہ دولت آباد ست و کہ چار طاق در او ہست ہشت باب جناں" اور سیر المتاخرین میں لکھا ہے کہ راجہ بھوج کے زمانہ میں اس کا نام دھاڑا نگری تھا بہرحال محمد شاہ تغلق نے جو ۲۹؁۷ھ میں ہندوستان کے تخت پر بیٹھا تھا، جب اس کو ہندوؤں سے فتح کیا تو دولت آباد نام رکھدیا جس کے قریب گوداوری کے کنارے اورنگ زیب نے اپنی حکومت دکن کے زمانہ میں اورنگ آباد بسایا جو خجستہ بنیاد اورنگ آباد کے نام سے سرکاری کاغذات میں لکھا جاتا تھا۔ ہمارے اس زمانہ میں اگرچہ دولت آباد کی نمود باقی ہے مگر حاکم جانشین کا مقام اورنگ آباد ہی ہے۔ جہاں ریاست حیدرآباد کی طرف سے ایک حاکم صدر تعلقہ دار کے لقب سے رہتا ہے۔ س۔م۔ح

گول کنڈا کی جو جو خدمات انجام دی ہیں ان کو سارا زمانہ جانتا ہے۔ لیکن بجائے اس کے کہ وہ میرا ممنون ہوتا میری اور میرے خاندان کی بربادی اور بیخ کنی کی فکر میں لگا ہوا ہے۔ اس لئے میں آپ کی پناہ لینا اور آپ کے حضور میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ اور اس درخواست کی قبولیت کے شکرانہ میں کہ جس کی پذیرائی کی آپ کی جانب سے کامل اُمید ہے ایک منصوبہ پیش کرتا ہوں کہ جس کے ذریعہ سے آپ بآسانی اس بادشاہ کو گرفتار کرکے اُس کے ملک پر قبضہ کر سکیں گے۔ آپ میرے اس وعدہ کی سچائی پر اعتبار اور بھروسہ فرمائیں۔ اور یہ مہم انشاء اللہ نہ تو کچھ مشکل ہی ہوگی اور نہ کچھ خطرناک ہی۔ آپ پانچ چار ہزار چیدہ سواروں کے ساتھ بہت جلد اور بلا توقف کوچ کرتے ہوئے گول کنڈا کی طرف چلے آئیں جس میں صرف سولہ دن لگیں گے۔ اور یہ مشہور کر دیں کہ شاہجہاں کا سفیر شاہ گول کنڈا سے بعض ضروری معاملات میں گفتگو کرنے کے لئے بھاگ نگر[1] جاتا ہے اور یہ فوج اُس کی اردلی میں ہے۔ اور چونکہ "دبیر" جس کے توسط سے ہمیشہ ایسے اُمور کی اطلاع بادشاہ کو ہوا کرتی ہے۔ میرا قریبی رشتہ دار ہے اور اُس پر مجھے کامل بھروسہ ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایک ایسا حکم جاری ہو جائے گا کہ جس کی وجہ سے کوئی شک و شبہ پیدا ہوئے بغیر آپ بھاگ نگر کے دروازہ پر پہنچ جائیں گے اور گول کنڈا والے آپ کو سفیر کے سوا کوئی اور شخص نہ سمجھیں گے۔ پس جب بادشاہ معمول کے مطابق شاہی فرمان کے استقبال کے لئے سفیر کے پاس آئے۔ تو آپ اُس کو بآسانی پکڑ کر جو کچھ مناسب جانیں اُس کی نسبت تجویز کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس مہم کا کل خرچہ میں آپ کو دوں گا اور

[1] صاحب تاریخ فرشتہ نے لکھا ہے کہ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے جس کے ہاں ایک ہزار کسبیاں ناچنے گانے کے لئے نوکر تھیں نو سو پچاس ہجری سے کچھ پہلے اپنی معشوقہ بھاگ متی کے نام پر جو انھیں میں سے ایک پاتر یعنی ہندو کسبی تھی۔ بھاگ نگر آباد کیا تھا۔ لیکن پھر کچھ پشیمان ہو کر یہ نام بدل دیا اور حیدر آباد نام رکھدیا" مگر اب ہمارے اس زمانہ میں وہ پہلا نام بالکل محو ہو گیا ہے۔ اور صرف حیدرآباد ہی مشہور ہے اور گول کنڈا کا قلعہ بھی اب تک قائم ہے اور دونوں ریاست حیدرآباد دکن کے قبضہ میں ہیں جو اس وقت ہندوستانی ریاستوں میں سب سے بڑی اور سلطنت مغلیہ کے طرز نظم و نسق اور طور و طریق کا گویا ایک نمونہ ہے اور جس کا رقبہ بہ جب بیان مسٹر طالبوئیس ہیلر صاحب مولفہ تاریخ جلسہ قیصری واقع دہلی تقریباً اٹھانوے ہزار میل مربع اور آبادی تقریباً نوے لاکھ اور آمدنی تین کروڑ اکتیس لاکھ ہے اور جو محمد شاہ بادشاہ دہلی کے عہد سے نواب نظام الملک آصف جاہ بہادر صوبہ دار دکن کی اولاد کے قبضہ میں چلی آتی ہے۔

اس کے اختتام تک پچاس ہزار روپیہ روز دیتا رہوں گا۔"

اورنگ زیب کی گولکنڈہ روانگی

اورنگ زیب جو ہمیشہ ایسے ہی منصوبوں میں لگا رہتا تھا میر جملہ کی استدعا کے موافق فوراً تیاری کر کے گول کنڈا کی طرف چل کھڑا ہوا اور ایسی ہوشیاری سے اس تدبیر کو بجالایا کہ بھاگ نگر پہنچ گیا اور کسی نے نہ جانا کہ یہ زبردست فوج سفیر کی ہم رکابی کے سوا کسی اور مقصد سے آئی ہے۔ یہاں تک کہ بادشاہ اس دستور کے موافق جو ایسے سفیروں کی آمد سے متعلق مقرر تھا اس مصنوعی ایلچی کی ملاقات کے واسطے اپنے باغ سے سوار ہو کر روانہ ہوا۔ مگر وہ جب بغیر کسی وسوسے کے اپنے دغاباز دشمن کی طرف جارہا تھا اور قریب تھا کہ اس تدبیر کے بموجب جو پہلے سے گانٹھی ہوئی تھی اس کو دس بارہ غلام گرفتار کرلیں اور اورنگ زیب کا منصوبہ چل جائے اس کی خوش قسمتی سے ایک امیر نے جو اس راز سے واقف اور اس میں شریک تھا ناگہاں پشیمانی اور ترحم کی وجہ سے چلا کر کہہ دیا کہ "جہاں پناہ جھٹ پٹ نکل جائیے ورنہ آپ پھنس جائیں گے یہ اورنگ زیب ہے ایلچی نہیں" اس موقعہ پر بادشاہ کو جو حیرانی اور پریشانی لاحق ہوئی اس کا کیا کہنا، پس وہ گھوڑے پر سوار ہو کر بگٹٹ قلعہ گولکنڈا کی طرف جو اس کی معمولی قیام گاہ بھاگ نگر سے صرف ایک فرسنگ کے قریب تھا بھاگا اور اس میں جا داخل ہوا[1]۔

---

[1] عاقل خاں نے اس واقعہ کو یوں لکھا ہے کہ جب میر جملہ نے اپنے آقا کو ناراض دیکھا تو اورنگ زیب سے مدد چاہی۔ اس نے شاہجہاں کو اطلاع دی وہاں سے فرمان صادر ہوا کہ جس طرح ہو سکے اس کو عبداللہ قطب شاہ کے ہاتھ سے بچا کر ہمارے پاس بھیج دو۔ اس حکم کے آنے پر اورنگ زیب نے اس مضمون کا ایک نشان (اس وقت کی اصطلاح میں بادشاہوں کی تحریر کو "فرمان" اور شاہزادوں کی تحریر کو "نشان" کہتے تھے) قطب شاہ کے نام لکھا کہ محمد سلطان اپنے چچا شجاع کے پاس اڑیسہ کی راہ سے بنگالہ کو جانا چاہتا ہے (کیونکہ بقول الفنسٹن صاحب راستہ کی صورت یہ تھی کہ اورنگ آباد سے بنگالہ کو پہلی پٹن کے پاس اس طرح چکر کھا کر جاتا تھا کہ گونڈوانہ کے جنگل بیچ میں نہ پڑیں حاصل یہ کہ اورنگ زیب کی راہ گول کنڈا کے دارالسلطنت بھاگ نگر سے تھوڑے فاصلہ پر رہ جاتی تھی)، آپ خاطرداری سے اپنے ملک سے گذر کرادیں اب اُدھر وہ بیچارہ تو اس پیغام کو واقعی سمجھ کر مہمانداری اور خاطر تواضع کی تیاری میں مصروف ہوا اور ادھر محمد سلطان لڑائی کے ساز و سامان سے خوب درست ہو کر کوچ بہ کوچ روانہ ہوا اور اس کے پیچھے پیچھے خود حضرت بھی چل کھڑے ہوئے اور قطب الملک کو اس

گولکنڈے کا محاصرہ

اورنگ زیب اگرچہ اپنے شکار سے ناامید ہو گیا۔ لیکن اُس نے خیال کیا کہ اب ڈرنے کا موقعہ نہیں ہے بلا خوف و خطر اس کی گرفتاری کے واسطے کوشش اور تدبیر جاری رکھنی چاہیے۔ پس سب سے پہلے یہ کام کیا کہ بھاگ نگر کے تمام شاہی محلوں کو لوٹ لیا۔ اور کل قیمتی اور بیش بہا اجناس و اسباب پر قبضہ کر لیا[1] لیکن محل کی عورتوں کو مشرقی بادشاہوں کے دستور کے مطابق

بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۵۔ قریب کی اُس وقت خبر ہوئی کہ جب محمد سلطان بھاگ نگر کے بہت قریب جا پہنچا اور وہ نہایت سراسیمگی اور اضطراب کی حالت میں بقدر گنجائش وقت جو کچھ جواہرات اور عمدہ چیزیں ساتھ لے سکا لے کر گرتا پڑتا قلعہ حیدر آباد یعنی گولکنڈا میں جا داخل ہوا۔ اور یہ مصیبت ایسی ناگہانی تھی کہ مارے گھبراہٹ کے اُس کی بیگمیں بیچاری پا پیادہ بلکہ ننگے سر اور ننگے پاؤں بھاگ کر قلعہ میں پہنچیں۔ اور محمد سلطان نے آکر بھاگ نگر پر قبضہ کر لیا اور بعض مورخوں نے صرف اتنا ہی لکھدیا ہے کہ پہلے قاضی عارف کشمیری کو اورنگ زیب نے قطب شاہ کے پاس میر جملہ کے باعزت و آبرو رخصت کر دینے کے لئے مع فرمان شاہی بھیجا تھا ابھی وہ پہنچنے نہیں پایا تھا کہ قطب شاہ نے میر جملہ کے بیٹے محمد امین خاں کو قید کر کے اُن کا مال و اسباب ضبط کر لیا۔ اور اس سبب سے شاہجہاں کی طرف سے اُس کے نام ایک اور خفگی آمیز فرمان جاری ہوا اور اورنگ زیب کے نام حکم صادر ہوا کہ اگر قطب شاہ ارشاد شاہی کی تعمیل میں توقف کرے تو اس کو سزا دو اس حکم کے آنے پر اورنگ زیب آگے آگے محمد سلطان کو روانہ کر کے پیچھے سے خود بھی چل پڑا اور چونکہ قطب شاہ کے لوگوں کی طرف سے محمد سلطان کے بھاگ نگر پہنچ جانے کے بعد کچھ "حرکات شوخی" ظہور میں آئی تھیں اسی سبب سے محمد سلطان اور اورنگ زیب نے بھاگ نگر کو تاخت و تاراج کر کے گولکنڈا کو گھیر لیا تھا۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان مورخوں نے اورنگ زیب کی ان دھوکے بازی کی چالوں کا ذکر جن کا حال برنی‌ئر اور عاقل خاں نے لکھا ہے دانستہ چھوڑ دیا ہے۔ س م ح ۱۲

[1] عاقل خاں اس لوٹ کی نسبت یہ لکھتا ہے "کہ شاہزادہ فیروزمند (محمد سلطان) درکمال عظمت و استقلال بہ بھاگ نگر درآمدہ رایت اقتدار برافراشت و اکثر کارخانجات و بیوتات قطب الملک عرض نہب و غارت ساخت و کتب نفیسہ و چینی آلات و دیگر اشیا و اجناس افزوں از اندازہ شمار و قیاس بہ سرکار سلطنت رسید و از عقب مندگان حضرت جہاں پناہ (اورنگ زیب) بدولت و اقبال تشریف آوردہ طنطنۂ عظمت و جلال آنحضرت در زمین و زماں پیچیدہ بسیارے از اسباب و آلات غریبہ کہ از تحف روزگار بود از اموال قطب الملک بسرکار عالم مدار ضبط شد۔ کثرت و افزونی ذخائر و اشیا و اسباب مواد مکنت و ثروت آں دولتمند (قطب الملک) بمرتبہ بود کہ بعد از کوچ فرمودن ہمچنان خانہا و مخزنہا مالامال گذاشتند و اصلاً محسوس نمی شد کہ دست کسے بایں خزائن و ذخائر رسیدہ باشد و نقصے دراں راہ یافتہ و حالانکہ ازیں جہت در سرکار سلطنت سامانِ ثروت و سرانجام مکنت پدید آمد" س م ح

بڑی حفاظت سے بادشاہ کے پاس بھیج دیا۔ اگرچہ توپوں کے نہ ہونے کے سبب سے ناچار تھا۔ مگر تاہم یہی ٹھان لیا کہ قلعہ کا محاصرہ کرنا چاہیے کیونکہ اس صورت میں بادشاہ کو رسد وغیرہ کے نہ پہنچنے کے سبب سے دیر تک بچاؤ کرنا مشکل ہوگا۔ لیکن محاصرہ سے دو مہینے بعد شاہجہاں کی طرف سے اس مضمون کا قطعی حکم پہنچا کہ ہم سے ہاتھ اٹھا کر بلا توقف دکن کو لوٹ جاؤ اُس کو بخوبی علم تھا کہ یہ حکم دارا شکوہ اور بیگم صاحب کی تحریک و ترغیب سے صادر ہوا ہے (کیونکہ دوراندیشی اور عاقبت بینی سے اُن کو یہ خیال ہوگیا تھا کہ اگر اورنگ زیب کو بادشاہ گولکنڈا کی نسبت اپنے منصوبوں کے عمل میں لانے کی اجازت مل جائے گی تو وہ بہت زبردست ہو جائے گا) اور اس وجہ سے دل ہی دل میں بہت پیچ و تاب کھایا۔ لیکن نہایت درجہ اطاعت دکھانے کی غرض سے حکم کی تعمیل کو مقدم رکھا مگر محاصرہ اٹھا لینے سے پہلے فوج کشی کے اخراجات کا ایک بڑا معاوضہ اور حرجانہ شاہ گولکنڈا سے وصول کیا اور یہ عہد و پیمان لیا کہ میر جملہ کو اپنے خاندان اور مال و اسباب اور فوج سمیت صحیح سلامت چلے جانے کی اجازت دی جائے اور گولکنڈا کے روپیہ پر شاہجہاں کا سکہ لگا کرے اس کے علاوہ محمد سلطان[1] کی شادی بادشاہ کی بڑی بیٹی سے کرلی۔ اور جبراً یہ وعدہ بھی لیا کہ شاہزادہ موصوف اب سے سلطنت گولکنڈا کا ولی عہد[2] سمجھا جائے گا اور جہیز میں رام گڈھ کا قلعہ بھی معہ اُس کے تمام توابع اور متعلقات کے لے لیا۔

قلعہ بیدر کی فتح اورنگ زیب نے دکن کو واپس جاتے ہوتے میر جملہ کے اتفاق سے جو اُس کی پناہ میں آچکا تھا اول[3] بیدر کے قلعہ کو جو بیجاپور کے ملک میں ایک مستحکم جگہ ہے گھیر کر فتح کر لیا۔ اور پھر دونوں دولت آباد پہنچ کر اتحاد اور محبت کے ساتھ رہنے اور آیندہ شوکت و عظمت کے لئے بڑے بڑے منصوبے باندھنے لگے۔ چنانچہ اِن کے اِس اتفاق کو ہندوستان کی تاریخ میں ایک اہم اور قابل یادگار واقعہ سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ اورنگ زیب کو شہرت عظمت اور سلطنت جو کچھ حاصل ہوا وہ سب اسی اتفاق کی بدولت تھا۔

---

[1] اصل کتاب میں غلطی سے جابجا اس کو سلطان محمود لکھا ہے اور صحیح نام محمد سلطان ہے۔ س م ح

[2] ماثر خاں اور خافی خاں نے اس شرط اور سکہ جاری کرنے کی شرط کا ذکر نہیں لکھا۔ س م ح

[3] فارسی کتابوں میں اکثر اس قلعہ کا نام بے در (بے دروازہ) لکھا ہے۔ س م ح۔

دولت آباد پہنچتے ہی میر جملہ نے اپنی حسنِ تدبیر سے ایسے منصوبے تیار کئے کہ شاہجہاں کی طرف سے حاضرِ دربار ہونے کے لئے متواتر پیغام پہنچے اور آخرکار وہ پاتے تخت آگرہ میں جا پہنچا۔ اور بادشاہ کے لئے نہایت عجیب و غریب پیش کش اپنے ساتھ لایا۔ کیونکہ اُس کو اُمید تھی کہ اس ذریعہ سے شاہجہاں کو گولکنڈا اور بیجاپور اور پرتگیزوں سے لڑائی شروع کر دینے کی ترغیب دے سکوں گا۔ چنانچہ جب دربار میں حاضر ہوا تو وہ الماس نذر کیا جو مقدار اور خوبصورتی میں عموماً بے نظیر سمجھا جاتا ہے اور گولکنڈا کی فتح کے بہت سے فوائد بیان کئے اور عرض کیا کہ گولکنڈا کے جواہرات قندھار کے پتھروں اور چٹانوں کی بہ نسبت جہاں حضور آج کل مہم روانہ کرنا چاہتے ہیں، یقیناً زیادہ لحاظ اور شاہانہ توجہ کے قابل ہیں۔ اور یہ بھی گذارش کی کہ حضور کو گولکنڈا کی سمت میں اپنی جنگی تدبیریں اُس وقت تک کہ تمام ملک راس کماری تک فتح نہ ہو جائے برابر جاری رکھنی چاہئیں[1]۔

کچھ بعید نہیں کہ ہیروں کے لالچ نے شاہجہاں کے دل پر یہ تاثیر کی ہو کہ اُس نے میر جملہ کی تجویزوں کو قبول کر لیا۔ لیکن اکثر لوگوں کی رائے یہ ہے کہ اصل میں شاہجہاں نے اس مہم میں نئی فوج کی بھرتی کو دارا شکوہ کی روز افزوں بے ادبیوں کی روک تھام کے لئے ایک معقول بہانہ سمجھا اور میر جملہ کی صلاح مان لی تھی۔ بہرحال شاہجہاں کا کچھ ہی مطلب و مدعا ہو مگر اُس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ دکن کی طرف ایک فوج میر جملہ کی سپہ سالاری میں بھیجی جائے۔

دارا شکوہ سے شاہجہاں کی خفگی کے اسباب دارا شکوہ سے شاہجہاں کے ناراض ہو جانے کی وجہ یہ تھی کہ اُس نے خود سر اور مختار مطلق بن جانے کے لئے ان دنوں بعض علانیہ کوششیں کی تھیں بلکہ ایک ایسی حرکت کی تھی کہ جس کے باعث شاہجہاں کو اس سے سخت نفرت اور خوف ہو گیا تھا۔ اور اُس کی اِس خطا کے معاف کرنے پہ مائل نہ تھا یعنی سعد اللہ خاں کو جسے شاہجہاں تمام ممالک ایشیا میں ایک بڑا ہی قابل اور لائق وزیر سمجھتا تھا اور جس سے اس قدر الفت رکھتا تھا کہ تمام دربار میں اُس کی محبت ضرب المثل ہو گئی تھی مروا ڈالا تھا۔ معلوم نہیں کہ وہ کیا جرم تھا جس کے سبب سے دارا شکوہ نے اُسے واجب القتل تصور کیا۔ اس کا یہ خیال ہو گا کہ شاہجہاں

[1] گولکنڈا اور بیجاپور کے بادشاہوں کا حال اس کتاب کے خاتمہ کے قریب متن اور حاشیہ میں دیکھنا چاہیئے س م ح

کے گذر جانے پر اپنے اقتدار کی وجہ سے یہ امر اس کے اختیار میں ہوگا کہ جسے چاہے تخت پر بٹھا دے۔ یا بادشاہت کا تاج سلطان شجاع کے سر پر رکھدے۔ کیونکہ وہ اُس کا حامی اور طرفدار معلوم ہوتا تھا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اُس کے دل میں لوگوں کی بعض افواہوں نے جو سعد اللہ خاں کے ارادوں کی نسبت مشہور تھیں اثر کیا ہو۔ مگر اس کے ساتھ یہ امر بھی غور کے قابل ہے سعد اللہ خاں جو نسل کے اعتبار سے ایک ہندی الاصل شخص[1] تھا۔

---

[1] سعد اللہ خاں کو عہد شاہجہاں کے مورخوں میں سے بعض نے لاہور اور بعض نے چنیوٹ کا رہنے والا بیان کیا ہے جو پنجاب کے ضلع جھنگ میں ایک پرانا قصبہ ہے۔ لیکن میرے ایک دوست جو جھنگ کے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہیں بعد تحقیق یہ لکھتے ہیں کہ اصل میں وہ پتراکی کا رہنے والا تھا۔ جو چنیوٹ سے پانچ کوس شمال کی طرف ایک موضع ہے۔ مگر اپنے ایام امارت میں اُس نے چنیوٹ کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ اگرچہ اس ملک میں اُس کی اولاد میں سے کوئی نہیں ہے مگر اُس کی بنائی ہوئی ایک بہت عالی شان مسجد اور اُس کے محلوں کے کھنڈر چنیوٹ میں موجود ہیں۔ اس کے زمانہ کے مورخوں نے اُس کی قومیت کا کچھ ذکر نہیں لکھا البتہ خافی خاں نے اُس کو شیخ سعد اللہ خاں لکھا ہے جو ہندوستان میں اکثر نومسلم لوگوں کو یہی کہا اور بولا جاتا ہے مگر اس کے وطن داروں کا یہ بیان ہے کہ وہ تہیم تھا جو ایک ایسی قوم ہے کہ وہاں کی مسجدوں اور مکتبوں کے مُلّا اکثر اسی ذات کے ہوتے ہیں۔ اگرچہ میرے نزدیک تو ظن غالب یہی ہے کہ یہ کوئی ہندی الاصل قوم ہے۔ مگر چونکہ ان کے میراسی ان کے سلسلہ نسب میں کچھ عجیب و غریب نام بیان کرکے پھر اُس کو کھینچ تان کر ملک عرب تک پہنچاتے ہیں۔ اس لئے میرے ایک اور دوست جو بالفعل خاص چنیوٹ کی منصفی کے عہدہ پر مامور ہیں اور جنھوں نے براہ مہربانی تکلیف فرما کر میری خواہش کے موافق اس کی تحقیق کی تھی یہ خیال کرتے ہیں کہ شاید یہ لفظ تمیم کی خرابی ہو جو عرب کے مشہور قبیلہ بنی تمیم کے نام کا ایک جزو ہے۔ اور ان گنواروں نے اپنی جہالت اور بے علمی کی وجہ جو فی زماننا ان اضلاع میں عموماً ہے بگاڑ کر اور اُس میں سے ایک لفظ حذف کرکے تہیم بنا لیا ہو۔ سعد اللہ خاں جو لاہور میں تحصیل علوم کے سبب سے ملا سعد اللہ لاہوری کے نام سے معروف تھا۔ ۱۰۵۰ھ میں شاہجہاں کے جلوس کے چودھویں سال کے شروع میں سید موسوی خاں صدر یعنی وزیر اوقاف کی سفارش سے بادشاہ کے حضور میں پہنچا تھا۔ مگر چار ہی برس کے اندر اپنی لیاقت اور کمال کی وجہ سے ہندوستان کا وزیر اعظم بن گیا۔ اور ساتویں برس ہفت ہزاری کے منصب پر جس سے بڑا کوئی اس وقت تک منصب نہ تھا فائز ہوا۔ اور شاہجہاں کے مزاج میں یہاں تک دخل پایا اور اعتماد حاصل کیا کہ کوئی چھوٹا یا بڑا کام اس کی رائے بغیر ہونا دشوار تھا اور مرتے دم تک اسی اعتماد اور اقتدار کے ساتھ اپنے عہدہ پر قائم رہا۔ عام ح

اُس سے ایرانی اُمرا کو بڑا حسد تھا چنانچہ اُن افواہوں میں سے جو اُس کی نسبت اُڑادی گئی تھیں ایک افواہ یہ تھی کہ اُس نے یہ منصوبہ باندھ رکھا ہے شاہجہاں کی وفات کے بعد اولادِ تیمور کو تخت سے محروم کرکے یا تو پٹھانوں[1] کے شاہی خاندان کو پھر قائم کرے گا یا خود تخت نشین ہو جائے گا یا اپنے بیٹے کو بادشاہ بنائے گا اور اس افواہ کی تائید کے لئے یہ قرینہ تھا کہ سعد اللہ خاں کی بیوی قوم کی پٹھانی تھی اور ایک یہ بات بھی گھڑی گئی تھی کہ اُس نے پٹھانوں کے کئی مستعد دستے اپنے منصوبہ کی تائید کے واسطے متفرق مقامات میں لگا رکھے ہیں[2]

گولکنڈہ پر فوج کشی کی شرائط

دارا شکوہ خوب جانتا تھا کہ یہ بڑی فوج جو دکن کو بھیجی جارہی ہے اس سے اورنگ زیب کی طاقت بڑھ جائے گی۔ اس لئے اُس نے اس معاملہ میں بہت کچھ بحث مباحثہ کیا۔ اور ہر حکمت اور حیلہ سے جو اُس سے بن سکا اس منصوبہ کو روکنا چاہا لیکن جب دیکھا کہ بادشاہ کو اس سے باز رکھنا نا ممکن ہے تو آخر کار کچھ سمجھا بجھا کر یہ شرطیں مقرر کرا دیں۔

اول یہ کہ اورنگ زیب اس معرکہ میں کسی قسم کا دخل نہ دے۔

---

[1] شیر شاہ کا خاندان مراد ہے جس نے شاہجہاں کے پردادا ہمایوں کو ہندوستان سے مار کر نکال دیا تھا اور خود بادشاہ بن بیٹھا تھا۔ س م ح

[2] ان افواہوں اور دارا شکوہ کے سعد اللہ خاں کو مروا ڈالنے کا ذکر اورنگ زیب کے طرفدار مورخوں میں سے کسی نے بھی نہیں کیا حالانکہ دارا شکوہ کی کسی برائی کا چھپانا اُن کے مدعا کے خلاف تھا بلکہ سب نے سیدھے اور صاف طور سے اُس کا مرنا قولنج کے مرض سے بیان کیا ہے جس میں وہ کئی مہینے تک مبتلا رہ کر ۱۰۶۶ھ میں سینتالیس برس کی عمر میں مرا تھا۔ اور حکیم داؤد مخاطب بہ تقرب خاں شاہجہاں کا طبیب خاص اس کا معالج تھا اور لکھا ہے کہ خود بادشاہ کئی بار اُس کی عیادت کو گیا تھا۔ اور خافی خاں نے اگرچہ اُس کی نسبت دارا شکوہ کے نہایت درجہ رشک و حسد اور بیجا پیکار دشمنوں کا ذکر کیا ہے لیکن یہ صاف لکھا ہے کہ باوجود قرب ولی عہدی اور اختیار سلطنت کے سعد اللہ خاں کے مرتے دم تک اُس کی جان یا آبرو کو ضرر نہیں پہنچا سکا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اکثر ایشیائی اہلِ دربار کی عادت ہے کہ کسی اپنی ناجائز غرض سے کسی بڑے آدمی کی موت کو اکثر زہر وغیرہ سے منسوب کر دیا کرتے ہیں اسی طرح یہ شہرت ہو گئی ہو گی جس کو برنیئر نے اجنبی ہونے اور اس ملک کے لوگوں کی عادت سے بخوبی واقف نہ ہونے کی وجہ سے سچ سمجھ کر لکھ ڈالا اور غالباً یہی وجہ ہو گی کہ الفنسٹن صاحب نے اپنی تاریخ ہندوستان میں باوجودیکہ جابجا برنیئر کی تحریر کے حوالے سے اکثر باتیں درج کی ہیں اُس کی اس روایت کا ذکر نہیں کیا۔ س م ح

دوسرے یہ کہ وہ اپنا قیام بالکل دولت آباد میں رکھے۔

تیسرے یہ کہ جو ملک اُس کے سپرد ہے اُس کے نظم ونسق کے سوا اورنگ زیب کو اس مہم سے کچھ سروکار نہ ہوگا۔

چوتھے یہ کہ فوج کی سپہ سالاری وحکومت اور جزو کل کا اختیار صرف میر جملہ کے ہاتھ میں رہے مگر وہ تمام اپنے اہل وعیال کو اپنی وفاداری کی کفالت کے طور پر دربار میں چھوڑ جائے۔

یہ پچھلی بات اگرچہ میر جملہ کو نہایت ناگوار تھی لیکن شاہجہاں نے یہ سمجھا کر راضی کر لیا کہ یہ صرف دارا شکوہ کی خوشی خاطر اور رفع وساوس کے لئے ہے۔ اور بخوبی مطمئن کر دیا کہ تمھارے اہل وعیال عنقریب تم سے آملیں گے۔ الغرض میر جملہ اس جرار فوج کا سپہ سالار بن کر دکن کی طرف روانہ ہوا۔ اور وہاں سے بلا توقف کوچ کر کے بیجاپور کے ملک میں جا داخل ہوا۔ اور کلیانی کا محاصرہ شروع کر دیا جو ایک بڑی مضبوط اور مستحکم جگہ ہے[۱]۔

---

[۱] ان واقعات کو عاقل خاں اور خافی خاں نے جس طرح پر بیان کیا ہے اُس کا ماحصل یہ ہے کہ میر جملہ جب اورنگ زیب کے پاس پہنچ گیا تو شاہجہاں نے اس کو وہیں معظم خاں کا خطاب اور پنج ہزاری کا منصب اور ایک بڑا بھاری خلعت عطا فرما کر حضور میں طلب فرمایا اور ۱۰۶۶ھ میں جب مقام شاہجہاں آباد حاضر ہوا تو اسد خاں بخشی نے استقبال کیا اور اُسے حضور میں لایا اور اُس نے ایک خوان اشرفیوں کا اور دو خوان جواہرات کے اور اور عمدہ عمدہ چیزیں نذر گذرانیں اور چونکہ سعد اللہ خاں کے انھیں دنوں میں انتقال کر جانے کے سبب سے وزارت خالی تھی اس لئے اس عہدہ کا مرصع قلمدان چھ ہزاری چھ ہزار سوار کا منصب اور خلعت خاص با شمشیر مرصع اور شاہی گھوڑوں اور ہاتھیوں میں سے دو سو گھوڑے اور ایک ہاتھی اور ایک ہتنی مع سونے چاندی کے ساز کے اور پانچ لاکھ روپیہ عنایت ہوا اور بقول صاحب سیر المتاخرین خطاب میں لفظ عمدۃ الملک بھی بڑھا گیا۔ مگر چونکہ اُس نے دکن میں نشو ونما پائی تھی اور وہاں کی آب وہوا کا خوگر تھا اور اس کے اور اورنگ زیب کے باہم آئندہ کے منصوبوں کی نسبت بھی کئی طرح کے مخفی عہد و پیمان تھے۔ اس لئے ہمیشہ واپس جانے کی تدبیریں سوچتا رہتا تھا۔ اب حسن اتفاق سے جو بیجاپور کے بادشاہ علی عادل شاہ نے لاولد قضا کی اور اورنگ زیب نے باپ کو اطلاع دی کہ لوگوں نے سکندر نامی ایک مجہول النسب لڑکے کو جس کو عادل شاہ نے فرزند کے طور پر پالا تھا تخت پر بٹھا دیا ہے تو شاہجہاں نے بھی اورنگ زیب کو بیجاپور پر فوج کشی کا حکم دیدیا اور اُس کے مہم سے واپس آنے تک شایستہ خاں کو دولت آباد پہنچ کر صوبہ داری کا کام کرنے کی ہدایت ہوئی میر جملہ نے موقعہ دیکھکر ایک بڑی بھاری پیش کش (جس کی کل قیمت پندرہ لاکھ روپیہ جانچی گئی تھی) اور جس میں دو سو

شاہجہاں کی بیماری

اس وقت جب کہ سلطنت کا یہ نقشہ تھا اور شاہجہاں کی عمر ستر سے تجاوز کر چکی تھی وہ ایسی بیماری میں[۱] مبتلا ہو گیا جس کی حقیقت کا بیان کرنا مناسب نہیں ہے۔ اور صرف اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ ایک ایسی عمر کے آدمی کے لئے یہ بہت نازیبا ہے کہ احتیاط کے ساتھ حفاظت کرنے کے بجائے اپنی باقی ماندہ طاقت اور توانائی کبھی برباد اور تلف کر دے۔

بادشاہ کی اس بیماری سے تمام قلمرو میں ایک سخت پریشانی اور تہلکہ پڑ گیا چنانچہ دہلی اور آگرہ میں جو پائے تخت سلطنت ہیں۔ داراشکوہ نے ایک بڑی زبردست فوج جمع کی اور بنگالہ میں شجاع نے ایسی ہی تیاریاں کیں اُدھر دکن اور گجرات میں اورنگ زیب اور مراد بخش نے ایسی فوجیں بھرتی کیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان کا کیا ارادہ ہے۔ اور چاروں نے ہر طرف سے اپنے رفیق اور مددگار بلا کر جمع کئے اور ادھر اُدھر خط لکھ بھیجے اور ر

بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۲۔ رتی وزن اور دو لاکھ سولہ ہزار روپیہ قیمت کا ایک ہیرا اور چار ہتنیاں اور ساٹھ ہاتھی سونے کے ساز کے اور سولہ ہتھیاں چاندی کے ساز کی تھیں گذرانی۔ اور عرض کیا کہ بیجاپور کیا بلکہ دکن کا تمام ملک آسانی کے ساتھ فتح ہو سکتا ہے۔ اور اس کا ذمہ میں لیتا ہوں اور اس طرح مہابت خاں اور راو ستر سال وشاہنواز خاں و نجابت خاں وغیرہ کمکی امیروں کے ہمراہ بیس ہزار مغل اور راجپوت فوج کا سپہ سالار بن کر رخصت ہوا تاکہ اورنگ زیب کے تحت اس مہم کو سرانجام دے اور محمد امین خاں کو حکم ہوا کہ باپ کی جگہ وزارت کا کام باتفاق رائے رایاں رگھناتھ نائب وزیر انجام دیتا رہے۔ میر جملہ اورنگ آباد پہنچا اور وہاں سے معہ اورنگ زیب کے بیجاپور کے ملک پر چڑھائی کر دی۔ اور کلیانی اور دوسرے قلعوں کو جا گھیرا۔ ایم ع

[۱] مترجم انگریزی نے حاشیہ میں بحوالہ تحریر کرنل ڈو صاحب یہ لکھا ہے کہ شاہجہاں کی طاقت و توانائی میں بسبب افراط و بے ہنگام شوق عیاشی کے نہایت خلل آ گیا تھا چنانچہ اسی سبب سے سترھویں ستمبر ۱۶۵۷ء کو ناگہاں اسے فالج ہو گیا اور اس کے ساتھ سوزاک کا بھی خلل تھا اور کئی دن تک حالت بیہوشی اس پر طاری رہی تھی مگر فارسی کتابوں سے فالج کا ہونا غلط معلوم ہوتا ہے اور ان کتابوں میں یوں لکھا ہے کہ شروع ماہ ذی الحجہ ۱۰۶۷ھ کو بمقام دہلی ستر سٹھ برس کی عمر میں شاہجہاں کا پیشاب بند ہو گیا اور اعضائے اسفل پر ورم ہو کر ایک ہفتہ تک نہایت سخت بیمار رہا اور کچھ تخفیف ہو گئی تھی کہ اسی حالت میں داراشکوہ اپنے بھائیوں کے منصوبوں کے روکنے کے واسطے دہلی کی بہ نسبت اکبر آباد کو ایک بہتر مقام سمجھ کر بسواری کشتی اس کو وہاں لے گیا۔ اور اگرچہ یہ سفر ایک مہینے میں ختم ہوا مگر مرض میں بھی بہت کچھ افاقہ ہو گیا۔ ص م ح

بڑے بڑے وعدے اور عہد و پیمان کئے اور طرح طرح کی بندشیں اور سازشیں کرنی شروع کیں۔

سازشی خطوط اگرچہ دارا شکوہ نے ان سازشوں کے تحریری ثبوت باپ کو دکھائے اور بھائیوں کی سخت شکایتیں کیں۔ اور بیگم صاحب نے بھی موقع دیکھ کر بہت سا لگائو بجھائو کیا۔ لیکن بادشاہ کو دارا شکوہ پر بالکل اعتبار نہ تھا یہاں تک کہ اُسے کامل شبہ تھا کہ وہ اُسے زہر دلوانے کی فکر میں ہے اور اس سبب سے کھانے پینے میں بہت ہی احتیاط برتتا تھا۔ بلکہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اُس نے اورنگ زیب سے بھی کچھ خط و کتابت کی تھی جس کی خبر پا کر اور طیش میں آ کر دارا شکوہ نے باپ کو بہت دھمکایا تھا۔

بادشاہ کے انتقال کی افواہ اس عرصہ میں بادشاہ کی علالت اس قدر بڑھ گئی کہ اُس کے مرنے کی افواہ اُڑ گئی۔ اور تمام دربار درہم و برہم ہو گیا۔ اور آگرہ میں یہاں تک خوف و خطر پھیلا کہ بازاروں میں کئی روز تک ہڑتال رہی اور چاروں شاہزادے علانیہ کھُل کھیلنے لگے۔ اور صاف کہہ دیا کہ اب اس مقدمہ کا فیصلہ صرف تلوار ہی سے ہو گا اور واقعی ان کا اپنے اس ارادہ سے دست بردار ہونا مشکل بھی تھا کیونکہ فتح یابی کی حالت میں تو تخت کی امید تھی اور شکست کی صورت میں جان جانے کا یقین کلی تھا اور اب صرف دو ہی باتیں تھیں، یا موت یا سلطنت، اور جس طرح شاہجہاں[1] خاص اپنے بھائیوں کے خون سے ہاتھ رنگ کر تخت نشین ہوا تھا اُسی طرح ان کو یقین واثق تھا کہ اگر ہم

[1] جب ۱۰۳۷ھ میں کشمیر سے واپس آتے ہوئے جہانگیر کا انتقال ہو گیا اور نورجہاں بیگم نے جہانگیر کے بیٹے سلطان شہریار کو جس سے نورجہاں کی بیٹی جو اس کے پہلے خاوند سے تھی بیاہی ہوئی تھی اور جو بیماری کے سبب سے رخصت لے کر پہلے ہی لاہور پہنچ گیا تھا سلطنت کے لئے اُبھارا اور نورجہاں کے بھائی آصف خاں، وزیر نے اپنے داماد شاہجہاں کو بنارسی نامی اپنے ایک نہایت معتمد ہندو قاصد کی معرفت تنگی وقت کی وجہ سے عریضہ کی جگہ اپنی مہر حوالہ کر دی تھی خفیہ پیغام بھیج کر بلایا۔ اور نورجہاں کی سازشوں کی روک تھام کے لئے شاہجہاں کے دکن سے آگرہ میں پہنچنے تک جہاں وہ باپ سے باغی بنا پھر رہا تھا، جہانگیر کے پوتے سلطان داور بخش عرف مرزا بلاقی خلف سلطان خسرو کو جو جارلوت خاں کے سپرد تھا برائے نام بادشاہ بنا کر لاہور کی طرف کوچ کیا۔ اور نورجہاں کو اپنے خیمہ میں لا کر قابو میں کر لیا۔ اور لاہور پہنچ کر شہریار کو جو بادشاہت

اپنی امیدوں میں ناکام رہیں گے تو غالب اور فتح یاب حریف حسد کے مارے ہم کو ضرور قتل کرادے گا۔

سلطان شجاع کا آگرہ کی طرف کوچ

پس سب سے پہلے سلطان شجاع (جس نے کچھ تو بعض راجاؤں کو برباد کرکے اور کچھ اور لوگوں کو لوٹ کھسوٹ کر اپنے صندوق بھر لئے تھے اور اس سبب سے ایک فوج کثیر کا جمع کرلینا اُس کے لئے کچھ مشکل نہ تھا اس کے علاوہ اپنے ہم مذہب ایرانی اُمرائے دربار کی اعانت اور امداد پر بھی اُسے پورا بھروسہ تھا) فوج و لشکر جمع کرکے نہایت سُرعت کے ساتھ آگرہ کی طرف چل کھڑا ہوا۔ اور یہ مشہور کیا کہ چونکہ بادشاہ کو دارا شکوہ نے زہر دے کر مار ڈالا ہے اس لئے ہم اس خونِ ناحق اور حرکت ناشائستہ کا انتقام لیں گے اور تخت سلطنت پر جو خالی ہے جلوس کریں گے۔" اگرچہ شاہجہاں نے دارا شکوہ کی صلاح سے بہت جلد اس افواہ کی جو اُس کی موت کی نسبت مشہور ہوگئی تھی تردید کی اور صاف لکھا کہ علاج و معالجہ سے بیماری کو افاقہ ہوتا جاتا ہے اور بتاکید حکم دیا کہ تم اپنے صوبہ کو فوراً لوٹ جاؤ۔ لیکن اس بنا پر کہ اُس کے ہوا خواہ برابر یہ خبریں بھیج رہے تھے کہ بادشاہ کی بیماری لا علاج ہے وہ آگرہ کی طرف بدستور بڑھتا چلا آیا۔ اور یہ حیلہ بنایا کہ مجھے بندگان والا کی سلامتی کی خبر پر یقین نہیں آتا۔ اور بالفرض اگر وہ زندہ اور سلامت ہیں تو قدم بوسی حاصل کرنی اور ارشاد و احکام سے سرفراز ہونے کی مجھے بڑی تمنا ہے۔

اورنگ زیب نے بھی اسی طرح اپنے اشتہار جاری کئے اور فوج کو کوچ کا حکم دیا۔ اور ٹھیک انھیں دنوں میں جب کہ سلطان شجاع نے کوچ کیا تھا اُس نے بھی آگرہ کی

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ :- کی ہوس میں لاہور کے بادشاہی خزانہ کا پچہتر لاکھ روپیہ خراب کرکے پندرہ ہزار فوج کی جمعیت سے صرف ادی تک مقابلہ کیلئے آیا تھا گرفتار کرکے قلعہ لاہور میں قید کردیا اور داور بخش کو تخت پر بٹھایا تو شاہجہاں کا خاص اُس کے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ حکم آصف خاں کے پاس پہنچا کہ مناسب اور مصلحت وقت یہ ہے کہ اگر ممکن ہو تو داور بخش اور اُس کے بھائی گرشاسب اور مرزا دانیال کے تینوں بیٹوں شہریار اور طہمورث اور ہوشنگ کو اندھا کرکے ہمارے پاس لے آؤ۔ ورنہ پانچوں کے پانچوں کو چلتا کرو۔ تو آصف خاں نے ارادت خاں اور خواجہ ابوالحسن وغیرہ اُمرا کے اتفاق سے سکہ و خطبہ شاہجہاں کے نام کا جاری کردیا۔ اور ان بیچارے پانچوں بیگناہوں کو رات کے وقت دنیا سے رخصت کردیا۔ اور اُدھر آٹھویں جمادی الثانی سنہ ۱۰۳۷ھ کو شاہجہاں نے آگرہ پہنچ کر تخت سلطنت پر جلوس کیا۔ س م ح

طرف بڑھنے کا عزم کیا اور اگرچہ اس کو بھی وہی امتناعی احکام بادشاہ اور داراشکوہ کی طرف سے پہنچے۔ اور داراشکوہ نے تو یہاں تک دھمکایا تھا کہ اگر تم دکن سے حرکت کرو گے تو سزا پاؤ گے۔ مگر شجاع کی طرح اس نے بھی وہی حیلہ بنا کر اسی عذر سے جواب روانہ کیا اور چونکہ اس کی آمدنی بہت زیادہ نہ تھی اور فوج بھی بہ نسبت اوروں کے کم تھی[1] اس سے اس نے چالاکی سے اس چیز کو حاصل کرنا چاہا جو صرف اس کی تلوار اور قوت بازو سے غیر ممکن تھی۔ اور چونکہ مراد بخش اور میر جملہ ہی دو ایسے شخص تھے جو آسانی کے ساتھ اس کے دم میں آسکتے تھے۔ اس لیے اس نے مراد بخش کو اس مضمون کا خط لکھا کہ "بھائی تم کو اس بات کے یاد دلانے کی کچھ حاجت نہیں کہ امور سلطنت کی محنت اٹھانی میرے اصلی مزاج اور طبیعت کے کس قدر مخالف ہے اور اس وقت جب کہ داراشکوہ اور شجاع نہایت سرگرمی سے حصولِ سلطنت کے لیے کوشش اور سعی کر رہے ہیں تو میں صرف ایک جانِ زاری کی حفاظت اور فقیرانہ زندگی بسر کرنے کی فکر میں ہوں۔ اور سلطنت کے حق حقوق اور دعووں سے میں بالکل دست بردار ہوں۔ تاہم آپ میرے قدیمی اور نہایت گرامی عزیز ہیں تم کو اس رائے اور خیالات سے مطلع کرنا واجب جانتا ہوں کہ یہی نہیں کہ داراشکوہ فرماں روائی کے اوصاف سے خالی ہے۔ بلکہ لا مذہب اور کافر ہونے کی وجہ سے بالکل تاج و تخت کے لائق نہیں اور بڑے بڑے امرائے سلطنت اور ارکانِ دولت سب اس سے متنفر ہیں اور علیٰ ہذا القیاس شجاع بھی سلطنت کے قابل نہیں کہ رافضی مذہب اور ہندوستان کا دشمن ہے۔ پس اس صورت میں اس عظیم الشان سلطنت کی فرماں روائی کے لائق صرف آپ ہی ہیں۔ اور یہ رائے صرف میری ہی نہیں۔ بلکہ اس میں پایۂ تخت کے مشیر اور امیر جو آپ کے بے بدل شجاع ہونے کے بدل قائل و معترف ہیں سب متفق الرائے اور ہم زبان اور دارالخلافت میں آپ کی رونق بخشی کے منتظر ہیں اور میری بابت تو یہ تصور کر لیجئے کہ اگر آپ کی طرف سے موثق اور مستحکم طور پر مجھے یہ وعدہ مل جائے گا کہ جب بفضل خدا آپ پادشاہ ہو جائیں گے تو مجھے اپنی قلمرو میں کوئی خلوت کے موقعہ کا گوشۂ عافیت باطمینان خاطر عبادتِ الٰہی بجا لانے کو عنایت فرما دیجئے گا تو میں فوراً آپ کی طرف داری میں خدمت بجا لانے کو آمادہ اور تیار ہوں۔

[1] عاقل خاں نے لکھا ہے کہ اس وقت اورنگ زیب کے پاس تیس ہزار سوار جرار تھے۔ س م ع

اور صلاح ومشورہ سے۔ اپنے دوستوں اور رفیقوں سے۔ اپنی تمام فوج آپ کے تحت حکم کردینے سے۔ غرض کسی قسم کی مدد دینے سے بھی۔ مجھے دریغ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بالفعل آپ کی خدمت میں ایک لاکھ روپیہ بھیجتا ہوں اور امیدوار ہوں کہ آپ اس کو بطور نذر قبول فرمائیں کہ یہ میری ترقی اخلاق اور خوشی کا باعث ہوگا۔ اور اب ہنر آزمائی اور جوہر نمائی کا وقت ہے۔ پس آپ ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیجئے اور موقعہ کو غنیمت سمجھئے۔ اور جلدی سے سورت[1] کے قلعہ پر جہاں مجھے خوب معلوم ہے کہ بہت سے بادشاہی دفائن وخزائن مدفون ومخزون ہیں قبضہ کرلیجئے[2]

---

[1] فارسی زبان کی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جگہ اس وقت شاہجہاں کی بڑی بیٹی معروف بیگم صاحب کی جاگیر میں تھی۔

[2] اورنگ زیب کی چالوں اور ہتھکنڈوں پر خیال کرنے سے تو ظاہرا ڈاکٹر برنیر ہی کا لکھنا صحیح پایا جاتا ہے کہ مراد بخش نے جو کچھ کیا وہ اورنگ زیب کی تحریک وترغیب سے کیا مگر اس وقت کی فارسی تاریخوں سے بالاتفاق یوں معلوم ہوتا ہے کہ مراد بخش نے جب باپ کے سخت بیمار ہونے کی خبر پائی تو اُس کا مرجانا فرض کرکے خود بخود شورش کی۔ اور صوبہ گجرات کے بادشاہی دیوان سید علی نقی کو جو اس کی خرابیوں کی اصلاح کے لئے مامور تھا اپنا بدخواہ سمجھکر بے جرم وخطا خود اپنے ہاتھ سے قتل کرڈالا اور بادشاہ بن کر تخت پر بیٹھ گیا۔ اور دستور خاندان کے مطابق اپنا شاہانہ لقب مروج الدین مقرر کرکے سکہ اور خطبہ بھی جاری کردیا۔ اور ساز وسامان کی درستی کے لئے نہ صرف شاہی خزانہ پر تصرف کرلیا بلکہ گجرات کے سوداگروں اور دولت مندوں سے بھی بہت سا روپیہ جبرًا وصول کیا۔ اورنگ زیب ان سب حالات کو دیکھ رہا تھا مگر ازراہ احتیاط ایک برس کے قریب تک خاموش رہا۔ مگر جب شجاع نے بھی بنگالہ سے کوچ کردیا تو زیادہ توقف مصلحت نہ دیکھکر اُس نے بھی چڑھائی کرنے کی ٹھان لی اور بقول عاقل خاں جس کے بیان اکثر ناطرفدارانہ اور صاف ہیں یہ خیال کرکے کہ مراد بخش جو تخت نشین ہونے کی بھی حرکت کرچکا ہے ایسے باحوصلہ شخص کا دارالحکومت دکن سے آگرہ کی طرف میرے چلے جانے کی صورت میں ایسے قریب مقام میں رہنا مناسب نہیں ہے اس لئے سخت سخت قسموں کے ساتھ مراد بخش سے یہ معاہدہ کیا۔ کہ ہم تم متفق ہوکر آگرہ پر حملہ کریں۔ اور بصورت فتح کل مال غنیمت میں سے ایک ثلث تمہارا اور دو ثلث میرے اور سلطنت میں سے کابل اور کشمیر اور سندھ اور ملک پنجاب تمہارے تصرف میں آئے گا۔ اور اُس میں سکہ وخطبہ اور حکومت شاہانہ تمہاری رہے گی۔

مراد کی سورت پر فوج کشی

مراد بخش جس کی دولت اور قوت بہ نسبت اوروں کے کم تھی بھائی کی اس درخواست سے جس کے ساتھ ایک بڑی رقم بھی آئی تھی بہت ہی خوش ہوا اور اُس کی اُمیدوں کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ چنانچہ اس اُمید سے کہ جوان اور سپاہی پیشہ لوگ اس کے مضمون سے واقف ہوکر فوج میں بھرتی ہونے پر زیادہ راغب اور آمادہ ہوں گے اور اس خبر کو سُن کر سوداگر لوگ زیادہ رضا مندی سے بڑی بڑی رقمیں قرض دینے پر مائل ہوجائیں گے۔ جو اُن سے وہ بہ سختی طلب کرتا تھا۔ یہ خط جا بجا دکھایا گیا۔ اور اب اُس نے سچ مچ سارے کرّو فرّ اور شان و تزک شاہانہ بنا لئے اور لوگوں کو بڑے بڑے انعام و اکرام کا متوقع کیا۔ اور حسنِ اتفاق سے ان سب باتوں میں اُس کی تدبیریں اور منصوبے ایسے بن پڑے کہ بہت جلد ایک خاصی فوج جمع ہوگئی اور مراد نے سب سے پہلے تین ہزار سپاہیوں کا ایک دستہ زیرِ حکومت شاہ عباس خواجہ سرا جو بڑا بہادر اور سپاہی منش تھا قلعہ سورت کے محاصرے کے لئے بھیج دیا گیا۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۶۔ اور سیر المتاخرین میں یوں لکھا ہے کہ سلطنت اور مال و دولت کی تقسیم نصف نصف ٹھیری تھی اور منشی ممدوح کا۔ اللہ ساحب دہوی سلمہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب تاریخ ہند میں مکتوبات عالمگیری سے اس عہد نامہ کا خلاصہ یہ لکھتے ہیں کہ ہمارا دوست آپ کا دوست اور ہمارا دشمن آپ کا دشمن اور بعد انفصال تمام جھگڑوں کے صوبجات لاہور، کشمیر، کابل، ملتان، ٹھٹھہ بھکر اور تمام اضلاع خلیج عمان تک تم کو دیے جائیں گے۔ س م ح

لہ عاقل خاں نے اس خط کا مضمون بیان نہیں کیا مگر الفنسٹن صاحب نے اپنی تاریخ ہندوستان میں خافی خاں کے حوالہ سے یہ لکھا ہے کہ "میں تمھارا خیر خواہ اور ہمارا مخلص ہوں اور تخت نشینی تم کو مبارک ہو باقی میرا تو یہ ارادہ ہے کہ میں مکہ کو جاؤں اور کنج عزلت میں بیٹھکر خدا کی یاد کروں اور دنیا کو چھوڑوں اور باوصف اُس کے لامذہب دارا شکوہ کے مقابلہ پر تمھارا ساتھی بھی ہوں اور اب تک کہ ہمارا باپ جیتا جاگتا ہے تو ہم کو چاہیئے کہ اُس کی خدمت میں حاضر ہوں۔ اگر وہ ہم سے بعنایت پیش آئے تو اُس کو اس ناواجب رعب و داب سے بچائیں جو دارا شکوہ نے اُس پر ڈال رکھا ہے اور اُس کی غلط فہمی کی معافی چاہیں اور اب اسی عرصہ میں ہمکو یہ مناسب ہے کہ ہم اپنی فوجیں الگ الگ کریں اور کافر جسونت سنگھ سے بمقابلہ پیش آئیں جو ہمارے روکنے کے لئے روانہ کیا گیا ہے۔ س م ح۔

ٹہ عاقل خاں کی تاریخ سے صحیح نام شہباز خاں معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ شخص پنج ہزاری کے منصب کا ایک امیر تھا اور آیندہ اس ترجمہ میں شہباز خاں ہی لکھا جائے گا س م ح

میر جملہ اورنگ زیب کی قید میں

جب مراد بخش کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو اورنگ زیب نے اپنے بڑے بیٹے محمد سلطان کو رجس کی شادی شاہ گلکنڈا کی بیٹی سے ہوئی تھی، میر جملہ کے پاس بھیجا کہ "بڑا ہی ضروری کام ہے۔ آپ فوراً یہاں آکر ذرا مجھ سے مل جائیں" لیکن میر جملہ اپنی فراست سے اس ضروری کام کو فوراً تاڑ گیا اور جواب دیا کہ کلیانی کا محاصرہ چھوڑ کر اور فوج سے علیحدہ ہو کر میرا دولت آباد آنا ممکن نہیں اور آپ یقین فرمائیں کہ میں نے آگرہ سے ابھی تازہ خبر پائی ہے کہ شاہجہاں ہنوز زندہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ امر بھی قابل غور ہے۔ جب تک میرے اہل و عیال داراشکوہ کے قابو میں ہیں میں آپ کے ساتھ شریک نہیں ہو سکتا بلکہ میرا اصل منشا تو یہ ہے کہ میں اس ہنگامہ میں کسی کا بھی طرف دار نہ ہوں۔

جب محمد سلطان نے دیکھا کہ میر جملہ میرے ساتھ جانا نہیں چاہتا تو وہ نہایت ناراض ہو کر دولت آباد کو چلا گیا۔ لیکن اس ناکامی سے اورنگ زیب کسی طرح ناامید نہ ہوا اور اپنے دوسرے بیٹے سلطان معظم کو پھر اس کے پاس بھیجا اور اپنی پہلی خواہش کا اعادہ کیا۔ اس شاہزادہ نے اپنے پیام و سلام کو اس خوبی سے ادا کیا اور سابقہ محبت و اتحاد کو اس قابلیت سے جتایا کہ میر جملہ اس کی درخواستوں سے انکار نہ کر سکا اور اس نے کلیانی کے محاصرہ کو اس قدر سخت اور شدید کیا کہ مخالفوں نے ناچار ہو کر آخرکار قلعہ خالی کر دیا۔ اور فتح کے بعد یہ اپنی چیدہ فوج ساتھ لے کر نہایت عجلت کے ساتھ دولت آباد کو چلا آیا۔ چنانچہ بوقت ملاقات اورنگ زیب نہایت مہربانی اور گرم جوشی سے پیش آیا اور گفتگو میں بابا اور باباجی وغیرہ بہت بڑے بڑے تعظیمی الفاظ کے ساتھ اس سے مخاطب ہوا اور اس مبارک مہمان کو کئی بار گلے لگایا اور پھر خلوت میں لے جا کر یہ کہا کہ "مجھے معلوم ہے کہ آپ نے جو محمد سلطان سے انکار کیا تھا وہ مجبوری کے باعث سے تھا اور بے شک میرے سب فہمیدہ اور دور اندیش اہل دربار کی بھی یہی رائے ہے کہ جب تک آپ کے اہل و عیال داراشکوہ کے قابو میں ہیں آپ کو علانیہ اور سرملا کوئی ایسی حرکت ہرگز نہ کرنی چاہئے جو بظاہر ہمارے حق میں مفید نظر آتی ہو۔ لیکن آپ جیسے فاضل شخص کو سمجھانے کی کیا حاجت ہے کہ دنیا میں ہر مشکل کام کی آخر ایک تدبیر ہے۔ چنانچہ ایک منصوبہ میرے خیال میں آیا ہے جس سے بظاہر اگرچہ آپ حیران ہوں گے لیکن جب

اس کے نشیب و فراز پر بخوبی غور کریں گے تو بے شبہ آپ کے اہل و عیال کی سلامتی کے لئے ایک یقینی ذریعہ ہوگا۔ اور وہ یہ ہے کہ آپ بظاہر قید ہو جانا گوارا کرلیں اس سے تمام جہان کو میری آپ کی دشمنی کا یقین کامل ہو جائے گا اور اس حکمت سے ہم اپنی تمام خواہشوں میں کامیاب ہو جائیں گے۔ کیونکہ کوئی شخص ہرگز ایسا گمان کبھی نہ کرے گا کہ آپ جیسے رتبہ کا کوئی آدمی اس طرح اپنی خوشی سے قید ہو جاتے۔ اور اس کے ساتھ ہی میں آپ کی فوج کا ایک حصہ جس وضع اور حیثیت سے آپ کو پسند اور منا سب معلوم ہو نوکر رکھ لوں گا اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ جس طرح پہلے آپ بار بار مجھ سے وعدے کرتے رہے ہیں اس وقت کچھ روپیہ دینے سے بھی انکار نہ کریں گے۔ کیونکہ مجھے روپیہ کی بہت ضرورت ہے اور آپ کے اس روپیہ اور لشکر سے میں اپنی بخت آزمائی کروں گا بس اجازت ہونے پر میں آپ کو اسی وقت قلعہ دولت آباد میں پہنچا دوں۔ اور اس جگہ میرا ایک بیٹا آپ کا نگران حال رہے گا اور اس کے بعد ہم اور آپ اس مہم کو سرانجام دینے کی تدبیر پر باہم غور و فکر کر سکیں گے اور اس صورت میں ہرگز میرے خیال اور قیاس میں نہیں آتا کہ دارا شکوہ کے دل میں کوئی شبہ پیدا ہو اور وہ ایسے شخص کے اہل و عیال سے کوئی بدسلوکی کرے جو بظاہر میرا اس قدر دشمن ہو۔

ہم معتبر سند سے بیان کر سکتے ہیں کہ اورنگ زیب کی تقریر کا مدعا یہی تھا۔ اور اگرچہ وہ خیالات اور حالات جن کو سوچ سمجھ کر میر جملہ نے ان خواہشوں کا جواب دیا ہوگا بخوبی معلوم نہیں ہیں۔ لیکن یہ بات بالکل یقینی ہے کہ اس نے ان سب باتوں کو قبول کر لیا تھا یعنی وہ اس پر بھی راضی ہو گیا تھا کہ اپنی فوج کو اورنگ زیب کے زیر حکومت کر دے۔ اور روپیہ کا دینا بھی قبول کر لیا۔ اور سب سے زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ اس کی مرضی کے مطابق سچ مچ قید ہو کر قلعہ دولت آباد میں چلا گیا!

اب اس معاملہ کی نسبت بعض لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ میر جملہ کو اورنگ زیب نے سمجھا بجھا کر فی الواقع اس بات کا یقین دلا دیا تھا کہ آپ کے برضامندی قید ہو جانے سے بہت فائدے ہوں گے۔ اور چونکہ پہلے سے آپس میں دوستی اور اتحاد تھا۔ اس وجہ سے اورنگ زیب نے اُسے قید ہو جانے پر حقیقتاً راضی کر لیا تھا۔ اور بعض کی یہ رائے ہے (جو غالباً زیادہ معقول اور قرین قیاس ہے) کہ اس نے صرف ڈر کے مارے ان باتوں

کو قبول کر لیا تھا۔ کیونکہ اورنگ زیب کے دو جوان بیٹے ایک سلطان معظم دوسرا محمد سلطان اس ملاقات اور سوال و جواب کے وقت سر پر کھڑے تھے اور اگرچہ سلطان معظم کا مسلح ہونا بھی زبان حال سے گویا یہی کہہ رہا تھا کہ انکار کی حالت میں بہت ہی بُرا ہو گا مگر محمد سلطان تو ننگی تلوار لئے ہوئے موچھوں کو اس طرح تاؤ دے رہا تھا کہ بس مار ہی ڈالے گا۔ اور چونکہ اسی ملاقات کے معاملہ میں میر جملہ کی طرف سے اس کی کافی توہین و تحقیر ہو چکی تھی اور اس کا چھوٹا بھائی اپنی سفارت میں سرخ رو اور کامیاب ہوا تھا۔ اس لئے اُس کو اپنی رنجش پوشیدہ رکھنے کی کچھ پروا بھی نہ تھی[1]۔

---

[1] فارسی زبان کی تاریخوں سے اس کی گرفتاری کے واقعہ کی تفصیل و تشریح یوں پائی جاتی ہے کہ جب مہابت خاں و میر جملہ وغیرہ بادشاہی امیروں نے جو بیجاپور کی مہم میں اورنگ زیب کے ماتحت کام کر رہے تھے، اول قلعہ بیدر (بدر) اور پھر کلیانی کے بھی نہایت مضبوط اور مستحکم قلعہ کو سخت مقابلہ کے بعد بیجاپوریوں سے چھین لیا۔ اور شاہجہاں نے اورنگ زیب کی عرائض فتح ملاحظہ فرما کر بیدر کا مفتوحہ ملک مع قلعہ رام گڑھ اورنگ زیب کو حسنِ خدمت کے صلہ میں بخش دیا اور اُس کی تنخواہ بارہ کروڑ دام یعنی ایک کروڑ سالانہ علاوہ اور عطیوں کے مقرر کر دی اور معظم خاں۔ شہنواز خاں۔ مہابت خاں۔ نجابت خاں وغیرہ امیروں کو بھی جنھوں نے اس مہم میں نمایاں کام کئے تھے اضافہ مناصب اور عطائے خلعت وغیرہ سے سرفراز کیا گیا۔ اور دلاور حبشی قلعہ دار کلیانی قلعہ چھینوا کر جب بیجاپور پہنچا۔ اور بیجاپور والوں کو یقین ہو گیا کہ اب بغیر اطاعت کے چارہ نہیں انھوں نے اپنا ایک معتمد شاہزادہ اورنگ زیب کے پاس بھیج کر امان چاہی۔ اور آخرالامر یہ ٹھیر گیا کہ ایک ایسی بھاری پیش کش داخل کریں جو جواہرات اور ہاتھی اور نقدی وغیرہ ملا کر ڈیڑھ کروڑ روپیہ کی تعداد سے کم نہ ہو۔ اور قلعہ پرینڈا مع مضافات اور ملک کوکن کے تمام قلعے اور کچھ اور محالات بھی بادشاہی عہدہ داروں کے حوالہ کریں۔ اور جب یہ سب حال اورنگ زیب نے بادشاہ کو لکھا اور اُس نے بیجاپوریوں پر رحم کر کے پیش کش کی تعداد میں پچاس لاکھ کی تخفیف کر دی اور شاہزادہ کے نام فرمان لکھا گیا کہ قاضی نظاما کو تحصیل پیش کش کے لئے مامور کر کے خود دولت آباد کو چلا جائے اور معظم خاں جب ملک مفتوحہ کے قلعوں کے قرار واقعی بندوبست سے فارغ ہو جائے تو بیجاپور کی پیش کش جو قاضی نظاما سے کرائے اُس کو ساتھ لے کر حضور میں حاضر ہو جائے ابھی ان شرطوں کی تعمیل نہیں ہوئی تھی اور اورنگ زیب قلعہ گلبرگہ کو گھیرے ہوئے تھا کہ اسی اثنا میں بادشاہ بیمار ہو گیا۔ اور داراشکوہ نے ایسے بڑے امیروں کا اورنگ زیب کے پاس اس وقت موجود رہنا اپنے حق میں بہتر نہ سمجھ کر مہابت خاں

بسلسلہ سفر گذشتہ۔ راو ستر سال وغیرہ کے نام بادشاہی فرمان جاری کرو یئے کہ اُس کی اجازت اور عدم اجازت کی مطلق پروا نہ کرکے بلا توقف آگرہ کو چلے آئیں۔ چنانچہ سوائے نجابت خاں اور شاہنواز خاں اور میر جملہ کے سب چلے آئے۔ بلکہ میر جملہ کو تو عہدہ وزارت سے معزول کرکے حاضر دربار ہونے کا حکم بھیجا گیا (کیونکہ اورنگ زیب کا متوسل خاص سمجھا جاتا تھا) اور محمد امین خاں کو جو باپ کی جگہ نیابتاً وزارت کرتا تھا کام سے علیحدہ کیا گیا اور رائے رایان دیوان رگھناتھ سرانجام کار کے لئے قائم مقام کے طور پر مامور ہوا۔ دارا شکوہ نے ان امیروں کے واپس بلانے کے لئے یہ بہانہ بنایا تھا کہ شجاع نے بنگالہ نے بارادہ فاسد کوچ کر دیا ہے۔ اس لئے ان کا مع ان کی فوجوں کے پائے تخت میں حاضر ہو جانا مناسب ہے۔ ان امیروں کے چلے آنے سے اورنگ زیب کو نہایت دقت پیش آئی۔ کیونکہ اول تو بادشاہ کی سخت بیماری ہی کی خبریں سن کر بیجاپوریوں کے دل بہت بڑھ گئے تھے۔ اور اس پر ایسے نامور اور صاحب فوج امرا کے چلے جانے سے اُن کو اور بھی زیادہ دلیری ہوگئی۔ اور اورنگ زیب کے لشکر میں جو ہنوز گلبرگہ کو گھیرے ہوئے تھا بہت ابتری اور کمزوری پھیل گئی مگر وہ حسب معمول اپنی ثابت قدمی اور استقلال طبع سے نہایت متانت اور وقار کے ساتھ جس طرح بن پڑا بندوبست مناسب کرکے عزت اور نیک نامی کے ساتھ دولت آباد میں واپس آگیا۔ اور جب اُس نے سُنا کہ میر جملہ بھی جو اب تک پیش کش کی تحصیل اور مفتوحہ قلعوں کے نظم و نسق سے فارغ نہیں ہوا تھا۔ مہابت خاں اور ستر سال کی طرح آگرہ کو جانے والا ہے۔ تو اُسے یہ خوف پیدا ہوا کہ اگر ایسا دولت مند باتدبیر صاحب فوج و لشکر امیر ایسے وقت میں دارا شکوہ کے پاس جا پہنچا تو میری ساری اُمیدیں خاک میں مل جائیں گی پس اس کے پھانسنے کے لئے یہ تدبیر نکالی کہ اس کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ چونکہ ہم آپ کو اپنا ملی ہوا خواہ اور خیراندیش جانتے ہیں اگر آپ ہم سے مل کر اور رخصت ہوکر آگرہ کو جائیں تو مناسب ہے۔ اور جب اُس نے آنے سے پہلوتہی کی اور لکھا کہ میرے نام فرمان آ چکا ہے اس لئے مجبور ہوں۔ تو اورنگ زیب نے اس کے قابو میں لانے کے لئے اس مرتبہ اپنے بڑے بیٹے محمد سلطان کو بھیجا اور یہ پیغام دیا کہ چونکہ آپ حضور میں حاضر ہونے کو جاتے ہیں اس لئے بعض ضروری باتیں تخلیہ میں آپ سے کہنی سنی واجبات سے ہیں اور اس صورت میں آپ کا ہم سے مل کر جانا ہماری نہایت ہی خوشی کا باعث ہوگا۔ اور محمد سلطان نے باپ کی فہمائش کے موافق ایسی چکنی چپڑی باتیں بنائیں اور ایسا مطمئن کیا کہ وہ بلا دغدغہ خوش خوش ملنے کو چلا آیا۔ اب چونکہ یہاں پہلے ہی سے سب تیاری کی ہوئی تھی اور یار لوگ تواضع کے لئے منتظر تھے جوں ہی اُس نے خلوت خانہ میں قدم رکھا جناب امارت مآب فوراً گرفتار کرلئے گئے اور اُس کے عمر بھر کے جمع کئے ہوئے خزانے اور مال و اسباب اور سامان

القصہ جب میر جملہ کی گرفتاری کی خبر عام ہو گئی تو اُس کی فوج کے اُس دستہ نے جو بیجا پور سے اُس کے ساتھ آیا تھا بڑے زور سے کہا کہ ہمارے سردار کو چھوڑ دیا جائے اگر اورنگ زیب اپنی حکمت عملی سے فوراً اُن کی تسلی تشفی نہ کر دیتا تو بے شبہ وہ اپنے سردار کو چھڑا لیتے۔ چنانچہ اورنگ زیب نے اُن کے بڑے بڑے سرداروں کو تو یہ سمجھا کر کہ وہ بالکل اپنی خوشی اور مرضی سے نظر بند ہوا ہے اپنا رفیق بنا لیا۔ اور اُن کے ذہن نشین کر دیا کہ یہ محض ایک حکمت اور منصوبہ ہے جو اصل میں ہماری اور امیر کی باہمی صلاح ہی سے تجویز ہوا ہے۔ اور سپاہ کو خوب دل کھول کر انعام واکرام دیئے یعنی سرداروں سے تو آئندہ ترقی کے صرف بڑے بڑے وعدے ہی کئے مگر سپاہیوں کی تنخواہ حقیقتاً بڑھا دی بلکہ بطور ثبوت صداقت اپنے وعدوں اور اظہار سیر چشمی کے فوراً تین مہینے کی تنخواہ بطور پیشگی دیدی اور اس تدبیر سے میر جملہ کی فوج اُس مہم میں شریک ہونے کو راضی ہو گئی جو اورنگ زیب کے مدِنظر تھی اور اب اُس کے پاس لڑنے بھڑنے کے لائق اچھی خاصی جمعیت ہو گئی۔

اورنگ زیب کی سورت روانگی اس کے بعد اورنگ زیب نے سورت کی طرف کوچ کیا کیونکہ اہل قلعہ خلافِ توقع اب تک مراد بخش کی فوج سے مغلوب نہ ہوئے تھے اور اورنگ زیب کا مدعا یہ تھا کہ جس قدر جلد ممکن ہو یہ قلعہ فتح ہو جائے لیکن اس نے کوچ سے چند روز بعد یہ خبر پائی کہ وہ فتح ہو گیا۔ پس اُس نے مبارکباد کا خط مراد بخش کو تحریر کیا اور اس میں میر جملہ کے ساتھ گذرے ہوئے واقعات تحریر کئے اور لکھا کہ "میں نے ایک جرار فوج جمع کر لی ہے اور خزانہ بھی بافراط موجود ہے اور عمائد و امرائے دربار شاہی سے بھی سب طرح بخت و پنز ہو چکی ہے اور برہانپور[1] اور آگرہ کی طرف چل پڑنے میں

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ :- ثروت و حشمت سب قابو میں کر لیا گیا اور اس کے لڑکو چاکرا اور فوج لڑ کر رکھ لی گئی۔ اوران خزانوں اور مال اور سپاہ کے ہاتھ آجانے سے اورنگ زیب بخوبی اس بڑی مہم کے انجام دینے کے قابل ہو گیا۔ اور چونکہ اس نے اب تک پردہ نہیں اُٹھایا تھا باپ کو یہ لکھ بھیجا کہ فدوی کو معظم خاں کے اوضاع و اطوار سے بے وفائی اور روگردانی کی بو آئی تھی اس لئے میں نے اس کو پکڑ کر قید کر دیا ہے اور اگر ایسا نہ کرتا تو بے شبہ وہ بھاگ کر پھر دکن کے سرداروں سے جا ملتا۔ (ماخوذ از سیر المتاخرین و تاریخ عاقل خاں) س م ع

[1] اصل کتاب میں جابجا برم پور لکھا ہے مگر صحیح نام برہان پور ہے۔ اس لئے آئندہ اس ترجمہ میں برہان پور

اب میری طرف سے کچھ دیر نہیں ہے اور التجا کی کہ آپ کوچ میں دیر نہ کیجئے اور دونوں لشکروں کے مل جانے کے لئے کوئی جگہ قرار دے کر جلد مطلع کیجئے۔

قلعہ سورت کا خزانہ قلعہ سورت میں خلاف مراد تھوڑا سا خزانہ ملنے سے مراد بخش بہت ناامید ہوا۔ اس کمی کا سبب یا تو یہ تھا کہ محض مبالغہ آمیز افواہوں سے اس کی اس قدر کثرت مشہور ہو گئی تھی یا یہ وجہ تھی (جیسا کہ عموماً لوگوں کو شبہ تھا) کہ وہاں کے قلعہ داروں نے بہت سا خورد برد کر لیا تھا بہرحال، جو روپیہ مراد بخش کے ہاتھ لگا وہ صرف اتنا ہی تھا کہ اس سے فقط ان سپاہیوں کی تنخواہ دے سکا جو اس طمع پر نوکر رکھ لئے گئے تھے کہ سورت سے بہت سا مال و دولت ہاتھ آئے گا۔

قلعہ کی فتح کا راز سورت کے محاصرے اور اس کے فتح کرنے کی تدبیروں میں مراد بخش کی کوئی جنگی لیاقت ظاہر نہیں ہوئی۔ کیونکہ باوصف اس کے کہ قلعہ کی فصیلیں جیسی چاہئیں جنگی قاعدہ کے مطابق خوب مستحکم نہ تھیں۔ پھر بھی باوجود بہت بڑی کوششوں اور عرق ریزیوں کے اہل قلعہ ایک مہینے تک برابر لڑا کئے اور جب تک کہ ڈچ قوم کے فرنگیوں نے سرنگ لگانے کی حکمت نہ سکھلائی محاصرہ وغیرہ سے کچھ فائدہ نہ ہوا البتہ جب ان کی پہلے ہی پہل کی سکھائی ہوئی تدبیر سے قلعہ کی فصیل کا ایک بڑا حصہ اُڑا دیا گیا تو محصوروں نے متحیر ہو کر اور بعض شرطیں لے کر قلعہ حوالہ کر دیا۔

اس فتح سے مراد بخش کا بڑا نام ہو گیا اور جو باتیں اس کے پیش نظر تھیں اب اُن کی درستی میں بڑی آسانی ہو گئی اور چونکہ سرنگ لگانے کی تدبیر سے یہاں کے لوگ بخوبی واقف نہ تھے اس لئے مراد بخش کی اس نئی حکمت نے لوگوں کے دلوں پر بہت ہی عجیب اثر کیا۔ اس کے علاوہ یہ بات علی العموم مشہور ہو گئی کہ سورت کا بہت سا دفینہ مراد بخش کے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ لکھا جائے گا۔ یہ شہر اس وقت صوبہ خاندیس کا دارالحکومت تھا اور دکن کا دروازہ سمجھا جاتا تھا مگر اس زمانہ میں ناگپور کی چیف کمشنری میں ضلع نماڑ کے متعلق ایک تحصیل کا مقام ہے یہ دریائے تاپتی کے کنارے آباد ہے۔ اور قریب تیس ہزار کی آبادی ہے۔ س م ح۔

[1] یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ اس واقعہ سے چھبیس ستائیس برس پہلے ایک ہزار بیالیس ہجری میں شاہجہاں کے سرداروں نے پرتگیزوں پر بمقام ہوگلی سرنگ ہی اڑا کر فتح پائی تھی جس کا حال ہم آئندہ ایک اور مقام پر کتاب بادشاہ نامہ سے نقل کریں گے۔ س م ح

ہاتھ آگیا ہے۔

مراد کو شہباز خواجہ سرا کا مشورہ

لیکن باوجود اس تمام شہرت اور ناموری کے جو اس فتح سے حاصل ہوئی تھی اور باوصف اورنگ زیب کے بہت سے خوشامد آمیز اور ابلہ فریب وعدوں کے شہباز خواجہ سرا مراد بخش کو یہی سمجھاتا رہا کہ آپ بھائی صاحب کی فضول باتوں پر ہرگز بھروسہ اور اعتبار نہ کریں اور جلد بازی کر کے ان کے قابو میں نہ آجائیں اور اس خیر خواہ خواجہ سرا نے صاف کہہ دیا کہ "آپ اب بھی میری صلاح مان لیں اور اگر آپ کی ایسی ہی مرضی ہے تو خیر اورنگ زیب کو چکنی چپڑی باتوں میں پھسلائے رکھیں لیکن فوج اور لشکر سمیت اُس سے جا کر شامل ہو جانے کا ارادہ ہرگز نہ فرمائیں اور بالفعل آگرہ کی طرف اُس کو اکیلا ہی جانے دیں رفتہ رفتہ جب ہم کو بادشاہ کی صحت اور مرض کی پختہ خبریں اور صحیح حالات معلوم ہو جائیں گے تو اس وقت جو مصلحت معلوم ہو گی اُس پر عمل کیا جائے گا اور اس عرصہ میں آپ قلعہ سورت کا استحکام کر لیں جو ان اطراف میں سب سے زیادہ کار آمد مقام ہے۔ اور اس جگہ کے قابو کر لینے سے ایک وسیع سیر حاصل اور زرخیز ملک کی حکومت آپ کے ہاتھ آجائے گی اور پھر تھوڑی سی تدبیر سے شہر برہان پور بھی جو صوبہ دکن کا دروازہ اور نہایت کار آمد مقام ہے آپ کے قبضہ میں آجائے گا۔" مگر چونکہ مراد بخش کے پاس اورنگ زیب کے خطوط برابر چلے آتے تھے اُس نے اپنا ارادہ ترک نہ کیا اور بیچارے شہباز کی صلاح نہ مانی۔ یہ دانا اور دور اندیش امیر نہایت ہی سچا ناصح اپنے آقا کا دلی خیر خواہ تھا۔ پس اس جوان شاہزادہ کے حق میں بہت ہی بہتر ہوتا اگر اُس کی معقول صلاح کو مان لیتا۔ لیکن اول تو بادشاہ بن جانے کے بے حد شوق ہی میں مراد بخش اندھا ہو رہا تھا۔ اور اس پر اُس کے مکار بھائی کے خط جو جاں فشانی اور ہوا خواہی کے وعدوں کے اظہار میں روزمرہ چلے آتے تھے بڑے محرک تھے اس کے علاوہ اُس نے یہ بھی سوچا کہ یہ مہم جس میں بادشاہی اور سلطنت حاصل ہو جانے کی اُمید ہے۔ مجھ سے اکیلے انجام نہ پا سکے گی۔ اس لئے اُس نے احمد آباد سے جہاں وہ ڈیرے ڈالے پڑا تھا کوچ کر دیا۔ اور گجرات سے روانہ ہو کر پہاڑوں اور جنگلوں کا سیدھا راستہ اختیار کیا تاکہ جلدی سے اس جگہ پہنچ سکے جہاں اورنگ زیب چند روز پہلے سے اُس کے انتظار میں ٹھہرا ہوا تھا۔

دونوں بھائیوں کی ملاقات

القصہ جب دونوں لشکر مل گئے تو بڑی خوشیاں اور جشن منائے گئے۔ اور اورنگ زیب نے اپنی محبت کے پائدار اور مستحکم اقرار از سرِ نو تازہ کئے اور اپنی کمال بے غرضی اور بے طمعی کا اظہار کیا۔ اور دونوں بھائی کبھی ایک دوسرے سے جُدا نہ ہوتے تھے اور اورنگ زیب بار بار یہی جتاتا تھا کہ بادشاہی اور سلطنت کی تو مجھے ذرا بھی ہوس نہیں اور یہ فوج کشی میں نے صرف اس واسطے کی ہے کہ جس طرح بن پڑے داراشکوہ سے جو میرا اور آپ کا کھلا دشمن ہے۔ لڑ بھڑ کر آپ کو تختِ سلطنت پر جو خالی پڑا ہے بٹھادوں جس زمانے میں دونوں فوجیں تخت کی طرف جا رہی تھیں۔ اورنگ زیب ہمیشہ حاضر و غائب خاص و عام کے روبرو جس طرح پر کہ یہاں کی رعایا کے لوگ بادشاہ کو حضرت کہکر بولتے ہیں۔ مراد بخش کو یہی لفظ کہکر مخاطب کرتا تھا اور ہر موقعہ پر بڑی تعظیم اور تکریم سے پیش آتا تھا۔ اور فی الواقع یہ بات نہایت عجیب ہے کہ مراد بخش نے اورنگ زیب کے خلوص نیت پر کچھ بھی شبہ نہ کیا اور وہ علانیہ دغا بازی جو گولکنڈا کے معاملہ میں وہ ابھی کرچکا تھا ایسی صریح بات سے بھی اُس کے دل پر ذرا اثر نہ ہوا۔ بات یہ ہے کہ یہ شاہزادہ اپنی خیالی سلطنت کی ہوس میں ایسا اندھا ہو رہا تھا اور عقل پہ ایسا پردہ پڑگیا تھا کہ اتنی موٹی بات بھی اُس کی سمجھ میں نہ آئی کہ جو شخص کل اس قدر بے ایمانی کے ساتھ ایک سلطنت کے چھین لینے کے لئے کوشش کرچکا ہے۔ آج کس طرح ممکن ہے کہ اُس کے خیالات ایسے بدل گئے ہوں کہ بجز فقیرانہ گذران کرنے کے اُس کی کچھ اور آرزو ہی نہیں ہے۔

فوجوں کا آگرہ کی طرف کوچ

اب ان متفقہ فوجوں نے ایک بڑی شان و شوکت پیدا کی اور اُن کے کوچ کی خبریں سُن کر پایۂ تخت میں ایک

لہ فارسی زبان کی تاریخوں میں لکھا ہے کہ شاہجہاں کی بیماری کے شروع سے ایک برس بعد یکم جمادی الاول ۱۰۶۸ھ ہجری میں اورنگ زیب نے باپ کی عیادت کے بہانے سے دولت آباد سے برہان پور کی طرف کوچ کیا تھا اور مراد بخش کو ساتھ لینے کی نسبت یہ حیلہ بنایا تھا کہ سکہ اور خطبہ وغیرہ جاری کرنے کی بے ادبی جو اُس سے ہوگئی ہے اس لئے اُس کو خطا معاف کرانے کی خاطر اپنے ساتھ لیجاتا جاتا ہوں۔ اور یہ دونوں شاہزادے بمقام تالاب دیال پور اُجین سے تقریباً ۲ فرسنگ کے فاصلہ پر ملاقی ہوئے تھے۔ س م ح

تہلکہ پڑ گیا۔ اور دارا شکوہ تو اس قدر مشوش اور مضطرب ہوا کہ جس کی انتہا نہیں۔ اور انجام کار پہ نظر کر کے شاہجہاں بھی ڈر گیا۔ اور اگرچہ اپنے خیال میں اس فساد کے حالیہ نتائج کی نسبت اُس نے کچھ ہی اندازہ کیا ہو۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ وہ اس بات سے بخوبی آگاہ تھا کہ اورنگ زیب کی قابلیت اور دانائی اور مراد بخش کے تہور اور شجاعت کے متفق ہو جانے سے ایسا کوئی امر نہیں ہے کہ جو ناممکن الوقوع ہو۔

شاہجہاں نے ہر چند اُن کے پاس قاصد پہ قاصد یہ پیغام دے کر روانہ کئے کہ مابدولت کو اب آرام اور افاقہ ہے۔ اور اگر تم اپنے صوبوں کو لوٹ جاؤ گے تو تمھاری اس حرکت سے چشم پوشی کی جائے گی اور داخل نافرمانی نہ سمجھا جائے گا۔ لیکن یہ سب تحریریں اور احکام بے فائدہ تھے اور متفقہ فوجیں برابر بڑھی چلی آتی تھیں۔ اور چونکہ بادشاہ کی علالت واقعی مہلک سمجھی جاتی تھی۔ اس لئے یہ اپنے وہی عذر اور بہانے کئے جاتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ خط خطوط شاہی مُہریں لگ کر آتے ہیں وہ جعلی اور بالکل دارا شکوہ کی بناوٹ اور ایجاد ہیں۔ اور "حضرت" یا تو مر چکے یا قریب المرگ ہیں۔ اور بالفرض اگر ہماری خوش نصیبی سے وہ زندہ ہیں تو ہم اُن کی قدم بوسی کے مشتاق ہیں۔ اور دارا شکوہ نے جو اُنھیں ہر طرح سے بے بس اور بے اختیار کر رکھا ہے اس حالت سے بھی ہم اُن کو نکالنا چاہتے ہیں۔

شاہجہاں کی مجبوریاں ان دنوں شاہجہاں کا فی الواقع بہت بُرا حال تھا اور علاوہ شدائد اور تکالیف مرض کے وہ حقیقتاً دارا شکوہ کے پنجہ سرکشی میں پھنسا ہوا تھا۔ اور ادھر تو دارا شکوہ کے دل میں قہر و غضب کی آگ بھڑک رہی تھی اور لڑائی کے سوا کچھ خیال ہی نہ تھا اور مستعدی کے ساتھ تیاری کر رہا تھا اور اُدھر شاہجہاں کے دوسرے بیٹے باپ کے تاکیدی اور متواتر احکام پر مطلقاً لحاظ اور التفات نہ کر کے برابر آگرہ کی طرف بڑھے چلے آ رہے تھے اور ایک طرف بیچارے بادشاہ کو یہ فکر تھی کہ اگر میرے جمع کئے ہوئے دفینے اور خزانے ان نوجوان شاہزادوں کے ہاتھ آ جائیں گے تو خدا جانے کس کس طرح اڑا کر برباد اور تلف کریں گے۔

شجاع کی پیش قدمی غرض کہ جب اس بڈھے بادشاہ کو کوئی چارہ باقی نہ رہا تو اُس نے مجبور ہو کر اپنے وفادار جنگ آزمودہ اور کار آگاہ سرداروں

کو اپنے پاس طلب کیا۔ اگرچہ یہ امرا دارا شکوہ سے اکثر ناموافق تھے اور بادشاہ کو بھی اُس کی بہ نسبت اپنے تینوں حملہ آور بیٹوں سے زیادہ محبت تھی۔ لیکن مصلحتِ وقت کا کچھ اور تقاضہ تھا۔ اس لئے انھیں امیروں کو جو اکثر اُس سے ناراض تھے اپنے باغی بیٹوں کے مقابلہ پر سرِ لشکر بنا کر بھیجنا ضروری تھا۔ چنانچہ اس بات کا لحاظ کرکے کہ جدھر سے شجاع بڑھا چلا آتا تھا اُدھر کا زیادہ اندیشہ تھا۔ ایک فوج تو فوراً اس کے مقابلہ کے واسطے روانہ کی گئی اور ایک دوسری فوج اس غرض سے تیار اور جمع کی گئی کہ بشرطِ ضرورت اورنگ زیب اور مراد بخش کی متفقہ فوج سے جنگ کرے۔ چنانچہ دارا شکوہ کا بڑا بیٹا سلیمان شکوہ اس فوج کا سپہ سالار مقرر ہوا جو شجاع کے مقابلہ کے واسطے بھیجی گئی تھی۔ اس کی عمر قریب پچیس برس تھی اور بڑا خوبصورت اور وجیہ اور سخی شاہزادہ تھا۔ سب لوگ اسے پسند کرتے تھے اور قابلیت و لیاقت میں بھی بہت خاصہ تھا۔ شاہجہاں کو بھی اپنے اس پوتے سے بہت محبت تھی اور اس نے کئی بار اس کو بہت سا مال و دولت دیا تھا بلکہ یہ ارادہ تھا کہ دارا شکوہ پر اس کو ترجیح دے اور اپنا ولی عہد مقرر کرے۔

شجاع کی شکست چونکہ شاہجہاں کا اصل مطلب یہ تھا کہ اس غیر طبعی اور ناحق کے فساد میں حتی الامکان خونریزی نہ ہونے پائے اس لئے اُس نے ایک مسن راجہ کو جس کا نام جےسنگھ[۱] ہے اور جو اس وقت کے راجاؤں میں سب سے زیادہ دولت مند اور غالباً ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ قابل شخص ہے بطور مشیرِ خاص اپنے پوتے کے ہمراہ روانہ کیا۔ اور اُس کو پوشیدہ طور پر یہ ہدایت کی کہ حتی الامکان جنگ نہ ہونے دینا اور شجاع کو سمجھانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھنا کہ وہ اپنے متعلقہ صوبہ کو لوٹ جائے بلکہ یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اُس سے کہہ دینا کہ "ارشادِ شاہی کے مطابق واپس چلے جانا تم پر صرف فرض و واجب ہی نہیں بلکہ فنِ حکومت و سلطنت کی رو سے بھی یہ امر نہایت ضروری ہے کہ تم سرِ دست اپنے زور و طاقت کا اظہار نہ کرو اور جب تک کہ ایک ٹھیک اور مناسب

۱؎ راجہ جے سنگھ کچھوا ہا رئیس جے پور سے مراد ہے جس کو لفظ راجہ کے علاوہ شاہی خاندان کے شاہزادوں کی طرح مرزا کا معزز خطاب بھی ملا ہوا تھا واضح ہو کہ جے پور کی ریاست ہمارے اس زمانہ میں بھی کچھوا ہا قوم ہی کے راجپوت خاندان میں قائم ہے اور خالص آمدنی اس ریاست کی سوائے جاگیروں اور معافیات کے ستائیس لاکھ سے کچھ زیادہ ہے اور پچیس ہزار دو سو پچاس میل مربع رقبہ ہے جس میں تقریباً بیس لاکھ آدمی بستے ہیں۔ س م ع

موقعہ اس کام کا نہ آجائے یعنی تاوقتیکہ ہماری بیماری منجر بہ ہلاکت نہ ہو جائے یا اورنگ زیب اور مرادبخش کی متفقہ فوجوں کا کچھ انجام نہ معلوم ہو چکے ایسی جلد بازی تمہارے لئے مصلحت نہیں ہے۔

لیکن جے سنگھ کی کوششیں انسداد جنگ کے باب میں سب بے سود رہیں کیونکہ ادھر تو سلیمان شکوہ بلند حوصلگی اور نوجوانی کے نشہ میں جنگ جوئی کی اُمنگ اور ناموری کے شوق سے بیتاب ہو رہا تھا۔ اُدھر شجاع کو یہ خیال تھا کہ اگر کوچ میں دیر کروں گا تو اغلب ہے کہ اورنگ زیب دارا شکوہ کو مغلوب کرکے دارالسلطنت آگرہ اور دہلی پر قابض ہو جائے پس جوں ہی دونوں فوجیں ایک دوسرے کو دکھائی دینے لگیں فوراً دونوں طرف سے دنادن گولہ اندازی شروع ہو گئی۔

لیکن میں اس مقام پر ضرورت نہیں سمجھتا کہ اس لڑائی کے حالات بہ تفصیل بیان کروں۔ کیونکہ اُس دوسری لڑائی کے واقعات جو اس سے زیادہ اہم ہیں بیان کرنے ہیں اور ناظرین کے لئے یہاں پر صرف اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ دونوں طرف سے بڑی سختی اور سرگرمی سے حملے ہونے اور ایک بڑی کوشش کے بعد سلطان شجاع کو ایسا مغلوب ہونا پڑا کہ آخر کار سراسیمہ ہو کر بھاگ نکلا۔ اور یقین ہے کہ اگر جے سنگھ اور اُس کا دلی دوست دہیر خاں[۱] پٹھان جو بڑا بہادر سپاہی تھا قصداً پیچھے نہ ہٹے رہتے تو فوج مخالف بالکل تباہ ہو جاتی بلکہ خود شجاع بھی گرفتار ہو جاتا۔ لیکن راجہ نے ازراہ دانائی مناسب نہ جانا کہ شاہی خاندان کے شاہزادے اور اپنے آقا کے بیٹے پر ہاتھ ڈالے اور یہ بھی ہے کہ اُس نے شجاع کو بھاگ جانے کی مہلت دینے میں بادشاہ کی ہدایتوں پر

---

[۱] فارسی زبان کی تاریخوں میں جے سنگھ کے ساتھ دوسرے امیر کا نام بہادر خاں لکھا ہے اور دہیر خاں تو صریح غلط ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دلیر خاں کی جگہ غلطی سے دہیر خاں چھپ گیا ہے۔ کیونکہ انگریزی میں حرف لام اور رے کی شکل قریب قریب ہے۔ مرزا محمد کاظم مصنف عالمگیر نامہ لکھتا ہے کہ باقی بیگ المخاطب بہ بہادر خاں جو دارا شکوہ کے عمدہ نوکروں میں سے تھا اُس کو اس مہم میں دارا شکوہ نے سلیمان شکوہ کے ساتھ بطور اتالیق کے بھیجا تھا۔ اور اپنی کل فوج کی سواری بھی اُسی کے حوالہ کی تھی۔ اور اسی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ دلیر خاں بھی ایک امیر منجملہ اُن نامور اُمرا کے تھا جو اس مہم میں سلیمان شکوہ کے ساتھ بھیجے گئے تھے۔ س م ع

عمل کیا۔ اس شکست میں اگرچہ شجاع کا کچھ زیادہ نقصان نہ ہوا تھا۔ لیکن چونکہ میدان سلیمان شکوہ کے ہاتھ رہا اور چند توپیں بھی اس کے قبضہ میں آگئی تھیں اس لئے دربار شاہی میں یہ خبر عام ہوگئی کہ سلیمان شکوہ نے کامل فتح پائی اور اس سے سلیمان شکوہ کی نیک نامی اور شجاع کی بڑی بدنامی ہوئی اور اُن ایرانی امرائے دربار کی سرگرمی اور دلسوزی پر بھی جو شجاع کی طرف داری کرتے تھے اوس پڑ گئی۔

سلیمان شکوہ کی واپسی سلیمان شکوہ ابھی شجاع کے تعاقب میں لگا ہوا تھا کہ خبر ملی کہ اورنگ زیب اور مراد بخش بڑی مستعدی اور استقلال سے آگرہ کی طرف بڑھے آتے ہیں۔ اب چونکہ اس کو اپنے باپ کی عقل و دانش کا اندازہ بخوبی معلوم تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ اُس کے گرد و پیش پوشیدہ دشمن جمع ہیں اس لئے کمال دور اندیشی سے آگرہ کو واپس آنے کا ارادہ کیا۔ کیونکہ ظن غالب یہی تھا کہ دارالسلطنت کے آس پاس ہی کہیں نہ کہیں داراشکوہ اُن سے لڑے گا۔ سب لوگ متفق الرائے ہیں کہ سلیمان شکوہ کی یہ تجویز بہت ہی دانائی اور ہوشیاری کی تھی اور اگر یہ نوجوان شہزادہ اپنی فوج سمیت بروقت پہنچ جاتا تو اورنگ زیب ان کی ایسی بڑی فوجوں سے ٹکر لینے میں کبھی کامیاب نہ ہوتا بلکہ شاید مقابلہ ہی نہ کرتا۔

شاہی فوج کی روانگی باوجود اس کامیابی کے جو سلیمان شکوہ[1] کی سپاہ کو بمقام الہ آباد (جہاں جمنا اور گنگا باہم ملتی ہیں) حاصل ہو چکی تھی

---

[1] عالمگیر نامہ میں اس واقعہ کو یوں لکھا ہے اور اُس وقت کی اور کتابوں سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے کہ سلیمان شکوہ اور راجہ جے سنگھ کچھواہا جو شجاع کے مقابلہ کو چوتھی ربیع الاول ۱۰۶۸ہجری کو آگرہ سے روانہ ہوئے تھے اُنھوں نے کوچ بہ کوچ بہادر پور میں پہنچ کر جو بنارس سے ڈھائی کوس آگے گنگا کے کنارہ پر ایک گاؤں ہے شجاع کے لشکر سے ڈیڑھ کوس کے فاصلہ پر ڈیرہ کیا تھا جو بنگالہ کے نواڑے یعنی کشتیوں کے بیڑہ کو ساتھ لئے ہوئے دریا کے کنارے ٹھیرا ہوا تھا اور فوج کو ذرا آرام سے پلنے کے بعد دھوکا دینے کی غرض سے یہ مشہور کر کے کہ لشکر کی جائے قیام بدلنا چاہتے ہیں اکیسویں جمادی الاول کو علی الصباح شجاع کے لشکر پر ناگہاں حملہ کر دیا اور چونکہ اُس نے غفلت کے سبب سے اپنی فوج کی صف بندی بھی نہ کی تھی خفیف سے مقابلہ کے بعد لڑائی ہار گیا۔ اور نواڑے میں بیٹھکر پیچھے کو بھاگا اور تمام مال واسباب لُٹ گیا۔ اور اس کے بعد سلیمان شکوہ نے اول پٹنہ اور پھر مونگیر سے نکال

یہاں آگرہ کی طرف معاملات کی کچھ اور ہی صورت تھی۔ یعنی جب دارالسلطنت میں یہ خبر پہنچی کہ اورنگ زیب برہان پور کے پاس دریا کے پار اُتر آیا ہے۔ اور اُن دشوار گزار پہاڑوں کی گھاٹیوں کو بھی بزور طے کر چکا ہے جن پر ہر طرح سے مزاحمت اور بچاؤ کا بہت بڑا بھروسہ تھا تو دربار میں بڑی گھبراہٹ اور حیرانی پیدا ہوئی اور فوج کی تیاریاں شروع ہوئیں مگر بڑی جلد بازی کے ساتھ سب سے پہلے فوراً ایک دستہ اس مقصد سے اُجین بھیجا گیا کہ جلدی سے پہنچ کر دریا کے گھاٹ[1] کو روک لیں اور مخالفوں کو پار اُترنے سے روکیں اور اس پیش رو دستہ کی سرداری کے واسطے دو امیر جو نہایت با اقتدار اور لایق و فایق تھے انتخاب کئے گئے۔ ان میں سے ایک کا نام قاسم خاں تھا جو بڑا ہی مشہور و معروف سپاہی اور شاہجہاں کا دلی خیر خواہ تھا۔ لیکن یہ چونکہ دارا شکوہ سے متنفر اور بیزار تھا اس لئے اُس نے یہ سرداری بخوشی اختیار نہیں کی تھی۔ بلکہ شاہجہاں کے حکم کی تعمیل تھی۔ دوسرا سردار راجہ جسونت سنگھ تھا جو درجہ اور اقتدار میں جے سنگھ سے کم نہ تھا۔ یہ راجہ اُس زبردست[2] رانا کا داماد تھا جو اکبر کے زمانہ میں سب راجاؤں کا مہارا سمجھا جاتا تھا۔ دارا شکوہ نے ان دونوں سرداروں سے نہایت تملق اور شیریں زبانی سے گفتگو کی اور جب وہ لشکر میں جانے لگے تو بڑے بڑے بھاری خلعت اُن کو دیئے مگر شاہجہاں نے جو ہدایتیں شجاع کے بارہ میں راجہ جے سنگھ اور دلیر خاں کو کی تھیں ویسے ہی احتیاط سے کام کرنے کی بابت ان کو بھی کیں۔

اورنگ زیب کے مقابلہ میں شاہی فوج کی کارروائیاں

لیکن جب کہ اس طرف اس قسم کے تامل و تذبذب ہو رہے تھے اورنگ زیب کی طرف مستعدی کے ساتھ لڑائی کی پوری تیاری تھی چنانچہ بادشاہ کی نصیحت اور ہدایت کے مطابق جو قاصد متواتر یہ پیام دے کر اُس کے پاس بھیجے جاتے رہے کہ آپ کو

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ: اور وہ مجبور ہو کر اپنے اصلی صوبہ یعنی بنگالہ کو چلا گیا۔ اور مونگیر سے پٹنہ تک دارا شکوہ کا قبضہ ہو گیا۔ لکھا ہے کہ ان لڑائیوں میں شجاع کے نوکروں میں سے جو لوگ قید ہو گئے تھے دارا شکوہ نے ان کو آگرہ میں منگوا کر اول تشہیر وغیرہ سے بے عزت کیا اور پھر اُن کے ہاتھ قلم کرا دیئے جس کے باعث سے کتنے ہی بیچارے اپنی جانوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔

[1] اس دریا سے شیپرا ندی مراد ہے جس کا اصل سنسکرت زبان کا نام گھشیپرا ہے۔ س م ع

[2] اودے پور کا رانا مراد ہے۔ س م ع

دکن کو لوٹ جانا چاہیئے اُن میں سے کوئی بھی واپس آنے نہ پایا۔ بلکہ واپسی کے بجائے اُس کی فوج یکایک ایک بلند ٹیلہ پر جو دریا[1] سے تھوڑے فاصلہ پر تھا۔ آنمودار ہوئی۔ چونکہ گرمی کا موسم تھا اور سخت دھوپ پڑتی تھی اور اس وجہ سے دریا پایاب ہو رہا تھا۔ قاسم خاں اور راجہ نے یہ خیال کرکے کہ اورنگ زیب پار اُترنا چاہتا ہے، لڑائی کی تیاری کردی۔ لیکن واقع میں اورنگ زیب کی پوری فوج ابھی پیچھے تھی۔ اور اس تھوڑی سی سپاہ کو آگے بھیج دینا بالکل ایک دھوکا تھا کیونکہ اورنگ زیب کو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں بادشاہی فوج دریا کے پار نہ اُتر آئے جس سے ہمارا پانی بند ہو جائے اور وہ ہماری تھکی ماندی فوج پر حملہ کردے اور اس طرح پر جنگ کا مفید موقعہ ہمارے ہاتھ سے جاتا رہے۔ اور اُس کا یہ اندیشہ حقیقت میں درست تھا۔ کیونکہ اُس وقت اُس کی فوج مقابلہ کے لایق نہ تھی اور اگر قاسم خاں اور راجہ حملہ کردیتے تو بآسانی غالب ہو سکتے تھے۔

میں اس موقعہ پر بذات خود موجود نہ تھا۔ لیکن جن لوگوں نے اس لڑائی کو دیکھا ہے خصوصًا وہ فرانسیسی افسر جو اورنگ زیب کے توپ خانہ میں ملازم تھے اُن سب کی یہی رائے ہے۔ مگر یہ سردار ایسا کس طرح کرتے کیونکہ بادشاہ کے منفی احکام کے باعث صرف اتنا ہی کر سکتے تھے کہ دریا کے وار اپنا مورچہ جمائیں اور اگر اورنگ زیب دریا سے بزور اُترنا چاہے تو روکیں۔

اورنگ زیب کی پہلی فتح

القصہ جب اورنگ زیب کی فوج نے دو تین روز دم لے لیا تو دریا سے بزور اُترنے کی تیاری کردی۔ چنانچہ پہلے تو اُس نے اپنا توپ خانہ ایک بلند جگہ پر قائم کیا۔ اور پھر فوج کو حکم دیا کہ توپوں کی پناہ میں آگے بڑھے۔ مگر ان کی پیش قدمی روکنے کے لئے اس طرف سے بھی توپیں چلنی شروع ہوئیں اور اگرچہ ابتدا میں سخت جوش و خروش اور سرگرمی سے مزاحمت کی گئی۔ اور جسونت سنگھ نہایت ہی شجاعت اور دانائی کے ساتھ حملہ آوروں کو ہر ہر قدم پر روکتا رہا مگر قاسم خاں سے باوجودیکہ اُس کی سپاہ گری اور بہادری میں کسی کو کلام نہیں اُس موقعہ پر نہ تو کچھ بہادری ہی دکھائی اور نہ کچھ سپاہیانہ دانائی ہی ظاہر کی بلکہ اُس پر دغابازی اور سازش کا شبہ[2]

[1] مصنف نے دریا کا نام نہیں لکھا مگر مترجم انگریزی نے حاشیہ میں نربدا لکھدیا ہے جو صریح غلط ہے کیونکہ ابھی ان کے پاس تو وہی شپنرا ندی ہے۔ جس کا ذکر ہم ابھی ایک حاشیہ میں کر چکے ہیں۔ س۔ م۔ ح

[2] دوسرے مورخوں کے بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ س۔ م۔ ح

ہے ۔ کیونکہ اُس نے لڑائی سے پہلے ہی رات کے وقت اپنا بہت سا بارود گولہ ریت میں چھپا دیا تھا جس کے سبب سے صرف چند باڑیں چلانے کے بعد فوج کے پاس یہ سامان نہ رہا ۔ خیر اس کی اصل خواہ کچھ ہی ہو مگر لڑائی بہر حال بہت سخت ہوئی اور گھاٹ کے روکنے میں سپاہ نے بڑی شجاعت دکھائی ۔ اُدھر اورنگ زیب کی فوج کا یہ حال تھا کہ بڑے بڑے پتھروں کی وجہ سے جو دریا کے پاٹ میں تھے اُس کو سخت تکلیف پہنچی اور کناروں کی بے ڈھب بلندی کے باعث سے اوپر چڑھنا سخت مشکل تھا ۔ مگر مراد بخش کی تیزی اور شجاعت ان سب دشواریوں پر غالب آئی ۔ اور وہ اپنی خاص فوج کے ساتھ دریا کو عبور کر آیا اور آخرکار باقی سپاہ بھی پیچھے سے بہت جلد آپہنچی ۔ اس وقت قاسم خاں بڑی بدنامی کے ساتھ میدان سے بھاگ نکلا ۔ اور جسونت سنگھ کو صریح جان جوکھوں میں چھوڑ گیا ۔ اب اگرچہ اس بہادر راجہ پر چاروں طرف سے دشمن کی فوج ٹوٹ پڑی ۔ مگر اُس کے شجاع اور بہادر راجپوتوں نے اُسے اپنی جانیں لڑا کر بچا لیا ۔ اور ایسا جان توڑ کر لڑے کہ آٹھ ہزار میں سے لڑائی کے خاتمہ پر صرف پانچ سو کے قریب باقی رہ گئے ۔

اس واقعہ کے بعد راجہ نے آگرہ جانا مناسب نہ جانا اور ان بچے کھچے وفادار سپاہیوں کے ساتھ سیدھا اپنی ریاست کو چلا گیا[1]۔

---

[1] ہندوستانی مورخوں نے ان واقعات کو یوں بیان کیا ہے کہ جب مراد بخش کے بادشاہ بن بیٹھنے کی خبر آگرہ میں پہنچی تو اُس کو گجرات کی صوبہ داری سے معزول کئے جانے اور ملک برار میں جو پہلے سے اورنگ زیب کی جاگیر میں تھا (غالباً دونوں کے بھڑانے کی خاطر) جاگیر دے کر صرف اُس پر قناعت کرنے کا حکم داراشکوہ نے بادشاہ سے دلوا دیا تھا ۔ اور اس کے ساتھ ہی قاسم خاں میر آتش اُس کی جگہ گجرات کی صوبہ داری پر نامزد کیا گیا تھا ۔ اور چونکہ مالوہ کا صوبہ دار شائستہ خاں (جو ان چاروں شاہزادوں کا حقیقی ماموں تھا) اورنگ زیب کے ساتھ زیادہ موافقت رکھتا تھا اس کا بھی اُجین میں کسی کے راستہ پر رہنا مناسب نہ جان کر اس کی جگہ اپنے دلی خیر خواہ مہاراجہ جسونت سنگھ راٹھور جودھپوری کو اس مراد سے بھجوا دیا تھا کہ اورنگ زیب جو اس وقت تک بظاہر خاموش تھا اگر وہ بھی (جیسے کہ داراشکوہ کو اُس سے توقع تھی) کچھ حرکت کرے تو راجہ قاسم خاں کی مدد سے اُس کا سد راہ ہو ۔ اور اگر بدستور خاموش رہے تو قاسم خاں مراد بخش کو گجرات سے برار کی طرف نکال دے اور جسونت سنگھ بشرط ضرورت اُس کی ۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ ۔ کرے۔ چنانچہ ان دونوں کو اب تک یہی خبر تھی کہ مراد بخش گجرات سے مالوہ کے راستہ آگرہ کی طرف بڑھا آ رہا ہے اور اسی خیال میں اجین سے بانس[1] پہلے تک راستہ روانہ ہو کر مقام کاچ رودہ بزعم خود اس کا راستہ روکے پڑے تھے۔ اور اگرچہ اورنگ زیب عاقبت اندیشی کی وجہ سے برہانپور سے بھی چل کر اور اکبر پور کے گھاٹ نربدا سے پایاب اتر کر مالوہ میں داخل ہو گیا اور دیپال پور کے قریب مراد بخش بھی اس سے آ ملا مگر راستوں اور گھاٹوں کو جو اس نے نہایت ہوشیاری سے روک رکھا تھا اس نے ان کو مطلقاً اس کے ایسے نزدیک پہنچ جانے کی خبر تک نہیں ہوئی۔ بلکہ اس نے پادشاہی سپاہ کی کثرت کے اندیشہ سے جو مراد بخش کو یہ لکھ بھیجا تھا کہ میرے آنے تک جلدی کر کے ان سے بھڑ نہ جانا۔ اور وہ اس وجہ سے کاچ رودہ سے صرف اٹھارہ کوس کے فاصلہ پر پہنچ جانے کے بعد پیچھے کو ہٹ کر دیپال پور کی طرف چلا گیا تھا تو انھوں نے اپنے خیال میں اس کو اس کے بھاگ جانے پر محمول کر کے بادشاہ کو مبارکباد کی عرضی کر دی تھی اور بادشاہ بھی کسی قدر مطمئن ہو کر اٹھا رہا تھا۔ جب [illegible] کو مع دارا شکوہ تبدیل آب و ہوا اور آگرہ کی گرمی سے بچنے کے لئے اپنے طبیبوں کی صلاح کے موافق مگر دارا شکوہ کی مرضی کے برخلاف دہلی کو چلا گیا تھا۔ مگر جب یہ دونوں لشکر آن کر باہم مل گئے اور راجہ شیورام گوڑ نے جو قلعہ مانڈو میں تھا اور دارا شکوہ کے ان نوکروں نے جو دھار کے قلعہ سے اورنگ زیب کے نزدیک آ پہنچنے سے خوف زدہ ہو کر مہاراجہ کے لشکر میں بھاگ آئے تھے جسونت سنگھ کو اطلاع دی تو اس وقت اس کی آنکھیں کھلیں اور کاچ رودہ سے پیچھے ہٹ کر دھرمات پور کے متصل جو اجین سے سات کوس کے قریب ہے اورنگ زیب کے لشکر سے ایک کوس کے فاصلہ پر اس کا راستہ آ روکا۔ اب چونکہ اورنگ زیب کا اصل مقصود یہ تھا کہ اگر ہو سکے تو راجہ کو بھی اپنے ساتھ ملا لے۔ اور پیغام سلام کے حیلہ سے اپنے تھکے ماندے لشکر کو ذرا آرام دے لے۔ اس نے کب راے کو جو ایک ہوشیار اور فہیم برہمن تھا اس کے پاس بھیج کر پیغام سلام شروع کئے اور وہی معمولی حیلہ کہ ہم بادشاہ کی خدمت میں صرف عیادت اور حصول ملازمت کی خاطر جاتے ہیں ظاہر کیا کہ اول تو مناسب یہ ہے کہ تم ہمارے پاس حاضر ہو جاؤ اور اگر یہ نہیں ہو سکتا تو راستہ چھوڑ کر اپنے وطن جودھپور کو چلے جاؤ" مگر جب راجہ نے کوئی بات بھی نہ مانی اور لشکر نے بھی ذرا دم لے لیا تو بائیسویں رجب ۱۰۶۸ھ ہجری مطابق اپریل ۱۶۵۸ء کو لڑائی کے قصد سے چڑھ آیا اور سخت لڑائی ہوئی۔ جس میں اس شمار کے موافق جو اورنگ زیب نے فتح کے بعد کرایا تھا قریب چھ ہزار کے سپاہی جو زیادہ تر راجپوت ہی تھے کام آئے اور بہت سے بڑے بڑے نامی راجپوت سردار مارے گئے اور جسونت سنگھ خود بھی زخمی ہوا

[1] ب ان س ب رل ہ گ ک اچ رودہ –

راجپوتوں کی سپاہگری

لفظ راجپوت کے معنی ہیں راجہ کا بیٹا۔ یہ لوگ پشت ہا پشت سے سپاہی پیشہ ہیں اور ابتدائے عمر سے یہی تعلیم پاتے ہیں اور ان کے راجہ معاش کے لئے اس شرط پر ان کو جاگیریں دیا کرتے ہیں کہ جنگی ضرورت کے وقت اپنے آقا کی خدمت کے لئے حاضر ہو جائیں لارڈ وغیرہ موروثی امراے فرنگستان کی طرح ان راجپوت ٹھاکروں کو بھی اس ملک کے خاندانی سردار کہا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ اُن کی جاگیریں ناقابل ضبطی اور موروثی ہوں۔ یہ لوگ ابتدائے عمر سے افیون کھانے کے عادی ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کو افیون کے بڑے بڑے انٹے کھاتے دیکھکر مجھے سخت حیرت ہوئی۔ اور لڑائی کے دن تو یہ معمول ہے دوگنی افیون کھا کر ایسے مدہوش سے ہو جاتے ہیں کہ بے فکر واندیشہ اپنے آپ کو ہر ایک جان جوکھوں میں ڈال دیتے ہیں۔ اگر کوئی راجہ خود بھی بہادر ہو تو اُس کے دل میں کبھی یہ خیال بھی نہیں گذرتا کہ میرے راجپوت کبھی کسی مشکل میں میرا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ لڑائی کے وقت یہ لوگ شاید اتنی بات کے تو محتاج ہیں کہ کوئی اِن کا پیش رَو اور لڑانے والا ہو۔ مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ اپنے رئیس کے سامنے جان دے دینا اپنا فخر سمجھتے ہیں اور اُس کو دشمن کے ہاتھ میں کبھی نہیں چھوڑ دیتے۔ میدانِ جنگ میں جانے سے پہلے جب یہ افیون کے نشہ میں جھومتے ہوتے مرنے کے یقین سے ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر رخصت ہوا کرتے ہیں تو یہ تماشا عجیب و دلچسپ اور قابلِ دید ہوتا ہے۔ اور اس صورت میں محل تعجب نہیں ہے کہ یہ مغل بادشاہ اگرچہ مسلمان اور بُت پرستوں کے مخالف مذہب ہیں۔ لیکن بہت سے راجاؤں کو ہمیشہ اپنی ملازمت میں اور اکثر اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ اور اُن کے ساتھ ویسے ہی سلوک کرتے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ بلکہ لکھا ہے کہ کچھ خفیف زخم قاسم خاں کے بھی آیا۔ مگر ان مورخوں نے باوجود راجپوتوں کی بہادری کی تعریف و توصیف کرنے کے اس شکست کو زیادہ تر راجہ کی سوئے تدبیری اور ناواقفیت فنِ جنگ سے منسوب کیا ہے اور لکھا ہے کہ اُس نے اپنے لشکر کو ایسی اونچی نیچی جگہ میں قائم کیا تھا۔ اور ندی سے کچھ پانی کاٹ کر لشکر کے اردگرد کیچڑ کر دی تھی جس سے اُس کی سوار فوج لڑائی کے وقت اچھی طرح کام نہ دے سکی۔ خافی خاں نے اس لڑائی کا ہونا شیپرا نامے ندی کے کنارے بیان کیا ہے اور جغرافیہ کے نقشوں میں بھی اس ندی کا نام شیپرا ہی لکھا ہے۔ گمر عالمگیر کے خاص مورخ مرزا محمد کاظم نے عالمگیرنامہ میں اس کا نام نالہ چھدرشرنا لکھا ہے۔ س م ح

ہیں جیسے کہ اپنے مسلمان امیروں اور سرداروں کے ساتھ۔ اور مسلمان امیروں کی مانند ان کو بھی فوج کی حکومتوں اور سرداریوں پر مقرر اور مامور کرتے ہیں۔

جسونت سنگھ کی رانی کا غیرانہ طرزِ عمل

اس موقعہ پر جسونت سنگھ کی رانی جس سلوک سے اپنے شوہر کے ساتھ پیش آئی وہ بھی سننے کے لائق ہے یعنی رانی نے جب سنا کہ راجہ پانچ سو سپاہیوں کے ساتھ معرکہ سے جان بچا کر نکل آیا ہے تو اُس نے بجائے اس کے کہ اس آفت سے بچنے کی مبارک باد دیتی اور تسلی کرتی فوراً حکم دیا۔

"قلعہ کے دروازے بند کر دو ایسے بے غیرت نامرد کو میں قلعہ میں ہرگز نہ آنے دوں گی! ایسا شخص اور میرا شوہر، میرے باپ کا داماد اور ایسا بے غیرت! میں ہرگز اس کا منہ دیکھنا نہیں چاہتی، جو شخص ایسے نامور رانا کا رشتہ دار ہو چاہیئے کہ اُس کی شجاعت اور نیک نامی کی تقلید اور پیروی کرے۔ اور اگر فتح نہ پا سکے تو بہادری سے جان دیدے۔"

اور اس سے تھوڑی دیر بعد اُس کے دل میں کچھ اور خیالات گذرے اور کہا کہ میرے لئے ابھی چتا تیار کرو مجھے دھوکا ہوا۔ میرا شوہر حقیقت میں مارا گیا۔ اور یہی سچ ہے پس اب میں زندہ رہنا نہیں چاہتی۔ اور تھوڑے عرصہ بعد پھر غصہ میں آکر بدستور لعن طعن کرنے لگی اور اسی حالت میں اُس کو آٹھ دن گذر گئے اور شوہر کا منہ نہ دیکھا لیکن آخر جب اُس کی ماں اُس کے پاس آئی تب کچھ تسلی تشفی کر کے سمجھایا کہ گھبراؤ نہیں۔ راجہ ذرا دم لے کر اور از سرِنو فوج جمع کر کے اورنگ زیب پر پھر حملہ کرے گا۔ اور اپنی شجاعت اور بہادری کے نام کو بدستور قائم رکھے گا۔

اس حکایت سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ اس ملک کی عورتوں کے دل میں حفظِ ننگ و ناموس اور عزت کا کس قدر خیال ہے۔ چنانچہ میں اس قسم کی مثالیں اور بھی بیان کر سکتا ہوں کیونکہ میں نے بہت سی بیبیوں کو اپنے خاوندوں کی لاش کے ساتھ جلتے ہوئے بچشم خود دیکھا ہے۔ لیکن اُن واقعات کو میں کسی اور مقام پر لکھوں گا جہاں بیان کروں گا کہ انسان کے دل پر اپنی اُمیدوں اور کثرتِ رائے اور کسی عام عقیدے اور عزت و حرمت کے خیالات کا کیسا زبردست اور قوی اثر ہوتا ہے۔

جب وقت داراشکوہ اجین کی اس نامبارک اور غمناک واردات سے مطلع ہوا تو غیظ و غضب کے مارے اس کی یہ حالت تھی کہ اگر نصیحت اور فہمائش سے شاہجہاں ذرا ڈھیلا پڑ جاتا تو خدا جانے وہ وحشت اور جلد بازی میں کیا کر بیٹھتا اور کچھ شک نہیں ہے کہ اگر قاسم خاں اس کے قابو میں آجاتا تو اس کا سر ضرور کٹوا دیا جاتا اور چونکہ میر جملہ[1] کی نسبت بھی اس کو یہ گمان تھا کہ اورنگ زیب کو اپنی فوج اور روپیہ دے کر وہی اس سارے فتنہ و فساد کا اصل اصول اور بانی مبانی ہوا ہے اس لئے قریب تھا کہ اس کے بیٹے محمد امین خاں کو بھی مروا ڈالے اور اس کی بیوی اور بیٹی کو بازاری عورتوں کے چکلہ میں بھیج دے مگر بادشاہ کی فہمائش بلیغ کے باعث آخرکار اس کا جوش غضب فرو ہوا اور میر جملہ کے اہل و عیال کی عزت اور جان بچ گئی۔ یعنی بادشاہ نے اس کو سمجھایا کہ یہ امر ہرگز ممکن نہیں ہے کہ میر جملہ اورنگ زیب سے سازش رکھتا ہو اور یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایسا دوراندیش اور دانا آدمی ایسے شخص کے فائدہ کے واسطے جس سے وہ کچھ الفت و محبت نہیں رکھتا اپنے اہل و عیال کو ایسے شدید خطرہ میں ڈال دے بلکہ برخلاف اس کے یہ امر ظاہر ہے کہ وہ خود اورنگ زیب کے دام فریب میں پھنسا ہوا ہے۔

ادھر حملہ آوروں کا یہ حال تھا کہ خوشی کے مارے پھولے نہ سماتے تھے اور یہ گھمنڈ

---

[1] فارسی تاریخوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باوجودیکہ داراشکوہ میر جملہ کا سخت مخالف تھا مگر شاہجہاں کو اس کے حال پر توجہ تھی۔ چنانچہ پیچھے لکھا جا چکا ہے کہ شاہجہاں کے شروع مرض کے دنوں میں جب داراشکوہ نے مہابت خاں اور راو ستر سال وغیرہ امرا کو بیجاپور کی مہم سے آگرہ میں واپس بلایا تو میر جملہ کو بھی اورنگ زیب کے ساتھ سازش رکھنے کے شبہ میں عہدہ وزارت سے معزول کرا کر دکن سے طلب کیا تھا۔ اور اس کے بیٹے محمد امین خاں کو بھی ممانعت کر دی تھی کہ باپ کی جگہ کام نہ کرے اور راجہ رائے رایاں راجہ رگھناتھ قائم مقام وزیر مقرر ہو کر بعد ازاں جعفر خاں مستقل وزیر مقرر ہو گیا تھا۔ مگر شاہجہاں نے پھر بھی محمد امین خاں کو دانشمند خاں کی جگہ جس نے میر بخشی کے نہایت بڑے عہدہ سے انہیں دنوں استعفا دے دیا تھا مقرر کر دیا تھا اور جب جسونت سنگھ کی شکست کی خبر داراشکوہ کو پہنچی تو اس نے محمد امین خاں کو اپنے مکان پر بلا کر قید کر لیا۔ اور اگرچہ دو چار روز کے بعد شاہجہاں کے سمجھانے سے قید سے چھوڑ دیا۔ مگر میر بخشی کے عہدہ پر نہ رہنے دیا۔ چنانچہ داراشکوہ اور اورنگ زیب کی لڑائی کے وقت بادشاہی فوج کا میر بخشی عمدۃ الملک خلیل اللہ خاں تھا تمام ع

ہو گیا تھا کہ ہم کسی سے مغلوب نہیں ہو سکتے۔ اور کوئی ایسا مشکل کام نہیں جس کو ہم انجام نہ دے سکیں اور فوج کی ہمت و جرأت بڑھانے کو اورنگ زیب علانیہ کہتا تھا کہ داراشکوہ کی فوج میں تیس ہزار مغل ہمارے لئے اپنی جانیں لڑا دینے کو تیار ہیں۔ اور اُس کی یہ لاف زنی چنداں بے اصل بھی نہ تھی کیونکہ ناظرین کتاب جلد معلوم کرلیں گے کہ داراشکوہ سے فی الواقع بعض اُمرانے دغا بازی کی اب مرادبخش اگرچہ تیز مزاجی سے قیام کا متحمل نہ تھا اور اُس کا شوق یہی چاہتا تھا کہ آگے بڑھے چلے۔ لیکن اورنگ زیب نے روکا اور کہا کہ اس خوفناک دریا (نربدا)[1] کے کنارے ٹھیر کر ذرا دم لینا اور آرام کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ اِس صورت میں ہم کو اپنے دوستوں اور خیرخواہوں سے خط و کتابت کرکے دارالسلطنت کے حالات جانچنے اور معلوم کرنے کا موقعہ ملے گا۔ غرض کہ اب ان کا کوچ آہستہ آہستہ ہوتا تھا۔ اور آگرہ سے جو خبریں آتی تھیں اُن پر غور کرکے آگے کو بڑھتے تھے۔

شاہجہاں کی مجبوری اور داراشکوہ کی خودرائی

اس وقت شاہجہاں ایک عجیب ناامیدی اور غم میں مبتلا تھا۔ کیونکہ ایک طرف تو یہ دیکھتا تھا کہ اب یہ دونوں کسی طرح دارالسلطنت میں داخل ہوئے بغیر نہ رہیں گے۔ دوسری جانب داراشکوہ کو لڑائی کی بڑی بڑی تیاریاں کرتے دیکھکر اُسے سخت اضطراب ہوتا تھا کیونکہ خوب جانتا تھا کہ جن آفتوں کو وہ طرح طرح کی تدبیروں سے ٹالنا چاہتا تھا اب اس خاندان پر آنے والی ہیں۔ مگر داراشکوہ کی خواہشوں کو روک بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ اول تو بیماری کی سختیوں ہی سے چھٹکارا نہیں ہوا تھا اس کے علاوہ داراشکوہ کی منہ زوریوں سے مجبور ہو کر فوج اور ملک کے کام سے ہاتھ اٹھا بیٹھا تھا اور اُمرا اور وزرا کو کہہ چکا تھا کہ اُس کی اطاعت اور فرمانبرداری کریں۔ غرض کہ ان دنوں اُس کی یہ حالت تھی کہ گویا داراشکوہ تو بادشاہ اور حاکم تھا اور وہ نوکر اور محکوم۔

داراشکوہ کی فوج

اس لئے یہ کچھ تعجب کی بات نہیں کہ داراشکوہ نے بآسانی اس قدر فوج جمع کرلی جو ہندوستان میں کسی لڑائی کے موقعہ پر شاذ ہی کبھی ہوئی ہوگی۔ چنانچہ ایک لاکھ سوار[2] اور بتیس ہزار پیدل اور اسی توپیں اور بے انتہا نوکر چاکر اور بنئے بقال اور مزدور

[1] انگریزی میں نربدا ہی لکھا ہے مگر مترجم کی غلطی معلوم ہوتی ہے جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ آتے ہیں۔ س م ح

[2] عاقل خاں لکھتا ہے کہ قریب صد ہزار سوار کہ اکثرے نامدار و دیگر بندہائے سرکار عالم مدار و ملازمان سرکار خویش فراہم آوردہ" س م ح

اور حال جو رسد رسانی اور اور کاموں اور خدمتوں کے لئے صلح ہو یا جنگ . بہرحال درکار ہوتے ہیں جمع ہو گئے ۔ پس اکثر مورخ جو یہ لکھدیا کرتے ہیں کہ فلاں جگہ تین چار لاکھ آدمی کا لشکر تھا مجھے شک ہے کہ وہ غلطی سے ۔ بھیڑ کے لوگوں کو بھی لڑنے والے سپاہیوں کے شمار میں داخل کر لیتے ہیں۔

اگرچہ یہ بات مسلم ہے کہ دارا شکوہ کی فوج اس قدر زیادہ تھی کہ بظاہر اورنگ زیب کی سی دو تین فوجوں پر غالب آسکتی تھی (کیونکہ اول تو اُس کی سب قسم کی فوج چالیس ہزار سے کسی طرح زیادہ نہ تھی ۔ اور پھر تیز دھوپ اور گرمی میں کڑے کڑے کوچ کئے چلے آنے سے اکثر تھکی ماندی تھی) ، مگر اس پر بھی کسی کو اُس کی کامیابی کا یقین نہ تھا اس لئے کہ جن سپاہیوں اور سرداروں کی نسبت یہ بھروسہ ہو سکتا تھا کہ نمک حلال اور وفادار رہیں گے وہ صرف وہ لوگ تھے جو سلیمان شکوہ کے ساتھ گئے ہوئے تھے۔ اور دربار کے جتنے بڑے بڑے امیر تھے اُن کی طرف سے ایسے آثار ظاہر تھے کہ اُن کو نہ تو کچھ اُس سے محبت ہی ہے اور نہ کچھ اُس کا فائدہ ہی چاہتے ہیں۔

داراشکوہ کا جنگ کرنے پر اصرار

اس لئے اُس کے خالص خیرخواہوں نے نہایت منت اور سماجت سے یہ صلاح دی کہ آپ اس خطرناک لڑائی کی سلسلہ جنبانی نہ کریں اور خود شاہجہاں کی بھی نہایت مضبوطی کے ساتھ یہی رائے تھی بلکہ باوجود ضعف و نقاہت کے اُس نے یہاں تک کہا کہ میرا ارادہ ہے کہ اورنگ زیب کے مقابلہ کو بذات خود جاؤں اور فی الواقع یہ تدبیر نہایت ہی عمدہ اور معقول تھی اور ضرور لڑائی ٹل جاتی اور اورنگ زیب جو نہایت ہی مغرور ہو رہا تھا اس طریق سے اُس کی کامیابی بے شک رُک جاتی اور اول تو اورنگ زیب اور مراد بخش باپ کے ساتھ غالباً مقابلہ سے پیش ہی نہ آتے ۔ اور اگر ایسی حرکت کر بھی بیٹھتے تو یقیناً تباہ اور برباد ہو جاتے ۔ کیونکہ اورنگ زیب اور مراد بخش کے سب سردار اور اہل فوج بادشاہ کے دل سے گرویدہ تھے اور جب اُس نے کسی طرح سے بھی اُن کی اس صلاح کو نہ مانا تو مجبوراً انھوں نے یہ سمجھایا کہ سلیمان شکوہ جو آپ کی امداد کے لئے بہت جلد چلا آرہا ہے اُس کے آجانے تک توقف کیجئے ۔ اور فی الواقع یہ بھی ایک اچھی اور مفید صلاح تھی کیونکہ اس نوجوان شاہزادہ سے اکثر لوگ راضی تھے اور محبت رکھتے تھے اور وہ اپنے ساتھ ایک ایسی فوج

ملنے آتا تھا جس میں اکثر دارا شکوہ کے ذاتی ملازم تھے اور سلطان شجاع پر ابھی فتح پا چکی تھی۔ لیکن اس کو بھی نہ مانا کیونکہ اُس نے یہی ایک بات ٹھان لی تھی کہ اپنے اس ارادہ پر قائم رہ کر جس طرح بن پڑے اورنگ زیب سے سبقت لے جانا چاہیے۔ اگر دارا شکوہ خوش نصیب ہوتا اور موقعہ شناسی سے کام کرتا تو غالباً بازی لے جاتا[1]۔

جن خیالوں سے اُس نے ان تجویزوں کو نہ مانا اور جلدی سے بھڑ جانا ہی پسند کیا ان میں سے ایک تو یہ تھا کہ اُس نے سوچا کہ اس وقت بادشاہ یہاں تک میرے قابو میں ہے کہ اُس کی ذات خاص پر بھی مجھے اختیار کلی حاصل ہے۔ دوسرا یہ کہ بادشاہی خزانہ سب میرے قبضہ میں ہے۔ تیسرا یہ کہ کل بادشاہی فوج میرے تحتِ حکومت ہے۔ چوتھا یہ کہ سلطان شجاع نے ایسی شکست کھائی ہے کہ گویا تباہ ہی ہو چکا ہے اور اورنگ زیب اور مراد بخش جو ایک کمزور اور تھکی ماندی فوج لے کر آئے ہیں گویا "بپائے خود بگور آمد" کا مصداق بننے کے لئے آئے ہیں اور اس حالت میں اگر ان کو ایک بار شکست مل جائے گی تو پھر کہیں ان کا ٹھور ٹھکانا نہ رہے گا اور اس طرح سے روز روز کا قصہ ایک ہی دفعہ پاک ہو کر بلا شریک و سہیم سلطنت کا مالک اور بادشاہ بن جاؤں گا۔ اور یہ بھی خیال کیا کہ اگر خود بادشاہ کو مقابلہ کے لئے جانے دوں گا تو ضرور صلح ہو جائے گی اور سب

[1] عاقل خاں لکھتا ہے کہ چونکہ دارا شکوہ کو ناتجربہ کاری کی وجہ سے لڑائی بھڑائی کے کام کی بالکل لیاقت نہ تھی اور اُس کی اکثر تدبیریں نامناسب اور خلاف عقل ہوتی تھیں اس لئے اس خاندان کے خیر خواہوں نے ہر چند عرض کیا کہ یہ آگ جو بھڑکی ہے آپ تدبیر کے بغیر بجھنی مشکل ہے اور حضرت (بادشاہ) کو ایک فریق بنانا مناسب نہیں اورنگ زیب اور مراد بخش کو آنے دینا چاہیے اور جب حضرت کے ارشاد سے بادشاہی اُمرا اُن سے علیحدہ ہو جائیں گے تو اُن میں خود ہی مقابلہ کی طاقت نہ رہے گی اور جو کچھ حضور فرمائیں گے اورنگ زیب کو اُس کی مخالفت ناممکن ہوگی۔ مگر جب تک بادشاہی اُمرا اُن کی رفاقت میں ہیں کوئی تدبیر پیش نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ بادشاہ نے بھی اس رائے کو نہایت پسند کیا۔ مگر دارا شکوہ نے راؤ ستر سال اور رام سنگھ کے اغواء سے منظور نہ کیا۔ بلکہ نفاق پر محمول کر کے علانیہ کہہ اٹھا کہ "من عنقریب ایں کوتہ پانچ ہارا (یعنی شرعی پانچوں والے مسلمان امیروں کو) در جلیب (ردلی) ستر سال خواہم مہ انید" (ستر سال تک دوڑاؤں گا) اور اس بات کے سننے سے سب امرا کیا تورانی اور کیا ایرانی بے دل ہو کر دہر دہ طرف ثانی کے جانب دار ہو گئے۔ س م ح ۱۲

بھائی اپنے اپنے صوبوں کو واپس چلے جائیں گے۔ اور بادشاہ جو پہلے کی بہ نسبت تندرست ہوتا جاتا ہے عنانِ حکومت پھر اپنے ہاتھ میں لے گا۔ اور امورِ سلطنت جس صورت پر پہلے تھے اُسی شکل پر پھر ہو جائیں گے اور سلیمان شکوہ کے انتظار کرنے کی نسبت اُس نے یہ سوچا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اُس کے آنے تک بادشاہ میری خرابی کے لئے کوئی منصوبہ باندھ لے یا اورنگ زیب ہی سے کوئی ایسا عہد و پیمان کرے جو میرے حق میں مضر ہو اور یہ بھی خیال کیا کہ اگر اُس کے آنے تک صبر کیا جائے اور بالفرض اس کے آنے کے بعد لڑائی میں فتح بھی حاصل ہو جائے تو لوگ اس کو سلیمان شکوہ ہی سے منسوب کریں گے جس کی بہادری کی پہلے ہی بہت کچھ دھاک بیٹھ گئی ہے اور اس حالت میں کون کہہ سکتا ہے کہ اس دل چلے اور نوجوان لڑکے کی طبیعت پر لوگوں کی تعریف و توصیف سے کس قسم کا اثر پیدا ہوگا اور جب کہ خاص دادا اور اُمرائے دربار تحسین و آفرین کریں گے تو کیا معلوم ہے کہ اُس کے خیالات کہاں تک بلند پروازی کریں اور باپ کی محبت اور ادب کا کچھ لحاظ باقی رہے یا نہ رہے۔

داراشکوہ میدانِ جنگ کی طرف

غرض کہ ان توہمات سے داراشکوہ بہک گیا۔ اور اپنے خیر خواہوں اور دوستوں کی نیک اور عاقلانہ صلاح بالکل نہ مانی اور فوج کو لڑائی کے لئے تیار ہو کر کوچ کرنے کا حکم دیا اور رخصت ہونے کو قلعہ میں بادشاہ کے پاس آیا۔ اور یہ بوڑھا باپ اول تو بیٹے سے بغل گیر ہو کر بے اختیار رونے لگا مگر پھر ذرا سنبھل کر بولا کہ "خیر بیٹا تم نے اپنی مرضی کا کام کیا۔ خدا تم کو اس میں سرخ رو اور کامیاب کرے۔ لیکن یاد رکھو کہ اگر لڑائی بگڑ گئی تو پھر آ کر مجھے کیا منہ دکھاؤ گے" مگر اُس نے ان باتوں کی کچھ پروا نہ کی اور جھٹ پٹ رخصت ہو کر چنبل کی طرف جو آگرہ سے قریب بیس فرسنگ کے ہے کوچ کر دیا اور اس خیال سے کہ مخالف فوج یہیں سے گذرے گی دریا کے گھاٹ روک کر مورچے جما دیئے[1]

---

[1] داراشکوہ نے اگرچہ اس دریا کے معروف گھاٹ سب ہی روک لئے تھے مگر دھول پور کے گھاٹ کو جہاں سے گوالیار اور دکن کا عام راستہ ہے خصوصیت کے ساتھ روکا تھا۔ یہ مقام اُس زمانہ میں خاص بادشاہی عمل داری میں تھا۔ مگر ہمارے اس وقت میں پرولیا گوت کے جاٹ قوم کے اُن رئیسوں کا دارالحکومت ہے جو پہ زمانہ سابق گوہد کے رانا کہلاتے تھے۔ اور گوالیار بھی انھیں کی عمل داری میں

اورنگ زیب کی فوجی چال

لیکن وہ تیز نظر اور سیاست داں "فقیر"[1] جس نے ہر جگہ جاسوس اور مخبر نگار رکھے تھے اس بات کو خوب سمجھے ہوئے تھا کہ اس قدر مخالف فوج کی موجودگی میں دریا سے اُترنا کس قدر دشوار ہے۔ مگر بہرحال اُس نے اپنے ڈیرے نیچے اُس پار آن لگاتے۔ اور عمداً ایسے نزدیک قائم کئے کہ دارا شکوہ اُن کو دیکھ سکے اور اس کے ساتھ ہی یہ تدبیر کی کہ چمپت[2] نامی ایک راجہ

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ - تھا۔ مگر مرہٹوں کے زور کے زمانہ میں وہ ریاست ان کے ہاتھ سے نکل گئی اور اس کے عوض سرکار انگریزی کی اعانت سے وصول پوری کی تی۔ ریاست قائم ہوگئی جس کا رقبہ ایک سو ساٹھ میل مربع اور آبادی قریب دولاکھ اور آمدنی دس اور گیارہ لاکھ کے اندر ہے۔ نوجوان فی حال مہاراج رانا نہال سنگھ صاحب بہادر عالی شان خاندان پٹیالہ کے نواسے ہیں۔ اور یہ بااختیار ریاست ہے اور گورنمنٹ قیصریہ کی طرف سے رئیس کے لئے پندرہ توپ کی سلامی مقرر ہے۔ س م ح

[1] چونکہ شاہزادگی کے زمانہ میں اورنگ زیب ریاکاری سے اپنی نسبت اکثر فقیر کا لفظ استعمال کیا کرتا تھا اس لئے مصنف کہیں کہیں طنزاً اس لفظ کا اعادہ کرتا ہے۔ س م ح

[2] یہ بھدا ور کا راجہ تھا جو باشندوں کی قوم کے نام کی مناسبت سے آگرہ کے قریب چنبل کے دونوں طرف کے اُس قطعہ ملک کو کہتے ہیں جس میں بھدو. یہ گوت کے راجپوتوں کی آبادی ہے۔ اس خاندان میں ریاست کی صورت کسی قدر اب تک بھی قائم ہے اور گورنمنٹ عالیہ قیصریہ کی طرف سے کچھ تو گاؤں معاف ہیں اور کئی ہزار روپیہ نقد عنایت ہوتا ہے جو مل جل کر قریب ایک لاکھ روپیہ سال کی آمدنی ہو جاتی ہے۔ اور موضع کچھوا جس کو عموماً گھاٹ کا گاؤں کہتے ہیں آج کل ان کا ریاست گاہ ہے جو دریائے جمنا کے کنارے پرگنہ باہ پناہٹ ضلع آگرہ میں واقع ہے۔ اور اگرچہ اختیار فرماں روائی حاصل نہیں ہے مگر رئیس کو مہاراجہ کا خطاب ہے اور عزت و آبرو اب بھی بہت خاصی ہے۔ چنانچہ ایک بڑے دربار میں جو نومبر ۱۸۶۶ء میں لارڈ لارنس صاحب بہادر وائسرائے و گورنر جنرل کشور ہند نے بمقام آگرہ نہایت شان و شوکت سے کیا تھا اور جس میں میں خود بھی موجود تھا مہاراجہ بھدا ور کی کرسی سندھیا جے پور - جودھپور وغیرہ بڑے چھوٹے چوبیس فرماں روا رئیسوں اور چھ مغلیہ خاندان کے شاہزادوں - اور مہاراجہ وزیانگرام (رئیس بے اختیار متعلقہ احاطہ مدارس) اور مہاراجہ بلرام پور اودھ کے تعلقدار اعلیٰ کے بعد تیئیسویں نمبر پر اور بہت سے بے اختیار راجاؤں اور سرداروں سے اوپر تھی اورنگ زیب چنبل کے جس گھاٹ سے پایاب اُترا تھا۔ باوجود کوشش کے اُس کا پتہ نہیں لگ سکا مگر عاقل خاں کی تاریخ اور عالمگیرنامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بھدا ور کے راجہ نے نواح گوالیار میں حاضر ہوکر اس خدمت

کو کچھ انعام و اکرام اور وعدے وعید دے کر یہ بند و بست کر لیا کہ فوج اُس کے علاقہ میں سے گذر کر فوراً اُس گھاٹ کو جالے جو پایاب تھا۔ اور اس راجہ نے اُس بَن اور کوہستان کے مشکل راستہ سے جس کی نسبت داراشکوہ کو شاید یہ گمان تھا کہ اس طرف سے اورنگ زیب نہ آسکے گا خود ساتھ ہو کر عبور کرا دینے کا ذمہ لیا۔ اور اس تجویز کے موافق مخالفوں کو دھوکا دینے کے لئے ڈیرے خیمے بدستور کھڑے چھوڑ دیئے اور خود معہ فوج چل دیا۔ اور دشمن کو خبر ہونے سے پہلے چنبل سے اُتر آیا۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ کے بجا لانے کا ذمہ لیا تھا اور اورنگ زیب نے کارخانہ جات شاہی کو کواری کی سرائے میں چھوڑ کر اُس ملک کے پچیس کوس کی مسافت کو دو منزلوں میں طے کر کے ماہ رمضان کی پہلی تاریخ ۱۰۶۸ھ ہجری کو ایک غیر مشہور گھاٹ سے جو گوالیار سے دھول پور کی طرف آتے ہوئے داہنے ہاتھ تھا۔ عبور کیا تھا۔ س م ع

۱ اس موقعہ پر بیگم صاحب نے جو خط اورنگ زیب کو لکھا تھا (جس کو خود شاہجہاں کی طرف سے سمجھنا چاہیئے) اور اس کے جواب میں جو عریضہ اس نے باپ کی خدمت میں بھیجا تھا وہ دلچسپ سمجھکر تاریخ عاقل خاں سے یہاں نقل کئے جاتے ہیں "للہ الحمد و المنت کہ ذات مقدس شاہنشاہ معدلت پژوہ وقیقہ رس اعلیٰ حضرت ظل سبحانی منظور انظار عنایات ربانی صاحب قران ثانی از سایر عوارض و امراض جسمانی کہ لازمہ نشاء بشریت و طبیعت انسانی است منزہ و مبراست و توجہ عالم آرا در باب رفاہیت برایا کہ ودایع بدایع الٰہی اند وا نیست ملک بہ وجہ اتم مبذول و بہ مقتضائے طبع نصفت آگین اشرف ہیچ تقضیے را نمی پسندند کہ مصدر حرکتے و مظہر امرے کہ مستلزم بے جمعیتی خلایق و متضمن ضرر و ضیر طوائف انام باشد گردد خاصتہً از فرزندان نامدار و ابنائے کامگار سیا دریں ایام کہ خاطر مقدس بہ تدارک و تلافی وہن و فتورے کہ بسبب بیماری آں برگزیدۂ انفس و آفاق بحال کافہ برایا و عامہ رعایا راہ یافتہ باقصی غایت متوجہ و متعلق است التہاب نوایر فتنہ و فساد و اشتعال آتش کین و عناد کہ مورث ویرانی بلاد و خرابی عباد است معاذ اللہ موجب مزید آزار خاطر ہمایوں و سبب کثرت حزن و ملال طبع مقدس خواہد بود بہ تخصیص ظہور ایں نشاء ناپسندیدہ و وقوع ایں امر نامرغوب ازاں برادر ہوشمند بیدار مغز کہ آراستہ بمزایائے لطیفہ ماخلاق کریمہ و صاحب آداب حمیدہ و طبع سلیمہ است بغایت زشت و نازیبا۔ لاجرم بنا بر خیر طلبی ایں چند کلمہ کہ ہر آئینہ متضمن فوائد عظیمہ و موجب حسن نیہ و تطہیر ساحت باطن و تصفیہ طریق معاد از خس و خاشاک امور ردیہ و شیون ذمیمہ است حسن نگارش پذیرفت اگر غرض آں برادر والا گہر از مہ توجہ بہ تہییج غبار فساد و عناد و التہاب نوایر حرب و قتال است خود انصاف

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ - فرمایند کہ دریں ابر مرشد و تمہید حقیقی کہ رضائے او موجب خوشنودی خدائے عزوجل و رضامندی رسول اوست - ہنگامہ جنگ و جدال و حرب و قتال آراستن و بر سفک دمائے بے گناہان ہمت گماشتن و بر روئے آنحضرت تیر و تفنگ انداختن بجز مایہ ناشایان است و فقرۂ آں دریں نشار جنبئی رو در آں نشا غیر بہ سرانجامی نیست ما گر آرائش ہنگامہ مخاصمہ و مقاتلہ از مہر شاہ بلند اقبال رو دارا شکوہ است نیز و تا تن دیں و خرد صواب گزین پسندیدہ نباشد زیرا کہ برادر بزرگ شرعاً و عرفاً حکم پدر دارد و این معنی را با مرضیات خاطر مقدس حضرت ظل الٰہی و تمنیات طبع والائے شہنشاہی مباینت تامہ متحقق است۔ بالجملہ انبعاث غبار ہیجا و ایقاد نوایر وغا و ترتیب اسباب رزم و خوں ریزی و تصمیم عزیمت حرب و فتنہ انگیزی ازاں برادر ہوشمند والا گہر کہ بہ محامد اوضاع و محاسن اطوار و مکارم اخلاق موصوف و معروف جہان گشتہ بودہ و در استرضائے خاطر اقدس خاقان خجستہ منظر و شاہنشاہ فرشتہ سیر ملکوت شعار ہیچ وجہ و باہیچ کس پسندیدہ نیست چہ توقف چند روزہ دریں دار بے ثبات و قرار و مستلذات ابلہ فریب ایں سرائے مستعار کہ باعث ارتکاب چنیں امر مذموم و ناپسندیدہ باشد موجب ملالت نشا ایں دو طراز ساعت سرائے خلد است و ممکن کہ نکو گوہران چنیں نکنند - مناسب آنست کہ آں برادر نامدار ازیں امور رویہ و اعمال شنیعہ کہ نتیجہ سوء خاتمت و ثمرہ وخامت عاقبت ست اجتناب لازم شمردہ در استرضائے خاطر قدسی مناظر شاہنشاہ دین پرور و خاقان معدلت گستر تا ممکن و مقدور سعی نماید و خوشنودی آنحضرت را از موجبات حصول سعادت دارین فرا گرفتہ از ارادۂ ... م متابعان حضرت خاتم النبیین در ماہ مبارک رمضان محترز باشد و احکام مرشد و ولی نعمت و والی سلطنت را بجان و دل امتثال نماید کہ فی الحقیقت بہ مقتضائے اولی الامر منکم امتثال امر شاہنشاہ حقیقی است و مقدم در راہ خلاف خلیفۂ الٰہی سپردن مخالفت فرمان مالک الملک نمودن است و اگر مطلبے و غرضے غیر ازیں مرکوز خاطر عزیز بودہ باشد - پس پسندیدۂ عالم خرد آنست کہ در سرزمینے کہ مضرب خیام شدہ باشد توقف اختیار نمودہ ہر مطلبے کہ مکنوز خاطر گرامی است مرقوم گردانند تا بعرض اقدس والا رسانیدہ مطابق اقتضائے خاطر عزیز و تمنائے طبع گرامی سرانجام دادہ آید و در اسعاف و انجاح مقاصد و مآرب آں قرۃ باصرۂ سلطنت و جہانبانی سعی و اجتہاد وافی بہ تقدیم رسانیدہ شود۔

اورنگ زیب نے کسی مصلحت سے بہن کو تو اس کا جواب نہ لکھا مگر خود باپ کے نام مندرجہ ذیل عرضی بیگم صاحب کے بخشی محمد فاروق کو جو یہ خط لایا تھا دیدی اور آگرہ کی جانب کوچ کر دیا۔

* دریں ایام زمام مہام سلطنت و دارائے و عنان امور ملکی و مالی از قبضہ اختیار حضرت بیروں رفتہ

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ اعلام تغلب و اقتدار شاہزادہ کلاں (دارا شکوہ) در قبض و بسط امور سلطنت و فرمان دہی بجائیکہ ارتفاع پذیرفتہ کہ اندازۂ آں بہ حوصلۂ تقریر و تحریر نمی آید و از بنا بر قدرت و مکنت خویش ہمت باستیصال نہال وجود خواں مقصود گردانیدہ روز بروز سعی در اجہادش دریں باب بہمت تزاید می پذیرد۔ چنانچہ سلیمان شکوہ را با فواج گراں بر سر شاہ شجاع کہ پسر رشید آں حضرت است تعین کردہ ناموس و نام فتح و دو سالہ را (کیونکہ یہ واقعہ شاہجہاں کے بتیسویں سال جلوس میں ہوا تھا) بباد و فنا دادہ و آنجناب (شاہ شجاع) چہ مایہ ذلت و خفت از تو اسر پرویز (شاہجہاں کے ایک سوتیلے بھائی کا نام تھا جس کی بیٹی سلیمان شکوہ کی ماں تھی) کشیدہ در پیش اہل جہاں شرمسار و خجل گردیدہ و ہم چنیں بہ ہوائے نفس و خواہش طبع خویش بنائے کار برآں نہادہ پیوستہ در تفحص و تفتیش احوال و تفضیح و تخریب حال ایں نیاز مند بذل جہد می نماید و ہمیشہ کارہائے مباین دین و ملت کہ متلزم فساد امور بلاد و عباد باشد از و بظہور می رسد و ابواب منافع و مداخل بر روئے روزگار ایں خیر خواہ مسدود گردانیدہ اقواع منقصت و اقسام مضرت رسانیدہ در ایامے کہ حسب الاشارہ اقدس بر ولایت بیجاپور لشکر کشیدہ بہ تسخیر بعضے از قلاع آں ولایت می پرداخت و امراء و سپاہ بہ محاصرہ اشتغال ورزیدہ داد جاں فشانی می دادند و مخالفان از اطراف و جوانب ہجوم آوردہ در صدد ممانعت و مدافعت بودند اخبار موحشہ بیماری ذاتِ مقدس شیوع یافتہ باعث تحیر و تفکر اولیاء نیکی و شوخی اعدا شدہ بود و محصوران گلبرگہ کہ جاں بازان موکب اقبال بعد از تسخیر قلعہ بیدر بہ کلیانی بہ محاصرۂ بلدۂ مذکور پرداختہ بودند در مضیق محاصرہ دل تنگ تر از غنچہ شدہ کار بداں قریب گشتہ بود کہ صورت افتتاح رو نماید و مسند آرائے بیجاپور از ترک تاز بہادران اقلیم ستان بستوہ آمدہ در فکر آں فرو افتادہ بود کہ پیشکشے لائق سرانجام دادہ ولایت خود را از صدمۂ سپاہ فیروزی دستگاہ مصئون گرداند و الا بیم آں داشت کہ دلاوران موکب اقبال او را منقوب متاصل ساختہ ولایتش را ضمیمہ ممالک محروسہ گردانند در خلال ایں حال شاہزادہ کلاں ملاذ ماں خود را الطلب امرائے بادشاہی و تسلی و استمالت حاکم بیجاپور تعین نمود۔ آں ہا پیغام ہائے عنایت آمیز و مہربانی انگیز بہ والی بیجاپور رسانیدہ او را در ادائے لجاج و عناد نسبت با ایں مرید دلیر تر ساختند سرداران بادشاہی را بہ مبالغہ و اہتمام تمام از پیرامون بلدۂ گلبرگہ کہ کارش نزدیک بہ کشایش رسیدہ بود برداشتہ در رواں کردن و بردن آں ہا بدرجۂ نہایت مراتب تاکید و اجہاد بطور رسانیدن کہ فرصت رخصت و مجال وداع نیافتہ و ایں خیر خواہ را نمیدہ بر جناح استعجال عازم درگاہ جہاں پناہ شدند از یں جہت تا فیہ وقت بریں نیاز مند بغایت تنگ گشتہ۔ بورطۂ تحیر و تفکر در افتادہ بحکم ضرورت کار صورت یافتہ و بانجام رسیدہ را برہم زدہ محض نہ نیروئے اقبال بے زوال خود را از ان سیہ چال

داراشکوہ کی جلدبازی

اب داراشکوہ کو بھی مجبوراً اپنے مورچے چھوڑ کر اس کا تعاقب کرنا پڑا جو چنبل سے اتر کر بڑی سرعت کے ساتھ جمنا کے کنارے پہنچ گیا اور فوج کو آرام دینے کی غرض سے مورچے جمائے دیکھ رہا تھا کہ داراشکوہ کب آتا ہے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ خطر برآوردہ ہزاران جرثقیل واصابہ نذا ایزرسمان انبوہ نیم بما آمدہ سالما ہمانجے رسید۔ عیاذاً باللہ۔ اگر چشم زخمی می رسید در اکناف واطراف جہاں شہرت یافتہ کہ بدنامی خلل خفت وذلت سالہائے دراز بر روئے دولت پائدار می ماند و بر جریدۂ روزگار ثبت می گردید و پیداست کہ تدارک وتلافی آں بواسطہ عدم دوربینی وناعاقبت۔ اندیشی شہزادۂ کلاں کہ محض روائی کار خویش مطمح نظر داشتہ اگر عالمی را آب فرو بردے نہ آرد از دائرہ امکان وحیز قدرت بندہائے بادشاہی بیرون بود ایں مرید از بس ممارست در معرکہ جاں بازی ومہارت در کار نبرد و پیکار وآشنائی باشیوہ ستیزہ وران ایں دیار از ہجوم وازدحام اعدا حسابی نہ گرفتہ بہ چخماق جلادت فرق مخالفان کوفتہ باستظہار اقبال لشکر را از آں گرداب شورش وفساد در ضمان سلامت بیروں آورد وغریب تر آنکہ باہمہ بے مددی وخسارت وکار شکنی وخصومت کہ در ایران وتوران اشتہار پذیرفتہ اکتفا نہ کردہ محال برار را (یعنی برار جو فی زمانہ ریاست حیدرآباد دکن کا ایک جزو مگر گورنمنٹ انگریزی کے زیر انتظام ہے) بے سابقہ تقصیر وکوتاہی از جاگیر ایں خیرخواہ رضا طلب کہ جز ارادت واخلاص ولاے دیگر را بخاطر راہ نمادہ تغیر کردہ با پٹھان ناخلفی زیادہ سری (مراد بخش) کہ پا از حد بیرون نہادہ مرتکب انواع گستاخی ومصدر تقصیرات عظیم گشت ولوائے بے اعتدالی وافساد در عرصہ بغی وعناد برافراشتہ تنخواہ نمودہ کیفیت حال دامی را بواسطہ خواہش نفس خویش بخلاف واقع بعرض اشرف رسانیدہ بمحض بہتان وافترا انیال حال ایں خیراندیش را فنہا تا لو دجرلم ولوث آلودہ ذمایم وانمودہ با نجاح تمام جسونت سنگھ را بالشکر گراں بر سر ایں فدائی گماشت ومطمح نظر آں داشت کہ بدین ضمن ولایتے مختصر (یعنی صوبہ داری دکن) کہ از پیشگاہ عاطفت واشفاق حضرت بایں مرید مرحمت شدہ بہر بہانہ کہ میسر آید انتزاع نماید وایں فدوی را آوردہ خیابانی بیکسی وغربت وآسیمہ سر صحرائے محن وکربت گرداند وبسکہ از راہ ودمہ دوستان در مزاج اقدس تصرف کردہ حضرت قول او را تصدیق فرمودہ ساز فرزندان اخلاص طینت را دشمن دولت ذا گر فتہ در حق ایں سرگرداناں سراب گاہ حیرت ہر چہ او تجویز می نماید بے تامل حکم می فرمایند وتعلقا تفحص وتفتیش حال ایں بے گناہاں توجہ وغور در امور ملکی ومالی نفرمودہ زمام رتق وفتق مہام جزی وکلی بکف اختیار وقبضہ اقتدارش باز گزاشتہ اند ولوخود بے غائلہ شک وشائبہ ریب تشنہ خون ایں بے گناہان است۔ چوں کار بایں حد رسیدہ وصورت حال بدیں منوال انجامیدہ حفظ جان وپاس ناموس ہر ماز متمات عالم وتحمات لشاہ فرو داشتہ عازم استلام شدہ سدرہ منزلت سپہر احتشام گردیدتا صورت حال بہ حجج وبراہین معقولہ در خدمت عاکفان پایۂ اورنگ جہانبانی

د یہ جگہ جہاں اس نے اپنے مورچے قائم کیے تھے آگرہ سے قریب پندرہ میل کے ہے اور اس کا نام پہلے سوگڑھ تھا اور اب اس وجہ سے کہ اورنگ زیب نے یہاں فتح پائی تھی فتح آباد کہا

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ مکشوف گرداند فرد عدل سلطان گرنپرسد حال مظلومان عشق۔ گوشہ گیران را ز آسائش طمع باید برید۔ چوں این خیرخواہ قطع مسافت نمودہ بحوالی اُجین فایز گردید جسونت سنگہ باشارہ شاہزادہ کلاں با بنیاد و آثار امیں خیرخواہ مامور بود بہ سلسلہ جنبانی جہل و نادانی سنگ راہ گشتہ بہ قدم ممانعت پیش آمد و بے ملاحظہ آداب و حقوق دلیرانہ تحکم نمود چندانکہ مردم ہوشمند سخن دان فرستادہ بعنوان معقول آں جھول را بارلوہ خود آگاہی بخشیدہ و تصریح نمود کہ محرز سعادت حضور فائض النور و محرم طواف کعبہ آمال بندگان نزدیک و دورست چہ مانع سعادت می شود۔ آں ناعاقبت اندیش اصلاً بمعقولیت آشنا نہ شدہ بہ تکلیف جہالت و غرور بیشتر در مراتب منع افزود و لاجرم پنبہ جہل و پندار پوچ از گوش ہوش او کردن و حلقوم جھول را از پیش راہ برداشتن بہ حکم ضرورت بر ذمہ ہمت عقیدت تہمت واجب گردید و اگر غیر از تحصیل سعادت زمیں بوس اشرف و اعلیٰ مرے دیگر مرکوز خاطر می بود بر ضمیر خورشید تنویر ہمایوں روشن و ہویداست کہ اسیر کردن او ر دنقائش کہ چنیں شکست فاحش یافتہ بحال منکر سراسیمہ گرد وادی انہزام گشتہ بودند چنداں تعذرے نداشت واکنوں کہ شاہزادہ کلاں خود با سپاہ گراں تا وصول پور تشریف آوردہ معابر چنبل و مسالک راہ مسدود ساختہ و جا بجا مردم خود گماشتہ باعتقاد خویش راہ عبور بر ہمیں خیراندیش بستہ بودند۔ چوں امیں مرید را غیر از ادراک دولت حضور بہ نور با ہیچ کس سر مقابلہ و پیکار نبود و نیست۔ از راہ بعدا در از آب چنبل عبور نمودہ عازم زمیں بوس اقدس گشت و چنیں شنیدہ می شود کہ آنجناب (دارا شکوہ) حرماں ایں ارادت سرشت اخلاص کیش از سعادت خاک بوس ہمایوں خواستہ قصد اشتعال نائرہ قتال پیش نہاد ہمت دارند۔ چوں آنجناب را با چوں من مرید ارادت پرست بمقابلہ و ممانعت پیش آمدن و ہنگامہ حرب و معارف آراستن عقلاً و نقلاً منجمہ میزان استحسان نیست لازم کہ از سلوک مسلک عناد و اعتساف انحراف نمودہ از اقدام بر امرے کہ نتیجہ اختلال احوال خلائق باشد اجتناب و احتراز نمایند و اگر بنا بر توغل در لجہ غرور و استکبار و نظر بر کثرت اعوان و انصار خواہ مخواہ بافروختن آتش کارزار و گرم نمودن بازار پیکار ہمت گمارند۔ فدوی عقیدت گزیں نیز بحکم الضرورت تبیح المحظورات مرفہ نخواہد کرد و پسندیدہ عالم صواب آنست کہ بزرگی را کار فرمودہ بساط کرد فرو پیچند و بالفعل بہ صوب ولایت پنجاب کہ در جاگیر آنجناب مقرراست شتافتہ چندے خدمت حضور ہمایوں را بایں خیرخواہ سراپا اعتقاد واگزارند بعد ازاں سرچہ در مرآت رائے جہاں آرا جلوہ ظہور نماید شرف بروز خواہد یافت۔ س م ح

جاتا ہے ، پس وہ بھی جھٹ پٹ آن پہنچا اور اورنگ زیب کے لشکر اور آگرہ کے مابین جمنا کے کنارے ڈیرے آن لگائے ۔ مگر تین چار روز تک دونوں لشکر آمنے سامنے اسی طرح چپ چاپ پڑے رہتے اور اس عرصہ میں اگرچہ شاہجہاں نے خط پر خط بھیجے اور لکھا کہ سلیمان شکوہ قریب پہنچ گیا ہے خبردار ہو سوئے تدبیری سے سوتوجہ جلدی نہ کر بیٹھنا بلکہ مناسب یہ ہے کہ آگرہ سے کسی قدر اور قریب ہو جاؤ اور سلیمان شکوہ کے آجانے تک لشکر کو کسی مناسب جگہ ٹھیرا کر اردگرد خندق کھدوا لو اور مورچے باندھ لو مگر اس نے ان کے جواب میں صرف اتنا ہی لکھ بھیجا کہ حضور کچھ اندیشہ نہ فرمائیں انشاء اللہ تعالیٰ تین دن گذرنے نہ پائیں گے کہ اورنگ زیب اور مراد بخش کو ہاتھ پاؤں باندھ کر حاضر کر دوں گا اس وقت حضور کو اختیار رہے کہ جو مناسب ہو ان کو سزا دیں اور یہ جواب روانہ کر کے لڑائی کی تیاری شروع کر دی[1]

دارا شکوہ کی صف آرائی

چنانچہ سب سے آگے توپ خانہ قائم کیا اور آہنی زنجیروں سے توپوں کو اس طرح باہم جکڑ دیا کہ دشمن کے سواروں کو حملہ کر کے گھس آنے کی گنجائش نہ رہی اور اس کے پیچھے زنبورخانہ کے رسالوں کا پرا جمایا جن کے اونٹوں کی پیٹھ پر زنبورک جو ہمارے جہازی جزائلوں سے مشابہ ہیں کسے ہوتے ہیں اور یہ لوگ اُن کو اونٹ پر چڑھے چڑھائے آسانی بھر کر چلا سکتے ہیں اور ان کے پیچھے بہت سی صفیں پیدل بندوقچیوں کی تھیں اور باقی فوج سواروں کی تھی جن کے پاس یا تو تلواریں اور برچھیاں تھیں یا تلواریں اور تیر کمان ۔ چنانچہ برچھی تو راجپوتوں کا ہتھیار ہے ۔ اور تیر و کمان عموماً مغلوں کا ۔ اور یہ بات میں پہلے لکھ ہی چکا ہوں کہ آج کل ہندوستان میں گورے رنگ کے سب نووارد مسلمانوں کو خواہ عرب ہوں خواہ رومی ۔ ایرانی ہوں خواہ تورانی مغل ہی کہتے ہیں ۔

اس کے بعد دارا شکوہ نے فوج کے تین حصے قرار دیئے چنانچہ دائیں پرے کا سردار خلیل اللہ خاں کو بنایا جس کے تحت میں تیس ہزار مغل تھے اور بائیں پرے کی سرداری رستم خاں

---

[1] شاہجہاں نے جو حتی الامکان لڑائی کو روکنا چاہتا تھا باوجود ضعف و نقاہت اور شدت گرمی کے یہ چاہتا تھا کہ خود جا کر دونوں لشکروں کے مابین آ پڑے یہاں تک کہ بیڑہ منگوا بھیج دیا تھا ۔ اور بیماری کی وجہ سے یہ سواری کشتی موقعہ پر پہنچنا چاہتا تھا ۔ مگر اس وقت کے مورخوں نے لکھا ہے کہ [illegible] اس تجویز کو اپنے مدعا کے برخلاف سمجھ کر عمل میں نہ آنے دیا ۔ [illegible]

دکھنی کو جو بڑا شجاع اور نامور سردار تھا تفویض ہوئی اور راؤ ستر سال (ہاڑہ) اور رام سنگھ (راٹھور معروف روٹھلہ) کو اس کے شامل کر دیا۔ خلیل اللہ خاں کو دانشمند خاں کی جگہ (جس کی کچھ دنوں بعد میں نے ملازمت اختیار کرلی تھی) سواروں کی فوج کا بخشی یعنی سپہ سالار بنا دیا گیا تھا۔ اور اس کی یہ وجہ تھی کہ دانشمند خاں کو یہ بات ہرگز گوارا نہ تھی کہ کوئی شخص شاہجہاں کے شاہانہ اختیارات میں مداخلت کرے اور چونکہ یہ امر دارا شکوہ کی ناراضی کا باعث تھا اس لئے اُس نے اپنے منصب سے استعفا دیدیا تھا۔

اورنگ زیب اور مراد بخش نے بھی قریبًا اسی قاعدہ سے اپنی فوج کو میدان میں کھڑا کیا البتہ یہ بات زیادہ کی کہ اُمرا کی فوجوں میں جو دونوں طرف یعنی دائیں بائیں تھیں کچھ ہلکی توپیں پوشیدہ طور پر لگا دیں۔ کہتے ہیں کہ یہ حکمت میر جملہ کی بتائی ہوئی تھی جس کا نتیجہ کسی قدر اچھا ہی نکلا۔

ہندوستان کا طریقۂ جنگ مجھے معلوم نہیں کہ اس لڑائی میں کوئی اور جنگی حکمت بھی کی گئی ہو بجز اس کے کہ مقابل کی صف کے اکثر حصوں سے ایک قسم کے بان دونوں طرف کے سواروں پر چلائے جاتے تھے۔ جن سے اکثر گھوڑے بھڑک جاتے تھے اور کبھی کبھی کچھ آدمیوں کا بھی نقصان ہو جاتا تھا۔ مگر میں اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ یہاں کے سواروں کی چلت پھرت بہت اچھی ہے اور لڑائی کے وقت گھوڑوں کو بہ آسانی پھرانے اور چکر وغیرہ دینے میں بہت مشاق ہیں۔ اور تیراندازی تو ایسی عجیب سرعت کے ساتھ کرتے ہیں کہ جتنی دیر میں برقنداز وبندوقیں چھوڑے سوار چھ تیر چلا سکتا ہے۔ اور نہایت اچھی طرح سے صف بندی قائم رکھتے اور بخوبی مجتمع رہتے ہیں۔ خصوصًا حملہ کے وقت دشمن پر خوب اکٹھے ہو کر گرتے ہیں۔ مگر بایں ہمہ میں ان کو لڑائی کے فن میں فرنگستان کی فوج سوار کے مانند قابل اور ہوشیار نہیں سمجھتا۔ اور اس کا سبب اس کتاب کے ایک اور مقام میں بیان کروں گا۔

لڑائی کا مقابلہ اب لڑائی کی کیفیت سنئے کہ جس وقت دونوں طرف بخوبی تیاریاں ہو چکیں تو یہاں کے دستور کے مطابق اول گولہ چلنا شروع ہوا اور پھر تیر اس کثرت سے برسنے لگے کہ گویا بادل چھا گیا مگر لڑائی کی گرما گرمی میں یکایک مینہ کا ایک ایسا

پھیلتا پڑا کہ لڑائی جو خوب سرگرمی سے ہو رہی تھی تھوڑی دیر کے لئے ذرا ٹھنڈی پڑ گئی۔ مگر ہاتھی کے رکتے ہی پھر توپیں چلنے لگیں اور دارا شکوہ اس وقت سراندیپ کے ایک خوبصورت ہاتھی پر سوار ہو کر نکلا اور سب طرف سے دھاوا کرنے کا حکم دیتا ہوا بذات خود سواروں کی ایک فوج کے ساتھ دشمن کی توپیں چھین لینے کو بڑی جرأت سے بڑھا۔ مگر مخالفوں نے ایسی مستعدی اور استقلال سے مقابلہ کیا کہ دارا شکوہ کے ارد گرد آن کی آن میں کشتوں کے پشتے لگا دیئے اور نہ صرف وہ فوج جو اس کے ساتھ تھی بلکہ بہت سی اور بھی جو پیچھے سے آن ملی تھی سب تتر بتر کر دی لیکن دارا شکوہ ایک عجیب استقلال کے ساتھ میدان میں قائم اور ہاتھی پر بیٹھا چاروں طرف بڑی دلیری اور بے باکی سے برابر نظر ڈالتا ہوا لڑائی سنبھال لینے میں معروف تھا چنانچہ اس کی دیکھا دیکھی اہلِ فوج بھی دلیر ہو گئے اور نا مستقل مزاج اور تھڑدلے سپاہی جو جگہ چھوڑ گئے تھے پھر اپنے اپنے موقعہ پر آن جمے اور دارا شکوہ نے اگرچہ پھر کئی متواتر حملے کئے مگر اورنگ زیب تک نہ پہنچ سکا کیونکہ دشمن کے توپ خانہ نے اس قدر نقصان پہنچایا اور ایسا ڈر باندھا کہ بعض سپاہیوں کے دل چھوٹ گئے بلکہ کچھ بھاگ بھی نکلے لیکن دارا شکوہ کی شجاعت و دلیری نے ایسا اثر کیا کہ اکثر سپاہیوں نے منہ نہ موڑا اور اپنے بہادر سپہ سالار کی رکاب میں اس تیزی سے بڑھے کہ آخرکار توپوں تک جا ہی پہنچے اور اُن کی زنجیریں کھول ڈالیں اور دشمن کی خیمہ گاہ میں جا گھسے اور زنبور خانہ کے رسالوں اور پیادوں کی فوج کو مار کر بالکل بھگا دیا۔ مگر اس وقت سواروں کی فوجوں کے باہم نہایت ہی زور شور سے لڑائی ہوئی اور اس کثرت سے تیر برسے کہ آسمان کا دکھائی دینا دشوار ہو گیا یہاں تک کہ خود دارا شکوہ نے اپنا ترکش خالی کر ڈالا۔ مگر ان تیروں سے فریقین کا چنداں نقصان نہیں ہوا۔ کیونکہ ان میں سے نو تیر یا تو نشانہ تک پہنچتے ہی نہ تھے یا ادھر ادھر جا گرتے تھے جب ترکش خالی ہو چکے تو تلواروں کی نوبت آئی اور فریقین اس شدت سے لڑے کہ جس قدر سپاہی مارے جاتے تھے اُسی قدر جوش بڑھتا جاتا تھا اور دارا شکوہ بڑی شجاعت سے پکار پکار کر اہلِ فوج کو برابر تسلی اور بڑھاوے دیتے جاتا اور حملہ پر حملے کئے جاتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخرکار دشمن کے سواروں کو بھی بھگا دیا اور اورنگ زیب نے جو ہاتھی پر سوار اور نزدیک ہی تھا ہر چند سپاہ کے قائم رکھنے میں بہت کوشش کی

لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اگرچہ اپنے خاص الخاص سواروں سے کبھی چاہا کہ دارا شکوہ کو روکیں لیکن اُن کو بھی میدانِ جنگ سے نہایت ابتری کے ساتھ بھاگنا ہی پڑا۔ مگر واہ رے اورنگ زیب تیری دلاوری! جب دیکھا کہ تمام فوج بھاگ گئی اور جو لوگ اب تک صحیح و سالم و حاضر رکاب ہیں وہ بھی ایک ہزار سے زیادہ نہیں۔ (بلکہ میں نے سُنا ہے کہ صرف پانچ سو ہی کے تھے) اور اس حالت پر کبھی غور کیا کہ بلالحاظ زمین کی ناہمواری اور نشیب و فراز کے (جو دونوں لشکروں میں حائل تھی) دارا شکوہ اب ہماری اس تھوڑی سی باقی ماندہ فوج پر ضرور حملہ کرے گا تو ذرا بھی نہیں ڈرا بلکہ اپنے سرداروں کو نام لے لے کر پکارا کہ

"بہادرو! خدا پر نظر رکھو! بھاگنے سے کیا ہوگا: خدا سب جگہ ہے کیا تم نہیں جانتے کہ ملک دکن کس قدر دور ہے؟"

اورنگ زیب کی ثابت قدمی

اور اپنا یہ عزم جتانے کو کہ خواہ کچھ ہی ہو میدان سے ہرگز نہ ٹلوں گا یہ عجیب حکم دیا کہ "ہمارے ہاتھی کے پاؤں میں زنجیر ڈال دو" حقیقت یہ ہے کہ اگر اُس کے حاضر رکاب رفقا اور جاں نثار سردار اس نازک وقت میں وفاداری اور ہمت میں کچھ کمی کرتے تو ہاتھی کے پاؤں میں ضرور زنجیر ڈال دی جاتی مگر ان لوگوں نے بالاتفاق اپنی جان نثاری اور وفاداری کے مضبوط وعدوں سے اورنگ زیب کو ایسا نہ کرنے دیا اور دارا شکوہ نے اگرچہ نہایت کوشش کی کہ جس طرح ممکن ہو اورنگ زیب کو جالے۔ لیکن زمین کے نشیب و فراز اور دشمن کے شکست یافتہ سواروں کی وجہ سے جو اب تک میدان میں اور ٹیلوں پر ادھر ادھر موجود تھے گو بے ترتیب طور پر پھر رہے تھے اُس تک نہ پہنچ سکا۔ دارا شکوہ کا یہ خیال بے شک صحیح تھا کہ اورنگ زیب کے مارے یا پکڑے جانے کے بغیر فتح ناقص ہے اور چونکہ اورنگ زیب اب مقابلہ کے قابل نہ رہا تھا اس لئے اُس کو فی الواقع ایسا ہی کرنا واجب تھا کہ فوراً حملہ کرکے اپنے اس خوفناک رقیب کو بہ آسانی پامال کردیتا۔ لیکن بعض واقعات کے سبب سے جن کا ذکر میں ابھی کرتا ہوں دارا شکوہ کا خیال ایک اور طرف رجوع ہوگیا اور اورنگ زیب

لہ ہندوستان کے بہادر سردار کڑے وقت میں بھاگنے کی بہ نسبت جان دینے کو بہتر سمجھ کر ہمیشہ ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ م م ح

جو کھوں سے بچ گیا۔ یعنی دارا شکوہ کو اس خطرناک موقعہ پر اپنی فوج کے بائیں پرے میں بڑی ہل چل نظر آئی۔ اور اُس کا ایک مصاحب یہ خبر لایا کہ رستم خاں اور ستر سال کام آئے اور رام سنگھ روٹھلہ جو بڑی شجاعت کے ساتھ دھاوا کیے دشمن کی فوج میں جا گھسا تھا گھر گیا ہے۔ پس اورنگ زیب پر دھاوا کرنے کا ارادہ چھوڑ کر اسے بائیں پرے کی مدد کو نہایت جلدی کے ساتھ جانا پڑا اور دارا شکوہ کے بذات خود پہنچ جانے کی وجہ سے ایک سخت چپقلش کے بعد لڑائی کا رنگ پھر بدل گیا۔ اور چاروں طرف سے فوج مخالف کو پیچھے ہٹا دیا گیا۔ لیکن انھوں نے ابھی ایسی شکست نہیں کھائی تھی کہ دارا شکوہ کو بالکل بے فکری ہو جاتی۔ اس مارا ماری میں رام سنگھ روٹھلہ نے ایک بے نظیر شجاعت کے ساتھ مراد بخش کو جا زخمی کیا اور کمال دلیری سے اُس کی عماری کے چند رسوں کو کاٹ ڈالا اور قریب تھا کہ حریف کو ہاتھی سے گرا دے۔ مگر مراد بخش کی پھرتی اور شجاعت کے باعث ناکام رہا۔ مراد بخش اگرچہ زخمی[2] اور راجپوتوں کے نرغہ میں تھا لیکن ڈھال سے اپنے سات برس کے بچے کو جو پہلو میں بیٹھا ہوا تھا۔ بچاتے ہوئے بڑے استقلال سے بدستور لڑتا رہا اور تاک کر ایسا تیر مارا کہ یہ بہادر راجہ وہیں کھیت رہا۔ دارا شکوہ کو اگرچہ اس خبر سے بہت رنج ہوا۔ مگر چونکہ اُس نے سُنا کہ اپنے مالک کے مارے جانے کی وجہ سے راجپوتوں نے نہایت غیظ و غضب کے ساتھ مراد بخش کو گھیرا ہوا ہے۔ اس لئے باوجود چند طرح کی مشکلوں کے اُس نے یہی مناسب سمجھا کہ مراد بخش پر حملہ کیا جائے۔ اور اس صورت میں اگرچہ اورنگ زیب گرفتاری سے بچ جاتا تھا اور یہ ایک غلطی تھی مگر مراد بخش کے ہاتھ آ جانے کو بھی وہ اورنگ زیب کے پکڑے جانے سے

[1] رام سنگھ کا مراد بخش پر حملہ کرنا اور مراد بخش کے تیر سے اُس کا مارا جانا تو صحیح ہے مگر اس کے ہاتھی کے کچھار بند کو کاٹنے کے لئے کوشش کرنا درست نہیں کیونکہ فارسی تاریخوں سے بالاتفاق ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دلیرانہ حملہ خود اورنگ زیب کے ہاتھی پر ہوا تھا اور جس نے حملہ کیا تھا وہ مہاراجہ جسونت سنگھ جودھپور یہ کا چچیرا بھائی راجہ روپ سنگھ راٹھور تھا جو اورنگ زیب کے منع کرتے کرتے جواس کی اس بے مثل بہادری کی وجہ سے اس کو بچا نا چاہتا تھا لڑائی کے ٹھر لونگ میں اورنگ زیب کے سپاہیوں کے ہاتھ سے وہیں مارا گیا۔ س م ح

[2] تیروں کے زخم منہ پر لگے تھے۔ س م ح

کچھ کم نہیں سمجھتا تھا۔

دارا شکوہ کی شکست

لیکن خلیل اللہ خاں کے دغا دینے سے بازی بگڑ گئی۔ اور یہ دغابازی ایسی عجیب تھی کہ ایک آن کی آن میں دارا شکوہ کی دائمی بربادی کا سبب ہو گئی۔ یہ شخص داہنے پرے کا سردار تھا جس میں تیس ہزار مغل تھے۔ اور یہ ایسی اچھی فوج تھی کہ اورنگ زیب کی تمام سپاہ کے شکست دینے کو صرف یہی کافی تھی۔ مگر جب کہ دارا شکوہ بذاتِ خود بائیں پرے کی فوج کو بڑی شجاعت اور کامیابی سے لڑا رہا تھا یہ مطلقاً اس کا شریک نہ ہوا۔ اور یہ بہانہ بنا رکھا کہ

"ہماری فوج کے لئے تو یہ حکم ہے کہ بطور کمک اپنی جگہ قائم رہے۔ اور جب تک کوئی شدید ضرورت پیش نہ آئے ایک قدم آگے بڑھنے اور ایک تیر تک کے چلانے کا حکم نہیں۔"

مگر اصل یہ ہے کہ اُس کا اس طرح پر الگ تھلگ رہنا پرلے سرے کی بے ایمانی اور دغابازی پر مبنی تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اب سے چند سال پیشتر دارا شکوہ نے اُس کی کچھ بے عزتی کروا ڈالی تھی۔ اور اس کینہ کی آگ اُس کے دل کو جلاتے رکھتی تھی۔ پس اُس نے خیال کیا کہ بدلہ لینے کا اب وقت ہے مگر دارا شکوہ کا جو نقصان اس نے اپنے الگ رہنے میں سوچا تھا وہ نہ ہوا۔ کیونکہ دائیں پرے والوں کی مدد کے بغیر ہی وہ دشمن پر غالب آگیا تھا۔ مگر اس دغاباز نے اب ایک اور چال چلی یعنی جب کہ دارا شکوہ مراد بخش کے دبانے کو اپنی سپاہ کی امداد کے لئے جا رہا تھا یہ مکار معہ اپنے چند رفیقوں کے گھوڑا دوڑاتے آیا۔ اور دور سے پکار کر کہا۔

"مبارک باد حضرت سلامت! الحمدللہ الحمدللہ حضور کو بخیر و سلامتی بادشاہی اور فتح مبارک ہو! لیکن حضور یہ تو فرمائیں کہ ایسے خطرناک موقعہ پر جب کہ عماری کے سائبان سے کئی گولیاں اور تیر پار ہو چکے ہیں اتنے بڑے ہاتھی پر کیوں سوار ہیں۔ اگر خدانخواستہ ان بے شمار تیروں اور گولیوں میں سے کوئی جسم مقدس کو چھو جائے تو ہم لوگوں کا کہاں ٹھکانا ہے۔ خدا کے واسطے جلد اُتریئے اور گھوڑے پر سوار ہو لیجئے۔ اور اب کیا رہ گیا ہے۔ صرف اتنی ہی بات باقی ہے کہ ان چند بھگوڑوں کا زیادہ تر چستی اور مستعدی سے تعاقب کیا جائے۔"

اور میں پھر عرض کرتا ہوں کہ اب حضور ان کو اس قدر مہلت نہ دیں کہ بھاگ سکیں۔ اگر دارا شکوہ ہاتھی پر سے اُترنے کو نقصان سمجھتا اور یہ سوچتا کہ اس ہاتھی ہی کی بدولت آج میں کیسے کیسے کام کر سکا ہوں اور فوج کو میرے دکھائی دیتے رہنے سے کیسا کچھ فائدہ ہوا ہے تو وہ ہی تمام بادشاہت کا مالک ہوتا۔ لیکن زود اعتقاد اور سادہ شاہزادہ فریب میں آگیا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اُس کو شک ہوا۔ اور پوچھا کہ خلیل اللہ خاں کہاں ہے۔ مگر وہ اب کہاں تھا۔ اور کب اُس کے ہاتھ آتا تھا۔ اور دارا شکوہ اگرچہ اُس کو بہت بُرا بھلا کہتا رہا اور یہ بھی کہا کہ میں اُسے زندہ نہ چھوڑوں گا۔ لیکن اُس کا یہ غصہ اور دھمکیاں سب بیکار اور بے فائدہ تھیں۔ کیونکہ سپاہ نے جب دیکھا کہ ہمارا مالک ہاتھی پر نہیں ہے تو فوراً اُس کے مارے جانے کی افواہ اُڑ گئی۔ اور تمام فوج اس دھوکے میں پڑ کر حواس باختہ ہو گئی۔ اور عام تہلکہ پڑ گیا۔ اور سب کو اورنگ زیب کے قہر و غضب کے اندیشہ سے اپنی اپنی جان کی پڑ گئی۔ اور چند لمحہ میں تمام فوج تتر بتر ہو گئی۔ اور عجب انقلاب ہوا کہ غالب مغلوب اور مغلوب غالب ہو گیا۔ اور عجیب ماجرا ہے کہ اورنگ زیب نے صرف پاؤ گھنٹے ہاتھی پر سوار رہنے سے یہ نتیجہ پایا کہ تمام ہندوستان کا بادشاہ ہو گیا۔ اور دارا شکوہ کو چند لمحہ قبل از وقت اپنے ہاتھی پر سے اُترنے کا یہ پھل ملا کہ ہاتھی سے کیا اُترا گویا اوجِ سلطنت سے گر گیا۔ اور بدبخت بادشاہوں اور شہزادوں کی فہرست میں داخل ہو گیا۔ دیکھیے انسان کیا کوتاہ اندیش ہے۔ اور ایک چھوٹی سی بات سے اس دنیا میں کیسے کیسے بڑے نتیجے پیدا ہو جاتے ہیں۔

ہندوستان کی فوجی تنظیم اگرچہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بڑے بڑے لشکروں سے بڑے بڑے نمایاں کام بن پڑتے ہیں۔ لیکن فوج کی کثرت میں یہ بڑی خرابی ہے کہ ایک بار ابتر ہو جائے تو پھر اُس کو حالتِ سابقہ پر لانا مشکل ہو جاتا ہے اور جیسے کوئی بڑا دریا اُچھل کر کناروں سے باہر بہہ نکلتا اور اُس کا پانی پھیل جاتا ہے۔ اسی طرح ابتری کے بعد بڑے لشکروں کو قابو میں لانا ناممکن ہوتا ہے۔ چنانچہ میں جب ان بے انتظام[1] فوجوں کو دیکھتا تھا

[1] ہندوستانی مغل فوج کی تنظیم قدیم ترک فوج کی تنظیم کے اصول و قواعد پر ہی قائم تھی اور یہی وہ فوجی تنظیم ہے جس نے قسطنطنیہ پر پوری فوج کے ٹڈی دل کے چھکے چھڑا دیئے تھے یہ متعصب فرنگی سیاح صلیبی جنگوں اور عثمانی ترکوں کے مقابلہ کو بھول گیا ہے ورنہ وہ پرنس کانڈی اور مارشل تورین کا نام لیتے ہوئے شرماتا۔

کر جو انوں کے گلوں کی مانند چلتی ہیں تو ہمیشہ یہ خیال آتا تھا کہ ہمارے صرف پچیس ہزار کار آزمودہ سپاہی زیر حکم پرنس کانڈی یا مارشل تورین ہندوستان کی فوج پر جو کتنی ہی کیوں نہ ہو غالب آ سکتے ہیں اور جب میں کتابوں میں پڑھتا ہوں کہ یونانیوں کی دس ہزار سپاہیوں نے جو سکندر کے ساتھ تھے ایران کے بادشاہ دارا کے چھ سات لاکھ آدمیوں کے لشکر کو شکست دی تھی (بشرطیکہ یہ بات سچ بھی ہو کہ دارا کی فوج بھیڑ کے سوا فی الواقع اتنی ہی تھی) تو باقاعدہ اور بے قاعدہ فوجوں کی حالت پر لحاظ کرنے کے بعد مجھے ان روایتوں کی صحت پر کچھ تعجب نہیں ہوتا۔ اور میری دانست میں فرانسیسی سپاہ دشمن کے حملے کو اپنے معمولی استقلال سے رد کر کے ہر ایک ہندوستانی فوج کو سخت تہلکہ میں ڈال سکتی یا سکندر کی طرح دشمن کی صف کے ایک خاص حصہ پر اپنا تمام زور ڈال کر باقی سپاہ میں اپنا سخت خوف اور عام بدنظمی اور انتشار پھیلا سکتی ہے۔

اورنگ زیب کی شاطرانہ چالیں اورنگ زیب جو اپنی مطلب براری کے واسطے ہر شاطرانہ حرکت اور فن وفریب کے لئے ہمیشہ ہی تیار رہتا تھا یہ غیر مترقب اور خداداد فتح پاکر اور یہ سمجھ کر کہ میرے معمولی ہتھکنڈوں کے کام میں آنے کا اب موقعہ ہے اپنی مکاری کی چالوں اور توڑ جوڑ میں مصروف ہو گیا۔ چنانچہ سب سے پہلے، نامباز خلیل اللہ خاں آن موجود ہوا اور تسلیم بجالا کر عرض کیا کہ بجا آوری خدمات کے لئے حاضر ہوں۔ اور جس قدر فوج سردست اُس طرف سے پھٹ کر میرے ساتھ آسکی ہے وہ بھی حاضر ہے۔ چنانچہ شہزادہ (اورنگ زیب) نے بے حد اظہار عنایت کیا اور بڑے بڑے وعدے دیئے۔ مگر احتیاطاً سب وعدے مراد بخش کی طرف سے کرتا رہا۔ اور اُس کے پاس لے گیا۔ اور موقعہ وقت کے موافق اُس نے بھی بہت ہی کچھ آؤ بھگت اور خاطر داری کی اور اورنگ زیب اگرچہ بظاہر مراد بخش کو برابر شاہ ہندوستان کہہ کر گفتگو کرتا رہا اور خلیل اللہ سے کہا کہ

> صرف حضرت ہی تخت نشینی کے لائق ہیں۔ اور یہ فتح محض انھیں کی قابلیت اور شجاعت سے حاصل ہوئی ہے۔ مگر باطن کا یہ حال تھا کہ شب و روز امرائے سلطنت کو تحریریں بھیج بھیج کر بتدریج اپنی طرف متوجہ اور رجوع کرتا جاتا تھا۔

ان دنوں اورنگ زیب کا ماموں شائستہ خاں بھی اپنے اس بھانجے کے حق میں بہت کچھ کوشاں تھا۔ اور فی الحقیقت اُس کی مدد سے اورنگ زیب کو فائدہ بھی بہت ہی پہنچا۔ کیونکہ شائستہ خاں ایک چست وچالاک اور نہایت مدبر اور ذی اقتدار امیر تھا اور تمام ہندوستان میں اُس کے یہ اوصاف مشہور تھے کہ حسن تقریر اور خوبی انشا وتحریر و فصاحت بیانی اور شیریں زبانی سے بڑے بڑے کام نکال سکتا ہے۔ اور مشہور ہے کہ کسی حقیقی یا خیالی تحقیر کے باعث جو دارا شکوہ کی طرف سے اُس کی نسبت ظہور میں آئی تھی یہ اُس سے نہایت نفرت رکھتا تھا اور اسی وجہ سے دارا شکوہ کی بربادی کے لئے اس موقعہ کو اس نے بھی غنیمت سمجھ لیا تھا[1]

باوجود اس فتح کے حضرت اورنگ زیب بہادر اپنی وہی چال چلے جاتے تھے۔ یعنی بے غرضی اور خلوص نیت کے لباس میں حصول سلطنت کے منصوبہ کو پوشیدہ کئے ہوئے تھے اور جو کچھ پیام وسلام اور وعدے وعید اور کارروائیاں کی جاتی تھیں وہ سب مراد بخش کے نام سے ہوتی تھیں۔ اور اُسی کو بادشاہ بنا رکھا تھا اور اپنے تئیں صرف اس کا نائب اور ایک فرماں بردار خیر خواہ بیان کرتا اور ایسی باتیں بناتا تھا کہ سلطنت کی شان وشوکت اور کروفر گویا اُسے مرغوب ہی نہیں بلکہ فقیرانہ گذران کرنا اور حالت فقیری ہی میں مرجانا اُس کی دلی مراد اور عین تمنا ہے۔

داراشکوہ کا فرار

اس وقت دارا شکوہ خوف وخطر کے دریا میں ڈوبا ہوا سخت ناامید تھا۔ اگرچہ وہ فوراً آگرہ چلا آیا تھا۔ لیکن چونکہ وہ الفاظ اُس کو یاد تھے جو شاہجہاں نے لڑائی پر جاتے وقت کہے تھے۔ اس لئے بادشاہ کے سامنے نہ ہو سکا مگر شاہجہاں نے بہرحال ایک وفادار خواجہ سرا کی زبانی اس بدنصیب شہزادہ کی تسلی اور تسکین کے لئے یہ کہلا بھیجا کہ

"میں اب بھی تم کو ویسا ہی چاہتا ہوں اور تمہاری اس مصیبت کا مجھے بہت رنج ہے۔ بلکہ یہ بھی کہلا بھیجا کہ ابھی سلیمان شکوہ کی فوج اور لشکر

---

[1] اورنگ زیب سے سازش رکھنے کے شبہ میں مالوہ کی صوبہ داری سے تو پہلے ہی معزول ہو چکا تھا۔ جیسا کہ ایک حاشیہ میں ہم لکھ آئے ہیں۔ مگر اس کے بعد جاگیر بھی ضبط ہوگئی تھی۔ بلکہ دو چار روز قید رہنے کی بے عزتی کا بھی صدمہ اٹھا چکا تھا۔ س م ح

آپ صحیح و سلامت ہے نا اُمید ہونے کی کوئی بات نہیں۔ اور ہماری صلاح یہ ہے کہ بالفعل تم دہلی کو چلے جاؤ صوبہ دار کو حکم بھیج دیا گیا ہے وہ تم کو بادشاہی اصطبل میں سے ایک ہزار گھوڑا اور خزانہ اور ہاتھی دے گا۔ اور آگرہ سے دور نہ جانا چاہیے۔ بلکہ ایک ایسے معقول فاصلہ پر ٹھہرنا مناسب ہے کہ جہاں ہماری تحریریں تم کو آسانی ملتی رہیں۔ اور ہم کو اب تک یہ اُمید ہے کہ ہم اورنگ زیب کو قابو میں لا سکیں گے بلکہ سزا دے سکیں گے۔"

مگر دارا شکوہ ایسا شکستہ خاطر اور اس قدر غمگین تھا کہ ان محبت آمیز باتوں کا کچھ جواب نہ دے سکا بلکہ معقول طور پر اتنا بھی نہ کہہ سکا کہ آپ کا پیغام میرے پاس پہنچ گیا۔ اور اس کے بعد بیگم صاحب کے پاس چند پیغام بھیج کر آدھی رات کے وقت معہ اپنی بیگم اور بیٹوں اور اپنے فرزند سپہر شکوہ اور قریب تین چار سو آدمیوں کے دہلی کی طرف چل دیا۔

سلیمان شکوہ کی صحرانوردی اب ہم دارا شکوہ کے دہلی جانے کے احوال کو کہ وہ کس غمگینی اور شکستہ دلی سے روانہ ہوا یہیں چھوڑتے ہیں۔ اور اورنگ زیب کے اس جوڑ توڑ کا حال لکھتے ہیں جو اُس نے بڑی دور اندیشی اور حسنِ تدبیر سے آگرہ پہنچ کر کئے۔ چنانچہ سب سے پہلے یہ تدبیر کی کہ سلیمان شکوہ کے لشکر میں نااتفاقی کا بیج بویا بلکہ بعض سرداروں کو اپنی طرف کر بھی لیا۔ اور اس تدبیر سے دارا شکوہ کی امیدوں کا بالکل خاتمہ کر دیا یعنی راجہ جے سنگھ اور دلیر خاں جو سلیمان شکوہ کے لشکر کے سب سے بڑے سردار تھے۔ اُن کو لکھا کہ دارا شکوہ بالکل تباہ ہو گیا ہے اور وہ بڑا لشکر جس پر اُس کو اس قدر گھمنڈ تھا شکست فاش کھا کر ہمارا مطیع ہو گیا ہے اور وہ ایسی بے سرو سامانی سے بھاگا ہے کہ سواروں کا ایک رسالہ تک ساتھ نہیں۔ اور اُمید ہے کہ ہم بہت جلد اُس کو گرفتار کر لیں گے۔ اور حضرت شاہجہاں اس قدر علیل ہیں کہ صرف چند روز کے مہمان اور چراغ سحری ہیں۔ پس اس حالت میں اگر تم ہم سے مقابلہ کرو گے تو نتیجہ بجز خرابی اور ہلاکت کے کچھ نہ ہو گا۔ دارا شکوہ کی اس ابتر حالت میں اُس کی طرف داری کرنا نہایت ہی نادانی ہے۔ اور تمہارے حق میں اب یہی بہتر ہے کہ ہمارے پاس حاضر ہو جاؤ۔ اور سلیمان شکوہ کو جو آسانی گرفتار ہو سکتا

سے پکڑ کر ساتھ لیتے آؤ۔

جے سنگھ اور دلیر خاں اگرچہ پسند ... اور متردد رہے۔ کیونکہ ... تک شاہجہاں اور دارا شکوہ سے ڈرتے تھے اور شاہزادہ پر ہاتھ ڈالنے سے بھی ... جب سے خوف کرتے تھے کہ ایسی حرکت بالفعل یا آئندہ کسی دن ہمارے حق میں مضر اور موجب ... ہو سکتی ہے۔ اور عجب نہیں کہ خود اورنگ زیب ہی کے ہاتھ سے سزا مل جائے۔ اور ... بھی خوب معلوم تھا کہ سلیمان شکوہ کیسا عالی دماغ و غیور اور بلند حوصلہ و دلیر شاہزادہ ہے اور بے تکلف جان دے دے گا مگر قید کبھی نہ ہوگا۔ مگر آخرکار دونوں نے یہ ... کیا۔ جب جے سنگھ سلیمان شکوہ کے خیمہ میں جائے اور اورنگ زیب کی تحریریں دکھا کر اپنی رائے سے اُس کو مفصل اور پوست کندہ مطلع کرے۔ چنانچہ راجہ نے شہزادہ سے جا کر کہا کہ جس خطرناک حالت میں آپ پڑے ہوئے ہیں مناسب نہیں کہ میں اُس کو آپ سے پوشیدہ رکھوں۔ اور معاملات کی حالت ایسی بدل گئی ہے کہ اب آپ کو نہ تو دلیر خاں ہی پر اعتماد کرنا چاہیے اور نہ داؤد خاں اور اپنی فوج ہی پر۔ اور اگر آپ اپنے باپ کی امداد کے ارادہ سے ذرا بھی آگے بڑھیں گے تو بے شک تباہ اور برباد ہو جائیں گے۔ پس مناسب یہ ہے کہ آپ ... نگر کے پہاڑوں کو چلے جائیں۔ وہاں کا راجہ یقیناً آپ کو بہت خاطرداری سے رکھے گا اور ملک کے دشوار گذار ہونے کے باعث اورنگ زیب سے اُس کو کچھ ڈر بھی نہیں ہے۔ اور اُس محفوظ جگہ میں کچھ دنوں ٹھہر کر آپ حالات اور واقعات پر نظر رکھیں اور جب موقعہ معلوم ہو تو بآسانی وہاں سے آکر مقتضائے وقت کے موافق عمل کر سکتے ہیں۔

شہزادہ یہ گفتگو سنتے ہی سمجھ گیا کہ اب نہ تو جے سنگھ ہی اپنا ہے اور نہ لشکر ہی اور سب برگشتہ ہیں۔ اور یہاں ٹھہرنا جان جوکھوں میں پڑنا ہے پس ناچار فوج و لشکر کو وہیں چھوڑ کر اپنے چند نمک حلال اور خالص رفیقوں کے ساتھ جو اکثر منصب دار اور ذات کے سید تھے۔ اور جنھوں نے اُس کی رفاقت کا ترک کرنا خلاف شرافت سمجھا کوہستان کی طرف چل دیا۔ مگر جے سنگھ اور دلیر خاں ایسے کمینے نکلے کہ کچھ سپاہی بھیج کر اُس بیچارے کا مال و اسباب لوٹ منگایا۔ جس میں اشرفیوں سے لدا ہوا ایک ہاتھی بھی تھا۔ اور ان کی اس نالایق حرکت کے باعث سلیمان شکوہ کے بہت سے ہمراہی شکستہ خاطر ہو کر اُس سے جدا ہو گئے۔ اور جو باقی رہے اُن کو اکثر دیہاتی گنواروں نے لوٹ کھسوٹ

کر تباہ کر دیا بلکہ ان کے ہاتھوں سے بہتیرے مارے بھی گئے مگر جس طرح بن پڑا یہ گرتا پڑتا اپنی بیگم اور اہل و عیال کو ساتھ لیئے ہوئے سری نگر جا پہنچا اور وہاں کا راجہ اس کے رتبہ کے لائق تعظیم و تکریم سے پیش آیا اور تسلی کی کہ جب تک آپ اس ملک میں ہیں میری تمام سپاہ آپ کی مدد کے لئے حاضر ہے اور آپ کو کچھ خوف و خطر نہیں ہے[1]

---

[1] عالمگیرنامہ میں سلیمان شکوہ کے سری نگر جانے کے حالات کو بہت طوالت سے لکھا ہے مگر ہم اس کا خلاصہ یہاں لکھتے ہیں کہ جب سلیمان شکوہ الہ آباد سے تین منزل اس طرف آ پہنچا تو لڑائی کے چوتھے دن باپ کی شکست کی خبر ملی۔ اور اس تشویش کی حالت میں جو راجہ جے سنگھ سے صلاح پوچھی تو اس نے یہ مشورہ دیا کہ اول تو جس طرح بنے دہلی پہنچ کر اپنے باپ کے ساتھ شامل ہو جایئے۔ اور اگر یہ نہیں ہو سکتا تو ہٹ کر الہ آباد جا ٹھیریئے اور موقع وقت کا انتظار کیجئے۔ اور جب وہ الہ آباد جانے کو تیار رہا تو رفاقت سے جواب دیدیا۔ بلکہ عین روانگی کے وقت اپنے دوست دلیر خاں کو بھی اونچ نیچ سمجھا کر ساتھ جانے سے روک لیا۔ اور اس حالت کو دیکھکر اور سرداروں نے بھی اسی کی پیروی کی۔ اور اگرچہ شہزادہ کی ذاتی رائے دہلی پہنچنے کی تھی۔ مگر اس کا اتالیق بہادر خاں اس کو الہ آباد لے گیا۔ کیونکہ یہاں کا مستحکم قلعہ داراشکوہ کے ایک معتمد ملازم سید قاسم عرف سید کاسو بارہ وال کے قبضہ میں تھا۔ اور چند روز ٹھیر کر لکھنؤ کی راہ سے قصبہ نگینہ کی طرف (جو داراشکوہ کی بڑی بہن معروف بیگم صاحب کی جاگیر میں تھا اور جس کو اس کتاب میں نگینہ چاندپور کرکے لکھا ہے) روانہ ہوا تاکہ گنگا کے کسی گھاٹ سے اتر کر اور پھر سہارن پور کے قریب بوڑیہ کے گھاٹ سے دریائے جمنا کو عبور کر کے پنجاب کو باپ کے پاس چلا جائے۔ مگر جب دشمن کے مقرر کئے ہوئے سرداروں کی مزاحمت کے باعث اس طرف سے گنگا کو عبور نہ کر سکا تو مراد آباد کے نواح سے ہوتے ہوئے ہردوار کے قریب وہاں کے راجاؤں خصوصًا راجہ سری نگر کی مدد سے اس دریا سے اُترنا چاہا۔ اور اس ارادہ سے بمقام چانڈی پہنچ کر (جس کو صاحب عالمگیرنامہ نے "محاذی ہردوار متصل ملایت سری نگر" لکھا ہے) بھوانی داس نامی اپنے دیوان "بیوتات" کو جو پہلے بھی داراشکوہ کا بھیجا ہوا وہاں ہو آیا تھا کچھ تحایف دے کر سری نگر کے راجہ کے پاس کشتیوں کے بہم پہنچانے میں مدد کرنے کے لئے بھیجا۔ مگر اتنے میں جو امیر الامرا شایستہ خاں اور فدائی خاں بہت سی فوج کے ساتھ سامنے آ موجود ہوئے اور بجز سری نگر جانے کے کچھ چارہ نہ رہا تو چانڈی سے اُٹھ کر بمقام کاناتال جو سری نگر کی حد میں داخل تھا جا ڈیرہ کیا۔ اور یہاں سے راجہ کے اہلکار پہاڑ پر لے گئے اور

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ - چار منزل راجہ خود آگے آیا اور سری نگر سے گیا۔ اور کہا کہ آپ مختصر طور پر یہاں تشریف رکھ سکتے ہیں۔ مگر ان ہاتھی گھوڑوں اور فوج و لشکر کی میرے اس پہاڑی اور چھوٹے سے ملک میں گنجائش نہیں۔ اب بہادر خاں تو مرض الموت کے سبب اجازت لے کر شہزادہ سے گیا بلکہ پہاڑ سے اترتے ہی دنیا سے رخصت ہوا۔ اور باقی ماندہ سردار جو ناامیدیوں کے باعث ادھر ادھر کھسک جانا چاہتے تھے کہ شہزادہ کی مرضی اور راجہ کے ملازموں کی رہنمائی کے بغیر اس پہاڑی ملک میں سے نکل نہیں سکتے تھے انھوں نے کچھ جھوٹ سچ بول کر اس کو پھر الٰہ آباد جانے کے لئے آمادہ کیا تاکہ شجاع کے ساتھ شامل ہو جائے کیونکہ اپنی شکست کے بعد دارا شکوہ نے بذریعہ خط و کتابت مصالحہ کرکے اس کو آگرہ پر حملہ کرنے کی ترغیب دی تھی۔ الغرض شہزادہ راجہ کا شکریہ ادا کرکے اور کچھ تحفے تحائف دے کر رخصت ہوا۔ نگینہ میں واپس پہنچتے ہی یہ دغاباز اور خود غرض خیرخواہ اس کو چھوڑ کر ادھر ادھر چل دیئے اور بہ ناچاری پھر سری نگر کی طرف لوٹنا پڑا۔ اور اب سوائے سید احمد کے جس کا بھائی سید قاسم اب تک قلعہ الٰہ آباد کو تھامے ہوئے تھا اور اس کے کوکے محمد شاہ اور دو تین اور سرداروں اور بیچاری مصیبت زدہ بیگم اور چند اور عورتوں اور سترہ نوکر چاکروں اور ہمراہیوں کے اس تمام فوج و لشکر میں سے کوئی بھی ساتھ نہ رہا۔ اور چونکہ اس کے پہاڑ سے اترنے کی خبر سن کر اورنگ زیب کے بعض سردار پھر اس کا راستہ روکنے کے لئے آپہنچے تھے۔ اس لئے یہ خوف زدہ شہزادہ گھبراہٹ میں جس قدر جواہرات اور اشرفیاں ساتھ لے سکا لے کر راتوں رات نگینہ سے چل کھڑا ہوا اور خوف کے سبب معمولی راستہ چھوڑ کر راجہ کے آدمیوں کی رہنمائی سے ایک اور راستہ سے سری نگر کو چلا گیا جہاں شہر سے نیچے آکر راجہ اسے اپنے ہاں لے گیا۔

واضح ہو کہ شہر سری نگر معہ ان پہاڑی علاقوں کے ایک حصہ کے جو اس وقت کمایوں اور سری نگر کے راجاؤں کی خود مختار حکومتوں میں تھے۔ اس زمانہ میں گورنمنٹ انگلشیہ کے ماتحت اور کمشنری کمایوں کا جس کا صدر مقام الموڑہ ہے ایک جزو اور ان کئی برفستانی نالوں میں سے جو کوہستان ہمالہ سے نکلنے کے بعد دریائے گنگا کہلاتے ہیں الکہ نندا نامے ایک نالہ کے کنارہ سطح سمندر سے سترہ سو انچاس فٹ بلند اور ایک یورپین اسسٹنٹ کمشنر کا جائے قیام ہے۔ اس عیسوی صدی کے شروع میں جو کوہستان نیپال کے رہنے والے گورکھا لوگ ہندوستان کے مغربی اور شمالی پہاڑوں پر بہت دور تک قابض ہو گئے تھے تو انھوں نے یہاں کے راجہ کو بھی حکومت سے خارج کر دیا تھا۔ مگر جب سرکار انگریزی نے ان کو ان سب پہاڑوں سے نکال دیا تو ۱۸۱۵ء میں وہاں کے خارج شدہ راجہ سدرشن شاہ کو گڑھوال کا علاقہ دے کر ریاست پر پھر بحال کر دیا لیکن اس کے قدیمی ملک میں سے وہ حصہ جو الکہ نندا اور منداکنی کے تمام شمال

اورنگ زیب آگرے میں

اب ہم اُن واقعات کا ذکر پھر شروع کرتے ہیں جو آگرہ کی طرف وقوع میں آئے سموگڈھ کی لڑائی کے تین چار روز بعد دونوں شاہزادوں نے ایک باغ میں جو آگرہ کے سامنے قریب تین میل کے ہے ڈیرے آن لگائے اور ایک خواجہ سرا کو جو اورنگ زیب کا نہایت معتمد علیہ اور چالاکی و عیاری میں گویا خود اورنگ زیب ہی تھا شاہجہاں کے حضور میں بھیجا اور اُس نے اس ڈھب سے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوکر ادائے تسلیمات کے بعد اپنے آقا کی طرف سے بے حد ادب و تعظیم اور محبت وفرماں برداری کا اظہار کیا اور عرض کی کہ

سے اوپر کی جانب شرق کی طرف تھا معہ علاقہ دیرہ دون اور پرگنہ رام گڈھ کے اپنے قبضہ میں رہنے دیا۔ چنانچہ ریاست مذکور کا صدر مقام اب ٹہری نامے ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ جو چونتیس درجے تیئس دقیقے عرض شمالی اور اٹھتر درجے اٹھائیس دقیقے طول شرقی پر سمندر سے دو ہزار فٹ بلند گنگا کی ایک شاخ بھاگرتھی نامی کے بائیں کنارے سری نگر کے سامنے قریب دو منزل کے فاصلہ پر آباد ہے اور راجہ سورج بنسی راجپوت خاندان کے قوم سے ہے۔ اور اُس کے نام کے اخیر میں نیپال کے فرمان روا خاندان کے راجاؤں کی طرح شاہ کا لفظ لگایا جاتا ہے۔ مثلاً رئیس حال جس کا نام پرتاب شاہ ہے بھوانی شاہ کا بیٹا اور سودرشن شاہ کا پوتا ہے اور بقول مسٹر الہاسے وہیلر مولف تاریخ جشن قیصری دہلی واقع یکم جنوری ۱۸۷۷ء رقبہ چار ہزار ایک سو اسی میل مربع اور آمدنی اسی ہزار اور آبادی ڈیڑھ لاکھ آدمیوں کی ہے۔ اُس راجہ کا نام جس نے سلیمان شکوہ کو پناہ دی تھی فارسی زبان کی تاریخوں میں پرتھی سنگھ اور پرتھی پت لکھا ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ کا لفظ سلاطین مغلیہ کے ادب کے منافی سمجھکر لفظ سنگھ اور پت کے ساتھ دانستہ بدل دیا ہے۔ جیسا کہ گولکنڈا اور بیجاپور کے بادشاہوں کو بجائے قطب شاہ قطب الملک اور بجائے عادل شاہ عادل خاں لکھتے تھے۔ اور ناظرین تاریخ کے لئے یہ امر بھی قابل غور ہے کہ سلاطینِ مغلیہ کے زمانہ میں جو مقامات ایسے دشوار گذار اور بے ڈھب سمجھے جاتے تھے کہ اُن کے دشمن اور باغی وہاں کے آزاد مطلق راجاؤں کے پاس جاکر بے تکلف پناہ لیتے تھے سرکار عالیہ انگریزی کی کوششوں سے وہی مقامات بلکہ اُن سے بھی بہت آگے اور دور تک عمدہ سڑکوں اور پلوں کے بن جانے کی وجہ سے ایسے سہل العبور ہو گئے ہیں کہ ہندوستان کے ہر ایک حصہ سے ہر سال ہزاروں جاتری مرد اور عورت بدری نارائن وغیرہ تیرتھوں کے درشن کو جو ہمالہ کے برفانی اور سربفلک پہاڑوں میں واقع ہیں اسی سری نگر اور ٹہری کے راستہ سے بہت آرام کے ساتھ آتے جاتے ہیں۔ س م ع

۔یہ جو کچھ گذرا صرف داراشکوہ کی کج رائے اور بے جا جاہ طلبی کے خیالات کے باعث ہوا۔ اورنگ زیب نے حضور کی خدمت میں حصول صحت کی مبارک باد عرض کی ہے۔ اور اِن واقعات کے وقوع میں آنے کا اُس کو نہایت ہی رنج وافسوس ہے۔ اور اُس کا آگرہ آنا محض اس غرض سے ہے کہ جو کچھ ارشاد ہو وہ بسروچشم اُس کی تعمیل کرے۔"

جس کے جواب میں شاہجہاں نے بھی اپنے فرزند سعادت مند کے طور وطریق کی نسبت ایسی ہی خاطرداری اور تملق کے ساتھ اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ اور کہا کہ اس کی سعادت مندی اور ایسی فرماں برداری سے ہم نہایت راضی اور خوش ہیں۔ اگرچہ شاہجہاں اورنگ زیب کی مکاری اور شوق جہاں داری سے بخوبی واقف تھا۔ اور اُس کی ان ظاہری باتوں پر اُس کو ہرگز اعتماد نہ تھا۔ مگر باوجود اس کے اُس نے صفائی کے ساتھ معاملہ کو یک سو نہ کیا یعنی اگرچہ یہ ضروری تھا کہ دربار میں امرا اور ارکان دولت کو جمع کرکے خود اُس کے مقابلہ کو نکلتا اور اس طرح خلائق کی نظر میں اُس کو علانیہ باغی ثابت کرتا حالانکہ ان اُمور کے لیے اب تک موقعہ تھا۔ مگر کچھ نہ کیا اور اس کے عوض صرف چالاکی اور دَم بازی سے اورنگ زیب جیسے شخص پر جو ایسی باتوں میں دنیا بھر سے تیز تھا غالب آنا چاہا۔ پس اُس کا خود اس حال میں پھنس جانا جو بیٹے کے لئے بچھایا تھا کچھ تعجب کی بات نہیں اور اس کی تفصیل اس طرح پر ہے کہ شاہجہاں نے ایک معتبر خواجہ سرا کو اورنگ زیب کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ

"بے شک داراشکوہ نے جو کچھ کیا وہ سب نامناسب تھا اور اُس کی بے سمجھی اور نالائقی کی باتیں یاد دلا کر کہا کہ تم پر تو ہم ابتدا ہی سے دلی شفقت رکھتے ہیں پس تم کو ہمارے پاس جلد آنا چاہیئے تاکہ تمہارے مشورہ سے ان امور کا انتظام کیا جائے جو اس افراتفری کے باعث خراب اور ابتر پڑے ہوئے ہیں۔"

مگر اس محتاط شہزادہ نے پدر گیانی سے بادشاہ پر اعتماد کرکے قلعہ میں چلے جانے کی دلیری نہ کی کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ بیگم صاحب کسی وقت بادشاہ سے جدا نہیں ہوتی اور اُس کے مزاج پر اس قدر حاوی ہے کہ جو کچھ وہ چاہتی ہے وہی ہوتا ہے اور یہ پیغام اُسی کا ایک حیلہ ہے۔ اور اُس نے قلما قنیوں[1] میں سے جو محل سرا میں چوکی پہرہ کے کام پر متعین

[1] اصل کتاب میں "تاتاری عورتیں" ہے مگر چونکہ وہ ترک قوم کی عورتیں جو محل کے چوکی پہرہ کا کام دیتی ہیں

رہتی ہیں کچھ قوی ہیکل اور مضبوط اور مسلح عورتیں اس قصد سے لگا رکھی ہیں کہ جب وہ قلعہ میں داخل ہو تو فوراً اُس پر آن پڑیں۔ اور اگرچہ اُس نے بارہا اپنی حاضری کی تاریخیں اور دن معین کئے لیکن کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر ٹالتا ہی رہا۔ اور ادھر اپنی معمولی کارروائیاں کرتا رہا یہاں تک کہ اکثر بڑے بڑے ذی اقتدار امیروں کا عندیہ دریافت کر لیا۔ اور جب سب بندوبست ہو گیا تو یکایک اُس کا بیٹا محمد سلطان آ کر قلعہ پر قابض ہو گیا جس سے سب لوگ ہکا بکا رہ گئے۔ اس جانباز اور عالی ہمت جوان نے کچھ سپاہی پہلے سے قلعہ کے آس پاس لگا رکھے تھے۔ پس اس بہانہ سے کہ بادشاہ کی خدمت میں کچھ پیغام لے کر جاتا ہے یکایک اُن سپاہیوں پر آ پڑا جو قلعہ کے دروازے پر متعین تھے اور جو سپاہی ادھر اُدھر گھات میں لگائے ہوئے تھے جھٹ پٹ آ پہنچے اور اہلِ قلعہ کو مغلوب کر کے جن کو اس کا کچھ وہم و گمان بھی نہ تھا قلعہ پر قبضہ کر لیا۔

اس وقت شاہجہاں کو جس قدر خوف و اضطراب ہوا ہوگا وہ ظاہر ہے پس جس شخص کے پکڑ لینے کے لئے وہ اتنے دنوں سے گھاتیں لگا رہا تھا اب خود ہی اُس کا قیدی بن گیا۔

محمد سلطان کا قلعہ پر قبضہ کہتے ہیں کہ اس بدنصیب بادشاہ نے قید ہوتے ہی محمد سلطان کو یہ پیغام بھیجا کہ

میں تم سے تختﷺ کی قسم کھا کر کہتا ہوں اور قرآن مجید میرے تمہارے درمیان ہے کہ اگر تم اس وقت مجھ سے ایمانداری برتو تو میں تمہیں کو بادشاہ بنا دیتا ہوں۔ اور اس موقعہ کو غنیمت جان کر ہاتھ سے نہ دو اور فوراً چلے آؤ اور دادا کو قید سے چھڑا دو اور یاد رکھو کہ اس سے تم کو ثواب آخرت کے علاوہ دنیا میں بھی ایک دائمی نیک نامی حاصل رہے گی۔

لوگوں کا قول ہے کہ اگر محمد سلطان نے جرأت کر کے شاہجہاں کے کہنے کو مان لینا تو غالباً

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ: اُن کو قلماقنیاں کہتے تھے اس لئے ترجمہ میں وہی لفظ اختیار کیا گیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ قلماق بھی ایک تاتاری ہی قوم ہے۔ س م ش

لہ اصل کتاب میں تاج کا لفظ ہے جس کی جگہ ہم نے ہندوستان کے محاورہ کے موجب تخت کا لفظ اختیار کیا ہے کیونکہ ہم کو یاد ہے کہ دہلی کے خاندانِ شاہی کے اکثر لوگ غدر ۱۸۵۷ء تک بھی (جس میں اس خاندان کا نام و نشان ہی مٹ گیا) بات بات پر تخت ہی کی قسم کھایا کرتے تھے۔ حالانکہ نہ کچھ تخت ہی رہا نہ تاج مگر عادت پرانی تھی۔ قدماء اس خاندان کی

وہی سب کچھ ہوجاتا۔کیونکہ اب تک بھی لوگوں کے دل میں شاہجہاں کا ادب اور لحاظ بہت کچھ باقی تھا۔اور اگر یہ شہزادہ اُسے قلعہ سے نکلنے دیتا اور یہ بڈھا بادشاہ کچھ فوج لے کر بذات خود اورنگ زیب پر حملہ کرتا تو غالباً کل فوج اُس کی فرماں برداری کرتی اور ذی اقتدار امیر نمک حلالی اور وفاداری سے پیش آتے۔اور اس بات پر بھی سب لوگ متفق الرائے ہیں کہ اس موقعہ پر محمد سلطان سے ویسی ہی غلطی سرزد ہوئی جیسی کہ سموگڈھ کی لڑائی کے بعد شاہجہان سے ہوئی تھی۔

اب چونکہ اس جگہ بادشاہ کی غلطی رائے کا پھر ذکر آگیا ہے تو انصاف یہ چاہتا ہے کہ میں اس کی نسبت یہ بھی ظاہر کردوں کہ تمام حالات پر نظر کرکے بہت سے ذی رتبہ مدبر لوگوں کی بالاتفاق یہ رائے تھی کہ دارا شکوہ کی شکست کے بعد اس بوڑھے بادشاہ کو قلعہ ہی میں رہنا اور اورنگ زیب کو فریب ہی سے گرفتار کرنا مناسب تھا۔اور ان کا قول تھا کہ خلائق کا یہ قاعدہ ہی ہے کہ نتیجہ کے ظہور کے بعد کسی تدبیر کو بُرا یا بھلا بتلایا کرتے ہیں اور اکثر اوقات جب کہ نہایت ہی کچے منصوبے چل جاتے ہیں تو لوگ ان کی بھی تعریف و توصیف کیا کرتے ہیں۔پس شاہجہاں کا الفت و محبت اور صفائی نیت جتا کر اورنگ زیب کو گرفتار کرلینا کچھ ناممکن نہ تھا اور اس صورت میں اس کے فہم و فراست کی ویسی ہی تعریف اور ناموری ہوجاتی جیسے کہ اب سب بُرا کہتے اور یہ الزام لگاتے ہیں کہ یہ عقل سے خارج بادشاہ ایک ایسی عورت (بیگم صاحب) کے کہنے پر چلنے سے اس حال کو پہنچا جو صرف کینہ اور عداوت کے جوش سے اندھی ہورہی تھی اور بے عقلی سے یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ وہ سیانا کوا اورنگ زیب قلعہ میں ہم سے ملنے کو آئے گا اور اُس جانور کی طرح جو خود بخود پنجرہ میں آن پھنسے گرفتار ہوجائے گا۔

اب محمد سلطان کی سنیئے۔اُس کی نسبت عموماً اس ملک کے معمر لوگ یہ کہتے ہیں کہ تاج شاہی اس کو مفت ہاتھ آتا تھا۔مگر اس سے لیا نہ گیا حالانکہ اس میں بموجب قول مشہور "ہم خرما و ہم ثواب" سلطنت اور دادا کے قید سے چھڑا دینے کی نیک نامی دونوں حاصل ہوتی تھیں۔پس اگر وہ ایسا کرتا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ یہ نوجوان شہزادہ بجائے اس کے کہ قلعہ گوالیار[۱] میں پڑا زندگی کے دن گنا کرتا ہے کل امور سلطنت کا وہی مالک و مختار ہوجاتا۔اور اگرچہ چند شخص یہ

---

[۱] یہ محمد سلطان کے قید میں ڈالے جانے پر اشارہ ہے جس کا ذکر آئندہ آتے گا۔ س م ح

خیال کرتے ہیں کہ اُس نے باپ کی اطاعت اور حق پدری پر نظر کر کے بادشاہ کی درخواست کو قبول نہ کیا۔ مگر ظنِ غالب یہ ہے کہ اُس کو شاہجہاں کے عہد و پیمان پر سچائی کا بھروسہ نہ ہوا اور اُس نے یہ بھی سوچا کہ ایسے عقلمند اور شجاع شخص سے جیسا کہ اورنگ زیب ہے لڑائی مول لینا محض بے فائدہ اور سراسر خطرناک ہے۔ بہر حال شہزادہ کا خیال خواہ کچھ ہی ہو مگر خلاصہ یہ ہے کہ اُس نے اس بدنصیب بادشاہ کی تجویز نہ مانی بلکہ پاس جانے سے بھی یہ عذر پیش کر کے انکار کر دیا کہ

> مجھے اورنگ زیب کی طرف سے حضور میں حاضر ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ بلکہ تاکیدی حکم یہ ہے کہ قلعہ کے کل دروازوں کی کنجیاں خود اپنی سپردگی میں لے کر یہاں سے نہایت جلد واپس جاؤں کیونکہ وہ حضور کی قدم بوسی کے ازبس مشتاق ہیں اور صرف اتنی ہی دیر ہے کہ اس امر سے اطمینان ہو جائے تو فوراً حاضر ہو جائیں۔

اب دو دن تک تو شاہجہاں کنجیوں کے دینے میں ہیچر میچر کرتا رہا لیکن جب اُس نے دیکھ لیا کہ سب لوگ اُسے چھوڑے جاتے ہیں خصوصاً یہ سن کر کہ تھوڑی سی فوج جو دریچۂ خاص کی محافظ تھی وہ بھی چل دی۔ اور اب بچاؤ کی کوئی امید باقی نہیں ناچار قلعہ کی کنجیاں حوالے کر دیں اور بتاکید کہلا بھیجا کہ

> "اورنگ زیب کو اب تو آنا ہی چاہیئے۔ اور لازمہ دانائی یہی ہے کہ وہ جلد ہم سے ملنے کو آئے کیونکہ سلطنت کے بعض ضروری اسرار ہم اُس کو سمجھانا چاہتے ہیں"

شاہجہاں کی گرفتاری لیکن وہ سیاست داں فقیر اپنی چال سے چوکنے والا نہ تھا چنانچہ بجائے اس کے کہ اس ارشاد کی تعمیل کرے فوراً اعتبار خاں نامی اپنے ایک معتمد خواجہ سرا کو قلعدار مقرر کر دیا[1]

جس نے پہنچتے ہی سب بیگموں، بیگم صاحب اور خود شاہجہاں کو قید کر دیا۔ بلکہ قلعہ کے اکثر دروازے تک چنوا دیئے۔ اور بادشاہ اور اُس کے خیرخواہوں

---

[1] عالمگیر نامہ سے ظاہر ہے کہ اعتبار خاں اس وقت دکن میں تھا۔ اُس کو نہیں بلکہ ذوالفقار خاں کو قلعہ دار بنایا گیا تھا۔ س م ع

کے باہم آمد و رفت تو کیسی خط کتابت اور سلام پیام کے تمام ذریعے بھی مسدود کر دیئے۔ اور شاہجہاں کو اتنی بھی اجازت نہ رہی کہ قلعدار کی اطلاع کے بغیر اپنے کمرے سے باہر نکل سکے۔

بادشاہ کے نام اورنگ زیب کا عریضہ اب اورنگ زیب نے باپ کو ایک عریضہ لکھا جو روانہ کرنے سے پہلے قصداً سب لوگوں کو سنایا گیا جس کا مضمون یہ تھا کہ "یہ بے ادبی مجھ سے اس لئے سرزد ہوئی ہے کہ حضور ظاہرا میری نسبت اظہار الفت و مہربانی فرماتے تھے اور ارشاد ہوتا تھا کہ ہم دارا شکوہ کے طور و طریق سے سخت ناراض ہیں مگر مجھے پختہ خبر ملی ہے کہ حضور نے اشرفیوں سے لدے ہوئے دو ہاتھی اس کے پاس بھیجے ہیں۔ جن سے وہ نئی فوج تیار کرے گا۔ اور اس خوں ریز لڑائی کو طوالت دے گا۔ پس حضور ہی غور فرمائیں کہ یہ حرکتیں جو فرزندوں کے معمول اور طریق کے برخلاف اور سخت معلوم ہوتی ہیں مجھ سے ان کے سرزد ہو جانے کا باعث کیا صرف دارا شکوہ کی خود سری اور عناد ہی نہیں ہے، بلکہ فی الواقع حضور کی اسیری اور اتنی دیر تک شرف قدم بوسی سے میری محرومی اور حضور کے خلاف توقع فرزندانہ خدمات کی بجا آوری میں اس قدر تاخیر کا باعث محض وہی ہے۔ اور میں حضور سے بکمال معذرت یہ التجا کرتا ہوں کہ میرے اس بظاہر حیرت انگیز طرز عمل سے صرف نظر کر کے اس زوال آزادی کو جو صرف چند روز کے لئے ہے تحمل کے ساتھ گوارا فرمالیں اور جب دارا شکوہ امن و امان میں خلل انداز ہونے اور حضور کو اور مجھکو ایذا دینے کے قابل نہ رہے گا تو میں فوراً قلعہ کی طرف از خود دوڑا چلا آؤں گا اور حاضر ہو کر دست بستہ عرض کروں گا کہ اب کچھ روک ٹوک نہیں ہے۔

اورنگ زیب کے الزام کی تحقیق اگرچہ میں نے سُنا ہے کہ شاہجہاں نے فی الواقع یہ اشرفیاں اُسی رات کو دارا شکوہ کے پاس بھیجی تھیں جب کہ وہ پنجاب کی طرف روانہ ہوا تھا اور اس کی خبر روشن آرا بیگم نے اورنگ زیب کو پہنچائی تھی اور یہ خبر بھی اُسی نے دی تھی کہ قلعہ میں آ ؤ گے تو قلماقنیاں تم پر حملہ کریں گی اور یہ بھی کہتے

ہیں کہ شاہجہاں کے کئی خط جو اس نے داراشکوہ کے نام روانہ کئے تھے اورنگ زیب کے ہاتھ آگئے تھے۔ مگر اکثر دانشمند اور فہمیدہ لوگ ان باتوں کی صحت سے انکار کرتے اور یہ کہتے ہیں کہ وہ کاغذ جو سرعام سنایا گیا تھا محض بےاصل اور صرف لوگوں کے دھوکا دینے اور شاہجہاں کے خیرخواہوں اور طرف داروں کی طفل تسلی اور زبان بندی کے لئے تھا جو اورنگ زیب کی اس ناشائستہ حرکت کا چرچا کرتے تھے۔

امرائے سلطنت کی اطاعت خیر یہ باتیں صحیح ہوں یا غلط، لیکن یہ بات بالکل سچ ہے کہ جب بادشاہ ایسے سخت طور سے قید ہوگیا تو قریبًا تمام امرا اورنگ زیب اور مراد بخش کے دربار میں تسلیمات کے لئے جا حاضر ہوئے۔ اور میں جب یہ سوچتا ہوں کہ اس بیچارے بڈھے اور مظلوم بادشاہ کی حمایت میں کسی امیر نے ذرا بھی ہاتھ پاؤں نہ ہلائے اور کسی کے چھوٹے منہ سے بات تک بھی نہ نکلی! تو مجھے نہایت ہی رنج ہوتا اور غصہ آتا ہے۔ افسوس، یہ لوگ اُن ظالموں کے آگے سر جھکانے کو جاتے تھے جنھوں نے ان کے آقا اور مالک پر ایسی سختی کی۔ حالانکہ ان کے موجودہ مرتبے اور درجے اور دولت وحشمت سب کچھ صرف اُسی کی مہربانی کا نتیجہ تھا۔ اور اس دربار کی رسم کے موافق اُس نے اُن کو ادنیٰ ادنیٰ درجوں سے مراتب اعلیٰ پر پہنچایا تھا۔ یہاں تک کہ بہت سے ان میں سے ایسے تھے جو غلامی کی حالت سے امارت کے درجہ کو پہنچے تھے۔ مگر ہاں چند شخص ایسے بھی تھے۔ مثلاً دانشمند خاں[1] جنھوں نے کسی کی بھی جانب داری اختیار نہیں کی تھی۔ لیکن ان کے سوا اور سب کا عمومًا یہ حال تھا کہ اب اورنگ زیب ہی کا دم بھرتے تھے مگر اُمرا کی اس حالت پر جب میں غور کرتا ہوں تو ان کے اس کفرانِ نعمت اور احسان فراموشی کی نسبت لعن طعن کرنے کا جوش کچھ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ یعنی ہندوستان کے امرا چونکہ فرانس وغیرہ ممالک یورپ کے اُمرا کی طرح کسی جائداد زمینداری وغیرہ کے مستقل مالک نہیں ہیں۔ اس وجہ سے ان کی آمدنیوں کا کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے۔ جس کو بادشاہ وقت سے کچھ تعلق نہ ہو۔ بلکہ جیسا میں پہلے لکھ چکا ہوں ان کی آمدنیاں صرف وہ

---

[1] داراشکوہ کی مخالفت کے باعث میر بخشی کے عہدہ سے استعفا دے کر اس وقت تک یہ دہلی ہی میں خانہ نشین تھا اور عالمگیرنامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب اورنگ زیب داراشکوہ کے تعاقب میں آگرہ سے دہلی کے قریب پہنچا تو یہ خضرآباد کے مقام پر جو پرانی دلی کے پاس تھا، اُس کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ س م

روزینے ہوتے ہیں جن کا تعین محض بادشاہ کی مرضی پر موقوف ہے۔ اور ان کا جاری رکھنا یا بند کرنا صرف اسی کے اختیار میں ہے اور جب یہ وظائف بند ہو جاتے ہیں تو یہ لوگ بالکل تباہی میں آجاتے ہیں یہاں تک کہ تھوڑا سا قرض بھی ان کو کہیں سے نہیں مل سکتا[1]

[1] باپ بیٹے کی منافقانہ کارروائیاں۔ امرا کا اورنگ زیب کے پاس حاضر ہو جانا۔ اور آخر کار شاہجہاں کا قید ہونا۔ ان سب واقعات کو عالمگیرنامہ۔ تاریخ عاقل خاں۔ عمل صالح۔ اور سیرالمتاخرین میں جس تفصیل و ترتیب سے لکھا ہے اس کا خلاصہ اس خط و کتابت کی مکمل نقل کو جو باپ بیٹے کے درمیان ہوئی۔ بہت مفید اور دلچسپ سمجھ کر اسی ترتیب سے اس جگہ درج کیا جاتا ہے۔ اس خط و کتابت کی نقلیں جو عمل صالح اور تاریخ عاقل خاں میں درج ہیں اُن کے الفاظ مختلف اور مطلب واحد ہے۔ مگر عاقل خاں جو اورنگ زیب کے خاص امیروں میں سے تھا اس کی تحریروں کو زیادہ مستند سمجھ کر سب نقلیں اُسی کتاب سے لی گئی ہیں بجز ایک عرضی کے۔ جو اس میں نہ تھی اور عمل صالح سے لی گئی۔

اگرچہ اورنگ زیب کی وہ تحریر جس کو برنیئر نے نقل کیا ہے ان دونوں کتابوں میں نہیں ہے مگر عالمگیر نامہ میں (جس کے مسودات خود اورنگ زیب کے ملاحظہ کے بعد صاف ہوتے تھے) داراشکوہ پر فتح پانے کے دوسرے دن بمقام عاد پور (عرف سموگڈھ) اورنگ زیب کے قیام کے تذکرہ کے بعد یہ عبارت تحریر کی ہے کہ

"دریں روز خجستہ معذرت نامۂ مشتمل بر صورتِ حال۔ و اشتمال وقوع صف آرائی و قتالی کہ باعثِ بدہادیِ آں داراشکوہ بے خرد مغرور بود۔ و جنود منصور بحکم شرع و فتوائے عقل در اقدام برآں معذور نگاشتۂ کلک ادب دانی ساختہ بخدمت اعلیٰ حضرت فرستادند"

اور لڑائی سے تیسرے دن ٹھہرا آگرہ کے قریب جب باغ نور منزل معروف باغ دہرہ میں ڈیرہ ہوا تو اُس کے ان معذرت نامہ کے جواب میں شاہجہاں نے جو شقہ اپنے قلم خاص سے لکھا تھا اُس کا خلاصہ بقول عاقل خاں یہ ہے۔

"چوں بمقتضائے مشیت بے چونی درمیان آں قرہ باصرۂ سلطنت و جہاں بانی وغرہ ناصیہ عظمت و کامرانی و شاہ بلند اقبال صحبت بہ کدورت و ملال انجامید و آنچہ در پردۂ غیب و حجاب تقدیر مستور بود بر روئے بروز افتاد ازاں جا کہ در فرمانِ قضا و قدر و وارداتِ خالقِ خیر و شر چون و چرائے بشر را مدخلے نیست اغماض عین ازاں از سمات نشان خود شناسی و خدا دانی دانستہ باظہار امرے کہ اکنون انشراح خاطر و انبساط طبع اقدس بداں متعلق و منوط آمدہ بذل توجہ والا ناگزیر شرف وقوع پذیرفت و غرض از تبیین ایں مقولہ آنکہ تقاضائے باطن و تمنائے خاطر

بہ تماشائے جمال لقائے فرحت افزائے آں فرزند ہوشمند بیدار مغز کہ چراغ ضیا بخش و فروغ افزائے این دودمان دولت و اقبال است بغایتے است کہ حوصلہ تقریر و بیان اندازہ آں ما بر نمی تابد خامۂ کہ آں درۃ التاج خلافت و دارائے و شمین فریدہ زینت افزائے اکلیل فرماں روائے را بنا بر ارادت لم یزلی پس از روزگار دراز و زماں طویل باین ہمہ قرب مکان و محل قریب اتفاق نزول افتادہ بود ما را پس از آں چناں امراض متضادہ شدیدہ کہ رشتہ امید توقف درین نشار اصل سور حوادث اندوز قطعاً مفقود و منقطع بود از شفاخانہ عنایت حکیم علی الاطلاق شربت گوارائے صحت کرامت وصول پذیرفتہ فی الحقیقت حیات تازہ زندگی دوبارہ عطا گردید التہاب نیران شوق و لذا بر اشتیاق باقصٰی نہایت رسیدہ یقین کہ خواہش قلبی و آرزوئے باطنی آں فرزند نیک اختر والا گہر نیز درین باب از اباب غلیاں نشار محمت و کیفیت طلب عزیز مصر بلقائے بزرگ کنعاں خواہد بود چوں زیادہ برین حوصلہ طاقت بار انتظار را برنمی تابد پسندیدۂ عالم استحسان آنست کہ آں ادب داں خرد ورسم شناس عقل بزودی ہر چہ تمامتر مرہم راحت بہ جراحت ترصد نہادہ خاطر اقدس را بمشاہدۂ جمال لقائے بہجت افزائے خود فرحت آگیں و مسرت آمود سازد۔

۴۶

"زود آ و دل تنگ مرا مونس جاں باش"

اِس شقہ کے پہنچنے پر اورنگ زیب نے تملق کی راہ سے نہایت ہی ادب اور فرماں برداری کا اظہار کیا اور فاضل خاں میر ساماں اور سید ہدایت اللہ صدر یعنی محکمۂ اوقاف، کو جو یہ شقہ اور الفت و محبت اور شوق ملاقات کے پیغام زبانی لے کر آئے تھے بڑے بھاری خلعت عنایت کئے اور جواب میں یہ عرضی حوالہ کرکے بہت خاطر و مدارات کے ساتھ رخصت کیا۔

"مراسم سجود و سلام و لوازم تعظیم و تکریم بجا آوردہ بعرض می رساند کہ فرمان فرخندہ عنوان مشتمل بر کیفیت آرزومندی خاطر فیض مظاہر و زود رسیدن این پروردۂ نعمت و برآوردۂ تربیت مہر زمیں بوس حضور فائض النور شرف صدور و عز ورود یافتہ سازور یافت مضمون اشفاق مشحون آں جمیدۂ فیض کہ ہر کلمہ اش سرمایہ دو الزار برکات و ہر فقرہ اش پیرایہ پیرائے حیات بود سراتا سر صفحہ خاطر زینت جمعیت و طراز شگفتگی یافتہ رو کش نسخہ رنگین بہار گردید و فروغ این آیات رحمت و شموس سمائے عاطفت از سر تو پرتو بر بام و طارم دماغ

گسترده سرشار نشۂ مسرت وطراوت ساخت. شکر ایں عنایات تازه و مرحمت بے اندازه کہ از ظرف طاقت تحریر و تقریر بیرون است از تنگیٔ دست گاه لفظ و معنی چگونہ بہ تقریر زبان کز مژ بیان راست آید؏ ہم مگر لطف شما پیش نہد گامے چند. الحمدللہ والمنۃ کہ خاصیت صدق ارادت مضمر و خلوص عقیدت مکنون در ضمیر منیر آں حضرت کار خود کرده تازگی فروغ ظہور از نہان کده باطن بر روئے بروز انداخت و سلسلہ جنبانی آمال آسانی و فیض خواہش جسمی و جانی بفور کمال عنایت حضرت ظل سبحانی رسیده گلشن امید و مراد را شگفتہ و خنداں ساخت اکنوں کہ از اظہار عواطف رسمی و مراحم ظاہری گذشتہ بخواہش حقیقت رسیده فاتحہ التفات معنوی بمشام آرزو فائز گشتہ باعث مزید حیات گردیده امیدوار است کہ اسباب مواصلت ایں دور افتاده در وقت مسعود و ساعت سعادت آمود دست بہم دہد و از فیض قدم بوس مبارک آں حضرت کہ فی الحقیقت برکت روزگار و آیۂ رحمت پروردگار اند روزگاران انتظار ایں وقت و آرزوے روزی شدن ایں روز داشت بر مراد خاطر فیروز گشتہ از تجلی دیدار فائض الانوار روزنۂ منظر دیده را روکش دریچۂ مشرق پرانوار سازد. زیاده ازیں دراز نفسی کوتہ اندیشی می داند۔"

اگرچہ اورنگ زیب کے ہتھکنڈوں سے یہ گمان ہوتا ہے کہ تعیین وقت مسعود و ساعت سعادت آمود کا اظہار اس دیر و توقف میں اپنے انتظامات پورا کرنے کے لئے محض ایک حیلہ تھا۔ کیونکہ اس عرصہ میں بادشاہی سردار اور امیر روز بروز اس کے پاس حاضر ہوتے جاتے تھے اور اس حالت میں بادشاہ کے پاس جانے سے بجز ضرر کے کوئی فائدہ متصور نہ تھا۔ اور بقول صاحب سیر المتاخرین حاضر ہونے کا ارادہ ظاہر کرنے کی وجہ صرف اتنی ہی تھی کہ لوگوں کی زبانِ طعن ذرا بند رہے۔ مگر عاقل اور صاحب عمل صالح کے بیان سے (جو اورنگ زیب کے خوشامدی مورخ نہیں ہیں) معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ارادہ فی الحقیقت باپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا تھا۔ مگر فاضل خاں کے چلے جانے کے بعد بعض امرا نے اُسے خوب بہکایا اور شاہجہاں کے پاس جانے سے ڈرا دیا۔ چنانچہ فاضل خاں جب اگلے روز اس اُمید میں کہ باپ بیٹے کی ملاقات اب جلد ہونے والی ہے۔ خوش خوش پھر آیا اور بادشاہ کی طرف سے بطور علامت اُس کی رضامندی اور خوشنودی کے بعض عمدہ تحائف مع ایک مشہور تلوار کے جس کا نام عالمگیر تھا (جس کی نسبت مورخ لکھتے ہیں کہ اورنگ زیب اور اُس کے رفیقوں نے اُسے ایک ایسی فال مبارک سمجھا تھا کہ آخر کار تخت نشینی کے وقت اس لفظ کو اپنے القاب شاہی کا

اُس نے ایک جز بنالیا) لایا اگرچہ اورنگ زیب نے ادب اور اطاعت کی ظاہری باتیں تو اب بھی بہت سی بنائیں مگر شاہجہاں کے پاس حاضر ہونے کی اصل بات پہ نہ آیا۔ جس کو فاضل خاں نے بھی تاڑلیا اور بادشاہ سے جاکر صاف کہدیا۔ ناچار شاہجہاں نے دوسرے روز پھر ایک رقعہ لکھا بلکہ اورنگ زیب کی بدگمانی رفع کرنے کے خیال سے خلیل اللہ خاں کو بھی فاضل خاں کے ساتھ بھیجا اور وہ یہ تھا۔ نقل شقہ ثانی۔

- باوجود حقوق پرورش نیاز ونعیم وترتیب وتلقین وتعلیم وبہ نوازشات بیکراں وعنایات بے پایاں اختصاص بخشیدن وبمناصب بلند ومراتب ارجمند فائز گردانیدن وبااین ہمہ حقوق ابوت واولوالامری کہ بزبان شاہنشاہ علی الاطلاق اطاعت وامتثال حکم لازم وواجب است درکلام ربانی وکتاب آسمانی بدان ناطق اداں فرزند سعادت مند کہ آراستہ حسن اعتقاد ومجموعہ دانش وبینش خداداد دست وپیوستہ عمر گرامی را بہ رضاجوئی ونیک نامی وحق شناسی وخدا دانی صرف کردہ بسیار بعید می نماید کہ قدر مہربانی ورتبہ شوق وخواہش خاطر اقدس را بہ دریافت ودیدار فرحت آثار خویش ندانستہ بنا بر اغوا واضلال صاحب اغراض فاسدہ چند بیت اعدو شوند مرمانے رسند باد شوند اربہ چراغے رسند۔ از احراز سعادت حضور باز ایستد وبواسطۂ دوست کامی مشتے بے مہر بدطینت مارا دشمن کام پسند وخفت مارا در فرمان فرمایان جہان واہل روزگار تجویز کردہ از وخامت عاقبت نیندیشد وبرائے دوروزہ زندگی این سرائے حادثہ را شرمساری وخجالت ابد در پیش خدا ورسول برخود گوارا وآسان گیرد۔ زنہار اے فرزند بکار ے جرات منما کہ آخر منتج ندامت وپشیمانی گردد وندامت سود ند ہد۔ ابیات

اے خلف از راہ مخالف بتاب — تیغ میفگن کہ منم آفتاب

گر ز خود این نقش گرفتی بدست — سوئے خدا بین ومشو خود پرست

ور زبد آموز شد این رہ پدید — گفت بد آموز نباید شنید

گرچہ کنی دعوی دانش ولیک — نیک بدانم کہ ندانی تو نیک

چوں تو شب وروز ادب افزوں کنی — بے ادبی با جو منے چوں کنی

گرچہ جوانی ہمہ فرزانگی است — این نہ جوانی است کہ دیوانگی است

اے پسر ار چہ پسری در خوری — لیک مکن با پدران سروری

بر سر خوان آئے کہ ہم توشۂ — با تو نمک کن کہ جگر گوشۂ

خون منی ودلِ من مہر جوست جوشش بسیار مکن زیر پوست

چنانچہ جب یہ دونوں امیر اورنگ زیب کی ڈیوڑھی پر پہنچے تو صرف خلیل اللہ خاں جو پہلے ہی سے ادھر ملا ہوا تھا اندر بلا لیا گیا جس نے جا کر اورنگ زیب سے کہا کہ آپ ہرگز نہ جائیے وہاں آپ کی نسبت بُرے ارادے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ اُس نے بادشاہ کو قید کر لینے کی صلاح دی اور رفع بدنامی کے لئے خود اپنی درخواست سے بظاہر نظر بند ہو کر وہیں رہ گیا۔ اور اورنگ زیب نے فاضل خاں کی زبانی بادشاہ کو کہلا بھیجا کہ مجھے وہاں جانے میں کئی طرح کا خوف اور اندیشہ ہے اس لئے بالفعل حاضر ہونے سے معذور ہوں۔ بادشاہ نے جب فاضل خاں سے یہ سب ماجرا سُنا اور دیکھا کہ میرے ہی امراء اسے بہکاتے ہیں تو اس اندیشہ سے کہ ایسا نہ ہو کہ یکایک مجھ سے کچھ اور سلوک کر بیٹھیں قلعہ کے دروازے بند کرا دیئے جن کی خبر پہنچتے ہی ذوالفقار خاں اور بہادر خاں اور اورنگ زیب کے سرداروں نے آن کر قلعہ کا محاصرہ کر لیا اگرچہ اُنھوں نے رات کو قلعہ کی فصیل کے نزدیک پہنچ کر بقول عاقل خاں بہت سا کروفر دکھایا مگر یہ قلعہ ایسا نہ تھا کہ وہ ایسی آسانی سے اُس پر قابض ہو جاتے اس باعث سے اورنگ زیب کے سردار اور سپاہی قلعہ کے نزدیک کے مکانوں اور درختوں اور دیواروں کی آڑ میں آ پڑے اور دونوں طرف سے توپ اور بندوق کی لڑائی شروع ہو گئی۔ اگرچہ بادشاہ کی طرف سے بعض چھوٹے سردار اور بندوقچی بیچارے نمک حلالی اور بہادری سے بخوبی مقابلہ اور مدافعت کرتے رہے۔ مگر اکثر بڑے امرا اور منصب دار پہلے ہی روز یہ بہانہ بنا کر چھپت ہوتے کہ دریچہ کے راستہ دریا سے پانی لانے والوں کی مدد کو جاتے ہیں۔

چونکہ گرداگرد کی عمیق خندق کی وجہ سے اس قلعہ میں نہ تو سرنگ ہی لگ سکتی تھی اور نہ حملہ ہی ہو سکتا تھا۔ اس لئے اہل قلعہ کو پیاسا مار کر مغلوب کرنے کے قصد سے دوسرے دن اورنگ زیب کے لوگ نہایت جرأت کر کے خضری دروازہ تک جا پہنچے اور قلعہ میں پانی پہنچنے کا راستہ بند کر دیا۔ وہ لوکا موسم اور آگرہ کی سخت گرمی بے چارے اہل قلعہ لاچار ہو گئے۔ پس اس بیمار اور بڈھے بادشاہ نے یہ حادثہ دیکھ کر بجز غیر مشروط اطاعت کے (جس کو ان فارسی تاریخوں میں "مصالحہ" لکھا ہے) اور کوئی صورت نہ دیکھی اور پھر اپنے اُسی دلی خیر خواہ بیچارے فاضل خاں کو فرزند بلند اقبال کی خدمت میں ایک اور تحریر دیکر روانہ کیا جس کا مضمون یہ تھا۔

"مالک الملک تعالیٰ شانہ کہ مملکتش از تغیر و زوال مصون است کوکب اقبال فرزند برومند قوی طالع راچوں کوکب جہاں فروز فروغ بخش شبستان دولت وضیا افزائے ساحت جہاں دارد۔ از کجبازی سپہر نیرنگ ساز و ناسازی روزگار شعبدہ باز امریکہ اصلاً بحیطہ تصور و حیز

تعقل در نمی آمد بعین الیقین مشاہدہ افتاد۔ آں فرزند اقبال مند طالع بلند بیک بارگی مہر فرزندی بریدہ و بہ آتش شوق کہ در کانون درون اقدس سمت التہاب پذیرفتہ نظرے نیفگند و چشم از حقوق ابوت و تربیت عمرے پوشیدہ مارا دشمن کام پسندیدہ و ایذا و آزار ما را کہ موجب بدنامی دنیا و مورث ناکامی عقبی است سہل و آسان انگاشتہ از پرس روز شمار غافل و بے خبر افتادہ اما در یوم یقوم الحساب از یں جرأت و ارتکاب حق شکنی چہ جواب خواہد داد۔ نظم

پیش کہ گویم ز خودت شرم باد | کز پئے خون خودم اندر فتاد
بندہ کہ با شاہ بود کینہ جو | خلق چہ گویند تو ہم خود بگو
ورز نور قلب من آمد غبار | ہم تو شوی در رخ خود شرمسار
باش بکام کہ بکام توام | زندہ و نازندہ بنام توام
بہر خدا صورت خویشم نما | روئے بگردان و بترس از خدا

لائق آنست کہ آں قرۃ باصرۂ دولت و دارائے بر صف شکنی و کشورکشائی خود مغرور بودہ تکیہ و اعتماد بر سازگاری زمانہ و رفاقت روزگار نکند کہ ایں چرخ پر نیرنگ و جہان دو رنگ اصلا اعتماد را نشاید و از یں پیمان شکن بد عہد قطعا وفا نیاید و درمیں صورت شائستہ خرد آنست کہ کارے کہ موجب طعن و متوراین و ودمان عالی شان گردد ارتکاب آں اجتناب واجب شمردہ در حفظ ناموس سلطنت چندیں سالہ کہ طنطنۂ عظمت و شکوہ و حشمت و اقتدار ایں دولت در ساحت زمین و زمان پیچیدہ و سائر فرمان روایان روئے زمین از آں شمارے برمی گرفتند کوشیدہ آنچہ از فرزندان قابل توقع باشد بہ ظہور آرد کہ نام نیک و رسم قابلیت آں نوبادۂ گلشن جاہ و جلال در صحیفۂ روزگار و صفحۂ لیل و نہار ثابت و پائدار بماند۔

جس کے جواب میں اورنگ زیب نے یہ عریضہ لکھا۔

"للہ الحمد والمنۃ کہ ایں نیاز مند درگاہ شاہنشاہ بے شل و مانند از بدو اعتبار رواج عقل و تمیز الی الآن باندازہ امکان بشری و طاقت انسانی در تمہید قواعد ارادت و اعتقاد و تشئید مبانی صدق و سداد خود را مقصر نساختہ و در ضبط سر رشتہ استرضائے خاطر ہمایوں کوشیدہ از صراط مستقیم عبودیت و جان فشانی انحراف جائز نداشتہ و نمی دارد و در راہ بندگی و عقیدت ثابت و راسخ است لیکن از ثمر ظہور ایں مقدمات کہ بنا بر ارادت ازلی و مشیت لم یزلی در میان آمدہ بمقتضائے طبیعت بشری مغلوب واہمہ و ہراس گشتہ جرأت آں نماندہ کہ باطمینان

قلب و جمعیت باطن عازم احراز سعادت حضور پر نور توانند شد والا از روے خاطر فاتر اینا
مستمند سراپا ارادت و اخلاص بہ نیلِ دولت استلام سدہ سپہر التیام زیادہ از آن است کہ حیطہ
تقریر و تبیین آں را برتابد و زبان از شکرِ عنایاتِ سرشار و مراحم و اشفاق بے شمار اقدس قاصر
اگر آئین مرید نوازی مرعی فرمودہ حکم والا بشرف نفاذ رسانند کہ بعضے از مردم ایں مرید نخست
بقلعہ باریافتہ بجائے جمعے از ملازمان سرکار عالم مدارکہ بہ محافظت مداخل و مخارج مامور اند
قرار گیرند و از پیش گاہ عنایت خسروانی بحراست ابواب قلعہ امتیاز و اختصاص یابند ایں فدوی
جاں سپار بخاطر جمع و سکونِ باطن و اطمینانِ دل بحضور اقدس رسیدہ سعادت زمیں بوس
اشرف حاصل نماید و زبانِ عقیدت بیان بعذر تقصیرات بکشاید نمایت مرید نوازی خواہد بود۔
اس کاغذ کے پہنچنے پر شاہجہاں نے ناچار حکم دیدیا کہ سب بادشاہی ملازم قلعہ سے باہر چلے جائیں اور قلعہ کے دروازے کھول دیئے اور شاہزادہ محمد سلطان معہ ذوالفقار خاں اور شیخ میر اور بہادر خاں اور اسلام خاں کے روز جمعہ گیارھویں رمضان ۱۰۶۸ھ کو داخل قلعہ ہو گئے۔ اور جب سب جگہ اپنا بندوبست کر چکے اُس وقت محمد سلطان اسلام خاں کے ساتھ کورنش کے لئے داداجان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اگرچہ اب بیچارہ بادشاہ قلعہ بھی حوالہ کر چکا۔ مگر جب اس پر بھی حضرت اورنگ زیب ملاقات کو نہ آئے تو اگلے روز شاہجہاں کی بڑی بیٹی معروف بیگم صاحب باپ کی طرف سے ملاقات وغیرہ کے پیغام لے کر اورنگ زیب کے لشکر کو خود گئی۔ مگر اُس طرف سے اُس کے اعزاز و احترام کے مقررہ دستور کے برخلاف اُس کا استقبال وغیرہ نہ کیا گیا۔ اور یہ کہلا بھیجا کہ آپ محل سرا میں چلیں، میں وہیں آتا ہوں۔ اور جب وہ محل سرا میں پہنچ گئی تو اورنگ زیب نے کسی قدر اعزاز و اکرام سے ملاقات کی بیگم صاحب نے پہلے تو باپ کی طرف سے اپنے فتح مند بھائی کی نسبت اظہار عنایت اور شوقِ دیدار بیان کیا۔ بعد اس کے یہ بے موقعہ پیغام دیا کہ حضرت ظلِ سبحانی کی شاہانہ مرضی اس طرح پر ہے کہ ملک پنجاب معہ اُس طرف کے اور اضلاع کے داراشکوہ کو عنایت فرمائیں اور گجرات پر مراد بخش اور بنگالہ پر شجاع کا بدستور تصرف رہے اور ملک دکن محمد سلطان کو عطا ہوا اور شاہ بلند اقبال کا خطاب اور باقی کل ممالک محروسہ کی ولی عہدی کا منصبِ عالی آپ کو مبارک ہو۔ پس آپ قبول کیجئے۔ اور غرض مند لوگوں کی باتوں پر نہ جایئے۔ بغیر وغدغہ اور وسواس کے حضرت کی خدمت میں چل کر اپنے دیدار سے اُن کی خاطر مشتاق کو مسرور کیجیے اورنگ زیب نے اس کے جواب میں داراشکوہ کی خصومت کی سخت شکایتیں کر کے ان باتوں کی قبولیت سے انکار کیا اور صاف کہہ دیا کہ داراشکوہ کا معاملہ یکسو ہوئے بغیر حضور میں حاضر ہونے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

بیگم صاحب یہ جواب سُ کر نہایت رنج و افسوس کے ساتھ واپس ہوئی۔ اور سب اندوہناک ماجرا بادشاہ سے عرض کیا۔ اس کے بعد پھر اسی طرح پیام و سلام ہوتے رہے۔ اور جب آخرکار بہت سی گفت و شنید کے بعد اورنگ زیب تیسرے دن شاہجہاں کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ کر کے باغ نورمنزل سے سوار ہو کر چل پڑا تو یکایک شائستہ خاں اور شیخ میر نے سامنے سے آکر عرض کیا کہ

"حضور کہاں جاتے ہیں! یہ ارادہ عقل اور دور اندیشی کے برخلاف ہے۔ خدا کے واسطے اس سے احتراز فرمائیے۔ اور جب خدا کے فضل سے قلعہ میں حضور کا عمل و دخل خاطر خواہ ہو چکا ہے اور اعلیٰ حضرت کا اختیار و اقتدار کچھ بھی نہیں رہا تو بلا ضرورت اندیشے اور خطر کی جگہ میں جانے سے اب کیا حاصل؟"

ان باتوں سے اورنگ زیب کی طبیعت میں پھر ایک تذبذب سا پیدا ہو گیا اور وہ اپنے ڈیرے کو چلا آیا۔ اور بادشاہ کے پاس جانے نہ جانے کی نسبت ابھی گفتگو میں درمیان ہی میں تھیں کہ اسی اثنا میں ناہر دل نامی ایک چیلے نے شاہجہاں کا ایک رقعہ جو اس نے دارا شکوہ کے نام اپنے ہاتھ سے لکھ کر بڑے اعتماد اور احتیاط سے اس کو سپرد کر کے یہ ہدایت کی تھی کہ نہایت جلد دہلی پہنچ کر اس کا جواب لائے۔ پیش کیا۔ خلاصہ اس کاغذ کا عاقل خاں نے یہ لکھا ہے کہ

"دارا شکوہ در شاہجہاں آباد ثبات قدم ورزد۔ کمی خزانہ و لشکر در آنجا نیست۔ زینہار از آنجا پیشتر نگذرد کہ ما بدولت دریں جا مہم را فیصل می فرمائیم۔"

اس آخر فقرہ کا پڑھنا تھا کہ اورنگ زیب کو اپنے خیر خواہوں کی باتوں کا یقین ہو گیا۔ اور اُس نے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ بالکل ترک کر دیا اور چونکہ بیگم صاحب کے آنے کے بعد جعفر خاں وزیر۔ حکیم تقرب خاں (جو قرب و منزلت میں وزیر سے کم نہ تھا) اور رائے رایان راجہ رگھناتھ دیوان سلطنت بھی معہ عملۂ دیوانی حاضر ہو چکے تھے اب شہزادوں کے دستور کے موافق نشست منعقد کر کے سب امرا اور منصب داروں کی نذریں (شاہانہ طور پر) لیں اور بعد ازاں بڑے طمطراق اور کر و فر کے ساتھ بسواری فیل قلعہ کے دروازے کے آگے سے گذر کر دارا شکوہ کی حویلی میں جا ڈیرہ کیا۔ اور محمد سلطان نے باپ کے حکم سے تمام بادشاہی خزانوں کا رخانوں توشہ خانوں کو ضبط کر کے سربمہر کر دیا۔ اور اکیسویں رمضان سنہ مذکور سے شاہجہاں ایسی سخت قید میں رہا کہ حرم سرائے سے باہر نکلنے کی اجازت نہ رہی۔ بلکہ بقول مصنف عمل صالح مدت تک بجز چند خادمہ عورتوں کے کوئی خدمت گار تک پاس پھٹکنے نہ پاتا تھا۔

ذوالفقار خاں آگرہ کا قلعہ دار اور شاہجہاں کا محافظ مقرر ہوا۔ اسلام خاں کو آگرہ کی صوبہ[داری]

گئی۔ اور آپ صرف تین روز دارا شکوہ کی حویلی میں ٹھہر کر دلی کو کوچ کر دیا اور اگرچہ سیاسی مصلحتوں کے لحاظ سے اپنی معیت میں محمد سلطان کو بھی آگرہ رہنے کا حکم دیا مگر نہ تو اس کو فوج وغیرہ پر اختیار کلی ہی دیا نہ قلعہ میں رہنے کی اجازت دی بلکہ اسلام خاں کو اس پر اتالیق مقرر کر کے یہ حکم دیا کہ دارا شکوہ کی حویلی میں قیام رکھے۔ اور اگرچہ بادشاہ کے قید اور بے بس کر دینے کے لئے ایک طرف تو مذکورہ بالا اہتمام و انتظام تھے مگر ظاہرداری سے ان حرکتوں پر پردہ ڈالنے اور لوگوں کی طعن و تشنیع سے بچنے کی خاطر دلی کو کوچ کرنے سے پہلے فاضل خاں میر ساماں کو بادشاہ کی خدمت گذاری اور پرداخت مہمات بیوتات و انتظام کارخانجات خاصہ شریفہ (کے لئے وجہ اکثر وہیں تھے) مقرر کیا۔ اور تقرب خاں کو جو شاہجہاں کا مزاج داں معالج تھا۔ رہے سہے امراض کے علاج کے لئے مقرر کر کے تین ہزار اشرفیوں کے انعام اور عنایات "خلعت خاص و جمدھر مرصع با علاقہ مروارید" سے سرفراز کیا۔ اور جب آگرہ سے چل کر پہلا ڈیرہ بہادر پور میں ہوا تو اپنے فرزند ثالث محمد اعظم کو بھی سلام کے لئے روانہ کیا جس نے جد امجد کو پانچ سو مُہریں اور چار ہزار روپیہ نقد نذر کیا اور بادشاہ نے بھی تملق اور ظاہری پیار محبت کے بعد بہت کچھ دے دلا کر رخصت کیا۔ شاہجہاں کی قید کے پُر عبرت واقعہ کا مادۂ تاریخ جو نہایت ہی حسب حال ہے عاقل خاں نے یہ لکھا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔ س م ح

مرادبخش کی گرفتاری

القصہ دونوں شاہزادوں نے باپ کے معاملہ سے فارغ ہو کر اُمرا کی نذریں لیں اور اپنے ماموں شائستہ خاں[1] کو آگرہ کا صوبہ دار بنا کر اور خزانہ شاہی سے اخراجات ضروری کا انتظام کر کے داراشکوہ کے تعاقب میں کوچ کیا۔ اور جب فوج آگرہ سے کوچ کرنے والی تھی تو مرادبخش کے مخلص ہوا خواہوں خصوصاً شہباز خواجہ سرا نے اُس کو بہت سمجھایا کہ

"آپ کو مع اپنے لشکر کے آگرہ یا دہلی سے دور جانا نہیں چاہئیے اور غایت درجہ کا ادب و آداب اور بے حد میٹھی باتیں جو اورنگ زیب کر رہا ہے فریب اور دغا بازی کا نشان ہیں۔ اور جب کہ خاص و عام بلکہ خود وہ بھی اس امر کو تسلیم کرتا ہے کہ اب بادشاہ آپ ہیں تو پھر یہ کیوں کر مناسب ہے کہ آپ آگرہ اور دہلی کے نزدیک نہ رہیں اور کہیں دور چلے جائیں۔ پس آپ اُسی کو داراشکوہ کے

---

[1] پچھلے حاشیہ میں لکھا جا چکا ہے کہ اس وقت اسلام خاں کو آگرہ کا صوبہ دار بنایا گیا تھا البتہ شائستہ خاں بھی آگرہ کا صوبہ دار مقرر ہوا تھا مگر اس سے کچھ عرصہ بعد۔ س م ح

تعاقب میں جانے دیجئے۔"

چنانچہ میری دانست میں اگر وہ یہ معقول صلاح مان لیتا تو اورنگ زیب بڑی مشکل میں پڑ جاتا لیکن اُس نے ایک نہ مانی اور بھائی کے ساتھ دہلی کو چل کھڑا ہوا کیونکہ اُس کے مکر اور مستحکم وعدوں اور اُن بیہودہ قسموں پر جو بارہا قرآن درمیان رکھکر کھائی ہوئی تھیں اُس کو پورا بھروسہ تھا۔لیکن جب دونوں نے متھرا پہنچ کر مقام کیا جو آگرہ سے قریب تین چار منزل کے ہے تو مرادبخش کے خیرخواہوں نے جو اس عرصہ میں بہت کچھ دیکھ اور سُن چکے تھے ناچار ہوکر آپس میں یہ صلاح کی کہ ایک دفعہ تو اس کو سمجھانا چاہیئے آگے وہ جانے۔ مانے یا نہ مانے۔چنانچہ انھوں نے اُس سے کہا کہ

"ہم کو متعدد ذرائع سے پختہ خبریں ملی ہیں کہ اورنگ زیب کا کچھ بُرا ارادہ ہے اور کسی خوفناک منصوبہ کے لئے بہت کچھ بندشیں ہو چکی ہیں اس واسطے اُس کی ملاقات کو خاص اُس کے لشکر میں آپ کا جانا مناسب نہیں اور زیادہ نہیں تو آج کی رات تو ہرگز نہ جایئے۔اور اس آفت کے ٹال دینے کی بہت آسان سبیل یہ ہے کہ ناسازیِ طبیعت کا بہانہ کرلیجئے اور وہاں نہ جایئے۔ یہ سُن کر جیسا کہ معمول ہے اورنگ زیب خود ہی چند آدمیوں کے ساتھ آپ کے پاس آجائے گا۔"

لیکن نہ تو ان تقریروں اور دلیلوں ہی نے کچھ اثر کیا اور نہ منت وسماجت ہی کچھ کارگر ہوئی۔کیونکہ وہ ایک ایسی حالت میں تھا گویا کسی نے اُس پر جادو کیا ہوا ہے چنانچہ اورنگ زیب کی ظاہری اطاعت اور دکھاوے کی محبت سے فریب میں آکر اپنے رفیقوں اور خیرخواہوں کی ممانعت کے باوجود اورنگ زیب کے لشکر میں،جہاں میرخاں اپنے تین چار محرمِ راز مصاحبوں کے مشورہ سے گھات میں لگا ہوا اس کے آنے کا منتظر تھا۔ضیافت کھانے چلا گیا۔اور جب یہ سادہ لوح شہزادہ وہاں پہنچا تو اورنگ زیب نے معمول سے زیادہ بڑھ چڑھ کر تعظیم وتکریم کی اور اس قدر خوشی کا اظہار کیا کہ آنکھوں سے چند آنسو بھی نکال دیئے اور خاص اپنے ہاتھ سے مرادبخش کے چہرہ کی گرد صاف کی اور پسینہ پونچھا اور جب کھانا کھانے کو بیٹھے تو نہایت ہی گرم جوشی دکھائی اور اظہارِ مسرت کے لئے ہنسی اور مذاق کی بے حد باتیں بنائیں اور کھانے سے فارغ ہونے کے بعد جب عمدہ کابلی اور شیرازی شراب پیش ہوئی تو آہستہ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور مسکرا کر بولا۔

حضرت کو معلوم ہے کہ میں اپنے مذہبی خیالات کے باعث اس صحبت عیش و نشاط میں حاضر رہنے سے قاصر ہوں اگرچہ میں رخصت ہوتا ہوں لیکن یہ سب لوگ جو اس پر لطف جلسہ کے شریک ہیں اور میر خاں[1] اور میرے مصاحب آپ کی خدمت گذاری کے لئے حاضر ہیں "

پس مراد بخش شراب دوست تو تھا ہی اُس پر یہ طرہ کہ ایسی عمدہ صحبت اور ایسی لطیف شراب ہیں۔ غرض خوب پی اور یہاں تک پی کہ بالکل سرشار ہو گیا اور اورنگ زیب کا جو یہ مدعا تھا کہ وہ مدہوش ہو کر سو جائے پورا ہو گیا۔ پس اول تو مراد بخش کے نوکروں کو اس حیلہ سے رخصت کر دیا گیا کہ اُس کے خواب راحت میں خلل نہ آئے۔ اور اس کے بعد میر خاں نے اُس کی تلوار اور جمدھر کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔ اور تھوڑی ہی دیر بعد اورنگ زیب اُس کو اس نازیبا خواب سے جگانے کے بہانہ سے خیمہ میں آیا اور اس تمام مصنوعی ادب و لحاظ کو خیرباد کہہ کر اس خفتہ بخت کے اول تو چند ٹھوکریں ماریں اور جب اُس نے ذرا آنکھیں کھولیں تو یہ ذو فنون! ملامت کی راہ سے بولا کہ بڑی شرم کی بات ہے کہ

"تم بادشاہ ہو کر ایسے غافل اور بے خبر ہو جاؤ۔ بھلا دنیا کے لوگ تم کو بلکہ مجھ کو بھی کیا کہیں گے۔ اور لوگوں کو اشارتاً کہا کہ اس بدمست و مخمور کے ہاتھ پاؤں باندھ کر خلوت خانہ میں لے جاؤ کہ نشہ کے اُترنے تک اس بے شرمی کا سونا وہاں سوئے "

پس تعمیل حکم میں کیا دیر تھی فوراً پانچ چھ مسلح شخصوں نے آن دبایا اور مراد بخش ہر چند چلاتا اور زور کرتا رہا۔ لیکن اس کے پاؤں میں بیڑی اور ہاتھوں میں ہتکڑی ڈال ہی دی اور قیدی بنا کر ایک علیحدہ جگہ میں ڈال دیا۔

یہ سختی اور بدسلوکی خواہ کیسی ہی مخفی طور پر کی گئی تھی مگر مراد بخش کے اُن ملازموں پر ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی جو باہر بھیج دیئے گئے تھے پس جب اُنھوں نے اس کی بھنک سنی تو کسی قدر شور و غوغا مچایا اور چاہا کہ بزور اندر گھس آئیں لیکن مراد بخش کے میر آتش علی قلی نے جس کو اورنگ زیب نے کچھ دے کر پہلے سے گانٹھا ہوا تھا بھا اور دھمکا کر خاموش

---

[1] شیخ میر اور سید میر دونوں بھائی تھے ان میں سے سید میر اورنگ زیب کا بے تکلف مصاحب در غالباً اس جگہ وہی مراد ہے۔ س م ع

کرا دیا۔ اسی طرح اُس کے لشکر میں بھی اگرچہ کچھ شور و شر شروع ہو گیا تھا اور اندیشہ تھا کہ کہیں وہ یکایک چڑھ نہ آئے لیکن رات ہی کو کچھ لوگ بھیج دیتے گئے جنھوں نے جا کر یہ مشہور کر دیا کہ اورنگ زیب کے ڈیرہ میں جو ماجرا گذرا ہے وہ کچھ بڑی بات نہیں ہے کیونکہ ہم بھی وہیں تھے اور بات صرف اس قدر ہے کہ مراد بخش شراب ذرا زیادہ پی گیا تھا اور یہاں تک بدکلامی کرنے لگ گیا تھا کہ اور تو کوئی کیا خود اورنگ زیب کو بھی مغلظات گالیاں دیں اور ایسا اودھم مچایا کہ ناچار خلوت خانہ میں بند کرنے کی ضرورت پڑی۔ ۔ ۔ بہرحال تشویش کی کوئی بات نہیں ہے صبح کو جب نشہ اُتر جائے گا تو وہ صحیح و سلامت اپنے لشکر میں آ جائے گا۔

اب ادھر تو اہل سپاہ کو یہ دم دے کر چپ کرایا گیا اور اُدھر راتوں رات بڑی بڑی رشوتیں اور بڑے بڑے وعدے دے کر لشکر کے بڑے سرداروں کو الگ گانٹھ لیا گیا اور معاً تمام فوج کی تنخواہ بڑھا دی گئی غرضکہ وہ شورش اور ہنگامہ جو برپا ہوا تھا صبح ہوتے اُس کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ کیونکہ ایسے لوگ بہت ہی تھوڑے تھے جو یہ نہ سمجھتے ہوں کہ مراد بخش کسی بلا میں پھنسنے والا ہے ورنہ اُس کے سب سردار اور سپاہی اس بات کو بخوبی جانے ہوئے تھے کہ کسی نہ کسی دن یہ ضرور پھنس جائے گا۔

جب یہ سب بند و بست ہو چکا اور اطمینان ہو گیا کہ اب کچھ اندیشے کا مقام نہیں ہے تو اس نامراد کو ایک زنانی عماری میں بند کر کے دہلی کو چلتا کیا اور قلعہ سلیم گڈھ میں جو جمنا میں بنا ہوا ہے قید کیا گیا[1]

---

[1] مسٹر ارونگ براک صاحب اصل کتاب کے مترجم انگریزی نے کرنل ڈو صاحب کی تاریخ ہندوستان سے اس موقعہ پر مندرجہ ذیل حاشیہ لکھا ہے۔

قولہٗ جب مراد بخش کیمپ میں جو متھرا کے قریب تھا آ پہنچا تو اُس سے اگلے دن سلطان مراد بخش نے اورنگ زیب کو ضیافت کا پیغام بھیجا اور چونکہ وہ طبعاً کشادہ مزاج اور رنگین طبع شخص تھا اس وجہ سے اورنگ زیب نے بغیر کسی طرح کے شک و شبہ کے اُس کی دعوت کو قبول کر لیا جب دونوں بھائی دسترخوان پر بیٹھ گئے اور شہباز نے جو مراد بخش کے محلات کا ناظر اور اس دعوت کے اصلی منصوبہ کا رازدار تھا یکایک کان میں آ کر کہا کہ "عمدہ پوشاک میں چاک کرنے کا اب وقت ہے" یعنی اورنگ زیب سے یہیں سمجھ لینا چاہیئے تو اورنگ زیب جو لوگوں کی صورتوں اور چہروں سے دلوں کے بھید سمجھ لیتا

تھا اس سرگوشی اور بھائی کی بناوٹی رنگینیوں سے جو اس وقت دکھا رہا تھا اصل مدعا کو تاڑ گیا۔ مگر تحمل اور متانت کی راہ سے خاموش ہو رہا اور جب مراد بخش نے بھا کر شہباز کو رخصت کر دیا کہ فلاں علامت اور اشارہ کا منتظر رہے تو اورنگ زیب نے یہ سمجھ کر کہ اس وقت میرے قتل کا منصوبہ ہے یکا یک یہ ظاہر کیا کہ میرے پیٹ میں سخت درد ہے اور مجلس سے اٹھ کر جھٹ پٹ باہر چلا آیا اور اپنے اہل موالی اور ہم رکاب سپاہیوں کے پاس جو ڈیوڑھی پہ حاضر تھے آپہنچا اور وہاں سے سیدھا اپنے لشکر میں آگیا۔ اور اس تمارض کی چال کو ایسی خوبصورتی سے چلا کہ مراد بخش یہی خیال کرتا رہا کہ وہ فی الواقع بیمار ہے اور اس کو گمان بھی نہ ہوا کہ وہ اس منصوبہ کو سمجھ گیا ہے۔ چنانچہ آخر تین روز کے بعد جب اورنگ زیب کا مصنوعی درد شکم جاتا رہا تو مراد بخش نے بہت خوشیاں منائیں اور بڑے تپاک سے مبارکباد دی اور اس سے اگلے دن اورنگ زیب نے دعوت کی تیاری کی اور پیغام دیا کہ آپ کی تفریح طبع کے لئے ایسی حسین وجمیل ارباب نشاط بلائی گئی ہیں جو اپنے حسن وجمال اور لطافت ونزاکت اور گانے بجانے کے فن میں ایسی بے نظیر ہیں کہ ایسے کمالات کی رنڈیاں اس سے پہلے کبھی ہندوستان بھر میں نہیں دیکھی سُنی گئیں۔ اور اس مضمون کو ایسی آب وتاب سے بیان کیا گیا کہ مراد بخش جو بالطبع عیش وعشرت کا پُتلا اور راگ رنگ کا شیدا تھا ہزار جان سے اُن کا مشتاق ہو گیا اور اپنے تمام خیر خواہوں میں سے کسی کی بھی نہ سُنی اور اپنے مکار بھائی کے خیمہ گاہ میں چلا ہی گیا۔ چنانچہ جب بادشاہ سلامت (جیسا کہ اورنگ زیب اس کے بیوقوف بنانے کو کہا کرتا تھا) خیمہ گاہ میں داخل ہوئے تو وہ نازنینیں اُس کو ایک اور اندر کے خیمہ میں لے گئیں اور یہ مغلوب النفس شہزادہ اُن کے حیرت افزا حسن وجمال کو دیکھ کر جو فی الواقع بے مثال تھا بالکل لٹو ہو گیا۔ الغرض ناچ رنگ شروع ہوا اور عیش ونشاط کا وہ سماں بندھا کہ مراد بخش نے مزے میں آکر شراب شیرازی منگائی۔

اب دور چل رہا ہے اور "بادشاہ سلامت" پریوں کے اکھاڑے میں راجہ اندر بنے بیٹھے ہیں اور اورنگ زیب بھی اپنے معمولی تقویٰ وطہارت سے ہاتھ دھوئے اس بزم شراب میں شریک ہے۔

آخر جب حضرت کے ہوش وحواس رخصت ہونے لگے تو اورنگ زیب نے شیرازی کی خام شراب کی جگہ تیز شراب کے پیالوں کی اور بھی بھرمار شروع کر دی۔ جس سے وہ تھوڑی ہی دیر میں بیہوش ہو کر ایک نازنین کی بغل میں سر دے کر سو گیا۔ اور چونکہ اورنگ زیب نے اپنے سرداروں کو حکم دے رکھا تھا کہ جو اُمرا وغیرہ مراد بخش کے ساتھ آئے ہیں اُن کی تواضع بھی اسی

تکلف سے کی جائے اس لئے اس کے باڈی گارڈ کے لوگوں تک کو بھی شراب پلا پلا کر مدہوش کر دیا گیا اور اس تدبیر سے وہ بدبخت شہزادہ بالکل بے حفاظت رہ گیا۔ اور اورنگ زیب نے موقع پاکر نظر جنگ اور تین اور امیروں کو حکم دیا کہ خیمہ میں جا کر اُس کے ہاتھ پاؤں باندھ لیں۔ چنانچہ وہ عورت تو ان کو آتے دیکھ کر کھسک گئی اور انھوں نے آکر مراد بخش کو جو پلنگ پر پڑا ہوا تھا۔ اور جس کے ہتھیار تلوار اور خنجر وغیرہ اورنگ زیب نے چالاکی سے پہلے ہی اٹھوا لئے تھے آن گھیرا۔ اور آہستہ آہستہ اُس کے ہاتھ باندھنے شروع کر دیئے۔ پس اس حرکت سے مراد بخش چونک پڑا اور جھنجلا کر باندھنے والوں کے کچھ لاتیں وغیرہ مارنے لگا۔ جس سے وہ ذرا ڈر گئے اور شہزادہ پکار پکار کر اپنی تلوار مانگنے لگا۔ اب اورنگ زیب نے جو اس کارروائی کے وقت خیمہ کے دروازے پر کھڑا تھا پردہ کے پیچھے سے سر نکالا اور اپنے امیروں کو خوب ڈانٹ کر کہا کہ اگر یہ کچھ ہاتھ پاؤں ہلائے تو ابھی قتل کر ڈالو۔ جس کوسن کر مراد بخش نے کچھ برا بھلا تو کہا۔ مگر آخر کار چپ ہو کر ہاتھ پاؤں بندھوا لئے۔ اور ناظر شہباز جو اُس کا دلی رفیق اور خیر خواہ اور عمدہ مشیر تدبیر تھا اُس کو بھی اُسی وقت اس طرح سے قید کر لیا گیا۔ کہ وہ شامیانہ جو میر بخشی کے ڈیرہ کے آگے لگا ہوا اور یہ اُس کے نیچے بیٹھا ہوا تھا اشارہ ہوتے ہی اُس کی چاروں چوبوں کی طنابیں یک لخت کاٹ کر گرا دیا۔ اور قبل اس کے کہ وہ اس ناگہانی ابھیڑے سے اپنے تئیں نکال سکے پکڑ لیا گیا۔ اور باقی اُمرا کو مسلح آدمیوں نے گھیر لیا۔ اور اورنگ زیب کے حضور میں حاضر کئے گئے جنھوں نے فرمانبرداری قبول کر لی۔

اس واقعہ سے اگرچہ خفیف سا چرچا مراد بخش کے لشکر میں پھیلا مگر اُس سے کوئی ضرر پیدا نہیں ہوا۔ اور اہل فوج تھوڑی دیر کے بعد اس طرح سے چپ چاپ ہو گئے جیسے کوئی شخص خواب پریشاں سے ذرا چونک کر پھر سو جاتا ہے۔

جب سلطان مراد بخش کو قید کیا گیا تھا۔ اُس وقت کچھ زیادہ رات نہیں گئی تھی اور دن نکلنے سے پہلے ہی اُس کو اور اُس کے رفیق کو ایک ہاتھی پر زنانی عماری میں بند کر کے بحفاظت کامل آگرہ کو روانہ کر دیا گیا تھا۔ (انتہیٰ کلامہ)

مگر واقعات کی ترتیب اور اُن چالوں اور منصوبوں کی تفصیل جو دارا شکوہ پر فتح پانے سے مراد بخش کے قید ہونے اور اُس کے سلیم گڑھ میں بھیج دینے تک اورنگ زیب اپنے اس سادہ لوح بھائی کی نسبت عمل میں لاتا رہا جس طرح پر کتاب عالمگیر نامہ۔ عمل صالح۔ اور سیر المتاخرین

میں بطور مجمل اور عاقل خاں کی تاریخ میں مفصل درج ہے۔ اور ڈو صاحب کی تحریر سے آمادہ اعتماد کے لائق ہے) خلاصہ اُس کا یہ ہے کہ جب اورنگ زیب دارا شکوہ پر فتح پا چکا تو مراد بخش کے ساتھ بہت ہی چرب زبانی اور ملائمت سے پیش آیا۔ اور چونکہ اس لڑائی میں اُس نے زخم کھائے تھے اس لئے۔ اطبا یانِ حاذق وجراحانِ ماہر اس کے علاج کے واسطے مامور کئے۔ اور جب دونوں بھائی آگرہ کے قریب پہنچ کر باغ نور منزل میں ڈیرہ کر چکے تو اب اورنگ زیب نے چاہا کہ بغیر مراد بخش کی شرکت کے شہر آگرہ (یعنی دارالسلطنت) پر خاص اپنا قبضہ کرے اس لئے اس بہانہ سے کہ اہل شہر اس ہنگامہ اور شوروشر کے باعث بہت خوف زدہ ہو رہے ہیں اور مراد بخش کی سپاہ کے لوگ اپنے آقا کی بے پروائی کے سبب سے براہ خود سری حکم کے خلاف شہر میں داخل ہو کر دست درازیاں اور بے اعتدالیاں کرتے ہیں۔ رعایا کی تسلی اور انتظام کا حیلہ بنا کر اپنے بیٹے محمد سلطان کو مع اپنی سپاہ کے شہر میں بھیج کر اپنا عمل و دخل کر لیا اور جب بادشاہ کے تہیہ کر لینے کے بعد بڑی شان وشوکت کے ساتھ شہر میں خود داخل ہوا تو اُس روز بھی مراد بخش کو اس حیلہ سے کہ آپ کے زخم ابھی کچے ہیں! سواری وغیرہ کی حرکت مناسب نہیں۔ وہیں باغ نورمنزل میں پڑا رہنے دیا! اور خود دارا شکوہ کی حویلی میں (جو ولی عہد سلطنت اور مدعی بادشاہت کی حویلی تھی) آ ڈیرہ کیا۔ مگر میاں مراد بخش باوجود ان تمام حالتوں کے اپنے خیال میں بدستور بادشاہ بنے ہوئے تھے اور تخت وچتر وغیرہ سلطنت کا سارا سوانگ گجرات سے کہ اب تک اپنے ساتھ رکھتے تھے۔

مذکورہ بالا مورخوں کا قول ہے کہ اب اس کے دل میں اورنگ زیب کا یہ عروج دیکھ کر کچھ تو خود ہی حسد ہوتا تھا اور کچھ اس کے سردار اور امیر خواہ ازراہ خیر خواہی خواہ ازراہ خودغرضی اُس کو بہکاتے تھے کہ اورنگ زیب کے قول وقسم اور عہد وپیمان پر بھروسہ نہ کرکے اپنا بندوبست کرنا چاہیئے۔ چنانچہ کچھ نئے سپاہی بھی بھرتی کئے جاتے تھے اور سرداروں اور امیروں کو بھی فضول دعائیں دے کر اپنی طرف ملانے کی کوششیں کی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ قریب بیس ہزار سوار کے مراد بخش کے لشکر میں جمع ہو گئے۔ بلکہ بعض سردار اور سپاہی عالمگیر سے بھی جدا ہو کر اس کے لشکر میں جا شامل ہوئے۔

جب اورنگ زیب نے آگرہ سے بائیسویں رمضان ۱۰۶۸ھ کو کوچ کرکے پہلا ڈیرہ بہادر پورہ میں کیا اور وہاں سے چوبیسویں کو سامی گھاٹ پہنچ کر وہاں بھی دو روزہ مقام کیا تو اُس کو خبر

ملی کہ مراد بخش جس نے اب تک آگرہ سے کوچ نہیں کیا تھا اس مہم میں شامل ہونا نہیں چاہتا۔ پس اورنگ زیب کو نہایت اندیشہ ہوا اور اس نے اس امر کو اپنے مدعا کی خرابی کا باعث سمجھکر معتمدوں کی زبانی مراد بخش سے ترک رفاقت کا سبب دریافت کیا اور جب اُس نے اس کے جواب میں اپنی ناداری اور اس وجہ سے فوج کی پریشان حالی کا اظہار کیا تو ایک لاکھ روپیہ بھیجدیا اور یہ کہلا بھیجا کہ (عمل صالح صفحہ ۲۸۷)

> بالفعل اُس کو اپنی اور اپنی فوج کی ضروریات میں خرچ کیجئے۔ اور جیسا کہ آپ کے ساتھ قرار پاچکا ہے کہ تیسرا حصہ خزانہ اور لوٹ کا مال آپ کو دیا جائے گا وہ بھی جلد پہنچ جائے گا۔ اور خدا نے چاہا تو بعد اتمام مہم داراشکوہ کے ملک پنجاب اور کابل اور کشمیر اور ملتان بے شک آپ کو ملے گا۔ پس اس معاملہ کی طرف سے مطمئن رہیئے اور جلد تشریف لایئے تاکہ بالاتفاق اس مہم عظیم کو جو درپیش ہے حسب دلخواہ انجام کو پہنچایا جائے۔ اور جب تک داراشکوہ کا معاملہ درمیان ہے اس تکرار کا موقعہ نہیں ہے۔

خلاصہ یہ کہ مراد بخش دم میں آکر آگرہ سے سوار ہوا لیکن اگر اب بھی اورنگ زیب کے لشکر سے ایک کوس پیچھے ڈیرہ کیا اور اسی طرح آگے پیچھے اُترتے ہوئے جب متھرا پہنچے تو اس سے بھی کچھ زیادہ فاصلہ پر قیام کیا۔

پس اُس کے ان اوضاع و اطوار کو دیکھکر یہ صلاح ٹھہری کہ مراد بخش کو قید کرلینا چاہیئے۔ چنانچہ پہلے تو طرح طرح کے لالچ اور وعدے دے کر اُس کے معتمدوں اور بڑے بڑے امیروں کو گانٹھ لیا اور پھر مشورہ اور صلاح کے بہانہ سے مراد بخش کو اپنے ہاں بلانا چاہا مگر وہ اپنے بعض خیراندیش اور ہواخواہوں کے منع کرنے سے کچھ بہانہ بناکر اُس روز نہ آیا۔ چونکہ اورنگ زیب اُس کا کھٹکا مٹانے میں زیادہ تاخیر کو مناسب نہیں سمجھتا تھا اس لئے متھرا میں رکا جہاں حسن اتفاق سے عیدالفطر کا بنا بنایا عمدہ حیلہ بھی موجود تھا، مقام کیا اور اس کے پھسلانے کی غرض سے کبھی تو نہایت ہی شوق ملاقات ظاہر کیا جاتا تھا اور کبھی معاملات ملکی میں صلاح مشورہ کا حیلہ پیش کیا جاتا تھا۔ غرض کہ جب مراد بخش اپنی صاف دلی سے جانے کو تیار ہوا تو اُس کے ہواخواہوں اور خیراندیشوں نے جو اس فریب کی بھنک پاچکے تھے پھر روکا اور کہا کہ ہم کو اورنگ زیب کی طرف سے نہایت کھٹکا ہے ایسا نہ ہو کہ دغا کرے اور پھر پچھتانا کچھ کام نہ آئے۔ مگر بدقسمتی سے مراد بخش نے اُن کی بات پر یقین نہ کیا بلکہ یہ جواب دیا کہ

"این محض واہمہ است کہ بر طبیعت فما غالب گشتہ و با وجود عہد و پیمانِ موکدہ خلاف ایمان ازاں حضرت راورنگ زیب) این واہمہ را بخاطر راہ دادن از طریقہ مسلمانی نباشد۔"

مختصر یہ کہ وہ دن بھی یوں ہی گذر گیا۔ اور اورنگ زیب نے اس معاملہ کو ادھورا چھوڑ کر آگے کو کوچ کرنا کسی طرح سے مناسب نہ جانا۔ اور ہر روز کئی کئی دفعہ یہ کہکر بھیجتا رہا کہ چونکہ بڑے بڑے معاملات درپیش ہیں اور بغیر آپ کی صلاح و مشورہ کے آگے کو کوچ نہیں کیا جا سکتا۔ اور آپ کے تشریف لانے کا انتظار حد سے زیادہ گذر گیا ہے پس اگر تشریف لائیں تو ملاقات کی خوشی کے علاوہ پیش نظر مہم پر مشورہ بھی ہو جائے مراد بخش سادہ لوحی سے اس کے ان فقروں کو سچ مان کر ملاقات کرنے پر رضامند تو ہو ہی گیا تھا اس پر یہ واقعہ پیش آیا کہ علی الصبح وہ سیر و شکار کے ارادہ سے جب باہر گیا تو واپس آتے ہوئے نورالدین نامی اُسی کا ایک ملازم خاص جو اورنگ زیب سے ملا ہوا تھا۔ سامنے سے گھوڑا دوڑائے آیا۔ اور عرض کیا کہ

"اورنگ زیب کے پیٹ میں یکایک سخت درد پیدا ہو گیا ہے اور وہ بستر پر پڑا لوٹ رہا ہے۔ اور محبت کے سبب سے بار بار آپ کو یاد کرتا ہے۔ پس ایسی حالت میں بہت جلد اُس کے پاس تشریف لے جانا ہی مناسب ہے"!

مراد بخش جو بیچارہ ایک سیدھا سادا اور مکر و فریب سے محض ناآشنا تھا اُس کے قول کو سچ سمجھ کر وہیں سے اورنگ زیب کے لشکر کی طرف چل پڑا۔ اور صرف چند خدمت گاروں اور خاص خاص لوگوں کے ساتھ گھوڑا دوڑائے بپائے خود بگور آمد کا مصداق بن گیا۔ اور اورنگ زیب کے چالاک ملازم جو منصوبے سے واقف تھے نہایت اچھی طرح استقبال کر کے اُس کے خیام خاص میں جو کئی ڈیوڑھیوں کے اندر محل سرا کے قریب بیماری کا بہانہ بنائے پڑا تھا لے گئے۔ اور جگہ کی تنگی کے عذر سے اُس کے ملازموں کو باہر ٹھیرا لیا۔ اور اندر پہنچنے پر خود اورنگ زیب نہایت ہی شوق و اشتیاق اور تعظیم و احترام سے پیش آیا۔ اور حد سے زیادہ مسرت اور خوش دلی کا اظہار کیا۔ کیونکہ سموگڈھ کی لڑائی کے بعد اس تمام عرصہ میں مراد بخش کا اُس کے پاس آنا نہیں ہوا تھا۔ غرض کہ بہت سے تکلفات کے بعد اپنی خلوت گاہ خاص میں اور بھی اندر لے گیا۔ اور کہا کہ اب تو حاضری تناول فرمانے کا وقت ہو گیا ہے اول کچھ ماحضر نوش فرما کر ذرا قیلولہ اور استراحت فرمائیے اور قیلولہ سے فارغ ہو کر معاملات سلطنت میں فراغ خاطر سے گفتگو اور مشورہ کیا جائے گا۔ چنانچہ مراد بخش

کچھ کھانا کھاکر پلنگ پر لیٹ گیا اور اورنگ زیب بھی اب یہ دیکھکر کہ سب کام ٹھیک ہوگیا۔ استراحت کے بہانے سے حرم سرا کو چلا گیا۔ اور اورنگ زیب کے خدمت گار مراد بخش کی چپی وغیرہ کرنے لگے۔ اور اورنگ زیب کا جو اس تمام تدبیر سے یہ مدعا تھا کہ مراد بخش اپنے ہتھیار کھول ڈالے وہ پورا ہوگیا۔ یعنی اُس بیوقوف نے نہایت بے تکلفی سے ہتھیار بھی کھول کر رکھدیئے اور اپنے نصیب کی طرح سو گیا۔ جوں ہی مراد بخش کی ذرا آنکھ لگی اور نگ زیب کے اشارے سے خدمت گار تو باہر چلے گئے۔ اور ایک لونڈی اندر سے آکر اُس کی تلوار اور ہتھیار اٹھاکر لے گئی۔ اور شیخ میر اور بعض اور لوگ جو اسی امر کے منتظر تھے فوراً خوابگاہ میں آن گھسے۔ اُن کے پاؤں کی آہٹ اور شیخ میر کی ڈھال کے اتفاقاً کھڑک جانے کی آواز سے جو آنکھ کھلی تو عجیب صحبت دیکھی۔ متحیر ہوکر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور جب ہتھیاروں کا پتہ نہ پایا تو اب سمجھا کہ معاملہ کیا ہے۔ پس ناامیدی سے ٹھنڈی سانس بھر کر بولا کہ

"آخر با ہچو منے در ست اخلاص صاف باطن چنیں کردید۔ دحق عہد و پیمان درست

کہ قرآن مجید ضامن طرفین بود چنیں بجا آوردید"

جس کو حضرت اورنگ زیب نے پردہ کے پیچھے سے فرمایا کہ

"برادر عزیز چونکہ تم سے ان دنوں میں کچھ ایسی باتیں سرزد ہوئیں جن سے فتنہ و فساد اور خلقت اور ملک کی بربادی کا گمان ہوتا تھا اور چند احمق اور شریر لوگوں کے بہکانے سے جو تمہارے گرد و پیش جمع تھے تمہارے دماغ میں کچھ ایسا غرور اور نخوت سما گئی تھی کہ عقلمند اور سمجھدار لوگوں کو ملک کے امن و امان میں خلل پڑنے اور سلطنت کے انتظام میں فتور آجانے کا یقین ہوگیا اس لئے تمہارے مزاج کی اصلاح اور ملک وسلطنت کی مصلحت کے لئے کچھ دنوں تم کو گوشہ عافیت میں بٹھانا اور زمانہ کی کشمکش سے علیحدہ رکھنا لازم ہوا ورنہ خدانخواستہ کوئی ایسا امر کہ جو آپ کی پیاری جان کے اندیشہ کا باعث ہو ہمارے دل میں نہیں ہے اور خدا کا شکر ہے کہ اُس عہد و پیمان میں جو آپ کے ساتھ کیا گیا ہے کسی طرح کا خلل و فتور نہیں آیا۔ اور تمہاری جان عزیز خدا کے حفظ و حمایت میں ہے پس مقتضائے عقل یہی ہے کہ اس کو اپنے لئے موجب بہتری سمجھ کر حزن و ملال کو طبیعت میں جگہ نہ دیجئے۔ ع در طریقت ہر چہ پیش سالک آید خیر اوست"

غرض کہ یہ بیچارہ سیدھا سادا شہزادہ متھرا میں شوال کی چوتھی ۱۰۶۸ھ کو اپنے پُرکار بھائی کے دام تزویر میں پھنس گیا۔ اور اسی وقت دلیر خاں اور شیخ میر کی حفاظت میں ہاتھی پر بٹھاکر شاہجہاں آباد

داراشکوہ کا تعاقب اب بجز شہباز خواجہ سرا کے جس کے ساتھ اورنگ زیب کو کسی قدر دقت اٹھانی پڑی مراد بخش کے ہمراہیوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس نے اورنگ زیب کی ملازمت اور اطاعت قبول نہ کرلی ہو۔ پس اس کی فوج کو بھی اپنی سپاہ میں شامل کرکے داراشکوہ کے تعاقب میں جو نہایت تیزی کے ساتھ لاہور کو بھاگا جارہا تھا روانہ ہوا۔ کیونکہ داراشکوہ کا یہ ارادہ تھا کہ اس شہر کی مورچہ بندی کرکے اپنے رفیقوں اور خیر خواہوں کو وہاں جمع کرلے۔ لیکن اس کا یہ مستعد دشمن ایسی چستی سے پیچھے لگا چلا آتا تھا کہ اُس کے مستحکم کرنے کی مہلت نہ ملی اور اُس نے وہاں سے ملتان کا راستہ لیا۔ مگر اورنگ زیب کے مستعدانہ تعاقب نے وہاں بھی پاؤں جمنے نہ دیئے۔ اورنگ زیب جس چستی اور چالاکی سے اس مہم میں کام کرتا تھا اُس کی کچھ تعریف نہیں ہوسکتی۔ یعنی موسم اگرچہ نہایت گرم تھا لیکن اُس کی فوج رات دن برابر کوچ کرتی تھی اور وہ خود سپاہ کی جرأت اور ہمت بڑھانے کے لئے صرف چند آدمیوں کے ساتھ اکثر چار پانچ کوس فوج سے آگے رہتا تھا اور ایک ادنیٰ سپاہی کی مانند بُرے بھلے پانی اور روکھی سوکھی روٹی پر قناعت کرکے رات کو پلنگ اور امیرانہ فرش فروش کے بغیر صرف زمین پر بستر جما کر لیٹ رہتا تھا۔

داراشکوہ پناہ کی تلاش میں ہندوستان کے دانا لوگوں کی یہ رائے ہے کہ داراشکوہ کے لئے لاہور سے کابل جانا مناسب تھا۔ اُس کے خیر خواہوں

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ کو ایسی جلدی اور سرعت کے ساتھ چلتا کیا کہ اُس کی فوج کو جو قریب بیس ہزار سوار جرار کے تھی اُس روز مطلقاً خبر نہ ہوئی۔ اور صرف اُس وقت معلوم ہوا کہ جب موقع ہاتھ سے جاتا رہا۔ اور یہ قصہ مشہور عام ہوگیا۔ پس بناچاری فوج نے بھی اورنگ زیب کی اطاعت اور نوکری قبول کرلی اور اُس کے بعض ملازم جو ساتھ آتے تھے مثل شہباز خاں خواجہ سرا کے جو پنج ہزاری کا منصب رکھتا تھا اور دو تین اور سردار وہ بھی اُسی وقت گرفتار کرلئے گئے۔ فقط

کرنل ٹوڈ صاحب کی منقولہ بالا تحریر میں اکثر باتیں تو صریحاً غلط ہیں تاہم کھانے کے وقت جلد غافل کرنے کے لئے شراب پلانے اور خواب گاہ میں کسی عورت کے پہنچا دینے کا مضمون خواہ وہ لونڈی ہو یا لونڈی قریب القیاس اور صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ شراب کے بغیر اُس کو جلد غافل بنانا مشکل تھا اور کسی عورت کے بغیر اُس کے مصاحب اور خدمتگار بلا اندیشہ بدگمانی الگ کرکے باہر نہیں بھیجے جاسکتے تھے۔
س م ح

نے بھی ہر چند اُس کو وہاں جانے کے لئے کہا مگر یہ معمہ کسی پر نہ کھلا کہ اُس نے ایسی دانشمندانہ صلاح کیوں نہ مانی۔ کیونکہ مہابت خاں جو امرائے ہندوستان میں ایک بڑا پرانا اور بردست امیر تھا اور جس کی اورنگ زیب کے ساتھ ہمیشہ سے اَن بن چلی آتی تھی وہاں کا صوبہ دار تھا۔ اور افغانوں اور ازبکوں اور ایرانیوں کے مقابلہ کے لئے دس ہزار سے زیادہ فوج موجود تھی۔ اور چونکہ اُس کے پاس روپیہ بھی کافی تھا۔ یہ تمام فوج اور خود مہابت خاں بخوشی مدد دینے کو تیار ہو جاتا اور ان فوائد کے علاوہ سرحد ایران اور ملک ازبک سے بھی نزدیک ہو جاتا۔ اور اغلب تھا کہ وہاں کے فرماں روا بہت کچھ مدد دے سکتے اور اُس کو یاد کرنا چاہیئے تھا کہ ہمایوں نے شیر خاں سے شکست کھانے کے بعد جو پٹھان قوم کا بادشاہ تھا۔ اور جس نے اُسے ہندوستان سے نکال دیا تھا۔ ایرانیوں ہی کی مدد سے پھر اپنی سلطنت حاصل کرلی تھی[۱]۔ لیکن بدنصیب داراشکوہ کی قسمت میں ہمیشہ یہی لکھا ہوا تھا کہ خواہ کیسی ہی نیک صلاح اُس کو دی جاتی وہ اس پر التفات ہی نہ کرتا تھا۔ چنانچہ اب بھی اُس نے ایسا ہی کیا کہ کابل کے عوض سندھ چلا گیا اور قلعہ ٹھٹھہ میں جاکر پناہ لی جو دریائے سندھ کے وسط میں ایک مشہور مستحکم مقام ہے۔

جب اورنگ زیب کو معلوم ہو گیا کہ داراشکوہ کا ارادہ کابل جانے کا نہیں ہے اور اطمینان ہو گیا کہ اب معاملہ چنداں مشکل نہیں تو خود اُس کے تعاقب میں جانا غیر ضروری خیال کیا اور سات آٹھ ہزار سپاہیوں کے ساتھ اپنے کو میر بابا شیخ میر کو داراشکوہ کی نقل و حرکت کی دیکھ بھال کے لئے مامور کر دیا اور اس اندیشہ سے کہ نہ معلوم پیچھے کیا کیا فتور برپا ہو جائیں ویسی ہی جلدی سے جیسی کہ داراشکوہ کے تعاقب میں کی تھی آگرہ کو لوٹ آیا[۲]۔

---

[۱] شیر شاہ سے ہمایوں کا شکستیں کھاکر ہند سے ایران جانا اور شاہ طہماسپ صفوی فرمانروائے ایران کی امداد سے پھر ہند کو آنا۔ اور دوبارہ تسلط ہونا نہایت مشہور واقعہ ہے۔ م م ع

[۲] ان واقعات کو جس طرح عالمگیر نامہ میں لکھا ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے روانہ ہونے سے پہلے خلیل اللہ خاں اور بہادر خاں کو داراشکوہ کے تعاقب میں روانہ کر دیا تھا۔ بعد ازاں متھرا سے دہلی پہنچ کر باغ اعزآباد متصل شہر دلی سے ذیقعدہ کی ساتویں ۱۰۶۸ھ کو مطابق سترھویں امرداد بہادروں کے پنجاب کو خود روانہ ہوا۔ داراشکوہ نے کرنال انبالہ کے معمولی راستہ سے تلون کے گھاٹ جو اس زمانہ میں پہلور کی طرح ستلج کا مشہور گھاٹ تھا عبور کرکے تعاقب کرنے والوں کے

اُس کو یہ خدشہ تھا کہ مبادا جسونت سنگھ یا جے سنگھ سا کوئی زبردست راجہ شاہجہاں کو قید سے چھڑا دے یا سری نگر کے راجہ کی مدد سے سلیمان شکوہ سیلاب کی طرح پہاڑوں سے یکایک اُتر آئے یا موقعہ دیکھکر سلطان شجاع ہی پھر آگرہ کی طرف چڑھائی کر دے۔

اورنگ زیب کا استقلال و حسنِ تدبیر

اب میں ایک مختصر سے واقعہ کا جو اورنگ زیب کو اسی سفر میں پیش آیا تھا ذکر کرتا ہوں جس سے اس کتاب کے پڑھنے والے یہ اندازہ کر سکیں گے کہ وہ کسی ناگہانی مشکل کے پیش آجانے پر کیسی چستی سے اُس کا فی الفور انتظام کر لینے کی صلاحیت رکھتا تھا ملتان سے واپسی کے وقت جب کہ وہ حسبِ معمول سرعت کے ساتھ کوچ کرتا چلا آتا تھا راجہ جے سنگھ کو چار پانچ ہزار جرار راجپوتوں کے ساتھ آتا دیکھکر حیرت میں آگیا۔ یہ اس وقت حسبِ معمول تھوڑے سے آدمیوں کے ساتھ اپنی فوج سے آگے تھا اور راجہ کا شاہجہاں کے ساتھ جو گہرا تعلق تھا وہ اس سے مخفی نہ تھا۔ پس بآسانی خیال میں آسکتا ہے کہ اُس نے خود کو سخت خطرے کی

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ روکنے کے لئے یہ بندوبست کر دیا تھا کہ اُس کا نامی سردار داؤد خاں پنی تلون کے اس پار اور اسی طرح سپہر شکوہ بیاس کے دوسرے کنارے کچھ عرصہ تک ٹھہر کر اور کشتیوں کو جلوا کر اور غرق کرا کر لاہور آکر اُس سے مل جائیں۔ اس لئے جب اورنگ زیب کو کرنال میں خلیل اللہ خاں کی عرضی سے یہ حال معلوم ہوا تو وہاں سے روپڑ کو ہو لیا اور کشتیوں کی قلت کی وجہ سے کئی دن میں لشکر کو ستلج سے پار اُتار کر ماچھی واڑہ۔ راہوں۔ گڈھ شنکر کو ہوتا ہوا گوبند وال کے گھاٹ دریائے بیاس سے بھی پار ہو گیا۔ اور چھبیسویں ذی الحجہ کو قصور جا پہنچا۔ چونکہ دارا شکوہ لاہور سے ملتان کو بھاگ گیا تھا۔ اور وہ سردار جو تعاقب میں مامور تھے کچھ سستی کرنے لگ گئے تھے۔ اس لئے "یلغار" کے طور پہ نہایت تیزی کے ساتھ بلا توقف کوچ کرتا ہوا ملتان کو روانہ ہوا اور ساتویں محرم کو جب کہ دارا شکوہ ملتان سے سندھ کی طرف بھاگ چکا تھا۔ ملتان جا پہنچا اور اس جگہ سے اول صف شکن خاں کو معہ چند اور سرداروں کے اور بعد ازاں اس خیال سے کہ اب بھی دارا شکوہ کے پاس بارہ چودہ ہزار سوار اور ایک اچھا توپ خانہ اور بہت سا مال و دولت موجود تھا۔ شیخ میر کو بھی جو اورنگ زیب کے نہایت محل اعتماد ہونے کے علاوہ بڑا صاحب تدبیر اور شجاع امیر سمجھا جاتا تھا اور جس کو برنیئر میر بابا لکھتا ہے مدد کرکے خود واپس ہو پڑا۔ اور معمولی منزلیں کرتا ہوا چوتھی ربیع الاول ۱۰۶۹ھ کو دلی پہنچ گیا پس جس غیر معمولی چستی اور جفاکشی کی برنیئر نے تعریف کی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُس "یلغار" سے مراد ہے جو اُس نے قصور سے کی تھی۔ ہم ع

حالت میں پایا اور طبعًا اُس کو بھی اندیشہ ہونا چاہیئے تھا کہ جے سنگھ اپنے محترم آقا کو اس قید بے جا کی تکلیف سے جھٹ پٹ چھڑا لینے اور ایسے بے رحم اور ناخلف فرزند کو سزا دینے کے اس عمدہ موقعہ کو جس کے ہاتھ سے اُس پر بلا وجہ ظلم وستم ہوا ہرگز ضائع نہیں کرے گا اور یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ فی الواقع راجہ کا آنا صرف اسی ارادہ سے تھا کہ اورنگ زیب کو گرفتار کرے اور اس رائے کے قرار دیئے جانے کی وجہ یہ تھی کہ اورنگ زیب کو تھوڑی ہی دیر پہلے خبر لگ چکی تھی اور وہ یقین کئے ہوئے تھا کہ راجہ دہلی میں ہے مگر اُس نے ایسی عجیب سرعت سے ایسی بعید مسافت طے کی کہ لاہور اور ملتان کے راستہ میں آ ملا۔ لیکن اورنگ زیب کی ہوشیاری اور متانت نے اُسے اس بڑی جوکھوں سے بچا لیا۔ چنانچہ اُس نے مطلق کچھ خوف واضطراب ظاہر نہ کیا بلکہ یہ دکھانے کو کہ اُس کا آنا اس کی بڑی ہی خوشی کا باعث ہے گھوڑا دوڑا کر نہایت کشادہ پیشانی کے ساتھ ہاتھ سے جلد آیئے، جلد آیئے کا اشارہ کرتا ہوا آگے بڑھا اور پکار کر کہا۔

"سلامت باشید راجہ جی! سلامت باشید بابا جی!" اور جب دونوں ذرا نزدیک پہنچے تو پھر کہا خوش آمدید۔ خوش آمدید۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھے آپ کے آنے کا کس قدر انتظار تھا۔ بہت ہی خوب ہوا کہ آپ آگئے مگر لڑائی ختم ہو گئی اور داراشکوہ تباہ وبرباد خاک چھانتا پھرتا ہے اور میں نے میر بابا کو اُس کے پیچھے بھیج دیا ہے اور اغلب ہے کہ جلد گرفتار ہو جائے گا۔ اور نہایت مہربانی اور التفات کے اظہار کی غرض سے موتیوں کی مالا جو پہنے ہوئے تھا اُتار کر راجہ کے گلے میں ڈال دی اور کہا کہ ہماری فوج بہت تھکی ہوئی ہے اس لئے آپ کو بہت جلد لاہور پہنچ جانا چاہیئے۔ مبادا وہاں کچھ بے انتظامی اور شورش ہو جاتے اور میں آپ کو لاہور کا صوبہ دار مقرر کرتا ہوں اور کل اختیار نظم ونسق دیتا ہوں اور میں بھی جلد آپ کے پاس پہنچتا ہوں لیکن رخصت کرنے سے پہلے میرے لئے ضروری ہے کہ سلیمان شکوہ کے معاملہ میں جو آپ نے کارگذاری دکھائی ہے اُس کا شکریہ ادا کروں۔ مگر آپ نے دلیر خاں کو کہاں چھوڑا؟ میں اس کو خوب سزا دوں گا۔ آپ جلدی لاہور تشریف لے جایئے خدا حافظ[1]

---

[1] خدا جانے مصنف نے یہ کیا بے سروپا قصہ لکھدیا ہے کیونکہ عالمگیر نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سلیمان شکوہ کو

داراشکوہ گجرات میں

جب داراشکوہ ٹھٹھہ میں پہنچا تو اُس نے ایک خواجہ سرا کو جو دانشمندی اور شجاعت دونوں میں مشہور تھا وہاں کا قلعہ دار بنایا اور بہت سے پٹھان اور پرتگیز اور انگریز اور فرانسیس اور ملک جرمنی کے رہنے والے فرنگی توپ خانہ میں نوکر رکھ لئے اور اُن سے وعدہ کیا کہ اگر ہم بادشاہ ہو جائیں گے تو تم کو امارت کے درجے دیئے جائیں گے۔ اور اس طرح پر قلعہ کا بندوبست کر کے اپنا خزانہ وہاں چھوڑ دیا۔ کیونکہ اب تک اُس کے پاس اشرفی اور روپیہ بہت تھا اور تین ہزار سپاہیوں کے ساتھ دریائے سندھ کے کنارے کنارے شان و شوکت سے کوچ کرتا ہوا راجہ کچھ کی عملداری سے گذر کر گجرات میں پہنچ گیا اور احمد آباد کے باہر جا ڈیرہ کیا۔ یہاں کا صوبہ دار شاہ نواز خاں جو اورنگ زیب کا خسر تھا اگرچہ مسقط کے سلاطین سابق کے خاندان سے تھا اور بہت مہذب اور نہایت ذی لیاقت شخص تھا مگر سپاہی منش نہ تھا بلکہ عیش دوست تھا احمد آباد میں شاہی فوج بہ تعداد کثیر موجود تھی اور خوب مقابلہ کر سکتی تھی لیکن اس کی کم ہمتی یا داراشکوہ کے ناگہاں آ پہنچنے سے شہر کے دروازے کھول دیے گئے اور شاہ نواز خاں بڑی تعظیم و تکریم اور نہایت ادب سے پیش آیا اور معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے اُس کی اس قدر خاطرداری اور تعظیم

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ کی رفاقت چھوڑ کر اول دلیر خاں متھرا کے قریب بمقام سلیم پور اور پھر چار پانچ روز بعد راجہ جے سنگھ خاص متھرا میں اورنگ زیب کی خدمت میں حاضر ہو گیا تھا بلکہ ستلج سے عبور کرنے کے بعد یہ دونوں سردار بہادر خاں اور خلیل اللہ خاں کی مدد کے لئے جو اورنگ زیب کی سپاہ خاص کے آگے آگے داراشکوہ کے تعاقب میں لاہور کو جاتے تھے بھیجے گئے تھے۔ س م ح

[1] شاہ نواز خاں جس کا نام میرزا بدیع الزماں تھا ایران کے بادشاہ شاہ سلیمان صفوی کی اولاد سے تھا اور اُس کا باپ مرزا رستم جو بہت خوش سلیقہ اور شاعر شہزادہ قندھار سے آ کر شاہجہاں کا ملازم ہو گیا تھا۔ اور شرافت اور علو خاندان کی وجہ سے شاہجہاں نے اپنے بیٹے سلطان شجاع کی شادی اس کی بیٹی اور اورنگ زیب اور مراد بخش کی شادی اُس کی دو پوتیوں یعنی شاہ نواز خاں کی بیٹیوں سے کر دی۔ چنانچہ اورنگ زیب کا تیسرا بیٹا محمد اعظم اور مشہور و معروف بیٹی زیب النسا بیگم اسی بیگم سے تھی جس کا نام دل رس بانو بیگم تھا پس مصنف کی یہ غلطی ہے کہ اس کو سلاطین مسقط کے خاندان میں سے بتایا ہے۔ کیونکہ خاندان صفوی کا مسقط سے کچھ تعلق نہ تھا بلکہ اُس کا نشو و نما اردبیل سے ہوا جو ملک ایران کا ایک مشہور شہر ہے اور اپنے بزرگ شاہ صفی کے نام کی مناسبت سے جو قوم کا سید اور صوفی مشرب

وکریم کی کہ اُس نے اُس کو اپنا خیرخواہ اور طرف دار سمجھ لیا اور اگرچہ لوگوں نے اُس کو اُس کی خیانت سے آگاہ کردیا تھا لیکن شہزادہ نے دھوکہ میں آکر بے احتیاطی سے بھروسہ کرلیا اور اپنے تمام منصوبے اور ارادے اور راز اُس پر ظاہر کردیئے اور جسونت سنگھ اور دوسرے خیرخواہ لوگ جو سپاہ جمع کرکے مدد کی تیاریاں کر رہے تھے اُن کے خط وغیرہ سب اُس کو دکھا دیئے

اورنگ زیب اور سلطان شجاع کا مقابلہ

اورنگ زیب کو جب یہ خبر لگی کہ داراشکوہ نے الہ آباد لے لیا تو وہ نہایت حیران اور مضطرب ہوا کیونکہ جانتا تھا کہ داراشکوہ کے پاس روپیہ پیسہ ابھی بہت ہے اور اگر وہاں اُس کے قدم جم گئے تو نہ صرف اُس کے متوسل اور خیرخواہ بلکہ وہ لوگ بھی جو کسی سبب سے مجھ سے ناراضمند ہیں سب کے سب ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے آکر اُس کے پاس جمع ہوجائیں گے۔ وہ بخوبی جانتا تھا کہ داراشکوہ کو زیر کرنے کے لئے اس کا بذات خود جانا نہایت ضروری ہے لیکن اُس نے سوچا کہ شاہجہاں کو آگرہ میں پیچھے چھوڑ کر اس قدر دور چلے جانا اور اپنے لشکر کو ایسے صوبہ (راجپوتانہ) میں سے لے جانا جہاں جے سنگھ اور جسونت سنگھ جیسے بڑے بڑے راجاؤں کے علاقے ہیں خطرناک اور خلاف مصلحت ہے اس کے علاوہ شجاع کی طرف سے بھی جو ایک بڑی فوج ساتھ لئے ہوئے تیزی سے بڑھا چلا آرہا تھا اُس کو سخت تردد تھا اور سلیمان شکوہ کی طرف سے بھی کھٹکا تھا جو سری نگر کے راجہ کے تعاون اور مدد سے فوج کشی کی تیاریاں کر رہا تھا۔ غرض کہ وہ اس وقت چند در چند مشکلات اور خطرات میں گھرا ہوا تھا۔ لیکن اُس نے سوچ سمجھ کر یہی طے کیا کہ سردست داراشکوہ اور شاہ نواز خاں کے معاملہ کو چھوڑ کر شجاع کی خبر لینی چاہیے جو الہ آباد کی طرف دریائے گنگا کے پار اُتر آیا تھا۔ سلطان شجاع

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ - تھا صفوی مشہور ہوا۔ اور اُس وقت کی فارسی تاریخوں میں اُس کے داراشکوہ سے مل جانے کی اصل وجہ یہ لکھی ہے۔ کہ جب اورنگ زیب دکن سے چڑھائی کرکے برہان پور سے آگرہ کی طرف چلنے کو تھا تو شاہنواز خاں یہ خیال کرکے کہ خدا جانے انجام اس مہم کا کیا ہو اُس کی رفاقت سے بچنا چاہتا تھا اس وجہ سے اورنگ زیب نے ناراض ہوکر قلعہ برہان پور میں اُس کو قید کردیا تھا مگر جب سموگڑھ کی لڑائی میں داراشکوہ پر فتح پائی تو قید سے چھوڑ کر گجرات کا صوبہ دار کردیا۔ مگر وہ اپنی اس بے عزتی کو ہنوز بھولا نہیں تھا۔ اور اس وجہ کے علاوہ یہی لکھا ہے کہ فوج بھی اُس کے پاس کچھ زیادہ نہ تھی کہ جس سے داراشکوہ کا مقابلہ کرسکتا۔ س م ع

نے اپنا کیمپ موضع کھجوہ[1] میں جو ایک بڑے تالاب کے کنارے نہایت عمدہ موقعہ پر تھا قائم کیا اور اس بات کو مناسب سمجھا کہ یہیں ٹھہر کر اورنگ زیب کے حملہ کا انتظار کیا جائے۔ اورنگ زیب نے آکر اپنا لشکر دریا کی شاخ کے ایک کنارے مخالف فوج سے ساڑھے چار میل کے فاصلہ پر قائم کیا۔ چنانچہ دونوں لشکروں کے بیچ میں ایک بہت وسیع میدان تھا جس میں دونوں طرف کی فوجیں لڑائی کے وقت بخوبی دوڑ دھوپ کر سکتی تھیں۔ اور چونکہ اورنگ زیب یہ چاہتا تھا کہ جس قدر جلد ممکن ہو لڑائی کا خاتمہ کیا جائے اس لئے لشکرگاہ میں پہنچتے ہی بار بار دارو دستوں کو دریا کے اسی کنارے چھوڑ کر خود حملہ کے ارادہ سے اس پار جا اترا دوسرے ہی دن لڑائی شروع ہونے سے پہلے صبح کے وقت میر جملہ[2] بھی دولت آباد سے آکر شامل ہو گیا تھا۔ دارا شکوہ کے بھاگ جانے کے بعد اس کے اہل و عیال قید سے رہائی پا چکے تھے اور اورنگ زیب کی مصلحتوں کے لحاظ سے بھی اس کا مزید قید میں رہنا ضروری نہیں رہا تھا لڑائی بڑے جوش و خروش سے شروع ہوئی اور نگ زیب کی فوج نے بے حد شجاعت اور سرگرمی سے حملے کئے لیکن شجاع اپنے مورچوں سے ہرگز آگے نہ بڑھا اور اپنی ہی جگہ قائم رہ کر حملہ آوروں کو بڑے نقصان کے ساتھ پسپا کرتا رہا۔ اس کی اس تدبیر نے اورنگ زیب کو نہایت ہی پریشان کیا۔

شجاع کی اس تدبیر کا اصل مدعا یہ تھا کہ اگر ہم بدستور اپنے مورچوں میں قائم رہ کر لڑتے جائیں گے تو گرمی[3] کے مارے تھوڑی دیر کے بعد اورنگ زیب خود ہی دریا کی طرف ہٹنے

---

[1] فارسی تاریخوں میں اس جگہ کا نام کھجوہ کا تالاب لکھا ہے جو قصبہ کوڑا اور جہاں آباد سے پانچ کوس کے فاصلہ پر ضلع فتحپور قسمت الہ آباد میں ہے۔ یہاں جمنا اور گنگا کا ایک بہت ہی تنگ دو آبہ ہے اور یہ سب مقامات اسی میں ہیں۔ س م ح

[2] دارا شکوہ کی شکست کے چند روز بعد میر جملہ کو اورنگ زیب کے احکام کے بموجب سلطان محمد معظم نے جو باپ کی غیبت میں دکن کا ناظم تھا رہا کر دیا اور تمام مال و متاع واپس دیدیا تھا اور اس وقت وہ خاندیس کی صوبہ داری کے عہدہ پر برہان پور میں تھا اور حسب الطلب وہیں سے آن کر اس لڑائی میں جو دارا شکوہ کی شکست سے آٹھویں مہینے ہوئی تھی شامل ہوا تھا۔ س م ح

[3] پانچویں جنوری ۱۶۵۹ء کو یہ لڑائی ہوئی تھی جو عین جاڑے کا موسم تھا۔ پھر معلوم نہیں ہوتا کہ مصنف نے گرمی کا ذکر کیوں کیا ہے۔ شاید یہ وجہ ہو کہ لڑائی لڑنے والوں کو پانی کی ضرورت ہر موسم میں ہوتی ہے۔ س م ح

پر مجبور ہو گا اور اُس وقت ہم کو اُس کی فوج کے پچھلے حصے پر حملہ کرنے کا موقع ملے گا۔ اورنگ زیب بھی بھائی کی اس حکمت کو خوب سمجھے ہوئے تھا اور اس لئے وہ برابر آگے بڑھے جانے پر زور دے رہا تھا۔ لیکن ایسے نازک وقت میں یہ ناگہانی حادثہ پیش آیا کہ راجہ جسونت سنگھ نے جو بظاہر بڑے خلوص کے ساتھ اُس سے آن ملا تھا اُس کی پچھلی فوج پر یکایک ایسا حملہ کر دیا کہ وہ شکست کھا کر بھاگ گئی اور اُس نے تمام خزانہ اور اسباب کو لوٹنا شروع کر دیا اور چونکہ یہ خبر بہت جلد تمام لشکر میں پھیل گئی اس لئے ایشیائی فوجوں کے دستور کے مطابق اورنگ زیب کی سپاہ بہت ہی ہراساں اور بے دل ہو گئی۔ اس ناگہانی حملہ سے اورنگ زیب کے خطرات اور بڑھ گئے۔ لیکن اُس کی مستقل مزاجی میں ذرا بھی فرق نہ آیا وہ خوب جانتا تھا کہ اگر پیچھے ہٹا تو سب اُمیدیں خاک میں مل جائیں گی اس لئے اُس نے جس طرح کہ داراشکوہ کے مقابلہ میں یہ ٹھان لی تھی کہ خواہ کچھ ہی ہو میدانِ جنگ میں قائم رہ کر نتیجہ کو دیکھنا چاہیے اُسی طرح اب بھی جمے رہنے کا پکا ارادہ کر لیا اور اگرچہ اُس کی فوج میں دم بدم پریشانی بڑھتی جاتی تھی اور شجاع نے اس حالت کو غنیمت سمجھ کر ایک بڑا سخت حملہ کیا اور اتفاقاً ایک تیر لگ کر مہاوت کے مارے جانے سے اورنگ زیب کا ہاتھی ایسا بے قابو ہو گیا کہ وہ گھبرا کر اس پر سے اُترنا چاہتا تھا مگر میر جملہ نے جو قریب تھا اور جس کی جرأت اور بہادریوں کو دیکھ کر سب اہل فوج دنگ ہو رہے تھے پکار کر کہا "دکن کو، دکن کو، دکن کو"! یعنی خیال کرو کہ دکن کہاں ہے اور کیا غضب کرتے ہو کیا اب بھاگ کر دکن جاؤ گے؟ اور اس بہادرانہ نصیحت سے اُس کو تباہ ہوتے سے بچا لیا۔

اگرچہ اورنگ زیب کی تباہی میں اس وقت کوئی دقیقہ باقی نہ رہا تھا اور اُس کی مشکلات کا کوئی حل نظر نہیں آتا تھا۔ اُس کو یہ اندیشہ لگا ہوا تھا کہ اب کوئی دم میں دشمن کے پنجہ میں پھنس جاؤں گا۔ مگر قسمت کا پھیر بھی ایک عجیب چیز ہے کہ اس فکر و تردد کے باوجود فتحیاب ہو گیا اور جس طرح سموگڈھ کی لڑائی میں ایک ادنےٰ حرکت کے باعث داراشکوہ کو اپنی جان بچا کر میدان سے بھاگنا پڑا تھا۔ شجاع کو بھی وہی حادثہ پیش آیا یعنی وہ بھی اورنگ زیب کی بھاگی ہوئی فوج پر زیادہ چستی کے ساتھ حملہ کرنے کے لئے اپنے ہاتھی سے اُتر پڑا اور اگرچہ یہ تحقیق نہیں ہے کہ اس کو بھی یہ صلاح بدنیتی سے دی گئی تھی یا خیرخواہی سے۔ مگر اس میں شک نہیں ہے کہ الہ وردی خاں نے جو اس کا ایک بڑا سردار تھا اس وقت

بڑی ہی التجا سے کہا کہ گھوڑے پر سوار ہو جائیے اور جو لفظ خلیل اللہ خاں نے سموگڑھ کی لڑائی میں کہے تھے اس کے لفظ بھی بعینہ ویسے ہی تھے یعنی دست بستہ ہو کر بڑی منت سے یہ کہا کہ "حضور! اس بڑے ہاتھی پر ایسی جان جوکھوں میں کیوں بیٹھے ہیں کیا ملاحظہ نہیں فرماتے کہ دشمن بھاگے جاتے ہیں اور اب چستی سے اُن کا تعاقب نہ کرنا سخت غلطی ہے پس جلدی گھوڑے پر سوار ہو کر اُن کا پیچھا کیجئے۔ اور پھر دیکھ لیجئے کہ ہندوستان کا تخت آپ کے قدموں کے نیچے ہے اور آپ ہندوستان کے بادشاہ ہیں"۔

چنانچہ اس حرکت سے جو حادثہ دارا شکوہ کو پیش آیا تھا وہی شجاع کو پیش آیا یعنی جوں ہی وہ فوج کی نظر سے غائب ہوا سب کے دل میں شبہ گذر گیا کہ یا تو مارا گیا یا کہیں قریب سے پکڑا گیا اور اُس کی فوج ایسی بے انتظام اور تتر بتر ہو گئی کہ دوبارہ جمع کرنا ممکن نہیں رہا[1]

[1] شاہجہاں کی بیماری کی خبر پا کر جب شجاع نے بنگالہ سے فوج کشی کی تھی اُس وقت الہ وردی خاں بہار کا صوبہ دار تھا۔ جب شجاع پٹنہ پہنچا اُس نے لڑے بھڑے بغیر ہی اُس کی اطاعت کر لی اور اُس وقت سے یہ اُس کے پاس بہ حیثیت وزیر کے تھا اور وہ اس کی اس قدر عزت کرتا تھا کہ ہمیشہ اُس کو "خان بھائی" کہتا تھا عالمگیر نامہ میں لکھا ہے کہ سنجر نامی اس کا بڑا بیٹا کھجوہ کی شکست کے بعد شجاع سے جدا ہو کر اورنگ زیب کے پاس حاضر ہو گیا تھا۔ اور جب ان واقعات کے بعد شجاع نے میر جملہ اور محمد سلطان کے قریب پہنچ جانے کی وجہ سے مونگیر سے پیچھے راج محل کی طرف کوچ کر دیا تو الہ وردی خاں فوج مخالف میں آملنے کی نیت سے مونگیر میں ٹھیر گیا۔ اور بعض اور دو دو لوگ بھی اُس کے ساتھ ہو گئے۔ چونکہ ایسے بڑے سردار کے علیحدہ ہو جانے سے نہایت اندیشہ تھا۔ اس لئے شجاع واپس آکر مونگیر کے باہر اپنے باغ میں آکر ٹھہرا اور چند چند سرداروں اور کچھ سپاہ الہ وردی خاں کو حاضر کرنے کے لئے جو مقابلہ پر آمادہ ہو بیٹھا تھا مامور کئے جو دما دھمکا کر اُس کو پکڑ لائے اور شجاع نے اُس کو اور اس کے بیٹے سیف اللہ کو تہ تیغ کرا دیا۔

پس ان حالات پر خیال کرنے سے تعجب نہیں معلوم ہوتا کہ اس نے بھی ہاتھی سے اُتر پڑنے کی صلاح خیانت ہی سے دی ہو۔

آگرہ میں اورنگ زیب کی شکست کی افواہ

جسونت سنگھ نے جب دیکھا کہ معاملہ برعکس ہوگیا تو لوٹ کا مال سمیٹ کر فی الفور اس ارادہ سے آگرہ کو چل دیا کہ وہاں سے اپنے وطن کو چلا جائے اور چونکہ آگرہ میں یہ افواہ اُڑ گئی تھی کہ اورنگ زیب شکست کھا کر قید ہوگیا ہے اور شجاع بھاری فوج لئے ہوئے آگرہ کو آرہا ہے۔ یہ افواہ یہاں تک پھیل گئی تھی کہ شائستہ خاں نے بھی اس کو سچ جان لیا چنانچہ یہ سن کر کہ جسونت سنگھ جس کی دغا بازیوں سے وہ خوب واقف تھا شہر کے قریب پہنچ گیا ہے ایسا مایوس ہوا کہ زہر کا پیالہ پی کر مرجانے پر آمادہ ہوگیا اور بے شک پی ہی لیتا اگر اُس کی مستورات اُس پر نہ آگرتیں اور پیالہ چھین کر نہ پھینک دیتیں۔ لڑائی کے اصل حال سے آگرہ والے دو دن تک اس قدر بے خبر تھے کہ اگر جسونت سنگھ ذرا جرأت کرکے لوگوں کو دھمکاتا وعدوں اور ترغیبوں سے کام لیتا تو بے شبہ شاہجہاں کو قید سے چھڑا لیتا لیکن حقیقت حال اُس پر روشن تھی اس لئے آگرہ میں زیادہ ٹھہرنا یا ان بکھیڑوں میں پڑنا اُس نے مناسب نہ جانا اور صرف شہر میں سے ہوتا ہوا اپنے ملک کو چلا گیا[1]

---

[1] جب اورنگ زیب نے دارا شکوہ کو مغلوب کرکے شاہجہاں کو قابو میں کر لیا تو سب سے پہلے اس نے یہ کام کیا کہ شجاع کے ساتھ اپنا قدیمی حسن سلوک جتانے کے لئے بادشاہ سے بڑے اصرار کے ساتھ اس مضمون کا فرمان حاصل کیا کہ صوبہ بنگالہ کے علاوہ صوبہ بہار بھی جس کا سلطان شجاع نہایت خواہشمند تھا اور سلیمان شکوہ سے شکست کھانے کے بعد دارا شکوہ نے بادشاہ سے اپنے نام کرا لیا تھا شجاع کو دیا جائے اور اُس کو اپنے ایک نہایت پُر تپاک اور محبت آمیز خط میں ملفوف کرکے اُس کے پاس بھیجا جس میں دارا شکوہ کی شکست اور تباہی اور اپنے قدیمی اتحاد کی یاددہانی کے علاوہ یہ چلتا ہوا فقرہ بھی درج تھا کہ فی الحال آپ اس طرح پر اپنے اُس نقصان کا تدارک کیجئے جو سلیمان شکوہ کے مقابلہ میں اٹھا چکے ہیں۔ اور جب دارا شکوہ کے معاملہ سے فارغ ہوکر میں پنجاب سے واپس آؤں گا تو ملک اور مال دولت میں آپ کے حقوق کا پورا پورا لحاظ کیا جائے گا۔ اس خط کو پاکر وہ بہت ہی شکرگزار ہوا۔ مگر پٹنہ میں آکر جب اُس نے دیکھا کہ اورنگ زیب دارا شکوہ کے پیچھے پنجاب کی طرف بہت دور نکل گیا ہے تو آگرہ پہنچنے اور سلطنت ہتیا لینے کے قصد سے بنارس اور الہ آباد کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ چونکہ دارا شکوہ نے پنجاب بھاگنے سے پہلے بذریعہ خط و کتابت شجاع سے صلح کر لی تھی۔ اور اورنگ زیب کی چال بگاڑنے کے لئے پٹنہ سے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ ۔ الٰہ آباد تک اپنے تمام قلعداروں کے نام اُس کی اطاعت کرنے کے احکام بھیج دیتے تھے ۔ اس سبب سے وہ بلا مزاحمت الٰہ آباد پر قابض ہو گیا ۔ ادھر اورنگ زیب کا یہ حال تھا کہ وہ دو طرفہ لڑائی سے بچنے کے لئے یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح شجاع لڑے بھڑے بغیر ہی واپس چلا جائے اور آگے نہ بڑھے ۔ اس لئے پنجاب سے جلد دلی پہنچ کر اول شاہزادہ محمد سلطان کو آگرہ سے جواب تک وہیں مامور تھا اُس کی راہ روکنے کے لئے روانہ کیا ۔ اور بعد ازاں موقعہ سے قریب رہنے کی خاطر شکار کھیلنے کا حیلہ کر کے خود بھی "سواروں" میں جو الٰہ آباد کے رخ گنگا کے کنارے ایک جگہ ہے جا پہنچا ۔ اور اس عرصہ میں شجاع کے پاس کئی بار نصائح آمیز خط اور پیغام بھیجے ۔ مگر جب اُس نے نہ مانا اور الٰہ آباد سے بھی کھجوہ تک بڑھ آیا تو سترھویں ربیع الاول ۱۰۶۹ھ مطابق تیسری جنوری ۱۶۵۹ء کو محمد سلطان کے لشکر سے کوڑہ میں جا ملا ۔ جو شجاع کے لشکر سے قریب چار کوس کے تھا ۔ اور انیسویں ربیع الاول کو خیمہ گاہ اور کارخانہ جات شاہی کو اسی جگہ چھوڑ کر نو نے ہزار سواروں کے ساتھ لڑنے کے لئے روانہ ہوا ۔ اگرچہ طرفین سے لڑائی ہوتی رہی لیکن دور دور سے صرف توپوں کی لڑائی ہو رہی تھی ۔ جب شام کو لڑائی بند ہوئی تو شجاع نے یہ غلطی کی کہ اُس کا توپ خانہ جو اپنی جگہ پر تھا ۔ اور اس وجہ سے اچھا کام دے رہا تھا اپنے لشکرگاہ کے قریب بلا لیا اور میر جملہ نے موقعہ پا کر اُس کی جگہ اپنی توپیں جا جمائیں ۔ اور چونکہ شجاع کی سپاہ اور توپ خانہ کے پیچھے ہٹ جانے سے اس طرف والوں کو شب خون کا اندیشہ ہو گیا تھا ۔ اس لئے اورنگ زیب پیچھے ہٹ کر اپنے لشکرگاہ کو نہ گیا بلکہ اُس کی کل فوج اور تمام امیر جس ترتیب سے میدان جنگ میں قائم تھے وہیں اُتر پڑے ۔ اور حکم دیا گیا کہ گھوڑوں کے زین اور سپاہیوں کی کمریں اُسی طرح بندھی رہیں ۔ علاوہ بریں ہوشیار اور خبردار رہنے کے لئے میر جملہ امرا اور سرداروں کو بہت تاکیدیں کرتا پھرا ۔ اور بعد نماز عشا جب اورنگ زیب اپنے مختصر سے خیمہ گاہ میں جو میدان جنگ ہی میں لگا دیا گیا تھا جا کر سو رہا ۔ تو آخر شب کو ایک عجیب ہنگامہ برپا ہوا جس سے اُس کے لشکر کو بڑا نقصان پہنچا ۔ یعنی مہاراجہ جسونت سنگھ جس کی تقصیر معاف کر کے اورنگ زیب دہلی سے اپنے ہمراہ لے آیا تھا ۔ اور اس وقت وہ اُس کے لشکر کے دائیں بازو کا سردار تھا شجاع کو یہ خبر بھیج کر کہ ادھر میں فساد اور شور و شر برپا کرتا ہوں ادھر سے آپ آئیں اور اس طرح اورنگ زیب کو تباہ کر ڈالیں ۔ بڑے بڑے راجپوت امیروں کو جو اُس کی کمان میں تھے ہمراہ لے کر میدان جنگ سے پیچھے کی طرف سے نکل بھاگا اور اول محمد سلطان کے کیمپ کو جو سر راہ تھا ۔ اور بعد ازاں اور امیروں اور خود اورنگ زیب کے

محمد سلطان اور میر جملہ شجاع کے تعاقب میں

اورنگ زیب کو جسونت سنگھ کے کرتوتوں کا بڑا کھٹکا تھا اور خیال تھا کہ آگرہ سے شورش کی کوئی نہ کوئی خبر آئے گی اس لئے شجاع کا زیادہ پیچھا نہیں کیا اور تمام لشکر لے کر تیزی سے دارالسلطنت کی طرف کوچ کر دیا۔ مگر اُس کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ غنیم کے لشکر کا اس لڑائی میں کچھ زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ بلکہ شجاع کی دولت مندی اور فیاضی کی شہرت کے باعث وہ

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ لشکرگاہ اور کارخانہ جات شاہی کو بے دھڑک لوٹتا ہوا چلا گیا۔ اس حادثہ سے ایک عجیب پریشانی اور ابتری پھیل گئی۔ اور بہت سے لوگ رات ہی کو شجاع سے جا ملے مگر ابھی کچھ رات باقی تھی کہ اورنگ زیب اس حال کی خبر پا کر تخت رواں پر سوار ہو کر کمال استقلال سے اپنے خیمہ کے باہر آن کھڑا ہوا۔ اور ہنس ہنس کر اپنے رفیقوں اور امیروں کو اس طرح تسلی دیتا رہا۔ کہ خوب ہوا کہ ہمارا لشکر منافقوں کے خس و خاشاک سے پاک ہو گیا۔ اگرچہ اس ناگہانی فساد کے سبب سے نصف فوج رہ گئی تھی۔ مگر بڑے استقلال سے باقی ماندہ سپاہ کو از سرِ نو جا بجا جنگی ترتیب سے پھر مامور کیا۔ اور اس غرض سے کہ فوج اس کو اور یہ فوج کو دیکھتا رہے اپنے معمول کے موافق صبح کو ایک بڑے ہاتھی پر سوار ہو کر اور شہزادہ محمد اعظم کو ساتھ بٹھا کر لڑائی کے لئے نکلا۔ چنانچہ اول توپوں اور بانوں کی لڑائی شروع ہوئی۔ پھر دونوں لشکر دست بدست ٹکرانے لگے۔ شجاع کے لشکر نے اس کی فوج کے دائیں بازو کو شکست دے کر ہٹا دیا۔ جس سے بڑی پریشانی ہوئی۔ اور بہت سے سپاہی دشمنوں سے جا ملے اور بعد ازاں انھوں نے فوج کے قلب کو جہاں اورنگ زیب خود موجود تھا خوب دبایا اور کئی دفعہ اس کی جان پر بن گئی۔ چنانچہ ایک جنگی ہاتھی تو اُس کے اس قدر قریب پہنچ گیا کہ کوئی کسر باقی نہیں رہی تھی۔ اگر اورنگ زیب کا ایک بندوقچی جو ساتھ کے ہاتھیوں کے ایک ہودے میں بیٹھا ہوا تھا اُس کے فیلبان کو گولی سے نہ اڑا دیتا تو خدا جانے اورنگ زیب پر کیا گذرتی غرض اورنگ زیب اپنے استقلال سے ہر خطرناک موقعہ پر غالب آیا اور دشمنوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اور ایک سو چودہ توپیں اور بہت سے ہاتھی ہاتھ آئے۔ اور تالاب کھجوہ پر جہاں شجاع کا لشکر مقیم تھا جا کر ڈیرہ کیا۔ اور اُسی روز محمد سلطان کو شجاع کے تعاقب میں روانہ کیا۔ اور میر جملہ کو ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار کا منصب دے کر اُس کی مدد کو بھیجا۔ اور خود آگرہ ہوتا ہوا اجمیر کو چلا گیا۔ کیونکہ داراشکوہ گجرات سے اور مہاراجہ جسونت سنگھ اپنے وطن جودھپور سے بالاتفاق اجمیر پر چڑھ کر آنے والے تھے۔ (ماخوذ از عالمگیر نامہ وغیرہ)

س م ح

سب راجے جن کی ریاستیں گنگا کے دونوں کناروں پر ہیں اُس کی مدد کے لئے اپنی فوجیں بھیج رہے ہیں اور اُس کی طاقت بڑھتی جاتی ہے۔ اور یہ بھی اطلاع پہنچی ہے کہ وہ الہ آباد میں اپنے پاؤں جمانا چاہتا ہے تاکہ گنگا کے اس مشہور گھاٹ کو جو حقیقت میں صوبہ بنگالہ کا دروازہ ہے ہاتھ سے نہ جانے دے پس اُس نے سوچا کہ صرف دو شخص اس قابل ہیں جو ان مشکلات میں مجھے مدد دے سکتے ہیں ایک محمد سلطان دوسرا میر جملہ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ فکر بھی تھی کہ جو شخص بھی کوئی نمایاں خدمت بجالاتا ہے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ خواہ اُس کو کیسا ہی صلہ کیوں نہ دیا جائے وہ اُسے اپنی خدمت کے مقابلہ میں بے حقیقت ہی سمجھتا ہے۔ چنانچہ وہ دیکھتا تھا کہ محمد سلطان کو میری اطاعت ابھی سے ناگوار ہے۔ اور قلعہ آگرہ پر قابض ہو جانے اور شاہجہاں کو قید کر لینے کی وجہ سے بڑی دون کی لیتا ہے۔ اب رہا میر جملہ۔ اگرچہ وہ اُس کی کمال دانائی سخیدگی اور دلاوری کا قائل تھا لیکن اُس کے انھیں اوصاف سے ڈرتا بھی تھا۔ کیونکہ ایک تو اُس کی دولتمندی کا بڑا شہرہ تھا اُس کے علاوہ تمام ہندوستان میں ایک ایسا دانا اور دوراندیش اور کامل وزیر سمجھا جاتا تھا کہ مشکل سے مشکل معاملات کو اپنے حسن تدبیر سے بخوبی سرانجام دے سکتا ہے ان وجوہ سے اورنگ زیب اس کی حیرت انگیز شخصیت کو بھی اُس کی حوصلہ آزمائی اور جاہ طلبی کی وجہ سے محمد سلطان سے کچھ کم خطرناک نہیں سمجھتا تھا۔ یہ مشکلیں ایسی تھیں جو ایک معمولی عقل کے آدمی کو متردد و وقتوں میں پھنسا دیتیں۔ لیکن اورنگ زیب نے ایسی حکمت اور ہوشیاری سے کام لیا کہ دو نوں کو دارالسلطنت سے جاتا بھی کر دیا اور دونوں میں سے کوئی شاکی بھی نہ ہونے پایا۔ یعنی ایک بڑی فوج سپرد کرکے ان کو شجاع کے مقابلہ پر روانہ کر دیا اور رخصت کے وقت میر جملہ کو تو یہ سمجھا کر راضی کر دیا کہ فتح کے بعد بنگالہ کے زرخیز صوبہ کی حکومت مدت العمر کے لئے آپ ہی کے واسطے ہے بلکہ آپ کے بعد آپ کا بیٹا بھی اُس صوبہ داری کا مستحق سمجھا جائے گا۔ اور اگرچہ آپ کی خدمات بہت سی عنایتوں کے قابل ہیں مگر اُن میں سے فی الحال یہ ایک ہے۔ اور جب آپ شجاع پر فتح پالیں گے تو امیرالامرا کا خطاب جو ہندوستان میں سب سے بڑا خطاب ہے آپ کو عطا کیا جائے گا اور محمد سلطان سے یہ کہا کہ بیٹا

ؔ فارسی تاریخوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ شجاع کی بربادی کے بعد میر جملہ کے لئے خانخاناں سپہدار بنگالہ خطاب لکھا جاتا تھا اور امیرالامرا کا خطاب شائستہ خاں کو دیا گیا تھا۔ س م ح

خیال کرو کہ میری اولاد میں تم سب سے بڑے ہو اور اپنے ہی کام پہ جاتے ہو اور بے شک تم نے بڑے بڑے کام کیے ہیں۔ مگر سچ پوچھو تو ابھی کچھ بھی نہیں کیا کیونکہ تاوقتیکہ شجاع کو جو ہمارے مخالفوں میں ایک بہت بڑا شخص ہے شکست دے کر پکڑ نہ لاؤ سارے ہی کام ادھورے ہیں۔ اس نہمائش کے بعد اورنگ زیب نے دونوں کو حسب معمول بڑے "تیمستیج" "سراپا" یعنی خلعت دیئے۔ اور چند گھوڑے اور ہاتھی عمدہ سازو سامان سمیت عنایت کیے۔ اور جس طرح سے ہو سکا محمد سلطان کی بیگم اور میر جملہ کے بیٹے محمد امین کو ان کے ساتھ نہ جانے دیا یعنی محمد سلطان کی بیگم کو تو جو شاہ گولکنڈا کی بیٹی تھی اس حیلہ سے ٹھہرا لیا کہ ایسی عالی خاندان شہزادی کا لڑائی کے وقت لشکر کے ساتھ جانا کسی طرح زیبا اور مناسب نہیں۔ اور محمد امین خاں کو اس بہانہ سے روک لیا کہ ابھی یہ بہت کم سن ہے اور ازراہ شفقت ہم چاہتے ہیں کہ خاص اپنے زیر نظر رکھکر اس کو تعلیم و تربیت دیں۔ لیکن دراصل ان دونوں کو یرغمال بنا رکھا تھا تاکہ شہزادے اور میر جملہ سے کسی بے وفائی کا اندیشہ نہ رہے

شجاع کی بنگالہ واپسی

اب شجاع کا حال سنیئے کہ چونکہ اس کو برابر یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ مبادا زیریں بنگالہ کے وہ راجہ جو میری چھینا جھپٹیوں اور زیادتیوں سے دل میں ناراض ہیں کسی کے بہکانے سے پیچھے فساد کر بیٹھیں اس وجہ سے جب اورنگ زیب کی ان کارروائیوں سے مطلع ہوا تو فوراً الہ آباد سے "ڈیرہ ڈانڈا" اٹھا بنارس اور پٹنہ کی طرف کوچ کر گیا۔ کیونکہ اسے یہ اندیشہ تھا کہ غالباً میر جملہ بجائے الہ آباد کے کسی اور گھاٹ سے گنگا عبور کرکے بنگالہ کی واپسی راستہ کو روکنا چاہے گا۔ چنانچہ انھیں اندیشوں سے بنارس اور پٹنہ سے بھی پیچھے مونگیر کو چلا گیا جو گنگا کے کنارے ایک چھوٹا سا شہر ہے اور ایک طرف پہاڑ اور دوسری جانب جنگل اور دریا ہونے کی وجہ سے ایک محفوظ مقام اور بنگالہ کا دروازہ سمجھا جاتا ہے۔ یہاں پہنچ کر اس نے مورچہ بندی کر لی اور شہر اور دریا کے کنارے سے لے کر پہاڑ تک ایک بڑی گہری خندق[1] کھدوالی۔ چنانچہ اس واقعہ کے کئی سال

[1] عالمگیر نامہ میں لکھا ہے کہ مونگیر کے ایک طرف جو قدرتی پہاڑ اور دوسری جانب دریائے گنگا ہے اِنغانوں نے اپنی حکومت کے زمانہ میں پہاڑ سے لیکر دریا تک سوا کوس لمبی دیوار کھنچوا کر اُس کے مقابل کی سمت میں خندق کھدوا دی تھی۔ شجاع نے ان باہمی فساد کے دنوں میں اس دیوار کی مرمت کرا کر ہر تیس گز پر ایک ایک برج بنوایا تھا اور خندق کو پانی تک گہرا کرا دیا تھا۔ س م ح

بعد اس خندق کو میں نے بھی دیکھا تھا۔ غرض اس مستحکم مقام میں گنگا کے گھاٹ کو روکے ہوئے وہ فوج مخالف کے حملہ کا منتظر تھا۔ کہ یکایک اُسے یہ افسوسناک خبر ملی کہ وہ لشکر جو بتدریج دریا کے کنارے کنارے بڑھا آتا تھا صرف دھوکا دینے کی غرض سے تھا اور میرجملہ اُس میں نہیں ہے۔ بلکہ وہ اُن راجاؤں کو جن کی ریاستیں دریا کے داہنے کنارے کوہستان میں ہیں اپنا معاون بنا چکا ہے اور پہاڑوں کو عبور کرتا ہوا محمد سلطان اور اپنی چیدہ و منتخب سپاہ کو لئے ہوئے راج محل[1] کی طرف اس غرض سے جا رہا ہے کہ ہمارے پیچھے ہٹنے کا راستہ روک کر ہم کو بنگالہ کے اندر جانے نہ دے۔ چنانچہ یہ خندق اور مورچے جو اتنے اہتمام سے تیار ہوئے تھے یوں ہی چھوڑ دینے پڑے۔ مونگیر اور راج محل کے درمیان گنگا اس طرح حائل ہے کہ کئی چکر اور پھیر کھا کر گذرتی ہے اس سبب سے اُسے بڑی تکلیفیں اُٹھانی پڑیں مگر پھر بھی میرجملہ سے کئی روز پہلے راج محل میں جا پہنچا بلکہ کچھ مورچے باندھ لینے کی بھی فرصت مل گئی۔ کیونکہ میرجملہ اور محمد سلطان یہ دیکھکر کہ اس کو اب راج محل پہنچنے سے روکنا ناممکن ہے اپنے ہاتھیوں کو بعض نہایت دشوار گذار راستوں سے گذرتے ہوئے اس غرض سے گنگا کے رخ ہوگئے کہ اپنے بھاری توپخانہ اور بقیہ فوج اور باربردار دستوں کو جو دریا کے راستہ سے آرہے تھے اپنے ساتھ شامل کرلیں اور جب ان کا یہ مدعا حاصل ہوگیا تو راج محل پہنچ کر لڑائی شروع کردی پانچ روز تک شجاع خوب جم کر لڑا مگر جب دیکھا کہ میرجملہ کے توپخانہ کی متواتر ضرب سے مورچوں کو (جو درختوں کی شاخوں اور لکڑیوں سے بُرج کی صورت میں مٹی اور ریت بھرکر بنائے گئے تھے) برباد کئے جاتی ہے۔ اور اس خیال سے بھی کہ برسات کا موسم قریب آگیا ہے اُس وقت اُن کو اور بھی زیادہ نقصان پہنچے گا راتوں رات وہاں سے نکل گیا مگر دو توپیں جو بہت بھاری تھیں وہیں چھوڑ گیا۔ اور میرجملہ اس خوف سے اُس کا پیچھا نہ کرسکا کہ شب خون کے ارادے سے کہیں وہ ہماری گھات میں لگا ہوا نہ ہو اور شجاع کی خوش نصیبی سے صبح ہونے سے پہلے اس زور کا مینہ برسا کہ اُس کے تعاقب کے لئے راج محل سے کوچ کا خیال تک کرنا ناممکن

[1] جلال الدین محمد اکبر کے زمانہ سے پہلے وہاں اکثر آگ لگتے رہنے کے سبب سے عوام الناس اس جگہ کو آگ محل کہنے لگے تھے جب راجہ مان سنگھ بنگالہ کا صوبہ دار ہوا اُس نے اپنے رہنے کے لئے وہاں اینٹ مٹی سے ایک مستحکم حصار تیار کرا کر اس کا نام راج محل رکھدیا بعد ازاں اس جگہ کا نام اُو شاہی دفتروں میں اکبر نگر لکھا جاتا رہا اور اب بدستور راج محل مشہور ہے۔ م ح

ہوگیا۔ یہ بارش نہایت ہی شدید اور برسات کا آغاز تھی۔ جو بنگالہ میں جولائی سے اکتوبر تک بہت ہی کثرت سے ہوا کرتی ہے۔ اور راستے ایسے خراب ہو جاتے ہیں کہ کسی حملہ آور فوج کے سفر کے قابل نہیں رہتے۔ پس میر جملہ کے لئے ناگزیر ہوگیا کہ وہ برسات کے ختم ہونے تک راج محل میں ٹھہر کر اپنی فوج کو شجاع کی سپاہ کے مکانوں میں آرام لینے دے۔

شجاع کی از سر نو تیاریاں

برسات کی وجہ سے شجاع کو بڑی مہلت مل گئی کہ جس جگہ مناسب سمجھا وہاں ٹھہر کر اپنے حسب حال تدبیریں کرتا رہا۔ اور بہت سی نئی فوج نوکر رکھ لی۔ جس میں بہت سے پرتگیز بھی تھے۔ جو معہ چند توپوں کے بنگالہ کے اُن ضلعوں سے آگئے تھے۔ جو نیچے کی طرف ہیں۔ واضح رہے کہ ملک کی انتہائی زرخیزی کے باعث اکثر اہل فرنگ اس نواح میں بسے ہوتے ہیں۔ اس آڑے وقت میں فی الحقیقت یہ شجاع کی خوش تدبیری اور دانائی تھی کہ اُس نے اِن اجنبی لوگوں کی ہمت افزائی اور خاطرداری کی اور اُن کو اپنی سپاہ میں بھرتی کر لیا۔ کیونکہ پرتگیز اصیل اور معدلے سب ملا کر اس وقت کم سے کم تو دس ہزار یہاں موجود تھے۔ اور فی الواقع اُس کو بڑی مدد دے سکتے تھے۔ اُس نے اس موقعہ پر خصوصیت کے ساتھ اُن کے پادریوں کی بہت دل داری اور تالیف قلوب کی اور انعام واکرام کے وعدوں کے علاوہ یہ وعدہ بھی کیا کہ اپنی مرضی کے موافق جہاں چاہو اپنے گرجا بنا لینا۔

محمد سلطان کی بغاوت

اس عرصہ میں میر جملہ کے لشکر میں نہایت پریشان کُن حالات پیدا ہو گئے کیونکہ اُس میں اور محمد سلطان میں سخت نا اتفاقی ہو گئی جس کی وجہ محمد سلطان کی یہ آرزو تھی کہ کل لشکر کی حکمرانی میرے اختیار میں ہو۔ دوسرے وہ میر جملہ کے ساتھ توہین و تحقیر سے پیش آتا تھا۔ بلکہ بعض اوقات باپ کی نسبت بھی کچھ ایسے الفاظ کہہ بیٹھتا تھا جو نہ فرزندانہ اطاعت اور ادب ہی کے شایاں تھے اور نہ باپ کے شاہانہ منصب ہی کے، علانیہ کہہ دیا کرتا تھا کہ آگرہ کی تسخیر میں میں نے وہ وہ کام کئے ہیں کہ حضرت کے لئے ضروری ہے کہ اپنی کامیابی کے لئے میرے ممنون ہوں۔ اِن حرکتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس نے باپ کو سخت ناراض کر لیا اور جب اُس کی ناراضگی کی خبریں سنیں تو اس ڈر کے مارے کہ مبادا میر جملہ کے پاس میری گرفتاری کا حکم آجاتے

اور وہ مجھے قید کرے صرف گنتی کے آدمیوں کے ساتھ راج محل سے چل دیا[1] اور سلطان شجاع کی خدمت میں اطاعت ظاہر کر کے بجا آوری خدمات کے لئے اپنی آمادگی ظاہر کی لیکن شجاع کو ان باتوں پر کچھ یقین نہ آیا بلکہ یہ شبہ کرتا رہا کہ شاید اورنگ زیب اور میر جملہ نے مجھے بیوقوف بنانے کے لئے کوئی چال چلی ہے چنانچہ اس کے بڑے بڑے وعدوں اور قسموں پر اعتبار کیا اور نہ اپنی فوج کا کوئی بڑا عہدہ اسے سپرد کیا بلکہ ہمیشہ اس پر نگرانی قائم رکھی۔ اس طرز سلوک کا انجام یہ ہوا کہ وہ تھوڑے ہی دنوں میں شجاع سے بھی متنفر ہو گیا۔ آخر کار چند مہینوں کے بعد نا اُمید ہو کر پھر میر جملہ کے پاس چلا آیا اور میر جملہ نے خاطر داری اور کسی قدر اعزاز و اکرام کے ساتھ اسے لشکر میں اُتار لیا۔ اور کہا کہ اگرچہ آپ نے بہت بڑا قصور کیا ہے مگر خیر میں بادشاہ سے سفارش کر کے معافی کی درخواست کروں گا۔

میں نے بہت لوگوں سے سُنا ہے کہ یہ عجیب حرکت جو محمد سلطان سے ظہور میں آئی تھی حقیقت میں اورنگ زیب کا ایک منصوبہ تھا جو یہ چاہتا تھا کہ میرا بیٹا خواہ اپنے آپ کو کسی خطرناک کام ہی میں کیوں نہ ڈال دے مگر سلطان شجاع تباہ ہو جائے۔[2] بہرحال اصل حقیقت خواہ کچھ ہی ہو مگر جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ وہ راج محل کو لوٹ آیا ہے تو موقعہ دیکھا کہ اب محمد سلطان کو بھی کسی حراست کی جگہ بھیج دینے کا خاصہ بہانہ ہاتھ آگیا ہے واقعی یا بناوٹی خفگی کے ساتھ اس کو ایک تاکیدی فرمان بھیجا کہ فوراً بلا توقف دہلی کو چلا آئے۔ اب بدنصیب شاہزادہ تعمیل حکم سے سرتابی کر ہی نہیں سکتا تھا۔ بس یوں ہی گنگا کے اس پار اُترا لوگوں کے ایک مسلح گروہ نے گرفتار کر لیا اور زبردستی ایک

---

[1] یہ عجیب اتفاق تھا کہ انتیسویں رمضان ۱۰۶۹ھ کو ادھر تو یہ شہزادہ باغی ہوا اُدھر داراشکوہ اور سپہر شکوہ ٹھیک اسی تاریخ میں ملک جیون کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔ م م ع

[2] فارسی تاریخوں سے محمد سلطان کی بغاوت کا سبب یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو شہزادگی اور لیاقت کا غرور تھا ہی اس پر میر جملہ کی ماتحتی اور بھی ناگوار تھی اور کوتہ اندیش مصاحبوں کی ترغیبیں اور سلطان شجاع کے دم جھانسے اور اپنی لڑکی سے شادی کر دینے کا وعدہ جس کا ذکر پیچھے ایک حاشیہ میں لکھا جا چکا ہے سب مل کر اس حرکت کا باعث ہوئے تھے چنانچہ جب شجاع کے پاس جا پہنچا تو بمقام ٹانڈہ جہاں مونگیر اور راج محل کے چھن جانے کے بعد شجاع نے برسات کا موسم بسر کیا تھا اُس لڑکی سے اس کی شادی کر دی اور اس کے واپس آنے کا سبب شجاع کی سرد مہری تھی بلکہ وزمرہ کی شکستوں سے جب اُس نے دیکھ لیا کہ شجاع کی بہبودی کی کوئی امید نہیں ہے تو مایوس اور نادم ہو کر آٹھ مہینے کچھ زیادہ اُس کے پاس رہ کر واپس چلا آیا۔ م م ع

عماری میں بٹھا کر گوالیار کو بھیجے گئے اور یقین ہے کہ اُس کی عمر کا خاتمہ اب اسی جگہ ہوگا۔[۱]

---

۱ عالمگیر نامہ میں لکھا ہے کہ محمد سلطان اول پانچویں شعبان سنہ ۱۰۶۹ھ کو سلیم گڈھ میں قید کیا گیا اور پھر چھبیسویں جمادی الاول سنہ [illegible]ھ کو یہ اور سلیمان شکوہ جو سری نگر سے گرفتار ہو کر آیا تھا دونوں گوالیار بھیج دیے گئے تھے۔ مگر سنہ [illegible]ھ میں ملتفت خاں کو بھیج کر محمد سلطان اور دارا شکوہ کے دوسرے بیٹے سپہر شکوہ کو وہاں سے بلا لیا اور کچھ دنوں پھر سلیم گڈھ میں زیر حراست رکھکر تقریباً چودہ برس کی قید کے بعد شروع سنہ [illegible]ھ میں خلعت وغیرہ دے کر چھوڑ دیا۔ اور مراد بخش کی بیٹی دوست دار بانو بیگم سے نکاح کر دیا اور اپنے ہاتھ سے موتیوں کا سہرا باندھ کر قلعہ کے اندر کی مسجد میں سلام کرانے لے گیا۔ اور بارہ ہزار روپیہ سالانہ مقرر کر دیا۔ اور جشن عید اضحیٰ کے موقعہ پر ایک گوسفند کی تو خود قربانی کی اور ایک اونٹ محمد سلطان سے ذبح کرایا اور سنہ [illegible]ھ میں کشتواڑ کے راجہ کی بیٹی بائی بھوپ دیبی نامی سے اس کا نکاح کیا گیا اور سات لاکھ روپیہ کا زیور عطا ہوا۔ اور کتاب مآثر عالمگیری سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ [illegible]ھ میں درہ خیبر کے پٹھانوں کی بغاوت کی وجہ سے جب اورنگ زیب کو ایک عرصہ تک بمقام حسن ابدال رہنا پڑا تھا محمد سلطان کو بست ہزاری دہ ہزار سوار کا منصب مع خلعت کے اور ایک لاکھ روپیہ نقد اور نقارہ و نشان وغیرہ عطا ہو گیا تھا۔ اور وہاں سے لوٹنے کے بعد اگلے برس سات لاکھ روپیہ نقد عنایت ہوا۔ مگر باوجود اس کے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ قید سے چھوٹنے کے بعد کس جگہ کی صوبیداری ملی ہو یا اس کے اور بھائیوں کی طرح اُس کو کسی مہم میں سر لشکر بنا کر بھیجا گیا ہو بلکہ ایسا پایا جاتا ہے کہ بادشاہ کی سرد مہری اپنے اس بیٹے کی نسبت چلی ہی جاتی تھی۔ کیونکہ جب یہ شہزادہ اڑتیس برس دو مہینے ہو کر سنہ [illegible]ھ میں مرا ہے اس کی نسبت اسی کتاب زمانہ عالمگیری میں یہ عبارت لکھی ہے کہ

"بادشاہزادہ را مرض شدید عارض شد۔ مدتے بستر گزین بیتابی بودند در مقام خاص شکار خبر ملالت اثر رسید کہ صرصر فنا آن نخل باغ مجد و علا را از باغ دنیا برہا شستہ بحدیقہ علی نشاندند۔ باوجود قوت حوصلہ حضرت را از استماع این واقعہ ناگزیر پائے قرار از جا رفتہ دل پر غم و دیدہ پر نم شدہ روح اللہ خاں خانساماں و سیادت خاں و عبدالرحیم خاں و شیخ نظام و ملا محمد یعقوب فرمان رفت کہ در روضۂ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی برحمت حق سپارند۔"

جس سے بہرحال یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ باوجود اُس کے مرض الموت میں مبتلا ہونے کے بھی اورنگ زیب نے اُس کو جا کر نہیں دیکھا۔ بلکہ سیر و شکار میں مصروف رہا اور اسی کتاب میں عالمگیر کی اولاد ذکور کے ذکر میں مصنف نے اس شہزادہ کی لیاقت اور قابلیت کی نسبت یہ عبارت لکھی ہے۔

سلطان محمد معظم کو اورنگ زیب کی نصیحت اس طرح جب اپنے بڑے بیٹے کا خرخشہ مٹا کر اورنگ زیب نے شہزادہ محمد معظم سے فرمایا کہ

"ایسا نہ ہو کہ کبھی تم بھی بھائی کی تقلید کر بیٹھو اور وہی معاملہ تم کو بھی پیش آئے جو اس کو پیش آیا ہے۔ یاد رکھو کہ جہاں بانی ایک ایسا نازک معاملہ ہے کہ بادشاہوں کو اپنے سایہ سے بھی حسد اور بدگمانی ہو جاتی ہے بس یہ خیال کبھی نہ کرنا کہ اورنگ زیب بھی بیٹوں کے ہاتھ سے وہی کچھ دیکھ سکتا ہے جو جہانگیر نے شاہجہاں کے ہاتھوں دیکھا تھا۔ جس طرح شاہجہاں نے تخت و تاج کھو دیا اورنگ زیب بھی اسی طرح کھو سکتا ہے"

لیکن سلطان محمد معظم کے طور و طریق پر نظر کرتے ہوئے میری تو یہ رائے ہے کہ اورنگ زیب کا اس کی طرف سے کسی بڑے ارادہ کا شبہ کرنا بے وجہ ہے۔ کیونکہ وہ تو ایک ادنیٰ غلام سے بھی زیادہ فرماں برداری کرتا ہے اور مطیع سے مطیع شخص سے کبھی یہ ممکن نہیں کہ غیرت مند اور حریص طبیعت کے جوش و ولولہ پر اپنے اقوال و افعال سے پردہ ڈال رکھے۔ چنانچہ خود اورنگ زیب بھی حصول اختیار و اقتدار کے معاملہ میں کبھی اس قدر بے پروا نہیں نظر آیا۔ اور نہ خیرات اور عبادات ہی میں اتنا مصروف دکھائی دیا۔ مگر بایں ہمہ اکثر ہوشیار لوگوں کی یہ رائے ہے کہ بمقتضائے (الولد لابیہ سر ابیہ) اس کی بناوٹ ہے اور حصول سلطنت کے خیالات اسی طرح دل میں چھپائے ہوئے ہے جس طرح اس کا باپ چھپائے ہوئے تھا۔[۱]

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ

"اولیں فروغ دودمان مجدد احسان پادشاہزادہ محمد سلطان ولادت ایشاں از بطن نواب بائی چہارم رمضان ۱۰۴۹ھ وقوع یافت بشرائف آداب و محاسن اوصاف متصف و بحفظ کلام مجید و اکثر کمالات و خواندن و نوشتن عربی و فارسی و ترکی بہرہ وافی داشتند و در محاربات کہ آنحضرت را پیش از جلوس با اعادی دولت اتفاق افتاد مصدر تردات شائستہ شدہ داد شجاعت و دلیری دادند و در سنہ بست و یک جلوس حضرت ظل خاقانی بسیر ریاض آخرت رفتند" س م ع

[۱] جہانگیر سے شاہجہاں کی اکثر ان بن ہی رہتی تھی اور جب وہ مرا ہے تب تو یہ دکن میں علانیہ باغی تھا۔ س م ع

[۲] محمد سلطان اور محمد معظم دونوں ایک ہی ماں سے تھے اور محمد معظم قریب چار سال کے اس سے چھوٹا تھا۔ اورنگ زیب کے بعد یہی بادشاہ ہوا تھا۔ اور اپنی چند سالہ بادشاہی کے مختصر زمانہ میں ایک نیک سیرت

اورنگ زیب کی تخت نشینی

اب بنگالہ کا حال سنئے وہاں لڑائی بدستور جاری تھی۔ اگرچہ کسی قدر سستی کے ساتھ شجاع حتی المقدور مقابلہ کئے جاتا تھا اور اُس کا ہوشیار دشمن میر جملہ گنگا سے اُترنے اور بے شمار ندی نالوں کے طے کرنے میں جو اُس ملک میں بکثرت ہیں جس جس طرح سے مناسب اور مصلحت وقت جانتا تھا عمل کرتا تھا اور

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ - بادشاہ سمجھا جاتا تھا۔ لکھا ہے کہ یہ بچپن ہی میں قرآن مجید کا حافظ ہو گیا تھا اور فن قرأت اور تجوید سے خوب واقف تھا اور علم حدیث، فقہ میں تو ایسا کامل تھا کہ ہم عصر علما بھی مانتے تھے اور مسائل فقہیہ کا استنباط و استخراج خود قرآن و حدیث سے کر سکتا تھا۔ عربی ایسی بولتا تھا کہ فصحائے عرب پسند کرتے تھے اور ترکی اور فارسی تو گویا اس کے گھر کی باندیاں تھیں خوش نویسی میں بھی کامل تھا اور کئی طرح کے خط لکھنے جانتا تھا۔ نیک اوقات ایسا تھا کہ راتیں نماز و وظائف اور تلاوت قرآن مجید اور مطالعہ کتب تفسیر و حدیث و فقہ و تصوف میں بسر کرتا تھا۔ اور صبح کی نماز ہمیشہ اول وقت ادا کر کے کچھ دن چڑھے تک اوراد و وظائف پڑھتا۔ اور اس کے بعد منتظرانِ دیدار کے لئے "جھروکہ درشن" میں بیٹھتا اور مستغیثوں اور فریادیوں کی داد دیتا پھر وہاں سے اُٹھ کر دیوانِ خاص یا عام میں بیٹھ کر ملکی و مالی معاملات سنتا اور نماز ظہر کے بعد محل سرا میں جا کر کھانا کھاتا۔ اور کسی قدر سوتا۔ اور نماز عصر پڑھ کر پھر فریادیوں کی دادرسی کرتا۔ اور لوگوں کا سلام مجرا لیتا۔ اور نماز مغرب کے بعد درود و وظائف میں مصروف رہتا۔ اور قریب ڈیڑھ پہر رات گذرے نماز عشا پڑھ کر محل سرا میں چلا جاتا تھا۔ مگر باوجود ان تمام صفات حمیدہ اور کمال اطاعت کے آخر کار اُس کو بھی بدگمان باپ کے قہر و غضب کا نشانہ بننا ہی پڑا۔ یعنی جب اورنگ زیب نے سکندر عادل شاہ نابالغ والی بیجاپور کی بربادی کے لئے محمد معظم کے سوتیلے بھائی محمد اعظم شاہ کو اور ابوالحسن تانا شاہ والی حیدرآباد دکن کی بیخ کنی کے لئے اس کو مامور کیا تو اعظم شاہ اور دوسرے لوگوں کی دراندازی سے اورنگ زیب کو یہ شبہ ہو گیا کہ والی دکن سے اسکی سازش ہے۔ اور باوجودیکہ خود بادشاہ کے بعض معتمدانِ خاص نے اُسکی بے جرمی کی شہادت دی مگر بدگمانی رفع نہ ہوئی اور ۱۰۹۸ھ میں اس کو بیوی بچوں اور متوسلوں سمیت نہایت ذلت اور سختی سے قید کر دیا اور پانچ برس سے زیادہ تک قید رکھا اور تمام مال و اسباب و جاگیر وغیرہ ضبط کی گئی یہاں تک کہ اُس کی زوجہ نور النسا بیگم کے کانوں اور گلے کے زیور تک چھین لئے گئے اور اُس کو اور اُس کے بیٹوں کو حجامت بنوانے، ناخن کٹوانے، ٹھنڈا پانی پینے، گرم روٹی کھانے اور مناسب حال لباس پہننے سے مدتوں ممانعت اور محرومی رہی اور لطف یہ ہے کہ مآثر عالمگیری میں (جس کا مصنف التزام کے ساتھ ہمیشہ ادب و احترام سے ہمیشہ اورنگ زیب کی تعریف لکھتا ہے،) لکھا ہے کہ اگرچہ حضرت اورنگ زیب کو اُسکی قید کے زمانہ میں اس امر کا بھی اقرار تھا کہ ہمارے ہاتھ سے اس پر ظلم ہوا ہے۔ مگر فرماتے تھے کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ خداوند کریم ہمارے دل کو اُس کے حال پر مہربان کرے (ماخوذ مآثر عالمگیری مطبوعہ ایشیاٹک)

تمام ح

اس عرصہ میں اورنگ زیب آگرہ کے علاقہ میں مقیم تھا۔ مگر آخرکار جب مراد بخش کو قلعہ گوالیار میں بھیج چکا تو دہلی جاکر اُن سب دھوکے کی ٹٹیوں کو جواب تک لوگوں کو فریب دینے کے لئے بنا رکھی تھیں ڈھا ڈالا اور تخت سلطنت پر جلوس کرکے بادشاہ بن بیٹھا[۱]

داراشکوہ اجمیر کے میدان جنگ میں

اب اورنگ زیب کی تمام توجہ داراشکوہ کو گجرات سے نکالنے کی تدبیروں پر لگی ہوئی تھی لیکن ان وجوہ سے جو پہلے بیان کی جاچکی ہیں اس دلی مدعا کا حاصل ہونا آسان نہ تھا مگر آخرکار اس کی عجیب وغریب ہنرمندی اور

---

[۱] داراشکوہ کے تعاقب میں پنجاب کو جاتے ہوئے اگرچہ سرسری طور پر تخت نشینی کی رسم بمقام باغ اغرآباد جو شاہجہاں آباد کے قریب لاہور کے راستہ پر تھا پہلی ذیقعدہ ۱۰۶۸ھ کو عمل میں آچکی تھی۔ مگر باقاعدہ جلوس اُس وقت کیا گیا تھا جب کہ شجاع کو بمقام کہجوہ شکست دینے کے بعد مراد بخش کو قلعہ گوالیار میں بھیج دیا گیا۔ اور داراشکوہ کو بمقام اجمیر اُنتسویں جمادی الثانی ۱۰۶۹ھ کو دوبارہ شکست ہوئی اور وہ اُلٹے پاؤں احمد آباد کی طرف نہایت بے سروسامانی کے ساتھ بھاگ گیا۔ اس تخت نشینی کو مصنف نے داراشکوہ کی شکست کے واقعہ سے پہلے خدا جانے کس طرح لکھدیا ہے اور یہ جلوس چوبیسویں رمضان سنہ مذکور کو قلعہ شاہجہاں آباد میں (جس میں اب تک یہ داخل نہیں ہوا تھا)، ہندو اور مسلمان نجومیوں کے مجوزہ مہورت کے موافق جب کہ شمسی حساب سے اس کو اکتالیسواں برس تھا معمولی تکلفات کے ساتھ کیا گیا۔ اور اورنگ زیب نے اپنا لقب حسب ذیل قرار دیا۔

"ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب بہادر عالمگیر بادشاہ غازی" اور بے ادبی کے خیال سے سکہ میں کلمہ طیبہ اور خلفائے اربعہ کے ناموں کی جگہ سونے اور چاندی کی مناسبت سے باختلاف لفظ مہر و بدر یہ بیت تجویز ہوئی۔ ؎

سکہ زد در جہاں چو مہرِ منیر   شاہ اورنگ زیب عالمگیر

اوراگرچہ کسی کتاب تاریخ میں نہیں دیکھا گیا مگر مشہور ہے کہ جب خطیب دستور کے موافق اس کے بزرگوں کو کسی کو جنت آشیانی اور کسی کو خلد مکانی وغیرہ وغیرہ کہکر گننے لگا اور جہانگیر کے نام پر پہنچا تو اورنگ زیب نے فراست سے معلوم کیا کہ یہ اس امر میں حیران ہے کہ جیتے جاگتے شاہجہاں کا کیا کہکر نام لے۔ فوراً اس کی طرف مخاطب ہوکر قیدی باپ کے لئے یہ حسب حال اور لطیف لقب تجویز کردیا اور کہا کہ خطیب بگو "تارک تاج و دیہیم ثانی سلطان ابراہیم شہاب الدین محمد شاہجہاں بادشاہ غازی صاحبقران ثانی"۔ س م ح

روز افزوں خوش اقبالی سب مشکلوں پر غالب آگئی۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ جسونت سنگھ نے گھر پہنچتے ہی اُس مال و دولت سے جو کھجوہ سے لوٹ کر لایا تھا ایک مضبوط فوج بھرتی کرنی شروع کردی اور دارا شکوہ کو لکھ بھیجا کہ آپ بلا توقف آگرہ چلے آیئے میں اپنی تمام فوج کے ساتھ راستہ میں آن ملوں گا۔ اب چونکہ شہزادہ نے بھی ایک فوج کثیر[1] جمع کرلی تھی اگرچہ بہت عمدہ نہ تھی پس اس اُمید پر کہ جب میں ایسے نامی راجہ کو ساتھ لئے ہوتے دارالسلطنت کے قریب پہنچ جاؤں گا تو میرے منتشر شدہ ہواخواہوں کو بھی میرے نشان کے نیچے آکر جمع ہو جانے کی جرأت ہو جائے گی۔ چنانچہ اس نے احمد آباد سے کوچ کردیا اور بہت سُرعت کے ساتھ اجمیر میں آپہنچا جو آگرہ سے سات آٹھ منزل کے فاصلہ پر ہے لیکن جسونت سنگھ اپنے عہد پہ قائم نہ رہا۔ وجہ یہ ہوئی کہ راجہ جے سنگھ نے یہ خیال کرکے کہ لڑائی کے نام ننگ ڈھنگ سے اورنگ زیب ہی کے طلب کی اُمید ہوتی ہے اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے جسونت سنگھ کو دارا شکوہ کی طرف داری چھوڑ دینے کا مشورہ قرین مصلحت جان کر اُس کو لکھا کہ

> تم نے اس میں ایسا کیا فائدہ سوچا ہے کہ ڈوبتے کے ساتھی بنتے ہو اور اگر تم اسی بات پہ قائم رہو گے تو اُس کا کچھ فائدہ ہوتا تو معلوم ہوگا مگر ہاں تمھارا خاندان اور تم بے شک برباد ہو جاؤ گے۔ اور اورنگ زیب تم کو کبھی معاف نہ کرے گا۔ اور چونکہ میں بھی راجپوت راجہ ہوں اس لئے بمنت التماس کرتا ہوں کہ بیچارے راجپوتوں کا خون کرانے سے باز آؤ اور اس گھمنڈ میں نہ رہو کہ اور راجہ بھی تمھارے شریک ہو جائیں گے کیونکہ یہ میں کبھی نہ ہونے دوں گا۔ اور چونکہ یہ ایک ایسا امر ہے جو ہر ایک ہندو کی سلامتی سے تعلق رکھتا ہے اس لئے آپ کو ایسی آگ کے بھڑکانے کی کس طرح اجازت دی جا سکتی ہے جو تمام ملک میں پھیل جاتے اور پھر کبھی بھی اُس کو بجھایا نہ جا سکے اور اگر تم دارا شکوہ کو بحال خود چھوڑ دو گے تو اورنگ زیب تمھاری پچھلی خطائیں سب معاف کر دے گا۔ اور اُس شاہی خزانہ کا بھی مطالبہ نہ کرے گا جو تم نے کھجوہ کی لڑائی میں لوٹ لیا تھا۔ بلکہ فوراً گجرات کی صوبیداری پر

---

[1] عالمگیر نامہ میں لکھا ہے کہ گجرات میں دارا شکوہ کے پاس بائیس ہزار سوار اور ایک اچھا توپ خانہ موجود ہو گیا تھا اور کھجوہ کی لڑائی میں جسونت سنگھ کی بغاوت سے جو افواہیں اڑی تھیں اُن کو سُن کر جلد بازی سے جسونت سنگھ کی عرضیوں کے پہنچنے سے پہلے ہی اجمیر کو چل پڑا تھا۔ ن۔م۔ح

سرفراز کئے جاؤ گے اور ایسے صوبے کی حکومت میں جو آپ کے علاقہ سے متصل ہے جو فوائد ہیں وہ آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ اور وہاں آپ بغیر کسی طرح کے خوف وخطر کے نہایت آرام سے رہیں گے اور ان وعدوں کا کامل طور سے پورا کرانا میرے ذمہ ہے۔

غرض کلام یہ کہ جسونت سنگھ اس امر پر مائل ہو گیا کہ گھر سے قدم باہر نہ نکالے[1] اور اورنگ زیب مع اپنی تمام فوج ولشکر کے اجمیر میں دارا شکوہ کی فوج کے سامنے آن موجود ہوا۔

اب ایسا کون شخص ہوگا جو اس تاریخ کو پڑھے گا اور اس بات پر افسوس نہ کرے گا کہ بدنصیب دارا شکوہ کو لوگوں نے کیسی کیسی اُلٹی تدبیریں بتائیں اور آخر کار دغا کی جسونت سنگھ کی بدعہدی کا حال اگرچہ دارا شکوہ پر کھل گیا مگر اس کے ہولناک نتیجوں کا اب کیا علاج تھا۔ وہ بے شک اپنی فوج کو احمد آباد لے جاتا مگر گرمی کی شدت اور پانی کے قحط کی وجہ سے جو اس موسم میں راجپوتانہ میں ہو جاتا ہے یہ امر سخت دشوار تھا کہ پینتیس روز تک اُن راجاؤں کے ملک میں سفر کرے جو جسونت سنگھ کے رفیق اور دوست ہوں اور اس پر طرہ یہ ہو کہ اورنگ زیب سا مستعد دشمن ایسی بڑی اور تازہ دم فوج کے ساتھ نہایت سرگرمی سے اُس کا پیچھا کرے۔ اس لئے اُس نے سپاہیانہ موت سے مرجانا ہی بہتر سمجھا اور اگرچہ جانتا تھا کہ برابر کی لڑائی نہیں ہے مگر تاہم یہی ٹھان لی کہ یا دشمن کو مار لیا یا آپ مر گئے مگر اب تک اُس کو اپنی مصیبت کی انتہا معلوم نہ تھی کیونکہ جن لوگوں پر خیانت اور دغا بازی کا کچھ بھی شک وشبہ نہ تھا سب کچھ دہی کرنے کو موجود اور گھات میں لگے ہوئے تھے۔ چنانچہ بدذات شاہنواز خاں جس پر دارا شکوہ کامل بھروسہ کئے ہوئے تھا اُس کی خط وکتابت اورنگ زیب سے برابر جاری تھی اور وہ اس کے سب منصوبوں سے اُس کو مطلع کرتا رہتا تھا۔ لیکن اپنی بے ایمانی کی سزا اُس نے جلد ہی پالی یعنی اسی لڑائی میں تلوار سے قتل کیا گیا۔ چنانچہ بعض لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ خود دارا شکوہ کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ مگر ظن غالب یہ ہے دارا شکوہ کے اُن مخفی طرف داروں نے جو اورنگ زیب کے لشکر میں تھے اس خوف سے اُسے مارڈالا کہ اگر یہ زندہ رہا تو ہم سب کا

---

[1] عالمگیر نامہ میں لکھا ہے کہ جے سنگھ نے اورنگ زیب کی خواہش کے موافق اپنے خط کے ساتھ اسی مضمون کا بادشاہی فرمان بھی اپنے ایک خاص آدمی کے ہاتھ جسونت سنگھ کے پاس بھیجا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگرچہ وہ جودھپور سے سوار ہو آیا تھا مگر راستہ سے اُلٹا پھر گیا۔ س م ح

بھید کھول دے گا۔ اور ان سب عرضیوں کا حال اس سے کہدے گا جو ہم داراشکوہ کی خدمت میں بھیجتے رہے ہیں۔ لیکن اس دغابازی کی سوت سے اب کیا فائدہ تھا کیونکہ داراشکوہ کو لازم تو یہ تھا کہ جس روز سے اس نے احمد آباد کو لیا تھا اسی روز سے اس کے بارے میں اپنے خیر خواہوں کی دانشمندانہ صلاح سنتا اور وہ جس بے اعتباری اور بے عزتی کے لائق تھا اس سے اسی طرح پیش آتا الغرض قریب پہر دن چڑھے لڑائی شروع ہوئی اور داراشکوہ کے توپ خانہ سے جو ذرا اونچی اور مناسب جگہ پر قائم تھا اگرچہ خالی آوازیں تو بڑے زور شور کی سنائی دیں مگر کہتے ہیں کہ دغابازی کا جال یہاں تک پھیلا ہوا تھا کہ توپوں کی تھیلیوں میں گولے نہیں بلکہ وہ صرف بارود سے بھری ہوئی تھیں۔ اس لڑائی کی۔ بشرطیکہ اس کو لڑائی کہا جائے تفصیل لکھنی بے فائدہ ہے۔ صرف اس قدر بیان کردینا کافی ہے کہ پہلے گولے کے چلتے ہی جے سنگھ ایک ایسے مقام پر آ کھڑا ہوا جہاں سے داراشکوہ اس کو دیکھ سکے اور اپنے ایک سردار کو یہ پیغام دے کر داراشکوہ کے پاس بھیجا کہ

"اگر گرفتاری سے بچنا چاہتے ہو تو فوراً میدانِ جنگ سے علیحدہ ہو جاؤ"

اس پیغام سے اس بیچارے شہزادہ پر ایسا ناگہانی خوف طاری ہوا اور ایسی حیرت چھائی کہ فوراً اس کی صلاح مان لی اور ایسا سراسیمہ ہو کر بھاگا کہ اپنی خیمہ گاہ اور باربرداری کے متعلق بھی کوئی حکم نہیں دیا اور فی الواقع اس وقت وہ ایسی ہی آفت میں مبتلا تھا کہ اس نے اتنی ہی مہلت کو غنیمت جانا کہ اپنے اہل و عیال کو اس تہلکہ سے نکال لے جائے۔ کیونکہ بلا شبہ وہ اس وقت جے سنگھ کے قابو میں آ چکا تھا۔ اور راجہ کے اس اغماض کا سبب یہ تھا کہ وہ ہمیشہ یہ سمجھکر کہ کسی شاہزادہ سے بدسلوکی کرنا کسی نہ کسی دن سخت خطرہ کا باعث ہے شاہی خاندان کے لوگوں کے ساتھ بہت ادب اور لحاظ سے پیش آتا تھا۔[1]

[1] اس لڑائی کا حال عالمگیرنامہ میں یوں لکھا ہے کہ نواح اجمیر میں جو پہاڑیاں ہیں چونکہ ان کی سب گھاٹیاں روک کر مورچہ بندی اچھے طور سے کی گئی تھی اور داراشکوہ کا توپ خانہ بھی مناسب جگہ قائم کیا گیا تھا اس لئے اورنگ زیب کے امیروں کا حوصلہ نہیں پڑتا تھا کہ حملہ کریں یہاں تک کہ تین دن یوں ہی گذر گئے اور صرف توپ بندوق سے دور دور کی لڑائی ہوتی رہی آخر اورنگ زیب نے مجبور ہو کر ان کو غیرتیں بھی دلائیں اور ڈرایا دھمکایا بھی اور انعام و اکرام کے وعدے بھی کئے مگر پھر بھی یہی حالت بدستور رہی۔ اتفاق سے راجہ راج روپ جموں والے کے کوہستانی سپاہی "کوکلہ" پہاڑی کے

پیچھے ایک ایسی جگہ دیکھ آئے کہ جہاں سے پیادہ سپاہی چڑھ کر مخالف کے مورچے پر حملہ کر سکتے تھے
راجہ نے اورنگ زیب کو اس حال کی اطلاع کر کے کچھ اپنے سپاہی اس پہاڑی کو روانہ کئے اور
خود بھی اپنی باقی ماندہ فوج لے کر اُن کی مدد اور نگہبانی کے طور پر مخالف کے مورچوں کی طرف چلا
گیا۔ چونکہ اتفاقاً اس وقت اورنگ زیب کے توپ خانہ سے توپیں چلنی بند ہو گئیں تھیں اس باعث
سے ذرا دلیر ہو کر دارا شکوہ کی فوج میں سے کوئی ایک ہزار سوار راجہ راجروپ پر حملہ کرنے کو
اپنے مورچوں سے باہر نکل آئے۔ اس پر اورنگ زیب کے مسلمان امیروں میں سے اول دلیرخاں
اور پھر شیخ میر نے اپنی اپنی فوجیں ساتھ لے کر ایسے زور سے حملے کئے کہ اُن کے مورچوں تک
جا پہنچے۔ اور اس طرح پر ایک اچھی لڑائی ہو پڑی جس میں شیخ میر جو ہاتھی پر سوار اپنی سپاہ کو
لڑاتا تھا بندوق کی گولی سے مارا گیا۔ مگر اُس کا ایک ہم قوم سید جو پیچھے بیٹھا ہوا تھا اُس نے
ہوشیاری سے اُس کی لاش کو اس طرح تھامے رکھا جس سے دشمنوں کو بلکہ خود اُس کی سپاہ کو لڑائی کے
خاتمہ تک اُس کے مرنے کا علم نہ ہوا اور دلیرخاں تو جرأت کر کے دارا شکوہ کے مورچوں ہی میں جا گھسا اور
اُس کے ایک نامور سردار کو خاص اپنے تیر سے ہلاک کر دیا اور خود بھی زخمی ہوا ان حملوں میں اُس طرف
سے شاہنواز خاں اورکئی اور نامی سردار بھی مارے گئے۔ اتنے میں راجہ روپ کے کوہستانی پیدلوں نے
کوکلہ پہاڑی پر اپنا نشان جا گاڑا۔ اور راجہ جے سنگھ بھی اپنی فوج لے کر ان سب سرداروں کی مدد کو جا
پہنچا۔ دارا شکوہ کی سپاہ راجروپ اور دلیرخاں کی جرأت اور دلیری سے پہلے ہی ہمت ہار چکی تھی اور خود
دارا شکوہ کا تو یہ حال تھا کہ اُس نے مایوسی کے مارے اپنی بیگمات کو اول ہی ہاتھیوں پر سوار کرا کر
اور ضروری مال واسباب اور روپیہ اشرفی اونٹوں اور خچروں پر لدوا کر آنا ساگر تالاب کے کنارے میدان
جنگ سے کچھ فاصلہ پر ٹھیرا دیا تھا۔ مگر جب رات ہو گئی تو ساری اُمیدیں قطع کر کے اس قدر سراسیمہ
ہو کر بھاگا کہ اپنی بیگموں کو ساتھ لینا تو درکنار اُن کو اپنے بھاگنے کی خبر بھی نہ کر سکا۔ اور جن کو اُس کا
ایک معتمد خواجہ سرا یہاں سے لے جا کر دوسرے دن بمشکل اس سے مل سکا۔ اور سوائے فیروز خاں میواتی کے
اور کسی رفیق نے اُس کا ساتھ نہ دیا یہاں تک کہ جو راجپوت اُس کے مال و دولت کے لدے ہوئے اونٹوں
اور خچروں کے محافظ تھے اور جن پر اُس کو وفاداری کا بہت بڑا بھروسہ تھا وہی اُن کو ہانک کر اپنے اپنے
گھروں کو لے گئے۔ اس طرح لڑائی سے تیسرے دن بادجود اورنگ زیب کے اُمرا کی کم ہمتی کے جس کو عالمگیر نامہ
میں مفصل لکھا ہے اس کو اپنے خیمہ میں بیٹھے بٹھائے ۲۹ رجمادی الآخر ۱۰۶۹ھ کو ایسی فتح حاصل ہو گئی کہ
جس سے وہ اب بے کھٹکے بادشاہ ہو گیا۔ اگرچہ اور امیر بھی مثل شائستہ خاں دہوش دارخاں وغیرہ

داراشکوہ پناہ کی تلاش میں

آفت رسیدہ اور برباد شدہ داراشکوہ جس کی جان بری کا صرف احمد آباد پر دوبارہ قبضہ حاصل کرنے میں منحصر تھی ایسے دور دراز ملک میں سے گذرنے پر مجبور تھا جو قریباً سب کا سب مخالف راجاؤں کے قبضہ میں تھا اور ایسی بے سروسامانی تھی کہ خیمہ تک پاس نہ تھا اور زیادہ سے زیادہ دو ہزار آدمی ہمراہ تھے گرمی بہت سخت پڑتی تھی اور اس پر یہ ایک اور آفت تھی کہ کولی لوگ رات دن پیچھا نہ چھوڑتے تھے اور اُس کے سپاہیوں کو اس قدر لوٹا اور قتل کیا تھا کہ صرف چند قدم پیچھے رہ جانا بھی نہایت خطرناک تھا۔ یہ کولی اس ملک کے کسان ہیں اور بڑے ہی لٹیرے اور ہندوستان بھر میں ایک ہی بدذات ہیں۔ پس اگرچہ ان سب مشکلوں اور آفتوں سے بچ کر داراشکوہ ایک ایسے مقام تک پہنچ گیا جہاں سے احمد آباد صرف ایک منزل تھا اور اُسے اب یہ اُمید تھی کہ کل کو احمد آباد میں جا داخل ہوں گا اور پھر ایک فوج بھرتی کرلوں گا۔ لیکن بدنصیب اور شکست خوردہ لوگوں کی اُمیدیں کبھی سرسبز نہیں ہوتیں۔ چنانچہ اُس شخص نے جس کو داراشکوہ احمد آباد میں قلعہ دار اور حاکم بنا کر پیچھے چھوڑ آیا تھا یہ بے وفائی اور پاجی پن کیا کہ اورنگ زیب کے دھمکانے یا اُمیدوار کرنے کے باعث اپنے آقا سے پھر گیا اور یہ لکھ بھیجا کہ شہر کے نزدیک نہ آئیے دروازے بند اور لوگ مقابلہ کے لئے مسلح اور تیار ہیں۔

داراشکوہ کی رفاقت میں ایک ہولناک سفر

اس وقت میں بھی تین دن سے داراشکوہ کی ہمراہی میں تھا۔ اور یہ ایک نہایت ہی عجیب و غریب اتفاق تھا کہ میں اُسے راستہ میں مل گیا اور کسی طبیب کے ہمراہ نہ ہونے کی وجہ سے اُس نے جبراً مجھے اپنے ساتھ لے لیا۔ احمد آباد کے حاکم کے کاغذ کے پہنچنے سے ایک دن پہلے کا ذکر ہے کہ داراشکوہ نے مجھ سے فرمایا کہ مبادا تمہیں کولی مار ڈالیں اور اس لئے بااصرار مجھ کو اس کاروانسرا میں لے گیا جہاں خود ٹھہرا ہوا تھا اور اب اُس کا یہ حال تھا کہ خیمہ تک اُس کے پاس نہ تھا اور اُس کی بیگم اور اور عورتیں صرف ایک قنات کی آڑ میں تھیں جس کی رسیاں میری سواری کی بہلی کے پہیوں سے جس میں آرام کرتا تھا باندھی ہوئی تھیں۔ جو لوگ اس امر سے واقف ہیں کہ ہندوستانی اُمرا اپنی مستورات کے پردہ کے معاملہ میں کس قدر مبالغہ کرتے ہیں ۔۔ وہ

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ اپنی اپنی فوجیں ساتھ لے کر لڑنے کو گئے تھے مگر عالمگیرنامہ میں اس فتح کو صرف راجہ راجروپ شیخ میر بہادر خاں اور راجہ جے سنگھ ہی کی کارگذاری سے منسوب کیا گیا ہے۔ ج م ع

میرے اس بیان پر اعتبار نہ کریں گے۔ مگر میں نے یہ واقعہ اس دردناک حالت کے ثبوت میں لکھا ہے جس میں یہ شہزادہ اس وقت مبتلا تھا۔

اسی شب کو پو پھٹنے کے قریب احمد آباد کے حاکم کا جب مذکورہ بالا پیغام آیا تو مستورات کی گریہ وزاری نے ہم سب کو رُلا دیا۔ اس وقت ایک عجیب پریشانی اور مایوسی چھا رہی تھی اور ہر کوئی خوف سے خاموش ایک دوسرے کا منہ تکتا تھا اور کوئی تدبیر نہ سوجھتی تھی اور کچھ معلوم نہ تھا کہ دم بھر میں کیا ہو جائے گا۔ دارا شکوہ زنانہ میں سے باہر آیا تو میں نے دیکھا کہ مُردہ کی سی حالت تھی اور کبھی اس سے اور کبھی اُس سے کچھ کہتا ۔۔ اور ایک ادنیٰ سپاہی کے پاس بھی کھڑا ہو کر پوچھتا تھا کہ اب کیا کرنا چاہیئے ۔ اور جب اُس نے دیکھا کہ ہر ایک کے چہرہ سے خوف کے آثار نمایاں ہیں تو یقین ہو گیا کہ غالباً ان میں سے ایک بھی میرا ساتھ نہ دے گا اور نہایت حیران تھا کہ اب کیا ہو اور مجھے کدھر جانا چاہیئے۔ اور توقف کی حالت میں تو سراسر بربادی ہی بربادی نظر آتی تھی۔

اِن تین دن کے عرصہ میں جب کہ میں اس شاہزادہ کے ہمراہ تھا رات دن بلا توقف ہم کو کوچ کرنا پڑا اور گرمی اس شدت کی تھی اور اس قدر گرد و غبار اڑتا تھا کہ دم گھٹا جاتا تھا اور میری بہلی کے تین عمدہ اور قدآور گجراتی بیلوں میں سے ایک مر چکا تھا اور ایک قریب المرگ تھا اور ایک اس قدر تھک گیا تھا کہ چلنے سے مجبور تھا اور اگرچہ دارا شکوہ بہت چاہتا تھا کہ میں اُس کے ہمراہ رہوں خصوصاً اس وجہ سے کہ اُس کی ایک بیگم کی ٹانگ میں ایک بہت بُری طرح کا زخم تھا لیکن وہ ایسی لاچاری کی حالت کو پہنچ گیا تھا کہ دھمکانے اور منت سماجت کرنے پر بھی کسی نے اُس کو میری سواری کے لئے کوئی گھوڑا یا بیل یا اونٹ نہ دیا۔ اور جب کوئی سواری میسر نہ آئی تو بناچاری میں پیچھے رہ گیا۔ اور چار پانچ سو سواروں کے ساتھ آتے جاتے دیکھ کر جو گھٹتے گھٹتے اب صرف اسی قدر رہ گئے تھے میں بے اختیار رو پڑا مگر اب تک بھی دو ہاتھی اُس کے ساتھ تھے اور لوگ کہتے تھے کہ اُن پر روپے اور اشرفیاں لدی ہوئی ہیں اور اس وقت میں سمجھتا تھا کہ وہ ٹھٹھہ کی طرف جائے گا اور حالات موجودہ کے لحاظ سے یہ تجویز شاید بُری بھی نہ تھی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اُدھر بھی مصیبت تھی اور اِدھر بھی

اور مجھے ہرگز یہ اُمید نہ تھی کہ وہ اُس ریگستان سے جو احمدآباد اور ٹھٹھہ کے بیچ میں ہے سلامت گذر جائے گا۔ چنانچہ واقعی ایسا ہی ہوا کہ اُس کے ہمراہیوں میں سے اگرچہ عورتیں بھی بہت سی مر گئیں مگر مردوں پر تو یہ مصیبت گذری کہ بھوک پیاس۔ اور بے رحم کولیوں کے ہاتھ سے کوئی زندہ بچا ہو تو بچا ہو۔ کاش اس پُرآفت سفر میں اگر دارا شکوہ خود بھی مرجاتا تو میں اُس کو بڑا ہی خوش نصیب کہتا۔ لیکن وہ ہر طرح کی مصیبتیں جھیلتا مرتا آخرکار کچھ کے علاقہ میں جا پہنچا اور کچھ کا راجہ اُس سے بڑی مہمان نوازی سے پیش آیا اور کہا کہ اگر آپ اپنی بیٹی کی شادی میرے بیٹے سے کردیں تو میری تمام فوج آپ کی مدد کو حاضر ہے۔ لیکن جس طرح جے سنگہ کا منتر جسونت سنگھ پر اثر کرگیا تھا ویسا ہی اس پر بھی چل گیا اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اُس کے تیور بدلے ہوئے نظر آنے لگے اور دارا شکوہ کو بعض معقول وجوہ سے جب یہ اندیشہ ہوا کہ یہ وحشی میری جان ہی لینے کی فکر میں ہے تو فوراً ٹھٹھہ کی طرف چل دیا۔

جان بچی لاکھوں پائے اب اگر میں اپنا کل ماجرا جو میرے اور اُن بدذات کولیوں کے باہم گذرا اور جس ڈھنگ سے میں نے اُن کو اپنی نسبت مہربان بنایا اور تھوڑا سا روپیہ جو میرے پاس تھا بچا لیا بیان کروں تو غالباً اس کتاب کے پڑھنے والے دق ہو جائیں گے بس مختصر یہ ہے کہ میں نے اپنی طبابت کی بڑی تعریفیں کیں اور میرے دو نوکروں نے بھی جو اُسی خوف میں مبتلا تھے جس میں میں تھا اُن کو یہی جتایا کہ ہمارے آقا کی برابر کوئی حکیم دنیا میں نہیں ہے اور دارا شکوہ کے سپاہیوں نے اس کو ایسا ستایا ہے کہ جو کچھ قیمتی مال و اسباب اس کے پاس تھا وہ سب چھین لے گئے ہیں۔ قصہ مختصر ہماری بڑی ہی خوش نصیبی تھی کہ ہمارے اس کہنے سننے سے اُن کے دل کسی قدر پسیج گئے اور ہم کو سات آٹھ روز تک روکے رکھنے کے بعد آخرکار ایک بیل ہماری گاڑی میں جوت کر ہم کو وہاں تک پہنچا دیا جہاں سے احمدآباد کے بُرج نظر آتے تھے اور اس شہر میں میری ایک امیر سے ملاقات ہوگئی جو دہلی کو جاتا تھا اور میں اُس کی پناہ میں یہاں تک چلا آیا۔ اور راستہ میں آدمیوں، ہاتھیوں، گھوڑوں، اونٹوں اور بیلوں کی لاشیں ہم کو جابجا پڑی ہوئی نظر آئیں جو دارا شکوہ کی تباہ شدہ فوج کی مصیبتوں کا قصہ گویا زبانِ

حال سے سُنا رہی تھیں۔

سلیمان شکوہ کی طرف سے اندیشے

جس زمانہ میں دارا شکوہ ٹھٹھہ کے پُر مصیبت سفر میں مصروف تھا بنگالہ میں لڑائی بدستور جاری تھی اور سلطان شجاع اپنے دشمنوں کی اُمید سے بہت بڑھ کر ہمت اور کوشش دکھا رہا تھا۔ لیکن اورنگ زیب کو اُدھر کے معاملات کا چنداں اندیشہ نہ تھا۔ کیونکہ میر جملہ کی دانشمندی اور خوش تدبیری اُس کو بخوبی معلوم تھی اور بنگالہ اور آگرہ کے بُعد مسافت کی وجہ سے بھی یہ معاملہ سر دست زیادہ اہم نہ تھا البتہ جس بات کا اُسے نہایت کھٹکا تھا وہ یہ تھی کہ سلیمان شکوہ نزدیک تھا اور یہ چرچا پھیلا ہوا تھا کہ سری نگر سے جہاں سے آگرہ آٹھ روز سے بھی کم کا راستہ ہے وہ اور راجہ فوج سمیت اُترنے والے ہیں اور اورنگ زیب ایسا غافل نہ تھا کہ ایسے دشمن کو حقیر سمجھتا۔ اُس کو اب زیادہ تر اسی بات کی فکر تھی کہ کسی طرح سے سلیمان شکوہ کو اپنے قابو میں لائے۔ پس سب سے بہتر تدبیر اُس نے یہ خیال کی کہ راجہ جے سنگھ ہی کی معرفت اس راجہ سے بھی کچھ بندوبست کیا جائے۔ چنانچہ جے سنگھ نے اُس کو اس مضمون کے خط پر خط لکھے کہ اگر آپ سلیمان شکوہ کو پکڑ کر بھیج دیں تو بڑے بڑے انعام ملیں گے ورنہ آپ کے حق میں بہت ہی بُرا ہوگا۔ مگر اُس نے ان کا یہی جواب دیا کہ خواہ میرا تمام ملک چھن جائے مگر میں کبھی ایسی بے عزتی اور نامردی کی حرکت کا مرتکب نہ ہوں گا۔ پس جب اورنگ زیب نے دیکھ لیا کہ خواہ دھمکایا جائے یا لالچ دیا جائے یہ کسی طرح بھی اپنے اس عزم سے پھرنے والا نہیں تو اپنی فوج کو دامن کوہ کی طرف روانہ کیا اور بے شمار پہاڑوں کو کاٹ کر راستہ ہموار اور فراخ کرنے کے لئے لوگوں کو مامور کیا۔ لیکن راجہ مخالفوں کی ان بیہودہ کوششوں کو جو اُس کے ملک میں داخل ہونے کے لئے کی جا رہی تھیں عبث اور بچوں کا کھیل سمجھ کر ہنستا تھا اور فی الواقع اُس کا ہنسنا بجا تھا۔ کیونکہ اگر اورنگ زیب جیسے چار بادشاہ بھی جمع ہو کر اُس کوہستان پر چڑھائی کرتے تو ان دشوار گذار پہاڑوں میں رسائی ناممکن تھی۔ آخر کار ایسا ہی ہوا کہ لاحاصل غصہ دکھانے کے بعد فوج واپس بُلالی گئی۔

اس عرصہ میں دارا شکوہ ٹھٹھہ کے نزدیک جا پہنچا تھا اور صرف دو ہی تین منزلیں باقی رہ گئی تھیں اور مجھ کو اُن فرانسیسیوں اور کئی اور اہل فرنگ کی زبانی جو اس قلعہ

کی فوج میں تھے معلوم ہوا کہ یہاں پہنچ کر دارا شکوہ کو یہ خبر ملی کہ میر بابا نے جو مدت سے قلعہ کو گھیرے ہوئے تھا محصوروں کو یہاں تک تنگ کر دیا ہے کہ آدھ سیر گوشت یا چاول ڈھائی روپیہ سے زیادہ میں فروخت ہوتے ہیں اور باقی اجناس کی بھی سخت گرانی ہے۔ لیکن بہادر قلعہ دار اب تک ہمت باندھے مقابلہ پر جما ہوا ہے۔ بلکہ اکثر اوقات قلعہ سے باہر نکل کر دشمنوں پر اچھے خاصے حملے کر جاتا ہے۔ اور ہر طرح سے دانائی شجاعت نمک حلالی اور ہمت کے ساتھ میر بابا کے سخت حملوں کو رد کرتا ہے اور اورنگ زیب کی دھمکیوں اور ۔ عدوں کو ہنسی میں اڑا دیتا ہے۔ چنانچہ اس کے اس قابل تعریف کام کی ان بہت سے اہلِ فرنگ نے بھی جو اُس کی فوج میں تھے تصدیق کی۔ اور مجھ سے یہ بھی کہا کہ جب اُس کو دارا شکوہ کے قریب پہنچ جانے کی خبر ملی تو زیادہ داد و دہش کرنے لگا اور اس طرح پر سپاہیوں کا دل ایسا ہاتھ میں کر لیا کہ تمام اہلِ قلعہ محاصرین کو ہٹا کر دارا شکوہ کے قلعہ میں لے آنے کے واسطے بخوشی اپنی جانیں لڑا دینے کو تیار تھے۔

اس کے علاوہ اس ذی ہوش سردار نے کئی طرح کی عمدہ تدبیروں سے۔ بہت ہوشیار جاسوسوں کو میر بابا کے لشکر میں بھیج کر محاصرین کو یہ یقین دلا دیا کہ دارا شکوہ ایک جرار فوج ساتھ لئے ہوئے محاصرہ اٹھا دینے کے ارادہ سے جلد پہنچنے والا ہے اور اس میں یہاں تک مبالغہ کیا کہ ہم دارا شکوہ اور اُس کی فوج کو بچشم خود دیکھ کر آئے ہیں۔ چنانچہ یہ چال ایسی کارگر ہوئی کہ دشمنوں کے چھکے چھوٹ گئے اور کچھ شک نہیں کہ اگر دارا شکوہ اس وقت آ پہنچتا تو میر بابا کا لشکر ضرور تتر بتر ہو جاتا۔ بلکہ اُن میں سے بعض لوگ اُس سے آن ملتے۔ لیکن اُس کی قسمت میں ایسا ہی لکھا تھا کہ کسی مہم میں بھی سرسبز نہ ہو۔ پس یہ سمجھ کر کہ ان چند آدمیوں کے ساتھ محاصرہ کا اٹھا دینا ناممکن ہے۔ پہلے تو اُس کا یہ ارادہ ہوا کہ دریائے سندھ سے اُتر کر ایران کو چلا جائے۔ اگرچہ اس تجویز کا عمل میں آنا بھی بہت ہی مشکل تھا۔ کیونکہ پٹھانوں اور بہت سے ایسے چھوٹے چھوٹے سرداروں کے ملک میں سے جانا پڑتا جو نہ ایران ہی کے مطیع ہیں اور نہ ہندوستان ہی کے اور بیچ میں ایسا بیابان حائل تھا کہ جس میں پانی میسر آنا بھی مشکل تھا۔ لیکن اِن امور سے قطع نظر اُس کی بیگم نے ایک ضعیف اور واہیات سی بات کہہ کر اُس کا یہ ارادہ ترک

کرا دیا یعنی یہ کہہ دیا کہ اگر آپ ایران کا قصد کریں گے تو خوب سمجھ لیجئے کہ مجھ کو اور میری بیٹی دونوں کو شاہ ایران کی لونڈیاں بننا پڑے گا؛ اور یہ ایک ایسی بے عزتی ہے کہ ہمارے خاندان میں سے کسی کو بھی گوارا نہ ہوگی۔ اور اس بات کو بیگم اور داراشکوہ دونوں بھول گئے کہ ہمایوں جب ایسی ہی مصیبتوں میں مبتلا ہو کر ایران گیا تھا اور اس کی بیگم بھی ساتھ تھی تو کوئی نازیبا سلوک اُس سے نہ ہوا تھا۔ بلکہ بہت ہی تعظیم و تکریم اور خاطر و مدارات ہوئی تھی۔ القصہ داراشکوہ کو اس کشمکش و پیچ اور تذبذب کی حالت میں یہ خیال آیا کہ جیون خاں پٹھان کے پاس جانا بہتر ہے جو کسی قدر ذی شہرت اور بادقعت سردار ہے۔ اور اس کا علاقہ چنداں دور بھی نہ تھا۔ اور اس کا سبب یہ تھا کہ اس کی بغاوت اور سرکشی کی وجہ سے شاہجہاں نے دو مرتبہ اس کو ہاتھی کے پاؤں سے کچلوا دینے کا حکم دیا تھا۔ اور دونوں ہی دفعہ صرف داراشکوہ کی سفارش سے جان بچی تھی اور اس کے پاس جانے سے مقصود یہ تھا کہ کچھ فوج کی مدد لے کر میر بابا کو قلعہ ٹھٹھہ سے ہٹائے اور وہ خزانہ جو وہاں کے قلعہ دار کی تحویل میں تھا اس کو لے کر قندھار چلا جائے اور وہاں سے بہ آسانی کابل پہنچ جائے اور اس کو یقین تھا کہ میرے وہاں پہنچ جانے پر مہابت خاں صوبہ دار کابل (جو ایک بڑا معتمد امیر تھا اور کابل والے اس سے بہت مانوس تھے) بلا تامل اور بڑی سرگرمی سے میری رفاقت اختیار کرے گا۔ اور چونکہ کابل کی صوبہ داری اس کو اسی کی وساطت سے ملی تھی۔ اس لئے یہ توقع کچھ بے وجہ بھی نہ تھی کہ وہ خلوص اور صداقت سے پیش آئے گا۔ لیکن دارا شکوہ کی مستورات اُس کے عزم سے بہت ہی مضطرب اور فکرمند ہوئیں اور انھوں نے بہ ہزار منت و زاری اس کو سمجھایا کہ ملک جیون کے ہاں جانا مصلحت نہیں ہے۔ بلکہ بیگم اور اس کی بیٹی اور بیٹے سپہر شکوہ نے پاؤں پر گر کر اور رو رو کر اس ارادہ سے باز آنے کے لئے التجا کی۔ اور کہا کہ یہ پٹھان ایک مشہور سرکش اور لٹیرا ہے ایسے شخص پر بھروسہ کرنا اپنی موت آپ خریدنا ہے اور یہ بھی سمجھایا کہ ٹھٹھہ کا محاصرہ اٹھانا کچھ ایسا ضروری نہیں ہے۔ اس مہم کی جوکھوں میں پڑے بغیر بھی آپ کابل کی راہ لے سکتے ہیں۔ کیونکہ یقین ہے کہ میر بابا ٹھٹھہ کا محاصرہ چھوڑ کر آپ کا راستہ روکنے نہ آئے گا۔ لیکن داراشکوہ کی اُلٹی سمجھ ہمیشہ ہی سیدھی راہ سے اُس کو بھٹکا دیتی تھی یہ معقول باتیں بالکل اس کی سمجھ میں نہ آئیں اور بولا کہ کابل کا سفر نہایت خطرناک اور مشکل ہے (جو فی الواقع سچ تھا) اور کہا کہ جس شخص کی جان میں

نے اس طرح سے بچائی ہے کیا یہ ممکن ہے کہ وہ ایسی خیانت کرے؟ پس باوجود اُن کی اس قدر التجا اور منت وزاری کے اُس کے ہاں چلا ہی گیا! اور یہ بات بہت جلد ثابت ہوگئی کہ بدذات آدمی اپنی غرض کے لئے کسی بدنامی کی مطلق پروا نہ کرکے اپنے محسنوں اور خیرخواہوں کی جان لینے کے لئے کس طرح بلادریغ تیار ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ پٹھان جب تک یہ سمجھتا رہا کہ داراشکوہ کے ساتھ ایک بڑا لشکر آتا ہوگا اُس وقت تک تو بظاہر تعظیم وتکریم سے پیش آیا۔ اور شاہزادہ کے ہمراہی سپاہیوں کو لوگوں کے مکانوں میں اُترواویا۔ اور بہت تاکید کی کہ جو کچھ اِن کو درکار ہو حاضر کریں اور برادرانہ اور دوستانہ سلوک سے پیش آئیں۔ لیکن جب یہ معلوم ہوگیا کہ دو تین سو آدمی سے زیادہ ساتھ نہیں ہیں تو فوراً آنکھیں بدل لیں۔ اور یہ امر تحقیق نہیں ہوا کہ اُس نے یہ حرکت اورنگ زیب کی ترغیب سے کی یا خود ہی اس سخت خیانت کا مرتکب ہوا۔ مگر ظنِ غالب یہ ہے کہ اشرفیوں سے لدی ہوئی چند خچریں جو قزاقوں کی روزمرہ کی لوٹ مار سے اب تک بچی ہوئی تھیں اُن کو دیکھ کر اُسے لالچ آگیا۔ بہرحال اُس نے یہ بدذاتی کی کہ رات کے وقت بہت سے ہتھیار بند آدمی جمع کرکے اول سب روپیہ پیسہ مستورات کے زیور اور جواہرات سمیت چھین کر قابو کر لیا۔ اور پھر داراشکوہ اور سپہر شکوہ پر حملہ کیا۔ اور جن لوگوں نے اُن کو بچانا چاہا اُنھیں قتل کر ڈالا۔ اور داراشکوہ کو باندھ کر ہاتھی پر چڑھا دیا۔ اور ایک جلاد اس غرض سے پیچھے بٹھا دیا کہ اگر وہ یا اُس کا کوئی طرفدار ذرا بھی ہاتھ پاؤں ہلائے۔ تو فوراً شہزادہ کا سر اُڑا دے۔ اور ایسی بے عزتی کے ساتھ میر بابا کے لشکر میں جو ٹھٹھہ کو گھیرے ہوئے تھا لاکر اُس کے سپرد کر دیا۔ میر بابا[۲] نے حکم دیا کہ اُس کو لاہور کے راستہ دہلی لے جایا جائے۔

بدنصیب داراشکوہ دہلی میں | الغرض جب بدنصیب داراشکوہ دہلی کے قریب پہنچا تو

---

[۱] داراشکوہ کو جب دادر میں ملک جیون کے پاس جانے کا اتفاق ہوا تو اس کا بڑا سبب ایک یہ بھی تھا کہ جب داراشکوہ اس نزاع میں پہنچا تو ملک جیون کی اکثر عرضیاں اس کے پاس اظہار تابعداری وحقوق جان بخشی کی یاددہانی کے سلسلہ میں آئی تھیں۔ س م ع

[۲] اس سے پہلے حاشیہ میں لکھا جا چکا ہے کہ شیخ میر بابا جس کو مصنف جابجا میر بابا لکھتا ہے داراشکوہ کے مقابلہ میں بمقام اجمیر اس سے پہلے ہی مارا جا چکا تھا۔ س م ع

اورنگ زیب نے اپنے اہل دربار سے اس امر میں مشورہ کیا کہ قلعہ گوالیار میں بھیجنے سے پہلے اُسے تشہیر کرانا چاہیئے یا نہیں ؟ پس بعض کی تو رائے یہ تھی کہ ایسی حرکت مناسب نہیں ۔کیونکہ اول تو ایسا امر خاندانِ شاہی کی عزت کے برخلاف ہے ۔دوسرے اس میں شورش اور فساد کے ہوجانے کا احتمال ہے ۔اور کچھ تعجب نہیں کہ لوگ اُسے چھڑالیں ۔لیکن اکثر کی یہ رائے ہوئی کہ نہیں ضرور تشہیر کرانا چاہیئے تاکہ لوگوں کو خوف اور عبرت ہو اور اُن کے دل پر بادشاہ کی شوکت اور دبدبہ کا نقش ثبت ہو جائے ۔اور بعض اُمرا اور اور لوگوں کو جو اُس کے گرفتار ہو جانے کے باب میں اب تک شبہ ہے وہ رفع ہو جاتے اور اُس کے مخفی جانب داروں کی امیدیں بھی ٹوٹ جائیں ۔چنانچہ اورنگ زیب نے بھی اسی رائے کو مناسب جانا اور تشہیر کا حکم دیا پس یہ بدنصیب قیدی اور اُس کا بیٹا سپہر شکوہ دونوں ایک ہی ہاتھی پر برابر بٹھائے گئے اور جلاد کی جگہ بہادر خاں کو پیچھے بٹھایا گیا اور تشہیر کیا گیا[۱]۔

[۱] عالمگیر نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دارا شکوہ نے گجرات کو جاتے ہوئے ایسی کڑی منزلیں کی تھیں کہ آٹھ دن کے عرصہ میں احمد آباد کے قریب پہنچ گیا تھا ۔مگر چونکہ اُس کی شکست کی خبر سن لینے کی وجہ سے سردار خاں نامی ایک منصب دار نے اُس کے مقرر کئے ہوئے حاکم سید احمد بخاری کو گرفتار کر لیا اور مقابلہ کے لئے تیار ہو بیٹھا تو اُس کو بناچاری کا نہ جی نامی کولی سے جو بقول صاحب سیر المتاخرین رہزنوں کا سرغنہ اور احمد آباد کے نزدیک ہی کا رہنے والا تھا ملتجی ہونا پڑا۔ اور اُس نے یہ آدمیت کی کہ ساتھ ہو کر کچھ کے راجہ کے ملک میں پہنچا دیا۔ مگر وہاں کے راجہ نے جو پہلے اس قدر ملاطفت سے پیش آیا تھا کہ اپنی لڑکی بھی سپہر شکوہ سے منسوب کر دی تھی ایسی رُکھائی دکھائی کہ ملاقات تک کو نہ آیا اور فیروز خان میواتی بھی کھسک کر اورنگ زیب کے پاس چل دیا تو وہ صرف دو روز وہاں ٹھہر کر بھکر کی طرف چلا گیا اور دریائے سندھ سے اُتر کر ایک سرحدی رئیس کے علاقہ میں جس کو عالمگیر نامہ کے نسخہ مطبوعہ کلکتہ میں علی اختلاف النسخ " ولایت چاند خاں یا چاندیاں" لکھا ہے جا پہنچا جہاں کے لوگوں نے اس کو خوب لوٹا کھسوٹا اور پکڑ لینے کے درپے ہوئے لیکن ابھی اس کے پاس کچھ جمعیت باقی تھی اس نے لڑتا بھڑتا ایک اور سرحدی سردار کے علاقہ میں جس کو " ولایت ملکیاں " کے نام سے لکھا ہے جہاں سے قندھار دس بارہ منزل تھا جا داخل ہوا۔ اور " میرزائے ملکی " وہاں کا رئیس استقبال کر کے اپنے ہاں لے گیا۔ اور بہت خاطر داری کی ۔اور ساتھ ہو کر قندھار پہنچا دینے کا ذمہ دار ہوا۔ مگر دارا شکوہ نے بدقسمتی سے ملک جیون رئیس داور کو جو جیکب آباد سندھ کی چھاونی سے پرے مقام سیبی کے نزدیک درہ بولان کے راستہ پر

مگر یہ وہ سراندیپ یا پیگو کا ہاتھی نہ تھا جس پر دارا شکوہ ایک نہایت عمدہ اور زرق برق عماری میں سواری کیا کرتا تھا اور اس پر زرین جھول اور سونے کا ساز پڑا ہوا ہوتا تھا۔ بلکہ ایک نہایت ہی سڑیل اور میلا کچیلا جانور تھا اور نہ اُس کے گلے میں ابھی اب نہ وہ بڑے بڑے موتیوں کی مالا ہی تھی جو ہندوستان کے بادشاہ اور شاہزادے پہنا کرتے ہیں اور نہ وہ مکلف اور عمدہ پگڑی اور قبائے زربفت ہی بلکہ باپ بیٹا دونوں میلے اور موٹے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اور ایک کشمیری ادنیٰ کپڑے کا بہت حقیر سا عمامہ جو ادنیٰ درجہ کے لوگوں کے پہننے میں آتا ہے سر پر تھا۔ غرضکہ اس حال سے تمام شہر اور بازاروں میں پھرایا گیا۔ اور بار بار مجھ کو یہ وہم ہوتا تھا کہ غالباً اب یہاں کچھ کشت و خون ہو جائے گا۔ اور سخت متعجب تھا کہ ایسے شاہزادے کے لئے جس کو عوام الناس نہایت عزیز جانتے ہیں ایسی بے عزتی تجویز کرنے کی جرأت اہلِ دربار کو کیوں کر ہوئی۔ اور حفاظت کے لئے کچھ مسلح فوج ساتھ نہ دیکھ کر اور بھی تعجب ہوتا تھا خصوصاً اس حالت میں کہ اورنگ زیب کی ناشائستہ اور خلاف انسانیت حرکتوں سے سب لوگ کچھ عرصہ سے بالکل ناراض تھے۔ یعنی اول باپ اور بیٹے (محمد سلطان) اور پھر بھائی مراد بخش کو قید کر لینے کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں نہایت نفرت اور بیزاری پیدا ہو گئی تھی۔

یہ نامعقول تماشہ دیکھنے کے لئے ایک بھیڑ جمع ہو گئی تھی اور لوگ جابجا رو رہے تھے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ واقع ہے) جان بخشی کے احسانوں کا ممنون اور خیر خواہ سمجھ کر لکھ بھیجا تھا کہ میں چند روز تیرے ہاں ٹھہر کر آرام لوں گا اس لئے اُس نے ایوب نامی اپنے ایک معتمد کو اس کے لینے کو سرحد پر بھیج دیا۔ اور ایک کوس تک خود استقبال کر کے اپنے ہاں لے گیا۔ چنانچہ یہ اپنی بیگم کی نعش ساتھ لئے ہوئے جو سل کی بیماری سے مر گئی تھی۔ اُس کے گھر پہنچا اور چونکہ اُس نے وصیت کی تھی کہ مجھ کو میاں بدخشی کے مزار واقع لاہور میں جن کو دارا شکوہ اپنا پیر سمجھتا تھا دفن کرنا۔ ملک جیون کی وفاداری کے بھروسہ پر اپنے بہادر اور وفادار نوجوان سردار گل محمد اور معقول نامی خواجہ سرا اور اُن ستر جان نثار سواروں کو جو تمام فوج سے اب صرف وہی باقی رہ گئے تھے بیگم کی نعش کے ساتھ لاہور کو بھیج دیا۔ اور آپ صرف چند خدمتگاروں اور خواجہ سراؤں کو پاس رکھ کر قندھار جانے کے ارادہ سے وہاں ٹھیر گیا۔ مگر ملک جیون نے یہ پاجی پن کیا کہ اُسے [illegible] کو قندھار کی راہ میں گھیر کر گرفتار کر لیا اور بہادر خاں فوجدار بھکر اور بہادر خاں اور راجہ جے سنگھ کو جو اُس کے تعاقب میں بھکر کے قریب پہنچ گئے تھے لکھ بھیجا اور بہادر خاں نے ملک سندھ کی گرمی اور باد سموم کے باوجود ایلغار کرتے ہوئے دارا کو اُسے اپنی تحویل میں لے لیا اور اپنے اور جے سنگھ کے لشکر میں جو اس وقت بھکر کے قریب پہنچ گیا تھا۔ لے آیا۔ [illegible]

اور داراشکوہ کی بدقسمتی پر ترس کھا رہے تھے چنانچہ میں بھی شہر کے سب سے بڑے بازار میں ایک اچھے موقعہ پر معہ اپنے دو رفیقوں اور دو خدمتگاروں کے عمدہ گھوڑے پر چڑھا کھڑا تھا۔ اور ہر طرف سے رونے اور چلّانے کی آواز آرہی تھی۔ اور عورتیں اور مرد اور بچے اس طرح چلّا چلّا کر رو رہے تھے کہ گویا اُن پر کوئی بڑی ہی مصیبت پڑی ہے۔ اور جیون خاں گھوڑے پر سوار بدنصیب داراشکوہ کے برابر جاتا تھا اور چاروں طرف سے اُس پر گالیوں اور لعن طعن کی بوچھاڑیں پڑ رہی تھیں بلکہ کئی ایک فقیروں اور غریب آدمیوں نے تو اس پاجی پٹھان پر پتھر بھی پھینکے۔ لیکن پیارے اور عزیز شاہزادے کے چھڑا لینے کی کسی کو جرأت نہ ہوئی۔

داراشکوہ کا قتل

جب یہ نازیبا سواری شہر میں گشت کر چکی تو بیچارہ قیدی اُسی کے ایک باغ میں جس کا نام حیدرآباد[1] ہے قید کیا گیا۔ گو اس کی تشہیر کی ناشائستہ حرکات کا جو اثر عام خلائق کے دل پر ہوا اور لوگ جیون خاں پر جس قدر غضبناک ہوئے۔ اور اُس کو پتھر مار مار کر مار ڈالنا چاہا۔ اور شورش اور بلوائے عام ہو جانے کا اندیشہ ہوا وہ اورنگ زیب نے جلد سُن لیا۔ اور اس نے پھر ایک مجلس منعقد ہوئی۔ اور اس امر میں مشورہ ہوا کہ پہلی تجویز کے موافق گوالیار بھیج دینا چاہیے یا فوراً قتل کر ڈالنا بہتر ہے۔ پس بعض کی رائے تو تھی کہ قتل کی کوئی ایسی ضرورت نہیں۔ اور گوالیار بھیج دینے میں بشرطیکہ حفاظت کے لئے کافی جمعیت ساتھ ہو کوئی اندیشہ نہیں۔ چنانچہ دانشمند خاں نے باوجود اُس نااتفاقی کے جو داراشکوہ کے ساتھ پہلی آتی تھی بڑے اصرار اور بہت سے دلائل کے ساتھ اُس کے گوالیار بھیج دینے ہی پر زور دیا۔ مگر آخرکار اتفاق رائے اسی پر ہوا کہ اس کو قتل کیا جائے اور سپہر شکوہ کو گوالیار

---

[1] صحیح نام خضرآباد ہے۔ یہ جگہ دہلی اور آگرہ کی درمیانی شاہراہ پر واقع تھی۔ کتاب آثارالصنادید مصنفہ سید احمد خاں بہادر سی۔ ایس۔ آئی اور آرکیولاجی آف دہلی مصنفہ مسٹر کار سٹیفن صاحب بہادر سے جو اُس کے بعد لکھی گئی ہے اصلیت اس کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ خضر خاں سید بادشاہ دہلی نے جو ۱۴۱۴ء تا ۱۴۲۱ء تک بادشاہ رہا تھا اُس جگہ سے جہاں ہمایوں کا مقبرہ ہے۔ قریب دو میل جنوب مشرق کی طرف جمنا کے کنارے اس نام کا ایک شہر آباد کرنا چاہا تھا۔ مگر اب اس کا کوئی نشان بجز ایک ٹوٹے ہوئے مقبرہ کے جو عوام میں "خضر کی گمٹی" کے نام سے مشہور ہے باقی نہیں ہے۔ م ا م ج

بھیج دیا جائے۔ اس موقعہ پر روشن آرا بیگم نے بھی وہ دلی عداوت جو اُس کو اپنے اس بے بس بھائی تھی۔ نہایت شدت سے ظاہر کی۔ چنانچہ دانشمند خاں کی رائے کو برابر رد کرتی اور اورنگ زیب کو اس بے رحمانہ اور خلاف انسانیت قتل کے لئے اُبھارتی رہی اور خلیل اللہ خاں اور شائستہ خاں جو دونوں داراشکوہ کے قدیمی دشمن تھے یہ بھی اُسی کی رائے کی تائید کرتے تھے اور تقرب خاں جس کا نام حکیم داؤد تھا اور کسی الزام کی وجہ سے ایران سے بھاگ کر یہاں آگیا تھا۔ اور جو ابتدا میں صرف ایک طبیب تھا اور اُمرا کے دسترخوانوں پر خوشامدی ٹکڑے کھایا کرتا تھا اور تھوڑے ہی دنوں سے امارت کے درجہ کو پہنچا تھا۔ پوری طرح ان کا ہم داستان تھا۔ چنانچہ اس نے اس مجلس میں سب سے بڑھ کر سخت زبانی کی اور بڑے دعوے کے ساتھ یہ الفاظ منہ سے نکالے کہ

"داراشکوہ کو زندہ چھوڑنا ہرگز مناسب نہیں اور سلطنت کی سلامتی اور حفاظت اسی میں ہے کہ فوراً گردن ماردی جائے اور مجھے تو اُس کے قتل کی صلاح دینے میں ذرا بھی تامل نہیں کیونکہ وہ علانیہ بے دین اور کافر اور مرتد ہے۔ اور اگر ایسے شخص کے قتل سے کچھ گناہ عائد ہو تو میری گردن پر"

چنانچہ انتقام الٰہی ملاحظہ کیجئے کہ جیسا اس کے منہ سے نکلا تھا فی الواقع ویسا ہی ہوا یعنی یہ خون ناحق اسی کے سر پڑا اور جلد بے عزت اور ذلیل ہو کر آخرکار بڑے عذاب سے مارا گیا۔[1]

القصہ اس ناشائستہ اور نہایت بے رحمانہ قتل کے لئے نذیر[2] نامی ایک غلام جو

---

[1] کتاب عمل صالح میں لکھا ہے کہ حکیم داؤد ابن حکیم عنایت اللہ شاہ عباس صفوی بادشاہ ایران کا طبیب خاص اور اس کا مقرب تھا۔ مگر جب شاہ کا انتقال ہو گیا تو کچھ دنوں خانہ نشین رہ کر مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کو چلا گیا اور پھر وہاں سے لاہری بندر واقعہ ملک سندھ کی راہ سے شاہجہاں کے سترھویں سال جلوس مطابق ۱۰۵۳ھ ہجری میں یہاں چلا آیا۔ فن طبابت میں کامل ہونے کی وجہ سے رفتہ رفتہ یہاں تک تقرب حاصل کیا کہ پنج ہزاری کا منصب اور تقرب خاں کا خطاب پایا۔ مگر اس کے بے عزت اور ذلیل ہو کر قتل ہونے کا حال جیسا کہ مصنف نے متن میں لکھا ہے باوصف تلاش ہم کو کسی کتاب میں نہیں ملا۔ س۔م۔ح

[2] فارسی کتابوں میں نذیر بیگ چیلہ لکھا ہے۔ اور واضح ہو کہ شہنشاہ اکبر نے اپنے عہد میں کئی ہزار

شاہجہاں کا پروردہ اور کسی بدسلوکی کے باعث داراشکوہ سے رنجیدہ تھا مقرر ہوا۔ چنانچہ زہر دینے کے اندیشہ سے وہ اور سپہر شکوہ اپنے ہاتھ سے بیٹھے دال پکا رہے تھے کہ یکایک یہ چار اور بدذاتوں کو ساتھ لئے ہوئے پہنچا جنہیں دیکھکر داراشکوہ نے سپہر شکوہ کو پکار کر کہا کہ لو بیٹا! "ہمارے قاتل آپہنچے" اور یہ کہکر اُس نے باورچی خانے کی ایک چھوٹی سی چھری اُٹھالی کیونکہ کوئی اور ہتھیار پاس نہ تھا۔ مگر ان جلادوں میں سے ایک نے تو سپہر شکوہ کو قابو کر لیا اور باقی اس کو لپٹ گئے اور زمین پر گرا کر تین نے پکڑے رکھا اور نذیر نے سر کاٹ لیا! اور فوراً اورنگ زیب کے پاس لے گیا: اور اُس نے ایک طشت میں رکھوا کر چہرہ کا خون دھلوایا! اور جب دیکھ لیا کہ حقیقت میں اُسی کا سر ہے تو آنکھوں سے آنسو نکال کر بولا۔ "اے بدبخت" اور پھر کہا کہ اچھا اس دردانگیز صورت کو میرے سامنے سے جلد لے جاکر ہمایوں کے مقبرہ میں دفن کر دو۔ اب داراشکوہ کے کنبہ کا حال سُنئے کہ اُس کی بیٹی تو اسی رات کو محل میں بھیج دی گئی جو کچھ دنوں بعد شاہجہاں اور بیگم صاحب کی التجا سے اُن کے سپرد کر دی گئی۔ اور اُس کی بیگم نے پہلے ہی یہ سوچ کر کہ ہم پر کیسی آفتیں پڑنے والی ہیں راستہ ہی میں بمقام لاہور اپنی زندگی کا خاتمہ زہر سے کر لیا تھا، رہا سپہر شکوہ سو اُسے گوالیار کے قلعہ میں بھیج دیا گیا[۱]

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ غلاموں کو جن کو "بندہ ہائے پادشاہی" کہا جاتا تھا آزاد کر کے چیلہ کا لقب دیدیا تھا اور اُس کا قول تھا کہ خدا کے بندوں کو اپنا بندہ کہنا مناسب و شایاں نہیں ہے۔ اور غالبًا لفظ چیلہ اس لئے اختیار کیا گیا ہوگا کہ اس زمانہ میں ان بادشاہوں کو تحریر و تقریر میں اکثر پیرو مرشد کہا جاتا تھا۔ س م ح

[۱] داراشکوہ کی بیگم کا دادر کے قریب پہنچ کر سل کی بیماری۔ سے مرنا پہلے لکھا گیا ہے زہر کھا کر مرنا صحیح نہیں ہے اور اب داراشکوہ کی تشہیر اور قتل کا حال جس طرح عالمگیرنامہ اور سیرالمتاخرین میں لکھا ہے اُس کا اس جگہ تحریر کیا جانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مگر چونکہ عالمگیرنامہ کا بیان اس واقعہ کے جزئیات اور اورنگ زیب کے دلی خیالات کی نسبت کسی قدر رُکا رُکا ہے اس لئے سیرالمتاخرین کی عبارت جو واضح تر ہے اور جس کا بڑا ماخذ تاریخ خافی خان اور تاریخ مرآۃ العالم ہے جو اورنگ زیب کے ایک بڑے منصبدار بختاور خاں کی تصنیف ہے یہاں بعینہ نقل کی جانی زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے وھو ہذا۔ "ہمدریں ایام بہادر خاں کہ داراشکوہ را با سپہر شکوہ از بختیار خاں دملک جیون گرفتہ مقید بسلاسل بآئین ناسزا حسب الامر آقا می آمد نظامِ

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ: دارالخلافہ رسید نذیر بیگ چیلہ از فرط خوشی معین شد کہ پیش رفتہ دارا شکوہ را بحضور عالمگیری خواستہ دیدہ بیاید۔ شانزدہم ذی الحجہ چیلۂ مذکور برگشتہ دولت زمین بوس دریافت و حقیقت حال آں بیچارہ باز نمودہ باز مرخص شد و سہ شنبہ ہفتہ دہم ذی الحجہ حکم فرمود کہ دارا شکوہ را مسلسل با پسرش در حوضہ سرکشادہ بر مادہ فیل نشانیدہ بیارند و نذیر بیگ چیلہ در عقب فیل نشستہ باشد و بہادر خان فوج ہمراہ گشتہ داخل شہر سازند از میان شہر و بازار بہ دہلی کہنہ بہ خضرآباد رسانند و در جائے محفوظے در عمارات خواص پورہ آں کہ برائے بودنش قرار یافتہ نگاہدارند و بموجب حکم بہ عمل آمد۔ روز دوم کہ بختیار خاں داخل شہر شد بعضے از نوکران شاہجہاں آں تبہ کار را دیدہ از خود رفتند و بازاریان شہر نیز از عمل او نفرت نمودہ بشوریدند و بے اختیار بر سر او و افاغنۂ ہمراہش ریختہ بضرب چوب و سنگ گرفتند تا آنکہ چند کس از آں سیاہ رویاں از پائے در آمدند و برخے مجروح و خستہ و سر و گردن شکستہ گشتند و نزدیک بود کہ فتنۂ عظیمی بلند شود۔ کوتوال شہر با جمعیت خود رسیدہ آشوب را فرو نشاندہ بختیار را با ہمراہیانش بہ قلعہ رسانید پادشاہ حق پرست با معدلت کیش از علمائے مذہب خویش فتوی طلبید۔ علمائے سو حکم نمودند کہ خون چنیں ملحد کہ در رسائل نوشتہ خود کفر و اسلام را برادر توام خواندہ و گفتہ است "کفر و اسلام در رہش پویاں ؛ وحدہ لا شریک لہ گویاں"، و کسانیکہ خوبی او برخلاف رضائے خلیفہ خواہند درست است: بادشاہ دین پرور با حق شناس با استحکام اساس سلطنت خود در قتل آں بیچارہ سراسر پاس دیدہ حکم بقتل او۔ و دوست دارانش کہ بر سر بختیار خاں ریختہ بودند داد و دارا شکوہ آخر روز چہار شنبہ بست و یکم ذی الحجہ مطابق ہژدہم شہریور (آسوج) مقتول گشت و لاش او را بعد تشہیر در مقبرہ ہمایوں دفن کردند و سپہر شکوہ را بردہ در قلعہ گوالیار محبوس داشتند و بعضے از احدیان پادشاہی کہ بادی فتنہ و شورش بر بختیار خاں شدہ بودند در پیش گاہ عدالت رسیدہ حسب الامر علمائے دیندار از قید دنیائے ناپائیدار رہائی یافتند۔

اور عالمگیرنامہ میں یہ عبارت زیادہ لکھی ہے "آخر روز چہار شنبہ بست و یکم ماہ مذکور مطابق ہژدہم شہریور کہ ہماں روز قضیۂ او با شاں شہر رو دادہ بود فرمانِ قہرمانِ جلال صادر شد کہ آں خیم العاقبت (دارا شکوہ) را در خضرآباد از قید ہستی برآرند و باہتمام سیف خاں و نذیر جنگ چیلہ و چندے دیگر از چیلہ ہائے معتمد اوایلِ شب پنجشنبہ ۱۰۶۹ہجری چراغ زندگی او خاموش شدہ بہ نہاں خانۂ عدم شتافت و باشارۂ معلیٰ پیکر فتنہ سرشتِ پر شور و شرش را بمقبرۂ حضرت جنت آشیانی ہمایوں پادشاہ نقل کردہ در تہ خانہ کہ زیر گنبد مرقد آنحضرت است و شاہزادہ دانیال و شاہزادہ مراد پسران حضرت عرش آشیانی جلال الدین محمد اکبر آنجا مدفون اند دفن نمودند۔ و روز دیگر فرمان جہاں مطاع بنفاذ پیوست کہ سیف خاں سپہر شکوہ

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ را بقلعہ گوالیار رسانیدہ بجا رسانید آن حصن عالی اساس سپارد و بمستقر الخلافہ اکبرآباد معاودت نمودہ بہ صوبہ داری آنجا از تغیر مخلص خان کہ بہ بنگالہ تعین یافتہ بود قیام نماید بست و سوم ماہ بہ سنگھ کہ از بہادر خان درعقب ماندہ بود (جو معلوم ہوتا ہے کہ ایسے بدنامی کے موقعے سے دانستہ بچ جاتا تھا) جبہ سائے عتبہ سپہر آسا گشت و ملک جیون کہ قبل ازیں بہ منصب ہزاری دو صد سوار و خطاب بختیار خانی کامیاب عنایت شدہ بود باضافہ صد سوار و مرحمت خلعت و خنجر مرصع و اسپ عربی با زین و ساز مطلا و یک زنجیر فیل با ساز مینا کار مشمولِ مراحم گوناگون گردید و چوں حکم جلیل القدر از پیش گاہ معدلت بہ تحقیق منشائے فتنہ شور انگیزی او باشان شہر کہ نسبت با افغانان او روے نمودہ صادر شدہ بود بعد از تحقیق و تفحص بہ ثبوت پیوست کہ سیبت نام فتنہ جوئے از خیل احدیانِ پادشاہی بادے ایں جرأت و محرک سلسلہ فساد بودہ است لہذا شحنہ شہر او را گرفتہ بہ پیش گاہ عدالت حاضر ساختہ وازیں جہت کہ منشائے ایں قسم جسارتے شدہ باعث ہلاک جمعی از مسلمانان گشتہ بود مورد انظار قہر و عتاب بادشاہانہ گردیدہ حکم شد کہ او را بہ سیاسا رسانند۔

صاحب عالمگیرنامہ نے دارا شکوہ کی تشہیر کی وجہ تو اگرچہ صاف صاف لکھدی ہے کہ "تا ہمگی خلائق آن رمیدہ بخت را بے شائبہ شک و ریب برای العین مشاہدہ نمایند و من بعد از خایان بیہودہ گو و واقعہ طلبان فتنہ جو را جائے سخنان لاطائل و مجال تصورات باطل نماند و در حدود و اطراف مملکت اوباشان را بہانہ فساد و دستاویز شورش بہم نرسد و بموجب حکم جلالت اثر آن سیہ روز برگشتہ اختر را با بہرش بر یک حوضہ فیل نشانیدہ آشکارا براہ بازار داخل شہر کردند و از پائے قلعہ مبارکہ گذرانیدہ بنوعیکہ ہمہ کس دیدند و احدے را در وجود بے بود او شک و شبہ نماند بشہر کہنہ بردند۔"

مگر اس کتاب میں ہاتھی پر ڈال کر اس کی نعش کی تشہیر کا ذکر جس کو صاحب سیر المتاخرین نے بہت وضاحت سے اور بہ تکرار لکھا ہے تحریر نہیں کیا۔ اور تاریخ عمل صالح میں لکھا ہے کہ

"دارا شکوہ کو نیلا لباس پہنا کر دہلی میں داخل کیا گیا تھا۔ اور اُسی لباس سے دفن کیا گیا۔"

چونکہ اس شاہزادہ کی پیدائش ۱۰۲۴ھ کی تھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پینتالیس برس کی عمر میں قتل کیا گیا۔

س۔م۔ح

جیون خاں کا قتل

ان دردناک واقعات کے بعد جیون خاں فوراً حضور میں بلایا گیا اور اسے انعامات دے کر دہلی سے رخصت کیا گیا۔ لیکن یہ شخص بھی اپنی بدکرداری کا نتیجہ پائے بغیر نہ رہا۔ یعنی جب کہ وہ دہلی سے واپس ہو کر ایسی جگہ پہنچ گیا تھا کہ جہاں سے اُس کا علاقہ دس بارہ ہی کوس کے فاصلہ پر تھا تو چند آدمیوں نے جو پہلے سے ایک جنگل کے اندر گھات میں لگے ہوئے تھے اُسے مار ڈالا۔

افسوس! اس جنگلی شخص نے یہ نہ سوچا کہ اگرچہ ظالم لوگ اپنی مطلب براری کے لئے بڑے سے بڑے گناہوں کی نسبت کبھی بظاہر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا کرتے ہیں۔ لیکن دل میں اُس کے عمل میں لانے والوں سے سخت نفرت رکھتے ہیں اور جب مطلب نکل آتا ہے تو اُن کے اعمال کی سزا دینے میں کچھ بھی تامل نہیں کیا کرتے۔

داراشکوہ کے قتل سے کچھ عرصہ پہلے اُس سے اس بہادر اور وفادار خواجہ سرا کے نام جو اس کی طرف سے ٹھٹھہ میں لڑ رہا تھا جبراً اس مضمون کا ایک حکم نامہ حاصل کر لیا گیا تھا کہ فوراً قلعہ حوالہ کر دے۔ لیکن اس نے کچھ جلدی نہ کی بلکہ اس بات پر اڑا رہا کہ قلعہ کے خالی کرنے سے پہلے حفظ عزت وغیرہ کی چند معقول شرطیں دی جائیں۔ جن کو میر بابانے دغابازی اور بے ایمانی سے بلاقصد ایفا بہت خوشی سے قبول کر لیا اور شہر میں داخل ہو گیا مگر جب اپنے تھوڑے سے بہادر رفیقوں کے ساتھ یہ نمک حلال شخص لاہور میں آیا تو خلیل اللہ خاں نے جو اس وقت یہاں کا صوبہ دار تھا نہایت بُری طرح سے سب کو تہ تیغ کر ڈالا۔ اس ظالمانہ فعل کا سبب یہ تھا کہ اگرچہ بظاہر یہی کہتا تھا کہ ہم یہاں سے دہلی کو جائیں گے (کیونکہ اورنگ زیب اس کی شجاعت اور بہادری کی وجہ سے اسے دیکھنا چاہتا تھا) لیکن اصلی ارادہ یہ تھا کہ ہمراہیوں سمیت سری نگر پہنچ کر سلیمان شکوہ سے جا ملے۔ اس کے رفیقوں میں بہت سے اہل فرنگ بھی تھے جن کو معہ اپنے اور رفقا کے اُس نے بہت سے انعام واکرام دیئے تھے۔

سلیمان شکوہ کی گرفتاری

داراشکوہ کے خاندان میں اب صرف سلیمان شکوہ باقی رہ گیا تھا اور اگر راجہ کو اپنے وفائے عہد اور ایمان داری کا خیال ہوتا تو اُس کا سری نگر سے نکالنا آسان نہ تھا۔ لیکن جے سنگھ کے منصوبوں اور اورنگ زیب

کے وعدوں اور دھمکیوں اور دارا شکوہ کے قتل۔ اور قرب وجوار کے راجاؤں کی جنگی تیاریوں نے اس چھوٹے دل کے راجہ کو آخرکار توڑ دیا چنانچہ جب سلیمان شکوہ یہ دیکھکر کہ یہاں اب کچھ بھروسہ نہیں ہے باوجود اس کے کہ راستہ ایک ایسے بے ڈھب اور بے موقعہ ملک میں تھا جہاں سوائے ویران پہاڑوں کے کچھ نہ تھا تو تبت کی طرف چلے جانے کے قصد سے نکل بھاگا لیکن راجہ کے بیٹے نے پیچھا کرکے آن لیا اور زخمی کرکے گرفتار کر لیا۔ بعد میں اسے دہلی پہنچا دیا گیا۔ اور قلعہ سلیم گڑھ میں جہاں پہلے سے مراد بخش قید تھا قید کیا گیا[1] اور اورنگ زیب نے تصدیق کی غرض سے جس طرح دربار میں دارا شکوہ کا سر منگوایا تھا اُسی طرح اور اُسی غرض سے سلیمان شکوہ کے لئے حکم دیا کہ دربار کے وقت تمام امرا کی موجودگی میں پیش کیا جائے۔ چنانچہ میں بھی اس نازیبا تماشے کے دیکھنے کو گیا تھا اور جس شوق اور تعجب سے میں نے اُسے دیکھا اُس کا بیان کرنا دشوار ہے۔ یعنی دربار میں لانے سے پہلے بیڑی تو نکال دی گئی تھی لیکن ہتھکڑی جس پر سنہری ملمع کیا ہوا تھا بدستور موجود تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس سرو قد اور نہایت حسین وجمیل جوان کو دیکھکر اکثر اہل دربار کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے اور وہ بیگمیں بھی جن کو دیوار کی جالیوں میں سے دیکھ لینے کی اجازت دی گئی

---

[1] عالمگیر نامہ میں لکھا ہے کہ اگرچہ سلیمان شکوہ کا قابو میں آجانا بحسب ظاہر ایک امر مشکل تھا۔ لیکن بادشاہ کی خوش اقبالی سے یہ مشکل یوں حل ہو گئی کہ سری نگر کا راجہ اپنے ملک کی تباہی کے اندیشہ سے کیونکہ تربیت خاں۔ رعد انداز خاں وغیرہ کئی امیر اُس کی تسخیر کے لئے مامور تھے راجہ جے سنگھ کی معرفت سلیمان شکوہ کے سپرد کر دینے کا وعدہ کرکے معافی کا خواستگار ہوا اور بادشاہ نے سلیمان شکوہ کے لانے کے لئے جے سنگھ کے بیٹے کنور رام سنگھ کو سری نگر روانہ کر دیا۔ چنانچہ اُس نے رام سنگھ کے پہنچنے کی خبر سنکر سلیمان شکوہ کو گرفتار کر لینے کے لئے جہاں وہ رہتا تھا اپنے آدمی بھیج دے۔ شاہزادہ مقابلے سے پیش آیا اور اُس کا کوکہ محمد شاہ (جس کا نام بعض نسخوں میں محمد شاہ اور بعض میں محمد شاکر لکھا ہے) اور کئی اور رفیق خوب بہادری سے لڑ کر مارے گئے۔ اور وہ خود گرفتار ہو گیا۔ اور پانچویں جمادی الاولیٰ سنہ ۱۰۷۰ھ کو راجہ پرتھی سنگھ نے اپنے بیٹے میدنی سنگھ کے ساتھ رام سنگھ اور تربیت خاں اور رعد انداز خاں کے پاس پہاڑ سے نیچے بھیج دیا اس خبر کے آنے پر دربار میں بڑی خوشیاں منائی گئیں اور راجہ جے سنگھ کا بہت اعزاز واکرام ہوا اور جب مذکورہ بالا امرا اُس کو دہلی لے کر آئے تو شاہزادہ محمد سلطان کے پاس قلعہ سلیم گڑھ میں قید کیا گیا۔
مترجم

تھی بہت ہی غمگین ہوتیں۔ بلکہ اورنگ زیب نے بھی بھتیجے کی بدبختی پر افسوس کیا۔ اور ظاہرا شفقت سے بولا کہ

"خدا پر نظر رکھو اور مطمئن رہو کہ تم کو کچھ ضرر نہ پہنچے گا اور مہربانی کی جائے گی۔ اور تمھارا باپ تو صرف اس وجہ سے قتل ہوا ہے کہ وہ کافر اور لامذہب ہوگیا تھا۔"

اس پر شاہزادہ نے تسلیمات کی یعنی ہندوستان کی رسم کے موافق ادائے شکر کی علامت کے طور پر تابمقدور جھک کر اپنے دونوں ہاتھ سر تک لایا۔ اور اس کے بعد بڑے استقلال سے یہ عرض کیا کہ

"اگر حضور کا یہ منشا ہو کہ مجھے پوست پلائے جایا کریں تو بہتر ہے کہ ابھی قتل کرا دیا جاؤں۔"

جس کے جواب میں اورنگ زیب نے بطور مستحکم وعدہ کے پکار کر کہا کہ:-

"نہیں تم کو پوست ہرگز نہیں پلائے جائیں گے بالکل اطمینان رکھو۔"

جس پر اہل دربار کے کہنے سے اس نے دوبارہ تسلیمات کی۔ اور اس کے بعد جب بادشاہ کی خواہش کے موافق اُس ہاتھی کے معاملہ میں چند باتیں پوچھ لی گئیں جس پر اشرفیاں لدی ہوئی تھیں اور سری نگر جانے کے وقت اُس سے چھن گیا تھا تو اُس کو دیوان عام سے لے گئے اور اگلے روز گوالیار کو روانہ کر دیا۔

پوست پلانے کا راز "پوست" سے جس کا ذکر میں نے ابھی کیا یہ مراد ہے کہ خشخاش کے چھلکے کو پانی میں بھگو کر اور مل کر نچوڑ لیا جاتا ہے۔ اور ایک بڑا سا پیالہ بھر کر ہر روز نہار منہ اُن شہزادوں کو پلایا جاتا ہے۔ جو اس وجہ سے گوالیار کے قلعہ میں قید کیے جاتے ہیں کہ اُن کا علانیہ سر کٹوا دینا بادشاہ خلاف مصلحت جانتا ہے۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ تاوقتیکہ اُسے نہ پی لیں اُن کو کھانا نہیں دیا جاتا۔ چنانچہ یہ پوستوں کا عرق ان بیچارے قسمت کے مارے مظلوموں کو رفتہ رفتہ بالکل بگاڑ ڈالتا اور عقل و توانائی دونوں پر پانی پھیر دیتا ہے اور آخر کار گئے گذرے اور حواس باختہ ہو کر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ اس پوست کے پیالہ ہی سے سپہر شکوہ اور مراد بخش کے پوتے اور سلیمان شکوہ کو موت کا کڑوا گھونٹ پلایا گیا تھا[1]

[1] کتاب عمل صالح میں بھی سلیمان شکوہ کی وفات کی نسبت اسی مضمون مندرجہ متن کی تائید پائی جاتی

مراد بخش کا قتل

مراد بخش اگرچہ قید تھا لیکن لوگوں کو اُس سے اب بھی بہت محبت تھی۔ اور اُس کی شجاعت اور سپہ سالاری کی تعریف میں شعرا اکثر اشعار اور قصیدے کہا کرتے تھے اس لئے اورنگ زیب کی مصلحت ملکی کا یہ اقتضا ہوا کہ اس کی بھی علی الاعلان گردن ماری جائے تاکہ اُس کے کسی طرف دار کے دل میں یہ اُمید باقی نہ رہنے کہ ابھی وہ زندہ ہے۔ اور چونکہ پوست پلا پلاکر مخفی طور پر جان لے لینے سے یہ مدعا حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے یہ تدبیر نکالی گئی کہ کوئی الزام قائم کرکے اُس کی سزا کے طور پر علانیہ قتل کرا دیا جائے۔ اور یہ امر کچھ مشکل ہی نہ تھا کہ اس بدنصیب شاہزادہ کی نسبت کوئی الزام پیدا کر لیا یا گھڑ لیا جائے۔ چنانچہ ایک سیّد کے لڑکے رجن کے باپ کو اُس کے مال و دولت کے لالچ میں مراد نے احمد آباد میں اس وقت مروا ڈالا تھا جب کہ اس لڑائی کے لئے تیاریاں کر رہا تھا) دربار میں استغاثہ کو آن موجود ہوئے جو پکار پکار کر اور دُہائی دے دے کر انصاف مانگتے اور یہ عرض کرتے تھے کہ قصاص کے طور پر اُس کا سر کاٹا جاتے۔ اور کسی امیر میں یہ جرأت کہاں تھی کہ ان فریادیوں کو ہٹا سکے۔ کیونکہ ایک تو وہ بے گناہ مقتول سید اولاد رسول تھا جن کی لوگ بہت تعظیم کرتے ہیں۔ دوسرے ہر کسی کو معلوم تھا کہ انصاف کے پردہ میں رقیب کی ہلاکت کے لئے یہ ایک بادشاہی منصوبہ ہے۔ پس مقتول سیّد کے بیٹوں کا دعویٰ مسموع اور قبول ہوا اور بغیر کسی قسم کی کارروائی اور ضابطۂ عدالت کے فوراً حکم دیا گیا کہ قصاص میں قاتل کا

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ: ہے جس کی پیچ دار عبارت بعینہ یوں ہے کہ "درشہر شوال ۱۰۷۲ھ درسن سی سالگی سلطان سلیمان شکوہ نیز بسعی محافظان از مطمورۂ زندان بفراخ نائے عالم بقا انتقال نمودہ وباجل طبعی درگذشت متصل شاہزادہ مراد بخش مدفون شد" اور مآثر عالمگیری میں ذیل واقعات ۱۰۸۵ھ مطابق سنہ پندرہ جلوس عالمگیری سلطان مراد بخش کے بیٹے ایزد بخش کی نسبت لکھا ہے کہ گوالیار سے بلوا کر اورنگ زیب نے اپنی بیٹی مہر النسا بیگم کے ساتھ اُس کا عقد کیا اور محمد سلطان اور سپہر شکوہ کو کہ وہ بھی وہاں سے بلائے گئے تھے سلیم گڈھ میں رکھنے کا حکم ہوا اور اگلے برس محمد سلطان کا مراد بخش کی بیٹی دوست دار بانو بیگم اور سپہر شکوہ کا خود اورنگ زیب کی بیٹی بدر النسا بیگم سے نکاح کیا گیا اور محمد سلطان کا بارہ ہزار اور سپہر شکوہ کا چھ ہزار اور ایزد بخش کا چار ہزار روپیہ سالانہ گذارہ مقرر ہوا پس جب کہ مراد بخش کے بیٹے ہی کی جان بخشی ہو کر خود اورنگ زیب کی بیٹی سے اُس کا عقد ہو چکا تھا تو پوتے کی نسبت کسی زیادہ بدسلوکی کا گمان جیسا کہ ڈاکٹر برنیر نے کیا ہے درست نہیں ہو سکتا۔ بلکہ کسی کتاب میں میری نظر سے گذرا ہے کہ یہ لڑکا اپنی طبعی موت سے مرا تھا۔ س م ح

سر کاٹا جاتے اور سنفیث یہ حکم لے کر گوالیار چلتے ہوتے[1]

سلطان شجاع کا فرار

اب یہ درد بھری کہانی خاتمہ کے قریب آپہنچی ہے۔ کیونکہ خاندان شاہی میں سے اب صرف سلطان شجاع ہی ایک ایسا شخص باقی رہ گیا تھا جو اورنگ زیب کو وحشت اور فکر میں ڈالے رکھتا تھا۔ اور اب تک بڑی ہمت اور جواں مردی دکھا رہا تھا۔ مگر اب اُس نے بھی دیکھ لیا کہ اورنگ زیب کی طاقت اور اقبال کا مقابلہ ناممکن ہے۔ کیونکہ میر جملہ کے پاس برابر کمک پہنچتی رہتی تھی اور اُس کی فوجوں نے شجاع کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ پس جان بچانے کی خاطر ڈھاکہ کو بھاگ گیا جو سمندر کے کنارے بنگالہ کا سب سے اخیر شہر ہے۔ اب یہاں اُس کے پاس نہ تو کوئی جہاز ہی تھا کہ سمندر پار چلا جائے اور نہ یہ جانتا تھا کہ پناہ کی خاطر کس طرف جائے۔ اس لئے اُس نے اپنے بڑے بیٹے سلطان باقی[2] ملک اراکان[3] د جسے

---

[1] کتاب عمل صالح میں لکھا ہے کہ "پسران علی نقی را کہ مدعی خون پدر بودند ہمراہ خواجہ بہلول بہ گوالیار فرستادہ امر فرمودند کہ بعد از ثبوت شرعی مراد بخش را بقصاص رسانند۔ چوں مدعیاں درآنجا رسیدہ بحضور قاضی گوالیار گفتگو آغاز نہادند شاہزادہ مہیب گشتہ برزبان آورد کہ اگر حضرت خلافت مرتبت پاس عہود و وفائے موعود در نظر داشتہ از خون این مراد می گذشتند نقصانے بدولت و سلطنت راہ نداشت۔ اگر خواہ نخواہ توجہ اشرف مصروف برین ست کہ وجود بے بود این ضعیف درمیاں نباشد مواجہ باین قسم مردم کم مایہ چہ لطف دارد۔ ہر چہ می خواہند بکنند آنگاہ باشارہ قاضی آخر روز چہارشنبہ بست و یکم ربیع الثانی سنہ ۱۰۷۲ھ دو نفر چیلہ بہ دو زخم شمشیر آن شاہزادہ رفیع الشان را از ننگنائے ساحت زندان نجات دادہ جسدش را بقلعہ گوالیار بخاک سپردند" واضح ہو کہ سید علی نقی دیوان گجرات کے قتل کا حال ہم ایک حاشیہ میں مفصل لکھ آئے ہیں۔

[2] سیر المتاخرین میں اس کے بیٹوں کے نام زین الدین و بلند اختر و زین العابدین لکھے ہیں۔ غالباً یہ نام اُس کے بڑے بیٹے زین الدین کا اسم ثانی یعنی عرف ہوگا۔ کیونکہ فارسی تاریخوں سے ظاہر ہے کہ شاہزادہ زین الدین ہی نے اراکان کے راجہ سے پناہ لینے کا بندوبست کیا تھا۔ اور اصل کتاب انگریزی میں اس نام کو جس ہجے سے لکھا ہے اُس کو یا تو باقی پڑھ سکتے ہیں یا بانکے اور کچھ تعجب نہیں ہے کہ وہ سلطان باقی کے دعائیہ نام یا مرزا بانکے کے لاڈلے لقب سے مشہور ہو۔ س م ح

[3] چونکہ فارسی مورخوں نے اس ملک کا نام رخنگ لکھا ہے اور انگریز اراکان کہتے ہیں اس وجہ سے یہ بات تحقیق طلب تھی کہ لفظ اراکان کو بگاڑ کر اُنھوں نے رخنگ بنا لیا تھا یا انگریزوں نے رخنگ کو اراکان بنا دیا

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ ۔ اس لئے صاحب کمشنر بہادر اراکان سے اس کے صحیح کردینے کی استدعا کی گئی تھی۔ ہم نہایت ممنون ہیں مسٹر جی ڈی برجس صاحب کمشنر اراکان کے کہ انھوں نے محض براہِ اخلاق و علم دوستی نہایت ہی عمدہ اور محققانہ جواب بھیجا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

"اس ملک کا نام اراکانیوں کے تلفظ کے موافق دراصل راکینگ ہے اور برہما والے اس کو حرف رے کی جگہ یے کے ساتھ یاکینگ کہتے ہیں۔ اور لفظ اراکان انگریزوں کا اختراع ہے۔ اور سر آرتھر فیر نے اپنے مسودۂ تاریخ اراکان مطبوعہ ۱۸۴۴ء میں اور اپنی تاریخ برما مطبوعہ ۱۸۸۳ء کے پانچویں باب میں لفظ راکینگ کی نسبت یہ لکھا ہے کہ یہ لفظ راکینگ (یعنی راکھس کا بگڑا ہوا معلوم ہوتا ہے جو پالی زبان کے لفظ یاکھا سے نکلا ہے جس کے معنی ایسے آدم خور دیو کے ہیں جو نصف حیوان اور نصف انسان ہوں اور جس زمانہ میں بدھ مذہب کے واعظ ہندوستان سے اس ملک میں پہنچے تو انھوں نے اس ملک کا نام یاکھ پورہ (یعنی راکھس پورہ) رکھدیا۔ یا تو اسی وجہ سے کہ انھوں نے وہاں پہنچ کر یہ روایتیں سنی ہوں گی کہ قدیم زمانہ میں ایسے دیو سیرت لوگ وہاں رہتے تھے جو ملک کو تباہ اور برباد کرتے تھے یا اس وجہ سے کہ انھوں نے میام ما قوم کے لوگوں کو بھوتوں اور دیووں کی پرستش کرتے دیکھا ہوگا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ آدم خور دیووں کے وجود کی نسبت یہ روایتیں اس طرح پیدا ہوئی ہوں کہ جب میام ما قوم کے لوگ اراکان میں پہلے پہل داخل ہوئے تو اس وقت اس ملک کے وحشی خصال باشندوں کی عادتوں کی نسبت انھوں نے مبالغہ آمیز باتیں سنی ہوں۔" سر آرتھر فیر صاحب کے ان اقوال کو نقل کر کے مسٹر برجس بطور اپنی رائے کے یہ لکھتے ہیں کہ "اس ملک کے نام راکھینگ کو لفظ راکھشا یا۔ یاکھش سے مشتق سمجھنا ایک قیاسی بات ہے۔ اور اراکان کے باشندوں سے جو تحقیق کیا گیا تو کوئی شخص قابل اطمینان جواب نہیں دے سکا اور حقیقت یہ ہے کہ مرور زمانہ کے باعث اس کے اشتقاق کی اصلیت محو اور فراموش ہوگئی ہے۔"

پس ظاہر ہے کہ لفظ رخنگ درست اور اصلیت کے قریب تھا اور جس طرح انگریزوں نے اس کے ہمسایہ ملک کا نام صحیح لفظ میام ما یا مرم ما کی جگہ برہما بنالیا ہے اسی طرح کا یہ بھی ایک تصرف ہے جو غیر ملک کے لوگ اکثر کرلیا کرتے ہیں۔ بہرتقدیر یہ ملک ۱۷۸۳ء تک خودسر اور آزاد تھا۔ مگر سنہ مذکور میں برہما والوں (یعنی آوا اور پیگو کے بادشاہ) نے اس کو فتح کر کے اپنی قلم رو میں شامل کرلیا تھا۔ اور مارچ ۱۸۲۴ء میں سرکار انگریزی نے جو برہما والوں کی زیادتیوں سے تنگ آگئی تھی اراکان پر پہلی دفعہ فوج کشی کی تو چوبیسویں فروری

بت پرستوں کا ملک بھی کہتے ہیں) اس درخواست سے روانہ کیا کہ اگر تم چند روز ہمیں پناہ دے سکو تو ہم تمھارے پاس آ جائیں۔ اور جب ہوائے موافق کے چلنے کا موسم آ جائے تو مکا تک پہنچ جانے کے لئے ایک جہاز بہم پہنچا دو تاکہ ہم اول مکہ اور پھر وہاں سے روم یا ایران کو چلے جائیں۔ راجہ نے یہ درخواست قبول کی اور بہت مہربانی سے پیش آیا۔ چنانچہ سلطان باقی بہت سی کشتیاں (جن کے ملاح اہل فرنگ یعنی گوا وغیرہ سے بھاگے ہوئے وہ پرتگیز اور آوارہ گرد عیسائی تھے جنھوں نے اس راجہ کی نوکری کر لی تھی اور جن کا بڑا پیشہ بنگالہ کے اُن ضلعوں کو لوٹتے رہنا تھا جو ڈھاکہ اور اراکان کی جانب سمندر کے قریب ہیں) ساتھ لے کر واپس آیا۔ اور شجاع اپنی بیگم[1] اور تینوں بیٹوں اور بیٹیوں کے ساتھ اُن پر سوار ہو کر اراکان کو چلا گیا۔ اور راجہ نے اگرچہ اُس کی خاطر تواضع کچھ بہت بڑھ کر تو نہ کی مگر ضرورت کی معمولی چیزیں مہیا و موجود کرا دیں۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ: ۱۸۲۶ء کے صلح نامہ کی رو سے سرکار ممدوح کے قبضہ میں آ گیا۔ اور اب تو نہ صرف اراکان بلکہ اس سے آگے شاہ برہما کا بھی کل ملک جو باشندوں کی اوضاع و اطوار اور آب و ہوا کی خاصیت کے لحاظ سے تقریباً ایک ہی طور کی سرزمین ہے۔ (معہ ملک مفتوحہ سابق و مفتوحہ سال حال ۱۸۸۵ء) چین کی حد تک گورنمنٹ انگریزی کی حکومت میں صاحب چیف کمشنر برہما کے ماتحت ہے سلطنت مغلیہ کے مورخوں نے اراکان کو "ذلیل ترین معمورہ ہائے عالم" اور ایک "قطعہ جہنم" لکھا ہے اور وہاں کے لوگوں کو نہایت ہی وحشی اور حیوانوں سے بدتر اور ملک کو "مسکن دام و دد" بتایا ہے اور اس کے واسطے میں اُن کے نزدیک فن جہازرانی کی ناواقفیت کے باعث "لجہ ہائے خونخوار" حائل تھے مگر انگریزوں کی عقل و دانش اور حسن انتظام سے وہی وحشی انسان بنتے جاتے ہیں۔ اور وہی قطعہ جہنم ایک سرسبز و شاداب اور بہت زرخیز علاقہ ہے۔ اور اس شہر میں اکیاب وغیرہ بعض مقامات نہایت عمدہ تجارت گاہ ہیں۔ س م ح

[1] عالمگیر نامہ اور ماثر عالمگیری وغیرہ سے شجاع کی بیگم یا بیٹیوں کا ساتھ جانا ثابت نہیں ہوتا بلکہ عام طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ٹانڈہ سے بھاگنے کے وقت جس کو راج محل کے بعد اُس نے اپنا جائے قیام بنایا تھا اُس کے محل کی عورتیں اور مستورات وہیں رہ گئی تھیں۔ جن کو میر جملہ نے بڑی احتیاط اور احترام کے ساتھ شجاع کے خزانہ اور جواہرخانہ اور مال و اسباب سمیت اخلاص خاں نامی ایک سردار کی حفاظت میں اورنگ زیب کے پاس بھیج دیا تھا۔ لیکن تعجب نہیں کہ اپنی خاص بیگم اور بیٹیوں کو وہ ساتھ لے گیا اور وہ عورتیں جن کا ذکر کتب مذکورہ میں کیا گیا ہے اُس کی خواصیں وغیرہ ہوں۔ س م ح

شجاع کا حسرتناک انجام

اب یہاں اگرچہ کئی مہینے گذرے اور ہوا ئے موافق کا موسم بھی آگیا مگر مخا جانے کے لئے جہاز بہم پہنچا دینے کا کسی نے ذکر تک نہ کیا۔ حالانکہ شجاع صرف اتنی بات کا خواستگار تھا کہ ایک جہاز کرایہ پر مل جائے کیونکہ اُس کے پاس زر و جواہر کافی موجود تھے۔ بلکہ غالباً اُس کی ہلاکت کا بڑا باعث یہ دولت ہی ہوئی۔

اصل یہ ہے کہ یہ وحشی بادشاہ اور راجہ بھی مروت اور فیاضی کو جانتے ہی نہیں اور اپنے وعدوں کی پابندی اور ایفا کا شاذ و نادر ہی خیال کرتے ہیں بلکہ اپنی غرض کو مقدم سمجھ کر اُسی کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ اور اس شیطنت اور قساوت کے نتیجوں کی طرف سے جو اکثر خود انھیں کو بھگتنے پڑتے ہیں مطلقاً بے پروا نظر آتے ہیں۔ اور اُن کے ہاتھ سے یا تو مفلسی بچا سکتی ہے۔ یا اس قدر زور جو اُن کی طاقت سے زیادہ ہو۔

غرض شجاع کی طرف سے مخا جانے کے لئے بڑی التجائیں ہوتیں۔ لیکن یہ جنگلی راجہ قطعاً ملتفت نہ ہوا بلکہ یہاں تک بے مروت اور گستاخ ہو گیا کہ شہزادہ کی نسبت عتاب ظاہر کیا کہ اب تک ہم سے ملنے کو کیوں نہیں آیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ شجاع نے کسر شان کے خیال سے اس بُت پرست سے ملاقات نہیں کی تھی یا اس خوف سے اُس کے مکان پر نہیں گیا تھا کہ مبادا گرفتار کر لے اور سب مال و اسباب لوٹ لے۔ اسی اثنا میں راجہ کو پھر حملہ نے بھی شجاع کے پکڑ کر حوالہ کر دینے کی شرط پر اورنگ زیب کی طرف سے بہت سے فائدوں او زر کثیر کے حاصل ہونے کی طمع دلا دی تھی۔ بہرحال راجہ کی خفگی رفع کرنے کو اگرچہ سلطان شجاع خود اب بھی اُس کے مکان پر نہ گیا۔ مگر سلطان باقی کو بھیج دیا۔

کہتے ہیں کہ جب یہ شہزادہ راجہ کے محل کے قریب پہنچا تو سواری پر سے غریب غربا کی طرف بہت سے روپے اور اشرفیاں[1] پھینکیں۔ اور جب راجہ کے پاس پہنچا تو بہت سے زر لفت

---

[1] اب سے پچاس برس پہلے تک ہندوستان میں یہ عموماً رواج تھا کہ امرا کی سواری کے وقت روپیہ اشرفی وغیرہ لٹایا کرتے تھے اور اس رسم کا یہاں تک رواج تھا کہ وہ فرانسیسی افسر جو اب سے اسی برس پہلے مرہٹوں کی طرف سے ہمارے اس ملک میں براہ تبلیغ آئے تھے اظہار امارت و شان و شوکت کے لئے وہ بھی اپنے ہاتھی پر سے کچھ روپیہ اشرفی اور سونے کی تھیں لٹاتے تھے بلکہ ریاست حیدرآباد دکن جس میں ہندوستانی درباروں کی پرانی رسمیں اب تک بھی بہت کچھ زندہ ہیں جلوسی سواریوں کے موقعہ پر وہاں اب بھی یہ رسم کچھ کچھ جاری ہے۔ س م ح

وغیرہ کے تھان اور مرصع زیور پیش کش کئے اور اپنے باپ کے بذات خود حاضر نہ ہونے کی نسبت یہ عذر کیا کہ وہ علیل ہیں۔ اور بڑی التجا سے درخواست کی کہ وہ جہاز جس کے بہم پہنچا دینے کے لئے اتنے دنوں سے وعدے ہوتے رہے ہیں بہت جلد عنایت ہو۔ مگر اس ملاقات سے بھی کچھ فائدہ نہ ہوا اور پہلی درخواستوں کی طرح یہ درخواست بھی بیکار گئی اور اس وحشی نے اپنا وعدہ مطلق وفا نہ کیا بلکہ اس عالی منزلت پناہ گزیں کی پریشانی اور رنج بڑھانے کے لئے اس سے پانچ ہی چھ روز بعد صاف صاف یہ پیغام بھیجا کہ اپنی بیٹی کی شادی ہم سے کردو۔ اور شجاع کے اس سے انکار کرنے پر ایسا غضب ناک ہوا کہ شاہزادہ کی حالت نہایت پُرخطر ہوگئی۔ اب ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا گویا ہلاکت کا منتظر رہنا تھا اور سفر کا موسم گذرا جاتا تھا اس لئے کوئی نہ کوئی آخری بات قرار دینی ضروری تھی پس اُس نے ایک ایسی تدبیر سوچی جس سے فضول تر کوئی حرکت نہ تھی اور جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس کی ناامیدی کس حالت کو پہنچ گئی تھی اور وہ یہ ہے کہ اگرچہ اراکان کا راجہ بُت پرست ہے لیکن مسلمان بھی وہاں بہتیرے ہیں جو یا تو بخوشی آن بسے ہیں یا وہ پرتگیز جن کا ذکر پہلے آچکا ہے اور جو سمندر کے کناروں کے ضلعوں میں لوٹ مار کیا کرتے ہیں اُن کو پکڑ کر اور غلام بنا کر یہاں لے آتے ہیں۔ پس شجاع نے اُن کو گانٹھ لیا اور اُن کو اپنے دو تین سو آدمیوں کو جو بنگالہ سے ساتھ آئے تھے ملا کر اس تھوڑی سی جمعیت کے ساتھ یہ مصمم ارادہ کر لیا کہ یکایک راجہ کے محل پر حملہ کرکے اُس کو اور اُس کے خاندان کو تہ تیغ کر ڈالے اور خود فرمان روا بن جائیے۔ یہ جسارت اگرچہ احتیاط کے خلاف اور ایک متہورانہ حرکت تھی۔ لیکن میں نے بعض پرتگیزوں اور مسلمانوں اور ڈچوں سے جو خاص وہاں موجود تھے سُنا ہے کہ اِس تدبیر کی کامیابی چنداں محال اور امکان سے خالی نہ تھی مگر اس منصوبہ کے عمل میں لانے کے لئے جو دن مقرر ہوا تھا اُس سے ایک روز پہلے یہ راز افشا ہوگیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کے رہے سہے کام ہی نہیں بگڑے

لہ عالمگیر نامہ اور ماثر عالمگیری اور سیر المتاخرین سے تو بالاتفاق یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس مصیبت کے وقت میں اُس کے رفیقوں اور نوکروں میں سے سوائے سید عالم بارہ اول اور سید قلی اُزبک کے جن کے ساتھ سادات بارہ میں سے شماری دس سید اور بارہ مغل تھے اور چند اور سپاہیوں اور خدمت گاروں وغیرہ کے سوے چالیس آدمی بھی بنگالہ سے اُس کے ہمراہ نہ آئے تھے۔ س م ح۔

بلکہ سارا کنبہ ہی ہلاک ہوگیا۔ چنانچہ اس راز کے کھل جانے پر اُس نے چاہا کہ پیگو کو بھاگ جائے لیکن اس ارادہ کا عمل میں لایا جانا قریب ناممکن تھا کیونکہ راہ میں ایسے سخت پہاڑ اور دشوار گذار جنگل اور بن حائل تھے کہ اُن میں سے ہو کر کوئی ایسا رستہ بھی ہوا ہی نہیں جس سے مسافر آتے جاتے رہے ہوں غرض کہ تعاقب کیا گیا اور بھاگنے سے آٹھ پہر بعد لوگوں نے اُسے جالیا اور جیسی کہ اس اسم بامسمّٰی شجاع شاہزادہ سے توقع ہونی چاہیئے یہ ویسی ہی شجاعت سے لڑا اور بہت سے وحشی خاص اُس کی تلوار سے قتل ہوئے۔ مگر آخرکار دشمنوں کے ہجوم سے جو پیچھے سے لگاتار آتے جاتے تھے مغلوب ہوکر ایسی لڑائی سے جو کسی طرح بھی برابر کی نہ تھی دست بردار ہوگیا۔

سلطان باقی جو باپ سے ذرا پیچھے رہ گیا تھا وہ بھی ویسا ہی لڑا جیسے کہ بہادر لڑا کرتے ہیں لیکن دشمنوں نے چاروں طرف سے اس قدر پتھر مارے کہ تمام بدن چور چور اور لہولہان ہوگیا۔ اور آخر یہ جنگلی اُسے اور اُس کی والدہ اور دونوں چھوٹے بھائیوں اور بہنوں کو پکڑ کرلے گئے۔

شجاع کی موت و حیات کی نسبت مختلف روایتیں

اب اس سے آگے اُس کی بابت کوئی ایسی ٹھیک بات جو زیادہ بھروسہ کے لایق ہو معلوم نہیں ہے۔ کیونکہ کچھ لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ وہ میدانِ جنگ سے نکل کر ایک پہاڑ کی چوٹی پر جا چڑھا تھا اور اُس کے ہمراہ ایک خواجہ سرا اور ایک عورت اور دو شخص اور تھے۔ اور سر میں پتھر کا ایک ایسا زخم لگا ہوا تھا کہ وہاں پہنچ کر گر پڑا مگر جب اس زخم کو اُس خواجہ سرا نے اپنی پگڑی سے باندھ دیا تو اُٹھکر جنگل میں جا گھسا۔

اس کے علاوہ چار روایتیں اور سُنی ہیں اور اگرچہ اُن لوگوں کی زبانی ہیں جو عین موقعہ پر موجود تھے۔ مگر باوجود اس کے ایک دوسری سے نہیں ملتی۔ چنانچہ بعض لوگوں نے مجھے اس امر کا یقین دلایا کہ اُس کی لاش مُردوں میں ملی تھی۔ لیکن صورت پہچانی مشکل تھی اور ڈچوں کے کارخانے کے ایک افسر اعلیٰ کی چٹھی میں تے بچشم خود دیکھی ہے اُس میں بھی یوں ہی لکھا تھا۔ لیکن پھر بھی جیسا کہ چاہیئے یقینی بات کوئی نہیں ہے۔ اور اسی وجہ سے دہلی میں کتنی بار ایسی افواہیں اُڑتی رہیں کہ جن سے خواہ مخواہ لوگوں

کے کان کھڑے ہو گئے[1]۔ چنانچہ ایک بار تو یہ غل ہوا کہ شجاع مچھلی پٹن پہنچ گیا ہے اور گولکنڈا اور بیجاپور کے بادشاہوں نے اُس سے یہ عہد اور اقرار کرلیا ہے کہ اپنی اپنی تمام فوج سے آپ کی مدد کریں گے اور پھر بڑے وثوق سے یہ خبر مشہور ہوئی کہ وہ دو جہازوں پر جن پر سرخ نشان چڑھے ہوئے تھے سورت کے سامنے سے ہو کر گذرا ہے اور یہ جہاز اُس کو شاہ پیگو یا شاہ سیام نے دیئے ہیں۔ پھر ایک یہ چرچا ہوا کہ وہ ایران پہنچ گیا ہے اور شیراز میں لوگوں نے دیکھا ہے۔ اور کچھ دنوں بعد اِن افواہ اُڑانے والوں نے اُسے قندھار پہنچا دیا اور مشہور کردیا کہ وہاں سے کابل پر چڑھائی کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ ایک دفعہ اورنگ زیب نے کہا کہ شجاع تو آخر حاجی ہو گیا" یعنی مکہ جا پہنچا۔ مگر اس کا یہ کہنا غالباً ظرافت کے طور پر تھا۔ اور اب تک بہتیرے آدمی اس بات پر یقین کئے ہوئے ہیں کہ وہ استنبول میں کچھ عرصہ رہ کر اور وہاں سے بہت سا مال و دولت لے کر ایران میں آگیا ہے۔ مگر میرے نزدیک یہ سب افواہیں محض بے بنیاد ہیں۔ اور وہ چٹھی قابل اعتماد ہے جو ڈچوں کے کارخانہ تجارت کے افسر اعلیٰ کی طرف سے تھی اور جس میں یہ لکھا تھا کہ شجاع اراکان سے بھاگنے کی حالت میں مارا گیا۔ چنانچہ اُس کے ایک خواجہ سرا نے جس کے ساتھ میں بنگالہ سے مچھلی پٹن گیا تھا اور ایک اور شخص نے جو اُس کے توپ خانہ کا سردار تھا اور اب شاہ گولکنڈا کا ملازم ہے مجھ سے کہا کہ فی الحقیقت ہمارا آقا مر چکا ہے۔ لیکن اس کی تفصیل مجھ سے بیان کرنی نہیں چاہی۔ اور بعض فرانسیسی سوداگروں سے جو سیدھے اصفہان[2] سے آئے تھے۔ دہلی میں میری ملاقات ہوئی تو اُنھوں نے کہا کہ ایران میں ہم نے کبھی اُس کا نام بھی نہ سُنا تھا۔ اس کے سوا اُس کے زندہ نہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ شکست کے ساتھ ہی اُس کی تلوار اور خنجر

---

[1] مآثر عالمگیری میں بضمن وقایع ۱۳؁ جلوس عالمگیری مطابق ۱۰۸۰؁ ہجری لکھا ہے کہ" عالمگیر کے حضور میں یہ خبر پہنچی کہ مورنگ میں یعنی آسام اور کوچ بہار کے مابین ایک مصنوعی شجاع نے شورش برپا کی ہے جس پر نہایت تاکید کے ساتھ وہاں کے حکام ابراہیم خاں اور فدائی خاں کے نام فرمان جاری ہوئے کہ اگر وہ کسی طرف سر نکالے تو سر کاٹ کر حاضر کرو۔ جس سے ثابت ہے کہ فی الواقع اُس کی تباہی سے نو برس بعد تک بھی لوگوں کو اس کی موت و حیات میں شک ہی تھا۔ س م ح

[2] اصفہان اُس زمانہ میں ایران کا دارالسلطنت تھا۔ س م ح

پڑا ہوا ملا تھا اور اگر وہ واقعی جنگل میں بھاگ گیا ہوتا جیسا کہ بعض لوگوں کا ادعا ہے تو اس صورت میں بھی جاں بر ہونے کی بہت کم اُمید ہے۔ کیونکہ وہاں یا تو چوروں اور رہزنوں وغیرہ نے قطعًا مار ڈالا ہوگا یا شیر اور ہاتھی وغیرہ جیسے درندہ جانوروں نے جو وہاں کے جنگلوں میں بکثرت ہیں چیر پھاڑ ڈالا ہوگا۔

شجاع کے اہل وعیال بہرحال سلطان شجاع کی موت و حیات کی نسبت خواہ کچھ ہی شکوک اور احتمالات ہوں۔ لیکن اُس کے کنبہ کے لوگوں پر جو جو آفتیں اور مصیبتیں پڑیں اُن کے متعلق روایتوں کی صحت میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے چنانچہ ان بیچاروں کی مصیبتوں کی تفصیل اس طرح ہے کہ جب ان کو قید کرکے واپس لائے تو کیا مرد کیا عورتیں کیا بچے سب کے سب قید خانے میں ڈال دیئے گئے۔ اور نہایت ہی بے رحمی اور سختی کی گئی۔ مگر کچھ مدت بعد اُن کو چھوڑ دیا گیا۔ اور کسی قدر مہربانی کی گئی۔ شجاع کی بڑی بیٹی سے راجہ نے شادی کرلی اور اُس کی ماں سلطان باقی سے خود اپنا عقد کر لینے کی بڑی خواہشمند تھی کہ اتنے میں سلطان باقی کے چند نوکر اُنھیں مسلمان لوگوں سے مل کر جن کا ذکر ابھی ہوچکا ہے پھر اُسی قسم کے منصوبہ کی فکر میں پڑ گئے۔ لیکن اُن میں کا ایک بے احتیاط اور جلد باز شخص جو غالبًا شراب پی کر اور بھی زیادہ بے عقل ہوگیا تھا نشہ کی ترنگ میں اس راز کو مخفی نہ رکھ سکا اور عین حملہ کے روز اُس سے یہ بھید کھل گیا۔ اور اگرچہ اس قصہ کی نسبت بھی ہزاروں روایتیں سننے میں آئی ہیں۔ لیکن جو بات اطمینان اور اعتماد کے ساتھ بیان کی جا سکتی ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ اس حرکت سے راجہ ایسا برہم اور غضب ناک ہوا کہ شجاع کے تمام کنبہ کے قتل کا حکم دے دیا یہاں تک کہ وہ شہزادی جس سے اُس نے عقد کرلیا تھا باوجودیکہ حاملہ تھی اس کے وحشیانہ حکم سے وہ بھی قتل کی گئی اور سلطان باقی اور اُس کے بھائیوں کے سر کند کلہاڑی سے کاٹے گئے اور اس بدبخت کنبہ کی باقی ماندہ عورتیں اپنے اپنے مکانوں میں ایسی سختی سے قید کی گئیں کہ فاقوں کے مارے وہیں ہلاک ہوگئیں۔

الغرض یہ لڑائی کی آگ جو ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کی خاطر چاروں بھائیوں کے باہم بھڑکی کُل پانچ یا چھ سال کے اندر یعنی تقریبًا ۱۶۵۵ء سے لے کر

لہ چونکہ ۱۶۵۷ء کے اخیر میں شاہجہاں سخت بیمار ہوا تھا۔ اور اُس کی بیماری کی خبر پاکر سب

سنہ ۱۶۶۰ء یا اکسٹھ تک اس طرح خاتمہ کو پہنچی اور اورنگ زیب اس عظیم الشان سلطنت کا اکیلا ہی مالک بن گیا[1]

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ - بھائیوں سے پہلے مراد بخش نے گجرات میں بغاوت کی تھی اور آخر کار شجاع کے اراکان میں چلے جانے کے بعد سلیمان شکوہ سری نگر سے قید ہو کر دہلی میں چھبیسویں جمادی الاولیٰ سنہ ۱۰۷۱ ہجری کو پہنچا تھا۔ اس حساب سے یہ لڑائی بھڑائی تین برس سے زیادہ نہیں رہی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اس قصہ کا شروع اُس وقت سے لیا ہے جب کہ شاہجہاں نے فساد کے اندیشہ سے شہزادوں کو علیحدہ علیحدہ صوبے دے کر کابل سے روانہ کیا تھا۔ س م ح

[1] شجاع کی شکستوں اور اراکان کو جانے کا حال جس طرح پر بلا اختلاف عالمگیر نامہ اور مآثر عالمگیری اور سیر المتاخرین میں لکھا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ مونگیر سے بھاگ گئے کے بعد اُس نے ٹانڈہ کو اپنا محل و مرکز قرار دیا اور برسات یہیں بسر کی اور جب میر جملہ کی آمد آمد سے ڈر کر یہاں بھی ٹھکانا نہ دیکھا تو اپنے دونوں چھوٹے بیٹوں اور قریب تین سو نوکروں چاکروں کے دو کشتیوں میں بیٹھ کر راج محل کو بھاگ گیا جہاں پہلے سے اُس کا بڑا بیٹا زین الدین اس غرض سے گیا ہوا تھا کہ وہاں کے حاکم رشید خاں نامی نے جو نمک حرامی کر کے میر جملہ سے سازش کر لی تھی اور اس کی تحریک سے راج محل کے رئیس معصوم خاں کے بیٹے منور خاں نے کسی قدر فساد برپا کر رکھا تھا اُس کو فرو کرے۔ چنانچہ رشید خاں کو تو اُس نے جاتے ہی جب کہ وہ سلام کو حاضر ہوا عین دربار میں قتل کرا دیا تھا۔ اور بلحاظ اپنی تنگ حالت کے اراکان کے راجہ سے پیام و سلام کر کے اور تحفے تحائف بھیج کر منور خاں کی سرکوبی کے لئے اُس کی بہت سی جنگی کشتیاں منگالی تھیں اور انھوں نے اُس کے ساتھ ہو کر منور خاں کو شکست دینے میں اپنی عادت کے موافق راج محل کی رعیت کو بھی بہت تباہ کیا اور اکثر لوگوں کو جن میں بہت سے مسلمان بھی تھے قید کر کے ساتھ لے گئے اور زین الدین نے اس مدد کے صلہ میں اُن کو بہت سا نقد و جنس دے کر رخصت کیا اور راجہ سے یہ ٹھیرا لیا کہ اگر شجاع کو مجبوراً اراکان میں آنا پڑے تو اُس کی کچھ فوج راج محل میں آ کر اُس کو وہاں لے جائے۔ چنانچہ راجہ نے اپنے رشتہ دار چاٹگام کے حاکم کو جو اُس وقت تک یہ مقام ملک اراکان میں داخل تھا یہ حکم بھیج دیا تھا کہ جب شجاع طلب کرے تو کچھ فوج اُس کی مدد کو بھیج دے۔ پس جب شجاع راج محل میں پہنچا تو ناچار اپنے چند معتمد شخصوں کو فوج لانے کو بھیجا تاکہ ساتھ ہو کر اُس کو اراکان لے جائے اور ایک مہینے تک اس کے انتظار میں بیٹھا رہا لیکن چونکہ میر جملہ برابر اُس کے تعاقب میں چلا آتا تھا اس لئے اپنے تینوں بیٹوں اور دو چار سرداروں اور چند سپاہیوں اور خواجہ سراؤں وغیرہ کے ساتھ

جواب کا انتظار چھوڑ کر کشتیوں میں بیٹھ وہاں چل دیا۔ راج محل چھوڑنے کے تیسرے دن وہ لوگ جو ایں سے اب سے تین مہینے پہلے راجہ اور چاٹگام کے حاکم کے پاس روانہ کئے تھے معہ اکابرِ اراکانی اور فرنگستانی کشتیوں کے جو مسلح اور ساز و سامان سے بخوبی درست تھیں اور جن کو چاٹگام کے حاکم نے خدا کے منشا کے موافق روانہ کیا تھا۔ راجہ اور چاٹگام کے حاکم کی تحریروں کے ساتھ بین رہ روی کی حالت میں آ ملے۔ مگر اراکانی سرداروں نے یہ کہا کہ اگرچہ ہم آپ کی مدد کے لئے آئے ہیں اور راجہ کا خود بھی ارادہ تھا کہ کمک کے لئے چاٹگام میں آکر بیڑے اور پیچھے سے جنگی کشتیوں کا اور بھی زیادہ مضبوط "لوازمہ" یعنی بیڑہ روانہ کرے اور خشکی کی راہ سے بھی کچھ مدد بھیجے لیکن یہ سب کچھ اس صورت میں تھا کہ آپ راج محل یعنی اپنے ملک میں ٹھیر کر میر جملہ کے مقابلہ کا سامان کرتے اور آپ کے اراکان میں لے جانے کا ہم کو حکم نہیں ہے۔ اب چونکہ یہاں سے قریب ہی موضع ہلوہ میں دو غالبًا وہی مقام ہے جس کو حال کے انگریزی نقشوں میں بھلوا لکھا ہے۔ اور ڈھاکہ سے نیچے تقریبًا ڈھاکہ اور چاٹگام کے وسط میں دریا کے کنارے ہے۔ انتہائے سرحد پر بادشاہی قلعہ اور تھانہ تھا اس لئے شجاع کا ارادہ ہوا کہ اس پر قبضہ کرلے اور وہاں ٹھیر کر اراکانیوں کی مدد سے آئندہ کے لئے کچھ بندوبست کرے مگر جب قلعہ پر تصرف نہ ہوسکا تو شجاع نے اراکان والوں سے خشکی پر اُتر کر قلعہ پر حملہ کرنے کی درخواست کی۔ لیکن انھوں نے کہا کہ یہ ہمارے معمول کے برخلاف ہے۔ البتہ پانی پر ٹھیر کر توپ بندوق سے آگ برسانے کو ہم حاضر ہیں۔ اور شجاع کے اصرار سے ناراض ہوکر آخرکار روکھے پھیکے بن گئے۔ اور صاف کہہ دیا کہ اگر قلعہ آپ کی کوشش سے ہاتھ آجاتا تو مضائقہ نہ تھا کہ ہم آپ کو اس میں بٹھا کر آپ کے ایک لڑکے کو اراکان لے جاتے اور راجہ آئندہ کے لئے جو حکم دیتا وہ کرتے۔ لیکن اب تو یہی بہتر ہے کہ آپ خود اراکان کو تشریف لے چلیں۔ چنانچہ وہ اس پر راضی ہوگیا اور چھٹی رمضان ۱۰۷۰ھ کو وہاں چلا گیا۔ اور سوائے اُن چالیس رفیقوں کے جن کا حال پیچھے ایک حاشیہ میں لکھا جاچکا ہے۔ اس آفت میں اور کسی نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ اور جس وقت سے وہ وہاں پہنچا اور جو مصیبتیں وہاں پیش آئیں اُن کی نسبت صاحب عالمگیر نامہ نے مجملًا یوں لکھا ہے کہ

"بعد از قطعِ مراحل ادبار و طے لجہ ہائے خونخوار بہ جزیرۂ زنگ کہ از ازل معمورہ ہائے عالم مسکن کفر و ضلالت شیم است رسیدہ از تیرہ بختی و بد فرجامی با دد و دام آن سرزمین محشور شد و وخامت حال و سوئے مآلش باعث عبرت ہمگناں شد و سرانجام کار آن مدعا تبت بعد از وصول بآن ولایت ضلالت بنیاد و ملاقات با سرگروہِ آن قومِ بد نژاد کہ بہزاراں ہزار مرحلہ از شہرستانِ آدمیت و کشورِ انسانیت دور و از حلیہ دین و دانش و شعارِ مروت و مردمی مہجور رند بعد ازیں در محلِ خود مشروح

ازبک کے سفیروں کی آمد لڑائی کے ختم ہوتے ہی ازبک قوم کے تاتاریوں نے بڑی عجلت کے ساتھ اپنے سفیر اورنگ زیب کے پاس بھیجے۔ جس زمانہ میں شاہجہاں نے اس کو اپنی فوج کا سپہ سالار بنا کر خانِ سمرقند[1] کی مدد کو جو خانِ بلخ سے لڑ رہا تھا بھیجا تھا یہ بہت سی لڑائیوں میں اُس کی بہادری اور جنگی لیاقتیں دیکھ چکے تھے اور اس سبب سے ڈرتے تھے کہ مبادا اُس کو ان کی وہ دغابازی یاد

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ وہ مذکور خواہد شد۔"

مگر اس مصنف نے اپنے اس وعدہ کے موافق کوئی تفصیلی حال اس بدنصیب کا آگے کہیں بیان نہیں کیا۔ اور نہ کسی اور کتاب میں میری نظر سے گذرا۔ س م ح

[1] امام قلی خاں اور نذر محمد خاں ازبک قوم کے دو بادشاہ اور سگے بھائی تھے اور ان کے باہم ملک اس طرح پر تقسیم تھا کہ سمرقند اور بخارا امام قلی خاں اور بلخ و بدخشاں نذر محمد خاں کے پاس تھا۔ لیکن جب امام قلی خاں زوالِ بصارت کی وجہ سے مکہ معظمہ کو ہجرت کر گیا تو سمرقند اور بخارا بھی نذر محمد خاں کے قبضہ میں آ گیا۔ مگر اس کی سخت گیری اور خود تدبیری سے اُمرا نہایت تنگ آ گئے اور انھوں نے اس کے بڑے بیٹے عبدالعزیز خاں کو بخارا اور سمرقند کا علیحدہ بادشاہ بنا لیا اور صرف وہی بلخ اور بدخشاں اس کے پاس رہ گیا۔ لیکن چونکہ وہاں بھی بے انتظامی اور ابتری پھیل گئی تو مجبور ہو کر اُس نے یہ حماقت کی کہ شاہجہاں سے امداد کا طالب ہوا جو بلخ و بدخشاں و سمرقند و بخارا کو اپنا ملک موروثی سمجھ کر اُس کو اپنے قبضہ میں لانے کا نہایت آرزومند تھا اور اس کی اُس حرکت کو بھی نہ بھولا تھا جو اس نے جہانگیر کا مرنا سنتے ہی کابل کو آن گھیرا تھا پس اُس نے موقعہ کو غنیمت سمجھ کر شہزادہ مراد بخش اور امیرالامرا علی مردان خاں کو امداد کے حیلہ سے بلخ کو روانہ کیا اور خود بھی لاہور سے کابل کو کوچ کر دیا۔ چنانچہ جب بلخ سے ایک منزل پر نذر محمد خاں نے اپنے دو بیٹوں بہرام اور سبحان قلی کو شہزادہ کے استقبال کے لئے بھیجا تو بہت سی خاطر و مدارات کے بعد اُن کو یہ پیغام دے کر واپس بھیج دیا گیا کہ آپ اطمینان رکھیں ہم بے شمار لشکر کے ساتھ آپ کی مدد کے لئے آن پہنچے ہیں مگر جب اگلے روز بلخ پہنچا تو امداد کی جگہ قلعہ پر قابض ہو جانا چاہا اور یہ دیکھ کر نذر محمد خاں معہ اپنے ایک بیٹے کے مجبوراً ایران کو بھاگ گیا اور انھوں نے بارہ لاکھ روپیوں اور جڑاؤ اور طلائی چیزوں اور ڈھائی ہزار گھوڑوں اور تین سو اونٹوں پر جو قلعہ میں تھے قبضہ کر لیا اور اُس کے دو بیٹوں اور تین لڑکیوں کو شاہجہاں کے پاس کابل بھیج دیا جن میں سے بہرام کو مصلحتاً پنج ہزاری کا منصب عطا ہوا اور عبدالرحمٰن کو تربیت کے لئے داراشکوہ کے سپرد

ہو کر جب وہ دشمن کے تخت گاہ بلخ پر قبضہ کر لینے کو تھا تو انھوں نے باہم صلح کر کے اُس کی سپاہ کو اپنے ہاں سے نکال دینے کے لئے اس وجہ سے بالاتفاق کوششیں کی تھیں کہ کہیں دونوں ہی کا ملک اس طرح نہ چھن جائے جس طرح اکبر نے کشمیر چھین لیا تھا [۱]

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ کیا گیا اور لڑکیوں کو بادشاہ کی بڑی بیٹی معروف بیگم صاحب نے بہت اعزاز سے اپنے پاس رکھا مگر جب مراد بخش چند عرضیاں بھیج کر بلا انتظار حکم کے واپس چلا آیا۔ اور سعد اللہ خاں وزیر سے بھی وہاں کا بخوبی نظم و نسق نہ ہو سکا تو شاہجہاں نے اورنگ زیب کو بھیجا جو جمادی الاول سنہ ١٠۵٦ ہجری کی پہلی تاریخ کو وہاں پہنچ گیا اور نذر محمد خاں کے بیٹے عبدالعزیز خاں والی بخارا و سمرقند اور ازبک سرداروں سے جو نہایت ہجوم کئے ہوئے تھے خوب لڑائیاں ہوئیں اور اورنگ زیب نے وہ چستی و چالاکی اور جواں مردی دکھائی کہ دشمن بھی دنگ ہو گئے چنانچہ ایک روز جب کہ ازبکوں نے اپنی زبردست کمانوں سے تیروں کا مینہ برسا رکھا تھا فوج کا دل بڑھانے کو اپنی زرہ اُتار ڈالی اور ڈھال کھول کر پھینک دی اور کہا آج اسی طرح لڑیں گے۔ اور ایک اور لڑائی میں جب کہ مخالفوں نے نہایت ہی انبوہ کر رکھا تھا سواری سے اُتر کر ایسی بے فکری و اطمینان کے ساتھ نماز ظہر با جماعت ادا کی کہ جس کی کیفیت سننے سے عبدالعزیز خاں کو اُس کے آگے سر جھکانا اور شاہجہاں کے حضور میں حاضر ہونا ہی پڑا اور نذر محمد خاں نے بھی اورنگ زیب کی خدمت میں اپنا خط متضمن اطاعت و اخلاص بھیج کر اس کے ذریعہ سے امن اور صلح کی درخواست کی جس کو شاہجہاں نے نہایت عقلمندی کر کے اس وجہ سے قبول کر لیا کہ چار کروڑ روپیہ اب تک خرچ ہو چکا تھا اور فائدہ کچھ بھی نہ تھا۔ اور اورنگ زیب اُسی طرح ملک کو خالی کر کے واپس چلا آیا۔

[۱] ۷۱۵ھ میں ایک شخص ساہو نامی جو اپنے کو گرشاسپ کی نسل سے (یعنی ایرانی نژاد گنتا تھا) راجہ سہدیو فرماں روائے کشمیر کا (جس کو بعض کتابوں میں شاید رسم الخط کی غلطی سے مہدیو اور اولاد راجہ ارجن پانڈو سے لکھا ہے) ملازم ہو کر عمدہ خدمتوں کے باعث رفتہ رفتہ نہایت صاحب اقتدار ہو گیا تھا چنانچہ سنہ ٧٤٢ھ میں جب سہدیو کا بیٹا جو برائے نام راجہ تھا مر گیا تو اُس کا مقتدر اور مسلط وزیر شاہ میر جو اس ساہو کا بیٹا تھا سلطان شمس الدین لقب مقرر کر کے خود ہی راجہ بن بیٹھا۔

اس طرح پر ہندو راجاؤں کی حکومت کا سلسلہ تو منقطع ہو گیا اور دو سو تیرہ برس تک شمس الدین کی اولاد کے لوگ متواتر حکمرانی کرتے رہے۔ مگر جب اس سلسلہ کے اخیر بادشاہ حبیب شاہ ابن نازک شاہ کو (جو سہدیو کے بیٹے کی طرح صرف برائے نام بادشاہ تھا) سنہ ۹۶۲ھ میں اُس کے کشمیری وزیر غازی خاں

(اکبر شاہ کشمیر پر قبضہ)

چک نے بے دخل کر دیا تو سلطنت چکوں کے خاندان میں منتقل ہو گئی۔ اور غازی خاں کی وفات کے بعد جو اُس کے بھائی حسین شاہ اور علی شاہ نوبت بنوبت بادشاہ ہوئے تو حسین شاہ شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کی خدمت میں تحفہ تحائف بھیج کر اظہار اطاعت کرتا رہا اور علی شاہ نے تو یہاں تک تابعداری اختیار کی کہ اکبر کا خطبہ اور سکہ بھی جاری کر لیا اور شاہزادہ سلیم (جہانگیر) کے لئے اپنی بیٹی کا ڈولہ بھی روانہ کیا۔

جس واقعہ کا ڈاکٹر برنیر اشارہ کرتا ہے وہ یہ ہے کہ جب سید مبارک خاں نامی ایک کشمیری سردار نے علی شاہ کے بیٹے یوسف شاہ کو کشمیر سے خارج کر دیا اور وہ مرزا سید یوسف خاں مشہدی صوبہ دار پنجاب کے ذریعہ سے استمداد کے لئے بمقام فتحپور سیکری اکبر کی خدمت میں حاضر ہوا تو اُس نے مرزا مذکور اور راجہ مان سنگھ والی جودھپور کو اس کی مدد کے لئے مامور فرمایا اور ۹۸۶ھ میں خفیف مقابلہ کے بعد کشمیر پھر اُس کے قبضہ میں آ گیا۔ ۹۸۹ھ میں اکبر نے کابل سے آتے ہوتے جلال آباد سے ایک ایلچی معہ فرمان کے روانہ کیا۔ اُس نے فرمان کا استقبال کیا اور حیدر خاں عرف یعقوب اپنے بیٹے کو بہت سے تحفہ تحائف کے ساتھ اکبر کی خدمت میں بھیج دیا یہ شہزادہ ایک برس تک حاضر دربار رہا۔ مگر کمبختی جو آئی کسی باعث سے گھبرا کر بلا اجازت کشمیر کو چلا گیا۔ اب اکبر کو ملک پر قبضہ کر لینے کے لئے خاصہ بہانہ مل گیا اور یوسف شاہ کے نام ایک سخت فرمان جاری ہوا کہ خود حاضر ہو یا اپنے بیٹے کو حاضر کرے۔ مگر جب تعمیل میں رجیسی کہ پہلے ہی سے توقع تھی حیلے بہانے ہوئے تو کشمیر کو فوج بھیج دی گئی۔ اور جب یوسف شاہ معہ اپنے بیٹے کے جو اس مصیبت کا باعث ہوا تھا مرزا شاہ رخ اور راجہ بھگونت داس اُمرائے شاہی مامورہ مہم کے لشکر میں حاضر ہو گیا تو کشمیریوں نے جو اپنی آزادی کو قائم رکھنا چاہتے تھے اُس سے ناراض ہو کر حسین چک کو اپنا حاکم بنا کر مقابلہ کی تیاری کر دی۔ مگر یعقوب باپ کو چھوڑ کر پھر کشمیر کو بھاگ گیا اور کشمیریوں نے اُسے شاہ اسمٰعیل کا لقب دے کر بادشاہ بنا لیا۔ لیکن ایک سخت لڑائی کے بعد کشمیری سردار مغلوب ہو کر حاضر ہو گئے اور ۹۹۳ھ میں اکبر کا سکہ خطبہ پھر جاری ہو گیا۔ اور زعفران اور ریشم اور شکاری پرندے بطور خراج مقرر ہو گئے۔ اس کے بعد اگرچہ یوسف شاہ بادشاہ کی خدمت میں بذات خود حاضر تھا مگر یعقوب اب بھی جیسی چاہیے اطاعت نہیں کرتا تھا اس لئے پھر فوج کشی ہوئی وہ اور شمس چک کچھ عرصہ تک مقابلہ کرتے رہے مگر آخر کار شمس چک وغیرہ کشمیری سردار سب حاضر ہو گئے اور ملک کشمیر ضمیمہ سلطنت مغلیہ ہو کر مرزا یوسف خاں مشہدی جو لیاقت اور دانشمندی میں مشہور شخص تھا صوبہ دار مقرر ہو گیا۔ اور اب کشمیری ایسے مغلوب ہو گئے اور اُن کا یہ کوتاہ اندیش بادشاہ یعقوب اس حالت کو پہنچ گیا کہ ۹۹۷ھ میں جب شہنشاہ کشمیر کی سیر کو گیا تو دربار

چونکہ یہ اُن تمام واقعات سے جو ہندوستان میں گذرے تھے اور اورنگ زیب کی فتوحات اور سلطنت کے دوسرے دعوے داروں کی کامل بربادی اور موت سے خوب واقف تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ اگرچہ شاہجہاں زندہ ہے مگر فی الواقع اُس کے بیٹے کے بادشاہ ہونے کو سب نے مان لیا ہے اس لئے انتقام کے خوف یا جبلی طمع اور طبعی لالچ کی تحریک سے اس اُمید پر کہ شہنشاہ ہندوستان کے ہاں سے عمدہ عمدہ تحفے ہاتھ آئیں گے مبارکباد کہنے اور خدمت کے لئے اپنی آمادگی ظاہر کرنے کو اُنھوں نے اپنے اپنے ایلچی روانہ کئے مگر فتح کے بعد یہ پیغام جس قدر کے قابل تھے اورنگ زیب اُس سے بخوبی واقف تھا اور خوب جانتا تھا کہ صرف سزا کے خوف یا مال کی طمع سے ان کو بھیجا ہے ۔ لیکن تاہم مناسب طور پر اُن کا استقبال اور خاطر تواضع عمل میں آئی اور چونکہ اُس روز دربار میں میں بذات خود موجود تھا اس لئے ہر ایک بات کو صحیح طور پر بیان کر سکتا ہوں ۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ انھوں نے دربار ہندوستان کی رسم ادب کے موافق کسی قدر فاصلہ سے بادشاہ کو سلام کیا ۔ یعنی سر جھکا کر اور تین دفعہ اپنے ہاتھ زمین تک لے جاکر اور پھر پیشانی تک لاکر تین بار سلام کیا اور اس کے بعد اگرچہ وہ اس قدر نزدیک پہنچ گئے کہ اورنگ زیب خود اُن کے ہاتھ سے خریطے لے سکتا تھا ۔ لیکن یہ رسم ایک امیر کی معرفت ادا ہوئی ۔ یعنی اُس نے ان سے لے کر کھولے اور پھر بادشاہ کو دیئے ۔ اور اُس نے بڑی متانت اور وقار سے پڑھکر حکم دیا کہ ہر ایک سفیر کو "سراپا" (جس کے معنی ہیں سر سے پاؤں تک کا لباس) عنایت ہو ۔ چنانچہ زربفت کی ایک ایک قبا اور ایک ایک پگڑی اور ایک ایک زری کا ریشمی پٹکہ عطا ہوا اور اس کے بعد جو تحائف وہ اپنے اپنے "خان" کی طرف سے لائے تھے پیش ہوئے ۔ یعنی نہایت عمدہ لاجورد[1] کے بنے ہوئے کئی صندوقچے اور لمبے لمبے بالوں والے کئی اونٹ اور چند نہایت

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ ۔ عبدالعظر کے روز مرزا یوسف خان کی سفارش سے جو اُس کی تقصیر معاف ہوئی تو اکبر نے بجائے تاج بخشی کے اُس کو اپنی پاپوش عطا کی ! جس کو وہ اپنی پگڑی پر باندھ کر دربار میں حاضر ہوا

(ماخوذ از سیر المتاخرین و گلزار کشمیر وغیرہ) س م ح

[1] کتاب مخزن الادویہ میں لکھا ہے کہ کاشغر واقع ترکستان کا سنگ لاجورد سب سے بہتر ہوتا ہے ۔ س م ح

خوبصورت ترکی گھوڑے لا گرچہ وہاں کے گھوڑوں کی زیادہ تعریف اصالت ہی کی ہے) اور کئی اونٹوں کے بوجھ کی مقدار میں تازہ میوے مثل سیب۔ ناشپاتی۔ انگور اور سردہ وغیرہ جو دہلی میں اکثر اسی ملک سے آتے اور جاڑے بھر بکا کرتے ہیں اور اسی قدر خشک میوے مثل آلو بخارا۔ خوبانی اور کشمش اور دو قسم کے سفید اور سیاہ انگور جو بہت بڑے بڑے اور نہایت لذیذ تھے جن کو ملاحظہ فرما کر اورنگ زیب نے سفیروں سے فرمایا کہ خان صاحبوں کے ان تحائف سے ہم بہت خوش ہوئے۔ اور میووں کی خوبی اور اونٹوں اور گھوڑوں کی عمدگی کی بڑے مبالغے سے تعریف کی۔ پھر اُن کے ملک کی زرخیزی کا کچھ ذکر کر کے سمرقند کے مدرسۂ اعظم کی بابت چند باتیں پوچھ کر کہا کہ اچھا اب آرام کیجئے۔ اور گاہ گاہ دربار میں آتے رہئے۔ ہم آپ کی ملاقات سے خوش ہوں گے۔ چنانچہ جس طرح ان ایلچیوں کا استقبال وغیرہ ہوا اُس سے یہ بہت خوش اور رضامند بارے رخصت ہوئے اور ہندوستان کے طرز سلام سے جو فی الواقع ایک ذلت ہے کچھ رنجیدہ نہ تھے۔ اور نہ اس سے کچھ ناراض تھے کہ خود بادشاہ نے ہمارے ہاتھ سے خریطے کیوں نہ لئے اور مجھے یقین تھا کہ اگر اُن سے آداب زمیں بوسی بجا لانے یا اس سے بھی زیادہ کسی اور رسم انکسار کے ادا کرنے کی خواہش کی جاتی تو یہ اُس کو بھی بلا عذر قبول کر لیتے لیکن یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر یہ اپنے ملک کے دستور کے موافق سلام کرنے یا بادشاہ کو اپنے ہاتھ سے خریطے دینے کی استدعا کرتے تو یہ منظور بھی نہ ہوتا۔ کیونکہ یہ رعایتیں صرف ایران ہی کے سفیروں کے ساتھ ملحوظ رہتی

لہ شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے زمانہ سے جس نے لباس اور رسوم دربار وغیرہ میں تالیف قلوب کے لئے بہت کچھ ہندو راجاؤں کا طرز اختیار کر لیا تھا لوگ جس طرح راجاؤں کو ڈنڈوت کرتے تھے دربار کے وقت بجائے سلام کے بادشاہ کو سجدہ کیا جاتا تھا مگر شاہجہاں نے تخت پر بیٹھتے ہی اس کی ممانعت کی اور مہابت خاں سپہ سالار کی رائے سے اُس کی عوض "آداب زمیں بوس" مقرر ہوا۔ یعنی جب کوئی سلام کو حاضر ہو تو چاہیئے کہ بادشاہ کے سامنے دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک کر اُن کی پُشت کو چوم لیا کرے اور سادات اور علما اور مشائخ اور درویشوں کو حکم ہوا کہ صرف سلام کر لیا کریں اور رخصت کے وقت فاتحہ پڑھا دیا کریں مگر چونکہ اس میں بھی سجدہ کے ساتھ ایک طرح کی مشابہت تھی چند سال بعد اس کو بھی موقوف کر دیا اور اس کے عوض چوتھی تسلیمات مقرر کر دی جو ایک مقام خاص سے جس کو آداب گاہ کہا جاتا تھا لوگ بجا لاتے تھے۔

ہیں۔ بلکہ اُن کو بھی ہزار دقت سے یہ اجازت ملتی ہے۔

یہ لوگ چار مہینے سے زیادہ دہلی میں رہے۔اور اگرچہ کئی بار چاہا مگر رخصت نہ ملی اور اتنے دنوں تک یہاں رہنا ان کی تندرستی کے لئے ایسا مضر ہوا کہ یہ اور ان کے اکثر ہمراہی علیل ہو گئے۔ بلکہ کئی شخص تو مر بھی گئے۔ مگر مجھے شبہ ہے کہ ان کو گرمی کے باعث جس کے یہ عادی نہ تھے یہ تکلیف ہوئی یا کہ جسم اور لباس کی کثافت اور خوراک کی قلت کے سبب سے کیونکہ ازبک غالباً تمام دنیا کے لوگوں سے بڑھ کر خسیس اور بخیل اور کثیف رہنے والے ہیں۔ چنانچہ جو لوگ اس سفارت میں آئے تھے سب کے سب جو روپیہ خرچ کے علاوہ اورنگ زیب کی طرف سے اُن کو ملتا تھا برابر جمع کئے جاتے تھے اور ایسی خست سے گزران کرتے تھے جو کسی طرح بھی اُن کے مناسب حال نہ تھی۔ مگر بایں ہمہ ان کی رخصت کے وقت بڑی دھوم دھام اور رسم رسوم کا عمل درآمد ہوا یعنی ایک ایسے دربار میں کہ جس میں تمام امرا حاضر تھے دونوں ایلچیوں کو بڑے بیش قیمت سراپا عطا ہوئے اور حکم ہوا کہ دونوں کے ڈیرے پر آٹھ آٹھ ہزار روپیہ نقد بھی بھیجا جائے اور ان کے آقاؤں کے لئے بھی بہت گراں بہا سراپا یعنی بہت سے عمدہ تھان زربفت کے اور کتنے ہی تھان تن زیب اور ململ کے اور چند الاچی جو ایک ایسا کپڑا ہوتا ہے جو سنہری روپہلی زری اور ریشم ملا کر بنا جاتا ہے اور چند قالین اور جڑاؤ قبضہ کے دو خنجر انھیں حوالہ کئے[1]

[1] عالمگیر نامہ اور مآثر عالمگیری سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دونوں سفیر ایک ہی وقت میں نہیں آئے تھے۔ بلکہ سبحان قلی خان خلف نذر محمد خان والی بلخ کا سفیر چھبیسویں جمادی الثانی سنہ [illegible]ھ کو حاضر ہوا اور شاہی میر تزک شہر سے باہر استقبال کر کے اُس کو دربار میں لایا اور خلعت کے علاوہ مرصع پٹی اور پندرہ ہزار روپیہ نقد عطا ہوا تھا اور چونکہ دیر سے بیمار اور ناتوانی اور ضعف کی حالت میں یہاں پہنچا تھا اس لئے چوتھی رجب سنہ مذکور کو ایک مرصع چھڑی جو بڑے بڑے امیروں کو اعزازاً اس غرض سے عطا ہوتی تھی کہ اُس کے سہارے سے دربار میں کھڑے رہا کریں عطا ہوئی اور دو سو تولہ کی ایک اشرفی اور اسی وزن کا ایک روپیہ عنایت ہوا مگر وہ چند روز بعد یہیں مر گیا۔ اور اُس کے ہمراہیوں کو آٹھ ہزار روپیہ نقد دے کر رخصت کیا گیا تھا اور عبدالعزیز خان کا سفیر ۱۰۷۰ھ میں آیا تھا اور اُس کا کابل میں پہنچ جانا سن کر بادشاہ نے ایک سردار کو اُس کی خاطر تواضع اور مہمان داری کے لئے روانہ کیا تھا اور جب وہ چوتھی ربیع الثانی سنہ مذکور کو شاہجہان آباد کے قریب

سفیروں سے میری ملاقات ان کے قیام دہلی کے زمانہ میں میری تین ملاقاتیں ان سے ہوئیں اور مجھے میرے ایک دوست نے جس کا باپ ملک اُزبک سے دربار مغلیہ میں آکر بہت دولت مند ہو گیا تھا یہ کہکر کہ یہ ایک طبیب ہیں ان سے ملا دیا تھا۔ ان ملاقاتوں سے میرا یہ مدعا تھا کہ حتی الامکان اُن کے ملک کے کچھ حالات دریافت کروں گر وہ اس قدر بے علم اور جاہل نکلے کہ جس کا مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا یہاں تک کہ اپنے ملک کی حدود سے بھی واقف نہ تھے اور جن تاتاریوں نے چند ہی سال گذرے مُلک چین پر غلبہ حاصل کیا تھا اُن کا کچھ بھی حال نہ بتا سکے۔ خلاصہ یہ کہ اُن سے ایک بھی نئی بات معلوم نہ ہو سکی ایک دفعہ مجھے یہ شوق ہوا کہ ان کے ساتھ کھانا کھاؤں اور چونکہ یہ رسوم تکلف سے چنداں آشنا نہ تھے اس لئے اُن کے شریک طعام ہو جانے میں مجھے کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ مگر اُن کا کھانا بہت ہی عجیب و غریب نظر آیا یعنی بجز گھوڑے کے گوشت کے کوئی بھی چیز نہ تھی۔ مگر بہرحال میں نے اپنے کھانے کا کچھ ڈھنگ نکال لیا۔ کیونکہ دسترخوان پر ایک قاب میں کچھ گوشت ایسی ترکیب سے پکا ہوا بھی تھا کہ جس کو میں نے کھانے کے قابل سمجھا اور آداب مجلس کے لحاظ سے اُس کی تعریف بھی کرتا رہا۔ کیونکہ اُن کے نزدیک وہ نہایت ہی خوش ذائقہ غذا تھی۔ کھانا کھانے میں ایک حرف بھی کسی کے منہ سے نہیں نکلتا تھا ادھر میرے یہ لطیف مزاج! میزبان جس قدر منہ میں سما سکتا تھا!! ہاتھ سے گھوڑے کا۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ پہنچا تھا تو دو بڑے امیر استقبال کرکے دربار میں لائے تھے اور یہ ترکی گھوڑوں اور اونٹوں اور اور چیزوں کے علاوہ چالیس ہزار روپیہ کی قیمت کا ایک لعل بھی تحفہ میں لایا تھا اور چونکہ یہ بھی بیمار ہی آیا تھا اس لئے خلعت اور مرصع خنجر اور آٹھ ہزار روپیہ نقد کے علاوہ ایک مرصع چھڑی اس کو بھی عنایت ہوئی تھی اور رخصت کے روز پھر خلعت مع خنجر مرصع اور تیس ہزار روپیہ نقد کے مرحمت ہوا تھا اور آنے کے دن سے رخصت کے روز تک کل ایک لاکھ بیس ہزار روپیہ اس کو دیا گیا تھا۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر برنیر نے غالباً اپنی یاد کی غلطی سے ان دونوں سفیروں کے آنے کو ملا کر لکھدیا ہے۔ س م ح

لہ اصل کتاب میں لفظ راگو لکھا ہے جو فرنگستان میں ایسے سالن کو کہتے ہیں جو کئی قسم کے گوشت کی بوٹیاں اور مصالحے ملا کر بہ تکلف تیار کیا جاتا ہے۔ راگو س م ح

گوشت ٹھونسنے چلے جاتے تھے ۔ کیونکہ چمچہ سے کھانا بالکل جانتے ہی نہ تھے[1] لیکن اس لطیف غذا سے جب خوب پیٹ بھر گیا تب تو اُن کی زبان کھلی اور خوش اختلاطی طور پر مجھ سے بدلائل کہنے لگے کہ ازبک سب لوگوں سے زیادہ قوی ہیکل ہیں۔ اور تیر اندازی میں دنیا کی کوئی قوم اُن کی برابری نہیں کر سکتی ۔ اور یہ کہکر اپنے تیر اور کمانیں منگائیں جو فی الواقع ہندوستان کی کمانوں اور تیروں کی بہ نسبت بہت لمبی تھیں اور کہا کہ ہم شرط لگاتے ہیں کہ اپنا تیر گھوڑے یا بیل کے جسم سے پار کر سکتے ہیں ۔ اور پھر اپنی دیہاتی عورتوں کی طاقتوری اور بہادری کی اس قدر تعریف کرنی شروع

[1] افغانستان اور ترکستان کے لوگ چھوٹے چھوٹے نوالے بنا کر کھانے کو ایک دقیانوسی سمجھتے ہیں اور چینیوں کے سوا جن کے کھانا کھانے کا طرز اہل یورپ سے بہت کچھ مشابہ ہے چھری کانٹے اور چمچہ سے کھانا کھانے کا رواج ممالک ایشیا میں کبھی بھی نہ تھا اور اب تک بھی اس نے کچھ زیادہ رواج نہیں پایا ۔ اور کھانے کے وقت کم بولنا آداب طعام میں سمجھا جاتا ہے اور ترکستان میں گھوڑے کے گوشت کا عام رواج ہے ۔ چنانچہ میرے محترم دوست مولوی محمد حسین صاحب آزاد جنھوں نے ترکستان کی خوب سیر کی ہے اپنے ایک خط میں یوں ارقام فرماتے ہیں " گھوڑے کا گوشت اس ملک میں عام ہے ۔ بازارہائے قصابی میں جو بڑا عریض اور طویل بازار ہوتا ہے میں نے دیکھا ہے کہ گوشت کی رانیں اور پچھے دوکانوں پر اور دوکانوں کے آگے جو لکڑ گڑے ہوتے جڑے ہیں ان پر لٹکتے ہوتے ہیں ۔ جس لکڑ پر گھوڑے کی دُم لٹکتی ہے وہ گویا بورڈ لگا ہوا ہے کہ یہ گھوڑے کا گوشت ہے ؛ اور جس پر گائے کی دُم لٹکتی ہے سمجھ جاؤ کہ یہ گائے کا گوشت ہے ، جس پر اونٹ کی دُم لٹکتی ہے یہ اونٹ کا گوشت ہے ۔ جب ہم کابل سے بلخ کو روانہ ہوئے تو کتل دندان شکن سے اُترتے ہوئے ہمارے قافلہ سالار کا گھوڑا گر پڑا ۔ اُترائی بھی میل بھر سے کم نہ تھی ایسے مقاموں میں گر کر گھوڑے یا اونٹ کا سنبھلنا تو ممکن ہی نہیں گھوڑا چور چور ہو گیا ۔ سامنے ہی ایک گاؤں تھا لوگ وہاں کے سنتے ہی چھرے لے لے کر دوڑے اور تکہ بوٹی کر کے لے گئے اور اپنی ہانڈیاں جا گرم کیں ۔ کیا تعجب کی بات ہے کہ جس قوم کا ایک مصنف گھوڑے کے گوشت کھانے پر ازبکوں کی ہنسی اُڑاتا ہے اُسی کی قوم کے لوگ جب شہنشاہ کی لڑائی میں سپاہ جرمنی نے اُن کے تختگاہ پیرس کو گھیر لیا اور اہل شہر گھوڑے وغیرہ جانوروں کے گوشت کھانے پر مجبور ہوئے تو صلح ہو جانے کے بعد بھی کچھ عرصہ تک بڑے شوق اور تکلف سے گھوڑوں کی رانوں کے کباب اپنی میزوں پر لگاتے اور اور اقوام یورپ کی ہنسی اور مذاق کی کچھ پروا نہیں کرتے تھے ۔ س ام ح

کی کہ گویا امیزنوں[۱] کو بھی اُن کے مقابلہ میں بہت نازک اندام اور ڈرپوک سمجھنا چاہیئے۔ اور اُن کی بہادری وغیرہ کے بہت سے قصے سُنا ئے۔ چنانچہ خاص طور پر ایک قصہ نے تو مجھکو بھی تعجب میں ڈال دیا۔ مگر افسوس ہے کہ میں اُس کو اس آب وتاب کے ساتھ بیان نہیں کر سکتا کہ جس کے ساتھ انھوں نے بیان کیا تھا۔ یعنی جس زمانہ میں اورنگ زیب اُزبکوں کے ساتھ لڑائی میں مصروف تھا اتفاقاً پچیس تیس سواروں کا ایک گروہ جو ایک چھوٹے سے گاؤں میں جا گھسا اور گھروں کو لوٹنے اور غلام بنانے کے لئے لوگوں کو پکڑنے باندھنے لگا تو ایک بڑھیا نے اُن سے کہا کہ بیٹا میری صلاح مانو اور ان حرکتوں سے باز آؤ اور اپنی خیریت چاہتے ہو تو جلد یہاں سے نکل جاؤ وہ میری بیٹی جو باہر گئی ہوئی ہے اور جلد آیا چاہتی ہے۔ تم پر آن پڑے گی تو تمھارا کیا اور نہ کیا سب برابر ہو جائے گا۔ لیکن اُنھوں نے اُس بیچاری نیک دل بڑھیا کی بات یوں ہی ٹھٹے میں اُڑا دی اور بدستور گھروں کو لوٹتے اور لوگوں کو پکڑتے باندھتے رہے مگر جب لوٹ کے مال سے اپنے گھوڑے اور ٹٹو لادلئے اور گاؤں کے بہت سے باشندوں اور خود اُس بیچاری بڑھیا کو بھی قید کر کے لے چلے تو کوس ڈیڑھ کوس بھی نہ گئے ہوں گے کہ یہ بڑھیا جو بار بار پیچھے کو مڑ مڑ کر دیکھتی جاتی تھی۔ خوشی سے چلا کر بولی۔ "میری بیٹی، میری بیٹی" اور اگرچہ وہ ابھی نظر سے اوجھل تھی مگر معمول سے زیادہ

---

[۱] امیزن اس کا اشتقاق یونانی لفظ میزاس سے ہے جس کے معنی پستان کے ہیں اور جس طرح قدیم فارسی اور سنسکرت میں اسم کے پہلے الف لگاتے جانے سے اُس کے معنی نفی کے ہو جاتے ہیں اسی طرح حرف اے کے ملنے سے جو بمنزلہ الف کے ہے اُس کے معنی بن چھاتی والی عورت کے ہو گئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ قدیم زمانہ میں یورپ کے شرق میں عورتوں کا ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا تھا جو اپنی داہنی چھاتی اس غرض سے کاٹ ڈالتی تھیں کہ تیراندازی اور نیزہ بازی کرنے میں کچھ الجھاؤ نہ رہے اور مردوں کو اپنی صحبت میں دخل نہ دیتی تھیں۔ اور ایسی قوی اور جنگ جو تھیں کہ بحر اسود کے ساحل معروف لوگزن پر ایشیائے کوچک میں تھرموڈون ندی کے کنارے ایک سلطنت قائم کر لی تھی اور ہمت مردانہ اور قوت دلیرانہ سے قرب وجوار کی قوموں کو مسخر اور مغلوب کر رکھا تھا۔ مگر بعض مورخ ان روایتوں کو صرف افسانہ خیال کرتے ہیں۔ بہرحال اس روایت کی وجہ سے فرنگستان میں بہادر اور مردانہ وش عورتوں کے لئے یہ لفظ ایک اصطلاح بن گیا ہے۔ م۔ ح

گرد اڑتی دیکھ کر اور گھوڑے کی ٹاپ کی آواز سُن کر اُسے یقین ہو گیا تھا کہ میری بہادر بیٹی مجھے اور میرے رفیقوں کو بے رحم دشمنوں کے ہاتھ سے چھڑا لینے کے لئے آپہنچی ہے اور وہ یہ الفاظ کہہ نہ چکی تھی کہ وہ لڑکی ایک برق وش گھوڑے پر سوار گلے میں کمان ڈالے اور کمر سے ترکش باندھے ہوئے دکھائی دی اور دور ہی سے للکاری! کہ اگر تم سب مال رکھ دو اور قیدیوں کو چھوڑ کر چپکے اپنے مکان کو چلے جاؤ تو میں اب بھی تمھاری جان بخشی کرتی ہوں! مگر اُنھوں نے جس طرح بیچاری بڑھیا کی منت وسماجت پر کچھ خیال نہیں کیا تھا اُسی طرح اس کی بات پر بھی کچھ توجہ نہ کی۔ لیکن جب اُس نے آن کی آن میں تین چار تیر مار کر اُتنے ہی سپاہیوں کو زمین پر گرا دیا تب تو وہ سخت حیران ہوتے! اور فوراً اپنی کمانیں سنبھال لیں۔ لیکن لڑکی اُن کی زد سے بہت دور تھی اور ہنستی تھی کہ کیا خوب! یہ نامرد اب اپنے رفیقوں کا بدلہ لینا چاہتے ہیں۔ الغرض وہ اس زور سے تیر مارتی اور ایسا ٹھیک نشانہ لگاتی تھی کہ جسے دیکھ کر یہ خوف زدہ ہندوستانی سوار ہکا بکا رہ گئے اور اُس نے آدھے تو تیروں سے مار لئے اور باقی ماندہ پر تلوار پکڑ کر آن پڑی اور سب کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔

اورنگ زیب کی علالت ابھی یہ تاتاری سفیر دہلی ہی میں تھے کہ اورنگ زیب ایک سخت بیماری میں مبتلا ہوا۔ چنانچہ اُسے شدتِ بخار سے ہذیان ہوتا تھا۔ اور زبان ایسی اینٹھ گئی تھی کہ بات مشکل سے منہ سے نکلتی تھی طبیب ناامید ہو گئے تھے اور عموماً یہ افواہ اڑ گئی تھی کہ بادشاہ مر گیا ہے۔ گر روشن آرا بیگم کسی غرض سے اس بات کو چھپائے ہوئے تھی۔ اور یہ بھی مشہور ہو گیا تھا کہ راجہ جسونت سنگھ صوبہ دار گجرات شاہجہاں کو قید سے چھڑانے کے لئے چلا آتا ہے اور اسی ارادہ سے مہابت خاں صوبہ دار کابل بھی جس نے آخر کار اورنگ زیب کی اطاعت قبول کر لی تھی، تین چار ہزار سواروں کے ساتھ آگرہ کی طرف بڑھا آتا ہے۔ بلکہ لاہور سے بھی آگے نکل آیا ہے۔ اور یہ بھی شہرت تھی کہ اعتبار خاں خواجہ سرا۔ شاہجہاں جس کی حراست میں تھا نہایت بے قراری سے چاہتا ہے کہ اُس بڈھے بادشاہ کو رہائی دینے کی ناموری مجھے حاصل ہو۔

ادھر سلطان محمد معظم کا یہ حال تھا کہ امیروں کو وعدے وعید اور رشوتیں دے کر

اپنا طرف دار بنانے کے لئے کوشش کر رہا تھا یہاں تک کہ ایک روز رات کو بھیس بدل کر راجہ جے سنگھ کے مکان پر بھی گیا اور نہایت منت و سماجت کے ساتھ اُس سے کہا کہ آپ علانیہ طور پر میری جانب دار بن جائے اُدھر روشن آرا بیگم نے کئی ایک امیروں کے اتفاق سے جن میں (توپ خانہ کا افسرِ اعلیٰ) فدائی خان میر آتش بھی تھا یہ بندوبست کر رکھا تھا کہ اورنگ زیب کے تیسرے بیٹے سلطان اکبر کو جس کی عمر ابھی سات آٹھ ہی برس کی تھی تخت نشین کرے۔ ہر دو فریق نے یہ مشہور کر رکھا تھا کہ ہمارا اصل مدعا شاہجہاں کا قید سے چھڑا دینا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف عوام الناس کی تالیفِ قلوب کے لئے ایک بہانہ تھا اور یہ بھی غرض تھی کہ اگر بالفرض اعتبار خاں یا اور امیروں کی مخفی سازش سے وہ چھوٹ جائے تو لوگوں کی نظر میں ہماری بات بنی رہے حالانکہ جتنے ذی رتبہ اور مقتدر لوگ تھے۔ شاہجہاں کا دوبارہ تخت نشین ہونا دل سے کوئی بھی نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ بجز جسونت سنگھ اور مہابت خاں اور بعض اور امیروں کے جو علانیہ شاہجہاں کی مخالفت کے مرتکب نہیں ہوئے تھے ایسا کوئی بھی نہیں تھا جو اس بے چارے حق دار بادشاہ کو چھوڑ کر نمک حرامی سے کھلم کھلا اورنگ زیب کا ساتھی نہ بن گیا ہو اس لئے یہ لوگ بخوبی جانتے تھے کہ اُس کا قید سے نکل جانا گویا ایک بپھرے ہوئے شیر کا چھوٹ جانا ہے۔ اور اُس کی رہائی کے اندیشہ سے تمام اہلِ دربار ہراساں ہو رہے تھے اور سب سے زیادہ اعتبار خاں ڈر رہا تھا جو اس بیچارے بدنصیب قیدی بادشاہ سے بے وجہ بڑی سختیوں اور گستاخیوں سے پیش آتا رہا تھا۔ لیکن اورنگ زیب باوجود شدتِ مرض کے باپ کی نگہبانی اور سلطنت کے کام کی طرف سے غافل نہ تھا۔ اور اگرچہ سلطان معظم کو اُس کی تاکیدی ہدایت اور نصیحت یہی تھی کہ اگر میں مر جاؤں تو شاہجہاں کو قید سے چھوڑ دینا مگر اعتبار خاں کو جو فرمان بر زبان لکھواتا رہا اُن میں برابر یہ تاکید تھی کہ خبردار اپنے کام میں سستی اور غفلت نہ کرنا اور بیمار ہونے سے پانچویں روز جب کہ مرض نہایت شدت پر تھا اُس نے کہا کہ ہم کو دربار میں لے چلو جس سے یہ غرض تھی کہ بعض لوگوں کو جو اُس کے مر جانے کا گمان ہو گیا تھا وہ جاتا رہے اور کوئی عام شورش یا ایسا واقعہ جس سے شاہجہاں قید سے نکل جانے ہونے نہ پاتے۔ چنانچہ انھیں خیالات سے ساتویں اور نویں اور دسویں دن بھی دربار میں آتا رہا اور نہایت تعجب کی بات تو یہ ہے کہ تیرھویں روز اگرچہ

اتنی دیر تک غش میں رہا کہ عموماً اُس کا مرجانا مشہور ہوگیا مگر تاہم جوں ہی ذرا افاقہ ہوا تو باہر آیا اور راجہ جے سنگھ اور دو تین اور بڑے بڑے امیروں کو بلا بھیجا تاکہ لوگوں پر ثابت ہو جاوے کہ وہ زندہ اور سلامت ہے اور خدمت گاروں سے فرمایا کہ ہم کو پلنگ پر ذرا بٹھادو اور اعتبار خاں کے نام کچھ لکھنے کے لئے کاغذ اور قلم دان منگایا اور سلطنت کی بڑی مُہر جو ایک چھوٹی سی تھیلی میں جس پر بادشاہ کی دستی مُہر لگی ہوئی روشن آرا بیگم کے سپرد رہتی تھی ایک خاص آدمی کے ہاتھ منگوا بھیجی جس سے یہ امتحان منظور تھا کہ بیگم نے اپنی کسی ناجائز غرض کے لیے اُسے استعمال تو نہیں کیا۔ چنانچہ جس وقت میرے آغا نے یہ سب خبریں سنیں تو میں نے دیکھا کہ اُس کی زبان سے یہ الفاظ نکلے۔

"واہ واہ کیا استقلالِ طبع اور کیا حوصلہ ہے اورنگ زیب خدا تجھے سلامت رکھے تجھے ابھی بڑے بڑے کام کرنے ہیں۔ اور یقیناً ابھی تیری زندگی باقی ہے۔"

اور فی الحقیقت اس حالت کے بعد اُس کی صحت میں رفتہ رفتہ ترقی ہونے لگی۔

داراشکوہ کی بیٹی سے سلطان اکبر کے رشتہ کی تجویز

اب چونکہ اورنگ زیب کی طبیعت روز بروز اعتدال پر آتی جاتی تھی اُس کی یہ مرضی ہوئی کہ داراشکوہ کی بیٹی کو شاہجہاں اور بیگم صاحب کے پاس سے بلوا کر سلطان اکبر سے جس کی نسبت ولی عہد بنائے جانے کا احتمال ہے اُس کی شادی کردے جس سے اُس کی ولی عہدی کو تقویت ہونے کی اُمید تھی۔ کیونکہ یہ شاہزادہ اگرچہ ابھی بچہ ہے لیکن بہت سے مقتدر امرا اُس کے قرابتی ہیں اور نواز خاں (شاہنواز خاں صفوی) کے نواسہ ہونے کی وجہ سے ایسے خاندان سے علاقہ رکھتا ہے جو کسی زمانہ میں مسقط کے بادشاہ تھے۔ اور محمد سلطان اور محمد معظم کی مائیں[1] صرف راجاؤں کی بیٹیاں ہیں۔

اگرچہ بادشاہانِ ہند سلمان ہیں مگر ہندوؤں کے ہاں شادی کر لینے میں اُن کو کچھ تامل نہیں ہوتا خصوصاً جب کہ کوئی ایسا رشتہ امور سلطنت کے لئے مفید معلوم ہو اور خوبصورت بیوی بھی ہاتھ آئے۔ لیکن اورنگ زیب کا یہ منصوبہ چل نہ سکا کیونکہ شاہجہاں اور بیگم صاحب نے بڑی نفرت کے ساتھ اس سے انکار کیا بلکہ خود اس نو عمر شہزادی نے بھی

[1] پیچھے لکھا جا چکا ہے کہ ان دونوں کی مائیں علیحدہ علیحدہ نہ تھیں بلکہ ایک ہی رانی یعنی نواب بائی کے پیٹ سے تھے اور اکبر کی ننھیال کا شاہانِ مسقط کی نسل سے ہونا بھی جیسا کہ ہم پہلے ایک حاشیہ میں کہہ آئے ہیں صحیح نہیں ہے۔ س۔ ح

نہایت بیزاری ظاہر کی اور بچاری مدت تک اس خیال سے کہ کہیں اُسے زبردستی نہ لے جائیں نہایت تردد اور بے قراری کی حالت میں رہی اور علانیہ کہتی رہی کہ

"جان دیدوں گی! مگر اُس شخص کے بیٹے سے شادی نہ کروں گی جس نے میرے باپ کو مارا ہے"

اورنگ زیب کی شاہجہاں سے بعض جواہرت کی طلبی، اور اُس کا سختی سے انکار

اسی طرح اورنگ زیب شاہجہاں سے بعض خاص جواہرات کے حاصل کرنے میں بھی کامیاب نہ ہوا جن کو وہ اُس مشہور و معروف (تخت طاؤس) میں لگانا چاہتا تھا جس کو دیکھکر ایک عالم کو حیرت ہوتی ہے۔ قیدی بادشاہ نے نہایت غصہ سے یہ کہلا بھیجا کہ اورنگ زیب دانائی اور انصاف سے سلطنت کا کام کرتا رہے مگر تخت کے معاملہ میں دخل نہ دے۔ اور جواہرات کی بابت اگر مجھے پھر ستائیں گے تو خبردار ان پتھروں کو کوٹ کر چورا کردوں گا۔

ڈچوں کے سفیر کی باریابی

آخرکار ڈچوں نے بھی اورنگ زیب کو تخت نشینی کی مبارکباد دینے میں پیچھے رہنا نہ چاہا اور سفیر بھیجنے کا ارادہ کیا اور اس کام کے لئے اڈریکن کو تجویز کیا۔ جو اُن کی سورت کی کوٹھی کا کارپرداز اعلیٰ اور بہت متدین اور ذی لیاقت اور سلیم الرائے شخص تھا۔ اور چونکہ اُس کی یہ عادت تھی کہ تجربہ کار لوگوں کی رائے اور مشورت پر چلنے میں اُس کو کبھی انکار نہ ہوتا تھا اس لئے یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ اُس نے اس کام کو اپنے ہم وطنوں کے قابل انجام دیا۔ اورنگ زیب اگرچہ دربار کے ضابطوں اور دستوروں میں ہمیشہ بڑی کروفر اور شان و شوکت دکھاتا ہے۔ اور اپنی دینداری کا اظہار بھی بہت کرتا ہے اور اس لئے عیسائیوں کو ذرا حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے تاہم اس سفیر کے ساتھ وہ بڑی مہربانی اور اخلاق سے پیش آیا۔ بلکہ یہ فرمایا کہ ہماری یہ خوشی ہے کہ مسٹر اڈریکن اول ہندوستان کے دستور کے موافق آداب بجالائے یعنی آداب گاہ پر تسلیمات ادا کرے اور پھر نزدیک آکر خاص اپنے ملک کی رسم کے موافق سلام کرے اور اگرچہ یہ سچ ہے کہ جو خریطہ مسٹر اڈریکن لے کر حاضر ہوا تھا اورنگ زیب نے وہ ایک امیر کی وساطت سے لیا تھا مگر اس کو کچھ توہین کی علامت سمجھنا نہیں چاہیے۔

اے ڈری گ ن

کیونکہ ازبکوں کے سفیروں کے ساتھ بھی ایسا ہی عمل ہوا تھا۔ ان ابتدائی رسوم کے طے ہونے کے بعد مسٹر ایڈریکین کو اپنے تحائف پیش کرنے کا حکم ہوا اور اُس کو اور اُس کے چند یورپین ہمراہیوں کو زربفت کے "سراپا" پہنائے گئے۔ چنانچہ منجملہ اُن تحائف کے کچھ تو سُرخ اور سبز رنگ کی عمدہ بانات کے تھان تھے اور کچھ بڑے بڑے آئینے اور کچھ چین اور جاپان کی بنی ہوئی عمدہ چیزیں جن میں ایک پالکی اور تخت رواں نہایت ہی خوبصورت تھا جو بہت ہی پسند کیا گیا۔

شاہانِ مغلیہ کی یہ عادت ہے کہ غیر ملکوں کے سفیروں کو جہاں تک ممکن ہوتا ہے اس غرض سے ٹھیراتے رکھتے ہیں کہ اُن کا دربار میں حاضر رہنا اور آداب و تعظیم بجا لانا سلطنت کی شان و شوکت کا باعث[1] ہے۔ پس ایڈریکین بھی جس جلدی کے ساتھ رخصت ہونا چاہتا تھا نہ ہو سکا۔ اگرچہ تاتاری سفیروں کی نسبت اُس کو بہت جلد رخصت حاصل ہو گئی یعنی جب اُس کا سکرٹری دہلی ہی میں چل بسا اور کئی اور شخص بھی بیمار ہو گئے تو اورنگ زیب نے اس کو رخصت کر دیا اور زربفت کا ایک "سراپا" اُس کو اور اُس سے بھی زیادہ قیمت کا "سراپا" اور جڑاؤ خنجر اور مہربانی آمیز ایک شقہ بٹیویا[2] کے گورنر کے لئے عنایت ہوا۔

سفیر کے بھیجنے سے ڈچوں کی اصل غرض یہ تھی کہ دربار میں رسائی پیدا کر کے بادشاہ کا التفات حاصل کریں اور اپنی قوم اور اپنے ملک کے حال سے اُس کو کسی قدر مطلع کریں تا کہ

---

[1] ظاہرا یہ صرف مصنف کا قیاس معلوم ہوتا ہے ورنہ ممالک ایشیا کی رسم کے موافق مہمان کا زیادہ دیر تک ٹھیرانا خوش خلقی کی نظر سے ہوتا ہے۔ س م ح

[2] بٹیویا ملک ہالینڈ کا قدیم نام ہے اور لفظ بٹی سے مشتق ہے جو ایک چھوٹی سی قوم تھی جو جرمنی کے اُن ضلعوں میں رہتی تھی جو زمانہ حال میں اس کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ قوم سنہ عیسوی سے ایک سو برس پہلے وہاں سے اٹھکر ہالینڈ میں آ بسی تھی اور اس کی وجہ سے پُرانے زمانہ میں ہالینڈ کا نام بٹیویا مشہور ہو گیا تھا۔ مگر جس بٹیویا کا ذکر مصنف نے کیا ہے وہ جزیرہ جاوہ میں کوئی پچاس ہزار آدمی کی آبادی کا ایک شہر اور ڈچوں کے مقبوضات کا دارالحکومت ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے اپنے ملک کی مناسبت سے اس کا یہ نام رکھدیا ہے۔ ماخوذ از جام جم۔ س م ح

بندرگاہوں اور دوسرے مقامات کے حاکموں اور عالموں کے دل پر جہاں اُن کی تجارتی کوٹھیاں تھیں اُن کے بارے میں اچھا اثر پیدا ہوا اور اُن کو امید تھی کہ یہ لوگ یہ معلوم کرکے کہ ڈچ بھی ایک زبردست سلطنت کی رعایا ہیں اور بادشاہ تک رسائی رکھتے اور خود اس کی خدمت میں اپنا عرض حال کرکے انصاف حاصل کر سکتے ہیں ہماری حقارت نہ کیا کریں گے اور نہ تجارت میں خلل انداز ہوں گے۔ چنانچہ ان لوگوں نے اہل دربار کو اس بات کے یقین دلانے میں کہ ہماری تجارت سے ہندوستان کو بہت بڑا فائدہ ہے بہت کوشش کی اور بہت سی جنسیں جو وہ یہاں سے خریدتے تھے اُن کی ایک بڑی لمبی چوڑی فہرست اس غرض سے دکھلاتے تھے کہ اُن کے ذہن نشین ہو جائے کہ اُن جنسوں کے خریدنے کے لئے وہ بہت سا سونا چاندی اپنے ملک سے یہاں لاتے ہیں۔ مگر اس بات کو ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے کہ سال بسال تانبا۔ سیسا۔ دارچینی۔ لونگ۔ جاپھل۔ کالی مرچیں۔ عود اور ہاتی وغیرہ بیچ کر کس قدر دولت کھینچ لے جاتے ہیں۔

اصولِ جہانبانی پر اورنگ زیب کی تقریر

انھیں دنوں ایک بڑے امیر نے اورنگ زیب سے عرض کیا کہ حضور جو کام میں اس قدر محنت فرماتے ہیں اس سے اندیشہ ہے کہ صحت جسمانی بلکہ قوائے دماغی کو ضعف پہنچے۔ جس کو سُن کر بادشاہ نے اس عقلمند ناصح کی طرف سے تو منہ پھیر لیا گویا سُنا ہی نہیں اور ذرا ٹھیر کر ایک اور بہت بڑے امیر کی طرف جو نہایت دانا اور ذی علم تھا متوجہ ہو کر فرمایا (اس کی یہ تقریر خاص اس امیر کے بیٹے نے جو ایک نوجوان طبیب اور میرا دلی دوست تھا مجھ سے نقل کی تھی) کہ آپ تمام اہل علم اس باب میں متفق الرائے ہیں کہ مشکل اور خوف کے زمانے میں بادشاہ کو جان جوکھوں میں پڑ جانا اور ضرورت کے وقت رعایا کی بہتری کے لئے جو خدا نے اُس کے سپرد کی ہے تلوار پکڑ کر میدان جنگ میں جان دے دینا فرض و واجب ہے۔ مگر اس کے برعکس یہ نیک اور باتمیز شخص یہ چاہتا ہے کہ رعایا کے آرام و آسائش کے لئے مجھے ذرا بھی تکلیف نہ اٹھانی چاہئیے اور بغیر اس کے کہ اُن کی رفاہ و فلاح کی تدبیروں کے سوچنے میں مجھے ایک رات بھی بے آرام رہنا پڑے یا ایک دن بھی بے عیش و عشرت اور لہو و لعب کے بسر ہو یہ مدعا یوں ہی حاصل ہو جائے اور اس کی یہ رائے ہے کہ میں صرف اپنی تندرستی کو

مقدم جانوں اور زیادہ تر عیش و عشرت اور آرام و آسائش میں مصروف رہوں اور اس کا یہی نتیجہ ہو سکتا ہے کہ میں اس وسیع سلطنت کے کام کو کسی وزیر کے بھروسہ پہ چھوڑ بیٹھوں مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اس امر پر غور نہیں کیا کہ جس حالت میں مجھے خدا نے شاہی خاندان میں پیدا کرکے تخت پر بٹھایا ہے تو دنیا میں اپنے ذاتی فائدہ کے لئے نہیں بھیجا بلکہ اوروں کے آرام کے لئے محنت کرنا مجھ پر فرض کیا گیا ہے پس میرا کام یہ نہیں ہے کہ اپنی ہی آسائش کی فکر کروں البتہ انھیں کے رفاہ کی غرض سے جس قدر آرام لینا ضروری ہے اس کا مضائقہ نہیں اور بجز اس حالت کے کہ انصاف و عدالت اس کی متقضی ہو یا اقتدار سلطنت کے قائم رکھنے یا ملک کی حفاظت کے لئے ضروری ہو اور کسی صورت میں رعایا کے آرام و آسائش کا نظر انداز کرنا جائز نہیں ہے اور رعیت کی آسائش و بہبودی ہی ایک ایسی چیز ہے کہ جس کی فکر مجھے ہونی چاہیئے۔ مگر یہ شخص اس بات کی تہ کو نہیں پہنچا کہ اس آرام سے جو یہ میرے لئے تجویز کرتا ہے کیا کیا قباحتیں پیدا ہوں گی اور یہ بھی اس کو معلوم نہیں کہ دوسروں کے ہاتھ میں حکومت کا دیدینا کیسی بُری بات ہے۔ اور سعدی نے جو یہ کہا ہے کہ

"پادشاہوں کو چاہیئے کہ بذات خود کاروبار سلطنت کا بوجھ اپنے اوپر لیں ورنہ بہتر ہے کہ پادشاہ کہلانا چھوڑ دیں"

تو کیا اس بزرگ کا یہ قول لغو ہے؟ پس اپنے اس دوست سے کہدیجئے کہ اگر ہم سے تحسین و آفرین حاصل کرنا چاہتا ہے تو جو کام اس کے سپرد ہے اس کو اچھے طور سے کرتا رہے۔ اور خبردار! ایسی صلاح جو بادشاہوں کے سننے کے لائق نہیں ہے پھر کبھی نہ دے اور افسوس ہے کہ تن پروری اور آرام طلبی اور ایسے خیالات سے جو دوسروں کے فلاح و بہبود کے فکر و تردد میں آدمی کو گھلا ڈالتے ہیں۔ بچنے کی خواہش انسان کی طبعی اور جبلی کمزوری ہے پس ایسے فضول صلاح کاروں کی ہم کو حاجت نہیں عیش و آرام کے مشورے تو ہماری بیگمیں بھی دے سکتی ہیں۔

ایک خواجہ سرا کے عشق کا واقعہ

انھیں دنوں میں ایک ایسا افسوسناک واقعہ دہلی میں ہوا کہ جس کا تمام شہر اور بالخصوص شاہی محل سرا میں بہت چرچا تھا اور جس سے میری اور لوگوں کی اس رائے کی کہ جو شخص

رجولیت سے محروم کر دیا جائے اُس کو تعشق نہیں ہو سکتا۔ غلطی ثابت ہو گئی[1] یعنی دیدار خاں نامی ایک ذی رتبہ خواجہ سرا نے ایک مکان بنایا تھا جہاں تفریح خاطر کے لئے کبھی کبھی جاتا اور بعض اوقات رات کو وہیں سو بھی رہتا تھا اور اُس کے ہمسایہ میں ایک ہندو کا گھر تھا جو عرائض نویسی وغیرہ کا کام کیا کرتا تھا۔ یہ خواجہ سرا اس کی بہن پر جو بہت خوبصورت تھی عاشق ہو گیا اور اگرچہ کچھ عرصہ تک ان کا باہم ناجائز تعلق رہا مگر کسی کو کچھ شبہ نہ ہوا کیونکہ یہ خوجہ تھا اور زنانہ میں آنے جانے سے خوجوں کو کوئی کبھی نہیں روکتا ـــــ مگر آخر کار ان کا تعشق یہاں تک بڑھ گیا کہ اُس ہندو کو بھی اس قسم کی خبریں پہنچ گئیں کہ لوگ اُس کی بہن کی پاک دامنی کی نسبت شبہ کرتے ہیں اور اُس نے غصہ میں آکر اپنے دل میں یہ ٹھان لی کہ اگر یہ سچ ہے تو دونوں کو مار ڈالوں گا چنانچہ کچھ زیادہ عرصہ نہ لگا کہ ایک رات کو یہ دونوں اکٹھے سوتے دیکھ لئے گئے۔ پس اس نے دیدار خاں کو تو چھاتی میں خنجر مار کر مار ڈالا اور بہن کو بھی ایسا زخمی کیا کہ اُس کی دانست میں مر ہی چکی تھی اور اس واردات سے محل سرائے شاہی میں نہایت تہلکہ اور شور و شر پیدا ہوا۔ اور خواجہ سراؤں اور محل کی عورتوں نے باہم ایکا کر لیا کہ جس طرح بنے اس شخص کو قتل کرنا چاہیے۔ چنانچہ اورنگ زیب جو اس ہندو کے مسلمان ہو جانے کو اُس کے اس گناہ کا کافی کفارہ خیال کرتا تھا اگر خواجہ سراؤں کے جوش و خروش پر ناراض نہ ہو جاتا تو اُس کا بچنا مشکل تھا مگر اس پر بھی لوگوں کی رائے عموماً یہ ہے کہ خواجہ سراؤں کی عداوت اور اُن کے زور و اثر کی وجہ سے یہ بے باک شخص سلامت نہ رہ سکے گا۔

ہندوستانیوں کا یہ خیال ہے کہ اگرچہ خصی کر دینے سے جانور غریب اور سیدھا ہو جاتا ہے مگر آدمی پر اس عمل کا اثر برعکس ہوتا ہے اور اُن کا قول ہے کہ کیا کوئی خواجہ سرا ایسا بھی ہے جو شریر اور مغرور اور بے رحم نہ ہو؟ حالانکہ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں بہت سے وفادار اور فیاض اور شجاع بھی ہوتے ہیں۔

انھیں دنوں اورنگ زیب کو روشن آرا بیگم پر دو نامحرم شخصوں کو محل میں بلا لینے

---

[1] مصنف نے باوصف اس قدر قابلیت کے خدا جانے یہ کیا لکھدیا ہے۔ حالانکہ سیدھی بات ہے کہ اُس کے خوجہ بنانے میں کوئی کسر رہ گئی ہوگی۔ س م ح

کا شبہ ہوا اور وہ بہت ناراض ہوا مگر چونکہ شبہ ہی تھا اس لیے بھائی بہن میں جلد صفائی ہو گئی اور اورنگ زیب ان دونوں آدمیوں کے ساتھ اس بے رحمی سے بھی پیش نہیں آیا جو شاہجہان نے اُس بدبخت گرفتار عشق سے برتی تھی جو حمام کی دیگ میں جا چھپا تھا میں اس قصہ کو ٹھیک اُسی طرح پر کہ جس طرح ایک دوغلی پرتگیزن بڑھیا نے جو بہت عرصے سے لونڈیوں کے طور پر محل میں خدمت کرتی اور باہر آنے جانے کی بھی مجاز تھی مجھے سنایا تھا بیان کرتا ہوں۔

روشن آرا بیگم نے ان میں سے اول تو ایک جوان کو کئی دن تک اپنے پاس چھپائے رکھکر حظِ صحبت حاصل کیا۔ اور بعد ازاں بعض اپنی خدمت گار عورتوں کو جنھوں نے وعدہ کرلیا تھا کہ ہم رات کی تاریکی میں اُس کو محل سے باہر کردیں گے سپرد کردیا۔ مگر یا تو ان عورتوں کو ایسا کرتے ہوئے کسی نے دیکھ لیا یا وہ خود ہی افشائے راز کے اندیشے سے ڈر گئیں یا کچھ اور سبب ہوا۔ لیکن خلاصہ یہ ہے کہ وہ تو اُس کو چھوڑ کر بھاگ گئیں۔ اور یہ خوف زدہ نوجوان محل کے باغوں میں اکیلا اور حیران پھرتا ہوا پکڑا گیا اور محل کے پاسبان وغیرہ اس کو کشاں کشاں اورنگ زیب کے حضور میں لے گئے چونکہ باوجود بہت ہی پرسش اور تفتیش کے اُس نے کسی جرم کے ارتکاب کا اقرار نہ کیا اور صرف اتنا ہی کہا کہ میں دیوار پر سے کود کر اندر آگیا تھا اس لیے اورنگ زیب نے حکم دیا کہ جس طرح سے یہ شخص یہاں تک آیا ہے اس کو چاہیے کہ اُسی طور سے باہر نکل جائے۔ لیکن خواجہ سراؤں نے بادشاہ کے حکم سے غالبًا تجاوز کر کے اُس کو دیوار سے نیچے گرا دیا۔ اور دوسرا شخص بھی اسی طرح باغ میں ادھر اُدھر پھرتا ہوا پکڑا گیا تھا اور اُس نے ظاہر کیا کہ میں دروازے کے راستہ سے آیا ہوں جس پر بادشاہ نے اُس کو تو اسی راستہ سے باہر نکلوا دیا مگر خواجہ سراؤں کو عبرتًا سخت سزا دینے کا مصمم ارادہ کیا کیونکہ نہ صرف حفظِ ناموس کی خاطر بلکہ بادشاہ کی ذات خاص کی حفاظت کے لیے بھی محل سرا کی ڈیوڑھی کا زیادہ سخت انتظام کیا جانا ضروری تھا۔

مکہ، یمن، بصرہ اور حبش کے ایلچیوں کی آمد اس واقعہ سے چند مہینے بعد قریبًا ایک ہی وقت میں پانچ ایلچی دہلی میں آئے۔ چنانچہ ان میں سے جو سب سے پہلے آیا وہ شریف مکہ کی طرف سے تھا۔ اور جو تحائف وہ لایا تھا اُن میں

چند عربی گھوڑے اور ایک جھاڑو تھی جو اُس معبد کے جھاڑنے بہارنے کے کام میں آچکی تھی جو اُس مشہور و معروف مسجد کے وسط میں بنا ہوا ہے۔ جو مکہ میں ہے اور جس کی مسلمان لوگ بڑی تعظیم کرتے اور اُس کو "بیت اللہ" یعنی خدا کا گھر کہتے ہیں اور اُن کا یہ اعتقاد ہے کہ یہ سب سے پہلا مکان ہے جو خدائے برحق کی عبادت کے واسطے مخصوص کیا گیا تھا اور اس کو حضرت ابراہیمؑ نے بنایا تھا۔

دوسرا ایلچی بادشاہ یمن نے بھیجا تھا۔ اور تیسرا البصرہ کے "پرنس"[1] نے اور یہ دونوں بطور تحفہ عربی گھوڑے لائے تھے اور باقی دو سفیر شاہ اتھوپیا (حبش) کے تھے۔ ان میں سے پہلے تین سفیروں کی خاطر تواضع اس قدر کم ہوئی جو بمنزلہ نہونے کے تھی۔ کیونکہ اُن کا ساز و سامان ایسا حقیر تھا کہ ہر ایک شخص یہ خیال کرتا تھا کہ اُن کا آنا صرف اِس غرض سے ہے کہ جو تحفے وہ لائے تھے اُن کی اور نیز اُن بہت سے گھوڑوں اور تجارتی جنسوں کی عوض جو اپنا ذاتی اسباب بنا کر بلا ادائے محصول ساتھ لے آئے تھے بہت سا روپیہ کما کر لے جائیں۔ چنانچہ فی الواقع جو روپیہ اُن کے تحائف کی عوض میں اور سوداگری مال و اسباب کے فروخت سے حاصل ہوا تھا اُس سے انھوں نے یہاں کی تجارتی جنسیں خریدیں اور بلا ادائے محصول اُن کو اپنے ساتھ لے جانے کا استحقاق ظاہر کیا۔

مگر شاہ حبش کی طرف سے جو ایلچی آئے تھے اُن کا حال کسی قدر توجہ طلب ہے۔ اِن سفیروں کے آنے کا یہ سبب تھا کہ جو انقلاب سلطنت یہاں وقوع میں آیا تھا شاہ حبش کو اُس کی تفصیلی خبر پہنچ چکی تھی اس لیے اُس کو یہ خواہش ہوئی کہ اپنے اقتدار اور شان و عظمت کے موافق سفارت بھیج کر اس وسیع سلطنت میں اپنی ناموری کی دھاک بٹھائے۔ لیکن بدگمان لوگوں کا یہ قول تھا اور فی الواقع سچ بھی تھا کہ سفیروں کے بھیجنے سے صرف وہ قیمتی تحائف اس حبشی کے مدنظر تھے۔ جن کے

---

[1] عالمگیرنامہ میں اس کا نام حسین پاشا لکھا ہے جو اول ٹرکی کی طرف سے بصرہ کا حاکم تھا اور پھر سلطان کی ناراضگی کی وجہ سے اورنگ زیب کا آن کر نوکر ہوگیا تھا۔ س۔م۔ح ۱۲

اورنگ زیب کے فیاض ہاتھوں سے حاصل ہونے کی قطعی اُمید تھی۔ اور جو ایلچی اُس نے بھیجے تھے فی الواقع اُس کے دربار میں بہت معزز و ممتاز اور اُن بڑے بڑے مقاصد کے حاصل کرنے کے قابل تھے جو اُس کے مد نظر تھے۔ چنانچہ ان میں سے ایک ایلچی تو ایک مسلمان[1] سوداگر تھا جو چند سال ہوئے جب کہ میں بحر احمر کے راستہ سے بندر مخا میں آیا تھا وہاں مجھکو ملا تھا اور اُس کے "عظیم الشان آقا" نے بہت سے غلام دے کر اس غرض سے بھیجا تھا کہ اُن کو بیچ کر اس روپیہ سے جو ہاتھ آئے ہندوستانی مال و اسباب خرید لائے۔ واہ عیسائی ہوکر یہ نامور افریقی بادشاہ کیا عمدہ تجارت کرتا ہے۔ اور دوسرا ایک عیسائی ارمنی سوداگر تھا جو حلب میں پیدا ہوا اور وہیں اُس نے شادی بھی کرلی تھی اور اتھوپیا میں اس کا نام مراد مشہور تھا۔ اور مخا میں اس سے بھی میری ملاقات ہوئی تھی اور اُس نے نہ صرف اپنا نصف مکان میرے لئے خالی کردیا تھا بلکہ وہ صلاح بھی اسی نے دی تھی جس کی بناء پر میں نے حبش کو جانا ملتوی کردیا تھا جس کا ذکر میں نے اپنی اس کتاب کے شروع میں کیا ہے۔ اور یہ بھی اُسی مذکورہ بالا غرض سے وہاں بھیجا ہوا آیا تھا۔ یہ شخص ہر سال مخا میں شاہ اتھوپیا کی طرف سے انگریزوں اور ڈچوں کی کمپنیوں کے لئے جو ہندوستان میں تجارت کرتی ہیں تحفتہً چیزیں لاتا اور اُن کی دی ہوئی اشیاء اپنے بادشاہ کے لئے گزارے جاتا ہے۔ چونکہ یہ بادشاہ یہ چاہتا تھا کہ اس کے سفیر ایسی شان و شوکت کے ساتھ جائیں جو اس موقعہ کے لائق ہو۔ پس اُس نے اُن کے اخراجات کے لئے بڑی ہی فیاضی ظاہر کی۔ یعنی دونوں کو تیس تیس جوان لونڈیاں اور غلام عنایت کئے کہ اُن کو مخا میں بیچ کر جو روپیہ اس مبارک تدبیر سے ہاتھ آئے اُس کو معاملات سفارت میں خرچ کریں۔ واہ واہ کتنی بڑی فیاضی ہے کیونکہ مخا میں جوان لونڈی غلام بحساب اوسط پچیس یا تیس کراؤن[2] قیمت پاتا ہے۔ ان کے علاوہ نہایت ہی چھانٹ کر پچیس غلام خاص اورنگ زیب کے لئے بھیجے تھے جن میں

---

[1] اس کا نام عالمگیر نامہ میں سیدی کامل لکھا ہے اور دوسرے شخص کا اس کتاب میں کچھ ذکر نہیں ہے۔ س م ح

[2] چونکہ ایک کراؤن پانچ شلنگ کا ہوتا ہے جو انگلستان کا ایک چاندی کا سکہ اور ہندوستان کی اس وقت کی اٹھنی کے برابر ہے۔ پس اس حساب سے ان غلاموں کو قریب ڈھائی ہزار روپیہ کی قیمت کا سمجھنا چاہئے۔ س م ح

تو یا دس بہت کم سن اور خوجہ بنانے کے قابل تھے ۔ واہ کیا کہنا ہے ایک عیسائی بادشاہ نے ایک مسلمان بادشاہ کے لئے کیا ہی مناسب تحفہ بھیجا تھا! جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گو آتھوپیا میں مذہب عیسوی کی کیا حالت ہے ۔ ان کے علاوہ شہنشاہ مغل کے لئے پندرہ حبشی گھوڑے جو عربی گھوڑوں کے برابر سمجھے جاتے ہیں اور چھوٹی قسم کا ایک[۱] خچر جس کی کھال میں نے بھی دیکھی تھی جو ایسی خوبصورت تھی کہ کسی شیر کے بھی ایسے خط وخال نہیں ہوتے اور نہ ہندوستان کے کسی الاچہ میں جو ایک قسم کا ریشمی کپڑا ہوتا ہے ایسی خوش نما اور طرح طرح کی دھاریاں ہوتی ہیں ۔ اور ہاتھی کے دو دانت جو معمول سے زیادہ ایسے بڑے اور بھاری تھے کہ ایک مضبوط شخص اُن میں سے ایک کو زمین سے بمشکل اٹھا سکتا تھا اور بیل کا ایک بہت بڑا سینگ جس میں سیوٹ[۲] بھری ہوئی تھی اور جس کا قطر منہ کی طرف سے نصف فٹ فرانسیسی سے زیادہ میرے ناپنے میں آیا تھا ان سفیروں کو سپرد ہوئے تھے ۔

یہ دونوں ایلچی جب ایسے شاہانہ اور فیاضانہ طور پر ساز و سامان سے دُرست کئے جاکر گونڈارسے جو ملک حبش کا پائے تخت اور صوبۂ ڈیمبیا میں ہے روانہ کئے گئے تو اُن کو ایک ویران ملک میں سے گذرنا پڑا ۔ اور بہلول تک پہنچنے میں جو باب المندب کے قریب مخا کے مقابل ایک غیر آباد بندرگاہ ہے دو مہینے لگے ۔ ان لوگوں کے کارواں کے مقررہ راستہ سے جو چالیس روز میں بآسانی طے ہوجاتا ہے آرکیکو کو جانے کی جرأت نہ کرنے کا یہ باعث تھا کہ آرکیکو سے جزیرہ مصوع کو جانا پڑتا ہے ۔ جہاں سلطنت ٹرکی کی کچھ فوج رہتی ہے ۔ جب کہ یہ لوگ بحراحمر سے عبور کرنے کی خاطر مخا کو جانے والے جہاز کے انتظار میں بہلول میں ٹھیرے ہوئے تھے اشیائے مایحتاج کے موجود نہ ہونے سے بہت تکلیف میں رہے اور کئی غلام مرگئے اور اس کے سوا مخا میں پہنچنے پر یہ معلوم ہوا کہ اب کی دفعہ میوے بہت کثرت سے آتے ہیں اور اس لئے جو لونڈیاں

---

[۱] غالباً زیبرا مراد ہے جو چھوٹے ٹٹو جیسا ہوتا ہے اور جس کی کھال نہایت خوبصورت دھاری دار ہوتی ہے عموماً افریقہ سے برآمد کیا جاتا ہے۔

[۲] سیوِیٹ مشک وغیرہ خوشبودار حیوانی مادوں کو بھی کہہ سکتے ہیں ۔ مگر خصوصیت کے ساتھ اُس خوشبودار اور بہت گاڑھی چیز کو کہتے ہیں جو مشک بلائی کی دم کے نیچے ایک تھیلی میں چربی کے طور کی ہوتی ہے ۔ ماخوذ از ناداو گلوبنز ڈکشنری س م ع

غلام باقی رہ گئے تھے وہ بھی کم قیمت پر بیچنے پڑے۔ بہرحال جب لونڈی غلام بک چکے تو اُنھوں نے اپنا سفر پھر شروع کیا اور ایک ہندوستانی جہاز پر سوار ہو کر جو سورت کو آتا تھا۔ پچیس دن کے عرصے میں جو اس سفر کے لئے چنداں زیادہ نہ تھا منزلِ مقصود پر پہنچ گئے۔ مگر بہت سے گھوڑے اور کئی ایک غلام غالبًا کافی خوراک نہ ملنے سے مرگئے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ اس باشان وشوکت سفارت کے پاس اتنا روپیہ کہاں تھا جو خرچ کے لئے کفتی ہوتا۔ اور جہاز ہی میں وہ بے چارہ خچر بھی مرگیا۔ لیکن یہ اُس کی کھال حفاظت سے لیتے آئے۔ جس کو میں نے بھی دہلی میں دیکھا تھا۔

ان کو سورت میں پہنچے ہوئے چند ہی گھنٹے گذرے تھے کہ بیجا پور کے ایک مشہور باغی نے جس کا نام سیواجی ہے شہر کو آ کر لوٹ لیا اور آگ لگادی اور اس عام آتش زدگی میں اگرچہ وہ مکان بھی جہاں یہ ٹھہرے ہوئے تھے جل گیا مگر آگ اور دشمن دونوں کے ہاتھ سے جس طرح بن پڑا اُن کی سفارت کی سندیں اور وہ چند غلام جو کسی وجہ سے ہاتھ سیواجی کے ہتے نہ چڑھے یا جن کو بیمار دیکھکر اُس نے خود ہی چھوڑ دیا اور ان سفیروں کے حبشی لباس جو اُس کو پسند نہ آئے اور وہ خچر کا چمڑہ جس کی اُس نے کچھ پروا نہ کی اور وہ بیل کا سینگ جس کو سیویٹ سے پہلے ہی خالی کر چکے تھے۔ بچ رہے۔

ان عالی شان سفیروں نے اپنے لٹ جانے کی نسبت بڑے بڑے مبالغے کئے مگر بدگمان ہندوستانی جنھوں نے ان کو جہاز سے اُترتے وقت اس حالت میں دیکھا تھا کہ نہ تو اچھا لباس ولپوشاک ہی تھی اور نہ روپیہ یا کسی مہاجن کے نام کی ہنڈی ہی پاس تھی بلکہ فاقوں کے مارے نیم مردہ ہو رہے تھے یہ کہتے تھے کہ فی الواقع یہ تو ان کی خوش نصیبی تھی۔ کہ سورت کے لٹنے اور جلائے جانے کے باعث یہ اُس ذلت سے بچ گئے جو ان کو اپنے ذلیل اور ناچیز تحائف کے دہلی تک لانے میں اُٹھانی پڑتی۔ اور سیواجی کی بدولت ان کو سورت کے صوبہ دار کے سامنے فقیرانہ حالت میں جانے اور دارالسلطنت تک پہنچنے کے لئے خرچ سواری مانگنے کا ایک عمدہ بہانہ ہاتھ آگیا۔ اور غلام اور سیویٹ بیچ کر کھا جانے کے الزام سے بھی بری رہے[1]

---

[1] حبشہ کی سفارت ممکن ہے ایسی شان دار نہ ہو جیسی دوسری سفارتیں لیکن برنیئر کا اس حقارت کے ساتھ مذاق اُڑانے کا اصل سبب وہی مذہبی اور فرقہ وارانہ تعصب ہے۔ جو رومن کیتھولک گرجا کا خصوصی وصف

میرے لائق دوست ٹوچوں کے کارخانہ کے مختار مسٹر ایڈ رکین نے مراد کو میرے نام کی ایک سفارشی چٹھی دی تھی جو اُس نے دہلی میں آکر مجھے دی اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ پانچ چھ برس بعد اُس سے اس طرح پھر ملاقات ہوئی۔ وہ اِس بات کو بالکل بھول گیا تھا کہ میں مخا میں اُسی کے ہاں ٹھیرا تھا۔ میں اپنے پُرانے دوست سے بغل گیر ہوا اور وعدہ کیا کہ حتی الوسع میں تمھاری مدد کروں گا۔ اگرچہ اہل دربار میں میری بہت کچھ رسائی اور ملاقات تھی مگر ان تہی دست ایلچیوں کی امداد ایک مشکل کام تھا۔ کیونکہ بجز خچر کے اُس چمڑے اور بیل کے اُس سینگ کے جس میں اُنھوں نے اپنے پینے کے لئے قندی شراب جو اُن کو بہت مرغوب ہے بھر رکھی تھی اور کچھ باقی نہ تھا اور بیش قیمت تحائف کے موجود نہ ہونے سے لوگوں کی نظروں میں جو اُن کی حقارت تھی اُس کو اُن کی ظاہری ذلیل حالت نے اور بھی بڑھا دیا تھا اور وہ بدووں کا سا لباس پہنے ہوئے پالکی کے بغیر پاپیادہ شہر میں پھرا کرتے تھے اور سات آٹھ غلام سروپا برہنہ پیچھے پیچھے ہوتے تھے جن کے پاس سوائے ایک مکروہ چھوٹے سے تہہ بند اور ایک پھٹی پُرانی چادر کے جسے بائیں کاندھے پر ڈوال کر دا ہنے بازو کے نیچے سے نکالے ہوتے ہوتے تھے کوئی پوشاک اور لباس نہ تھا اور بجز ایک ٹوٹی پھوٹی کرایہ کی بہلی اور ایک گھوڑے کے جو ہمارے پادری صاحب کا تھا اور کوئی گھوڑا بھی ان کے پاس نہ تھا۔ یا کبھی کبھی میرا گھوڑا مانگ لیتے تھے جس کو اُنھوں نے سواری سے لے کر قریب المرگ کر دیا تھا۔ پس ہر چند میں نے ان ذلیل اور حقیر سفیروں کے لئے بہت کوشش کی مگر کچھ فائدہ نہ ہوا کیونکہ لوگ اُن کو نفتیہ سمجھکر کچھ ملتفت نہ ہوتے تھے۔ لیکن بہرحال ایک روز جبکہ میں اپنے آقا دانشمند خاں کے پاس (جو ممالک غیر کے معاملات کا وزیر ہے) خلوت میں بیٹھا تھا میں نے شاہ اتھوپیا کی شان وعظمت کا ذکر ایسی آب وتاب سے کیا کہ اورنگ زیب ان کو اپنے حضور میں بُلانے اور خریطے کے قبول کرنے پر مائل ہو گیا۔ اور جب یہ حاضر ہوتے تو دونوں کو زربفت کا ایک ایک "سراپا" اور ریشمی زری کار پٹکا اور مندیل عنایت کی اور مراسم مہمانداری کے لئے بھی حکم ہو گیا۔ اور چند ہی روز بعد جب رخصت کئے گئے تو پھر ایک ایک "سراپا" معہ چھ ہزار روپیہ نقد کے مرحمت ہوا مگر یہ روپیہ مساوی طور پر نہ دیا گیا تھا بلکہ مسلمان کو چار ہزار اور مراد کو عیسائی ہونے کی

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ برہان ہے اور جیسا کہ وہ خود آغاز کتاب میں ذکر کر آیا ہے حبشہ سے اس عیسائی فرقہ کو نکال دیا گیا تھا۔

وجہ سے صرف دو ہزار ملا۔

اور اُن کے آقا کے لئے بطور تحفہ ایک نہایت بھاری "سراپا" اور چاندی کے ملمع کی دو شہنائیاں اور دو چاندی کے نقارے اور یاقوت کے جڑاؤ قبضہ کا ایک خنجر اور بیس ہزار روپیہ نقد عنایت ہوا۔ اور چونکہ ملک حبش میں سکہ کا چلن نہیں ہے اس لئے اورنگ زیب نے براہ مہربانی یہ فرمایا کہ امید ہے یہ نقد تحفہ خصوصیت کے ساتھ قبولیت کے لائق ہوگا۔ اور ایک اعجوبہ چیز خیال کیا جائے گا۔ مگر شہنشاہ مغل خوب جانتا تھا کہ ان میں سے ایک روپیہ بھی ہندوستان سے باہر نہ جائے گا اور یہ لوگ اُس سے کارآمد جنسیں خرید لیں گے۔ چنانچہ ویسا ہی ہوا اور اُنھوں نے اس روپیہ سے کچھ تو گرم مصالحے لے لئے اور کچھ مہین سوتی کپڑے کے تھان پادشاہ اور ملکہ اور ولی عہد کے پیراہنوں کے لئے اور الایچے جو ایک ریشمی دھاری دار کپڑا ہے اور سنہری یا روپہلی زری ملا کر بنا جاتا ہے قبا اور پاجامے بنانے کی خاطر خرید لئے۔ اور بادشاہ کی دو عباؤں کے لئے جو عربوں کا ایک لباس ہے سرخ اور سبز رنگ کی انگریزی بانات اور ان کے سوا بہت سا کپڑا مگر دونا کم قیمت محل سرا کی معزز عورتوں اور اُن کے بال بچوں کے لئے خریدا۔ اور سفارت کی وجہ سے اس تمام اسباب کا محصول تو معاف ہی تھا۔

اگرچہ مراد میرا بہت دوست تھا مگر تین باتوں کی وجہ سے مجھے اُس کے حق میں کوشش کرنے سے پشیمانی ہوئی۔ ایک یہ کہ اُس نے باوجود وعدہ کرنے کے کہ "میں اپنے بیٹے کو تمھارے ہاتھ پچاس روپیہ میں بیچ ڈالوں گا۔ کہلا بھیجا کہ تین سو روپے سے کم کو نہیں دوں گا۔ اور میں اس پر بھی راضی تھا کہ تین سو ہی دے کر خرید لوں تاکہ یہ کہنے کی گنجائش رہے کہ ایک شخص نے خاص اپنا بیٹا میرے پاس بیچ ڈالا تھا۔ یہ لڑکا خوب تازہ توانا اور سڈول بدن کا تھا اور رنگ بھی خوب صاف سیاہ تھا۔ اور حبشیوں کی طرح ناک بھی چپٹی نہ تھی اور نہ ہونٹ ہی موٹے تھے۔ مگر چونکہ اُس کے باپ نے وعدہ خلافی کر کے مجھے نہ دیا تو اس سے میں بہت ہی ناخوش ہوا۔

دوسری یہ کہ اس نے اور اس کے مسلمان رفیق نے اورنگ زیب سے پختہ وعدہ کیا تھا کہ ہم اپنے بادشاہ سے اُس مسجد کی مرمت کی بالضرور اجازت لے دیں گے جو پرتگیزوں کے وقت سے ویران اور کھنڈر پڑی تھی۔ چنانچہ اورنگ زیب نے اُس کی مرمت کے لئے بھی

دو ہزار روپیہ ان کو حوالہ کیا۔ یہ مسجد ایک شیخ یا درویش کے مقبرے کے طور پر بنائی گئی تھی جو مکہ سے ملک حبش میں صرف اس غرض سے چلا گیا تھا کہ وہاں دین اسلام پھیلائے اور یہ اُن پرتگیزوں نے مسمار کر دی تھی جو گوا سے فوج لے کر اُس ذی حق بادشاہ کی مدد کو آگئے تھے جو عیسائی ہو گیا تھا اور جس کو خارج کر کے ایک مسلمان شاہزادہ تخت پر جو بیٹھا تھا۔

تیسری یہ کہ اُس نے شاہ حبش کی طرف سے اورنگ زیب سے یہ درخواست کی کہ ایک قرآن اور آٹھ اور کتابیں (جن کے نام سے بھی میں واقف ہوں اور جو اُن کتابوں میں اول درجہ کی مشہور ہیں جو مذہب اسلام کی تائید میں تصنیف ہوئی ہیں) عنایت ہوں اور میری رائے میں ایک عیسائی بادشاہ کے ایک عیسائی سفیر کا ایسا کرنا ایک نہایت ہی ذلیل اور معیوب امر تھا۔ اور مخابیں جو کچھ میں نے سُنا تھا کہ حبش میں دین عیسوی کی کیسی متبذل حالت ہے اس سے اُس کی بخوبی تصدیق ہو گئی۔

بے شبہ اس بادشاہ کی حکمرانی کے تمام طور وطریق اور رعیت کے اوضاع واطوار سے اسلام کی بو آتی ہے اور بے شک جب سے وہ بادشاہ مرگیا ہے جس کو پرتگیزوں نے اپنی فوج کی مدد سے تخت پر بٹھایا تھا جو لوگ کہ صرف نام کے عیسائی ہیں اُن کی تعداد بھی کم ہوتی جاتی ہے۔ بابت یہ ہے کہ اس بادشاہ کے مرتے ہی اُس کی ماں کی فتنہ پردازیوں سے پرتگیز کچھ تو مارے گئے اور کچھ نکال دیئے گئے اور فرقہ جیسویٹ کے پیٹری آرک یعنی بڑے پادری کو جسے اُس کے ہم وطن پرتگیز گوا سے لائے تھے جان بچا کر بھاگنا پڑا۔

دریائے نیل کا دہانہ

جس زمانہ میں یہ سفیر دہلی میں تھے میرے آغا دانشمند خاں جو نئی معلومات کا ہمیشہ سے شائق ہے ان کو اکثر اپنے ہاں بُلا کر اُن کے ملک اور طریق حکمرانی کی بہت سی باتیں پوچھتا رہتا تھا۔ لیکن اُس کا اصل مدعا یہ تھا کہ دریائے نیل کا مخرج معلوم کرے۔ یہ لوگ دریائے نیل کو ابا بیل کہتے ہیں اور اُن کا قول ہے کہ اُس کا مخرج بخوبی معلوم ہے چنانچہ مراد اور ایک مغل نے جو اُس کا ہم سفر تھا بالاتفاق بیان کیا کہ ہم نے اُس مقام کو دیکھا ہے اور انھوں نے جو کچھ کہا وہ بعینہ وہی تھا جو میں نے مخا میں سُنا تھا۔ یعنی یہ کہ اُس کا مخرج ملک اگوس میں ہے اور وہ قریب قریب دو جوش مارنے والے چشمے ہیں جو باہم مل کر تیس یا چالیس قدم کے طول کی ایک چھوٹی سی جھیل میں

جاتے ہیں۔ اور جو پانی اس جھیل سے نکلتا ہے اگر چہ وہ خود بھی ایک اچھے خاصے دریا کے موافق ہے۔ مگر آئندہ چھوٹے چھوٹے بہت سے ندی نالوں سے جو قدم قدم پر اُس سے آکر ملتے جاتے ہیں بڑھتا جاتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی بیان کیا کہ یہ دریا اس طرح پر چکر کھا کر بہا ہے کہ بیچ میں ایک بڑا جزیرہ بن گیا ہے۔ اور کئی ایک سیدھی چٹانوں پر جزیرے ہیں اور گھڑیال بھی کثرت سے ہیں۔ اور بشرطیکہ سچ ہو ایک اور جانور اُس میں بتایا جو بہت ہی اعجوبہ ہے یعنی ایک دریائی بچھڑا جس کے منہ کے سوا فضلہ کے خارج ہونے کے لئے اور مخرج ہی نہیں ہے۔ اور یہ جھیل ڈیمبیا کے ملک میں گونڈار سے تین مختصر منزلوں اور نیل کے مخرج سے چار یا پانچ دن کے سفر کے فاصلہ پر بتائی اور کہا کہ جب یہ دریا اس جھیل سے نکل کر آگے کو بڑھتا ہے تو بہت سے دریاؤں اور برساتی نالوں کی وجہ سے جو اس جھیل میں آکر گرتے ہیں اس کا پاٹ بہت بڑھ جاتا ہے خصوصًا برسات میں جو ہندوستان کی طرح یہاں بھی ایک معین موسم ہے اور تقریبًا جولائی کے اخیر سے شروع ہوتا ہے۔

میرے نزدیک یہ آخری بات ایک طرح سے اہم اور قابل لحاظ ہے۔ کیونکہ اس سے اس دریا کی طغیانی کی وجہ معلوم ہوتی ہے اور اُنھوں نے کہا کہ دریا اس جھیل سے نکل کر جس کا ابھی ذکر ہوا شہر سے نار کی طرف جاتا ہے جو فن جی کا پایۂ تخت ہے جو شاہ اتھوپیا کا ایک باج گزار ملک ہے اور اسی طرح آگے کو بڑھتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ آخر کار مصر کے میدانوں میں جا پہنچتا ہے۔ ان سفیروں نے اپنے بادشاہ کی شان و شوکت اور فوجی قوت کا حال اس قدر بڑھا کر بیان کیا کہ مجھے اور دانشمند خاں دونوں کو ناپسند ہوا۔ مگر ان کا وہی رفیق سفر مغل اس مدح سرائی میں شریک نہ تھا۔ اور ان کی غیبت میں اُس نے ہم سے کہہ دیا کہ میں نے دو دفعہ وہاں کی فوج کو عین میدان اور ایسے وقت میں دیکھا ہے جب کہ خود بادشاہ اُس سے کام لے رہا تھا اور میرے خیال میں کسی فوج کی اُس سے زیادہ شکستہ حالی اور بے انتظامی ممکن نہیں اور ایسے ہی اور بہت سے حالات اُس ملک کے ہم کو سنائے جو سب میرے روزنامچے میں لکھے ہوئے ہیں۔ اور اُمید ہے کہ کسی دن لوگوں کی اطلاع کے لئے میں اُن کو چھپوا سکوں گا۔ اور بالفعل میں صرف تین چار ہی باتوں کے لکھنے پر جو مراد

نے ہم سے بیان کی تھیں قناعت کرتا ہوں ۔ اور چونکہ وہ ایسی سرزمین سے علاقہ رکھتی ہیں جو عیسائیوں کا ملک سمجھا جاتا ہے اس لئے نہایت تعجب کے لائق ہیں ۔ چنانچہ اُس نے بتایا کہ حبش میں چند ہی آدمی ایسے ہوں گے جن کی کئی کئی بیویاں نہ ہوں ۔ اور بغیر کسی طرح کے شرم و لحاظ کے خود اپنی بابت بھی کہدیا کہ منکوحہ بیوی کے سوا جو حلب میں ہے دو بیویاں اور بھی ہیں اور بیان کیا کہ جس طرح ہندوستان کے مسلمانوں بلکہ ہندوؤں کی بھی عورتیں پردہ میں رہتی ہیں حبش میں نہیں رہتیں اور غریب گھرانوں کی عورتیں خواہ بیاہی ہوں یا کنواری اور لونڈی ہوں یا آزاد رات دن ایک ہی مکان میں باہم رہتی ہیں اور رشک و حسد کے خیالات جو اور قوموں کی عورتوں میں عموماً ہوتے ہیں ۔ یہ جانتی بھی نہیں ۔ اور بڑے بڑے امیروں کے گھروں کی عورتیں اور اُن کی بیویاں اگر کسی خوبصورت سوار سپاہی پر طبیعت آجاتے تو اُس کے چھُپانے کی چنداں پروا نہیں کرتیں بلکہ جب چاہتی ہیں بے خوف و خطر اُس کے گھر چلی جاتی ہیں ۔ اور یہ بھی کہا کہ اگر تم وہاں جاتے تو خواہی نخواہی شادی کرنی ہی پڑتی : چنانچہ چند سال ہوئے کہ ایک یورپین درویش کو جس نے اپنے تئیں ایک طبیب باشندہ یونان ظاہر کر رکھا تھا زبردستی شادی کرادی گئی اور لطف یہ کہ جس عورت کو اُس نے اپنے بیٹے کی شادی کے لئے تجویز کیا تھا اُسی سے اس کا نکاح پڑھوادیا گیا اور ایک قصہ یہ سُنایا کہ ایک اسّی برس کے بڈھے نے اپنے چوبیس بیٹے جو جوان اور ہتھیار باندھنے کے قابل تھے بادشاہ کے روبرو پیش کئے ۔ بادشاہ نے پوچھا کہ کیا تیرے صرف اتنے ہی لڑکے ہیں ؟ جب اُس نے عرض کیا کہ ہاں لڑکے تو اتنے ہی ہیں مگر چند لڑکیاں بھی ہیں ۔ تو بادشاہ نے جھنجھلا کر کہا کہ " او بڈھے بیل میرے سامنے سے دور ہو ! مجھکو تعجب آتا ہے کہ شرمندہ ہونے کی جگہ تو شیخی بگھارتا ہے ۔ کیا ہمارے ملک میں عورتوں کا کال پڑ گیا ہے کہ تیری سی عمر کا آدمی صرف دو درجن لڑکوں کے باپ ہونے پر اتراتا ہے "

اور اُس نے کہا کہ ہمارے بادشاہ کے کم سے کم اتنی لڑکے بالے ہیں جو محل میں جدھر دیکھو دوڑتے پھرتے نظر آتے ہیں اور اُن کی یہ پہچان ہے کہ ہر ایک کے پاس بادشاہ کی دی ہوئی ایک گول رنگین چھڑی ہوتی ہے جس کو بہ نسبت اور لڑکوں کے ملنے کے لئے سیب[1] ہا

[1] یورپ میں دستور ہے کہ دربار وغیرہ جلوس کے موقعوں پر بادشاہ ایک عصا ہاتھ میں لئے رہتے ہیں جس کو

کی طرح باعث امتیاز سمجھ کر خوشی خوشی ہاتھ میں لئے پھرا کرتے ہیں ۔

میرے آغا کی طرح اورنگ زیب نے بھی دو دفعہ ان سفیروں کو اس اُمید سے اپنے حضور میں بُلایا کہ اُن سے اُن کے ملک کے کچھ حالات معلوم ہوں ۔ مگر اُس کی زیادہ تر غرض یہ معلوم کرنا تھا کہ دین اسلام کی وہاں کیا حالت ہے ۔ اور وہ خچر کی کھال بھی منگوا کر دیکھی جو نہ معلوم کس طرح قلعہ ہی میں بادشاہی عہدہ داروں کے پاس رہ گئی اور مجھے اُس کے حاصل ہونے کا ارمان ہی رہ گیا ۔ کیونکہ اُنھوں نے میری کارگزاری کے صلہ میں اُس کے دے دینے کا وعدہ کیا تھا ۔ اور میں یہ خیال کر کے کہ کسی دن اپنے ملک میں پہنچ کر عجیب چیزوں کے کسی شوقین شخص کی نذر کر سکوں گا ۔ دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا تھا ۔ اور میں نے ان سفیروں کو بہت تاکید سے یہ بھی کہا تھا کہ اس کھال کے ساتھ بادشاہ کو وہ سینگ بھی ضرور دکھانا مگر انھوں نے اس خوف سے اُس کو پیش نہ کیا کہ مبادا ہم سے یہ پوچھا جائے کہ سورت کی لوٹ میں جب یہ بچ رہا تو اس کے اندر کی خوشبودار چیز کہاں گئی اور پھر ہم اس کا کیا جواب دیں گے ۔

شاہزادوں کی تعلیم و تربیت کا مسئلہ

شاہِ حبش کے سفیر ابھی دہلی ہی میں تھے کہ اورنگ زیب نے اپنے دربار کے خاص خاص اُمرا اور علما کو اس مشورے کے لئے جمع کیا کہ اپنے تیسرے لڑکے سلطان اکبر کی تعلیم و تربیت کے لئے جس کو ولی عہد بنانا چاہتا تھا ایک اتالیق تجویز کرے ۔ اور اُن سے فرمایا کہ میری بڑی آرزو ہے کہ اس کی تعلیم و تربیت ایسی کی جائے کہ جس سے کامل توقع اس امر کی ہو سکے کہ ہر طرح کی لیاقتوں کے لحاظ سے یہ لڑکا مشہور آفاق ہو ۔ چنانچہ میری رائے میں کوئی شخص مجھ سے زیادہ اس امر سے واقف نہیں کہ شاہزادوں میں ہر ایک طرح کے ہنر اور مفید علوم کا موجود ہونا ضروری اور لابدی ہے ۔ کیونکہ ان کے آئندہ فرماں روا اور حاکم بننے کی توقع رہتی ہے ۔ اُس کا قول ہے کہ جس طرح سے باعتبار اپنے مرتبے اور اختیار کے ان کو اور لوگوں پر فضیلت ہے ۔ اسی طرح لازم ہے کہ دانائی اور صفات حمیدہ میں بھی اُن سے افضل ہوں ۔ اور وہ خوب جانتا ہے کہ ممالک ایشیا میں جو آفتیں اور مصیبتیں

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ ۔ رائل سیپٹر یعنی عصائے شاہی کہا جاتا اور تخت و تاج وغیرہ کی طرح ایک بادشاہی علامت سمجھا جاتا ہے ۔ س م ح رای ۔ س سے پ ٹ ر ۔

سلطنتوں پر پڑا کرتی ہیں اور وہ بدعملی اور بدانتظامی جس سے آخرکار وہ برباد اور تباہ ہو جاتی ہیں اس کا باعث اگر ڈھونڈا جائے تو ہمیشہ یہی نکلے گا کہ شاہزادوں کی تعلیم و تربیت ناکافی اور بُرے طور پر ہوتی ہے کیونکہ وہ بچپن ہی سے عورتوں اور خواجہ سراؤں اُن غلاموں کے سپرد رہتے ہیں جو ملک روس اور سرکیشیا اور منگولستان اور گرجستان اور حبش سے آتے ہیں اور کمبخت غلامی کا یہ خاصہ ہی ہے کہ اس سے عقل و تمیز خراب اور یہ عادت ہو جاتی ہے کہ اپنے سے زبردستوں کے سامنے بہت ہی عجز اور فروتنی سے پیش آتے اور کمزوروں اور ماتحتوں پر خواہ مخواہ زور و زیادتی جتاتے ہیں۔ پس یہ شاہزادے جب محلوں میں سے نکل کر تخت نشین ہوتے ہیں تو وہی ظالمانہ اور خراب عادتیں جو سیکھی ہوئی ہوتی ہیں ساتھ لئے آتے ہیں اور اُن فرائض سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں جو اُن کی اس نئی حالت کے لئے لازمی ہیں اور اپنی زندگانی کے اس تماشاگاہ میں اس طرح خلائق کے سامنے آتے ہیں کہ گویا کسی اور ہی دنیا سے آتے ہیں اور ہر ایک چیز کو ایسے بھولے پن اور حیرانی کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ گویا کسی اندھیری کوٹھری یا تہ خانے میں سے آج ہی پہلے پہل نکلے ہیں۔ اور یا تو بچوں کی طرح ہر بات پر یقین کر لیتے یا ہر چیز سے ڈرتے اور خوف کھاتے ہیں یا ایسے ہٹیلے اور بے پروا اور احمق ہوتے ہیں کہ معقول صلاح اور مشورہ کی بات کو سنتے ہی نہیں اور کیسا ہی خراب کام کیوں نہ ہو اُس کے کر بیٹھنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کرتے اور تخت پر بیٹھکر یا تو اپنی جبلی طبیعت اور مزاج کے سبب سے یا اُن خیالات کی وجہ سے جو پہلے سے اُن کے دل میں جانشین ہو جاتے ہیں ایک مصنوعی وقار اور تمکنت دکھاتے ہیں مگر ہر کسی کو بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ اصل سنجیدگی اور وقار اُن میں نام کو بھی نہیں اور یہ ظاہرداری صرف کسی بُری سکھاوٹ کا اثر ہے جس کو بجائے متانت اور سنجیدگی کے ایک حیوانیت اور بیہودہ نمائش کہنا چاہیئے۔ اور یا بہ تکلف ایک ایسی خوش خلقی اختیار کرتے ہیں جو بادشاہوں کی شان کے ہرگز لائق نہیں ہوتی اور بناوٹی ہونے کی وجہ سے مکروہ معلوم ہوتی ہے۔ پس ایسا کون شخص ہے جو ممالک ایشیا کی تاریخ سے واقف ہو اور میرے اس بیان کی صحت سے جو ایشیائی شاہزادوں کی حالت کی ایک ٹھیک تصویر ہے انکار کر سکے اور میں پوچھتا ہوں کہ کیسا ممالک ایشیا کے بادشاہ آنکھیں بند کر کے حیوانوں کی سی بے رحمیاں نہیں کرتے رہے۔

اور اُن کی بے رحمی کیا کبھی کسی معین طریقہ پر ہوتی تھی؟ اور کیا وہ مطلقاً نامنصفانہ نہ تھی۔ اور کیا وہ بے شراب خواری کی ذلیل اور کمینہ عادت میں مبتلا اور بغیر کسی طرح کی شرم کے عیاشی و شہوت پرستی میں ڈوبے ہوئے نہیں ہیں اور حرموں کی صحبت میں اپنی تندرستی اور عقل بالکل غارت اور برباد نہیں کرتے۔ اور کیا انھوں نے سلطنت کے کاروبار کے عوض اپنا تمام وقت سیر و شکار ہی میں نہیں کھویا؟ اور اگرچہ ان بے درد بادشاہوں کو اپنے شکاری کتوں سے بہت محبت ہوتی ہے اور اُن کی غور و پرداخت کا بہت خیال کرتے ہیں مگر اُن بے چارے غریب لوگوں کی مصیبتوں کی جو شکار میں ساتھ جانے کے لئے بیگار میں پکڑے جاتے اور گرمی اور سردی کی شدت اٹھاتے اور بھوک اور تکان سے مرجاتے ہیں ان کو مطلقاً پروا بھی نہیں ہوتی۔

الغرض ایشیائی بادشاہ نہایت ہی ہولناک بد عادتوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ اور جیساکہ میں پہلے کہہ چکا ہوں اُن کی یہ خراب عادتیں انواع و اقسام کی ہوتی ہیں۔ اور اس اختلاف کا سبب یا تو اُن کا طبعی میلان ہوتا ہے یا وہ خیالات ان کا باعث ہوتے ہیں جو ابتدائے عمر سے اُن کی طبیعت میں بٹھا دیئے جاتے ہیں۔ اور شاذ و نادر ہی کوئی بادشاہ ایسا ہوتا ہے جو اپنی سلطنت کے اندرونی اور پولٹیکل امور سے بدرجہ غایت ناواقف نہ ہو۔ وہ اپنی سلطنت کی باگ اکثر کسی وزیر کے ہاتھ میں دیدیتے ہیں جس کا منصوبہ یہ ہوتا ہے کہ خود مختارانہ اور بلا روک ٹوک اور بغیر کسی طرح کے خوف و خطر کے حکومت کرنے کی غرض سے حقیر اشغال میں اپنے آقا کے مبتلا رہنے کی اور کبھی تائید کرکے اُس کی طبیعت کو امور سلطنت کی واقفیت سے باز رکھتا ہے۔ اور اگر وزیر اعظم امور سلطنت کو مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں نہیں رکھتا تو بادشاہ کی ماں جو اصل میں کوئی لونڈی باندی ہوتی ہے۔ اور کچھ خواجہ سرا ملک پر حکومت کرتے ہیں۔ جن کی تدبیریں وسیع اور آزادانہ خیالات پر مبنی نہیں ہوتیں بلکہ ہمیشہ بے رحمانہ جوڑ توڑ میں لگے رہتے ہیں کہ اپنے ہم جنسوں میں سے کسی کو پھانسی دیں اور کسی کو قید یا جلاوطن کریں۔ اور ہم جنسوں پر ہی کیا منحصر ہے۔ یہی سلوک وہ اکثر اوقات بڑے بڑے امرا بلکہ خود وزیروں کے ساتھ بھی کرتے ہیں۔ اور فی الواقع اُن کے تسلط کے زمانہ میں جو سلطنت کے لئے شرم کا موجب ہوتا ہے کسی شخص کی زندگی، جو کچھ بھی مال و دولت رکھتا ہو ایک دن کے لئے بھی محفوظ نہیں ہوتی۔

شاہِ ایران کے سفیر کی آمد اورنگ زیب کے حضور میں مذکورہ بالا ملکوں کے سفیر جب حاضر ہو چکے تو آخر کار دربار شاہی میں یہ خبر پہنچی کہ ایران کا سفیر بھی سرحد پر پہنچ گیا ہے اور یہاں کے ایرانی امرا اور اہلِ ایران نے یہ مشہور کر دیا کہ نہایت ہی اہم معاملات اس کے آنے کے باعث ہوئے ہیں۔ لیکن سمجھ دار لوگوں نے اس پر بالکل یقین نہیں کیا کیونکہ اہم معاملات کا وقت گذر چکا تھا۔ اور یہ بات ظاہر تھی کہ ان لوگوں کے ایسا مشہور کرنے کا سبب بجز اس بیہودہ خواہش کے کہ اپنے ملک کی عظمت واقتدار کا اظہار کریں اور کچھ نہ تھا۔ اُن کا یہ بھی ادعا تھا کہ جو امیر اس کے استقبال اور تواضع وتکریم کے واسطے مامور ہوا ہے اُس کو بتاکید یہ فہمائش ہوئی ہے کہ جس طرح ممکن ہو دہلی پہنچنے سے پہلے سفیر کے آنے کا اصل مدعا دریافت کرے۔ اور اُس کو یہ بھی ہدایت ہوئی ہے کہ اس مدمغ سفیر کو رفتہ رفتہ اس امر پر مائل کر دے کہ وہ دربار میں ہندوستان کے قاعدہ کے موافق رسم تسلیمات بجا لائے اور اُس کو یہ بھی سمجھا دے کہ قدیم سے یہ دستور ہے کہ شاہ ایران کا نامہ بلاواسطہ کسی امیر کے خود بادشاہ کو نہیں دینا چاہیے۔ لیکن جو کچھ میں نے دیکھا اُس سے ظاہر ہو گیا کہ یہ سب لغو کہانیاں تھیں۔ اور جو مرتبہ خدا نے اورنگ زیب کو بخشا ہے وہ ایسی باتوں کا محتاج نہیں ہے۔

جب یہ سفیر دارالسلطنت دہلی میں پہنچا تو اُس کی تعظیم وتکریم کا اظہار مناسب طور پر کیا گیا یعنی جن بازاروں میں سے وہ ہو کر گذرا اُن پر سفیدی وغیرہ از سر نو کرائی گئی اور تین میل کے قریب دو رویہ سواروں کی فوج صف بستہ کھڑی کی گئی اور بہت سے امرا معہ اپنے اپنے باجے گاجوں کے اُس کی سواری کے ساتھ تھے۔ اور قلعہ شاہی کے دروازہ میں پہنچتے ہی توپ خانہ سے سلامی ہوئی۔ اور اورنگ زیب اُس سے نہایت اخلاق اور مہربانی سے پیش آیا اور اہل ایران کے طور پر اس کے سلام کرنے سے ناخوش نہیں ہوا اور اُس کے ہاتھ سے شاہ کا خریطہ بھی بلاتردد لے لیا بلکہ بطور تعظیم اُس کو اپنے تاج کے قریب تک لے گیا۔ اور پھر ایک خواجہ سرا سے اُس کی مہر کھلوا کر نہایت متانت کے ساتھ ملاحظہ کیا اور حکم دیا کہ سفیر کو سراپا پہنایا جائے۔ چنانچہ قبائے زربفت اور مندیل اور ریشمی زردوزی کا پٹکا عنایت ہوا۔ اور اس رسم کے بعد سفیر کو تحائف پیش کرنے کا اشارہ ہوا۔ چنانچہ پچیس[۲۵] ایسے خوبصورت گھوڑے جو میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے معہ زردوزی اور زربفت کی گردنیوں

کے۔ اور بیس نہایت اعلیٰ نسل کے ایسے قوی اور قد آور اونٹ جن کو ہاتھی کے پاٹھے کہنا زیبا ہے اور بہت سے صندوق عمدہ گلاب اور ایک اور عرق کے جس کو بید مشک کہتے ہیں اور جو نہایت مفرح سمجھا جاتا ہے اور کمیاب چیز ہے۔ اور پانچ چھ بڑے بڑے اور خوبصورت قالین اور کئی بہت ہی بڑھیا تھان زربفت کے جن پر نہایت باریک گلکاری کی ہوئی تھی اور ایسے سبک اور پاکیزہ وضع کے تھے کہ مجھے شک ہے کہ کبھی کوئی ایسی نفیس چیز یورپ میں دکھائی دی ہو۔ اور جڑاؤ قبضہ کے چار دمشقی خنجر اور چار مرصع پیش قبض اور پانچ یا چھ گھوڑوں کے بہت ہی خوبصورت ساز جن کو سب لوگوں نے خصوصیت سے پسند کیا۔ اور واقع میں بہت ہی خوش نما اور قیمتی تھے۔ اور جن پر چھوٹے چھوٹے موتیوں اور پرانی کان کے فیروزوں سے نہایت ہی اعلیٰ قسم کی مرصع کاری کی ہوئی تھی پیش ہوئے اورنگ زیب نے سب چیزوں کو بڑے غور سے ملاحظہ کیا اور حاضرین دربار کو اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان عمدہ تحائف سے بہت ہی زیادہ بلکہ معمول سے بڑھ کر خوش ہوا ہے۔ اس نے ان چیزوں کی خوبی اور نفاست اور کمیابی اور شاہ کی اس مہربانی اور کشادہ دلی کی کہ کیسے کیسے بیش بہا تحفے بھیجے ہیں بار بار تعریف کی۔ اور سفیر کو بڑے ذی رتبہ امرا میں جگہ دی اور اس کے دور دراز سفر کا ذکر کر کے اس معزز اور عالی مرتبہ مہمان سے فرمایا کہ اس وقت آپ آرام کریں اور ہم آپ کو ملاقات کے لئے ہر روز بلایا کریں گے۔

یہ سفیر چار پانچ مہینے دہلی میں رہا اور اس کے سب اخراجات بہت تکلف کے ساتھ خزانہ شاہی سے ادا ہوتے رہے۔ اور امرائے دربار نے نوبت بہ نوبت بڑی بڑی ضیافتیں کیں۔ اور بوقت رخصت بادشاہ نے ایک اور بھاری سراپا معہ کئی بیش بہا چیزوں کے عنایت کیا۔ اور شاہ ایران کے لئے تحائف بھیجے جانے کی نسبت یہ تجویز ٹھیری کہ پیچھے سے اپنے سفیر کی معرفت بھیجے جائیں گے۔ چنانچہ اس سفارت کے لئے ایک امیر[1] مقرر بھی کیا گیا۔

اگرچہ بہ نسبت اور سفیروں کے جو پہلے آ چکے تھے اورنگ زیب نے اس سفیر کا بہت ہی اعزاز کیا اور دل سے خاطر و مدارات کی۔ مگر اس پر بھی اُن ایرانیوں نے جو دہلی میں تھے یہ بات مشہور کر دی کہ شاہ نے اپنے نامہ میں اورنگ زیب کو داراشکوہ کے

[1] تربیت خاں کو بھیجا گیا تھا۔ س م ع

قتل اور شاہجہاں کی قید کی بابت بہت ہی ملامت کی ہے اور لکھا ہے کہ جو سلوک تم نے اُن سے کیا ہے کوئی بھائی بھائی کے ساتھ اور کوئی بیٹا باپ کے ساتھ نہیں کر سکتا اور کسی ایمان دار مسلمان سے ہرگز ایسی حرکت نہیں ہو سکتی ۔اور یہ بھی اعتراض کیا ہے کہ اپنا لقب عالمگیر کیوں مقرر کیا ہے اور اُس کو سکہ پر کیوں منقش کرایا ہے ۔ اور اس بات کو انھوں نے یہاں تک بڑھایا کہ خط میں صاف لکھا ہوا ہے کہ اگر آپ عالمگیر ہیں تو یہ گھوڑے اور یہ تلوار حاضر ہے ۔ بسم اللہ آیئے ادھر سے ہم بھی آتے ہیں ۔میرے نزدیک اگر یہ بات سچ ہوتی تو شاہ ایران کی طرف سے گویا پیغام جنگ تھا ۔لیکن میں نے جیسا سُنا ویسا لکھدیا ہے ۔اور اس کو میں غلط ثابت نہیں کر سکتا ۔اگر چہ اس دربار کا رازِ سربستہ کسی کو معلوم ہو سکتا ہے ۔بشرطیکہ زبان سے واقفیت اور چند شخصوں سے ملاقات رکھتا ہو اور میری طرح عجائب باتوں کے دریافت کرنے میں دل کھول کر روپیہ خرچ کرنے کی بھی کچھ پروا نہ کرتا ہو لیکن میں تو آسانی سے ایسی بات پر یقین نہیں کر سکتا کہ شاہ ایران نے ایسے الفاظ اپنے خط میں لکھے ہوں کیونکہ گو اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایرانیوں کی یہ عادت ہے کہ جب کسی کو اپنا زور و طاقت جتانا چاہتے ہیں تو ایسی ہی تعلّی کی لیا کرتے ہیں ۔مگر ایسے لفظوں سے تو محض تعلّی اور شیخی ہی نہیں دھمکی کی بو بھی آتی ہے ۔

اصل یہ ہے کہ اکثر باخبر لوگوں کی یہ رائے ہے اور خود میرا بھی خیال یہی ہے کہ ایران میں یہ طاقت ہی کہاں ہے کہ ہندوستان جیسی سلطنت پر حملہ کرے اور اُس کو تو یہی غنیمت ہے کہ قندھار جو ایران کی عملداری میں ہندوستان کی طرف سرحد پر ہے اُس کے قبضہ میں رہے یا یہ کہ اپنے ملک کو حدود سلطنت روم کی جانب سالم اور محفوظ رکھ سکے ایران کی سپاہ و دولت کا حال مدبّران سلطنت ہند کو خوب معلوم ہے ۔اور وہ واقف ہیں کہ وہاں کے تخت پر ہمیشہ شاہ عباس ہی نہیں ہے جو ایک نامور اور مدبر بادشاہ اور اس قابل تھا کہ جو معاملہ پیش آئے اُس کو اپنے ہی مدعا کے موافق بنالے اور بڑے بڑے منصوبے تھوڑے سے سامان سے انجام دے لے ۔ اور اگر ایران کا ارادہ اس سلطنت پر کوئی مہم کرنے کا ہے اور حالیہ وارداتوں کی وجہ سے اُس کو اورنگ زیب کی نسبت اس قدر تنفر پیدا ہوا ہے تو وہ کیوں ان جان کاہ واقعات کو خاموشی اور بے غرضی کی نگاہ سے دیکھتا رہا جو اُن لڑائیوں میں پیش آئے

لہ شاہ عباس ماضی سے مراد ہے جو اکبر کا معاصر تھا اور شاہجہاں کے زمانہ تک فرماں روائے ایران رہا ۔ س م ع

جو ہندوستان میں ہو رہی تھیں اور باوجودیکہ داراشکوہ اور شاہجہاں اور سلطان شجاع اور شاید مرادکا بل بھی اُس سے امداد کے لئے ملتجی ہوئے۔ مگر اس کے دل پر کچھ بھی اثر نہ ہوا حالانکہ وہ تھوڑی سی فوج سے ہندوستان کے ایک نہایت عمدہ حصہ پر یعنی کابل سے لے کر دریائے سندھ کے کنارے بلکہ اُس سے آگے تک قبضہ کر سکتا تھا اور اس طرح یہاں کے ہر ایک جھگڑے میں ہمیشہ کے لئے اپنے آپ کو ثالث بنا سکتا تھا۔

یا تو شاہ ایران کے خط ہی میں کوئی نا ملائم فقرہ تھا یا اورنگ زیب خود اس سفیر ہی کی کسی حرکت یا کسی گفتگو سے ناراض ہو گیا تھا جو اُس کے دہلی سے رخصت ہونے کے دو تین ہی روز بعد اُس نے اس امر کی شکایت کی کہ جو گھوڑے شاہ ایران کی طرف سے آئے ہیں سفیر نے اُن کے پچھلے پاؤں کی نسیں[1] کٹوا دی تھیں اور حکم دیا کہ اُس کو سرحد پر روک لیا جائے۔ اور تمام ہندوستانی لونڈی غلام جو وہ یہاں سے لے گیا ہے چھین لئے جائیں جن کی تعداد بلاشبہ بہت ہی زیادہ تھی اور قحط کی وجہ سے بہت ہی سستے اُس کے ہاتھ آگئے تھے۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اُس کے نوکر چاکر بہت سے بچوں کو چُرا کر بھی لے گئے تھے[2]

---

[1] اصلی انگریزی میں لفظ ہیم سٹرنگ ہے۔ جس کے معنی بموجب فن کشریح واصطلاح طبی رباط کے ہیں۔ س م ح

[2] اس سفیر سے اورنگ زیب کے ناراض ہو جانے کا ذکر کسی جگہ نظر سے نہیں گذرا مگر او رحالات مندرجہ متن کی تشریح اس وقت کی فارسی کتابوں سے یوں پائی جاتی ہے۔ جب سے شاہجہاں کے عہد سلطنت میں شاہ عباس ثانی نے قندھار ۱۰۵۸ھ ہجری میں عمال دولت ہندوستان سے دوبارہ چھین لیا تھا دونوں سلطنتوں کے باہم دوستانہ راہ و رسم بند تھی۔ مگر جب اورنگ زیب تخت نشین ہوا تو شاہ موصوف نے ایلچی بھیجنے میں سبقت کرکے اس راہ و رسم کو پھر تازہ کیا۔ چنانچہ صاحب عالمگیر نامہ نے اس حال کو ۱۰۷۱ھ ہجری کے واقعات میں (جو اورنگ زیب کے تیسرے اور چوتھے سال جلوس کے مطابق تھا)۔ بہت تفصیل سے لکھا ہے اور چونکہ اُس سے سفیر کی مدارات کا طور و طریق معہ اور بہت سی درباری رسموں اور دلچسپ باتوں کے زیادہ تفصیل سے معلوم ہوتا ہے اس لئے اُس کا پورا ترجمہ لکھ دینا مناسب معلوم ہوا۔ وھوھذا

ان ایام میں وقائع صوبہ ملتان سے دریافت ہوا کہ والی ایران نے بھی بمقتضائے مصلحت و دانائی رسم اتحاد کے تازہ کرنے کے لئے بوداق بیگ تفنگچی آقاسی (یعنی بندوقچیوں کی فوج کے سردار) کو جو اُس کے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ ۔ امرائے دربار میں سے تھا۔ مع تحائف و نامہ دوستانہ متضمن مبارکباد تخت نشینی " روانہ کیا ہے اور وہ قندھار سے گذر کر ملتان کے راستے دلی کو آتا ہے۔ اس لئے اورنگ زیب نے ابدال بیگ نامی اپنے ایک مقرب ملازم کو مامور کیا کہ استقبال اور مہمانداری کے لئے ملتان تک جائے چنانچہ اس شخص کو حسب معمول خلعت رخصت دے کر رجب کی پہلی تاریخ روانہ کیا گیا اور اسی کے ہاتھ بوداق بیگ کے لئے بھی ایک خلعت بھیجا گیا اور تربیت خاں حاکم ملتان اور خلیل اللہ خاں صوبہ دار " دارالسلطنت " لاہور اور راستے راہ کے سب حاکموں کو احکام بھیجے گئے کہ لوازم ضیافت و مہمانداری بجالا کر اپنے اپنے مقدور کے موافق نقد وجنس سے بھی تواضع کریں۔ تیسری شعبان کو بوداق بیگ کے بھیجے ہوئے " خربزہ ہائے کاریز " اور کچھ اور میوے بادشاہ کے حضور میں پیش ہوئے اور لانے والوں کو خلعت کے علاوہ ڈھائی ہزار روپیہ انعام مرحمت ہوا۔

بعد ازیں خبر آئی کہ بوداق بیگ آخر تاریخ شعبان کو ملتان پہنچ گیا اور تربیت خاں نے ضیافت کے بعد پانچ ہزار روپیہ نقد اور ہندوستان کی ساخت کے نو پارچے بطور تحفہ اُس کو دیئے اور جب لاہور پہنچا تو خلیل اللہ خاں نے نہایت عمدہ ضیافت کی جس میں بڑے تکلف سے چار سو قابیں انواع واقسام کے کھانوں کی اور سات سو خوان قسم قسم کے نقلوں اور عطریات کے چنے گئے اور بیس ہزار روپیہ نقد اور ایک خنجر اور ایک تلوار جن کے ساز مینا کار تھے اور سات کشتیاں ہندوستان کے بنے ہوئے نفیس کپڑوں کی تواضع کیں۔

اٹھارھویں رمضان کو بوداق بیگ کا ایک عریضہ لاہور سے اپنی روانگی کی اطلاع کے لئے پہنچا اور چونکہ اُس نے عریضہ کے ساتھ باز۔ جرہ۔ چرغ اور شاہین وغیرہ کچھ شکاری جانور بھی بھیجے تھے اس لئے لانے والوں کو خلعت عطا ہوئے۔

اٹھائیسویں رمضان کو جب بوداق بیگ باغ اعزآباد کے نزدیک بمقام سرائے بادلی پہنچ کر ٹھیر گیا تو بادشاہ نے بغرض اظہار عنایت اُس کے لئے " اوش خاص " بھیجا۔ اور دربار میں حاضر ہونے کے لئے شوال کی تیسری کو ایک " ساعتِ نیک " مقرر ہوئی چنانچہ اس صورت کے موافق جب یہ سفیر شہر کے قریب پہنچا تو اسد خاں۔ سیف خاں اور ملتفت خاں " میرتزک " تین بڑے امیر شہر کے باہر تک استقبال کر کے دیوان خاص وعام میں جہاں بادشاہ سالانہ جشن کے دربار میں تخت پر بیٹھا ہوا تھا لائے اور اُس نے دلبقول صاحب عالمگیرنامہ جس کے بیان کو اس امر خاص میں ڈاکٹر برنیر کی بے غرضانہ اور چشم دید شہادت کے مقابلہ میں صحیح نہیں سمجھا جا سکتا) " اسی طرز و قانون سے جو اس سلطنت کا معمول تھا۔ آداب کورنش و تسلیم بجالا کر شاہ ایران کا نامہ پیش کیا اور بادشاہ نے " بعطائے خلعت فاخرہ و جیغہ و خنجر مرصع دار کچھ جش ا

پیالہ وخوانچہ طلا وپان یا پاندان وخوان طلا" مین مجلس جشن میں ممتاز فرمایا۔ اور دربار برخاست ہونے کے بعد رستم خاں کی حویلی میں جو جمنا کے کنارے ایک عمدہ مکان تھا اور سفیر کی خاطر سرکاری فرش وفروش سے آراستہ کیا گیا تھا اُتارا گیا اور میر عزیز بدخشی جو ایک سنجیدہ اور معقول شخص تھا مہماندار مقرر ہوا بادشاہ نے دوسرے دن سفیر کو پھر حضور میں طلب کیا اور ایک "شمشیر با ساز مرصع" عنایت کی اور اُس کے ہمراہیوں میں سے نذر قلی نامی سوغات کے گھوڑوں کے میر آخور (داروغہ اصطبل) اور محمد حسین تحویلدار تحائف اور احمد بیگ ایلچی کے داماد اور اُس کے ملا میر زین العابدین کو خلعت عنایت کئے اور چونکہ رات کو دریائے جمنا میں بادشاہزادوں کے کارپردازوں اور بڑے بڑے امیروں کے اہتمام سے جشنوں کے معمولی دستور کے موافق کشتیوں پر نہایت تکلف سے چراغوں کی روشنی کی گئی تھی اس لئے بادشاہ نے غسل خانہ کے دربار خاص میں سفیر کو بھی معہ اُس کے ہمراہیوں کے طلب کر کے اس تماشے کے لاحظہ میں شریک کیا۔ اور ساتویں شوال کو سفیر نے حسب الطلب حاضر ہو کر بادشاہ ایران کے تحائف جن میں چھیاسٹھ عراقی گھوڑے نہایت ہی قابل تعریف تھے اور ایک بہت بڑا نایاب موتی جو وزن میں سینتیس قیراط (یعنی ایک سو گیارہ رتی یا ایک رتی کم چودہ ماشے) تھا اور جس کی قیمت بادشاہی جوہریوں نے ساٹھ ہزار روپیہ آنکی تھی معہ اور تحفوں کے جن کی قیمت معہ گھوڑوں اور اس موتی کے چار لاکھ بائیس ہزار روپیہ کھی گئی تھی پیش کئے اور سفیر نے اپنی طرف سے بھی کچھ عراقی گھوڑے اور "شتر بختی" (یعنی دو کوہان والے اونٹ) اور ایران کی اور نفیس چیزیں پیش کش کیں۔ جن کو اورنگ زیب نے قبول فرما کر ساٹھ ہزار روپیہ نقد اور چاندی کے ہودے اور زربفت کی جھول کے ساتھ ایک ہتھنی عطا کی اور محمد حسین تحویلدار تحائف کو پانچ ہزار روپیہ اور نذر قلی میر آخور اور ملا میر زین العابدین کو تین تین ہزار روپیہ اور ایلچی کے داماد احمد بیگ کو دو ہزار روپیہ عنایت کئے۔ اور بروز جشن سال گرہ چہل وپنجم بحساب قمری "سفیر کو پھر پچاس ہزار روپے نقد اور مرصع پیٹی اور خلعت بارانی اور پاندان با خوانچہ طلا اور ایک سپر با ساز مرصع اور ایک صندوق خاص"

اور محمد حسین کو تین ہزار اور نذر قلی اور حکیم یوسف سفیر کے طبیب کو دو دو ہزار اور اُس کے کمی "توجیہ" (تنخواہ) اور ہمراہیوں کو تیرہ ہزار روپے مرحمت فرمائے۔ اور تیسری ذی الحجہ کو تین اشرفیاں جو وزن میں سات سو تولہ کی تھیں اور پانچ پانچ سو تولہ کے تین روپے عطا ہوئے۔

اور سوم روز عید ذی الحجہ بوداق بیگ کو رخصت کر کے ایک لاکھ روپیہ نقد اور خلعت فاخرہ معہ خنجر میناکار با علاقہ مروارید اور ایک گھوڑا با زین ولگام طلا اور ہاتھی با زین طلائی و ساز نقرہ وجھل زربفت اور ایک ہل ... یائی جس کی شکل وصورت "(بقول صاحب عالمگیرنامہ)" خالی از طرفگی وغرابت نہ تھی اور ایک

پالکی معہ ساز سامان عطا کی اور نامہ کے جواب کی نسبت یہ ارشاد ہوا کہ ایک نہیدہ اور نجیبہ بڑے امیر کے ہاتھ ہندوستان کے عمدہ عمدہ تحفوں کے ساتھ پیچھے سے بھیجا جائے گا۔ خلاصہ یہ کہ ایلچی کو اول سے آخر تک پانچ لاکھ روپیہ اور اس کے ہمراہیوں کو پینتیس ہزار روپیہ عطا ہوا اور خواجہ صادق بدخشی کو ملتان تک مشایعت کے لئے مامور کیا گیا۔ انتہیٰ۔

واضح ہو کہ عالمگیر نامہ میں جو فیل دریائی کا ذکر ہے مآثر عالمگیری میں بھی فیل دریائی ہی لکھا ہے یہ کوئی خیالی جانور نہیں ہے۔ اس کو انگریزی میں ہیپوپوٹامس کہتے ہیں جس کا لفظی ترجمہ ہے اسپ دریائی۔ مگر اس کو گھوڑے سے کچھ مشابہت نہیں البتہ گینڈے سے بہت مشابہ ہے اور اگر سونڈ اور چوڑے کان بھی ہوتے تو پورا ہاتھی ہی ہوتا۔ تھن دار جانوروں کی نوع میں سے ہے اور مختلف اقسام کا ہوتا ہے اور بڑے سے بڑا دم کی طرف سے لے کر سر تک سترہ فٹ کا لمبا ہوتا ہے۔ اکثر سواحل افریقہ پر اور بعض جگہ دریائے نیل میں بھی پایا جاتا ہے۔ اگرچہ اکثر پانی میں خوش رہتا ہے مگر دریا کے کنارے نباتات چر کر زندگی بسر کرتا ہے۔

اور شاہ عباس کا وہ نامہ جو یہ ایلچی لایا تھا اور جس کے مضمون کی نسبت ڈاکٹر برنی اس کے بعض فقرے نقل کر کے اپنے قیاس سے ان کی تردید کی ہے انشائے ملا طاہر وحید میں جو شاہ عباس کا نہایت مقرب اور "مجلس نویس خاص" تھا ایک رقم "یعنی فرمان موسومہ ایلچی مذکور (جس کو اس کے صحیح نام اور خطاب بوداق سلطان کی جگہ صاحب عالمگیر نامہ وغیرہ شاہی مورخوں نے اپنے ہاں کے شاہزادوں کا لقب سلطان ہونے کے لحاظ سے خواہ مخواہ بوداق بیگ بنا دیا ہے) بجنسہٖ موجود ہے۔ اس کے ملاحظہ سے ثابت ہوتا ہے کہ فی الواقع اس نامہ میں کوئی بھی ایسا فقرہ نہ تھا جو اورنگ زیب جیسے عالی منزلت بادشاہ کی شان کے برخلاف ہو بلکہ برعکس اس کے تمام الفاظ اور طرز تحریر نہایت حسب حال اور معقول اور مؤدب ہے اور اگرچہ اس میں اورنگ زیب کو اصلی نام سے مخاطب کیا ہے بلقب عالمگیر نہیں لکھا مگر یہ بات کچھ اس کی توہین کے ارادہ سے نہیں معلوم ہوتی کیونکہ نامہ کی طرز عبارت کے علاوہ بوداق بیگ کے نام کے فرمان سے بے شبہ اور صاف طور پر شاہ عباس کا یہ خیال پایا جاتا ہے کہ وہ اورنگ زیب کے ساتھ دوستی اور اتحاد پیدا کرنے کا بہ دل خواہشمند تھا۔ چنانچہ نامہ اور فرمان کے بعض فقرات تاکید کو جو اس حاشیہ کے مدعا سے علاقہ نہیں رکھتے حذف کر کے بعینہٖ اس جگہ نقل کیا جاتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) "نامہ کہ بہ بادشاہ والا جاہ اورنگ زیب نوشتہ شد

بعد از حمد جناب کبریا و بسط بساط نعت سید انبیا و منقبت زبدۂ اصفیا بہ مرآت ضمیر قدسی تخمیر اعلیٰ حضرت رفیع المنزلت گردون بسطت مشتری سعادت خورشید طلعت عطارد فطنت کیوان وقار سپہر اقتدار زینت بخش وسادۂ جاہ و جلال متکی آرایک فرخندگی و اقبال مصقل مرآت سنائے دولت صفا و شیرازہ بند اوراق پریشان ملا و عباد فارس مضمار خصم افگنی و دشمن شکاری منظور انظار حضرت باری۔ پیش رو سالکان صراط مستقیم وصول۔ نظر یافتہ مقربان پیشگاہ قبول فروردین ریاض ہمیشہ بہار سلطنت گورگانی۔ حدیقہ طراز گلستان خلد نشان جہانبانی سیراب منہل عذب انتباہ و آگاہی۔ دقیقہ شناس خبایائے اسرار کما ہی۔ شہاب ثاقب سپہر حماست و جلادت۔ نہنگ لجۂ بحر شہامت و بسالت المؤید بعنایات الملک الحسیب نظام السلطنۃ والنصفۃ والمعدلۃ والشہامۃ والبدلۃ والجلالۃ والرفعۃ والعزۃ والا متنان سلطان اورنگ زیب منطبع می گرداند کہ دریں وقت ارجمند و زمان سعادت پیوند کہ بہ نیرنگی خالق الناس و جاعل تمکین و مکان اسباب کامیابی و خوش دلی من جمیع الوجوہ آمادہ و ابواب فیوضات از خشش جہت بچہرۂ اقبال کشادہ است بمیامن مخبران صدق آئین مژدہ جلوس آن گوہر فروزان بحر بسالت و شجاعت و جوہر تیغ دشمن شکار جرات و جسارت بر سریر والائے سلطنت موروثی گورگانی و وسادۂ لازم السعادت جہانبانی کہ بفحوائے صدق انتمائے تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ ـ و باقتضائے آیہ وافی الہدایہ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ و بہ نیروئے اصابت تدبیر و موافقت کارگذاران تقدیر پیرایہ حسن وقوع پوشیدہ سامعہ افروز گشتہ سرمۂ بر مسرت و خوش دلی افزودہ ہموارہ بر سریر گردون نظیر دولت متمکن باشند از انجا کہ مبانی صداقت والتیام فی ما بین برگزیدگان این دو سلسلۂ والا مقام سپہر احتشام استحکام تمام داشتہ در عالم دوستی قدیم مترقب می بود کہ آن زیبندۂ اورنگ اقبال و چراغ افروز دودمان مجد و اجلال را ہر گونہ مہیکہ درباب استقرار امر جہانبانی درکار باشد بمقام اعلام درآید کہ کارگزاران دولت ابد مقرون بانجام آن مامور گردند چون تلافی ما فات بعون عنایت الٰہی مقدور و مراعات شیوہ ستودۂ دوستی پیوستہ منظور است بدستور ہر گونہ مطلبے کہ در خاطر والا مرکوز باشد زبان زد خامۂ اظہار خواہند نمود" فقط انتہیٰ۔

رقعے کہ بہ بوداق سلطان تفنگچی آقاسی در ایام ایلچی گری ہند نوشتہ"

امارت پناہ بوداق سلطان بعنایت بے غایت شاہانہ و مرحمت بے نہایت بادشاہانہ معزز و سرفراز و ممتاز بودہ بداند کہ عریضۂ کہ دریں وقت مصحوب رفعت و معالی پناہ علی قلی بیگ بدرگاہ جہان پناہ و آستان

خلایق امیدگاہ مشتملبر خوشنودی از الطاف پادشاہِ والا جاہ گردوں بارگاہ ستارہ سپاہ فرستادہ بود در
ہنگامیکہ گلہاے کامجوئی و کامرانی در بوستانِ بے خزاں صاحب قرانی بر نیرش سحاب عنایت سبحانی
شگفتہ و گرد و غبار عوایق و موانعِ عیش و عشرت بنسایم الطاف الٰہی رفتہ دولاتِ اطراف در دربار جلال فرش
آستان و سلاطین باتمکین در محفلِ بہشت مشاکل مانند ساغر بخدمت در دوران بودند بہ نظر کیمیا اثر
رسید۔ برگ پان "کہ بدفعات ارسال یافتہ بود بہ تخصیص" بار جامۂ لاہوری "یعنی لاہور کی بنی ہوئی وہ
بوری یا گون جس میں پان بھیجے تھے) بوسے تو بہار دار الخلد بزم ارم نشان سر سبز دریان دار و گردید بنا بر عنایت
شاہانہ دربارۂ آں غلام زادہ خلاعِ فاخرہ پوشیدہ بمصحوب رفعت و معالی پناہ سہراب بیگ غلام خاصہ شریفہ
فرستادہ شد معروض داشتہ بود کہ اعلیٰ حضرت بادشاہِ والاجاہ کامیاب مالک رقاب بنا بر مراعات
یک جہتی و یگانگی مقرر فرمودہ اند کہ بہ تعاقب ارسالِ برگ سبز پان بوستان یاد آوری شگفتہ و خنداں باشد
این معنی موجب اہتزاز ازاہیر بوستان سراے خاطر ہمایوں شد۔ چوں از طرفین بساط یکتا دلی ممہد و ابواب
منافرت و بیگانگی بالکلیہ مسدود ست انچہ از شمار حلاوت آثار مختصہ این دیار مرغوب خاطر والاے آں پادشاہ
جم اقتدار عدالت شعار پسندیدہ اطوار بودہ باشد معروض خواہد داشت کہ بندگان درگاہ گردوں پیش گاہ
بارسال آن مامور گردند۔ در عریضہ علٰحدہ اظہار میلان خاطر خورشید آثر اعلیٰ حضرت بادشاہ گردوں
بارگاہ بارسالِ عمدۃ الاماثل والاشباہ برہان الدین خویش ایالت و شوکت پناہ فاضل خاں شدہ
بود برآن غلام زادہ لازمی ظاہرست کہ درحینیکہ جان نثار خاں بہ رسم حجابت بدرگاہ خلایق پناہ آمدہ
از جملہ مطالبے کہ بعرض آن مامور شدہ استدعاے رخصت جمعے از مردم این دیار بود و چوں درآں وقت
تراکم غبار نفاق مانع دخول شاہد مسئول بحجلۂ اجابت و قبول بود بپیرایۂ حصول نہ پوشیدہ دریں وقت کہ
بحمد اللہ تعالیٰ آں غبار از رہگذر خاطر رفتہ و گلہاے یک جہتی بر شاخسار مودت شگفتہ زبدۃ اقران موی الیہا
مرخص فرمودہ انتظام مطاعۂ لازم الاطاعت باسم بیگلر بیگیاں عظام و امراے کرام و مرزاے ذوی الاحترام
ممالک محروسہ شرف صدور یافت کہ مانع و مزاحم مشار الیہ نشدہ او را در کمال رفاہ حال و فراغِ بال
با منسوبان و متعلقان و احمال و اثقال روانہ نمایند و علی قلی بیگ مشمول عنایات شاہانہ و التفاتات خسروانہ
شد۔ چوں خاطر والا و طبع اقدس و اعلیٰ متوجہ رسیدن اخبار صحت آثار ذات ستودہ صفات کامل
الصفات اعلیٰ حضرت بادشاہِ والاجاہ ستارہ سپاہ می باشد و آن غلام زادہ نیز مدتیست کہ از شرف درگاہ
خلایق پناہ دور و از شرف بندگی مہجور شدہ درمین ورود قم اشرف رخصت انصراف حاصل نمودہ روانہ شود
و بہ توجہات شاہانہ مستمال باشد" فقط

جب تک یہ سفیر دہلی میں رہا اورنگ زیب اپنی تمام حرکات و سکنات میں سخت احتیاط کا پابند رہا برخلاف شاہجہاں کے جس نے نامور شاہ عباس کے سفیر کو کبھی تو بے موقعہ نخوت دکھا کر ناراض کر لیا اور کبھی ایسی بے تکلفی اختیار کی جو اُس کی شان کے لائق نہ تھی۔

سفیر ایران اور شاہجہاں کے لطیفے

جب کوئی ایرانی ہندوستانیوں کی ہنسی اُڑانا چاہتا ہے تو مندرجہ ذیل قصے بیان کرتا ہے۔ اول یہ کہ جب شاہجہاں کی کوئی تدبیر نہ چل سکی کہ سفیر ایران ہندوستان کے درباری قاعدہ کے موافق رسم تسلیمات جس سے اُس کو انکار تھا بجا لائے تو اُس نے یہ تدبیر نکالی کہ عام وخاص کے دروازے کا پھاٹک تو بند کروا دیا اور صرف کھڑکی کھلی رہنے دی جس میں سے بغیر سر جھکائے گذر نہیں ہو سکتا تھا شاہجہاں کو اُمید تھی کہ اس تدبیر سے ہم کو اس بات کے کہنے کا موقعہ ملے گا کہ سفیر ایران کو دربار میں حاضر ہونے کے وقت ہندوستان کی رسم سے کہیں زیادہ سر جھکانا پڑا۔ لیکن یہ سرکش اور چالاک ایرانی فوراً تاڑ گیا اور شاہجہاں کی طرف پیٹھ کر کے کھڑکی میں داخل ہوا شاہجہاں

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ اور مصنف نے جو ایران کی کمزوری کے ثبوت میں یہ لکھا ہے کہ باہمی فساد کے دنوں میں داراشکوہ۔ شاہجہاں سلطان شجاع اور شاید صوبہ دار کابل نے بھی اُن سے مدد مانگی تھی مگر باوجود ایسے عمدہ موقعہ مداخلت کے وہ کچھ بھی نہ کر سکے۔ اس کے متعلق کتاب طاہر وحید میں اگرچہ شاہجہاں شجاع اور مہابت خاں صوبہ دار کابل کے نام کی تو کوئی تحریر نہیں ملتی۔ مگر شاہ عباس کی طرف سے مراد بخش داراشکوہ اور والیان بیجاپور و گولکنڈا کے نام کے نامے بے شک موجود ہیں۔ جن سے پایا جاتا ہے کہ مراد بخش کو خالی وعدے تو بہت بڑے لفظوں میں دیئے گئے تھے مگر اخیر میں ایفائے وعدہ میں بیست لعل اور فیروزہ فدا کر دینے کے لئے قصداً گنجائش رکھ لی گئی تھی۔ اور داراشکوہ کو جو نواح سندھ میں پہنچ کر طالب امداد ہوا تھا مدد کا وعدہ دے کر یوں ٹال دیا تھا کہ آپ اپنے دادا ہمایوں کی طرح اول ہمارے پاس اصفہان میں تشریف لے آئیے پھر سب طرح سے بندوبست ہو جائے گا۔

اور بیجاپور و گولکنڈا والوں کو جو شاہان صفویہ کے ہم مذہب تھے شاہانِ مغلیہ کا سنی المذہب ہونا بہت شد و مد سے جتا کر اگرچہ یہ صلاح تو دی گئی تھی کہ اس وقت یہ اپنے خانگی فسادوں میں مبتلا ہیں تم دونوں متفق رہ کر ان کی بیخ کنی میں کوشش کرو مگر اپنی فوج وغیرہ بھیجنے کا کوئی وعدہ و اقرار نہ تھا۔

ان حالات پر غور کرنے سے برنیر کی یہ رائے بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ اہل ایران ظاہری نمائش کے لئے خالی شیخیاں بہت بگھارتے تھے مگر اپنی طاقت کا اندازہ اپنے دل میں خوب سمجھے ہوئے تھے۔ س م ع

یہ دیکھکر کہ اس چال میں بھی وہی غالب رہا بہت جھنجلایا اور سفیر کو حقارت سے مخاطب کر کے بولا ۔

"اے بدبخت کیا تو اپنے جیسے گدھوں کا طویلہ سمجھکر اس میں داخل ہوا ہے"؟

اُس نے کہا بے شک میں یہی سمجھا تھا۔ کیونکہ ایسے دروازہ میں سے گذر کرتے ہوئے کون شخص یہ خیال کر سکتا ہے کہ گدھوں سے ملنے کے سوا وہ کسی اور جگہ جا رہا ہے ۔

دوسرا یہ کہ شاہجہاں نے سفیر ایران کے کسی بے ادبانہ اور کرخت جواب سے ناراض ہو کر کہا

"اے بدبخت شاہ عباس کے دربار میں کیا کوئی شریف آدمی نہ تھا جو تجھ جیسے خر دماغ کو میرے پاس بھیجا؟"

اُس نے کہا کیوں نہیں بہت سے مہذب اور لائق لوگ موجود ہیں مگر وہ ہر ایک کی لیاقت کے موافق سفیر بھیجا کرتا ہے ۔

تیسرا یہ کہ ایک دن شاہجہاں نے سفیر ایران کو اپنے ہاں کھانے پر بلایا اور حسب معمول اُس کے چھیڑنے کے لئے موقعہ دیکھتا رہا۔ پس جب سفیر نے قاب میں سے ڈھونڈ کر ہڈیاں نکالیں اور چچوڑنی شروع کیں تو بادشاہ نے چپکے سے کہا "ایلچی جی کتے کیا کھائیں گے؟ اُس نے کہا "کھچڑی" جسے بادشاہ بڑی رغبت سے نوش جاں فرما رہے تھے۔ کھچڑی ایک کھانا ہے جو چاول اور مونگ یا ماش وغیرہ ملا کر پکایا جاتا ہے اور جس کو عموماً ہندوستان کے غریب آدمی کھاتے ہیں۔ پھر بادشاہ نے پوچھا کہ تم ہمارے شہر دہلی کو ۔ (جو اُس وقت نیا تیار ہو رہا تھا) اصفہان کے مقابلہ میں کیسا خیال کرتے ہو؟ سفیر نے بلند آواز سے جواب دیا کہ "واللہ باللہ اصفہان تو آپ کے شہر کی گرد کو بھی نہیں پہنچتا" ۔ بادشاہ نے اسے تعریف جانا۔ لیکن سفیر نے ہجو ملیح کی تھی۔ کیونکہ شاہجہاں آباد کا گرد و غبار بہت ہی تکلیف دہ ہے ۔

ایک قصہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ جب شاہجہاں نے سفیر کو اس امر پر مجبور کیا کہ ٹھیک طور پر بتائے کہ ایران اور ہندوستان کی سلطنت کی قوت میں کس قدر فرق ہے تو اُس نے عرض کیا کہ ہندوستان چودھویں رات کے چاند کے موافق ہے اور ایران محض دوسری یا تیسری رات کے چاند کے مطابق۔ جس سے شاہجہاں اپنی عظمت کی بات سمجھ کر بہت ہی خوش ہوا۔ لیکن جب اس ذو معنی جواب کا اصل مطلب خیال میں آیا جو

یہ تھا کہ سلطنت ہند زوال کے قریب ہے اور ایران ایک بڑھتی ہوئی دولت ہے تو دل ہی دل میں بہت پیچ و تاب کھایا۔ الغرض ہندوستان میں جو ایرانی رہتے ہیں وہ اپنی ذہانت اور حاضر جوابیوں کی نسبت اسی طرح کی شیخیاں بگھارا کرتے ہیں اور ایسے نقے بیان کرتے ہوئے کبھی سیر ہی نہیں ہوتے۔ مگر میری رائے میں بہ نسبت تعلی اور تدمغ اور طنز و ایما کے سفیروں کے لئے زیبا طریق یہ ہے کہ وہ متانت اور وقار اور ادب کو ملحوظ رکھیں۔

شاہ عباس کا یہ سفیر اگرچہ ان پسندیدہ اوصاف سے تو معرا ہی تھا۔ مگر تعجب تو اس بات کا ہے کہ اس کو اتنا معمولی شعور بھی نہ تھا کہ اپنی جان اور آبرو کو بچائے رکھتا اور خواہ مخواہ ایک خود سر بادشاہ کو اپنی نسبت غضبناک نہ کرلیتا۔ چنانچہ ایک واقعہ سے جس میں اس کی جان جانے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رہا تھا ثابت ہوتا ہے کہ اس نے ایسی ہی نادانی کی باتوں سے شاہجہاں کو اپنے سر کرلیا تھا یعنی اس بادشاہ کو اس سے ایسی دلی رنجش ہوگئی تھی کہ اس سے بات چیت کرنے میں حقارت آمیز الفاظ علانیہ کہہ بیٹھتا تھا بلکہ مخفی طور پر یہ حکم دیدیا تھا کہ جب وہ دربار کو آئے تو عام و خاص کے راستہ میں (جو مثل ایک لمبے اور تنگ کوچہ کے ہے) ایک خونی ہاتھی اس پر چھوڑدیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور اگر یہ شخص چالاک اور دلیر نہ ہوتا تو ضرور مارا جاتا۔ لیکن وہ اپنی پالکی سے نہایت پھرتی کے ساتھ کود گیا اور اس نے اور اس کے ہمراہیوں نے ایسے تیر پر تیر مارے کہ ہاتھی بھاگ گیا اور اس کی جان بچ گئی۔

اورنگ زیب کا اپنے استاد کے ساتھ سلوک جس مہینے سفیر ایران اپنے ملک کو واپس گیا ملا صالح کی دربار میں بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ یہ بڈھا عالمگیر کا اُستاد تھا اور ایک مدت سے اپنی جاگیر میں جو شاہجہاں نے

لہ شاہجہاں کا مورخ خاص ملا عبدالحمید لاہوری بادشاہ نامہ کے رسالہ اوّل کے خاتمہ میں جو ۱۰۴۶ہجری کے متعلق تھا دربار شاہجہانی کے علماء و فضلا کی فہرست میں اورنگ زیب کے اُستاد کی نسبت یہ عبارت لکھتا ہے "میر محمد ہاشم معروف بہ حکیم ہاشم خلف میر محمد قاسم گیلانی مدت دوازدہ سال در حرمین شریفین بودہ منقولات را از شیخ محمد عربی محدث و شیخ عبدالرحیم خساقی و ملا علی نبیرۂ ملا عصام الدین مشہور۔ و معقولات را از میر نصیر الدین حسین پسرزادہ میر غیاث الدین منصور و مرزا ابراہیم

اُسے دے رکھی تھی رہتا تھا جب اُس نے سُنا کہ شاہزادوں کی باہمی لڑائیاں ختم ہو چکیں اور اُس کے شاگرد نے اپنے اولوالعزمانہ منصوبوں میں پوری کامیابی حاصل کر لی تو فوراً دہلی آیا ہے۔ اور اُس کو پوری اُمید تھی کہ اب امارت کا درجہ بہت جلد حاصل ہو جائے گا چنانچہ جو لوگ دربار میں ذی وجاہت تھے سب کو اُس نے اپنا جانب دار بنا لیا یہاں تک کہ کئی شخصوں بلکہ روشن آرا بیگم نے بھی اورنگ زیب کو یاد دلایا کہ آپ کا قابل التعظیم اور کامل الاخلاص اُستاد عزت و اکرام کا یقیناً مستحق ہے۔ مگر تین مہینے تک تو اُس نے یہ بھی جاننا نہ چاہا کہ وہ دربار میں آتا بھی ہے یا نہیں۔ لیکن آخر کار جب

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ ہمراہی فرا گرفتہ بہ ہندوستان آمد و طب و ریاضی نزد سرآمد اطباے حکیم علی گیلانی مدے زیدہ چندے در احمد آباد گجرات بتدریس مشتغل بود چوں دانائی او در فنون و فضائل خصوصاً طب بعرض اقدس رسید حکم شد کہ در ہماں بلدہ بخدمت صدارت و طبابت پردازد۔ پس از انقضائے مدتے ملتزم عبودیت سدہ سینہ گشتہ بامر خاقانی شرف تعلیم اختر برج سعادت پادشاہزادہ محمد اورنگ زیب بہادر دریافت و اکنوں در ملازمت آں والا گوہر کامیاب است بر تفسیر بیضاوی حاشیہ نگاشتہ بنام نامی حضرت شاہنشاہی مطرز گردانیدہ است" فقط چونکہ اورنگ زیب کی ولادت پندرھویں ذیقعدہ ۱۰۲۷ھ ہجری کی تھی۔ اس حساب سے ظاہر ہے کہ ۱۰۴۷ھ میں اُس کی بیس برس کی عمر تک اُس کا یہی اُستاد اُس کے پاس تھا اور اُس وقت کے نامور عالموں کی مذکورہ بالا فہرست میں صالح نامی کسی شخص کا ذکر نہیں ہے۔ البتہ صاحب عمل صالح نے شاہجہاں کے عہد کے خوشنویسوں کے ذکر میں میر عبد اللہ مشکیں رقم کے بیٹوں میر محمد صالح و میر محمد مومن کے نام لکھ کر اُن کی خوشنویسی کی بہت تعریف کی ہے۔ اور لکھا ہے کہ علاوہ خوشنویسی کے یہ دونوں علاقی ہندوستان کے فن موسیقی میں بھی نہایت کامل گویّے تھے اور شاعر بھی تھے۔ چنانچہ میر صالح اشعار فارسی میں کشفی اور ہندی اشعار میں سبحان اپنا تخلص کرتا تھا اور یہ دونوں اپنے اشعار زیادہ تر اہل بیت اطہار سلام اللہ علیہم کے مناقب میں لکھتے اور اہل تصوف سے بہت ربط و ضبط رکھتے تھے۔ اور منصب داروں کی فہرست میں اس میر صالح کو نہ صدی صد سوار کا منصب دار لکھا ہے مگر اورنگ زیب کا اُستاد ہونا کہیں نہیں لکھا فقط

س م ت

اُس کو دیکھتے دیکھتے تنگ آگیا تو حکم دیا کہ ملّا خلوت کے دربار میں حاضر ہو۔ جہاں صرف حکیم الملک دانشمند خاں اور تین چار اور امیر جو علم وفضل میں مشہور ہیں موجود تھے۔ اگرچہ میں اس موقعہ پر حاضر نہ تھا اور ہوتا بھی تو ناممکن تھا کہ اُس طول طویل گفتگو کو یاد رکھتا جو اورنگ زیب نے مُلّا سے کی تھی۔ مگر جو کچھ اپنے آغا کی زبانی میں نے سُنا ہے کچھ شک نہیں کہ اُس کا مطلب حسب ذیل تھا۔ یعنی اورنگ زیب نے فرمایا۔

ملّاجی! براہ مہربانی یہ تو فرمایئے کہ آپ ہم سے چاہتے کیا ہیں؟ کیا آپ کو یہ دعویٰ ہے کہ ہم آپ کو دربار کے اوّل درجہ کے اُمرا میں داخل کرلیں؟ لیکن اس سے پہلے اس بات کا ثابت کرنا ضروری ہے کہ آپ کسی نشانِ عزت کے مستحق بھی ہیں یا نہیں۔ ہم اس سے انکار نہیں کرتے کہ اگر آپ ہماری تعلیم وتربیت شائستہ طور پر کرتے تو ضرور ایسی ہی عزت کے مستحق ہوتے آپ ہم کو ایک تربیت یافتہ نوجوان شخص بتایئے تاکہ ہم بتادیں کہ اُس کی تعلیم وتربیت کی بابت شکرگذاری کا زیادہ مستحق اُس کا اُستاد ہے یا اُس کا باپ۔ فرمایئے تو سہی کہ آپ کی تعلیم سے کون سی واقفیت مجھے حاصل ہوئی ہے کیونکہ آپ نے تو مجھکو یہ بتایا تھا کہ تمام فرنگستان ایک چھوٹے سے جزیرے سے زیادہ نہیں ہے جس میں سب سے بڑا بادشاہ اول شاہ پرتگال تھا۔ پھر بادشاہ ہالینڈ ہوا۔ اور اُن کے بعد شاہِ انگلستان اور فرنگستان کے اور بادشاہوں مثلاً فرانس اور اُندلس کی بابت آپ یہ بتایا کرتے تھے کہ یہ لوگ ہمارے ہاں کے چھوٹے چھوٹے راجاؤں کے موافق ہیں۔ اور یہ کہ ہندوستان کے پادشاہوں میں صرف ہمایوں، اکبر۔ جہانگیر اور شاہجہاں ہی ایسے شاہنشاہ ہوئے ہیں۔ جن کے آگے تمام دنیا کے پادشاہوں کی شان وشوکت مدھم ہے۔ اور یہ کہ ایران۔ اُزبک۔ کاشغر۔ تاتار۔ پیگو۔ سیام چین۔ اور ماچین کے بادشاہ سلاطین ہند کے نام سے کانپتے ہیں سبحان اللہ آپ کی اس جغرافیہ دانی اور کمال علم تاریخ کا کیا کہنا ہے۔ کیا مجھ جیسے شخص کے اُستاد کو لازم نہ تھا کہ دنیا کی ہر ایک قوم کے حالات سے مجھے مطلع کرتا مثلاً اُن کی قوت جنگی سے؟ اُن کے وسائل آمدنی اور طرز جنگ سے اُن کے

رسم ورواج اور مذاہب اور طرزِ حکمرانی سے، اور اُن خاص خاص اُمور سے
جن کو وہ اپنے حق میں زیادہ مفید سمجھتے ہیں بہ تفصیل مجھکو آگاہ کرتا، اور
علم تاریخ مجھے ایسا سلسلہ وار پڑھاتا کہ میں ہر ایک سلطنت کی جڑ بنیاد اور
اسباب ترقی و تنزل اور اُن حادثات و واقعات اور غلطیوں سے واقف ہو جاتا
جن کے باعث سے اُن میں ایسے بڑے بڑے انقلابات ظہور میں آتے رہے
ہیں۔ اور قطع نظر اس سے کہ آپ مجھکو بنی آدم کی وسیع اور کامل تاریخ سے
آگاہ کرتے آپ نے تو ہمارے اُن مشہور و معروف بزرگوں کے نام بھی اچھی
طرح نہیں بتائے جو ہماری سلطنت کے بانی تھے۔ اور اُن کی سوانح عمری
اور اُن کی خصوصی قابلیتوں سے بھی آگاہ نہیں کیا۔ جن کے باعث وہ بڑی
بڑی فتوحات کرنے کے قابل ہوئے اور اُن فتوحات سے پہلے جو واقعات
ظہور میں آئے اُن سے بھی ناواقف رکھا۔ اور باوجودیکہ بادشاہ کو اپنی ہمسایہ
قوموں کی زبانوں سے واقف ہونا ضروری ہے بجائے اُن کے آپ نے مجھکو
عربی لکھنا پڑھنا سکھایا۔ اگرچہ اس زبان کے سیکھنے میں میری عمر کا ایک
بڑا حصہ ضائع ہوا۔ مگر بے شک آپ نے یہ سمجھا تھا کہ آپ مجھ پر ایک ایسی
زبان کے سکھانے سے جو دس بارہ برس برابر محنت کئے بغیر حاصل نہیں
ہو سکتی ایک دائمی احسان کر رہے ہیں۔ آپ نے بغیر اس کے کہ یہ سوچیں
کہ ایک شاہزادہ کو زیادہ تر کن کن علوم کے پڑھانے کی ضرورت ہے صرف
صرف و نحو اور ایسے فنون کی تعلیم کو جو ایک قاضی کے لئے ضروری ہیں مقدم
جانا اور ہماری جوانی کے ایام کو بے فائدہ اور لفظی بحثوں کے پڑھنے پڑھانے
میں ضائع کیا۔"

یہ الفاظ تھے جن میں اورنگ زیب نے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ لیکن بعض پڑھے
لکھے آدمی یا تو بادشاہ کی خوشامد اور اُس کے کلام کی قوت دکھانے کو یا ملا صالح کے
حسد کے مارے یوں کہتے ہیں کہ بادشاہ کا ملا کو ملامت کرنا اسی پر ختم نہیں ہوا۔ بلکہ تھوڑی
دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے دوبارہ ملا کو کہا۔

"کیا آپ کو معلوم نہ تھا کہ بچپن میں جب کہ قوت حافظہ قوی ہوتی ہے

ہزاروں معقول باتیں ذہن نشین ہو سکتی ہیں اور آسانی کے ساتھ انسان
ایسی مفید تعلیمات حاصل کر سکتا ہے کہ جن سے دل میں نہایت اعلیٰ
خیال پیدا ہو جاتے ہیں اور انسان بڑے بڑے نمایاں کاموں کے کرنے
کے قابل ہو جاتا ہے۔ کیا نماز صرف عربی زبان ہی کے ذریعہ سے ادا ہو سکتی
ہے اور ہماری اصلی زبان میں اُسی طرح نہیں ہو سکتی۔ اور تحصیل مسائل
شرعیہ کیا زبان عربی ہی پر موقوف ہے۔ آپ نے ہمارے والد ماجد کو تو
یہ سمجھا دیا کہ ہم اسے فلسفہ پڑھاتے ہیں۔ اور مجھے خوب یاد ہے کہ آپ نے
برسوں تک ایسے بیہودہ اور لغو مسائل سے میرے دماغ کو پریشان رکھا
جن کے حل ہو جانے کے بعد بھی کچھ اطمینان خاطر حاصل نہیں ہوتا۔ اور
جو معاملات دنیاوی میں کبھی کارآمد نہیں ہوتے۔ اور صرف ایسے غیر معین
اور فضول خیالات اور توہمات ہیں جو سمجھ میں تو بڑی مشکل سے آتے ہیں
مگر بہت ہی جلد ذہن سے اُتر جاتے ہیں۔ اور جن کا نتیجہ صرف یہ ہے کہ
دماغ پریشان اور عقل خبط ہو کر آدمی ایسا منہ زور اور ہٹیلا ہو جائے کہ
لوگ اُس سے دق ہو جائیں۔ بے شک آپ نے میرے اوقات گراں
مایہ کے کئی سال ایسے مسائل مفروضہ کی تعلیم میں جو آپ کو مرغوب تھے
صرف کرائے مگر جب میں آپ کی تعلیم سے علیحدہ ہوا تو کسی بڑے علم کے
جاننے کا فخر نہیں کر سکتا تھا بجز اس کے کہ ایسی چند عجیب اور غیر معروف
اصطلاحوں سے واقف تھا۔ جو ایک عمدہ سمجھ کے نوجوان شخص کی ہمت
کو شکستہ، دماغ کو مختل، اور طبیعت کو حیران کر دیتی ہیں۔ اور جو مدعیانِ فلسفہ
کے جھوٹے دعووں اور جہالت کے چھپانے کی خاطر جو آپ کی مانند لوگوں
کو یہ ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ وہ عقل و دانش میں سب سے بڑھے
ہوئے ہیں اور یہ کہ اُن کی تاریک اور مشتبہ المفہوم پیچ در پیچ لچر لغو میں ایسے
بہت سے دقایق ہیں جو بجز اُن کے اور کسی کو معلوم نہیں گھڑ لیے گئے ہیں
اگر آپ مجھکو وہ فلسفہ سکھاتے جس سے ذہن اس قابل ہو جاتا ہے کہ بغیر برہان
اور دلیل صحیح کے کسی بات کو تسلیم نہیں کرتا۔ یا آپ مجھکو ایسا سبق پڑھاتے

جس سے انسان کے نفس کو ایسا شرف اور علو حاصل ہو جاتا ہے کہ دنیا کے انقلابات سے متاثر نہیں ہوتا۔ اور ترقی و تنزل کی حالت میں ایک ہی سا رہتا ہے۔ یا تم مجھے انسان کے لوازم فطرت اور مقتضیات طبیعت سے واقف کرتے۔ یا مجھے ایسے طریق استدلال کا عادی بناتے کہ تصورات و تخیلات کو چھوڑ کر ہمیشہ اصول صادقہ بدیہہ کی طرف رجوع کیا کرتا اور عالم و مافیہا کی حقائق واقعیہ اور اُس کے کون و فساد کی ترتیب و نظام کے معارف یقینیہ سے مجھے مطلع کرتے اور جو فلسفہ آپ نے مجھے تعلیم کیا ہے وہ ایسے مسائل پر مشتمل ہوتا۔ تو میں اُس سے بھی زیادہ آپ کا احسان مانتا جتنا کہ سکندر نے ارسطو کا مانا تھا۔ اور ارسطو سے بھی زیادہ آپ کو انعام عطا کرتا۔ ملاجی ناقدردانی کا جھوٹا الزام خواہ مخواہ مجھ پر نہ لگائیے۔ کیا تم یہ نہ جانتے تھے کہ شاہزادوں کو اتنی بات تو ضرور ہی سکھانی چاہیئے کہ اُن کو رعایا سے اور رعایا کو اُن کے ساتھ کس طرح برتاؤ کرنا لازم ہے۔ اور کیا تم کو اول ہی یہ خیال کر لینا ضروری نہ تھا کہ میں کسی وقت تخت و تاج کی خاطر بلکہ اپنی جان بچانے کے لئے تلوار پکڑ کر اپنے بھائیوں سے لڑنے پر مجبور ہوں گا۔ کیونکہ تم خوب جانتے ہو کہ سلاطین ہند کی اولاد کو ہمیشہ یہی معاملے پیش آتے رہے ہیں۔ پس تم نے کبھی لڑائی کا فن یا کسی شہر کا محاصرہ کرنا یا فوج کی صف آرائی کا طریقہ مجھے سکھایا تھا۔ مگر میری خوش طالعی تھی کہ میں نے ان معاملات میں ایسے لوگوں سے کچھ سیکھ لیا تھا جو تم سے زیادہ عقلمند تھے۔ پس اپنے گاؤں کو چلے جائیے اور آج کے بعد کوئی نہ جانے کہ تم کون ہو اور تمہارا کیا حال ہے۔[1]

---

[1] اس ساری تقریر کو پڑھنے کے بعد تو کچھ ایسا شبہ ہوتا ہے جیسے برنیر تعلیم و تربیت کے موضوع پر اپنے خیالات اورنگ زیب کے منہ سے کہلوانا چاہتا ہے جس کا مقصد محض مشرقی علوم کی تحقیر کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ حالانکہ اس زمانہ میں رومن کیتھولک گرجا کی جو تعلیمات اور فلسفے یورپ میں رائج تھے وہ بھی کہیں زیادہ لغویات اور حقائق سے دور تھے۔ ایک میں تین اور تین میں ایک کی تجسیم و تشکیل کے بنیادی نظریئے نے ان کے سارے علوم کو ایک عجیب گورکھ دھندا بنا رکھا تھا۔

بادشاہی منجم کی ناگہانی موت

انھیں دنوں میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ نجومیوں کے حق میں بہت غیر مفید تھا۔ بات یہ ہے کہ ایشیائی لوگ اکثر احکام نجوم کے ایسے معتقد ہیں کہ اُن کے نزدیک دنیا کا کوئی معاملہ ایسا نہیں ہے جو کواکب اور افلاک کی گردش پر منحصر نہ ہو اور اس لئے وہ ہر ایک کام میں نجومیوں سے مشورہ لیا کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ عین لڑائی کے وقت جب کہ دونوں طرف صف بندی بھی ہو چکی ہو کوئی سپہ سالار اپنے منجم سے ساعت نکلواتے بغیر لڑائی شروع نہیں کرتا۔ تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی نامبارک لگن میں لڑائی شروع کر دی جائے بلکہ منجموں سے پوچھے بغیر کوئی شخص سپہ سالاری پر مامور بھی نہیں کیا جاتا۔ علی ہذا القیاس بغیر اُن کی اجازت کے نہ شادی بیاہ ہو سکتا ہے نہ کہیں سفر کیا جاتا ہے۔ بلکہ ذرا ذرا سی باتیں بھی اُن سے پوچھے بغیر نہیں کی جاتیں مثلاً کسی لونڈی غلام کا خریدنا یا نیا کپڑا پہننا۔ اور اس احمقانہ توہم نے خلائق کو عموماً ایسی دقت میں ڈال رکھا ہے۔ اور اس سے ایسے اہم اور نامرغوب نتیجے پیدا ہوتے ہیں کہ مجھے سخت تعجب ہے کہ اس قدر مدت سے یہ اعتقاد کیوں کر قائم چلا آتا ہے۔ کیونکہ ہر ایک تجویز سے خواہ وہ کسی سرکاری کام کے متعلق ہو یا نج کے۔ اور ہر ایک معاملہ سے خواہ وہ معمولی ہو یا غیر معمولی نجومی کو واقف کرنا ضروریات سے ہے[1]۔

وہ واقعہ جس کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ خاص بادشاہی منجم کسی اتفاق سے پانی میں گر پڑا اور ڈوب کر مر گیا۔ اس افسوس ناک واقعہ سے دربار میں بڑی حیرت پیدا ہوئی۔ اور ان نجومیوں کی شہرت کو جو اسرار غیبی کے جاننے والے گنے جاتے ہیں

---

[1] مآثر عالمگیری اور سیر المتاخرین سے معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے جلوس کے اٹھارھویں سال (سنہ [illegible] ہجری) میں تمام منجموں کو جو بادشاہ اور شاہزادوں اور صوبہ داروں کے پاس ملازم رہتے تھے موقوف کر دیا تھا بلکہ اس حکم کی تعمیل اس سختی سے کی گئی تھی کہ اس کے مقرب خاص بختاور خاں نے ان سے مچلکے لکھوائے تھے کہ آئندہ تقویم (جنتری) تک بھی نہ بنایا کریں اور باوجودیکہ حسابوں کی صحت کے لئے سرکاری دفتروں میں جنتریوں کا موجود رہنا ایک ضروری امر تھا۔ اور مذہب کی رو سے کچھ منع بھی نہ تھا مگر اُن کا رکھنا اور دیکھنا بھی موقوف کیا گیا۔ اور بصورت نکلا کر سفر کرنے کی جگہ یہ دستور مقرر کیا گیا کہ وہ شنبہ اور پنجشنبہ کو روپہ ہوا کرے۔ س م ح

کی کہ ان میں جو مال و اسباب بند ہے وہ خاص اعلیٰ حضرت کے لئے ہے۔ میرے مرنے کے بعد باحتیاط تمام حضور میں پہنچا دیا جائے۔

پس نیک نام خاں کے انتقال کے بعد جب یہ صندوق سرکار میں آئے تو اتفاقاً بادشاہ دربار میں بیٹھا تھا۔ اُن کو دیکھکر اُس کا دل ایسا للچایا کہ سر دربار اُن کے کھولے جانے کا حکم دیا۔ مگر اُن کے کھلتے ہی جو انفعال اور مایوسی اُس کو ہوئی وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ اور اس قدر شرمندہ ہوا کہ فوراً دربار سے اُٹھ کر چلا گیا۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ نیک نام خاں کے مرنے کے چند سال بعد ایک دولت مند بنیا جو ہمیشہ سے پادشاہی ملازم تھا۔ اور اپنے ملک کے دستور کے موافق بڑا بیاج خور تھا مرگیا تو اُس کے بیٹے نے اپنی ماں سے کچھ روپیہ لینے کے واسطے لڑنا جھگڑنا شروع کیا مگر اس نے اُس کی عیاشی اور فضول خرچی کی وجہ سے دینے سے انکار کیا تو اس احمق نے شاہ جہاں کے پاس جاکر کہہ دیا کہ اُس کا باپ دو لاکھ "کرون" یعنی پانچ لاکھ روپیہ چھوڑ مرا ہے اس پر بادشاہ نے فوراً اس بیوہ مہاجنی کو دربار میں بلاکر یہ حکم دیا کہ ایک لاکھ روپیہ تو خزانہ شاہی میں بھیج دے۔ اور باقی میں سے پچاس ہزار روپیہ اپنے بیٹے کو دیدے۔ اور حکم قطعی دے کر چوب داروں سے کہا کہ اس بڑھیا کو دربار سے نکال دو۔ یہ سن کر اگرچہ یہ بیچاری بہت متحیر ہوئی اور اُس کو اس بات کا بھی بڑا رنج ہوا کہ بلا سماعت اس کے عذر کے دربار سے نکالے جانے کا حکم ہوا لیکن تاہم یہ باہمت بڑھیا گھبرائی نہیں اور چوب داروں کو جھڑک کر بولی کہ ہٹو، میں ابھی بادشاہ سے کچھ عرض کیا چاہتی ہوں' اس پر شاہجہاں نے : فرمایا اچھا جو کہنا چاہتی ہے کہنے دو۔ پس اُس نے عرض کیا کہ حضرت میرا بیٹا جو اپنے باپ کے مال کا دعویٰ کرتا ہے کچھ بے جا نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ہمارا بیٹا ...... اور ہمارا وارث ہے۔ مگر میں ہاتھ جوڑ کر عرض کرتی ہوں کہ سرکار کا میرے خاوند کے ساتھ کیا رشتہ ہے۔ جو حضور ایک لاکھ روپیہ مانگتے ہیں۔ شاہجہاں یہ مختصر اور بے ساختہ سوال سُن کر بہت خوش ہوا اور اس خیال سے کہ شہنشاہ ہند ہو کر ایک بنیے کا رشتہ دار کہلاتے اُس کو بڑی ہنسی آئی اور کئی بار قہقہہ مارا اور حکم دیا کہ اچھا اسے جانے دو اور اس کے مال و دولت سے کوئی متعرض نہ ہو۔

شاہزادوں کی باہمی لڑائی تقریباً سنہ ۱۶۶۰ء میں جب ختم ہو چکی اُس وقت سے لے کر کوئی چھ برس بعد تک جب کہ میں ہندوستان سے رخصت ہوا جو جو واقعات قابل غور پیش آئے

رہے اب میں اُن سب کو لکھنا نہیں چاہتا۔ اگرچہ کچھ شک نہیں ہے کہ اُن میں سے بعض کے کھ دینے سے میرا یہ مدعا کہ مغلوں اور ہندوستانیوں کے طور طریق اور رسم و رواج کا حال ناظرین کتاب پر واضح ہو جائے بہت کچھ پورا ہو جاتا اسی فروگذاشت کی وجہ سے مجھے وہ واقعات تمام و کمال کہیں پھر لکھنے پڑیں گے۔ لیکن سردست میں صرف انھیں خاص خاص لوگوں کے بعض اہم حالات بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں جن کے نام سے ناظرین واقف ہو چکے ہیں اور اس بیان کو شاہجہاں کے حال سے شروع کرتا ہوں۔

شاہجہاں کے ساتھ اورنگ زیب کا سلوک

اگرچہ اورنگ زیب نے شاہجہاں کو قلعہ آگرہ میں بڑی احتیاط کے ساتھ قید کر رکھا تھا اور کسی ایسی بات میں مطلقاً غفلت نہیں کی جاتی تھی جس سے اُس کے نکل بھاگنے کا اندیشہ ہو۔ لیکن اور سب طرح نہایت ادب اور ملائمت کا سلوک کیا جاتا تھا۔ اور اُن شاہی محلوں میں رہنے سہنے کی بھی اجازت دیدی گئی تھی کہ جن میں وہ پہلے رہا کرتا تھا۔ اور اُس کی بیٹی معروف بیگم صاحب سے ملنے کی بھی اجازت تھی۔ اور محل کی کل متعلقہ عورتیں مثلاً عملہ باورچی خانہ اور ناچنے گانے والیاں وغیرہ سب حاضر رہتی تھیں۔ اور ایسے معاملات میں اُس کی کوئی خواہش رد نہیں کی جاتی تھی اور اب جو یہ بڈھا عابد و زاہد بن گیا تھا بعض ملاؤں کو بھی اُس کے پاس جا کر تلاوت قرآن کی پروانگی تھی اور خاصے گھوڑوں اور باز جرے وغیرہ شکاری جانوروں کے منگا لینے اور ہرنوں اور مینڈھوں وغیرہ کی لڑائی کا تماشہ دیکھنے کی بھی اجازت تھی غرض کہ اورنگ زیب کا برتاؤ شاہجہاں کے ساتھ مہربانی اور ادب سے خالی نہ تھا اور حتی الامکان وہ اپنے بوڑھے باپ کی ہر طرح سے خاطرداری کرتا اور نہایت کثرت سے تحفے تحائف بھیجتا رہتا اور سلطنت کے بڑے بڑے معاملات میں اُس کی رائے اور مشورہ کو مثل ایک پیر و مرشد کی ہدایت کے طلب کرتا تھا۔ اور اُس کے عریضوں سے جو اکثر لکھتا رہتا تھا ادب اور فرماں داری ظاہر ہوتی تھی۔ پس اس طرح سے شاہجہاں کی گردن کشی اور اُس کا غصہ آخرکار یہاں تک ٹھنڈا پڑ گیا کہ معاملات سلطنت کے بارے میں بیٹے کو لکھنے پڑھنے لگا۔ اور دارا شکوہ کی بیٹی کو بھی اُس کے پاس بھیج دیا۔ اور وہ بیش بہا جواہرات جن کے دینے سے پہلے انکار کر کے یہ کہدیا تھا کہ اگر پھر مانگو گے تو کوٹ کر چورا کر ڈالوں گا مگر دوں گا نہیں اُن میں سے کچھ بعضے جواہر اورنگ زیب کے پاس از خود

بھیج دیئے بلکہ اپنے باغی فرزند کی سب گستاخانہ حرکتیں معاف کر کے اُس کے حق میں دعائے خیر بھی کر دی۔

حالانکہ اورنگ زیب بڑی لجاجت سے بارہا معافی مانگ چکا تھا اور شاہجہاں اس بات کو قبول نہیں کرتا تھا۔ مگر میرے اس بیان سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ شاہجہاں کی ہر ایک بات بلا عذر تسلیم کر لی جاتی تھی۔ کیونکہ مجھے اورنگ زیب کے ایک عریضہ کی طرز تحریر سے معلوم ہوا کہ جب کبھی یہ بڈھا بادشاہ تحکم کے طور پر اُس کو کچھ لکھتا تھا تو یہ اُس کے جواب میں جرأت کے ساتھ اپنی ہی بات پر قائم رہنے کا اظہار کرتا تھا۔ چنانچہ میں نے اُس کے چند فقرے پڑھے ہیں جن کا مضمون یہ تھا۔

"کیا حضور یہ چاہتے ہیں کہ میں سختی کے ساتھ پرانی رسموں کا پابند رہوں؟ اور جو کوئی ہمارا نوکر چاکر مر جائے اُس کی جائداد ضبط کر لوں، اگرچہ شاہانِ مغلیہ کا یہ دستور رہا ہے کہ اپنے کسی امیر یا کسی دولت مند مہاجن کے مرنے کے بعد بلکہ بعض اوقات تو دم نکل جانے سے بھی پہلے ہی اُس کے تمام مال و اسباب کا تعلیقہ کراتے تھے اور جب تک اُس کے نوکر چاکر جزو کل مال و دولت بلکہ ادنیٰ ادنیٰ زیور بھی نہ بتلا دیں اُن پر مار پیٹ اور قید و بند کا تشدد کیا جاتا تھا اور یہ دستور بے شک فائدہ مند بھی ہے۔ لیکن جو ناانصافی اور بے رحمی اُس میں ہے اُس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اور اگر ہر ایک امیر نیک نام خاں کا سا معاملہ کرے یا کوئی عورت اُس بیوہ مہاجنی کی طرح اپنے مال کو پوشیدہ کرے تو اس میں وہ حق بجانب ہے یا نہیں؟

حضور کی خفگی سے بہت ڈرتا ہوں اور اس امر کا متحمل نہیں ہو سکتا کہ حضور میرے طور طریق کی نسبت غلط فہمی فرمائیں۔ اور جیسا کہ حضور خیال فرماتے ہیں تخت نشین ہونے نے مجھے خود رائے اور مغرور نہیں بنا دیا۔ چالیس برس سے زیادہ کے تجربہ سے حضور خود ہی خیال فرما سکتے ہیں کہ تاج شاہی کس قدر گراں بار چیز ہے۔ اور بادشاہ جب دربار سے اُٹھتا ہے تو کس قدر افکار اُس کے دل کو غمگین اور دردمند بنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہمارے مشہور و معروف جد امجد جلال الدین محمد اکبر نے اسی غرض سے کہ اُن کی اولاد دانائی اور نرمی اور تمیز

کے ساتھ سلطنت کرے اپنے عہد سلطنت کی تاریخ میں امیر تیمور گورگان کا ایک ذکر بطور نمونہ لکھکر اپنی اولاد کو اُس کی طرف توجہ دلائی ہے چنانچہ لکھا ہے کہ جب بایزید یلدرم گرفتار ہوکر امیر تیمور کے حضور میں لایا گیا اور امیر بہت غور کے ساتھ اُس مغرور قیدی کی طرف دیکھکر ہنس دیا۔ تو بایزید نے اس حرکت سے ناراض ہوکر امیر کو کہا کہ تم کو اپنی فتح مندی پر اس قدر اترانا نہ چاہیئے عزت و ذلت منجانب اللہ ہے اور ممکن ہے کہ جس طرح تم آج فتح یاب ہوئے ہو کل میری طرح پکڑے جاؤ۔ امیر نے جواب دیا کہ میں دنیا اور اُس کے جاہ و دولت کی بے ثباتی سے خوب واقف ہوں اور خدا نہ کرے کہ میں اپنے کسی مغلوب دشمن کی ہتک کروں۔ اور میری ہنسی کا سبب یہ نہ تھا کہ تمھارا دل دُکھاؤں بلکہ مجھے تمھیں دیکھکر اپنی اور تمھاری بدصورتی کے خیال نے بے اختیار ہنسا دیا کیونکہ تم تو کانے ہو اور میں لنگڑا ہوں۔ اور یہ بات میرے دل میں گذری کہ تاج سلطنت ایسی کیا چیز ہے جس کو پاکر بادشاہ اپنی ہستی کو بھول جاتے ہیں حالانکہ خدائے تعالیٰ اس کو اپنے ایسے بندوں کو عطا کرتا ہے جو کانے اور لنگڑے ہوں[۱]۔

معلوم ہوتا ہے کہ حضور یہ خیال فرماتے ہیں کہ میری مصروفیت بہ نسبت اُن اُمور کے جن کو میں نظم و نسق ملک داری اور سلطنت کے اندرونی استحکام کے لئے نہایت ضروری جانتا ہوں نئی نئی فتوحات اور ملک گیری کی جانب زیادہ ہونی چاہیئے۔ اس امر سے میں ہرگز انکار نہیں کرسکتا کہ ایک بڑے شہنشاہ کا عہد دولت نئی نئی فتوحات کی وجہ سے ممیز اور ممتاز ہونا لازم ہے اور اگر میں ایسا نہ کروں تو گویا اپنے نامور بزرگ امیر تیمور گورگان کی نسل کو دھبہ لگاؤں گا۔ مگر بہرحال یہ بات قرین انصاف نہیں ہے کہ مجھے کاہلی اور خاموش بیٹھے رہنے کا الزام دیا جائے۔ کیونکہ بنگالہ اور دکن میں میری فوجوں کی مصروفیت کو تو حضور بھی عبث خیال نہیں فرما سکتے۔ اور میں

---

[۱] سلطان بایزید یلدرم کے مغلوب اور قید ہونے کے ذکر میں یہ روایت نہ تیمور نامہ میں لکھی ہے نہ اکبر نامہ میں۔ س م ح

حضور کو یہ بھی یاد دلاتا ہوں کہ بڑے سے بڑا ملک گیر بھی ہمیشہ سب سے بڑا بادشاہ نہیں ہوا۔ اور دیکھا جاتا ہے کہ کبھی کبھی دنیا کے اکثر حصے بالکل وحشی اور ناتربیت یافتہ قوموں نے فتح کر لئے ہیں اور نہایت وسیع سلطنتیں تھوڑے ہی عرصہ میں بالکل ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ہیں۔ پس حقیقت میں سب سے بڑا بادشاہ وہی ہے جو رعایا پروری اور عدل و انصاف ہی کو اپنا حاصل عمر جانے۔

اس عریضہ کے باقی حصہ کے پڑھنے کا مجھے موقعہ نہیں دیا گیا۔

میر جملہ کی کارگزاریاں مہم آسام اور اُس کی موت

اب میں چند کلمے اُس مشہور شخص کے باب میں کہنے چاہتا ہوں جس کو میر جملہ کہتے ہیں اور اُن معاملات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جن سے شاہزادوں کی باہمی لڑائی کے بعد اُس کا تعلق رہا اور یہ کہ اس نامور شخص کا خاتمہ کس طور پر ہوا۔

بنگالہ پر قبضہ حاصل کرنے میں اُس نے سلطان شجاع کے ساتھ وہ بے رحمی اور بے ایمانی نہیں کی جو جیون خاں نے دارا شکوہ سے اور سری نگر کے راجہ نے سلیمان شکوہ سے کی تھی۔ بلکہ اس نے ایک ہنرمند سپہ سالار کی طرح ملک پر قبضہ حاصل کیا اور بغیر اس کے کہ کسی دغا اور فریب سے سلطان شجاع کو گرفتار کرے صرف اس پر قناعت کی کہ سلطنت کے چھوڑ دینے اور سمندر کی طرف بھاگ جانے پر مجبور کیا۔ سلطان شجاع کی مہم کے خاتمہ کے بعد میر جملہ نے ایک خواجہ سرا کو عرضی دے کر اورنگ زیب کے حضور میں بھیجا اور التماس کی کہ میرے اہل و عیال کو اس کے ساتھ بنگالہ چلے آنے کی اجازت بخشی جائے اور لکھا کہ لڑائی بخیر و خوبی ختم ہو گئی۔ اور چونکہ میں ضعیف اور بڈھا ہو گیا ہوں حضور کی نوازش سے مجھے اُمید ہے کہ اس سے زیادہ اہل و عیال سے میری جدائی کو پسند نہ فرمایا جائے گا۔ لیکن اورنگ زیب اس چالاک مدبر کے مطلب کو فوراً سمجھ گیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر اُس کے بیٹے محمد امین خاں کو بنگالہ بھیج دیا جائے گا تو میر جملہ یقیناً بنگالہ کا خودسر بادشاہ بننے کا ارادہ کرے گا اور شاید کہ یہ عجیب شخص اس پر بھی قناعت نہ کرے۔ کیونکہ میر جملہ بیدار مغز اولوالعزم۔ شجاع اور دولت مند ہونے کے علاوہ اس وقت ایک فتحیاب فوج کا سپہ سالار تھا۔ اور اُس سے اہل سپاہ کو محبت بھی

تھی۔ اور اس کا رعب بھی مانتے تھے۔ اور ہندوستان کا سب سے عمدہ صوبہ اُس کے قبضہ میں تھا۔ اور گولکنڈے میں جو معاملات پیش آتے تھے اُن سے ثابت ہو چکا تھا کہ میر جملہ کیسا ایک بے صبر اور بے باک طبیعت کا انسان ہے۔ پس ایسے شخص کی درخواست کو قطعًا رد کر دینا بالضرور خطرناک نتائج کا باعث ہوتا۔ مگر اورنگ زیب نے اس موقعہ پر بھی اپنی مخصوص احتیاط اور دانائی سے کام لیا یعنی میر جملہ کی بیوی اور پوتے پوتیوں کو بنگالہ روانہ کر دیا۔ اور امیرالامرا کا خطاب عنایت کیا جو ایک ایسا خطاب ہے جس سے بڑھکر شہنشاہ ہند کوئی خطاب نہیں دے سکتا اور اُس کے بیٹے محمد امین خاں کو میر بخشی کا منصب عطا کیا جو سلطنت کے منصبوں میں دوسرے یا تیسرے درجہ کا منصب ہے مگر اس منصب دار کو ہمیشہ دربار میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔ اور بادشاہ سے اُس کا علیحدہ ہونا اگر ناممکن نہیں تو مشکل تو بے شک ہے۔ اس کے علاوہ میر جملہ کو بنگالہ کی مستقل صوبہ داری بھی عنایت فرمائی۔

میر جملہ جب اپنی مراد میں کامیاب نہ ہوا تو اُس نے سوچا کہ اگر بیٹے کے بلانے کی کرر درخواست کروں گا تو یہ امر یقینًا بادشاہ کے عتاب کا باعث ہوگا اس لئے اُس نے بھی اسی کو بہتر جانا کہ ان انعامات شاہی کا شکر بجالائے اور خاموش ہو رہے لیکن معاملہ پر جب کہ ایک سال کے قریب گذر چکا تو اورنگ زیب نے صحیح طور پر یہ خیال کرکے کہ ایک اولوالعزم سپاہی اب زیادہ عرصہ تک نچلا نہیں بیٹھ سکتا۔ اور اگر اُس کو لڑائی بھڑائی میں مشغول نہ رکھا جائے تو خود اپنی ہی سلطنت کے اندر کوئی بکھیڑا کھڑا کر دے گا۔ میر جملہ کو آسام کے راجہ پر فوج کشی کی تیاری کا حکم دیا جو ایک زبردست اور خود مختار راجہ ہے اور جس کا ملک ڈھاکہ کے شمال میں خلیج بنگالہ کے کنارے پر ہے۔

اُدھر میر جملہ خود بھی اس مہم کی فکر میں تھا کیونکہ اُس کو امید تھی کہ اس طرح پر سرحد چین تک ملک فتح کرکے ایک دائمی شہرت حاصل کروں گا۔ غرضکہ اورنگ زیب کے پیغام رساں نے میر جملہ کو اس مہم پر پہلے ہی سے آمادہ پایا اور فورًا ایک سپاہ جرار ڈھاکہ سے کشتیوں میں اُس دریا کے راستہ روانہ ہوئی جو آسام سے نکلتا ہے اور گوشہ شمال و مشرق

لہ ایک حاشیہ میں لکھا جا چکا ہے کہ اس کو خان خاناں سپہسالار بنگالہ لکھا جاتا تھا۔ امیرالامرا کا خطاب شائستہ خاں کا تھا۔ س م ح۔

سے چل کر ایک قلعہ پر جس کو آنند کہتے ہیں اور جو ڈھاکہ سے قریب تین سو میل کے ہے اور جس کو آسام کے راجہ نے بنگالہ کے ایک صوبہ دار سے سابق میں چھین لیا تھا جا پہنچی ۔ اور دس بارہ دن کے محاصرہ میں قلعہ فتح ہو گیا ۔ اور میر جملہ چپدارا کی طرف جو آسام کا دروازہ سمجھا جاتا ہے بڑھا اور اٹھائیس دن کے لیے سفر کے بعد وہاں جا پہنچا ۔ اور یہاں ایک لڑائی ہوئی اور راجہ شکست کھا کر گرگانوں کی طرف جو آسام کی راج دھانی اور چپدارا سے ایک سو بیس میل کے فاصلہ پر ہے بھاگ گیا ۔ لیکن میر جملہ کے پرزور اور چست تعاقب نے وہاں بھی دم لینے نہ دیا ۔ اور بغیر اس کے کہ کچھ مورچہ بندی وغیرہ کر سکے مجبوراً پیچھے کو ہٹتا ہٹتا مملکت لاسا کے کوہستان میں جا گھسا اور چپدارا اور گرگانوں لوٹ لیے گئے ۔ خصوصاً گرگانوں سے بہت مال و دولت فوج کے ہاتھ آیا ۔ گرگانوں ایک بڑا اور عمدہ شہر ہے اور تجارت کی بڑی منڈی ہے اور یہاں کی عورتوں کا حسن مشہور ہے ۔ مگر کثرت بارش کی وجہ سے جو موسم سے ذرا پہلے شروع ہو گئی تھی سپاہ آگے نہ بڑھ سکی کیونکہ اس ملک میں اس قدر مینہ برستا ہے کہ بجز گانوں کی آبادیوں کے جو چھانٹ کر اونچی اونچی زمینوں پر بسائے جاتے سب جگہ پانی ہی پانی ہو جاتا ہے اور راجہ نے موقعہ پا کر لشکر کے آس پاس کے ملک کو مویشی اور ہر قسم کے مایحتاج سے خالی کر ڈالا ۔ اور اگرچہ فوج نے بہت سا مال و دولت جمع کر لیا تھا ۔ مگر قبل اس کے کہ برسات ختم ہو ۔ رسد کی طرف سے نہایت دقت اور تکلیف میں پڑ گئی ۔ اب میر جملہ نہ آگے بڑھ سکتا تھا اور نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا ۔ کیونکہ سامنے جو پہاڑ تھے وہ نہایت ہی دشوار گذار تھے ۔ اور پیچھے ہٹنا ہٹنا اس لیے مشکل تھا کہ پانی اور دلدل کی کثرت کے علاوہ راجہ نے ہوشیاری کر کے وہ پشتہ بھی تڑوا ڈالا تھا جس پر سے چپدارا کا راستہ تھا ۔ پس برسات بھر مجبوراً وہیں ٹھہرنا پڑا ۔ مگر خشک موسم کے آنے تک رات دن کی تکلیفوں اور رسد کے نہ ملنے سے فوج ایسی شکستہ خاطر ہو گئی کہ میر جملہ کو آسام کی فتح کا ارادہ مجبوراً ترک کرنا پڑا ۔ اگر یہ فوج کسی اور کم لیاقت سردار کے ماتحت ہوتی تو بنگالہ کو واپس آنا مشکل تھا ۔ کیونکہ رسد بہت مشکل سے بہم پہنچتی تھی ۔ اور راستہ میں دلدل اب بھی اس کثرت سے تھی کہ سپاہ جلد جلد کوچ نہیں کر سکتی تھی ۔ اور راجہ چستی کے ساتھ پیچھے لگا چلا آتا تھا ۔ مگر میر جملہ اپنی معمولی ہوشیاری سے لشکر کو ایسے ڈھنگ سے ہٹا لایا کہ اس کے حسن تدبیر کی اور بھی دھوم مچ گئی اور مال و دولت بھی خوب ساتھ لایا ۔ اور واپس آتے

ہوئے قلعہ آنہ کو خوب مستحکم کرکے ایک جرار سپاہ وہاں اس غرض سے چھوڑا کہ اگلے برس کے شروع میں برسات سے پہلے پہلے پھر چڑھائی کی جائے۔ لیکن یہ نامی سردار مرض ہیضہ سے جو اُس کے لشکر میں بنگالہ پہنچتے ہی پھیل گیا تھا مر گیا۔ اور جیسا کہ ہونا چاہیے تھا اُس کی وفات سے تمام ہندوستان میں تہلکہ پڑ گیا۔ مگر بہت سے عقلمند لوگوں کا قول یہ ہے کہ حقیقت میں اورنگ زیب بنگالہ کا بادشاہ ابھی ہوا ہے۔ اگرچہ اورنگ زیب میر جملہ کی خدمات کا معترف اور شکرگزار تھا۔ لیکن شاید ایک ایسے نائب السلطنت کے مرجانے سے جس کا اقتدار اور دانشمندی اُس کو ہمیشہ متشوش رکھتی تھی غمگین نہیں ہوا۔ چنانچہ سردربار محمد امین خاں سے کہا۔

"افسوس ہے کہ تمھارا شفیق باپ اور ہمارا نہایت قوی اور نہایت خوفناک دوست چل بسا۔"

مگر بہرحال اورنگ زیب نہایت مہربانی اور فیاضی کے ساتھ محمد امین خاں سے پیش آیا۔ اور اُس کو یقین دلایا کہ اپنے باپ کی جگہ اب ہم کو سمجھو۔ اور بجائے اس کے کہ اُس کی تنخواہ میں کچھ کمی کرے۔ یا میر جملہ کے مال و دولت کو ضبط کرے محمد امین خاں کو میر بخشی کے عہدہ پر مستقل کردیا۔ بلکہ تنخواہ میں ایک ہزار روپیہ ماہوار کا اضافہ کردیا۔ اور اُس کے باپ کے کل مال و دولت سے بھی کچھ تعرض نہیں کیا۔[1]

شائستہ خاں اراکان کی مہم پر اب میں تھوڑا سا حال اورنگ زیب کے ماموں شائستہ خاں کا جس کا کچھ ذکر پہلے بھی کیا جاچکا ہے اور جس کی موثر تقریریں اور جوڑ توڑ اُس کے بھانجے کے لئے ایسے عظیم الشان مرتبہ پر پہنچنے کا باعث ہوئے۔ ناظرین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ تم پڑھ چکے ہو کہ کھجوہ کی لڑائی سے

---

[1] میر جملہ کا ایک مغلوب ہو کر آسام سے واپس آنا جیسا کہ مصنف نے لکھا ہے درست نہیں ہے اور اُس کے علاوہ اور بھی غلطیاں ہیں۔ اور اس مہم کا صحیح اور مفصل حال جو کوچ بہار اور آسام دونوں پر ایک ہی وقت میں کی گئی تھی عالمگیر نامہ میں اس خوبی سے لکھا ہے کہ اُس وقت کی فارسی تاریخوں میں ایسے عمدہ طور کا بیان شاذونادر ہی پایا جاتا ہے اور اگرچہ وہ تفصیل اور جزئیات سب کے سب نہایت ہی دلچسپ اور قابل دید ہیں لیکن اگر اُن کو پورا نقل کیا جاتا تو بجائے خود ایک چھوٹی سی کتاب بن جاتی اس لئے کچھ اُس کا خلاصہ لکھ کر بطور ایک حاشیہ کی اس جلد کے خاتمہ میں لگا دیا گیا ہے اُس کو ملاحظہ کرنا چاہیے۔ مترجم

پہلے جب کہ اورنگ دارالخلافت سے شجاع کے مقابلہ کو گیا تھا شائستہ خاں آگرہ کا
صوبہ دار مقرر ہو چکا تھا۔ اس کے بعد وہ دکن کا صوبہ دار مقرر ہوا اور وہاں کی سپہ سالاری
بھی اسی کو تفویض کی گئی۔ اور اب میر جملہ کی وفات کے باعث بنگالہ کا صوبہ دار اور
وہاں کی فوج کا سپہ سالار بھی مقرر ہوا۔ اور امیرالامرا کا خطاب بھی اس کو دیا گیا۔ شائستہ
خاں کی ناموری کے لحاظ سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بنگالہ پہنچتے ہی جو مہم عظیم اس نے
اپنے ذمہ لی تھی۔ اس کا بیان کیا جائے۔ اور جب یہ خیال ہوتا ہے کہ خدا جانے کس باعث
سے اس کے نامور جانشین سابق (میر جملہ) نے اس کو اختیار نہیں کیا تھا تو یہ مہم اور
بھی زیادہ توجہ کے قابل ہو جاتی ہے۔ اور میرے اس بیان سے مملکت بنگالہ اور اراکان
کی گذشتہ اور موجودہ حالت جو اب تک لوگوں کو چنداں معلوم نہیں ہے منکشف ہوگی۔
اور کچھ اور حالات بھی جو توجہ کے لائق ہیں ظاہر ہوں گے مگر اس مہم کی کیفیت معلوم ہونے
اور ان واقعات کے بخوبی سمجھنے کے لئے جو خلیج بنگالہ میں واقع ہوتے یہ بیان کرنا ضروری
ہے کہ اراکان میں جسے مگہ لوگوں کا ملک بھی کہتے ہیں برسوں سے بہت سے لوآبادیر تگیز
اور عیسائی غلام اور دوغلے پرتگیز اور اہل فرنگ جو ادھر ادھر کے ملکوں سے آن کر جمع ہو گئے
تھے رہتے تھے اور یہ ریاست ان بد چلن لوگوں کے لئے جائے پناہ تھی جو گوا۔ سیلان۔
کوچین۔ ملاکا اور ہندوستان کے اور مقامات سے جو قبل ازیں پرتگیزوں کے قبضہ میں
تھے یہاں چلے آتے تھے۔ اور جو بدمعاش فقیرا اپنی خانقاہوں کو چھوڑ آتے تھے یا جو بدأطوار
لوگ متعین عورتوں سے شادی کر کے یا کسی اور بڑے گناہ کے مرتکب ہو کر بھاگ آتے تھے
یہاں ان کی بڑی آؤ بھگت ہوتی تھی۔ یہ صرف نام کے عیسائی تھے۔ اور اراکان میں
ان کا طرز معاشرت نہایت قابل نفرت تھا۔ چنانچہ بے دھڑک ایک دوسرے کو قتل کرتے
یا زہر دیدیتے تھے۔ اور بعض اوقات اپنے واعظ پادریوں کو بھی جو سچ پوچھو تو وہ بھی ان
سے کچھ کم نہ تھے مار ڈالتے تھے۔ اور اراکان کے راجہ نے جو ہمیشہ سلاطین مغلیہ سے
خائف رہتا تھا۔ اپنے ملک کی سرحد پر ان کے وجود کو بمنزلہ ایک جنگی چوکی کے کار آمد
سمجھکر چاٹ گام کی بندرگاہ اور بہت سی زمینیں آبادی کے لئے ان کو دے رکھی تھیں۔
اور چونکہ وہ ان لوگوں سے کسی طرح کی مزاحمت اور باز پرس نہیں کرتا تھا۔ تو یہ کچھ تعجب
کی بات نہیں ہے کہ ان بدمعاش اور بے لگام لوگوں کا پیشہ لوٹ کھسوٹ اور سمندری

غارت گری کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ چنانچہ یہ چھوٹی چھوٹی کشتیوں پر چڑھکر ادھر ادھر سمندر میں گشت لگاتے اور گنگا کی بے شمار شاخوں اور کھاڑیوں میں جا گھستے۔ اور زیریں بنگالہ کے جزیروں کو تباہ و برباد کرتے۔ اور اکثر سو ڈیڑھ سو میل تک ملک کے اندر چلے آتے تھے اور جہاں کہیں بازار لگا ہوا ہوتا یا کوئی شادی بیاہ یا کوئی اور تقریب ہوتی وہاں یکایک جا پڑتے اور تمام لوگوں کو پکڑ کر لے جاتے۔ اور بدنصیب قیدیوں کو غلام بناتے۔ اور جو چیز اٹھائی نہ جاتی اس کو جلا ڈالتے تھے۔ اور یہ اس ہمیشہ کی لوٹ مار ہی کا نتیجہ ہے کہ ہم گنگا کے دہانہ پر ایسے عمدہ جزیروں کو جو کسی وقت خوب آباد اور معمور تھے۔ ویران اور سنسان پڑا ہوا دیکھتے ہیں۔ اور سوائے شیروں اور جنگلی جانوروں کے اب وہاں کوئی نہیں رہتا۔ اور ان قیدیوں کے ساتھ وہ بڑی بے رحمی اور بدسلوکی سے پیش آتے تھے اور ان کو یہاں تک جرأت ہو گئی تھی کہ بڑے آدمیوں کو نکمے اور بیکار جان کر انہیں مقامات میں بیچنے کو لے جاتے تھے جہاں سے ان کو پکڑ کر لاتے تھے اور اکثر دیکھا جاتا تھا کہ وہ جوان شخص جو کل اتفاقاً بھاگ کر ان کے ہاتھ سے بچ گئے تھے آج اپنے بڈھے باپ کو خرید کر ان کے پنجہ سے چھڑانے کی کوشش کرتے تھے۔ اور جوان قیدیوں کا یہ حال تھا کہ یا تو ان کو قزاقی سکھاتے تھے یہاں تک کہ وہ خود قتل و غارت کے شایق بن جاتے تھے۔ یا ان کو گوا۔ سیلان۔ اور سین طامس کے پرتگیزوں کے ہاتھ بیچ ڈالتے تھے۔ بلکہ خاص بنگالہ میں ہگلی کے رہنے والے پرتگیز بھی ان بیچاروں کے خرید لینے میں کچھ تامل نہ کرتے تھے اور یہ ہولناک تجارت گالیس تک بھی ہوتی تھی جو راس[1] ڈاس پال ماس کے قریب ایک جزیرہ ہے۔ ان قزاقوں کا یہ معمول تھا کہ فروخت طلب غلاموں کو کشتیوں میں بھر کر مقررہ مقامات پر لے جاتے اور باہمی قرارداد کے مطابق پرتگیزوں کے آنے کے منتظر رہتے تھے۔ اور وہ ان سب کو نہایت ہی ارزاں قیمت پر خرید لے جاتے تھے اور نہایت افسوس ہے کہ پرتگیزوں کے زوال قوت کے بعد فرنگستان کی اور قوموں نے بھی چاٹگام کے ان قزاقوں کے ساتھ (جو یہ شیخی بگھارتے ہیں کہ ہم ایک سال کے اندر اس قدر ہندوؤں کو عیسائی بنا لیتے ہیں جو پادری لوگ تمام ہندوستان میں دس برس میں بھی نہیں بنا سکتے) اس مذموم تجار

[1] راس ڈاس پال ماس۔ افریقہ کے اس مغربی ساحل کے نزدیک واقع ہے جس کو انگریزی میں گولڈ کوسٹ (یعنی ساحل الذہب) کہتے ہیں اور جزائر سین طامس اور گالیس بھی اسی

کو جاری رکھا۔ سبحان اللہ۔ عیسائی مذہب کے پاک اوامر کو اس طرح سے متواتر توڑنا اور اُس کے نواہی کی تحقیر کر کے علانیہ اُس کے برخلاف عمل کرنا کیا ہی عمدہ طریقہ ہمارے دین مقدس کے پھیلانے کا ان کمبختوں نے نکالا ہے۔

جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد میں پرتگیزوں کا حال

یہ لوگ ہگلی میں جہانگیر کی مہربانی سے آباد ہوئے تھے جو عیسائیوں سے بالکل تعصب نہ کرتا۔ اور اُن کی تجارت سے فوائد کثیر حاصل کرنے کی اُمید رکھتا تھا۔ علاوہ بریں ان لوگوں نے اُس سے یہ عہد بھی کیا تھا۔ کہ ہم خلیج بنگالہ کو بحری قزاقوں سے محفوظ رکھیں گے مگر شاہجہاں نے جو باپ کی بہ نسبت مذہب اسلام کا زیادہ پابند تھا اِن کو اس سبب سے سخت سزا دی کہ وہ نہ صرف اراکان کے قزاقوں کو جرأت دلاتے تھے۔ بلکہ خود بھی بہت سے غلام جو بادشاہی رعیت تھے اپنے پاس رکھکر اُن کے آزاد کرنے سے انکار کرتے تھے۔ پس اُس نے اول تو دھمکا کر اور پھسلا کر بہت سا روپیہ وصول کیا مگر جب بادشاہ کے احکام کے موافق جن جن باتوں کی تعمیل مطلوب تھی، نہیں ہوئی تو آخرکار محاصرہ کر کے شہر پر قبضہ کر لیا گیا اور عموماً سب کو غلام بنا کر آگرہ بھیج دیا۔ زمانہ قریب کی تاریخوں میں ان لوگوں کی مصیبت کی کوئی مثال پائی نہیں جاتی۔ بلکہ وہ اس گروہ بنی اسرائیل کی مصیبت سے بہت کچھ مشابہ تھی جو بیت المقدس سے قید کئے جا کر سب بابل کو بھیج دیئے گئے تھے[1] کیونکہ شاہجہاں کے حکم کی تعمیل سے نہ کوئی بچہ ہی مستثنیٰ رہا نہ کوئی

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ کے نزدیک ہیں۔ یہ سب مقام زمانہ سابق میں پرتگیزوں کے تحت حکومت تھے۔ اور چونکہ سین طامس ایک جگہ مدراس کے قریب بھی پرتگیزوں کے قبضہ میں تھی۔ اس لئے سیاق کلام سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ وہ افریقہ کا سین طامس مراد نہیں ہے۔ س م ح

[1] یہ ماجرا بنی اسرائیل کے قصص تاریخی سے متعلق ہے اور مختصر بیان اس کا اس طرح پر ہے کہ الیاقیم ابن یوشیا بیت المقدس میں آل یہودا ابن یعقوب علیہ السلام کا ۱۸واں ہیوطی میں جس کو اب (۱۸۹۶ء اور ۶۰۳ق م) سے دو ہزار چھ سو ستاون برس کا عرصہ گذرا۔ اس طرح پر بادشاہ ہوا تھا کہ مصر کے بت پرست بادشاہوں میں سے جو فرعون کہلاتے تھے اُس کے ایک ہم عصر فرعون نے اس کے بھائی یوحاز کو مغلوب اور قید کر کے الیاقیم کو بطور اپنے خراج گذار کے اور یویاقیم نام رکھکر بنی یہودا کا بادشاہ بنا دیا تھا۔ یہ بادشاہ بہت ظالم تھا اور جیسا کہ اور بنی اسرائیل بھی بعض اوقات کرتے رہتے تھے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ اس نے شریعت موسوی کے برخلاف بت پرستی اختیار کرکے اس طریق کو رواج دینا شروع کیا تھا۔ یہاں تک کہ حضرت اوریانبی کو جو حضرت یرمیا نبی کی طرف سے شرع موسوی کے موافق بنی اسرائیل کو گمراہیوں اور جور و جفا اور سخت بدعتوں اور اعمال قبیحہ اور بت پرستی سے منع کرتے اور قہر الٰہی کے نازل ہونے سے ڈراتے تھے۔ ناراض ہو کر اس بادشاہ نے قتل کرنے کا ارادہ کیا اور آخر کار مصر سے کہ جہاں وہ بھاگ کر چلے گئے تھے ڈھونڈوا کر اور اپنے مربی فرعون کی معرفت پکڑ منگا کر بیت المقدس میں قتل کرا دیا۔ بطور انتقام الٰہی ان حرکتوں کا نتیجہ یہ ہوا۔

کہ بخت نصر ثانی پسر نب پلسر۔ کلدانیوں کے بت پرست بادشاہ نے جس کے خاندان کی سلطنت عراق میں تھی اور دریائے فرات کے نزدیک شہر نینوا اور بابل (کربلائے معلی اور بغداد کے قریب) ان کے دارالحکومت تھے ۶۰۴ھ ق م میں بادشاہ ہو کر اول تو اُن قبائل کو جو ملک فلسطین میں رہتے تھے مملکت بابل کا مکرر مطیع کیا۔ اور بعد ازاں یویاقیم کے گیارھویں سال جلوس میں ایک لشکر عظیم کے ساتھ اپنے دارالملک نینوا سے بیت المقدس پر چڑھائی کی اور یویاقیم جو اُس کے مقابلہ میں محض بے حقیقت تھا بجز اطاعت کے کوئی چارہ نہ دیکھ کر معہ سرداران آل یہودا حاضر ہو گیا۔ چنانچہ بخت نصر نے بلا مقابلہ و مزاحمت شہر میں داخل ہو کر بیت المقدس پر قبضہ کر لیا اور جب کل بندوبست حسب دل خواہ کر چکا تو یاقیم کو پابہ زنجیر کر کے معہ اُس کی ماں اور ملکہ اور بیٹوں اور دس ہزار اور یہودیوں کے کہ جن میں سے ایک ہزار شہزادے اور سردار اور جنرل اور سات ہزار سپاہی تھے اور دو ہزار اور عوام الناس اور جن میں حضرت دانیال پیغمبر پسر یو حنا یو یاقیم کے بھتیجے بھی بارہ برس کی عمر میں معہ بعض اور صلحائے قوم کے تھے سب کو قید کر کے بابل کو بھیج دیا اور اپنے سپہ سالار بنوزردان کو حکم دے کر بیت المقدس کو جلا کر خاک سیاہ اور بے نشان کر ڈالا۔ اور بے شمار باشندگان ملک کو قتل کرایا۔ اور جو مال و دولت کہ مسجد اقصیٰ اور خزانہ شاہی اور رعایا کے گھروں میں تھا سب لوٹ کھسوٹ کر اور ستر ہزار بوجھے لاد کر نینوا کو چلا آیا۔ اور بنی اسرائیل میں سے ایک اور شخص کو اپنی طرف سے وہاں کا حاکم بنا کر یہودا بن یعقوب کے خاندان کی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ چونکہ بیت المقدس کی خرابی عبری گیارھویں مہینے آب کی نویں تاریخ کو ہوئی تھی اس لئے بنی اسرائیل اب تک سوگ مناتے ہیں۔ س م ع

ماخوذ از ناسخ التواریخ۔

واعظ اور نہ کوئی درویش۔ چنانچہ حسین اور خوبصورت عورتیں تو کیا بیاہی کیا کنواری لونڈیاں بنا کر محل سرائے شاہی میں بھیج دی گئیں۔ اور جو زیادہ عمر کی تھیں یا اُن کی شکل اچھی نہ تھی امیروں کو تقسیم کی گئیں۔ اور کم سن لڑکے ختنہ کئے جا کر غلام بنائے گئے۔ اور جو جوان تھے وہ بڑے بڑے وعدوں کی اُمید پر یا ہاتھی کے پاؤں سے کچلوائے جانے کی متواتر دھمکیوں سے مسلمان ہو گئے۔ البتہ چند درویش اپنے مذہب پر قائم رہے اور فرقہ جیسوئٹ کے عیسائیوں اور پادریوں کی مہربانی سے جنھوں نے اس آفت کے زمانہ میں بھی آگرہ کا رہنا ترک نہ کیا اور بہت سا روپیہ خرچ کرکے اور دوستوں سے سعی سفارش کرا کرا اپنے نیا صادرہ ارادہ میں کامیاب ہوئے گوا اور اُور مقامات مقبوضہ اہل پرتگال کو بھیجے گئے۔ مگر ہگلی کے حادثہ سے پہلے یہ پادری بھی شاہجہاں کے عتاب سے نہ بچے تھے۔ چنانچہ اس نے آگرہ کا عالی شان اور خوبصورت گرجا جو جہانگیر کے عہد میں مع ایک اور گرجا کے جو لاہور میں بنایا گیا تھا مسمار کرا دیا تھا۔ اس گرجا کے مینار پر ایک گھنٹہ لگا ہوا تھا جس کی آواز تمام شہر میں سُنائی دیتی تھی۔[1]

---

[1] شاہجہاں کے مورخ خاص ملا عبدالحمید لاہوری نے ہگلی کے پرتگیزوں کے اس واقعہ کو بادشاہ نامہ میں یوں لکھا ہے کہ "بنگالیوں کے عہد میں (یعنی ہمایوں اور اکبر کے زمانہ سے پہلے جبکہ بنگالہ میں تیموریہ خاندان کی حکومت نہ تھی) فرنگی سوداگروں کا ایک گروہ جو سراندیپ (لنکا) کے رہنے والے تھے۔ سات گاؤں (چاٹگام) میں آمد و رفت رکھتا تھا ان لوگوں نے سات گاؤں سے آگے بڑھ کر کھاڑی کے کنارے (جس کو ملا عبدالحمید "خود" لکھتا ہے) اس بہانہ سے کہ خرید و فروخت کے لئے کوئی جگہ چاہیے بنگالیوں کی اجازت سے جہاں اب شہر ہگلی آباد ہے اول چند گھر بنائے۔ اور بمرور ایام حکام بنگالہ کی بے شعوری اور لاپروائی سے اس نئی آبادی میں بہت سے فرنگی جمع ہو گئے۔ اور ان لوگوں نے یہ کام کیا کہ ایک طرف تو دریا موجود ہی تھا باقی تینوں طرف عمیق خندق کھدوا کر اور پانی سے بھر کر اس مقام کو ایک جزیرہ کی شکل بنا لیا۔ اور اُس کے اندر مضبوط اور عالی شان عمارتیں بنا کر توپ بندوق اور سامان جنگ سے خوب مستحکم کر لیا۔ اور یہ آبادی ایسی بڑھی کہ بندر سات گاؤں کا بازار سرد ہو گیا۔ اور جہازات فرنگ کی آمد و شد اور خرید و فروخت اسی جگہ مقرر ہو گئی۔ اور یہ مقام ایک بڑا شہر بن کر بندر ہگلی کے نام سے مشہور ہو گیا۔ رفتہ رفتہ ان لوگوں نے ہوگلی کی کھاڑی کے دونوں طرف جو پرگنے تھے تھوڑے تھوڑے معاملہ پر وہ بھی اجارے پر لئے اور وہاں کی رعایا کو زبردستی اور طمع دونوں طور سے کرسچن بنا بنا کر فرنگستان کو بھیجنا شروع

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ کیا۔ اور اگرچہ رعیت کے کم ہو جانے سے اجارہ کا روپیہ گرہ سے بھرنا پڑتا تھا۔ مگر باوجود اس کے وہ اس فعل کو موجب ثواب سمجھکر اس نقصان کو سوداگری کے نفع سے پورا کرتے تھے اور آخر کار اُن کی یہ کارروائی محال اجارہ کے دیہات پر ہی محدود نہ رہی تھی بلکہ صوبہ بنگالہ کا جو کوئی آدمی ان کے ہاتھ چڑھ جاتا اُس کو بھی پکڑ کر اسی طرح عمل کرتے تھے۔ شاہجہان کو جو اپنے باپ کے عہد میں بنگالہ جانے کا اتفاق ہوا تو بادشاہی رعایا اور مسلمانوں کے ساتھ اُن کا یہ طرز سلوک بہت ناگوار گذرا اور اُس وقت سے ان کی بیخ کنی کا خیال اُس کے دل میں ایسا جما کہ جب وہ بادشاہ ہوا۔ اور قاسم خاں کو بنگالہ کی صوبہ داری پر مقرر کیا تو اُس "عقدۂ دشوار کشا" کے کھولنے کو خشکی اور تری دونوں طرف سے حملہ کرنے کی تدبیریں اُس کو اپنی زبان خاص سے سمجھائیں جس کے موافق خان مذکور نے صوبہ کے اور ضروری انتظاموں سے فارغ ہوکر سردی کے اخیر میں بماہ شعبان سن ایک ہزار اکتالیس ہجری اللہ یار خاں نامی ایک سردار کو مع عنایت اللہ اپنے بیٹے اور کئی اور سرداروں اور امیروں کے یہ تدبیر سمجھائی کہ اول بردوان جاکر ٹھہریں۔ اور بجائے ہوگلی کے یہ مشہور کریں کہ بردوان کی طرف مقام ہجلی کی تاخت وتاراج کے لئے یہ فوج آتی ہے۔ اور بہادر نامی ایک سردار کو جو اُس کا ذاتی ملازم اور نہایت محل اعتماد تھا مخصوص آباد (مرشد آباد) کے محال خالصہ کے بندوبست کے بہانے اُس کو یہ سمجھا کر رخصت کیا کہ ضرورت کے وقت اللہ یار خاں اور عنایت اللہ کے پاس پہنچ کر شامل ہو جانا اور یہ سب احتیاطیں اس اندیشے سے تھیں کہ کہیں اس ارادہ کی خبر پاکر پرتگیز لوگ مال و عیال کو لے کر اپنی کشتیوں میں نہ جا چڑھیں۔ علاوہ بریں یہ تدبیر کی گئی کہ چند سواروں نے سری پور بندر سے نواڑہ میں بیٹھکر اول کھاڑی کے دہانہ کو جا روکا اور بعد ازاں اللہ یار خاں اور عنایت اللہ نے بردوان سے دفعۃً کوچ کر کے ایک جگہ سات گاؤں اور ہگلی کے بیچ میں آ ڈیرا کیا۔ اور بہادر نے پانچ سو سواروں اور پیادوں کی جمعیت کثیر سے مخصوص آباد سے آکر اور خواجہ شیر وغیرہ کے ساتھ جو نواڑہ میں سری پور سے آئے تھے شامل ہوکر ہگلی کی کھاڑی میں ایک تنگ جگہ کشتیوں سے پُل باندھکر اُن کے سمندر میں بھاگ جانے کا رستہ بند کر دیا اور بعد اس کے دوسری ذی الحجہ ۱۰۴۱ھ کو کھاڑی اور خشکی دونوں طرف سے آگے کو بڑھے۔ اور قصبہ بالی میں پہنچ کر جو یہ بستی بھی خندق سے اس طرف پرتگیزوں ہی کے متعلق تھی اُن کے ایک گروہ کو تہ تیغ کیا۔ اور جو کچھ مال لوٹ لیا۔ اور کچھ سپاہ نے کھاڑی کے دونوں طرف اُن کے اجارے کے پرگنوں میں داخل ہوکر نصرانی اجارہ داروں کو قتل و قید کیا اور سب سے زیادہ کارآمد تدبیر یہ کی کہ اُن کے نواڑہ کے ملازموں کے اہل و عیال کو بھی جو سب بنگالی تھے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ پکڑ لائے جس کے باعث ایسی ضرورت کے وقت چار ہزار ملاح اُن کی نوکری چھوڑ کر بادشاہی لشکر میں حاضر ہو گئے۔ اس کے بعد بادشاہی سرداروں نے خاص ہگلی کو جا گھیرا۔ اور ایام محاصرہ میں ساڑھے تین مہینے تک اُن کی یہ حالت رہی کہ کبھی تو لڑائی لڑتے تھے اور کبھی صلح کے پیغام و سلام بھیجتے تھے اور اس کج داری و مریز سے اصل مقصود یہ تھا کہ فرنگستان سے کمک آنے کے منتظر تھے۔ چنانچہ اسی پیغام و سلام میں اگرچہ بطور تمہید صلح اور عذر و معذرت کے ایک لاکھ روپیہ نقد بھی نذر کر دیا مگر باوجود اس کے تقریباً سات ہزار بندوقچی جو حالت محاصرہ میں اُن کے پاس موجود تھے اُن کو لڑنے کے لئے بھی مامور کئے رکھا۔ اور جس باغ میں بادشاہی سپاہ اُتری ہوئی تھی اُس کے درختوں کو بھی کٹوا دیا تاکہ بندوقوں کی زد سے پناہ نہ مل سکے۔ آخرکار بادشاہی سرداروں نے (جو دریائی لڑائی میں عموماً لاچار تھے۔ یہ تدبیر کی کہ بیلدار لگا کر گرجا کی طرف کی خندق میں (جس کا عرض اور عمق کم تھا) چھوٹی چھوٹی نالیاں کھدوا کر اس کو پانی سے خالی کر ڈالا اور اپنے مورچوں میں سے تین سرنگیں لگائیں جن میں سے دو کو تو خبر پا کر انھوں نے خراب کر دیا۔ مگر تیسری سرنگ ٹھیک اُس مکان تک جا پہنچی جو سب میں اونچا اور زیادہ مضبوط تھا اور جس میں بہت سے فرنگی جمع رہتے تھے۔ اور جب اُس سرنگ میں بارود بھر دی گئی تو چودھویں ربیع الاول کو اُسی مکان کے سامنے صف لشکر آراستہ کی گئی تاکہ لڑائی کا زور اسی طرف سمجھ کر وہ سب ادھر ہی آن کر جمع ہو جائیں۔ اور جب ایسا ہی ہوا تو اول توپ اور بندوق سے لڑائی شروع کر کے آخرکار سرنگ کو آگ دیدی جس سے وہ مکان اور بہت سے فرنگی دھوئیں کی طرح اُڑ گئے۔ اور باقی ماندہ جو اپنی کشتیوں میں جا چڑھنے کو بھاگے تو مارے گھبراہٹ کے اکثر تو پانی میں ڈوب گئے۔ اور جو لوگ ڈوبتے اُچھلتے کشتیوں تک جا بھی پہنچے اُن کو بادشاہی نواڑہ کی فوج نے جا لیا یہاں تک کہ پرتگیزوں نے اپنی تباہی کو یقینی جان کر اپنے ایک بڑے جہاز کو جس میں قریب دو ہزار کے مرد و عورت اور بہت سا مال و اسباب اور بارود کا ذخیرہ تھا اس خیال سے کہ غنیم کے ہاتھ نہ پڑے بارود میں آگ دے کر از خود جلا دیا۔ اور اسی طرح جو لوگ چھوٹی کشتیوں میں چڑھ گئے تھے انھوں نے بھی اپنے آپ کو جلا کر ہلاک کر ڈالا غرضکہ چونسٹھ بڑے ڈونگوں اور ستاون غراب اور دو سو جلیوں میں سے صرف ایک غراب اور دو جلیئے تو محض اس وجہ سے کہ یورش کے وقت چند تیل کی شاہی کشتیوں میں آگ لگ کر کچھ راستہ کھل گیا تھا بچ کر نکل گئے مگر اس کے سوا جو کچھ آگ اور پانی سے بچا سب بادشاہی لشکر کے قابو میں آگیا۔ اور شروع جنگ سے اس وقت تک اگرچہ لشکر شاہی میں سے تو صرف ایک ہی ہزار آدمی مارے گئے۔

ہگلی کے چھن جانے سے پہلے جب کہ باشبیان کا ن سانوزا اراکان کے قزاقوں کا سرغنہ تھا اور ایما نامی اور زبردست شخص ہوگیا تھا کہ شاہ اراکان کی بیٹی سے اُس نے شادی کرلی تھی ان قزاقوں نے گوا کے والیسرائے کی خدمت میں باقاعدہ طور پر یہ درخواست پیش کی تھی۔ کہ اگر آپ چاہیں تو تمام ملک اراکان پر ہم آپ کا قبضہ کرا سکتے ہیں۔ پرتگیزوں کی اس وضع اور رویہ کے پیش نظر جو انھوں نے جاپان - پیگو - انھو پیا اور دوسرے ملکوں میں اختیار کر رکھا تھا اس تجویز کو قبول کر لینا خلاف توقع نہ ہوتا۔ مگر کہتے ہیں کہ دلیسرائے گوا نے غرور اور حسد کے مارے اس کو منظور نہ کیا۔ اور اُس کو یہ امر نازیبا معلوم ہوا کہ شاہ پرتگال ایک ایسے بڑے معاملہ میں ایک ایسے چھوٹے اور کم اصل شخص کا احسان اٹھائے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ مگر اس آفت خیز لڑائی میں محصوروں کے عورت مرد بوڑھا جوان دس ہزار کے قریب ضائع ہوئے اور باقی " نصرانی مرد و عورت " چار ہزار چار سو قید ہوئے۔ اور رعایائے بادشاہی میں سے جو دس ہزار آدمی کے قریب ان کی قید میں تھے اُن کو رہائی دی گئی اور ۱۱ محرم ۱۰۴۲ھ کو قاسم خاں کے بیٹے عنایت اللہ مذکور نے بنگالہ سے آکر چار سو مرد و عورت " اسیرانِ فرنگ " (یا اگر چھاپہ میں کچھ غلطی ہوگئی ہو تو وہی چار ہزار چار سو) مع اُن کے بتوں کے (جو رومن کیتھلک عیسائیوں کے گرجاؤں میں اکثر ہوا کرتے ہیں) بادشاہ کی نظر سے گذرانے جس نے ان کی نسبت یہ حکم دیا کہ سختی کے ساتھ قید رکھے جائیں اور جو کوئی مسلمان ہو جاوے اُس کا گزارہ مقرر کیا جائے۔ اور جو مسلمان نہ ہو وہ برابر قید رہے۔ چنانچہ بعضے تو مسلمان ہو کر مورد عنایات ہوگئے اور بعضے قید ہی مرگئے اور اُن کے بتوں میں سے جو مورتیں کہ بعض پیغمبروں کی تھیں اُن کو تو ادب کے خیال سے دریائے جمنا میں ڈلوا دیا اور باقی کو توڑ ڈالا۔

صاحب سیر المتاخرین نے ملا عبدالحمید کی طرح اُن کو محض سراندیپ کے فرنگی نہیں بتایا بلکہ جیسا کہ چاہیے تھا بہ تخصیص قومیت " پرتگیس " لکھا ہے۔ اور اس مصیبت کا باعث اُن کا " تمرد اور بغاوت " اور قیدیوں کی تعداد چار ہزار چار سو زن و مرد لکھی ہے۔ اور چونکہ سرنگ اُڑنے کے بعد بادشاہنامہ میں بھی اتنے ہی آدمیوں کا قید ہونا لکھا ہے اس لئے اغلب ہے کہ یہی شمار صحیح ہو مگر ہاں یہ بھی ممکن ہے کہ چار ہزار چار سو نصرانی قیدیوں میں سے ہندوستانی نصرانیوں کو چھوڑ کر صرف چار سو گورے چٹے فرنگی مردوں اور عورتوں ہی کو چھانٹ کر غلامی کے لئے حاضر کیا گیا ہو۔ ۱۲

س م ح -

پرتگیزوں کی بداعمالی امر واقعی یہ ہے کہ ہندوستان میں پرتگیزوں کے زوالِ طاقت کا باعث اُن کی بداعمالی ہے۔ اور جیسا کہ وہ خود بھی قبول کرتے ہیں اس کو غضب الٰہی کا ایک نشان سمجھنا چاہیے۔ اگلے زمانہ کے پرتگیزوں کا ہندوستان میں بڑا نام تھا۔ اور تمام ہندوستانی رئوسا اُن کی دوستی کے خواہاں تھے۔ اور وہ جرأت و بلندی دولت مندی اور بڑی بڑی عظیم الشان مہموں کے سر کرنے میں مشہور تھے[1] اور وہ ایسے نہ تھے جیسے کہ آج کل کے پرتگیز ہیں جو ہر ایک معیوب فعل کے عادی ہیں اور جن کا ہر ایک ذلیل اور بے حیائی کام میں دل لگتا ہے۔

اسی زمانہ کے قریب جس کا میں ذکر کر رہا ہوں جزیرہ سوندیپ[2] کو ان دریائی قزاقوں نے اپنے قبضہ میں کر لیا تھا جو گنگا کے دہانہ کی ناکہ بندی کے لئے ایک اہم اور کار آمد ناکا تھا اور وہ نامی بدمعاش فراجوان جو آگسٹائین فرقہ کے درویشوں میں سے تھا نہ معلوم کس فن و فریب سے وہاں کے حاکم کو نکال کر ایک مدت تک اس جزیرہ کا چھوٹا سا راجہ بنا رہا اور یہ وہی قزاق تھے جن کا ذکر میں نے پہلے کیا ہے کہ اپنی گیلی[3] آس قسم کی کشتیوں میں

---

[1] اس کتاب کے مترجم انگریزی مسٹر آرونگ براک نے پرتگیزوں کے ہندوستان میں آنے اور اُن کے عروج و زوال کا حال ایک حاشیہ میں بہت تفصیل سے لکھا تھا۔ چونکہ وہ دلچسپ مضمون کسی قدر طولانی ہے اس لئے خفیف کمی بیشی کے ساتھ ہم نے اس جلد کے خاتمہ میں لگا دیا ہے۔ س م ح

[2] یہ چھوٹا سا جزیرہ خلیج بنگالہ میں چاٹگام کے نزدیک ہے۔ س م ح۔

[3] اہل فرنگ گے لی اور گے لی آس مندرجہ ذیل شکل کی ایسی کھلی کشتیوں کو کہتے ہیں جیسی کہ اکثر پنجاب اور ہندوستان کے بعض بڑے دریاؤں میں ہوتی ہیں چپوؤں سے کھیی جاتی ہیں۔ ضرورت کے وقت ان پر بادبان بھی چڑھا سکتے ہیں۔ ایک مختصر سا کمرہ بھی ایک سرے پر بنا ہوا ہوتا ہے۔ اور گے لی اور گیلی آس میں صرف اتنا فرق ہے۔ کہ گیلی آس اُس سے زیادہ اونچی ہوتی ہے۔ اور باقی ترکیب اور وضع سب وہی ہے اُس وقت کی فارسی تاریخوں میں بنگالہ کی ان دریائی لڑائیوں کے ذکر میں تین قسم کی کشتیاں لکھی ہیں۔

(۱) غراب یعنی ڈونگہ (۲) ڈونگہ کلاں (۳) جلبہ فرنگی۔ پس معلوم ہوتا ہے ڈونگہ کلاں تو گیلی سے مراد ہے۔ اور جلبہ فرنگی گیلی آس سے اور ان پر توپوں کے چڑھانے کی بھی گنجائش ہوتی تھی۔ س م ح

بیٹھکر سلطان شجاع کے پاس ڈھاکہ میں اس غرض سے آئے تھے کہ اُس کو اراکان لے جائیں ۔اس موقعہ پر بھی ان بدمعاشوں نے ایک عجیب چالاکی کی تھی کہ کسی طرح اس کے اسباب کے صندوقوں میں سے بہت سے جواہرات نکال لیے تھے اور اراکان پہنچ کر جزوی قیمت پر خفیہ خفیہ بیچتے پھرتے تھے جن میں سے ڈچوں اور اور فرنگیوں نے اکثر ہیرے یہ دم دے کر کہ یہ کچے ہیں ان بیوقوفوں سے تھوڑی سی قیمت پر اُڑا لیے تھے۔

شائستہ خاں کی پرتگیزی قزاقوں پر چڑھائی

میں خیال کرتا ہوں کہ جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اس امر کے اندازہ کرنے کے لیے کافی ہے کہ سلاطین مغلیہ کو کس قدر زحمت اور خرچ ان ظالم اور زبردست لٹیروں کے سبب سے اٹھانا پڑتا تھا ۔اور اُن کے بنگالہ میں گھس آنے کے خوف سے ہمیشہ فوج اور گیلی آس قسم کی کشتیوں کے بیڑے ناکوں کے روکنے کے لیے تیار رکھنے پڑتے تھے۔ اور اس پر بھی ان کے ہاتھ سے ملک ہمیشہ تباہ و برباد ہوتا رہتا تھا۔ اور یہ قزاق اس قدر دلیر اور اپنے فن میں ایسے مشاق ہو گئے تھے کہ صرف چار پانچ گیلی آس کشتیوں میں بیٹھکر چڑھ آتے تھے اور عموماً چودہ پندرہ گیلی قسم کی بادشاہی کشتیوں کو گرفتار کر لیتے یا تباہ کر ڈالتے تھے ۔اس لئے شائستہ خاں نے بنگالہ کا صوبہ دار مقرر ہو کر ان کی بیخ کنی کی ٹھانی ۔اور اس میں اُس کے دو مطلب تھے کہ سردست تو ان بے رحم وحشی قزاقوں کے متواتر اور برباد کن حملوں سے اپنے صوبہ کی حفاظت اور آخر کار اراکان کے راجہ پر چڑھائی ۔اور اُس بے رحمی کا انتقام جو اُس نے سلطان شجاع اور اُس کے اہل و عیال کے ساتھ کی تھی کیونکہ اورنگ زیب کا مستقل ارادہ تھا کہ اُن عالی منزلت لوگوں کے خون کا انتقام لے اور اس مثال سے قرب جوار کے تمام رئیسوں کو یہ سبق دے کہ خاندان شاہی کے لوگ خواہ کسی حالت میں کیوں نہ ہوں انسانیت اور ادب کے ساتھ سلوک کیے جانے کے مستحق ہیں چنانچہ شائستہ خاں نے اپنی تجویز کے ابتدائی امور کو انتہائی ہوشیاری کے ساتھ پورا کیا ۔اور چونکہ دریاؤں اور ندی نالوں کی وجہ سے جو راستہ میں پڑتے ہیں خشکی کی راہ سے اراکان میں فوج کا لے جانا بہت مشکل تھا اور اس فوقیت کے باعث جو ان بحری قزاقوں کو جہازی لڑائی میں حاصل تھی سمندر کے راستہ سے فوج کشی کرنا اس سے بھی زیادہ دشوار تھا اس لئے اُس نے ڈچ لوگوں سے مدد لینا مناسب سمجھا اور جس طرح پر شاہ عباس بادشاہ ایران نے انگریزوں

کے اتفاق سے جزیرہ ہرمز[1] پر قبضہ کر لیا تھا اسی طرح اس نے بھی ڈچوں کی امداد سے اراکان پر قبضہ کر لینا چاہا۔ اور بٹیویا کے گورنر کے پاس اپنے ایلچی کو چند خاص شرطوں کے ساتھ عہد و پیمان کے لئے بھیجا۔ اور یہ پیغام دیا کہ آؤ ہم تم مل کر اراکان پر مشترکہ قبضہ کر لیں۔ بٹیویا کا گورنر اس تجویز کے قبول کر لینے پر اس وجہ سے آسانی کے ساتھ مائل ہو گیا کہ اس کے ذریعہ سے اُن کو ہندوستان کے معاملات میں پرتگیزوں کی مداخلت کے کم کرنے کا (جس سے ڈچ کمپنی[2] کا بہت فائدہ تھا) زیادہ موقعہ ہاتھ آتا تھا۔ اور اُس نے اپنے دو جنگی جہاز بنگالہ کو

---

[1] اس مقام کو پرتگیزوں نے ایرانیوں سے چھینا ہوا تھا۔ مگر سولہ سو بائیس عیسوی میں ایرانیوں نے انگریزوں کی مدد سے پھر واپس لے لیا (تاریخ ہند منشی ذکاء اللہ)

[2] ہندوستان کی دولت مندی کی شہرت نے مدتوں سے یورپ کی اکثر قوموں کو اس ملک کے ساتھ تجارت کا سلسلہ جاری کرنے کے لئے بے چین کر رکھا تھا۔ مگر خشکی کے راستہ کی مشکلات اور سمندر کی راہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے سب لاچار تھے لیکن پرتگیزوں کے بادشاہ امان وئیل کے عہد میں اُس کا اولوالعزم امیرالبحر واسکوڈی گاما جب اپنے بادبانی جہازوں کے ذریعہ سے ایک پُر صعوبت اور خطرناک اور طولانی سفر طے کر کے ماہ جولائی ۱۴۹۸ء میں ساحل ملابار پر آ پہنچا (جس کا مفصل حال اُس حاشیہ میں درج ہے جو اس جلد کے خاتمہ میں لگایا گیا ہے) تو اُس وقت سے سو برس کے عرصہ تک تو مشرقی سمندروں اور جزیروں اور ساحل ہندوستان میں انہیں کا غلبہ اور دور دورہ رہا۔ مگر جب سنہ ۱۵۸۰ء میں ڈچ لوگ سپین کی حکومت سے آزاد ہو گئے تو اُنھوں نے بھی ہندوستان کی تجارت کے لئے کمپنیاں بنائیں اور ایسے بڑھے کہ بحرالہند میں خط استوا کے قریب جزیرہ جاوا وغیرہ پر جہاں اب تک شہر بٹیویا اُن کی حکومت کا صدر مقام ہے قابض ہو گئے۔ اور پھر جہاں کہیں قابو پایا۔ پرتگیزوں کو بھی پس پا کرنا شروع کیا یہاں تک کہ مشہور اور زرخیز جزیرہ لنکا بھی جو اب گورنمنٹ انگریزی کی حکومت میں ہے ڈچوں نے پرتگیزوں سے چھین لیا۔ اور اس قدر ترقی پائی کہ پرتگیز پست ہو گئے اور خاص ہندوستان کی تجارت اور بندرگاہوں میں بھی آخر کار انہیں کا غلبہ ہو گیا۔ اسی زمانہ کے قریب یعنی سنہ ۱۵۹۹ء میں انگریزوں نے بھی اپنی نامور ملکہ کوئین الزبتھ کی اجازت سے ہندوستان کی سوداگری شروع کی اور ان کے سولہ سو ڈنمارک والوں نے جو یورپ کی ایک چھوٹی سی قوم ہے اور جن کو ڈنیز کہتے ہیں اول مدراس کی طرف سمندر کے کنارے ترنگی بار (جس کا صحیح نام ٹلنگم باڑی معلوم ہوتا ہے) جو تنجور کے راجہ سے خرید لیا تھا۔ اور پھر کلکتہ کے قریب سیرام پور میں اپنی کوٹھیاں

بھیج دیتے تاکہ شائستہ خاں کی فوج کو آسانی کے ساتھ چاٹگام میں پہنچا دیں چونکہ اس عرصہ میں شائستہ خاں نے بھی گیلی آس وغیرہ قسم کی بڑی بڑی کشتیاں جمع کر لی تھیں۔ پس اُس نے ان قزاقوں کو اس طرح پر دھمکایا کہ "اگر فوراً اطاعت قبول نہ کرو گے تو نیست ونابود کر دیئے جاؤ گے کیونکہ اورنگ زیب نے اراکان کے راجہ کی سزا دہی کا ارادہ مصمم کر لیا ہے اور ڈچوں کے جنگی جہازوں کا ایک طاقتور بیڑا بھی جس کا تم مقابلہ نہ کر سکو گے بہت جلد آنے والا ہے۔ پس اگر تم کو کچھ عقل ہے اور اپنی اور اپنے اہل و عیال کی خیریت چاہتے ہو تو راجہ کی نوکری چھوڑ کر شاہی ملازمت اختیار کر لو اور جس قدر تم کو ضرورت ہو بنگالہ میں زمین عطا کی جائے گی اور راجہ کے ہاں سے جتنی تنخواہ ملتی ہے اُس سے دو چند دی جائیگی۔"

اتفاقاً انھیں ایام میں ان قزاقوں نے راجہ اراکان کے ایک بڑے عہدہ دار کو مار ڈالا تھا۔ اب اگرچہ یہ بات تو ٹھیک معلوم نہیں کہ راجہ کی سزا دہی کے اندیشے نے انھیں ڈرایا خیانت فلاں

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ کھولیں اور سب سے آخر میں ۱۶۶۸ء میں فرانس کے قابل والایق وزیر کول برٹ نے بھی (جس کو ڈاکٹر برنیر نے اپنا خط جو اس جلد کے خاتمہ میں ہے نذر کیا تھا) تجارتی کمپنی کھڑی کی اور فرنچوں نے قصبہ چندرنگر معروف بہ فرانس ڈانگا کے علاوہ جو کلکتہ کے پاس ہے مدراس کے قریب[۱] پانڈے چری کو اپنا صدر مقام قرار دے کر ایسے زور و شور سے قدم جمانے چاہے کہ گویا ہندوستان کے مالک ہی ہو چلے تھے۔ مگر اتفاقات وقت سے ان سب قوموں کا فروغ یکے بعد دیگرے گھٹتا گیا۔ اور خداوند تعالیٰ نے صرف انگریزوں کو جو ان سب میں معدودتر جزیرہ کے رہنے والے اور تعداد میں چار پونے چار کروڑ سے زیادہ نہ تھے اوصاف و اقبال خداداد کی وجہ سے اس ملک کا شہنشاہ اور یہاں کے چھبیس ستائیس کروڑ باشندوں کا مختار مطلق بنا دیا۔ منجملہ ان پانچوں قوموں کے ہندوستان میں اب ڈچوں اور ڈنمارک والوں کی حکومت کسی جگہ نہیں ہے۔ البتہ گورنمنٹ انگریزی کی رعایت اور اُس باہمی لحاظ و ملاحظہ سے جو ان سلطنتوں کے باہم یورپ میں ہے فرنچوں کی حکومت پانڈیچری میں معہ اُس کے علاقہ متعلقہ کے اور نیز قصبہ چندرنگر میں چلی آتی ہے اور پرتگیزوں کی حکومت بھی گوا میں اور نیز جزیرہ دیو متعلقہ کاٹھیاواڑ میں باقی ہے مگر فی زمانہ یہ دونوں حکومتیں ہندوستان کے عام نظم و نسق کے اعتبار سے ایسی غیر محسوس اور بے وقعت ہیں کہ یہاں کے امور پولٹیکل پر اُن کا کچھ اثر نہیں پڑتا۔ س م ح

[۱] صاحب جام جہاں نما اس کا صحیح نام پتوچری بتاتے ہیں۔ س م ح

کی دھمکیوں اور وعدہ وعید نے اُن پر اثر کیا۔ مگر یہ امر متحقق ہے کہ ایک دن ان نالائق پرتگیزوں پر ایسا خوف طاری ہوا کہ یک لخت چالیس پچاس گالیاسوں میں بیٹھکر بنگالہ کو چل پڑے۔ اور ایسے اضطراب سے روانہ ہوئے کہ اس ہڑبڑاہٹ میں جورو بچے اور مال و اسباب بھی بمشکل ساتھ لا سکے شایستہ خاں ان نئے ملاقاتیوں سے بڑے اخلاق کے ساتھ ملا اور بہت سا روپیہ اُن کو دیا اور شہر ڈھاکہ میں اُن کے اہل وعیال کے رہنے کے لیے عمدہ بند وبست کر دیا۔ اور اس طرح پر اُن کو اُس کے حسن سلوک پر ایسا اعتماد ہو گیا کہ از خود بادشاہی لشکر کے ساتھ مہم پر جانے کی خواہش ظاہر کی۔ اور جزیرہ سوندیپ پر چڑھائی کرنے اور فتح کر لینے میں (جو کچھ دنوں سے راجہ اراکان کے قبضہ میں چلا گیا تھا) شریک ہوئے اور پھر یہاں سے بادشاہی فوج کے ساتھ چاٹگام کو گئے۔ اب اگرچہ ڈچوں کے وہ دو لڑائی جنگی جہاز بھی آ پہنچے مگر شائستہ خاں نے اُن کے سرداروں کی مہربانی کا شکریہ ادا کر کے یہ کہلا بھیجا کہ اب آپ کے تکلیف کرنے کی کچھ حاجت نہیں رہی۔

بنگالہ میں یہ جہاز میں نے بھی دیکھے تھے اور اُن کے عہدہ داروں سے ملاقات بھی ہوئی تھی جو اس بات کے شاکی تھے کہ اس ہندوستانی سردار نے محض زبانی جمع خرچ اور خشک شکریہ پر ہی ان کو ٹالا اور شرائط مقررہ کا کچھ لحاظ نہ کیا۔

شائستہ خاں کا برتاؤ ان پرتگیزوں کے ساتھ اگرچہ ویسا نہیں ہے جیسا کہ شاید بلحاظ اُن کی خدمات کے ہونا چاہیے تھا مگر ہاں وہ اُن سے اُس سلوک سے پیش آتا ہے جس کے کہ وہ واقع میں لائق ہیں۔ اُس نے چاٹگام سے تو اُن کو اکھیڑ ہی دیا ہے اور وہ اب اپنے اہل وعیال سمیت اُسی کے قابو میں ہیں۔ اور اُن کی امداد کی بھی کچھ حاجت نہیں رہی اس لئے اُس نے سمجھ لیا ہے کہ جو وعدے ان سے کیے گئے تھے اُن میں سے اب کسی کے بھی ایفا کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ کئی کئی مہینے گذر جاتے ہیں کہ تنخواہ کی بابت پھوٹی کوڑی تک نہیں ملتی۔ اور وہ علانیہ کہا کرتا ہے کہ یہ ایسے دغا باز اور نالائق ہیں کہ جس راجہ نے ان سے اس قدر سلوک کئے تھے یہ پاجی اُسی کے ساتھ بے ایمانی سے پیش آئے۔ اس لئے ان پر بھروسہ کرنا نادانی ہے۔ اور اس طرح سے اُس نے چاٹگام میں ان پرتگیزوں کی طاقت کے چراغ کو بجھا دیا جنھوں نے بنگالہ کے زیریں علاقہ میں اس قدر اندھیر مچا کر تمام ملک کو ویران اور بے چراغ کر دیا تھا۔ اور یہ امر زمانہ کے گذرنے

یہ معلوم ہوگا کہ آیا شایستہ خاں کو ایسی ہی کامیابی اراکان کی مہم میں بھی ہوتی ہے یا نہیں[ل]

ل چاٹگام کے پرتگیزوں کی دریائی غارت گری اور رعایائے بادشاہی کو لوٹ لینے اور پکڑلے جانے کے الزام کے متعلق جس تفصیل و توضیح سے مصنف نے لکھا ہے نیز اس سبب سے بھی کہ اس کی یہ تحقیقات ایک یورپین قوم کے حالات سے متعلق ہے ہمارے نزدیک بھی بہ نسبت کسی فارسی مورخ کی تحریروں کے یہی بیان زیادہ تر اعتماد اور سند کے لائق ہے۔ مگر صاحب عالمگیر نامہ نے جس طرح پر اس مہم کے واقعات کو لکھا ہے وہ یوں ہے کہ اس نے چاٹ گام کے پرتگیزوں کی نسبت کوئی الزام نہیں لگایا۔ اور جہاں میں جو عموماً برنیر کے بیان کے قریب قریب ہے ان کل حرکتوں کا ملزم خود اراکانیوں کو ٹھہرایا ہے اور دریائی لڑائی اور فن کشتی رانی میں جو فوقیت اس نے پرتگیزوں سے منسوب کی ہے صاحب عالمگیر نامہ نے اُس کو بھی اراکانیوں ہی سے منسوب کیا ہے۔ بلکہ بلالحاظ خوشامد و چاپلوسی اپنے بادشاہ یا حکام سلطنت اس امر کو صاف صاف لکھدیا ہے کہ بہ نسبت بادشاہی نواڑہ کے اپنے فن میں یہ لوگ مشاق بھی زیادہ تھے۔ اور اُن کی جنگی کشتیاں ساز و سامان توپ خانہ اور مضبوطی اور استحکام میں بھی بادشاہی کشتیوں سے بہت بڑھ کر اور زیادہ عمدہ تھیں اور وجوہ فوج کشی کے متعلق شجاع کے واقعہ کا تو کوئی اشارہ نہیں صرف اتنا ہی لکھا ہے کہ یہ لوگ اپنی کشتیوں کے ذریعہ چاٹ گام کے رستہ سے صوبہ بنگالہ میں داخل ہوکر مذکورہ بالا جرائم کے مرتکب ہوتے تھے اس لئے شایستہ خاں نے علاوہ شاہی بیڑہ کی ماموری اور گشت کے اپنے سرحدی مقاموں نواکھالی اور سنگرام گڈھ اور بھلوہ وغیرہ کو مستحکم کیا اور خود چاٹ گام کو چھین لینا بھی مناسب جانا۔ اور اس ارادہ کی تکمیل کے لئے اول تو جزیرہ سوندیپ کو جو چاٹ گام کے قریب نواکھالی کے محاذی ہے۔ دلاور نامی وہاں کے "زمیندار" یعنی راجہ سے جو شایستہ خاں کے فرستادہ سواروں کے ساتھ ایک دو لڑائیاں لڑ چکا تھا چھین لیا۔ اور اُس کو اور شریف نامی اُس کے بیٹے کو جو لڑائی میں زخمی ہوگیا مع اہل و عیال کے قید کرلیا۔ کیونکہ یہ شخص ظاہر میں مطیع سلطنت اور باطن میں اراکانیوں کا مددگار تھا۔ اور باوجودیکہ بذات خود حاضر ہوسکنے اور امداد دینے کے وعدے کرچکا تھا۔ مگر اس مہم میں شریک خدمت نہ ہوا تھا بعد اس کے لکھا ہے کہ اُن "فرنگیوں" کی استمالت جو چاٹ گام میں رہتے تھے اور راجہ اراکان سے موافقت رکھتے تھے اس مہم کے سرانجام دینے کے لئے نہایت ضروری تھی۔ اس لئے امیرالامرا نے اُن "فرنگیوں" کو جو اس کے ماتحت بنگالہ کی اور بندرگاہوں میں رہتے تھے بہت سے وعدہ آمیز خطوط لکھکر ان کی معرفت چاٹ گام کے فرنگیوں کے پاس روانہ کئے۔ اتفاقاً ان میں سے بعض خطوط کمرام کبری نام ایک اراکانی سردار نے جو کہ

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ راجہ نے اپنے معمول کے موافق دریائی قزاقی کے لئے سودیپ کی طرف بھیجا ہوا تھا پکڑ لئے اور راجہ کے پاس بھیج دیئے۔ اس لئے چاٹ گام کے فرنگیوں سے راجہ بدظن ہوگیا۔ اور کرام کبیری کو لکھا کہ تم ان سب کو مع ان کے متعلقین کے اراکان کو بھیج دو نتیجہ اس حکم کا یہ ہوا کہ اراکانیوں سے فرنگی لڑ پڑے اور اُن کی کچھ کشتیوں کو جلا پھونک کر مع اپنے متعلقوں اور متوسلوں کے پچاس جلیوں میں جو سامان جنگ اور توپ بندوق سے بخوبی تیار تھے چاٹ گام سے بھلوہ کے تھانیدار فرہاد خاں کے پاس نواکھالی میں چلے آئے اور اس نے اُن کے بعض سرگروہوں کو امیرالامرا کے پاس بھیج کر باقی کو اپنے پاس ٹھہرا لیا۔ امیرالامرا نے ان کی بہت خاطر کی اور اُن کے ساتھ کئی طرح کی رعایتیں کیں غرضکہ چاٹ گام کی فتح کے لئے جب یہ ابتدائی بندوبست پورے ہو چکے تو امیرالامرا نے اپنے بیٹے بزرگ امیدخاں کو چند مسلمان اور ہندو اُمرا اور منصب داروں کے ہمراہ خشکی کے رستہ سے اور فرہاد خاں مذکور اور ابن حسین داروغہ نواڑہ (جو غالباً کوئی عرب تھا) اور میر مرتضیٰ داروغہ توپ خانہ کو کپتان مور سرگروہ فرنگیان چاٹ گام اور اُن کے دوسرے سرداروں کے ساتھ روانہ کیا اور ان کو انعام واکرام وغیرہ سے پوری طرح خوش کر دیا اُن کے بیڑہ کے ساتھ بادشاہی بیڑہ بھی دریا کے راستہ سے روانہ کیا۔ چونکہ بزرگ امیدخاں کو منزل مقصود تک پہنچنے میں جنگلوں کو کٹوا کر اور ندیوں اور دریاؤں کو عبور کر کے بڑی مشکلوں سے کوچ کرنا پڑتا تھا اس لئے بادشاہی بیڑہ پرعہ خشکی کی فوج سے کسی قدر آگے بڑھ گیا تھا اراکانیوں کے بیڑہ نے حملہ کیا۔ اور جانبین سے توپ بندوق اور تیروں سے ایک دریائی لڑائی ہوئی جس میں اراکانی مغلوب ہوگئے اور دش غراب اور تین جلیے چھنوا کر بھاگ گئے۔ چونکہ ابھی پیچھے سے بڑی بڑی بادشاہی کشتیاں نہیں پہنچ سکتی تھیں اس لئے ابن حسین نے زیادہ تعاقب نہ کیا اور اپنے بیڑہ کو اُن کے بیڑہ سے کسی قدر فاصلہ پر روک لیا۔ جب بزرگ امیدخاں اس کامیابی کے حال سے مطلع ہوا تو اس نے میر مرتضیٰ اور فرہاد خاں کو تاکید سے حکم بھیجا کہ جنگل وغیرہ کو کٹوا کر اور راستہ بنوا کر کوچ کرنے کا خیال تو چھوڑ دیں اور جس طرح بن پڑے ابن حسین کی مدد کو جا پہنچیں۔ چنانچہ جب یہ لوگ بھی ابن حسین کے نواڑہ کے پاس دریا کے کنارے پہنچ گئے تو ابن حسین نے دریائے کرن پھولی میں جہاں اراکانیوں کا نواڑہ ٹھہرا ہوا تھا پہنچ کر حملہ کر دیا۔ اور جانبین سے چھ گھنٹہ تک سخت دریائی لڑائی ہوئی جس میں بہت سے اراکانی مارے گئے۔ بہت سے ڈوب گئے۔ بہت سے پکڑے گئے اور ابن حسین نے فتح یاب ہو کر اپنے بیڑے کو قلعہ چاٹ گام کے نیچے جا کھڑا کیا۔ اور اس لڑائی میں کپتان مور مذکور نے بھی نہایت عمدہ خدمتیں

اورنگ زیب کے بیٹوں کا حال محمد سلطان تو اب تک قلعہ گوالیار میں قید ہے۔ لیکن کہتے ہیں کہ اب اُس کو حسب قاعدہ پوست کا قدح نہیں پلایا جاتا۔ اور محمد معظم بدستور اپنی ہوشیاری اور سلامت روی کی چال پر چلے جاتا ہے۔ لیکن ایک واقعہ سے ایسا پایا جاتا ہے کہ شاید بادشاہ اُس سے کچھ ناراض تھا۔ اور اس ناراضگی کا سبب یا تو یہ ہوگا کہ اپنے باپ کی شدت مرض کے زمانہ میں کوئی خفیہ کارروائی کی ہوگی یا کوئی اور نامعلوم سبب ہوگا۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ بغیر کسی مخفی رنجش کے صرف اُس کی جرأت اور اطاعت کا امتحان ہی منظور ہو۔ مگر بہرحال اورنگ زیب نے ایک روز بھرے دربار میں اُس کو یہ حکم دیا کہ "ایک شیر جو پہاڑ سے اتر آیا ہے اور گرد و نواح کے لوگوں کو تکلیف

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ ایجاد ہوئیں اور جو فرنگی چاٹگام میں اب تک کسی قدر موجود تھے اور اراکان سے اُن کی مدد کو آئے تھے سب ابن حسین کے پاس حاضر ہو گئے۔ اور اس سے دوسرے دن خشکی کے راستہ سے وقت ہے کہ بزرگ امید خاں بھی آن پہنچا اور قلعہ چاٹگام پر دریا اور خشکی دونوں طرف سے حملہ شروع ہوا۔ اہل قلعہ نے اگرچہ کچھ عرصہ تک بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر آخر امان چاہی اور عالمگیر کے آٹھویں سال جلوس میں آخر رجب ۱۰۷۵ھ کو چاٹگام کا مشہور و مستحکم قلعہ اور بندرگاہ جس پر بقول صاحب عالمگیر نامہ اس سے پہلے کسی مسلمان بادشاہ کا تسلط نہ ہوا تھا مع ولایت چاٹگام اور توپ خانہ اور بیڑے کے حوالہ کر کے چاٹگام کا حاکم جو راجہ اراکان کے چچا کا بیٹا تھا اپنے بیٹے اور چند رشتہ داروں اور کئی سو اور بالی موالی کے ساتھ قید ہو گیا۔ اور ایک سو تیس جنگی کشتیاں اور ایک ہزار چھبیس برنجی اور آہنی توپیں اور بہت سی بندوقیں اور زنبورک و سکہ و بارود بے شمار مع سالحہ توپ خانہ اور چند ہاتھی قبضہ میں آئے اور بنگالہ کی رعایا میں سے جو ایک خلق کثیر مدتوں سے ان کی قید میں تھی انھوں نے رہائی پائی اگرچہ اس کے بعد بزرگ امید خاں کے حکم سے میر مرتضیٰ نے قلعہ بندرامبو کو بھی جو چاٹگام سے چار منزل آگے چاٹگام اور اراکان کے درمیان تھا اور راستہ میں دشوار گذار جنگل اور ندیاں نالے اور پہاڑ واقع تھے راجہ اراکان کے بھائی سے جنگ و جدال کے بعد چھین لیا۔ مگر چونکہ ایام برسات میں چاٹگام اور رامبو کے درمیان پانی ہی پانی ہو جاتا ہے۔ اور گھنے جنگلوں اور ندیوں نالوں اور پہاڑوں کے علاوہ دو ایسے دریا بھی ہیں کہ جن کو بغیر کشتی کے عبور نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے قرب برسات کے اندیشے اور قلت رسد کے خیال سے فتح کے بعد اس مقام کو چھوڑ دیا گیا۔ اور عالمگیر نامہ میں جو تفصیلات ہیں اُن کا حساب لگانے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مہم میں دس بارہ ہزار سے کم فوج مامور نہ تھی۔ س م ح

رہتا ہے اُس کو جاکر مار آتے۔ اور اگرچہ پادشاہی میر شکار نے ذرا جرأت کرکے عرض کیا کہ جہاں پناہ وہ بڑے بڑے جال بھی تو ساتھ لے جانا مناسب ہے جو اس خطرناک شکار کے واسطے مخصوص ہیں۔ لیکن پادشاہ نے نہایت بے پروائی سے کہا کہ نہیں۔ اُن کی کچھ حاجت نہیں۔ کیونکہ ایام شہزادگی میں ہم نے تو کبھی اس قسم کی احتیاطوں کا خیال بھی نہیں کیا۔ اور یہ حکم ایسے قطعی طور پر دیا کہ شہزادہ کو بلا عذر جانا ہی پڑا۔ اور اگرچہ اس معرکہ میں دو تین آدمی کام آئے اور کچھ گھوڑے بھی زخمی ہوئے اور شیر زخم کھاکر اور جست کرکے شاہزادہ کے ہاتھی کے سر پر بھی آن پڑا مگر مار لیا گیا۔ اور جب سے یہ جرأت اور دلاوری شاہزادہ سے ظہور میں آئی ہے بادشاہ اُس سے بڑی محبت سے پیش آتا ہے۔ اور یہاں تک اُس کا رتبہ بڑھایا ہے کہ دکن کی صوبہ داری بھی دیدی ہے مگر اس میں شک نہیں کہ اُس کے اختیارات خصوصًا رقمی معاملات میں ایسے محدود ہیں کہ اُس سے کسی تکلیف کے پہنچنے کا اندیشہ نہیں ہوسکتا

مہابت خاں صوبہ دار کابل کی طاعت

اب میں مہابت خاں صوبہ دار کابل کا ذکر کرتا ہوں کہ اُس نے بھی آخر کار کابل کی حکومت سے دست بردار ہوکر حاضر ہو جانا ہی مناسب سمجھا۔ اور اورنگ زیب نے بھی از راہ عالی ہمتی اُس کا قصور معاف کر دیا۔ اور فرمایا کہ ایسے سپاہی کی جان بہت قیمتی ہے اور اپنے آقا شاہجہاں کے ساتھ اُس کی وفاداری تعریف کے لائق ہے۔ بلکہ عفو تقصیر کے علاوہ راجہ جسونت سنگھ کی جگہ (جو شائستہ خاں کی مدد کے لئے شیواجی مرہٹہ کی بیخ کنی کے لئے دکن کو بھیجا گیا تھا) گجرات کا صوبہدار بھی مقرر کر دیا۔ مگر اس جگہ یہ بات بھی جتا دینے کے قابل ہے کہ علاوہ اُن تحائف کے جو اُس نے روشن آرا بیگم کو دیئے تھے پندرہ سولہ ہزار اشرفیاں اور بہت سے ایرانی اونٹ اور گھوڑے خود بادشاہ کی نذر کئے۔ پس تعجب نہیں ہے کہ ان تحائف ہی نے بادشاہ کے دل کو نرم کر دیا ہو۔

قندھار پر ایران و ہندوستان کی لڑائیاں

مہابت خاں کے ساتھ چونکہ کابل کا ذکر آ گیا ہے۔ تو اس وجہ سے اُس کے ہمسایہ صوبہ قندھار کا خیال بھی میرے دل میں پیدا ہوتا ہے اس لئے لازم ہے کہ اس کے بیان میں بھی دو ایک صفحے لکھ ڈالوں۔ یہ صوبہ بنی زمانہ سلطنت ایران کا باج گزار ہے۔ اس کے حالات اور خصوصًا وہ پولٹیکل حسد اور مخالفت جو اس ملک کے باعث ایران اور ہندوستان کے

بادشاہوں کے درمیان پیدا ہوتی رہتی ہے لوگ بہت کم واقف ہیں ۔

پس واضح ہو کہ یہ ملک اور اس کا دارالحکومت جو اس زرخیز اور خوش نما صوبہ کے اندر ایک مستحکم قلعہ ہے دونوں کو قندہار کہتے ہیں ۔ اور اُس پر قبضہ حاصل کرنے کی خاطر ایرانیوں اور سلاطین مغلیہ کے درمیان ایک مدت سے برابر خون ریز لڑائیاں ہوتی رہی ہیں ۔ چنانچہ شہنشاہ اکبر نے اس کو ایرانیوں سے چھین لیا تھا ۔ اور اس کے عہد تک برابر اُس پر قبضہ رہا مگر شاہ عباس نے اُس کے بیٹے جہانگیر سے پھر لے لیا ۔ اور شاہ جہاں کے وقت میں علی مردان خاں کی نمک حرامی سے جو یہاں کا حاکم تھا اور شاہجہاں سے سازش کر کے فوراً اپنے اس نئے آقا کی پناہ میں چلا آیا تھا پھر سلطنت مغلیہ کے قبضہ میں آگیا ۔ اور اس کا باعث یہ تھا کہ دربار ایران میں علی مردان خاں کے بہت سے دشمن تھے اور وہ خوب جانتا تھا کہ اگر اُن فرمانوں کی تعمیل کروں گا جو صوبہ کا حساب سمجھانے کے بارہ میں صادر ہوئے ہیں تو کیا نتیجہ ہوگا ۔

اس کے بعد شاہ عباس کے بیٹے نے محاصرہ کر کے اس کو پھر فتح کر لیا اور اگرچہ شاہجہاں نے دو بار فوج بھیجی مگر دونوں دفعہ ناکام ہی رہا ۔ چنانچہ پہلی دفعہ کی ناکامی کا سبب تو اُن ایرانی اُمرا کی نمک حرامی تھی جو شاہ جہاں کے دربار میں سب سے بڑھ کر ذی اقتدار تھے اور باطن میں اپنے ملک کو نہایت عزیز جانتے تھے ۔ جنھوں نے اس محاصرہ میں شرمناک حد تک پہلوتہی کی اور راجہ روپ سنگھ کو جس نے اپنا نشان اُس دیوار پر جا گاڑا تھا جو سب سے زیادہ پہاڑ کے قریب تھی مدد نہ دی ۔ اور دوسری بار ناکام رہنے کا باعث اورنگ زیب کا رشک و حسد تھا جس سے اُس راستہ سے جو انگریزوں یہ تگیزوں، جرمن اور فرانسیسیوں کی توپوں نے دیوار قلعہ کو توڑ کر خاصہ گذر کے قابل بنا دیا تھا حملہ کر کے داخل ہی ہونا نہ چاہا ۔ کیونکہ اس مہم کا آغاز داراشکوہ نے کیا تھا جو اُس وقت باپ کے ساتھ کابل میں تھا اور اورنگ زیب کو یہ بات گوارا نہ تھی کہ اس قابل قدر ارادہ میں کامیاب ہونے کی ناموری داراشکوہ کو حاصل ہو ۔ اگرچہ شاہجہاں نے شاہزادوں کی باہمی جنگ سے چند سال پہلے تیسری دفعہ بھی قندھار کا محاصرہ کرنا چاہا تھا لیکن میر جملہ نے اس مہم سے روک دیا ۔ اور جیسے کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں اس کے عوض دکن پر فوج کشی کرنے کی صلاح دی اور علی مردان خاں نے بڑے زور سے اُس کے دلائل کی تائید کی تھی اور یہ عجیب لفظ کہے تھے کہ حضور قندھار کو کبھی فتح نہ کر سکیں گے جب تک کہ کوئی مجھ سا ہی نمک حرام اُس کا پھاٹک نہ کھول دے یا حضور تمام ایرانیوں کو جو

سپاہ میں ہیں محاصرہ کرنے والی فوج سے بالکل خارج نہ کردیں۔اور اس مضمون کا اشتہار جاری نہ فرمادیں کہ بازاری لوگوں سے جو فوج کے لئے رسد لائیں کسی طرح کا محصول نہ لیا جائے گا۔"

چند سال ہوئے کہ اورنگ زیب نے بھی اپنے بزرگوں کی تقلید میں یا تو اُس خط کی وجہ سے جو شاہ ایران نے لکھا تھا یا اُس کم التفاتی کے سبب جو اُس کے سفیر تربیت خاں کی تعظیم و تکریم کے بارے میں دربار ایران کی طرف سے ہوئی تھی ناراض ہو کر قندھار پر مہم کی تیاری کی لیکن شاہ ایران کے انتقال کی خبر سُن کر اسے ملتوی کر دیا اور یہ بات بنائی کہ ہمارا دل گوارا نہیں کرتا کہ ایک لڑکے پر جو ابھی تخت نشین ہوا ہے چڑھائی کریں۔ حالانکہ میرے قیاس میں شاہ سلیمان کی عمر جو باپ کی جگہ تخت نشین ہوا ہے پچیس برس سے کم نہیں۔

مخلص رفقاء اب میں اورنگ زیب کے سرگرم رفیقوں کا جن میں سے اکثر کو بڑے بڑے منصب اور عہدے دیئے گئے تھے ذکر کرتا ہوں۔

واضح ہو کہ اورنگ زیب کا ماموں شائستہ خاں تو جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے دکن کا صوبہ دار بنایا گیا۔ اور جو فوج وہاں مقرر تھی اُس کی سپہ سالاری بھی اُسی کو دی گئی اور آخرکار بنگالہ کی صوبہ داری پر سرفراز ہوا۔اور امیر خاں کو کابل، خلیل اللہ خاں کو لاہور، میر بابا کو الٰہ آباد لشکر خاں کو پٹنہ اور الہ ویردی خاں کے بیٹے کو جس کے باپ کی صلاح سے سلطان شجاع نے کھجوہ کے مقام پر شکست کھائی تھی سندھ کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔فاضل خاں کو جس کی معقولیت اور دانشمندانہ صلاح مشوروں سے اورنگ زیب کو بہت بڑی مدد ملی تھی خانسامانی کا عہدہ ملا دہلی کی صوبہ داری دانشمند خاں کو عنایت ہوئی اور اس رسم قدیم کے بجا لانے سے کہ ہر ایک امیر کو صبح و شام تسلیمات کے واسطے دربار میں حاضر ہونا لازم ہے (اور اگر اس میں کبھی فروگذاشت ہو جائے تو جرمانہ بھرنا پڑتا ہے) خصوصیت کے ساتھ اس وجہ سے معاف کیا گیا کہ سیر کتب اور مطالعہ کا اُس کو نہایت شوق ہے۔اور اس کے علاوہ سیغہ دول خارجہ کے متعلقہ کاموں میں بھی بہت وقت صرف کرنا پڑتا ہے۔ دیانت خاں کو کشمیر کی صوبہ داری عطا ہوئی۔ جو اگرچہ دشوار گذار اور مختصر سا ملک ہے۔ مگر ایسا پُر فضا قطعہ ہے کہ ہندوستان کا بہشت گنا جاتا ہے اور جس کو اکبر نے ایک حیلہ سے فتح کر لیا تھا۔اور اس بات کا فخر اُس کو حاصل ہے کہ اُس کی صحیح تاریخ خود وہیں کی زبان میں موجود ہے جس میں شاہان سلف کے ایک طول طویل سلسلہ کا دلچسپ حال مندرج ہے جو کسی زمانہ میں ایسے طاقتور تھے کہ تمام

ہندوستان کو ملنگا تک فتح کرلیا تھا۔ ان تاریخوں کا ترجمہ خلاصہ کے طور پر جہانگیر نے فارسی زبان میں کرایا تھا جس کی ایک نقل میرے پاس بھی موجود ہے۔ اس موقعہ پر یہ امر بھی قابلِ تذکرہ ہے کہ اورنگ زیب نے نجابت خاں کو جس نے سموں گڈھ اور کھجوہ کے معرکوں میں بڑی شجاعت دکھلائی تھی اُس کے منصب سے گرا دیا تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہ بے عزتی اُس کو اس لیے نصیب ہوئی تھی کہ اُس نے اپنی خدمتیں بار بار جتلائی تھیں۔

سیواجی مرہٹہ جسونت سنگھ اور جے سنگھ کی حالت اگرچہ کچھ مبہم سی ہے مگر میں اُس کی توضیح کی کوشش کروں گا۔ واضح ہو کہ بیجاپور میں ایک ہندو نے بغاوت کرکے کئی بڑے بڑے قلعوں اور بندرگاہوں پر جو شاہ بیجاپور کی عملداری میں تھے قبضہ کرلیا تھا۔ اور اس قسمت آزمائی کرنے والے نڈر شخص کا نام سیواجی ہے جو ایک بڑا ہوشیار صاحب داعیہ اور ایسا مشہور آدمی ہے کہ اپنے مرنے جینے کی اُس کو پروا ہی نہیں ہے چنانچہ جس زمانہ میں کہ شائستہ خاں دکن کا صوبہ دار تھا وہ اس کو شاہ بیجاپور کی تمام سپاہ اور اُن راجاؤں کی متفقہ قوت کی بہ نسبت جو کسی مشترک دشمن کے مقابلہ میں اس کے ساتھ شامل ہوجایا کرتے ہیں زیادہ خوفناک سمجھتا تھا۔

اس شخص کی جرأت وجسارت کو اسی پر قیاس کرلینا چاہیے کہ باوجودیکہ شائستہ خاں کی سپاہ چپے چپے پر پھیلی ہوئی تھی اور شہر اورنگ آباد فصیل سے بھی محصور تھا مگر اس پر بھی ایک رات صرف چند سپاہیوں کے ساتھ شائستہ خاں کے مکان کے اندر اس ارادہ سے جا گھسا کہ شائستہ خاں کو پکڑکر اُس کے تمام مال ودولت پر قابض ہوجائے اور اگر تھوڑی دیر اور خبر نہ ہوتی تو کچھ شک نہیں ہے کہ یہ اپنے منصوبہ میں ضرور کامیاب ہوجاتا۔ چنانچہ شائستہ خاں اس موقعہ پر سخت زخمی ہوا۔ اور اُس کا بیٹا میان سے تلوار نکالتے ہوئے مارا گیا۔

سیواجی کی بندرگاہ سورت میں غارت گری اس سے تھوڑے ہی دنوں بعد اس نے ایسا ہی ایک اور چھاپا مارا جس میں زیادہ کامیابی ہوئی یعنی چپکے سے دو تین ہزار چیدہ سپاہی ساتھ لے کر اپنے لشکرگاہ سے نکل کھڑا ہوا۔ اور یہ مشہور کیا کہ ایک راجہ بادشاہ کے سلام کو دہلی جاتا ہے اور جب شہر سورت کے قریب پہنچا اور وہاں کا حاکم اُس کو ملا تو اُسے یہ دم دے دیا کہ میرا قصد شہر میں جانے کا نہیں ہے سیدھا باہر باہر جاؤں گا حالانکہ اس منصوبہ کا اصل مدعا اسی مشہور اور دولت مند بندرگاہ کو لوٹنا تھا

چنانچہ شمشیر بکف شہر میں آگھسا اور تین دن تک لوگوں کو سخت تکلیفیں اور عذاب دے دیکر خوب تنگ کیا اور کئی لین[۱] روپیہ سونے۔ چاندی اور موتیوں اور ریشمی کپڑوں اور عمدہ ململوں اور تجارتی مال واسباب سے اپنی سواریاں لاد کر رخصت ہوگیا۔ اور جو چیز اُٹھا نہ سکا اُس کو جلا کر خاک سیاہ کرگیا۔

چونکہ اس موقعہ پر کسی نے اس سے اتنا بھی نہ پوچھا کہ تیرے منہ میں کے دانت ہیں اس وجہ سے یہ شبہ پیدا ہوگیا کہ اس کے اور راجہ جسونت سنگھ کے باہم خفیہ سازش ہے۔ شائستہ خاں پر حملہ کرنا اور سورت کو لوٹنا سب اُس کے علم واشارہ سے ہوا ہے۔ اس لئے راجہ دکن سے واپس بلا یا گیا۔ مگر وہ دہلی آنے کے بجائے اپنی ریاست کو چلا گیا۔

لو! یہ کہنا تو میں بھول ہی گیا کہ سیوا جی۔ نہیں نہیں۔ دھرم آتما سیوا جی صاحب نے سورت کو لوٹتے وقت ریورینڈ فادر ایمبروز کے مکان کو جو فرقہ کے پوشین[۲] میں سے ایک مشنری تھے ہاتھ تک نہیں لگایا اور کہا کہ فرنگیوں کے پادری نیک شخص ہیں ان کو ستانا نہیں چاہئیے اسی طرح ایک ہندو کے مکان کو بھی (جو ڈچ سوداگروں کی دلالی کا کام کرتا تھا) اس لئے نہ چھیڑا کہ وہ بہت سخی اور پُن دان میں مشہور تھا انگریزوں اور ڈچوں کے مکانات بھی بچے رہے لیکن اس کا سبب یہ نہ تھا کہ سیوا جی ان کا کچھ لحاظ کرتا تھا بلکہ اُنھوں نے اپنی ہمت اور دلیری سے اپنے آپ کو بچایا ــ انگریزوں نے تو اپنے جہاز کے خلاصیوں وغیرہ کی مدد سے کمال ہی کر دکھایا اور نہ صرف اپنے ہی مکانات بچائے بلکہ پڑوسیوں تک کے مکانوں پر بھی آنچ نہ آنے دی۔ اس موقعہ پر قسطنطنیہ کے رہنے والے ایک یہودی نے عجیب ہٹ دکھلائی جس سے لوگ حیران رہ گئے۔ سیوا جی نے یہ سُن کر کہ اُس کے پاس نہایت قیمتی یاقوت ہیں (جن کو وہ بیچنے کے لئے اورنگ زیب کے پاس لے جانا چاہتا ہے) اُس کو تین دفعہ گھٹنوں بٹھلا کر اور ننگی تلواریں تول تول کر ہر چند ڈرایا۔ مگر اُس نے ہرگز نہ بتایا۔ غرض یہودیوں کی اس عادت کو کہ روپیہ کو جان سے زیادہ عزیز جانتے ہیں خوب نباہا۔

سورت کے واقعہ کے بعد اورنگ زیب نے جے سنگھ کو فوج مامورہ دکن کی سپہ سالاری قبول کرنے پر رضامند کیا اور سلطان محمد معظم کو بھی اُس کے ساتھ بھیجا۔ مگر شاہزادہ کو کسی قسم

---

[۱] ایک لین دس لاکھ روپیہ کا ہوتا ہے۔

[۲] کے پوشین عورتوں کی طرح برقعہ پہننے والے عیسائی درویشوں کے ایک فرقہ کا نام ہے۔ س م ع

کا اختیار نہیں دیا ـــــ راجہ نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ سیوا جی کے سب سے بڑے قلعہ پر زور شور سے حملے کرنے شروع کر دیئے۔ مگر اس کے ساتھ حسب معمولی اپنے فن کے مطابق جوڑ توڑ اور اور وعدہ وعید سے بھی کام لیتا رہا جس کا حسب دل خواہ نتیجہ ہوا کہ قبل اس کے کہ اہل قلعہ نہایت لاچار ہو کر مغلوب ہوتے سیوا جی نے قلعہ حوالہ کر دیا۔ اور یہ شرط بھی قبول کر لی کہ اگر بیجا پور پر فوج کشی جائے تو بادشاہی فوج کا ساتھ دوں گا ـــــ اورنگ زیب نے بالطاف شاہانہ اُس کو راجہ کا خطاب عنایت کیا اور اُس کے بیٹے کو امرا کے ذیل میں داخل کر کے شمل اور امیروں کے وظیفہ مقرر کر دیا۔

سیوا جی کی دہلی میں حاضری

اس سے کچھ دنوں بعد جو ایران پر چڑھائی کا ارادہ ہوا تھا تو اورنگ زیب نے سیوا جی کو نہایت عنایت آمیز اور خوش آئند الفاظ میں فرمان لکھا اور اُس کی فہم و فراست اور سخاوت و شجاعت وغیرہ کی بہت تعریف کی اور راجہ جے سنگھ بھی جان اور آبرو کی حفاظت کا ضامن بنا اس لئے سیوا جی بھی مطمئن ہو کر دہلی میں حاضر ہو گیا تھا مگر اتفاق وقت سے شائستہ خاں کی بیوی بھی اس وقت دہلی میں موجود تھی اور بڑا بہر اس امر پر مصر تھی کہ ایسا شخص جس نے میرے بیٹے کو قتل کیا۔ اور شوہر کو زخمی کیا۔ اور بندر سورت کو لوٹا ہے۔ ضرور گرفتار اور قید ہونا چاہیئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیوا جی یہ دیکھ کر کہ تین چار افسر اُس کے خیموں کی ہمیشہ نگرانی کرتے رہتے ہیں ایک رات بھیس بدل کر بھاگ گیا۔ اور اُس کے قابو سے نکل جانے پر شاہی محل میں بہت کو بہت رنج اور افسوس ہوا اور جے سنگھ کے بڑے بیٹے پر قوی شبہ ہوا کہ اُس نے سیوا جی کو مدد دے کر بھگا دیا ہے ـــــ اس کو دربار میں حاضر ہونے کی ممانعت کر دی گئی۔

جے سنگھ کی وفات

چونکہ اورنگ زیب راجہ جے سنگھ اور اُس کے بیٹے دونوں ہی سے خواہ دل سے خواہ محض ظاہری طور پر ناراض معلوم ہوتا تھا راجہ جے سنگھ کو یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں اورنگ زیب اس حیلہ سے میری ریاست ہی ضبط نہ کرے۔ پس نہایت عجلت کے ساتھ اپنا ملک بچانے کے لئے دکن سے واپس آیا۔ لیکن راستہ ہی میں برہان پور پہنچ کر مر گیا۔

یہ خبر سُن کر جے سنگھ کے بیٹے کے ساتھ اورنگ زیب نے جو اظہار عنایت کیا اور اُس کی اس مصیبت پر اپنا دلی افسوس ظاہر فرمایا اور اُس کے باپ کے منصب اور جاگیر وغیرہ پر

اُس کو بحال کر دیا۔ تو اس سے بہت لوگوں کی یہ رائے ہو گئی کہ سیواجی کا بھاگ جانا خود اورنگ زیب ہی کی چشم پوشی اور اغماض سے ہوا ہے اور وہ یہ گمان کرتے تھے کہ چونکہ بیگمات کو سیواجی سے نہایت ہی نفرت تھی اور اُن کے رنج اور تلخی و تندی کا کچھ ٹھکانا نہ تھا اور وہ یہ سمجھتی تھیں کہ وہ ایک ایسا خبیث ہے کہ جس نے اُن کے عزیزوں اور قرابت داروں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے ہیں۔ اس لئے اورنگ زیب بھی دربار میں اُس کی موجودگی سے دق ہو گیا ہوگا۔

اب میں دکن کے واقعات پر ایک مجمل نظر ڈالنا چاہتا ہوں جو ایک ایسا ملک ہے کہ چالیس برس سے زیادہ عرصہ سے برابر لڑائیوں بھڑائیوں کا گھر رہا ہے۔ اور جس کے واسطے سلاطین مغلیہ شاہان گولکنڈا اور بیجاپور اور ان سے کم درجہ کے رئیسوں کے ساتھ اکثر اُلجھے ہی رہتے ہیں تا وقتیکہ اُس کے فرماں رواؤں کی حالت اور اُن بڑے بڑے واقعات سے جو اس ملک میں ہوتے رہتے ہیں بخوبی واقفیت نہ ہو۔ ان لڑائی جھگڑوں کی حقیقت اچھی طرح سمجھ میں آنی ناممکن ہے۔

ملک دکن کی وسعت واضح ہو کہ قریب دو سو برس سے ملک ہند کا یہ قطعہ جو مغرب کی طرف خلیج کھمبایت سے شروع ہو کر مشرق کی جانب جگن ناتھ کے قریب خلیج بنگالہ تک اور جنوب میں راس کماری تک پھیلا ہوا ہے۔ اور جو اہل یورپ کے جغرافیہ کی اصطلاح میں گریٹ انڈین پنین شلا کے نام سے معروف ہے باستثناء چند پہاڑی ضلعوں کے تمام کا تمام ایک خود مختار خاندان کے زیر فرمان چلا آتا تھا۔ مگر راجہ رام راج کی نااہلیت سے جو اُسی خاندان میں سب سے اخیر راجہ تھا یہ بڑی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ اور یہی وجہ ہے کہ اب یہ ملک مختلف مذہب کے کئی فرماں رواؤں کے زیر حکومت نظر آتا ہے۔

گولکنڈا اور بیجاپور کے فرماں روا بات یہ ہے کہ رام راج[1] کے پاس گرجستان کے رہنے والے تین غلام تھے جن کو اُس نے ہر قسم کی عنایات سے ممتاز کر رکھا تھا یہاں تک کہ آخر کار اُن کو تین بڑے بڑے صوبوں کا حاکم بنایا۔ چنانچہ ایک تو تقریباً اُن تمام اضلاع کا جو بالفعل سلطنت مغلیہ کے قبضہ میں ہیں حاکم متقرر ہوا۔

---

[1] اصل میں رام راس لکھا ہے۔ م ح

اور یہ صوبہ شہر بیدر اور پرینڈا اور سُورت سے لے کر دریائے نربدا تک پھیلا ہوا تھا اور ت آباد اس کا دارالحکومت تھا۔ دوسرا اُس ملک کا حاکم بنایا گیا جو سلطنت بیجاپور کے نام سے مشہور ہے۔ اور تیسرے کو وہ ملک سپرد ہوا جس کو گولکنڈا کی سلطنت کہتے ہیں۔ خلاصہ ل یہ تینوں غلام نہایت ہی دولت مند اور طاقتور ہو گئے۔ اور چونکہ ان تینوں نے شیعہ ہب اختیار کر لیا تھا جو اہلِ ایران کا عام مذہب ہے۔ اُن سے رام راج کے دربار کے ایرانی اُمراء سے اُن کو بہت مدد ملتی تھی۔ کوئی یہ نہ کہے کہ یہ ہندو کیوں نہ بن گئے اس لئے کہ ہندو نہیں چاہتے کہ کوئی غیر شخص اُن کے مذہبی اسرار سے مستفید ہو۔ پس اگر وہ چاہتے تب بھی ہندو نہیں بن سکتے تھے۔ القصہ ان تینوں نے متفق ہو کر بغاوت کی جس کا انجام یہ ہوا کہ رام راج مارا گیا۔ اور یہ اپنے اپنے صوبوں میں واپس آ کر بادشاہ بن بیٹھے۔ اور چونکہ رام راج کی اولاد میں کوئی ایسا شخص موجود نہ تھا جو ان کا مقابلہ کر سکتا اس لئے وہ صرف اُس ملک میں چپ چاپ بیٹھے رہے جو کرناٹک کے نام سے مشہور ہے اور جس کو ہمارے جہاز رانی کے مختصر نقشوں میں (جن کو چارٹ کہتے ہیں۔) بسنگر[1] لکھا ہے اور جہاں اُس کی اولاد اب تک راج کرتی ہے۔ اور اس جزیرہ نما کے باقی قطعات اُسی وقت سے اُن تمام چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو گئے جو اب تک قائم ہیں اور جن کے رئیس راجہ یا نائک کہلاتے ہیں۔ ان تینوں غاصبوں کی اولاد میں جب تک اتفاق رہا اُن پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکا اور سلاطین مغلیہ کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے لیکن جب سے باہمی رشک و حسد نے جگہ پائی اور اُنھوں نے یہ چاہا کہ ایک دوسرے کی مدد کے بغیر خود سر ہو کر رہیں تب سے وہ نااتفاقی کے خوفناک خمیازے اٹھا رہے ہیں۔ اور پینتیس یا چالیس برس ہوتے کہ شہنشاہ مغل نے یہ دیکھ کر کہ اُن میں اتفاق نہیں ہے نظام شاہ کی سلطنت پر جو بانی ریاست سے پانچویں یا چھٹی پشت میں تھا چڑھائی کر کے اُس کو فتح کر لیا۔ اور زمانہ ہوا کہ نظام شاہ اپنے سابقہ دارالحکومت دولت آباد ہی میں قید رہ کر قیدِ زندگی سے بھی چھوٹ چکا ہے۔

گولکنڈا کے سلطنتِ مغلیہ سے تعلقات

البتہ شاہانِ گولکنڈا اب تک حملہ سے محفوظ رہے ہیں۔ لیکن اُن کا یہ بچا رہنا اُن کی زور و قوت کے سبب سے نہیں ہے بلکہ صرف اس وجہ سے کہ شہنشاہ مغل کو اول اُس کی دونوں ہم جنس

[1] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ بجے نگر کی خرابی ہے جو راجہ رام راج کا دارالحکومت تھا۔ س م ح

اور ہمسایہ ریاستوں پر مہم کرنے اور اُن کے مستحکم مقامات امیر پر بیٹھنا۔ اور بیدر کے لے لینے کی زیادہ ضرورت تھی تاکہ اس کے بعد گولکنڈا پر حملہ کرنا اور بھی آسان ہو جائے اور اُن کی یہ دانائی اور حسنِ تدبیر بھی کچھ اُن کے بچاؤ کا باعث تھی کہ اپنی بے شمار دولت میں سے مخفی طور پر شاہ بیجاپور کو ہمیشہ مدد بھیجتے رہتے تھے۔ اور جب کبھی بیجاپور پر حملہ کا اندیشہ ہوتا تھا تو یہ اپنی فوج بھی سرحد پر بھیج دیا کرتے تھے تاکہ شہنشاہ مغل کو یہ بات جتلائی جائے کہ گولکنڈا نہ صرف اپنے بچاؤ کے لئے مستعد ہے بلکہ اگر بیجاپور پر سخت وقت آن پڑے گا تو ہم اس کے بھی آڑے آنے کو تیار ہیں۔ علاوہ بریں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مغل سپہ سالاروں کو بہت کچھ رشوتیں بھی دی جایا کرتی ہیں۔ اسی وجہ سے وہ گولکنڈا کے عوض بیجاپور پر مہم کرنے کی رائے کو ہمیشہ اس دلیل سے ترجیح دیتے رہتے ہیں کہ وہ دولت آباد سے زیادہ قریب ہے۔ اور جب سے اورنگ زیب اور گولکنڈا کے موجودہ بادشاہ کے درمیان ایک عہد نامہ ہو چکا ہے تب سے تو اورنگ زیب کا بھی اس پر چڑھائی کرنے کی طرف میلان نہیں معلوم ہوتا۔ اور اُس روز سے غالباً وہ اُسے اپنا ہی سمجھتا ہے اور چونکہ وہ مدت سے باج گزار ہے۔ اور بہت سا روپیہ اور وہاں کی بنی ہوئی نہایت عمدہ عمدہ چیزیں اور پیگو اور سراندیپ اور سیام کے ہاتھی سال بسال خراج کے طور پر بھیجتا رہتا ہے اور اب گولکنڈا اور دولت آباد کے مابین کوئی ایسا قلعہ بھی باقی نہیں رہا جو کسی مخالف کے قبضہ میں ہو اس لئے اورنگ زیب کو یقین ہے کہ ایک ہی دفعہ کی چڑھائی اس ملک کی فتح کے لئے کافی ہوگی۔ لیکن میری رائے میں اورنگ زیب کو گولکنڈا کی فتح سے بجز اس کے اور کسی بات نے نہیں روکا کہ مبادا شاہ بیجاپور اپنے اس اندیشہ سے کہ کل کو یہی دن اُس کے لئے بھی پیش آنے والا ہے کہیں خود سوبہ دکن ہی کی تاخت و تاراج شروع نہ کر دے۔ متذکرہ بیان سے اُمید ہے کہ ناظرین تصور کر سکیں گے کہ سلطنت مغلیہ اور گولکنڈا کے باہم کس قسم کے تعلقات ہیں۔ اور اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ گولکنڈا کے قیام و بقا کی حالت بالکل غیر متیقن ہے۔

اور جب سے کہ وہ ناخوش گوار معاملہ پیش آچکا ہے جو میر جملہ کی تجویز کے موافق اورنگ زیب نے اُس سے برتا تھا۔ شاہ گول کنڈا کے قوائے دماغی میں بھی بالکل فتور آگیا ہے۔ اور سلطنت کی باگ اُس نے نہایت ڈھیلی چھوڑ دی ہے۔ اور رسم ملک کے موافق نہ کبھی

دربار میں آکر بیٹھتا ہے اور نہ انصاف و عدالت کرتا ہے ۔ بلکہ اتنی ہمت بھی نہیں رہی کہ کبھی قلعہ کی دیوار سے باہر نکلے ۔جس کا طبعی اور لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ملک میں ابتری اور بے انتظامی پھیل رہی ہے ۔اور اُمرا و حکام جو نہ اب بادشاہ کا کچھ حکم ہی مانتے ہیں اور نہ اُس سے کچھ محبت ہی رکھتے ہیں بے حد ظلم کرتے ہیں ۔ اور اُمید ہے کہ اگر کبھی موقعہ ہوا تو رعایا جو اس ظلم و ستم سے تنگ آ رہی ہے بہت جلد اورنگ زیب کی اطاعت قبول کرے گی جس کی حکومت گولکنڈا کی بہ نسبت بہتر اور منصفانہ ہے۔

اب میں چند باتیں وہ بیان کرتا ہوں کہ جن سے اس بدبخت بادشاہ کی مختل حالت کا ثبوت ملتا ہے ۔ ایک تو یہ کہ ۱۶۶۷ء میں جب کہ میں گول کنڈا میں تھا اورنگ زیب کی طرف سے ایک سفیر خاص یہ پیغام لے کر آیا کہ یا تو دس ہزار سوار بیجا پور کی مہم کے لئے حاضر کرو ۔ یا تم بھی مقابلہ کے لئے تیار ہو جاؤ ۔ اس نے فوج کا بھیجنا تو قبول نہ کیا ۔ لیکن اُس قدر روپیہ جو دس ہزار سواروں کی تنخواہ کے لئے مکتفی ہو سکتا ہے ۔اور جس سے اورنگ زیب اور بھی زیادہ خوش ہوا دیدیا اور سفیر کی بہت ہی آؤ بھگت کی ۔اور بہت سے گراں بہا تحائف خود اُس کو دیئے اور ایک بڑا بھاری پیش کش اورنگ زیب کے لئے روانہ کیا۔

دوسرے یہ کہ اورنگ زیب کا معمولی سفیر جو گولکنڈا میں متعین رہتا ہے احکام جاری کرتا ہے ۔راہ داری کے پروانے دیتا ہے اور لوگوں کو دھمکاتا اور بدسلوکی کرتا ہے غرضکہ اُس کی گفتار و رفتار ایسے مطلق العنان حاکم کی ہے کہ گویا بجائے خود ایک بادشاہ ہے۔

تیسرے یہ کہ میر جملہ کا بیٹا محمد امین خاں جس کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ وہ .... اورنگ زیب کے دربار کا صرف ایک امیر ہے گولکنڈا میں اُس کا اس قدر ادب کیا جاتا ہے کہ اُسکا نائب یعنی دلال یا گماشتہ جو مچھلی پٹن میں رہتا ہے ۔ بندرگاہ کے حاکم کا سا اختیار رکھتا ہے تمام تجارتی جنسیں خریدتا ہے ۔ بیچتا ہے ۔جہازوں پر مال چڑھاتا ہے اُتارتا ہے ۔ مگر محصول کی ایک کوڑی تک نہیں دیتا اور نہ اُس کے کام میں کوئی دخل دے سکتا ہے ۔عجب بات ہے! میر جملہ کا رعب وداب اس ملک میں اس درجہ تک تھا کہ اُس کے مرنے کے بعد گویا وہ بھی وراثت میں محمد امین خاں کو مل گیا ہے ۔

چوتھے یہ کہ کبھی کبھی ڈچ لوگ گولکنڈا کے سوداگروں کے تمام جہازوں کو مچھلی پٹن کی بندرگاہ میں روکے رکھتے ہیں ۔ اور جب تک یہ بادشاہ اُن کی بات نہیں مان لیتا اُن کو باہر نہیں

جانے دیتے۔ اور خود میں نے اس بادشاہ پران کو یہ بیہودہ اعتراض کرتے دیکھا ہے کہ

"مچھلی پٹن کے حاکم نے ہم کو انگریزوں کے ایک جہاز پر جبراً قبضہ کر لینے سے کیوں روکا۔ اور لوگوں کو ہمارے مقابلہ کے لئے ہتھیار دے کر ہمارے اس ارادہ میں کیا مزاحم ہوا اور ہم کو یہ دھمکی کیوں دی کہ تمھاری کوٹھی کو جلا دوں گا اور تم پردیسی بدمعاشوں کو قتل کر ڈالوں گا۔"

پانچویں علامت اس سلطنت کے زوال کی یہ ہے کہ یہاں کے رائج سکہ کی قیمت بالکل ہی گر چکی ہے جو اس ملک کی تجارت کے حق میں نہایت مضر ہے۔

چھٹے یہ کہ یہاں تک تو نوبت پہنچی ہوئی ہے کہ پرتگیز بھی باوجود اپنی شکست حالی اور افلاس اور حقیر حالت کے اُس کو لڑائی کی دھمکی دینے میں تذبذب نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ اگر مقام سین طامس (جو چند سال ہوئے انھوں نے خود ہی شاہ گولکنڈا کو اس خیال سے دیدیا تھا کہ ڈچ جو ان سے طاقت میں زیادہ ہیں اُن کو اُس کے حوالہ کر دینے کی ذلت اُٹھانی نہ پڑے) ہم کو نہ دیدو گے تو ہم مچھلی پٹن اور دوسرے مقامات پر قبضہ کر لیں گے اور لوٹ لیں گے۔ مگر باوجود ان سب باتوں کے گولکنڈا ہی میں چند ذی فہم لوگ مجھ سے یوں بھی کہتے تھے کہ بادشاہ کے فہم و فراست میں کچھ بھی فرق نہیں اور اُس نے ضعیف العقلی اور ناقائم مزاجی اور سلطنت کے معاملات سے بے پروائی کی یہ حالت صرف اپنے دشمنوں کے دھوکہ دینے کو بنا رکھی ہے اور اس کے ایک ایسا جری بیٹا بھی ہے جو نہایت تیز مزاج، بلند خیال، گویا ایک پرکالۂ آتش شاہزادہ ہے۔ جس کو مصلحتاً عوام کی نظروں سے چھپا رکھا ہے اور کبھی موقعہ پاکر اُس کو تخت پر بٹھلا دے گا اور جو عہد و پیمان اورنگ زیب سے کر رکھا ہے اُس کو بالائے طاق رکھ دے گا۔

ریاست بیجاپور

اب میں ان رایوں کی غلطی اور صحت کے فیصلہ کو آئندہ زمانہ پر چھوڑ کر چند الفاظ بیجاپور کی بابت کہنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ شہنشاہ مغل کی طرف سے اس سلطنت کے ساتھ اکثر لڑائی بھڑائی رہتی ہے مگر اب تک یہ خود سر اور آزاد کہلاتی ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ جو سپہ سالار بیجاپور کی مہم پر مامور ہوتے ہیں اُن سرداروں کی طرح جو ایسی ہی اور مہموں پر بھیجے جاتے ہیں سپہ سالار بنے رہنے کے شوق میں اس امر کو غنیمت جانتے ہیں کہ دربار سے دور رہ کر فوج پر شاہانہ طور سے حکومت کرتے رہیں۔ اور اس لئے اپنے کام میں ٹال مٹول کرتے اور طرح طرح کے حیلوں اور بہانوں سے لڑائی

گو ہوائی کے اعزاز و اکرام کے علاوہ اُن کی آمدنی کا بھی ذریعہ ہے خواہ مخواہ طول دیتے رہتے ہیں ۔ اس وجہ سے یہ بات ہندوستان میں ایک ضرب المثل ہوگئی ہے کہ ملک دکن تو ہندوستانی سپاہی کی روٹی اور گذارہ ہے ۔

علاوہ بریں سلطنت بیجاپور میں پہاڑیوں کے اندر دشوار گذار مقاموں میں اس قدر قلعے اور گڑھیاں ہیں کہ جن کا فتح کرنا بہت ہی مشکل ہے اور جو علاقہ سلطنت مغلیہ سے متصل ہے وہ خصوصیت کے ساتھ چارے اور پانی کے موجود نہ ہونے کے باعث دشوار گذار ہے ۔ خصوصاً شہر پایۂ تخت ایک نہایت بے آب و گیاہ زمین پر واقع ہونے کی وجہ سے نہایت ہی مستحکم مقام ہے یہاں تک کہ پینے کے قابل پانی صرف شہر ہی کے اندر ملتا ہے ۔ مگر بایں ہمہ اس سلطنت کو بھی چراغ سحری ہی سمجھنا چاہیئے ۔ کیونکہ شہنشاہ مغل نے قلعہ پرینڈا پر جسے اس ملک کا دروازہ سمجھنا چاہیئے اور بیدر پر جو ایک مستحکم اور خوبصورت شہر ہے اور دوسرے بڑے مقامات پر قبضہ کرلیا ہے ۔ اور ان سب سے بڑھ کر یہ امر ہے کہ بادشاہ لاولد مرگیا ہے اُس کی بیگم نے ۔ جو شاہ گولکنڈا کی بہن ہے ایک لڑکے کو جو اپنا متبنٰی بناکر پرورش کیا تھا اُس نے اُس کا یہ اجر دیا ہے کہ ابھی چند روز ہوئے یہ شاہزادی حج کرکے واپس آئی تو اُس سے سرد مہری اور حقارت کے ساتھ پیش آیا ۔ اور یہ بہانہ بنایا کہ ڈچوں کے جہاز میں (جس پر وہ سوار ہوکر مکہ کو گئی تھی) اُس کا رویہ اُس کے رتبہ اور مستورات کی حالت کے مناسب نہ تھا بلکہ یہاں تک کہا کہ دو تین جہازیوں سے (جو اپنے جہاز سے علیحدہ ہوکر مکہ تک اُس کے ساتھ گئے تھے) ناجائز تعلق رکھتی تھی[۱]۔

---

[۱] گولکنڈا اور بیجاپور کے بادشاہوں کا حسب و نسب جس طرح پر برنیر نے بیان کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے اصل بات یہ ہے کہ یہ بادشاہ راجہ رام راج کے غلام نہ تھے بلکہ بہمنیہ خاندان کے بادشاہوں کے غلام تھے ۔ چونکہ بہمنیہ خاندان کا ذکر لکھے بغیر یہ مضمون مکمل نہیں ہوسکتا اس لئے پہلے ہم کچھ اسی کا حال لکھیں گے اور بعد ازاں اُن کا ۔

پس واضح ہو کہ سلطنت بہمنیہ کا بانی حسن نامی ابتدا میں ایک گمنام اور ایسا مفلس شخص تھا جو فخرالدین جونا المشہور محمد سلطان شاہ تغلق بادشاہ دہلی کے ایک نجومی برہمن کے پاس کہیں سے آکر نوکر ہوگیا تھا ۔ اور دہلی کے پاس جو کچھ اُس کی زمین تھی اُس میں کاشت کاری کیا کرتا تھا اس جوتشی کا نام تاریخ فرشتہ میں کانکو بہمن لکھا ہے ۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کے لوما رو مسلمان صحیح لفظ کانکیج

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ برہمن کی جگہ اس کو کانکو بہمن کہتے ہوں گے۔ اتفاقاً حسن مذکور کو اپنے مالک کی اس زمین میں ہل چلاتے ہوئے کچھ دفینہ مل گیا جو اس نے اپنے آقا کی خدمت میں بے کم و کاست حاضر کر دیا۔ اس ایمانداری کے باعث سے وہ جوتشی اس کو اس قدر چاہنے لگا کہ تعریف و توصیف کر کے محمد شاہ کی سرکار میں نوکر کرا دیا۔ اب حسن نے یہ ایک اور حق شناسی کی کہ بادشاہ کا ملازم ہو کر جو کسی قدر عروج پایا تو مُہر میں اپنا نام ہی حسن کانکو بہمن کندہ کرا لیا۔ جب محمد شاہ تغلق نے دیوگڈھ واقع دکن کا نام دولت آباد رکھکر اُس کو ہندوستان کا دارالسلطنت بنانا چاہا تو یہ شخص بھی شُتل اور ماتحت سرداروں کے قتلغ خاں اور ملک لاچین اُس کے ناتبوں کے پاس دیوگڈھ میں تھا اور جب اس بادشاہ کی خبطیانہ اور ظالمانہ حرکتوں سے سلطنت میں خلل پیدا ہوا اور دکن میں بغاوت ہو گئی اور ملک لاچین مارا گیا۔ اور تغلقوں کی حکومت جاتی رہی تو اتفاقات وقت سے ۷۴۸ھ میں یہ شخص دکن کا بادشاہ بن بیٹھا۔ اور اپنے پہلے نام اور لقب پر علاءالدین کا لفظ بڑھا کر علاؤالدین حسن کانکو بہمن کہلانے لگا۔ حسن آباد گلبرگہ اور احمد آباد بیدر (بدر) اس خاندان کے دارالحکومت تھے۔ اور اس گھرانے کے سترہ بادشاہ ایک سو ستتر برس تک ممالک دکن کے فرماں روا رہے۔ گول کنڈا اور بیجا پور کے سوا ملک برار و خاندیس وغیرہ بھی اسی سلطنت میں داخل تھے۔

نظام شاہ بہمنی بارھویں بادشاہ سے لے کر اس خاندان کے اخیر شخص ولی اللہ شاہ بہمنی تک بادشاہی کا تو ایک نام ہی نام تھا۔ کیونکہ امرائے سلطنت اپنے اپنے متعلقہ صوبوں میں خود مختارانہ حکومتیں کرتے تھے۔ مگر آخر کار ۹۳۵ھ میں اُنھوں نے اُس نام کو بھی مٹا ڈالا۔ اور بیجا پور۔ گول کنڈا۔ برار۔ خاندیس وغیرہ میں خود اپنے اپنے نام سے جدا جدا بادشاہتیں قائم کر لیں۔ چونکہ اکبر کے وقت سے شاہجہاں کے زمانہ تک خاندیس و برار وغیرہ کی حکومتیں سب دہلی کی شہنشاہی میں جذب ہو چکی تھیں۔ اس لئے ہم اُن کا ذکر قلم انداز کرتے ہیں اور خاندان گول کنڈا اور بیجا پور کا حال لکھتے ہیں۔

گولکنڈا کے خاندان کا بانی سلطان قلی نامی ہمدان کا رہنے والا ایک ترک اور محمود شاہ بہمنی کا غلام تھا۔ اور رفتہ رفتہ ایسا بڑھا کہ اس سلطنت کا وزیر ہو گیا۔ قطب الملک کا خطاب پایا۔ گول کنڈا کا "طرف دار" یعنی صوبہ دار بنا اور آخر کار (جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے) ۹۳۵ھ میں خود اپنے ہی نام سے سکہ و خطبہ جاری کر کے قطب شاہ بن بیٹھا۔ اس کی نسل کے چار بادشاہ ایک سو چھبیس برس تک حکومت کرتے رہے۔ لیکن جب اس خاندان کا اخیر فرماں روا عبداللہ

قطب شاہ ساٹھ برس بادشاہت کرکے مرگیا تو اُس کا داماد سید ابوالحسن معروف تاناشاہ اُس کا جانشین ہوا۔ ڈاکٹر برنیر اپنے بیان مندرجہ متن میں غفلت اور سستی کا اشارہ اسی کی طرف کرتا ہے۔ اور فی الواقع یہ بادشاہ اپنے وقت کا راجہ اندر اور گویا عیش و عشرت کا پُتلا تھا۔ جس کے عیش و نشاط اور لطافت و نفاست مزاج کے فسانے اب تک زبان زد خلائق اور ضرب المثل چلے آتے ہیں چونکہ یہ اس قدر سست اور کاہل مزاج تھا کہ اپنی پندرہ برس کی حکومت کے زمانہ میں شہر حیدرآباد اور قلعہ گولکنڈا یا اپنے باغ میں جانے آنے کے سوا اس سے اپنے ملک کو کبھی سیر و شکار کی خاطر بھی جا کر نہ دیکھا تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے سابقہ ہم جنسوں کی طرح آخر یہ بادشاہی بھی دہلی کی اعلیٰ سلطنت کا ایک جزو ہو گئی۔ یعنی جفاکش اور اولوالعزم شہنشاہ اورنگ زیب نے اپنی عمر کے بہترویں سال مطابق ۱۰۹۶ھ میں شہر حیدرآباد کو اور بعد ازاں ۱۰۹۸ھ میں قلعہ گولکنڈا کو مدت کے محاصرے اور سخت حملوں کے بعد تاناشاہ سے چھین لیا۔ اور اس کی پچاس ہزار روپیہ سالانہ پنشن مقرر کرکے قلعہ دولت آباد میں نظر بند کر دیا۔

اسی طرح بیجاپور کی سلطنت کا بانی گرجستان کا رہنے والا محمد یوسف نام ایک دوسرا غلام تھا جس کو بعض خوشامدی مورخوں نے سلاطین آل عثمان یعنی روم کے ترک بادشاہوں کی نسل میں جا ملایا ہے اس کو شہاب الدین محمود بہمنی نے خریدا تھا جو خوش قسمتی سے رفتہ رفتہ بیجاپور کا طرف دار اور آخرکار خود سر ہو کر عادل خاں سے عادل شاہ بن گیا۔ اسی کے پوتے ابراہیم عادل شاہ کی کتاب نورس پر ملا نورالدین ظہوری ترشیزی نے اپنی وہ فصیح و بلیغ نثریں جو خوبی و لطافتِ انشا کی وجہ سے ایران و ہندوستان میں اب تک متداول و مشہور اور سہ نثر ظہوری کے نام سے معروف ہیں لکھی تھیں۔ یہ سلطنت بھی ۱۰۹۷ھ میں اورنگ زیب نے چھین لی۔ اور سکندر عادل شاہ کو جو ایک لڑکا تھا اپنے امیروں کے ذیل میں داخل کرکے اور خان کا خطاب دے کر لاکھ روپیہ سالانہ گذارہ مقرر کر دیا۔ اگرچہ یہ دونوں گھرانے اخیر تک بادشاہ کہلاتے اور اپنے آپ کو خودمختار سمجھتے تھے۔ مگر سلاطین مغلیہ نہ تو ان کو خودمختار ہی مانتے تھے۔ اور نہ ان کے لقب شاہی کو ہی تسلیم کرتے تھے اور ہمیشہ پیش کشوں اور نذرانوں کے متقاضی اور طلبگار اور وقت کے دستور کے موافق جائز و ناجائز حیلہ سے ان کو پامال کرنے کے لئے آمادہ اور تیار رہتے تھے۔ اور خط و کتابت میں ان کے وہی اصلی خطاب قطب الملک اور عادل خاں اور الفاظ والقاب اپنے نوکروں اور صوبہ داروں کی طرح لکھا کرتے تھے۔ چنانچہ ان دونوں کے القابوں کے نمونے یہ ہیں۔

عنوان فرمان از طرف شاہجہاں بنام قطب شاہ ۱۰۶۶ھ

" ایالت و امارت پناہ ارادت وعقیدت دستگاہ عمدۃ الماجد کرام سلالۃ اکارم عظام نقاوۃ خاندان عز و علا صفاوۃ دودمان مجد و اعتلا زبدۃ مخلصان صلاح اندیش خلاصۃ مختصان سعادت کیش مورد الطاف شاہنشاہی مصدر آیات خیر خواہی جوہر مراۃ صفا وصفوت فروغ ناصیۂ دولت ورفعت سزاوار مراحم بیکران المخصوص بعنایت الملک المنان قطب الملک مشمول عنایات پادشاہانہ بودہ بداند "

ایضاً بنام عادل شاہ بسنہ مذکور

" ایالت و شوکت پناہ عدالت ونصفت دستگاہ زبدۂ ارباب دول عمدۃ اصحاب مال خلاصہ مریدان عادل خاں بوفور عنایات بادشاہانہ مفتخر ومستظہر بودہ بداند "

بہمینہ خاندان کے غلام اور متوسل بادشاہ (جیساکہ برنیر نے لکھا ہے) سب شیعہ نہ تھے۔ مگر ہاں گولکنڈا اور بیجاپور والے ضرور شیعہ تھے۔ چنانچہ سلاطین مغلیہ ان سے کاوش کرنے کے لئے کبھی کبھی کسی مذہبی بحث کو بھی حیلہ بنا لیتے تھے مگر آخری وجہ گولکنڈا اور بیجاپور کی بربادی کے لئے یہ تھی کہ یہ لوگ سیواجی کے بیٹے سنبھاجی کو مدد دیتے تھے۔ اور اورنگ زیب نے بذات خود دکن میں پہنچ کر گولکنڈا بیجاپور۔ اور سنبھاجی تینوں پر ایک ہی زمانہ میں فوج کشی شروع کی تھی۔

راجہ رام راج کا ذکر جس طرح پر ڈاکٹر برنیر نے لکھا ہے وہ بھی درست نہیں ہے بلکہ (بقول سر سونٹ الفنسٹن صاحب) صحیح حال اُس کا یوں ہے کہ وہ خاص دکن میں (یعنی مدراس کی طرف) شہر بیجے نگر میں ایک بہت ہی زبردست راجہ تھا۔ بہمینہ خاندان کے سب غلام بادشاہوں نے جن کا ذکر اوپر ہوچکا ہے متفق ہو کر اُس کا ملک چھیننے کا ارادہ کیا اور پچیسویں جنوری ۱۵۶۵ء مطابق جمادی الثانی ۹۷۲ھ ہجری کو دریائے کرشنا کے کنارے تالی کوٹ کے قریب جانبین سے بڑے اہتمام اور جوش و خروش کے ساتھ ایک نہایت خونریز لڑائی ہوئی۔ جس میں یہ ضعیف العمر اور بہادر راجہ مغلوب ہو کر پکڑا اور مارا گیا۔ مگر اصل مطلب کے لحاظ سے نتیجہ اس کا فتحمندوں کے حق میں چنداں مفید نہ ہوا۔ کیونکہ ملک مفتوحہ کی تقسیم پر باہم جھگڑے پیدا ہو گئے۔ اور اس وجہ سے اس راج کے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر وہاں کے "پالیگار" یعنی زمیندار ہی اپنے اپنے علاقوں میں راجہ بن گئے۔ اور رام راج کے بھائی نے بیجے نگر سے اپنی دارالریاست کو مشرق کی جانب منتقل کیا۔ اور آخر چندر گڑھی کو اپنی ریاست گاہ بنایا۔ جو مدراس سے شمال مغرب کی طرف سترہ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

اور دکن کا وہ قطع جو انگریزوں نے اپنے کارخانہ کے لئے پہلے پہل مدراس میں لے کر آخر کار

سیواجی کی خودسری

سیواجی جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے اس سلطنت کی یہ حالت دیکھکر بہت سے قلعوں پر جو اکثر پہاڑوں کے اندر ہیں قابض ہو گیا ہے۔ اور خودسر بادشاہ کی طرح جو چاہتا ہے سو کرتا ہے۔ اور شہنشاہ مغل اور شاہ بیجاپور جو کبھی اُس کو دھمکاتے ہیں تو اُن کی باتوں پر ہنس دیتا ہے۔ اور سورت سے لے کر گوا کے دروازے تک ملک تاخت وتاراج کرتا رہتا ہے۔ اور اگرچہ وقتاً فوقتاً بیجاپور کی ریاست کو سیواجی بڑے بڑے صدمے پہنچاتا رہتا ہے۔ مگر اس میں بھی شک نہیں کہ یہ جری شخص عین وقت پر اُس کے کام بھی آجاتا ہے کیونکہ اورنگ زیب کو ہمیشہ اسی کی تاخت وتاراج کی فکر ہے۔ اور اُس کی فوجیں ہمیشہ اس کے پیچھے لگی رہتی ہیں۔ اور اس طرح بیجاپور کا پیچھا چھوٹا رہتا ہے۔ اور سب سے مقدم کام یہی سمجھا جاتا ہے کہ سیواجی کی جڑ کس طرح اکھاڑی جائے۔ سیواجی کو سورت میں جو کامیابی ہوئی ناظرین اُس کو پڑھ چکے ہیں۔ اس کے بعد اس نے جزیرہ بارڈیز پر جو گوا کے نزدیک پرتگیزوں کی ایک بستی ہے۔ قبضہ کر لیا ہے[۱]۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ

قلعہ سینٹ جارج تعمیر کیا اسی شخص کی اولاد کے ایک راجہ سے ۱۶۴۰ء میں لیا تھا۔ س م ح

(ماخوذ از تاریخ فرشتہ۔ عالمگیرنامہ۔ مآثر عالمگیری۔ سیر المتاخرین۔ تاریخ۔ الفنسٹن۔ تاریخ خفی ذکاءاللہ)

[۱] سیواجی کا مختصر حال جو ڈاکٹر برنیر نے لکھا ہے اس کو پڑھکر خواہ مخواہ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس عجیب [بقیہ حاشیہ] سیواجی یہ شخص کا حسب ونسب کیا تھا۔ اور اس نے اس قدر اقتدار کس طرح پایا۔ اور اس کے متعلق جو واقعات برنیر نے لکھے ہیں اُن کی مفصل اور صحیح روداد کیا تھی۔

پس واضح ہو کہ انسائیکلوپیڈیا برطانیہ میں اس کو غیر صحیح النسب اودے پور کے رانا کی نسل سے۔ یعنی چھتری[۲] لکھا ہے۔ مگر مسٹر مونٹ الفنسٹن صاحب سابق گورنر بمبئی جن کی تحقیق اُدھر کی قوموں وغیرہ کے بارہ میں زیادہ بھروسہ کے قابل ہے اپنی مشہور تاریخ ہندوستان میں سیواجی کے اُن تمام ہم قوم لوگوں کو جو مہاراشٹر[۳] دیس کی سکونت کے باعث مرہٹے کہلاتے عموماً شودر بتاتے ہیں۔ اور سیواجی بھی حسب

[۳] ہندوؤں کی حکومت کے قدیم زمانہ میں مہاراشٹر کا اطلاق ملک کے اُس وسیع قطعہ پر ہوتا تھا جو دریائے نربدا کے جنوب کی طرف فی زمانہ چیف کمشنری ناگپور اور ریاست حیدرآباد دکن اور پریزیڈنسی بمبئی کی مختلف حکومتوں میں منقسم ہے۔ چنانچہ خاندیس و برار و کوکن وغیرہ کے علاقے جو علی الترتیب مذکورہ ریاستوں میں واقع ہیں۔ مہاراشٹر کے عام لفظ میں داخل تھے۔ س م ح

بقیہ حاشیہ سیواجی

ولنسب کی حقیقت کو اس طولانی تمہید سے بیان کرتے ہیں کہ گولکنڈا۔ بیجاپور اور احمد نگر کے مسلمان بادشاہوں کے وقت میں مرہٹوں کو قلعوں وغیرہ کے پیدل سپاہیوں میں نوکریاں ملا کرتی تھیں۔ مگر جب معلوم ہوا کہ جنگی سواروں میں بھی اچھی خدمت دے سکتے ہیں تو رسالوں میں بھرتی ہونے لگے اور ان میں سے ایسے لوگ جو ہمارے ملک کے دیہات میں چودھری اور نمبردار وغیرہ کہلاتے ہیں اور اس ملک میں اُن کے لقب پٹیل اور دیس کمھ وغیرہ ہوتے تھے موروثی عزت کے باعث سے رسالداریوں اور جمعداریوں کے عہدوں تک مامور ہو جاتے تھے منجملہ ان کے اگرچہ بعضوں نے قدر و منزلت بڑھانے کو راجپوت ہونے کا دعویٰ کیا ہے مگر الفنسٹن صاحب کی تحقیق میں قومیت کی حیثیت سے سارے ہی شودر تھے اور سولھویں صدی عیسوی سے پہلے نہ تو مرہٹے بطور ایک قوم ہی کے مشہور تھے۔ اور نہ ان میں کوئی ایسا سردار تھا جو پولٹیکل لحاظ سے نامور اور ذی اقتدار گنا جاتا ہو۔ مگر اس صدی کے آغاز میں اُن کے اقبال کا زمانہ اس طرح شروع ہوا۔ کہ ملک عنبر نے (جو احمد نگر والوں کے ہاں ایک مشہور اور نہایت زبردست امیر تھا) مرہٹوں کو اپنے سواروں میں زیادہ بھرتی کیا۔ چنانچہ اُس کی فوج میں لکھجا نامی ایک سردار نے (جس کو بطور اعزازی لقب کے جادوراؤ کہتے تھے) ایسی ترقی پائی کہ دس ہزار سواروں کی سرداری کے منصب پر سرفراز ہو گیا اور یہاں تک اقتدار حاصل کیا کہ شاہجہاں اور احمد نگر والوں کی لڑائی کے زمانہ میں جب اس نے شاہجہاں سے سازش اور موافقت کر لی تو ملک عنبر کی تقدیر الٹ گئی اور لڑائی ہار گیا الفنسٹن صاحب خیال کرتے ہیں کہ مرہٹوں میں اگر کسی کو راجپوت ہونے کا دعویٰ پہنچتا ہو تو البتہ یہ دعویٰ اسی کے گھرانے کو شایاں و سزاوار ہو سکتا تھا۔

کیونکہ دیوگڈھ (دولت آباد) کا وہ راجہ جو دکھنی راجاؤں میں سب سے بڑا تھا۔ اور جس سے مسلمانوں نے ملک دکن کو فتح کیا تھا۔ جادو نبسی ہی کہلاتا تھا اس لئے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ شخص غالباً دیوگڈھ کے کسی قریب ضلع کا دیس کھ اور جادو نبسی راجپوتوں کی نسل سے ہونے کے باعث جادوراؤ کہلاتا ہو گا۔ المختصر مالوجی بھونسلا سیواجی کا دادا اس کے متوسلوں میں ایک ایسا شخص تھا جو اگرچہ کسی قدر خاندانی اور ذی عزت گنا جاتا تھا مگر حیثیت اُس کی اس سے زیادہ نہ تھی کہ چند خود اسپہ سوار وں سمیت اس کے ماتحتوں میں تھا۔ قضائے کردگار ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ جادوراؤ کے یہاں کسی تہوار وغیرہ کی تقریب میں بہت سے لوگ جمع ہوئے۔ جس میں مالوجی بھی اپنے پانچ برس کے بیٹے ساہو کو ساتھ لے کر آیا تھا۔ اس محفل میں جہاں حسب معمول ہنسی خوشی کی باتیں ہو رہی تھیں اتفاقاً جادوراؤ

بقیہ حاشیہ سیواجی ·

نے ساہوجی اور اپنی سہ سالہ لڑکی دونوں کو زانو پر بٹھا کر ہنسی اور چہل کے طور پر کہیں یہ بات کہدی کہ یہ دونوں ایک تو بنانئی بنانے کے قابل ہیں۔ جادوراؤ کا یہ کہنا تھا کہ مالوجی فوراً بول اٹھا کہ ساری سبھا گواہ رہے میرے بیٹے کا رشتہ جادوراؤجی کی لڑکی سے ہوگیا؛ اگرچہ جادوراؤ اپنے خاندان و منصب کے غرور کے باعث مالوجی کے اس بڑے بول سے ایسا ناراض ہوا کہ دونوں کے باہم بدمزگی ہوگئی مگر مالوجی برابر اس سگائی کا دعویٰ کئے جاتا تھا۔ اور چونکہ تھوڑے ہی عرصہ میں خوش قسمتی سے یہ بھی ایسا بڑھا کہ اُسی ریاست میں پانچ ہزار سواروں کی رسالداری کے منصب پر سرفراز اور صاحب جمعیت ہوگیا۔ اور مضافات ملک کوکن میں بمقام پونا۔ (جواب پریزیڈنسی بمبئی میں ایک مشہور شہر ہے) اس کو ایک بڑی سی جاگیر مل گئی جس میں چاکند اور سوپا کے دو قلعے بھی شامل تھے تو آخرکار لکھوجی جادوراؤ کو بھی یہ خواہ مخواہ کی سگائی کا دعویٰ ماننا ہی پڑا۔ اور ساہوجی کی شادی اُس کی بیٹی سے ہوگئی۔

جس سے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ ایک ونکاجی دوسرا سیواجی (جو ماہ مئی ۱۶۲۷ء میں پیدا ہوا)

جب شاہجہاں نے والی بیجاپور کے اتفاق سے احمد نگر کی حکومت کو پامال کرکے ملک کو آپس میں بانٹ لیا اور منجملہ اس کے کوکن کا علاقہ بیجاپور کے حصہ میں آیا تو ساہوجی نے والی بیجاپور کی نوکری اختیار کرلی۔ اور اُس کی جاگیر واقع پونا بھی جو بیجاپور کے حصہ میں آگئی تھی بدستور اس کے قبضہ میں رہی اور وہ بیجاپور کی طرف سے کرناٹک میں ملک گیری کرتا رہا جس کے باعث سے میسور کے نزدیک بھی اُس کو ایک بہت بڑی جاگیر حاصل ہوئی جس میں بنگلور وغیرہ بڑے بڑے شہر داخل تھے۔

الغرض ونکاجی تو اپنے باپ کے ساتھ کرناٹک میں رہتا تھا۔ اور خردسال سیواجی پونا میں۔

۔اُس زمانہ میں مرہٹے سردار خود تو ناخواندہ ہوتے تھے۔ اور اُن کے کاروبار کا انتظام اُن اہل قلم برہمنوں کے اختیار میں ہوتا تھا۔ جو دکن کے مسلمان بادشاہوں کے عہد میں بڑے بڑے کاسآد عہدوں پر مامور ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ ساہوجی کی اس جاگیر کا اہتمام اور سیواجی کی سرپرستی داداجی کنڈو نامی ایک برہمن کو سپرد تھی۔ اُس وقت کے نوجوان مرہٹوں کو شہسواری، شکار بازی۔ اور نیزہ بازی وغیرہ سپاہیانہ ریاضتوں کے سیکھنے کا شوق ہوتا تھا۔ اور چونکہ پونا ایسی جگہ ہے کہ وہاں میدان اور پہاڑی ملک آپس میں ملتے ہیں تو ان سپاہیانہ شوق اور سیر و شکار کے سامانوں کے باعث سے سیواجی کے بڑے رفیق ابتدا ہی سے ایسے لوگ ہوتے جو یا تو اُس کے باپ کے سواروں میں بھرتی تھے یا گھاٹوں (یعنی کوہستان سیادری کے سلسلوں کے) پاس پڑوس

بقیہ حاشیہ سیواجی۔
کے رہنے والے ڈاکو اور لٹیرے تھے۔ اور کہتے ہیں کہ کبھی کبھی ایسا بھی اتفاق ہوا کہ بعض ڈکیتی کی وارداتوں میں مخفی طور سے یہ اُن کا شریک بھی ہوتا رہا۔ غرضکہ ان جفاکش اور مضبوط آدمیوں کی صحبت سے اور اُن دیہاتی راگوں (یعنی ساکھوں) کے سننے سے جن میں اس ملک کے بعض سورما لوگوں کی کہانیاں گائی جاتی تھیں اُس کی طبیعت میں بڑے بڑے خیال پیدا ہوتے۔ اور جب یہ آفت کا پرکالہ سولہ برس کی عمر کو پہنچا تو اپنے اتالیق دادا جی کے قابو سے بھی نکل گیا اور باپ کی جاگیر کے کاروبار میں خواہ مخواہ دخل دینے لگا۔ اور جب تھوڑے عرصہ بعد وہ برہمن بھی مرگیا۔ تو قلعہ چاکنہ پر قلعدار سے مل کر قبضہ کر لیا۔ اور قلعہ سوپا کو چھاپہ مار کر چھین لیا۔ اور وہ جفاکش پہٹے جو پونا کی سمت مغربی کے اُجاڑ علاقہ کے رہنے والے (اور ایک پرانے قصبہ ماہول متصل شولاپور کے قرب و جوار کی سکونت کی مناسبت سے) ماہولی کہلاتے تھے۔ اور بھیل اور کولی اور راموسی وغیرہ لٹیرے لوگوں کو جو پونا کے پاس ملک کوکن کے پہاڑوں اور جنگلوں میں بستے اور مثل اُس کے سب بیجاپور کی رعایا تھے جمع کر کے آس پاس کے ملک کو کہ جہاں کے حالات سے سیر و شکار اور چوریوں ڈکیتیوں کی شرکت اور اُن لٹیروں کی رہنمائی سے یہ بخوبی واقف ہو چکا تھا لوٹنا شروع کیا اور کہیں زور سے کہیں تابعداری سے اور کہیں فریب اور مکاری سے محمد عادل شاہ فرماں روائے بیجاپور کی حکومت کے اخیر زمانہ میں بسبب حاکموں کی غفلت اور ضعف وغیرہ کے علاقہ کوکن کے بہت سے قلعوں پر اپنا دخل کر لیا۔ اور منجملہ انھیں حرکتوں کے ایک حرکت یہ بھی تھی کہ اپنے مقاصد کا مخالف سمجھ کر ایک راجہ کو جو پونا کے جنوب میں اکثر پہاڑی علاقوں پر حکومت رکھتا تھا کسی حکمت سے قتل کرا دیا تھا۔ اور علی عادل شاہ کے ایام خردسالی میں باوجودیکہ اس کا باپ اور بڑا بھائی اُن کے نوکر تھے اور اُس کو ان حرکتوں سے بہت منع کرتے تھے علانیہ باغی ہو کر یہ عجیب داؤں کھیلا کہ ۱۶۵۹ء میں افضل خاں نامی اُن کے ایک بہت بڑے سردار کی خدمت میں جو اس کی سزادہی کے لئے فوج لے کر آیا تھا اور جس کی شجاعت اور زور و قوت سے فی الحقیقت یہ خائف تھا۔ یہ درخواست پیش کی کہ اگر خاں صاحب میرے حال پر ترس کھائیں تو مہربانی فرماکر میرا خوف اور اندیشہ دور کرنے کے لئے ایک جگہ لشکر سے اکیلے ہو کر تشریف لے آئیں اور اسی طرح میں بھی اکیلا ہی حاضر ہو جاتا ہوں اور جب وہ میری معروضات سُن کر تسلی و تشفی فرما دیں گے تو فرماں برداری اور اطاعت سے مجھے کچھ عذر نہیں۔ چنانچہ جب اس قرارداد کے موافق خانصاحب

بقیہ حاشیہ سیواجی ہے

باریک ململ کا جامہ پہنے ہوئے۔ اور صرف شان وزیبائش کے لئے ایک سیف ہاتھ میں اٹھائے اور محض ایک خدمت گار ساتھ لیے ہوئے خراماں خراماں آگے کو بڑھے تو سیواجی بھی قلعہ پرتاب گڑھ سے سہمی صورت بنائے لرزتا کانپتا سامنے سے صرف ایک ہمراہی سمیت نظر آیا۔ اگرچہ ظاہر میں کوئی ہتھیار اُس کے پاس موجود نہ تھا۔ مگر روئی کے دگلے کے نیچے زرہ پہنے اور ایک آب دار تیغہ چھپائے ہوئے اور انگلیوں پر فولادی کانٹے جس کو بگھ نکھ یعنی ناخن شیر کہتے تھے چڑھائے ہوئے تھا۔ افضل خاں نے اُس کو خوف زدہ دیکھکر اظہار عنایت کے لئے بغل گیر ہونے کو جوں ہی ہاتھ پھیلائے تو اُس نے جھپ سے فولادی پنجہ کو جو آستین میں چھپا ہوا تھا بڑے زور سے اُس کے پیٹ میں گڑو دیا۔ اور ہنوز وہ اس حرکت بیجا کے تعجب سے فارغ نہ ہوا تھا کہ بغل سے تیغہ نکال کر کام تمام کیا۔ اور خاں صاحب نے جو پنجہ کھا کر سیف کا وار کیا تھا وہ اس کی زرہ کے باعث سے کارگر نہ ہوا۔ اس کامیابی کے بعد اور اس دشوار گزار پہاڑی ملک میں جس کی حد سمندر تک منتہی ہوتی ہے وہ ایسا زبردست شخص ہو گیا کہ ۱۶۶۲ء تک اُس کے پاس سات ہزار سوار اور پچاس ہزار پیدل کی جمعیت ہو گئی تھی جن کی معاش کا مدار بہ نسبت مقرر تنخواہ کے زیادہ تر لوٹ کھسوٹ پر تھا۔ اور سمندر کے کنارہ تک مع چند بندرگاہوں کے اپنی حکومت کو وسعت دے کر کچھ کچھ مغلیہ سلطنت کے علاقوں واقع دکن میں بھی غارتگری اور دست درازی شروع کردی تھی اس لئے امیرالامرا شائستہ خاں صوبہ دار نے عالمگیر کے دوسرے سال جلوس میں دولت آباد سے فوج کشی کر کے قصبہ پونا اور چاکنہ کے مضبوط قلعہ کو سیواجی سے چھین لیا۔ مگر اس کے ناہموار اور پہاڑی ملک کی دشوار گذاری اور مرہٹوں کی سخت جفاکشی کی عادت سے شائستہ خاں کو حسب دل خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ سیواجی کے اس ابتدائی زمانہ میں اُس کے گروہ کے لوگ اور بھی زیادہ جفاکش ہوں گے مگر اس کے مرجانے کے بعد بھی مرہٹوں کا یہ حال تھا کہ جب اورنگ زیب اپنے بڑھاپے کے دنوں میں گولکنڈا اور بیجاپور کو نیست و نابود کر کے مرہٹوں کے پیچھے دوڑ دھوپ کر رہا تھا تو الفنسٹن صاحب نے اس ہمت بڈھے بادشاہ کی ناکامی کی وجوہات کے ذکر میں مرہٹوں کی عادت جفاکشی کا بیان اس طرح پر لکھا ہے کہ " اُن کی سواری میں چالاک اور دوردم گھوڑے ہوتے تھے جن پر بجائے زین کے کمبل کے تہرو پر صرف ایک گدی سی کس لیتے تھے اور توڑہ دار بندوق اور ڈھال تلوار کے

بقیہ حاشیہ سیواجی :۔
علاوہ عموماً ایک لمبا برچھا رکھتے تھے خوراک و لباس میں اسی پر قناعت تھی کہ جوار کی ٹکیہ اور کبھی پیاز اُن کی معمولی غذا تھی اور لباس میں ایک پگڑی چست جانگیہ اور ایک چھوٹی سی کرتی: سوائے سرداروں کے خیمہ کسی کے پاس نہ ہوتا تھا اور لڑائی بھڑائی کے موقعوں میں مرہٹے سوار اپنے برچھوں اور بھالوں کو زمین میں گاڑ کر گھوڑوں کی لگام اپنے اپنے بازو سے باندھکر زمین پر پڑ رہا کرتے تھے۔ غرض کہ اس شعر کے مصداق تھے۔ شعر

" لنگے زیر لنگے بالا نے غم دزد نے غم کالا "

(ایک لنگی نیچے ایک لنگی اوپر، نہ چور کا غم نہ اسباب کی فکر) نہ باربرداری کی ضرورت نہ کمسریٹ کی حاجت۔ اور ان کے مقابلہ میں مغلیہ فوجوں کی یہ صورت تھی کہ اگرچہ بہادری اور سپاہگری کی تو ان میں بھی کچھ کمی نہ تھی مگر عموماً یہ خرابی پھیلی ہوئی تھی کہ امیر سے لے کر سپاہی تک ساز و سامان بہت رکھتے تھے یہاں تک کہ ان کے لشکروں میں اہل خدمت اور اہل بازار وغیرہ کی یہ بھیڑ بھاڑ ہوتی تھی کہ بھیر کے لوگ سپاہیوں سے دس گنے ہوجاتے تھے جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ رسد اور باربرداری دونوں کی نہایت ہی غیر ضروری احتیاج تھی تھی اور اس کے باعث سے کوچ و مقام میں وہ چستی و چالاکی جو مرہٹوں جیسے جفاکش اور سبک بار دشمنوں کے مغلوب کرنے کیلئے خصوصاً ایسے پہاڑی ملک میں ضروری تھی۔ ان سے نہیں ہو سکتی تھی۔ بلکہ جہاں کہیں ان کا لشکر جاکر ٹھہرتا تھا رسد باربرداری کی ضرورتوں کی وجہ سے وہاں کے باشندوں پر ایک تباہی آن پڑتی تھی۔

غرضکہ جب شائستہ خاں کو کامیابی نہ ہوئی تو مہاراجہ جسونت سنگھ راٹھور صوبہ دار گجرات کو بھی مع اس کی کل فوج کے مدد کے لئے بھیجا گیا۔ اگرچہ یہ بھی مدت تک مامور رہا مگر کوئی کارنمایاں اس سے بھی ظہور میں نہ آیا۔ بلکہ اورنگ زیب کے جلوس کے چھٹے سال ۱۰۷۳ھ میں جب کہ شائستہ خاں پونا میں اُترا ہوا تھا سیواجی نے یہاں تک جسارت کی کہ ایک روز سرشام اپنے پہاڑی قلعہ سنگم نیر سے جو پونا سے بارہ میل کے فاصلہ پر تھا روانہ ہوا۔ اور راستہ میں تھوڑے تھوڑے سپاہی اس خیال سے چھوڑتا آیا کہ اگر ضرورت پڑے تو کام آئیں اور خود صرف پچیس ماولی مرہٹوں کو ساتھ لیکر ایک برات میں جو حسب اتفاق پونا کو جاتی تھی مل کر شہر میں داخل ہوگیا اور اس طرح پر شائستہ خاں کے چوکی پہروں کی مزاحمت سے بچ نکلا۔ چونکہ شائستہ خاں

بقیہ حاشیہ سیواجی :-

اسی مکان میں رہتا تھا جس میں سیواجی نے پرورش پائی تھی - اور اس وجہ سے اس کو اس مکان کی کل حالت بخوبی معلوم تھی اس لئے اس کے ایک دروازہ سے جو پشت مکان کی طرف تھا - چپکے سے شائستہ خاں کی خواب گاہ میں جا گھسا اور یکا یک اس طرح سے حملہ کیا کہ اس ہڑبڑاہٹ میں ایک کھڑکی کے راستہ نیچے کے مکان کی طرف کود کر بھاگتے ہوئے شائستہ خاں کی تو ایک انگلی کٹ گئی اور ابوالفتح اس کا بیٹا مقابلہ میں مارا گیا - چونکہ سیواجی اپنے ارادہ کے موافق شائستہ خاں کو قتل یا گرفتار نہ کر سکا تو قبل اس کے کہ باہر کے پہرہ والے اس حادثہ سے خبردار ہوں پھرتی سے باہر نکل آیا - اور جوں جوں آگے بڑھتا گیا تو وہ لوگ جو راستہ میں بٹھائے ہوئے تھے ساتھ لیتے گئے اور صحیح و سلامت اپنے قلعہ میں جا داخل ہوا اور اس کامیابی کی اس قدر خوشی منائی گئی کہ چراغوں اور مشعلوں کی روشنی پادشاہی فوج کو پونا میں بخوبی دکھائی دیتی تھی سیواجی کے اس کارنامہ سے اس کے اور اس کی قوم کے حق میں ایک نہایت ہی مفید اثر پیدا ہوا - بادشاہ نے اس حادثہ کو امیرالامرا کی غفلت پر محمول کیا اور میر جملہ کی وفات کے باعث سے بنگالہ کی صوبہ داری پر بدل دیا اور اس کی بجائے شاہزادہ معظم کو دکن کا صوبہ دار مقرر کر کے راجہ جے سنگھ کچھواہہ کو جو لیاقت اور دانائی میں مشہور اور ایک بڑا رکن سلطنت تھا راجہ جسونت سنگھ کی جگہ جس کی نسبت سیواجی کے ساتھ سازش رکھنے کا شبہ تھا اپنے جلوس کے ساتویں سال ۱۰۷۴ھ میں معہ دلیر خاں و راجہ رائے سنگھ سودیہ اور اور دس بارہ ہندو اور مسلمان بڑے بڑے سرداروں کے چودہ ہزار سواروں کی جمعیت سے روانہ کیا - خلاصہ یہ کہ راجہ جے سنگھ نے اورنگ آباد پہنچ کر اول شاہزادہ سے ملازمت حاصل کی - اور بعد ازاں پونا میں جا کر راجہ جسونت سنگھ سے مہم کا چارج لیا اور قلعہ رودرمال وغیرہ خصوصاً سیواجی کے کلاں تر قلعہ پورن دھر کو کہ جس میں اس کا بہت سا ساز و سامان اور چار ہزار لڑاکے سپاہی اور تین ہزار اور مرد و عورت اور بعض عزیز و اقارب اور کتنے ہی کارآزمودہ افسر موجود تھے زور شور سے دلیر خاں اور کیرت سنگھ نے گھیر لیا سیواجی جو اس وقت قلعہ راج گڈھ میں معہ اہل و عیال خود موقعہ جنگ سے قریب ہی تھا حملہ آوروں کی شجاعت و لیاقت کے باعث پورن دھر کے بچاؤ سے مایوس ہو گیا اور مجبور ہو کر عجز و نیاز کا اظہار شروع کیا جس کے جواب میں راجہ نے یہ کہلا بھیجا کہ اگر مجرموں کی طرح ہتھیار کھول کر حاضر ہو جائے تو اس کی اطاعت قبول کی جائے گی غرض کہ جب وہ ۱۰۷۵ھ عالمگیر کے آٹھویں سال جلوس میں

بقیہ حاشیہ سیواجی۔

اس طرح حاضر ہوگیا تو راجہ نے اُس کی بہت خاطر کی اور اول قلعہ پورن دھر کو جو قریب الفتح ہو گیا تھا معہ کل سامان جنگ وغیرہ اُس سے لے کر آخر ان شرائط پر صلح کر لی کہ ملک کوکن کے پینتیس قلعوں میں سے جو اس وقت اُس کے قبضہ میں تھے تیئیس قلعے معہ بندر چیول لہ علاقہ جات جمعی دس لاکھ ہن[1] کے سرکار پادشاہی میں آ گئے۔ اور باقی ماندہ بارہ قلعے معہ علاقہ جمعی ایک لاکھ ہن سیواجی کے پاس چھوڑے گئے اور اُس کے ہشت سالہ بیٹے سنبھاجی کے نام پنج ہزاری پنج ہزار سوار کا منصب عطا ہوگیا اور سیواجی نے یہ بھی قبول کر لیا کہ اس نواح میں اگر کوئی مہم پیش آئے گی تو بذات خود پادشاہی فوج میں شامل ہو کر خدمت کروں گا۔ غرض کہ جب شرطیں طے ہو چکیں اور سنبھاجی کبھی راجہ کے لشکر میں پہنچ گیا تو سیواجی کو جو بغیر ہتھیار باندھے دربار میں آیا کرتا تھا راجہ جے سنگھ نے اپنے سامنے ہتھیار بندھوا دئے۔ اور خلعت دے کر عزت کے ساتھ رخصت کر دیا۔ اور چونکہ راجہ کو اسی جگہ سے بیجاپور پر فوج کشی کرنے کا حکم آ گیا تھا۔ اس لئے سیواجی بذات خود معہ پندرہ سو سواروں اور سات ہزار پیادوں کے اس مہم میں کام دیتا رہا اور اگرچہ اس سے کچھ عرصہ بعد اُس نے اول سنبھاجی کو عالمگیر کے دربار میں بھیج دیا اور راجہ

---

[1] لفظ ہن پر حاشیہ در حاشیہ۔ ہندوستان کے ساحل مغربی و جنوبی پر ملک کا وہ تنگ اور طولانی قطعہ جس کو کنہڑ کہا جاتا ہے اور شمال کی طرف علاقہ کوکن سے شروع ہو کر جنوب کی سمت میسور کے قریب ختم ہوتا ہے وہاں کی زبان میں جسے کنہڑی کہتے ہیں ہن یا ہولنو سونے کو کہتے ہیں اور اس جگہ اس سے سونے کا سکہ مراد ہے۔ اور تعجب نہیں ہے کہ فارسی اور بھاشا میں جو سین اور ہا و ہونز کہیں کہیں (مثل آما سیدن و آما ہیدن۔ سوماہ و ماس۔ وده۔ ودس باہور دسور۔ ولپوس ولپوہ و بیاس و بیاہ وغیرہ) باہم بدل جایا کرتے ہیں اسی طرح اس لفظ میں سونے کا سین ہولنو کی ہتے سے بدل گیا ہو۔ اگرچہ یہ امر تحقیق شدہ ہے کہ بہت قدیم زمانہ سے ممالک دکن میں سکہ رائج الوقت سونے ہی کا ہوتا تھا۔ لیکن ٹھیک طور پر یہ بات معلوم نہیں ہوتی کہ بدھ مت والوں کے زمانہ میں یا اُس سے پہلے اُن سکوں کا عام نام کیا تھا۔ مگر البتہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چوتھی صدی عیسوی میں اُس خاندان کے راجاؤں نے جن کو ڈاکٹر ہنڈی صاحب چلوکیہ لکھتے ہیں جب اودھ سے جا کر دکن میں اپنی پادشاہی قائم کی تو منجملہ اُن علامتوں کے جو بطور اپنے نشان کے وہ سکوں وغیرہ پر لگاتے تھے دیراہ کی تصویر (جو سنسکرت میں سور

ضمیمہ ما سخنیہ سیوا جی :۔

جسونت سنگھ کی معرفت جان و عزت کی حفاظت اور حسن سلوک کا وعدہ لے کر اور اپنی جگہ فوج کی سرداری اپنے داماد کو راجہ کے پاس چھوڑ کر دربار جشن سالانہ کے موقعہ پر بادشاہ کو سلام کرنے کے لئے بطور جریدہ اکبرآباد کو چلا آیا۔ اور بادشاہ کی طرف سے بھی یہ مدارات ہوئی کہ کنور رام سنگھ پسر راجہ جے سنگھ اور مخلص خاں نامی ایک اور امیر اُس کا استقبال کرکے دربار جشن میں لاتے اور بادشاہ کے حضور میں اُس کے کھڑے ہونے کو بقول صاحب عالمگیر نامہ جگہ بھی ایسی معقول دی گئی کہ جو امرائے خاص کے لئے تھی اور اُسی دن کچھ اور اعزاز و اکرام بھی ہونے والے تھے اور یہ امر مقرر ہو چکا تھا کہ چند روز حاضر دربار رکھکر عزت و توقیر کے ساتھ رخصت کر دیا جائے گا۔ مگر اس اکھڑ مزاج شخص کو اپنے کھڑے ہونے کی جگہ جو بعض مورخوں کے نزدیک تیسرے درجہ کے امیروں یعنی پنج ہزاری کے منصب والوں کے لئے مقرر تھی ۔اور دوسرے رسوم درباری کچھ ایسی ناگوار اور اپنی عزت کے منافی معلوم ہوئیں کہ اُس نے کنور رام سنگھ کو علیحدہ لے جاکر اُسی وقت سخت شکایت کی اور بقول صاحب عالمگیر نامہ جو " توقعات بے جا و مقاصد دور از کار دخیال ہائے خام" پکائے ہوئے تھے ۔نہایت رنجیدگی سے اُن کا اظہار کیا ۔اگرچہ بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ اُس کو مارے رنج و غیرت کے دربار میں غشی ہو گئی تھی ۔ مگر یہ قول کچھ معتبر نہیں معلوم

بقیہ حاشیہ در حاشیہ لفظ ہن۔ کو کہتے ہیں خواہ ویراہ اوتار کی مناسبت سے یا کسی اور وجہ سے اُن ے سکہ پر منقش ہوا کرتی تھی ۔ چونکہ اس خاندان کی شاہانہ حکومت مدراس۔حیدرآباد دکن ۔اور بمبئی کے ایک بہت بڑے حصہ پر تقریباً آٹھ نو سو برس تک بڑی شان و شوکت سے قائم رہی تو اس وجہ سے اُس ملک میں ان کا سکہ عموماً ویراہا مشہور تھا۔ اور اگرچہ ان کی حکومت تقریباً ۱۲۵۰ء میں جاتی رہی تھی مگر اس ملک کے سونے کے سکہ پر لفظ ویراہا کا اطلاق بعد میں بھی جاری رہا چنانچہ کمال الدین عبدالرزاق سمرقندی نے جو نویں صدی ہجری مطابق ۱۴۴۲ء میں سلطان شاہ رخ والی خراسان کی طرف سے راجہ دیورائے کے پاس اجین کو چلوکیہ خاندان سے کچھ تعلق نہ تھا اس کی دارالسلطنت وجی نگر میں سفارت پر آیا تھا اپنی کتاب مطلع السعدین و مجمع البحرین میں وجے نگر کے عظیم الشان راجہ کے سکہ کا نام ویراہا ہی لکھا ہے اور وزن اس کا ایک مثقال یعنی ساڑھے چار ماشہ بتایا ہے۔ اغلب ہے کہ جب مسلمانوں کی حکومت دکن و مدراس میں قائم ہوئی تو ویراہ وسوراہ کے لفظ کو مکروہ سمجھکر اس سکہ کو اُس کی جنس کے نام سے بجائے ویراہا کے ہن کہنا شروع کر دیا۔ جیسا کہ فی

بقیہ حاشیہ سیواجی:۔

ہوتا۔کیونکہ صاحب عالمگیر نامہ کو اس کے چھپانے کی بحسب ظاہر کچھ ضرورت نہ تھی۔المختصر بادشاہ نے اس حرکت سے ناراض ہو کر بغیر اُن مراسم اعزاز وعنایات کے جو اُس کے لئے تجویز ہوتے تھے حکم دیا کہ ڈیرہ کو چلا جائے اور کنور رام سنگھ کو جو اُس کے معاملات میں متوسط تھا یہ ارشاد ہوا کہ اُس کو اپنے ڈیرے کے پاس (جو شہر سے باہر تھا) اُتار کر نگرانی کرتا رہے۔اور اُس کے بیٹے سنبھاجی کو جو منصب پنج ہزاری پر بدستور مامور تھا کبھی کبھی اپنے ساتھ دربار میں لاتا رہے اور اُس کے بھاگ جانے کے اندیشہ سے فولاد خاں کوتوال کو حکم ہوا کہ اُس کے ڈیرہ کے اردگرد پہرے لگا وے۔اور جے سنگھ کو جس کی وساطت سے وہ حاضر ہوا تھا لکھا گیا کہ اُس کے معاملہ میں جو مناسب جانے رپورٹ کرے۔اس عرصہ میں اگرچہ سنبھاجی دربار میں حاضر ہوتا رہتا تھا مگر سیواجی کو ایسا ہراس غالب ہوا کہ وہ سب ہوا اُس کے دماغ سے نکل گئی اور امرا کے پاس جا جا کر گڑگڑانے لگا۔اسی اثنا میں راجہ جے سنگھ کا جواب بھی آگیا کہ چونکہ میں اس کے ساتھ عہد کر چکا ہوں اور ہنوز بیجاپور کی مہم میں مشغول ہوں اگر در گذر کی جائے تو اس میں میری بھی سرخ روئی ہے۔اور کاروبار مہم کے لئے بھی یہ امر مناسب اور قرین مصلحت ہے۔اس پر بادشاہ نے اُس کی خطا معاف کردی۔اور پہرے اُٹھوا دیئے اور سنبھاجی پر بھی کچھ اور زیادہ اظہار عنایات ہونے لگا۔اور ارادہ تھا کہ چند روز بعد خود اُس کو بھی حاضر دربار ہونے کی

بقیہ حاشیہ در حاشیہ لفظ ہن۔زمانہ بخارا کے سونے کے سکہ کو عموماً طلا کہتے ہیں۔غرضکہ دکن میں زمانہ دراز سے ہندوؤں کے مختلف العلامت سونے کے سکوں کا نام ہن ہے۔مگر اقوام یورپ اور اہلِ اسلام کے سکوں کی طرح ان پر صاحب سکہ کا نام اور سال ومقام ضرب نہیں ہوتا اس لئے ان سے علم تاریخ کے لئے چنداں فائدہ نہیں پہنچتا۔اور اگرچہ ان سکوں کا مقدار وزن کسی قدر مختلف رہا ہے اور ایک بڑے مقدار کا سکہ رام ٹکہ کے نام سے بھی مضروب ہو چکا ہے۔مگر اکثر یہ وزن اس سکہ کا قریب ایک ثلث مروجہ اشرفی کے رہا۔چنانچہ ایک ہُن جو ہمارے کرم فرما مولوی چراغ علی خاں صاحب بہادر عہدہ دار گورنمنٹ نظام نے معہ بعض کوائف تاریخی متعلقہ سکہ ہُن کے حیدرآباد دکن سے بھیجا ہے۔اس کا وزن ساڑھے تین ماشہ ہے اس کی رو کی طرف تین ہندوانی مورتیں ہیں جن میں سے ایک بیچ کی بڑی اور دو آس پاس کی چھوٹی چھوٹی ہیں اور پشت کی جانب صرف باریک باریک دانے یا نقطے سے ہیں اور اس کا قطر انگریزی دوانی سے کچھ کم ہے اور اسی طرف سے یہ کسی

بقیہ حاشیہ سیواجی ۔

اجازت دے کر باعزاز واکرام رخصت کردیا جاتے گا۔ مگر سیواجی کو اپنی سابقہ اورحالیہ حرکتوں کے باعث اور بادشاہ کے "قہر وغضب" کے اندیشہ سے ایسی بے قراری تھی کہ جب اُس نے دیکھا کہ پہرے اٹھ گئے اور کنور رام سنگھ نے بھی خواہ غفلت سے خواہ سازش سے نگرانی میں کوتاہی کی تو ستائیسویں صفر ۱۰۷۷ھ مطابق سال نہم جلوس عالمگیری کو بھیس بدل کر آگرہ سے ایسا بھاگا کہ پھر کبھی قابو میں نہ آیا ۔ اور جب آٹھ نو مہینے کے بعد خدا جانے کن کن حکمتوں اور تدبیروں سے اپنی اور اپنے بیٹے کی تلاش اور تعاقب کرنے والوں سے جان بچا کر ماہ دسمبر ۱۶۶۶ء میں راج گڈھ واپس جا پہنچا ۔ تو اُس کے معاملات بہتر سے بہتر ہوتے چلے گئے ۔ یہاں تک کہ اُس نے تیرھویں سال جلوس مطابق ۱۰۸۰ھ میں نہ صرف بندر سورت کو ہی لوٹا اور جلایا بلکہ اکثر قلعے وغیرہ بھی جو اُس سے چھین لئے گئے تھے اُن پر بھی پھر قابض ہو گیا ۔ اور چونکہ وہ کسی طرح بادشاہی فوجوں کے قابو میں نہ آتا تھا اورنگ زیب نے دق ہو کر اس مناسبت سے کہ اُس ملک کے پہاڑوں اور جنگلوں میں چوہے بہت کثرت سے ہوتے ہیں اُس کا نام "موش کوہی" رکھ دیا تھا۔

اُس نے عالمگیر کے جلوس کے تیئسویں سال میں ۲۴ بیسویں ربیع الثانی ۱۰۹۰ھ کو (حسب قول مصنف آثر عالمگیری) و بقول الفنسٹن صاحب پنجم اپریل ۱۶۸۰ء کو ترپین برس کی عمر میں راج گڈھ میں جو اُس کا دارالریاست تھا انتقال کیا ۔ اُس کی موت کا باعث آثر عالمگیری میں یہ لکھا ہے کہ "کہیں سواری سے آکر شدت گرمی سے دو دفعہ خون کی قے کی اور مر گیا" اور انسائیکلو پیڈیا میں اُس کا مرنا ذات الصدر کی بیماری میں اور مرہٹوں کی تاریخ میں مرنے سے پہلے وجع المفاصل

بقیہ حاشیہ در حاشیہ لفظ ہن ۔ قدر محدب یعنی کچھ ابھرا ہوا ہے اور ایک اور ہن جو ہمارے کرم فرما کرنل سی ایچ ۔ ٹی ۔ مارشل صاحب بہادر نے حیدر آباد ہی سے بھیجا ہے اُس سے چھوٹا ہے ۔ اور اس کے نقوش بھی اُس سے مختلف ہیں ۔ یعنی رو کی طرف گروڑ پرندہ (ذیل کنندہ) بنا یا ہوا ہے اور اُس کی دونوں چونچوں اور دونوں پنجوں میں ہاتھی لٹکتے ہیں ۔ اور پشت کی جانب سنسکرت کے کچھ حروف ہیں اور بحسب ظاہر اس کی شکل اُس نقشہ کے مطابق پائی جاتی ہے جو ڈاکٹر جرڈی نے راجہ دیورائے وجے نگر والے کے ایک سکہ کا اپنے مضمون کے خاتمہ میں چھاپا ہے ۔ جب پرتگیزوں، ڈچوں، انگریزوں نے ہندوستان کے جنوبی و مغربی ساحل پر ابتداءً دخل پایا۔ تو

بقیہ حاشیہ صفحہ -
یا نقرس کے باعث سے گھٹنوں کے درد اور تپ میں اُس کا مبتلا ہونا لکھا ہے۔

انتقال کے وقت اُس کی حکومت چار سو میل طول اور ایک سو بیس میل عرض کے قطعہ زمین پر پھیلی ہوئی تھی۔ اور راج تلک کی رسم با قاعدہ اور آزادانہ طور پر بڑی شان وشوکت سے ادا کر کے خود سر راجہ بن چکا تھا۔ جس کو چھٹی جون ۱۶۷۴ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی انگریزی کے کارخانہ بمبئی کے ایک ایجنٹ نے جو مبارکباد دینے کے لئے ایلچی بن کر گیا تھا بچشم خود دیکھا تھا اور اُس نے ایک ایسی مستقل اور دیرپا حکومت قائم کرلی تھی اور اپنی قابلیت اور تدبیروں سے پولٹیکل اغراض کو مذہبی تعصبات کا رنگ چڑھا کر اور سادہ لوح لوگوں کو ایسے اشارے اور کرشمے دکھا کر جس سے معلوم ہو کہ اُس کے حال پر دیوی دیوتاؤں کی طرف سے بھی دیا کی نگہ ہے - جیسا کہ دنیا کے اکثر حصوں میں ہوتا رہا ہے اپنے ملک کے بھوکے اور جاہل باشندوں میں ـــــ سپاہیانہ اُمنگ اور مذہبی جوش پیدا کردیا اور اپنے ملک کے گمنام باشندوں کا پیش رو بن کر اُن کو بہادر اور جنگ جو قوم مرہٹہ کے نام سے ہندوستان کی تاریخ میں نامور اور مشہور کردیا۔ اور ایک ایسی بنیاد ڈال گیا جو اُس کے پیچھے آنے والوں کے لئے مغلیہ سلطنت کے ضعف کے زمانہ میں ملک وحکومت حاصل کرنے میں بہت ہی کارآمد ہوئی۔

بقیہ حاشیہ در حاشیہ لفظ ہن - بعض راجاؤں کے ہنوں پر مندر کی صورت مضروب دیکھکر انھوں نے بجائے پہلے ناموں وریا یا ہن کے عموماً اس کا نام پگوڈا رکھدیا۔ جس کو بعض انگریزی ڈکشنریوں میں لفظ بت کدہ کی خرابی بتایا ہے۔ لیکن بارٹال میو نامی ایک یورپین محقق سیاح نے جو مدراس میں ۱۷۷۶ء سے لے کر ۱۷۸۹ء تک رہا تھا اُس کی اصل یہ بتائی ہے کہ بعض پر بھگوتی یا بھگوتی (دیوی) کی تصویر ہوتی تھی۔ اس وجہ سے اُس کو بھگوتیہ یا بھگودتیہ کہتے تھے تو ان لوزاردفرنگیوں نے اس کو پگوڈا بنا لیا۔ بہرحال حیدرنایک اور اُس کے بیٹے سلطان ٹیپو کے زمانہ میں بھی ہن مضروب ہوتے تھے جو بہادری اور سلطانی ہن کہلاتے تھے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی دکن کی ٹکسالوں میں بھی برابر ۱۸۱۸ء تک پگوڈا مضروب ہوتے رہے ـــ انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے۔ سرکاری حساب کتاب اور لین دین میں بھی بجائے روپیہ کے پگوڈا ہی کا چلن تھا مگر ۱۸۱۹ء سے حکام انگریز نے آخرکار بجائے اُس طلائی سکہ کے روپیہ کو تمام ہندوستان کے لئے سکۂ رائج الوقت قرار دیدیا اور وریا ہا - ہن - پگوڈا سب متروک ہوکر اُن کے نام کتابوں میں لکھنے کو رہ گئے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔

عالمگیر نامہ وغیرہ فارسی تاریخوں میں جو اس کے مخالفوں کی لکھی ہوئی ہیں جہاں اُس کی مکاری اور غارت گری اور فن وفریب وغیرہ کی ہجو لکھی ہے اُسی کے ساتھ اُس کی چستی و چالاکی اور بے حد دلاوری وجرأت کا بھی اقرار کیا ہے۔ اور الفنسٹن صاحب لکھتے ہیں کہ بلحاظ اس وقت کے اُس کا ملکی اور فوجی انتظام دونوں عمدہ تھے۔ کہ "اُس کی حکومت کا کل زمانہ مسلسل لڑائیوں اور پولٹیکل سازشوں کا ایک ایسا منظر ہے کہ جس میں وہ ایک نہایت ہوشیار جنرل اور ایک قابل مگر مکار مدبر کی سی لیاقتیں ظاہر کرتا رہا۔ اور ہر ایک خوفناک ضرورت کے وقت خواہ وہ کیسے ہی انتہا درجہ کی اور یکایک پیش آئی ہو اُس کی شجاعت وجرأت میں ذرا بھی فرق نہ آتا تھا۔ بلکہ فی الفور اُس کا ایسا تدارک کرتا جو عین موقع اور وقت کے موافق ہوتا۔ اور کسی جان جوکھوں میں پڑتے وقت موت وزندگی کی اُس کو مطلق پروا نہ ہوتی تھی۔"

خلاصہ یہ کہ حضرت محی الدین اورنگ زیب عالمگیر بہادر اور سیواجی مہاراج اپنے اپنے طور پر دونوں ہی عجیب وغریب شخص تھے اور اگرچہ مختلف قالبوں میں ڈھلے ہوئے تھے مگر مادہ ایک ہی تھا۔ س م ح

بقیہ حاشیہ در حاشیہ لفظ ظن۔

ماخوذ از:
- خط مولوی چراغ علی خاں صاحب بہادر عہدہ دار گورنمنٹ نظام
- چٹھی مسٹر چارلس راجرس صاحب سابق پرنسپل مشنری نارمل سکول امرتسر حال از جیولاجی کل سروے۔
- رسالہ ڈاکٹر ہنڈی صاحب سرجن میجر و سپرنٹنڈنٹ عجائب خانہ مدراس مندرجہ جنرل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال مطبوعہ ۱۸۶۳ء جلد ۳۲ حصہ اول نمبر اوّل۔

س م ح

شاہ جہاں کی وفات میں ابھی گولکنڈا ہی میں تھا کہ شاہجہاں کے انتقال کی خبر سنی گئی اور یہ بھی سننے میں آیا کہ اورنگ زیب نے باپ کے مرنے کا بڑا غم کیا اور سوگ کی وہ تمام رسوم کیں جو بیٹے کو باپ کے ماتم میں کرنی چاہئیں۔ وہ فوراً آگرہ کو روانہ ہوگیا۔ اور وہاں پہنچنے پر بیگم صاحب نے بڑی دھوم سے اُس کا استقبال کیا اور کمخواب کے تھان لٹکا کر بادشاہی مسجد سجائی گئی۔ اور اسی طرح وہ مکان بھی سجایا گیا جہاں قلعہ میں داخل ہونے سے پہلے ٹھہرنے کا ارادہ تھا۔ اور جب محل میں پہنچا تو شاہزادی نے ایک بڑا سا سونے کا تھال جواہرات سے بھرا ہوا نذر کیا جن میں سے کچھ تو شاہجہاں کے متروکہ تھے اور کچھ اُس نے اپنے پاس سے پیش کش کئے تھے۔ بہن کی طرف سے گرم جوشی اور محبت کا برتاؤ دیکھ کر اورنگ کا بھی دل پسیج گیا۔ اور اس نے اُس کی گذشتہ باتوں سے درگذر کی۔ اور اُس وقت سے اُس کے ساتھ مہربانی اور فیاضی سے پیش آتا ہے[۱]

---

[۱] شاہجہاں کی وفات کا احوال جو کچھ عالمگیر نامہ میں لکھا ہے اُس کا ماحصل یہ ہے کہ اس قیدی بادشاہ کو بارھویں رجب ۱۰۷۵ھ کو حبس بول کا وہی پُرانا عارضہ جس کو مرض الموت کہنا چاہیئے پھر لاحق ہوا۔ حکیم مومنا می شیرازی نے جو اُس وقت کے شاہی طبیبوں میں ایک مشہور شخص تھا۔ ہر چند علاج کیا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ بلکہ اسہال وغیرہ کئی طرح کے اور عوارض پیدا ہو کر زندگی سے یاس ہوگئی۔ جب یہ خبر عالمگیر کو پہنچی تو باپ کی آخری زیارت کو دلی سے آگرہ جانے کا ارادہ کیا۔ مگر چونکہ بادشاہی کوچ و مقام کے لئے دستور سلطنت کے موافق نہایت بھاری سامانوں کی ضرورت تھی اس لئے باوجود تاکید اختصار سامان کے بھی چندروز کا توقف ہونا ضروری تھا۔ اس وجہ سے اپنے بڑے بیٹے محمد معظم کو اپنی روانگی سے پہلے احتیاطاً جلدی سے روانہ کر دیا۔ ابھی شاہزادہ آگرہ سے سات کوس اس طرف ہی تھا کہ شاہجہاں پر حالتِ نزع طاری ہوگئی۔ اور چھبیسویں رجب شب یک شنبہ کو آدھی رات سے پہلے انتقال ہوگیا۔ بیچاری مصیبت زدہ بیگم صاحب نے جو باپ کے ایام قید میں ایک وہی اُس کی غم خوار اور رنج و راحت کی شریک تھی رعدانداز خاں قلعدار اور بھلول خواجہ سرا کو جو قیدی بادشاہ اور قلعہ کے محافظ تھے مکان معروف غسل خانہ میں طلب کر کے اور اُن کی معرفت اُسی وقت قلعہ کے دروازوں کی کھڑکیاں کھلوا کر غسل و کفن کی تیاری کے لئے سید محمد قنوجی کو جو بڑے عالم اور درویش مسلک تھے۔ اور اس قید کے زمانہ

اورنگ زیب میری نظر میں

اب میں اپنی تاریخ کو ختم کرتا ہوں۔ جن جن ذریعوں سے اورنگ زیب نے یہ عروج اور اقتدار حاصل کیا یقیناً ناظرین اُن کو بہت ناپسند کریں گے کیونکہ وہ یقیناً بے جا اور نامنصفانہ تھے۔ لیکن شاید یہ ناانصافی ہوگی۔ تاہم اُن کو اس قدر نفرت سے نہ دیکھیں جس سے اپنے ملک یورپ کے شاہزادوں کے افعال کو جانچتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے ملک میں جانشینی کے لئے معقول قواعد مقرر ہیں اور بڑے بیٹے کے سوا کوئی جانشین نہیں ہوسکتا۔ لیکن ہندوستان میں باپ کے بعد شاہزادوں میں سلطنت کے لئے ہمیشہ جھگڑا ہوتا ہے۔ اور ان دو بے رحمانہ باتوں میں سے ایک بات اختیار کرنی پڑتی ہے۔ یا سلطنت کی خاطر خود قربان ہو جائیں یا بھائیوں کو قربانی بنائیں۔ تاہم اُن لوگوں کو جو ملک کے دستور اور رسم و رواج اور تعلیم و تربیت کے اثر کے عذر کو قبول نہیں کرتے یہ ماننا ہی پڑے گا کہ اورنگ زیب کو خدا نے غیر معمولی عقل و فکر اور ذہانت و تدبیر عطا کی تھی اور یہ کہ وہ بڑا ہی بہادر اور عالی شان بادشاہ ہے۔

بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ۔ میں اکثر شاہجہاں کی صحبت میں رہا کرتے تھے۔ اور ملا قربان قاضی دارالخلافہ آگرہ کو قلعہ میں بلوا لیا۔ پچھلی آدھی رات کے وقت جب وہ دونوں حاضر ہوئے تو قضائے روزہ و نماز کے عوض (اگرچہ بقول صاحب عالمگیر نامہ اُس کی نماز و روزہ کبھی قضا نہ ہوتے تھے) برسم احتیاط ادائے بہت سا روپیہ خیرات کیا گیا۔ اور بعد ازاں برج مثمن سے کہ جہاں انتقال کیا تھا لاش کو اٹھا کر ایک قریب کے مکان میں غسل و کفن دے کر صندل کے تابوت میں رکھا گیا۔ اور برج مثمن کے نیچے کا دروازہ جو مسدود کیا ہوا تھا کھلوا کر اس کے راستہ سے اور فصیل بیرونی کے اس دروازہ سے جو اس کے محاذی تھا جنازہ کو باہر لائے اور ہوشدار خاں صوبہ دار نے بادشاہی ملازموں کے ساتھ تابوت شائستہ یعنی مراسم اعزاز و احتشام شاہانہ کے ساتھ، علی الصباح جمنا کے کنارے جا پہنچایا۔ اور دریا سے پار ہو کر سید محمد قنوجی۔ قاضی قربان وغیرہ علماء و صلحا نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور اس کی زوجہ ممتاز الزمانی ارجمند بانو بیگم معروف بہ تاج محل کے مقبرہ میں کہ جس کا حال اس کتاب کے بعض اور مقامات میں مفصل درج ہے دفن کر دیا۔ لکھا ہے کہ اورنگ زیب کو جب باپ کے انتقال کی خبر پہنچی تو بہت رویا اور سوگواری کی اور رسموں کے علاوہ اُس نے اور تمام اہل دربار نے جیسا کہ اب بھی ہندوستانی ریاستوں میں دستور ہے سفید لباس پہنا۔ اور کشتی کے ذریعہ آگرہ پہنچ کر زیارت قبر کے وقت بھی بہت گریہ و بکا کیا۔ اور مجالس مولود و ختم و فاتحہ جیسا کہ بادشاہوں

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ :- کی وفات کے موقعہ پر دستور تھا منعقد کرکے دھوم دھام سے خیر و خیرات کی۔ اور اپنی غم زدہ بڑی بہن بیگم صاحب کے پاس بھی کئی بار قلعہ میں گیا۔ اور نہایت تسلی و تشفی کی بلکہ اس قدر پر حکر خاطر و مدارات کی کہ تمام اہل دربار کو حکم دیا کہ اُن کی ڈیوڑھی پر حاضر ہو کر نذریں پیش کریں۔ چنانچہ جب ایسا ہی ہوا تو بیگم صاحب نے بھی جو دریا دلی اور فیاضی میں مشہور اور بڑی ہی سیر چشم شاہزادی تھی تمام اہل دربار کو عموماً ہزاری کے منصب تک بھاری بھاری خلعت مرحمت کئے اور اس کے بعد جب اورنگ زیب پھر ملنے کو گیا تو رسم پیشتے انداز و رسم نثار بجا لا کر ایک نہایت قیمتی پیش کش جس کا برنیر نے اشارہ کیا ہے نذر کیا۔ اگرچہ صاحب عالمگیر نامہ اس امر کو نہیں لکھ سکتا تھا کہ شاہجہاں کا جنازہ شایانہ احتشام سے نہیں اُٹھایا گیا۔ اور ایسے سادہ طور سے دفن کیا گیا جو اُس کے مرتبہ کے شایاں نہ تھا اور یہ عمل خواہ عالمگیر کے حکم سے ہوا ہو خواہ قلعہ دار و صوبہ دار کی کم فہمی سے مگر صاحب عمل صالح نے اس امر کو بہت ہی رنج و افسوس کے ساتھ عبرت ناک الفاظ میں جتایا ہے۔ چونکہ شاہزادہ محمد معظم (دیکھو جب بیان مندرجہ عالمگیر نامہ) شاہجہاں کے انتقال کے وقت آگرہ سے صرف سات کوس کے فاصلہ پر موجود تھا اور ابھی پہنچا بھی نہ تھا کہ جنازہ بہت سویرے ہی دفنا دیا گیا۔ تو اس سے مصنف عمل صالح کا قول صحیح معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال اورنگ زیب کے جلوس کے آٹھویں سال ۱۰۷۵ھ کے ماہ رجب میں بیچارے شاہجہاں نے جو ہندوستان کے نہایت نیک نام بادشاہوں میں سے تھا۔ چھہتر برس تین مہینے ستائیس دن کی عمر میں بحساب قمری اور تین دن کم چوہتر برس کی عمر میں بحساب شمسی قلعہ آگرہ میں آٹھ برس کے قریب قید رہ کر قید ہستی سے رہائی پائی۔ جس میں سے اکتیس برس دو مہینے تیئیس دن بحساب قمری اور تیس برس چار مہینے اٹھارہ دن بحساب شمسی تخت نشین رہا۔

صاحب عالمگیر نامہ نے اس کے سال انتقال کی نسبت اپنی تصنیف کی ہوئی ایک تاریخ لکھی ہے جس کو ہم بھی پُر مضمون سمجھ کر اس جگہ نقل کرتے ہیں۔

چوں شاہجہاں خدیو قدسی ملکات | برخاست بعزم عقبیٰ از تخت حیات
جستم از عقل سال تاریخش را | گفتا خردم شاہجہاں کرد وفات
۱۰۷۵ھ

ضمیمہ

مسیو رکول برٹ[1] وزیر فرانس کے نام برنیر کا خط

خداوند من ممالک ایشیا میں امرا اور حکام کی خدمت میں کوئی شخص خالی ہاتھ نہیں جاتا۔ چنانچہ شہنشاہ معظم[2] کے دامن قبا کو بوسہ دینے کا اعزاز جب مجھکو حاصل ہوا تو میں نے بھی نذر کے طور پر جو تعظیم کی ایک علامت ہے آٹھ روپیہ پیش کئے تھے۔ اور ایک نائف کیس[3] ایک کانٹا اور کہربا کے دستہ کا ایک قلم تراش خان کی نذر کیا تھا۔ کیونکہ یہ نامور شخص

[1] یہ عالی منزلت شخص جس کا پورا نام جی ان بیپ ٹسٹ کولبرٹ ہے اور مارکولس آف سگنی کے خطاب سے مخاطب تھا فرانس کے وزرا میں ایک ایسا نامور مدبر سلطنت گذرا ہے کہ ایسے لائق و فائق وزیر کم ہوتے ہیں ۱۶۱۹ء میں بمقام پیرس پیدا ہوا تھا اور کہتے ہیں کہ اس کے بزرگ دراصل اسکاٹ لینڈ کے رہنے والے تھے اور کسی اتفاق سے فرانس میں جا بسے تھے۔ اس کا

[2] شاہان مغلیہ جو جلال و عظمت اور ترفع کے اظہار کے لئے دیوان عام کے شہ نشین میں زمین سے کئی گز بلند ہوکر تخت پر بیٹھتے تھے دامنِ قبا وغیرہ کو بوسہ دینے کی رسم اُن کے دربار میں نہ تھی چنانچہ بعض سفیروں کے حاضر دربار ہونے کے چشم دیدہ حالات جو خود مصنف نے اسی کتاب میں لکھے ہیں اُن سے بھی یہی ظاہر ہے کہ ایسا دستور نہ تھا اور درحالیکہ برابر کے بادشاہوں کے سفیروں کو بھی اس قدر قرب نصیب نہ ہو تو غریب برنیر کو یہ رتبہ کہاں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو اُس وقت دربار فرانس میں کوئی ایسی تعظیمی رسم ہوگی جس کے لحاظ سے مصنف نے شرف یابی کے اس عام مطلب کو مجازاً ان الفاظ خاص میں استعمال کیا ہوگا یا ایک ایسے مسلمان بادشاہ کے دربار میں حاضر ہونے کی رسم کو جس کے درباری آداب و رسوم سے مصنف کے ہم وطن کروا قفیت نہ تھی اس وجہ سے ان لفظوں میں بیان کیا ہوگا کہ خلفائے بنی عباس کے زمانہ میں اُن کی آستین

[3] نائف کیس غالباً پیش قبض کا میان ہوگا۔ س۔م۔ح

وزرائے سلطنت میں سے تھا۔ بڑے بڑے کام اس کے متعلق تھے اور طبیبوں کی نہل میں میری تنخواہ کا تجویز کرنا اسی کی رائے پر منحصر تھا۔ اگرچہ میری یہ مجال نہیں ہے کہ فرانس میں کسی نئی رسم کو جاری کروں۔ لیکن جب کہ میں ہندوستان سے مدت کے بعد ابھی واپس آیا ہوں تو یہ امر خلاف توقع ہے کہ میں اُس دستور کو جس کا ذکر ابھی کر چکا ہوں ایسی جلدی سے بھول جاؤں۔ پس اگر میں اپنے بادشاہ کے حضور میں جس کا ادب میرے دل میں بہ نسبت اورنگ زیب کی تعظیم کے اور ہی قسم کا ہے یا اُس کے وزیر کی خدمت میں جو فاضل خاں کی نسبت بہت زیادہ ادب کا مستحق ہے بغیر ایک حقیر پیش کش کے جو پیش کرنے والے کے لحاظ سے نہیں بلکہ اپنی ندرت کے اعتبار سے قابل قدر و قیمت ہے حاضر کرنے میں تامل کروں تو مجھے امید ہے کہ معاف کیا جاؤں گا۔

ہندوستان کا گذشتہ انقلاب جو عجیب و غریب حادثوں پر مشتمل ہے ہمارے عظیم الشان[1] بادشاہ کی توجہ کے لائق ہے۔ اور یہ عریضہ جس میں ایسی بڑی بڑی باتیں مندرج ہیں اُسی کا ملاحظہ فرمانا اُس رتبہ کے شایان ہے جو آپ کو دربار شاہی میں حاصل ہے اور بڑے تحرک اُس کا ایسے ہی شخص کی خدمت میں پیش کیا جانا زیبا تھا جس کی خوش تدبیری سے سلطنت

[1] بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ اور اس صفحہ کے اُن الفاظ سے جن پر خط ہے۔ اور بادشاہ اور وزیر دونوں کو علیحدہ علیحدہ نذریں دینے کی مندرجہ صدر تمہید سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے کتاب کا یہ پہلا حصہ جس میں شاہجہاں کے بیٹوں کی لڑائیاں اور انقلاب سلطنت کے واقعات لکھے ہیں اپنے بادشاہ کو نذر کیا اور یہ خط اُس کے وزیر کو۔ س۔م۔ح

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ نمبر۱۔ دادا شراب کا سوداگر تھا۔ مگر اس کا باپ کچھ عرصہ کے بعد یہ شغل چھوڑ کر ملازم پیشہ ہو گیا تھا۔ کولبرٹ نے تحصیل علوم و فنون کے بعد اپنے برادر نسبتی کے ذریعہ جو اُس وقت فرانس کا (منسٹر آف سٹیٹ) یعنی وزیر السلطنت تھا۔ امور سلطنت میں دخل پایا۔ اور رفتہ رفتہ حسن لیاقت اور کارگذاری اور ایمان داری کے باعث لوئیس چہاردہم کا جو اُس وقت کے یورپین بادشاہوں میں نہایت ہی نیک نام بادشاہ تھا وزیر ہو گیا۔ اس خوش تدبیر شخص نے اپنے عہد وزارت میں انواع و اقسام کی ایسی عمدہ اصلاحات کیں اور ایسے مفید قاعدے اور قانون جاری کئے کہ جن سے حقیقتاً اُس کی قوم اور سلطنت کو بڑی ناموری اور ترقی حاصل ہوئی۔ (انسائیکلو پیڈیا برطانیکا) س۔م۔ح

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ نمبر۲۔ دغیرہ کو بوسہ دینے کی رسم تھی جن کے تاریکی حالات سے اہل یورپ اکثر واقف تھے بن ع

کے بہت سے صیغوں کا جو میرے جانے کے وقت ناقابل علاج حالت میں پڑے ہوئے تھے نہایت عمدہ طور پر انتظام ہو گیا ہے۔ اور جس نے اپنی کوشش اور محنت سے ہمارے بادشاہ کی شان و عظمت کو تمام عالم میں پھیلا دیا اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ فرنچ قوم اُن باتوں کو کس قابلیت سے عمل میں لاتی ہے جو اُس کے فوائد اور نام آوری کی خاطر تجویز کی جائیں۔

خداوند من۔ میں ہندوستان سے بارہ برس کے بعد واپس آیا ہوں۔ اور میں وہیں تھا کہ فرانس کی خوش حالی اور اُس نیک نامی کی شہرت بخوبی سن لی تھی جو آپ نے اپنی غیر متبوع توجہ اور نمایاں قابلیتوں سے اس کو ترقی دینے میں حاصل کی ہے۔ اگرچہ فرانس کی خوش حالی اور آپ کی نیک نامی کا دلچسپ مضمون میں بڑے شوق و رغبت سے لکھتا لیکن تمام عالم جن باتوں کا پہلے ہی معترف اور مداح ہو وہ میرے بیان کی محتاج نہیں اس لیے بہتر ہے کہ اپنے وعدہ کے موافق صرف وہی غیر معلوم اور نئی باتیں لکھ کر نذر کروں جن سے ہندوستان کی واقعی حالت کا نقشہ کسی قدر آپ کے خیال عالی میں آ سکے اور مجھے یقین ہے کہ آپ بھی زیادہ تر انہی کو پسند فرمائیں گے۔

ہندوستان کی وسعت

ممالک ایشیا کے نقشوں سے ظاہر ہے کہ سلطنت مغلیہ جو سلطنت ہند کے نام سے مشہور ہے کتنا وسیع ملک ہے۔ اگرچہ میں نے قواعد مساحت کے موافق صحیح طور پر پیمائش نہیں کی لیکن ایک معمولی منزل کی مسافت کا اندازہ کر کے اور یہ دیکھ کر کہ گول کنڈے کی سرحد سے غزنین بلکہ اُس سے بھی پرے قندھار کے قریب تک جو سلطنت ایران کا پہلا شہر ہے تین مہینے کا سفر ہے یہ حساب لگایا گیا ہے کہ ان دونوں مقاموں میں ڈیڑھ ہزار میل سے کم فاصلہ نہیں ہے۔ یعنی جس قدر پیرس اور لائنس میں فاصلہ ہے اُس سے پانچ گنا سمجھنا چاہیے۔

ہندوستان کی قدرتی اور مصنوعی چیزیں

یہ امر قابل لحاظ ہے کہ اس ملک کا ایک بڑا حصہ نہایت زرخیز ہے۔ مثلاً ایک بنگالہ ہی ایسا ہے جو نہ صرف گیہوں اور چاول وغیرہ اشیائے احتیاج کی پیداوار کے لحاظ سے مصر سے افضل ہے بلکہ بہ لحاظ ریشم، روئی اور نیل وغیرہ بے شمار تجارتی جنسوں کی پیدائش کے بھی جو مصر میں پیدا نہیں ہوتیں اُس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس کے سوا ہندوستان کے اور حصے بھی بخوبی آباد ہیں اور زراعت بھی خاصی ہوتی ہے اور اگرچہ یہاں کے اہل حرفہ

بالطبع کاہل ہیں مگر تاہم کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے ہیں۔ مثلاً قالین۔ کمخواب چکن۔ کارچوبی اور زردوزی وغیرہ کے کام اور دوسرے قسم کی ریشمی اور سوتی چیزیں جو ملک کے اندر برتی جاتی یا باہر بھیجی جاتی ہیں بناتے رہتے ہیں۔

غیر ملکوں سے سونے چاندی کی ہندوستان میں درآمد

یہ امر بھی نذر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ سونا چاندی دنیا میں پھر پھرا کر جب ہندوستان میں پہنچتا ہے تو یہیں کھپ جاتا ہے۔ چنانچہ امریکہ سے جو روپیہ آ کر فرنگستان کے ملکوں میں پھیلتا ہے اُس میں سے کسی قدر تو اُن چیزوں کے مبادلہ میں جو ٹرکی (روم) سے آتی ہیں مختلف ذریعوں سے ٹرکی میں چلا جاتا ہے۔ اور کسی قدر بندرگاہ سمرنا کے راستے سے ایران میں پہنچ جاتا ہے۔ جہاں سے ریشم فرنگستان میں آتا ہے۔ اب ٹرکی کا یہ حال ہے کہ وہاں کے لوگ قہوہ کے بغیر نہیں رہ سکتے جو یمن سے آتا ہے۔ اور ٹرکی اور یمن اور ایران تینوں کو ہندوستان کی چیزوں کی ضرورت رہتی ہے۔ پس اس طرح پر بندر مخا میں جو بحر احمر کے کنارے باب المندب کے قریب ہے اور بصرہ میں جو خلیج فارس کے سرے پر ہے اور بندر عباس میں جو جزیرہ ہرمز کے نزدیک ہے ان ملکوں سے روپیہ آتا ہے اور یہاں سے اُن جہازوں کے ذریعہ سے جو ہر سال ہوائے موافق کے موسم میں ہندوستان کا مال لے کر ان مشہور بندرگاہوں میں آتے ہیں ہندوستان میں پہنچ جاتا ہے یہ بھی ملحوظ ہے کہ ہندوستانیوں، ڈچوں، انگریزوں اور پرتگیزوں کے تمام جہاز جو ہر سال ہندوستان کا مال پیگو۔ تناسرم (تیناسری)، سیام۔ سیلان۔ آچین۔ مکاسر۔ جزائر مالدیپ موزمبیق وغیرہ مقامات کو لے جاتے ہیں وہ بھی اُس کے مبادلہ میں سونا چاندی ہی لاتے ہیں اور یہ بھی اُس روپیہ کی طرح جو بندر مخا۔ بصرہ۔ اور بندر عباس سے آتا ہے یہیں رہ جاتا ہے۔ اور جو سونا چاندی ڈچ لوگ جاپان کی کانوں سے نکال لیتے ہیں اُس میں سے بھی تھوڑا بہت کسی نہ کسی وقت یہاں آ جاتا ہے اور جو روپیہ براہ راست فرانس اور پرتگال سے آتا ہے وہ بھی شاذ و نادر ہی یہاں سے پھر باہر جاتا ہے کیونکہ اُس کے عوض بھی مال واسباب ہی دیا جاتا ہے۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ لوگ یہ اعتراض کریں گے کہ ہندوستان کو تانبا، لونگ۔ جائپھل۔ دارچینی وغیرہ چیزوں اور ہاتھیوں کی ضرورت رہتی ہے کہ جن کو ڈچ۔ فرنگستان۔ جاپان۔ ملاکا اور سیلان سے لاتے ہیں۔ اور سیسہ بھی باہر ہی سے آتا

ہے۔ جس میں سے تھوڑا سا انگلستان سے انگریز بھیجتے ہیں اور فرانس سے بانات اور دوسری
چیزیں آتی ہیں اور غیر ملک کے گھوڑوں کی بھی ضرورت رہتی ہے۔ جو ہر سال پچیس ہزار
سے زیادہ ملک ازبک (ترکستان) سے اور بہت سے قندھار کے رستے ایران سے۔ و بندر
مخا اور بصرہ اور بندر عباس کی راہ سے اتھوپیا (حبش) اور عرب اور فارس سے آتے ہیں۔
اسی طرح بہت سا تر و خشک میوہ سمرقند۔ بلخ۔ بخارا۔ اور ایران سے آتا ہے مثلاً
خربوزے۔ سیب۔ ناشپاتی اور انگور جو کثرت سے دہلی میں خرچ ہوتے ہیں۔ اور جاڑے بھر
بڑی قیمت پر بکتے رہتے ہیں اور بادام۔ پستہ۔ فندق۔ زردآلو۔ خوبانی کشمش وغیرہ جو بارہ
مہینے ملتے ہیں۔ اسی طرح کوڑیاں جزائر مالدیپ سے آتی ہیں جو بنگالہ اور دوسرے
مقامات میں بجائے پیسے دھیلے وغیرہ کم قیمت سکوں کے مستعمل ہیں۔ اور عنبر جزائر مالدیپ
اور موزمبیق سے آتا ہے۔ اور گینڈے کے سینگ اور ہاتھی دانت اور غلام اتھوپیا سے اور مشک
اور چینی کے برتن چین سے اور موتی بحرین اور ٹوٹی کارن سے۔ جو سیلان کے نزدیک ہے
آتے ہیں۔ مگر باوجود اس کے ان چیزوں کے بدلے سونا چاندی نہیں جاتا کیونکہ جو سوداگر یہ
جنسیں لاتے ہیں وہ اس میں زیادہ فائدہ سمجھتے ہیں کہ ان کے معاوضہ میں یہاں کی جنسیں
اپنے ملک کو لے جائیں۔ پس اگرچہ ہندوستان میں غیر ملکوں سے قدرتی یا مصنوعی چیزیں آتی
ہیں مگر وہ دنیا بھر کے سونے یا چاندی کے ایک بڑے حصہ کی جو بہت سے ذریعوں سے
یہاں آتا ہے۔ یہیں رہ جانے میں روک نہیں ہیں۔ اور پھر وہ بمشکل ہی یہاں سے کہیں کو
واپس جاتا ہے۔

شہنشاہ مغل کی دولتمندی کے ذرائع

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جب کوئی امیر و منصب دار چھوٹا یا بڑا مرتا ہے تو اس کی جائداد سرکار بادشاہی
میں ضبط ہو جاتی ہے اور اس سے بڑھکر یہ امر ہے کہ ہندوستان کی تمام زمین مکانات
اور باغات کے سوا جن کے فروخت وغیرہ کی اجازت بعض اوقات رعایا کو دیدی جاتی ہے
بادشاہ کی ملکیت ہے۔ اور میں خیال کرتا ہوں کہ اس تمام بیان سے میں نے یہ ثابت کر دیا
ہے کہ اگرچہ سونے چاندی کی کانیں یہاں نہیں ہیں مگر تاہم سونا چاندی یہاں کثرت سے
ہے اور یہ کہ شہنشاہ مغل جو اس ملک کے ایک بڑے حصہ کا مالک ہے اس کا محاصل
بے شمار اور وہ نہایت ہی دولتمند ہے۔ لیکن باوجود اس کے بہت سے ایسے اسباب

بھی ہیں جو مقابلتاً اُس کی دولت مندی کے نقصان کے باعث ہیں۔ مثلاً ملک کے بہت سے وسیع حصے جن سے ہندوستان کی شہنشاہی مرکب ہے۔ خشک پہاڑوں اور ریت کے بیابانوں سے کچھ ہی اچھے ہیں۔ طریق زراعت بھی خراب ہے۔ اور آبادی بھی بہت ہی کم ہے۔ اور قابل زراعت زمین کا ایک بڑا حصہ کاشت کاروں کی قلت کی وجہ سے جو اکثر حکام کی بدسلوکی سے تباہ اور برباد ہو جاتے ہیں خالی پڑا رہتا ہے[1]۔ چنانچہ یہ بیچارے غریب آدمی جب اپنے سخت گیر اور لالچی حاکموں کی خواہشوں کو پورا نہیں کر سکتے تو نہ صرف اُن کے رزق کا ذریعہ ہی چھین لیا جاتا ہے بلکہ اُن کے بال بچے بھی پکڑ کر لونڈی غلام بنا لئے جاتے ہیں۔ اور یہ بیچارے اپنا گھر بار چھوڑ کر کسی قدر آرام سے دن کاٹنے کے لئے شہروں یا لشکرگاہوں میں چلے جاتے اور حمالی سقائی یا سائیسی وغیرہ کر کے اپنا پیٹ پالتے ہیں اور بعضے کسی راجہ کے علاقہ میں جہاں یہ ظلم و ستم کسی قدر کم دکھائی دیتے ہیں[2]۔ اور یہاں کی نسبت کچھ آرام ملتا ہے بھاگ جاتے ہیں۔ اور اس سلطنت میں بہت سی قومیں ایسی بھی آباد ہیں جن پر پادشاہ

---

[1] جیسا کہ راجپوتانہ میں اب بھی ہے۔ س م ح

[2] یہ بات بالکل سچ ہے۔ چنانچہ اُن اسباب کے بیان میں جن کے باعث کوچ بہار کی فتح کے بعد اُس علاقہ کی رعایا نے بغاوت کی اور اپنے بھاگے ہوئے راجہ بھیم نرائن کو واپس بلا کر پھر تخت پر قائم کر لیا خود صاحب عالمگیرنامہ نے بضمن واقعات ۱۰۷۲ھ مطابق سال چہارم و پنجم جلوس اور نگ زیب جو کچھ لکھا ہے مزید وثوق کے لئے ہم اس جگہ بعینہٖ نقل کرتے ہیں۔

"و ایں سانحہ بدان جہت وقوع یافت کہ چوں نظم و نسق مہمات مالی آں ولایت متعین گشتہ بود بنا بر اقتضائے مصلحت و تدبیر تا نکردہ دستورے کہ در ممالک محروسہ پادشاہی معمول است شروع در جمعبندی آں ولایت و مطالبت اموال اندعیت نمودند۔ ازآں جا کہ زمینداران مملکت ہندوستان بمقتضائے تدبیر بجہت تسخیر قلوب و استمالت رعایا کہ سر از ربقۂ اطاعت و مال گزاری نہا بر ندارند در محال زمینداری خویش معاملہ داندیہ مال بکاری بر ندو دستورے قانونے کہ در ممالک محروسہ معمول است بعمل نمی آرند و بھیم نرائن نیز بریں دستور عمل می کرد کافہ رعایا ئے آں جا از وقوع آں معاملہ و قرار آں دستور کہ از آئین معہود ایشاں بعید بود و با یستے بتدریج صورت ظہور داشتے رم گیر و متوحش و نفور گشتہ خواہان بھیم نرائن شدند و بعد باز خود آمدن از کوہستان و تحریک سلسلۂ فساد ترغیب نمودند و ہمگی اہل آں دیار بہ او پیوستند و دگر بارہ او را بحکومت و ریاست برگزیدند بر سر محمد صالح نام یکے از منصب داران پادشاہی کہ در موضع کنتل بازی بود ریختند۔" س م ح

کی کامل حکومت نہیں ہے اور اکثر اُن میں سے ایسی ہیں جن کا رئیس خود انھیں میں کا ایک شخص ہے اور صرف اُس وقت خراج ادا کرتے ہیں جب کہ سلطنت کی طرف سے کچھ زور ڈالا جاتا ہے۔ اور اُن میں سے اکثر تو بہت تھوڑا خراج دیتے ہیں۔ اور بعض کچھ بھی نہیں دیتے۔ اور بعض ایسے ہیں کہ دینا تو کیا اُلٹا کچھ لیتے رہتے ہیں۔ مثلاً وہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں جو سرحدِ ایران پر ہیں شاذونادر ہی ایران یا ہندوستان کو کچھ خراج دیتی ہیں۔ ایسا ہی حال بلوچستان اور اور پہاڑی قوموں کا ہے جو شہنشاہ مغل کو بجز قدرِ قلیل کچھ نہیں دیتیں اور اپنے آپ کو قریباً خودسر اور آزاد سمجھتی ہیں اور اُن کی خودسری اور آزادی اس سے ثابت ہے کہ شہنشاہ مغل نے جب قندھار کے محاصرہ کی غرض سے کابل جانے کے لئے مقام اٹک سے کوچ کیا (جو دریائے سندھ کے کنارے آباد ہے) تو اُن قوموں نے پہاڑوں سے اُن میدانوں میں آب رسانی کے ذریعے مسدود کر دیئے جو شاہراہ کے متصل تھے اور جب تک بادشاہ سے انعام حاصل نہ کر لیا۔ جو خیرات کے نام سے عنایت کیا گیا تھا فوج کا آگے بڑھنا ناممکن سا بنا دیا۔ پٹھان لوگ بھی بڑے سرکش ہیں اور یہ وہ مسلمان قوم ہے۔ جو پہلے بنگالہ کی جانب گنگا کے کنارے آباد تھی اور مغلوں کے ہندوستان پر حملہ کرنے سے پہلے اکثر مقامات میں اُن کو بہت قوت حاصل تھی۔ خصوصاً دہلی[۲] میں اُن کا بہت ہی زور تھا۔ اور اُس کے قرب وجوار کے بہت سے راجہ اُن کے خراج گذار تھے۔ اس قوم کے ادنیٰ شخص یہاں تک کہ ایسے لوگ بھی جو سقائی کرکے گذران کرتے ہیں دلیر اور سپاہی منش ہیں۔ اور جب کسی بات کی صداقت پر زور دینا چاہتے ہیں تو اُن کا یہ معمولی مقولہ ہے "کہ اگر میں جھوٹ کہتا ہوں تو دہلی کا تخت مجھے نصیب نہ ہو" یہ ہندوا ور مغل دونوں کو نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اپنے پہلے رتبہ اور اقتدار کو یاد کرکے مغلوں سے (جنھوں نے ان کے بزرگوں کو اُن کی بڑی بڑی ریاستوں سے بے دخل کر دیا اور دہلی اور آگرہ سے دور پہاڑوں کی جانب نکال دیا) سخت نفرت کرتے ہیں اور ان میں سے اگرچہ بعض بعض پہاڑوں میں چھوٹے چھوٹے رئیس بن بیٹھے ہیں مگر کچھ زیادہ طاقت ور نہیں ہیں۔

شاہ بیجاپور بھی خراج نہیں دیتا بلکہ اپنے ملک کے بچانے کے لئے شہنشاہ ہندوستان

---

[۱] معلوم ہوتا ہے کہ شیر شاہ سوری کی سلطنت سے مراد ہے۔

[۲] لودھیوں کی سلطنت سے مراد ہے۔

سے ہمیشہ لڑتا رہتا ہے۔ لیکن اُس کے ملک کی حفاظت کا ذریعہ صرف اُس کی فوج ہی نہیں بلکہ اور بھی بہت سی خاص حالتیں ہیں۔ مثلاً اُس کا ملک آگرہ اور دہلی سے جو شہنشاہ مغل کے دارالسلطنت ہیں بہت فاصلہ پر ہے۔ اور شہر بیجاپور بذات خود بھی ایک مستحکم مقام ہے اور قرب وجوار کے ملک میں گھاس اور پانی کی کمیابی اور خرابی کی وجہ سے حملہ آور فوج کو آسانی کے ساتھ وہاں تک پہنچنا دشوار ہے۔ اور بہت سے راجہ خود اپنے بچاؤ کی خاطر غنیم کے حملہ کے وقت اپنی اپنی فوجیں لے کر اُس کی مدد کو آجاتے ہیں۔ چنانچہ تھوڑا ہی عرصہ ہوا کہ سیواجی نامی ایک مشہور شخص نے خاص شاہی عملداری میں گھس کر بندر سورت کو جو دولت مندی کے لحاظ سے ایک مشہور جگہ ہے خوب لوٹا اور جلایا۔ اور یہ چال چل کر بیجاپور کو عین ضرورت کے وقت بادشاہی فوجوں کے زور اور غلبہ سے بچالیا۔

ان باتوں کے علاوہ شاہ گولکنڈا بھی جو ایک دولت مند اور طاقتور بادشاہ ہے مخفی طور پر اُس کو روپیہ پیسے سے مدد دیتا رہتا ہے۔ اور سرحد پر ہمیشہ اس غرض سے فوج متعین رکھتا ہے کہ ایک تو اپنے ملک کی حفاظت کرے اور دوسرے اگر بیجاپور پر زیادہ زور پڑے تو اُس کو بھی مدد دے سکے۔ الغرض جو لوگ شہنشاہ مغل کو کچھ خراج نہیں دیتے اُن میں تنو سے[1] زیادہ اچھے طاقتور ہندو راجہ بھی شامل ہیں جن کی ریاستیں دہلی اور آگرہ سے کوئی دور کوئی نزدیک تمام سلطنت کے اندر جا بجا پھیلی ہوئی ہیں اور ان میں سے پندرہ

---

[1] فی زمانتا ہندوستان کے چھوٹے بڑے ہندو اور مسلمان والیان ملک جو ملکہ معظمہ کوئین وکٹوریہ قیصرہند کے ظل عاطفت شاہنشاہی میں گورنمنٹ ہند کی پولیٹیکل نگرانی کے نیچے ہندوستان کے مختلف حصوں میں اپنے اپنے علاقوں میں فرماں روائی کا اختیار رکھتے ہیں چار سو پچاس کے قریب ہیں۔ جن میں بعض سے گورنمنٹ انگریزی قابل برداشت اور معینہ طور پر کچھ سالانہ خراج لیتی ہے۔ اور بعض سے کچھ بھی نہیں بلکہ جن کی ریاستوں کی بقا اور قیام کے لئے اپنی بے نظیر فیاضی سے شہنشاہی سرکار نے اُن کے بے اولاد ہونے کی حالت میں عموماً متبنیٰ کر لینے کا بھی اختیار دیا ہوا ہے۔ باعتبار رقبہ کے پانچ لاکھ میل مربع زمین اور پانچ کروڑ رعایا پر ان کی حکومت ہے۔ اور فوج ان کل ریاستوں کی شمار میں تین لاکھ چتالیس ہزار ہے۔ مگر باقاعدہ اور کام کے لائق اور مختلف کیفیت ہونے کی وجہ سے کمی زیادہ تر ہے۔ اور بمقابلہ اس کے کل سلطنت ہند کا رقبہ معہ ملک برہما مفتوحہ بہ دیگر باستثناء بلوچستان و نیپال و بھوٹان کی ریاستوں کے جن کی پیمائش اور مردم شماری ابھی

یا ستولہ تو بہت ہی دولت مند اور زبردست ہیں خصوصاً رانا اودے پور (جو کسی وقت ان راجاؤں کا شہنشاہ خیال کیا جاتا تھا اور جس کو راجہ پورس کی نسل سے بتاتے ہیں) اور جے سنگھ اور جسونت سنگھ ایسے ہیں کہ اگر یہ تینوں اتفاق کرلیں تو شہنشاہ کے لیئے بہت خطرناک ثابت ہوں کیونکہ ان میں سے ہر ایک بیس ہزار سوار لڑائی کے لیئے ہر وقت مہیا کر سکتا ہے اور وہ بھی ایسے عمدہ کہ ہندوستان میں کوئی اُن کے مقابلہ کا نہیں ہے۔ یہ سوار راجپوت کہلاتے ہیں جس کے معنی ہیں راجاؤں کی اولاد سپاہ گری ان کا آبائی پیشہ ہے اور اس شرط پر اُن کو جاگیریں ملتی ہیں کہ ہمیشہ گھوڑے پر سوار راجہ کی رفاقت میں رہیں۔ یہ لوگ بڑے جفاکش ہیں اور اگر لڑائی کے فن کی تعلیم دی جائے تو

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ نہیں ہوئی)، پندرہ لاکھ میل مربع اور قریب چھبیس کروڑ کے مردم شماری ہے پس اس حساب سے منجملہ کل رقبہ سلطنت کے مذکورہ بالا ہندوستانی والیان ملک کے قبضہ میں ایک ثلث زمین ہے۔ اور کل مردم شماری میں سے پانچویں حصہ سے کچھ کم ان کی رعیت ہے اور گورنمنٹ ہند کی آمدنی جو ۱۹۰۵ء کی بجٹ کی رو سے چہتر کروڑ روپیہ ہے اس کے مقابلہ میں ان سب ریاستوں کی آمدنی من کل الوجوہ قریب ایک چوتھائی کے ہے۔ مگر گورنمنٹ انگریزی کی چہتر کروڑ سالانہ آمدنی خزانہ میں وہ کروڑوں روپیہ شامل نہیں ہے جس کو لوکل فنڈ لوکل ریٹ میونسپل فنڈ وغیرہ کہتے ہیں۔ اور جس کا مقصود یہ ہے کہ جس شہر یا ضلع سے جن مقاصد مخصوصہ رفاہ رعایا کے لئے لیا جاتا ہے اُنھیں مقاصد اور اُنھیں مقامات کے سوا اور کسی اور مقام میں صرف نہیں کیا جاتا۔ البتہ چہتر کروڑ روپیہ کی رقم ایسی ہے کہ سرکار جس طرح چاہتی ہے اُس کے خرچ کی تفویق کرتی ہے۔ مگر ہندوستانی ریاستوں کی طرح اُس میں سے کبھی خزانہ سلطنت میں پس انداز اور جمع کچھ نہیں کیا جاتا۔ سال در سال جس قدر آتا ہے باستثنی قدر رعایا کی بہتری اور انتظام سلطنت کے کاموں میں خرچ کر دیا جاتا ہے۔ اور برخلاف شاہجہاں اور عالمگیر کے زمانہ کی طرز حکومت کے جس میں ریاستوں کی رعایا تاہم رعیت زیادہ آرام پاتی تھی اب گورنمنٹ انگریزی کی رعایا زیادہ خوش حال اور فارغ البال ہے۔ م ح

لہ یہ وہی شخص ہے جس کا نام نظامی نے سکندر نامہ میں پور لکھا ہے جو ایک زبردست راجہ تھا جس کا راج کوہ کمایوں سے لے کر قنوج تک تھا اور جو ستلج کے شمالی کنارہ پر سنہ مسیحی سے تین سو اٹھائیس برس پہلے متعدد دنیا کے مشہور و معروف بادشاہ سکندر اعظم سے لڑ کر مغلوب ہو گیا تھا۔ اور سکندر کی سلطنت ہندوستان میں قنوج تک ہو گئی تھی۔ م ح

نہایت ہی عمدہ سپاہی بن سکتے ہیں۔ یہ بات بھی بتا دینی ضروری ہے کہ شہنشاہ مغل مسلمانوں کے "سنی" فرقہ میں سے ہے۔ جیسے کہ ترک لوگ ہیں جو پیغمبر اسلام کا سچا خلیفہ عثمان کو جانتے اور عثمانی[1] کہلاتے ہیں۔ مگر دربار کے امرا زیادہ تر ایرانی ہیں جن کا مذہب شیعہ ہے اور اس امر کے معتقد ہیں کہ برحق خلیفہ علی تھے۔ ان باتوں کے سوا شہنشاہ مغل اس ملک میں اجنبی ہے۔ کیونکہ وہ تیمور کی نسل سے ہے جو اُن مغلوں کا سردار تھا جو ممالک تاتار سے آئے تھے۔ اور جس نے ایک ہزار چار سو ایک میں ہندوستان کو تاخت و تاراج اور فتح کیا تھا اس لحاظ سے گویا دشمنوں کے ملک میں یا کم سے کم ایسے ملک میں جہاں ایک مغل بلکہ ایک مسلمان کے مقابلہ میں سیکڑوں ہندو موجود ہیں قوت قائم رکھنے اور سرحد پر ازبکوں اور ایرانیوں کے حملوں کی روک تھام کے لئے اُس کو صلح کے زمانہ میں بھی ایک بڑی فوج تیار رکھنی پڑتی ہے۔ جس میں یا تو اس ملک کے باشندے بھرتی ہیں جیسے راجپوت اور پٹھان۔ یا نسل مغل اور وہ لوگ جو اگرچہ مغل نہیں ہیں اور اسی وجہ سے اُن کی ویسی قدر بھی نہیں ہے۔ مگر پردیسی اور مسلمان اور گورے رنگ کے ہونے کی وجہ سے مغل ہی کہلاتے ہیں لیکن زمانہ سابق کے موافق امرائے دربار اب اکثر مغل نہیں ہیں۔ یا تو ازبک و ترکستانی ایرانی۔ عرب۔ ترک رومی وغیرہ لوگوں کا مجموعہ ہیں۔ یا ان سب قسم کے لوگوں کی ہندوستان میں پیدا ہونے والی اولاد میں سے ہیں۔ مگر ان سب اقسام کے لوگوں کو ایک عام لقب کے طور پر مغل ہی کہا جاتا ہے۔ مگر ہاں مجھے اس بات کا بیان کر دینا بھی مناسب ہے کہ مذکورہ بالا اقسام کے لوگ اور مسلمانوں کی اولاد جو تیسری چوتھی پشت میں گندمی رنگ اور ہندوستانیوں کی طرح کاہل مزاج ہو جاتی ہے اس کی قدر تازہ وارد لوگوں کی سی نہیں کی جاتی[2] اور اُن کو شاذ و نادر ہی کوئی عہدہ دیا جاتا ہے۔ اور وہ اُس کو اپنی خوش طالعی سمجھتے ہیں کہ کہیں سواروں یا پیدلوں میں نوکری مل جائے۔

شہنشاہ مغل کی فوجی قوت | خداوند من اب اس بات کا موقع ہے کہ میں شہنشاہ مغل

---

[1] سلاطین عثمانیہ کے عثمانی کہلانے کی وجہ اور مصنف کے اس بیان کی غلطی ہم ایک حاشیہ میں اسی جلد کے کسی گذشتہ صفحہ میں لکھ چکے ہیں اُس کو ملاحظہ کرنا چاہیے ۔ س م ح

[2] جیسا کہ ہمارے زمانہ میں بھی بمقابلہ ولایت زا انگریزوں کے مخلوط النسل اور ہندوستان زا انگریزوں کی قدر و منزلت کم ہے ۔ س م ح

کی سپاہ کا خاص طور سے کچھ ذکر کروں تاکہ آپ اُن کثیر اخراجات کے متعلق جو اُس کو فوج کی بابت کرنے پڑتے ہیں اپنی رائے قائم کر سکیں کہ آیا حقیقتاً اُس کی فوج کس قدر ہے اور وہ کن لوگوں میں سے بھرتی کی جاتی ہے۔ پس پہلے میں اُس دیسی فوج کا ذکر کرتا ہوں جس کی تنخواہ کا ادا کرتے رہنا بادشاہ پر واجبات سے ہے۔

واضح ہو کہ بے شک جسونت سنگھ اور دوسرے راجہ جن کو بڑی بڑی رقمیں اس غرض سے ملتی ہیں کہ اپنے ہم قوم راجپوتوں کی ایک خاص تعداد شاہی خدمات کے لئے ہمیشہ تیار رکھیں ان کی فوجیں اسی ذیل میں ہیں۔ اور اُن سے خواہ اُس فوج میں کام لیا جاتے جو ہمیشہ حاضر رکاب رہتی ہے خواہ کسی صوبہ میں مگر منصب مسلمان اُمرا کے برابر ہیں۔ اور جن قاعدوں کی پابندی اُن پر واجب ہے۔ ان پر بھی واجب ہے یہاں تک کہ اپنی جمعیت کے ساتھ معمولی چوکی دینے کو حاضر ہوتے ہیں۔ مگر اتنا فرق ہے کہ جب کبھی بادشاہ قلعہ میں ہوتا ہے تو یہ باہر اپنے خیموں ہی میں رہ کر نوکری بجا لاتے ہیں۔ اور چوبیس گھنٹے تک قلعہ کی دیواروں کے اندر محصور رہنے کو گویا انہیں کر سکتے اور جب تک کہ ان کے جاں باز راجپوت سپاہی ساتھ نہ ہوں کسی قلعہ کے اندر جانا قبول نہیں کرتے۔ راجپوتوں کی جاں بازیوں کا امتحان ایسے موقعوں پر بخوبی ہو چکا ہے۔ جب کہ کسی راجہ کو قید کر لینے کا ارادہ کیا گیا۔

راجپوت راجاؤں کی فوج میں بھرتی کرنے کے اسباب

بادشاہ جو ان راجاؤں کو اپنی ملازمت میں رکھتا ہے اس کے کئی سبب ہیں۔ اول یہ کہ راجپوت نہ صرف عمدہ سپاہی ہیں بلکہ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں بعض راجہ ایک روز میں بیس ہزار سپاہی لڑائی کے لئے حاضر کر سکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جو راجہ پادشاہی ملازم نہیں ہیں اور خراج دینے یا ضرورت کے وقت جنگی خدمات کے بجا لانے کے عوض خود مقابلہ کو تیار ہو جاتے ہیں اُن کی مزاحمت اور تنبیہ و تادیب کا کام ان سے لیا جاتا ہے۔ تیسرے یہ کہ شہنشاہ مغل کی یہ پالیسی ہے کہ ان راجاؤں کے درمیان نااتفاقی اور حسد و رشک قائم رہے۔ چنانچہ جب چاہتا ہے کسی ایک کی نسبت اپنی مہربانی و التفات کا اظہار کر کے اُن میں لڑائی کرا دیتا ہے چوتھے یہ کہ راجپوت لوگ پٹھانوں کی باغی امیروں صوبہ داروں کے دبانے کے لئے کارآمد ہوتے ہیں۔ اور اس کام کے لئے ہمیشہ مستعد اور تیار رہتے ہیں۔ پانچویں یہ کہ جب کبھی گولکنڈے کا بادشاہ خراج ادا نہیں کرتا یا شاہ بیجاپور

یا اپنے کسی اور ہمسایہ راجہ کی مدد کو جس کو شہنشاہ مغل مطیع کرنا چاہتا ہے تیار ہو جاتا ہے۔ تو اُس کے مقابلہ کے لئے ان راجاؤں کو اور امرا پر جو اکثر ایرانی اور بادشاہ گولکنڈے کے ہم مذہب ہیں ترجیح دی جاتی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ یہ راجہ اُس وقت کام آتے ہیں جب کہ شاہ ایران سے لڑائی کا موقعہ آن پڑتا ہے اور امرائے دربار جو ایران کے رہنے والے ہیں جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا ہے اس خیال سے کانپتے ہیں کہ اپنے اصلی بادشاہ سے لڑیں خصوصاً وہ اُس کو اولاد علی[1] اور اپنا امام اور خلیفہ ماننے کی وجہ سے اُس کے مقابلہ میں ہتھیار اٹھانے کو نہایت گناہ سمجھتے ہیں۔

اور جن اسباب کے تحت راجپوتوں کی فوج رکھی جاتی ہے اُسی قسم کی وجوہ سے شہنشاہ مغل کو پٹھانوں کی بھی ایک فوج موجود رکھنی پڑتی ہے۔

ولایتی مغل فوج مغلیہ فوج کا (جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں) تیار رکھنا بھی ایسا ہی ضروری ہے۔ چونکہ سلطنت کی اصل فوج یہی سپاہ ہے۔ اور اس پر بڑا روپیہ صرف ہوتا ہے۔ اس لئے امید ہے کہ آپ کے نزدیک بھی اس کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جانا بے موقعہ نہ ہوگا۔ اس فوج میں سوار بھی ہیں اور پیادے بھی۔ اور اس کے دو حصے خیال کئے جا سکتے ہیں جن میں سے ایک تو ہمیشہ حاضر رکاب اور دوسرا مختلف صوبوں میں متعین رہتا ہے۔ فوج حاضر رکاب میں سے پہلے اُمرا پھر منصب دار پھر روز ینہ دار اور سب سے اخیر میں معمولی سواروں کا ذکر کر کے اس کے بعد فوج پیادہ اور اُس کے ضمن میں بندوقچیوں اور تمام پیدل سپاہیوں کا جو دونوں قسم کے توپ خانوں میں کام دیتے ہیں بیان کرتا ہوں۔

دربارِ مغلیہ کے امرا کی حیثیت یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ دربارِ مغلیہ کے امیر بھی امرائے فرانس کی طرح موروثی امیر ہیں۔ کیونکہ سلطنت کی تمام زمین بادشاہ کی ملکیت ہے اور اسی وجہ سے یہاں کوئی ایسی خاندانی ریاست نہیں ہے جیسے کہ ہمارے ہاں کی ڈیوک یا مارکوئیس کی ہوتی ہے اور نہ کوئی ایسا خاندان پایا جا سکتا ہے جو خود اپنی

[1] مصنف کے زمانہ میں یہ ایک اتفاقی بات تھی کہ شاہانِ صفویہ فرماں روائے ایران ذات کے سید تھے مگر اُن کا امام یا خلیفہ مانا جانا بالکل غلط ہے۔ گو سیادت کے باعث سے کیسے ہی واجب الادب سمجھے جاتے ہوں۔ س م ح

ملکیت کی زمین اور جائداد موروثی وخاندانی کی وجہ سے صاحب ثروت گنا جاتا ہو۔ اور اسی کی آمدنی سے اُس کے اخراجات چلتے ہوں۔ بلکہ برعکس اس کے یہاں کے اہل دربار تو اکثر ایسے ہیں جن کے باپ تک بھی امیر نہ تھے۔ اور چونکہ اُمرا کی کل جائداد اُن کے مرتے ہی ضبط سرکار ہو جاتی ہے اس لئے ظاہر ہے کہ کسی خاندان کا اعزاز وامتیاز دیر تک کس طرح قائم رہ سکتا ہے۔ بلکہ اکثر تو امیر کے مرتے ہی سب کچھ نیست ونابود ہو جاتا ہے۔ اور اُس کے بیٹوں کی نہیں تو پوتوں کی حالت تو ضرور فقیروں کی سی ہو جاتی ہے۔ اور عام لوگوں کی طرح کسی امیر کی فوج کے سواروں میں نوکری کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مگر ہاں اتنی رعایت ضرور ہوتی ہے کہ جو امیر مر جاتا ہے جائداد ضبط کر لینے کے بعد بادشاہ اُس کی بیوہ کے لئے تو عموماً اور اہل خاندان کے لئے اکثر کسی قدر وظیفہ مقرر کر دیتا ہے۔ لیکن اگر کوئی امیر بڑی عمر پاتا ہے تو اپنے جیتے جی اپنی اولاد کے لئے بشرطیکہ بادشاہ کی مہربانی ہو کوئی منصب بھی حاصل کر سکتا ہے خصوصاً اُس حالت میں جب کہ وہ ڈیل ڈول اور چہرے مہرے کے اچھے اور رنگ کے بھی گورے چٹے ہوں۔ جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ وہ اصل مغل ہیں۔ لیکن اس شاہی عنایت کی صورت میں بھی بیٹا باپ کا جانشین نہیں ہو جاتا۔ کیونکہ یہ معمولی قاعدہ ہے کہ چھوٹے اور قلیل تنخواہ کے منصب تک رفتہ رفتہ اور بہت تدریج کے ساتھ ترقی ملتی ہے۔ اس لئے امرائے سلطنت ایسے مختلف الاقوام شخصوں کا مجموعہ ہیں۔ جو ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی قسمت آزمائی کے لئے ممالک غیر سے یہاں آ گھستے ہیں۔ اور اکثر کم نسلے بلکہ غلام۔ اور باستثنار بعض خاص شخصوں کے عموماً علم سے بے بہرہ ہیں اور ان کا اعلیٰ سے اعلیٰ منصب پر پہنچا دینا یا بالکل ذلیل وخوار بنا دینا محض بادشاہ کی خوشی اور تلون طبع پر موقوف ہے۔

امرا کے مدارج اور تنخواہیں بعض امیروں کا منصب اور لقب ہزاری ہے۔ یعنی ایک ہزار کا مالک اور بعض کا دو ہزاری پنج ہزاری اور بعض کا ہفت ہزاری۔ اور بعض کا دہ ہزاری۔ اور کسی وقت کوئی امیر دوازدہ ہزاری بھی ہو جاتا ہے جیسا کہ خستشاہِ مغل کا بڑا بیٹا تھا۔ مگر ان کی تنخواہ کا اندازہ سواروں کے شمار پر نہیں ہے۔ بلکہ بہ لحاظ گھوڑوں کی تعداد کے ہے۔ اور عموماً ہر ایک سوار کو دو گھوڑے رکھنے کی اجازت ہے تا کہ نوکری میں حرج نہ ہو۔ کیونکہ اُس گرم ملک میں یہ ایک کہاوت ہے کہ ایک گھوڑے کا سوار لنگڑا ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ امیروں کو فی الواقع دوازدہ ہزاری وغیرہ بڑے

بڑے القاب کے مطابق اُتنے ہی گھوڑے ضرور رکھنے پڑتے ہیں۔ یہ عظیم الشان لقب جو زود اعتقاد اور اجنبی لوگوں کے بہکانے اور دھوکا دینے کے لئے ایجاد کئے گئے ہیں ٹھیک ٹھیک انھیں کے موافق تنخواہ ملتی ہے۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ بادشاہ خود مقرر کر دیتا ہے کہ ہر ایک امیر کو حقیقتاً کتنے گھوڑے رکھنے لازم ہیں اور کتنے رعایتاً معاف اور فرضی ہیں جن کی تنخواہ اس کو ملتی رہے گی سو اور یہ فرضی سواروں کی تنخواہ میں سے کچھ وضع کر کے اور اُن گھوڑوں کی جو حاضر رکھنے لازمی ہیں جھوٹی فردیں پیش کر کے اپنی آمدنی اور بھی بڑھا لیتے ہیں۔ جو اس طرح بدل جل کر بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ خصوصاً جب کہ خوش قسمتی سے تنخواہ کے عوض جاگیر مل جائے چنانچہ میں ایک پنج ہزاری امیر کے ماتحت ملازم تھا جس کے پاس جاگیر بھی دی تھی اور صرف نقد تنخواہ خزانہ سے ملتی تھی۔ مگر اس پر بھی پانچ سو گھوڑوں کی تنخواہ وغیرہ کے ادا کرنے کے بعد جو اُس کو حاضر رکھنے لازمی تھے پانچ ہزار کراؤن یعنی ساڑھے بارہ ہزار روپیہ ماہوار اُس کی آمدنی تھی۔ مگر باوجود ان بڑی بڑی آمدنیوں کے میں نے ان امیروں کو بہت کم مالدار پایا۔ بلکہ بہت مفلس اور نہایت قرضدار ہیں۔ اور یہ قرضداری اس وجہ سے نہیں ہے کہ اور ملکوں[1] کے امیروں کی طرح کھانے کھلانے میں بہت کچھ خرچ کر دیتے ہیں بلکہ نہایت قیمتی پیشکش جو سالانہ جشنوں کے موقعوں پر بادشاہ کو دینے پڑتے ہیں اور اُن کی عورتوں اور نوکر چاکروں کا ایک لشکر اور اونٹوں اور گھوڑوں کی کثرت اس کا باعث ہوتا ہے[2]۔

---

[1] یورپ کے لارڈوں وغیرہ سے مراد ہے۔ س م ح

[2] آئین اکبری میں جو درجہ وار فہرستیں ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ امرا اور منصب داروں کو باقاعدہ اپنے اپنے منصب کے گھوڑے یابو۔ ہاتھی۔ اونٹ۔ خچریں اور چھکڑے گاڑیوں کا ایک مقرر تعداد کے موافق اپنے پاس موجود رکھنا امر لازمی تھا۔ مثلاً پنج ہزاری امیر کو تین سو چالیس گھوڑے اور یابو اور ایک سو ہاتھی اور اسی قطار اونٹ اور بیس قطار خچریں اور ایک سو ساٹھ ارابہ یعنی چھکڑے اور گاڑیاں رکھنی واجب تھیں اور ان کے خرچ خوراک وغیرہ کے لئے پنج ہزاری کے منصب دار کو علاوہ تنخواہ فوج کے جو اس کو رکھنی پڑتی تھی) تیس ہزار روپیہ ماہوار سرکار شاہی سے ملتا تھا۔ اور چار ہزاری کے منصب دار کو دو سو ستر گھوڑے اور اسی ہاتھی اور پینسٹھ قطار اونٹ اور سترہ قطار خچریں اور ایک سو تیس ارابہ رکھنے پڑتے تھے۔ اور بائیس ہزار روپیہ ماہوار ملتا تھا۔ س م ح

امرا کی تعداد اور اُن کی سواری کے طریقے

امرائے متعینہ صوبہ جات۔ اور امرائے مامور با افواج اور امرائے حاضرین دربار بہت سی ہیں۔ مگر کچھ تعداد مقرر نہیں ہے۔ اور میں معلوم نہیں کرسکا کہ سب کتنے ہیں۔ لیکن دربار میں پچیس یا تیس سے کم میں نے کبھی نہیں دیکھے جو سب کے سب بڑی بڑی تنخواہیں پاتے ہیں جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ اور جو گھوڑوں کی تعداد پر موقوف ہے۔ جو ایک ہزار سے لے کر بارہ ہزار تک مقرر ہے۔ انھیں امرا کو افواج مامورہ مہمات اور صوبجات اور دربار میں بڑے بڑے عہدے ملتے ہیں۔ اور یہی لوگ ارکان سلطنت ہیں جیسے کہ وہ خود بھی کہلاتے ہیں۔ اور دربار کی شان و شوکت انھیں کے وجود سے قائم ہے۔ اور یہ نہایت عمدہ پوشاک کے بغیر کبھی گھر سے باہر نہیں نکلتے۔ اور کبھی ہاتھی اور کبھی گھوڑے پر اور اکثر پالکی میں سوار ہوتے ہیں جن کے ساتھ سواروں کے دستہ کے علاوہ بہت سے خدمت گار وغیرہ ہوتے ہیں جو سواری کے آگے آگے اور دونوں طرف پاپیادہ چلتے ہیں جو نہ صرف راستہ میں سے لوگوں کو ہٹاتے ہیں بلکہ مورچھل ہلاتے اور گرد و غبار جھاڑتے اور خلال اور پیک دان اور پانی کی صراحی اور کبھی کبھی کوئی قصہ کہانی کی کتاب یا کاغذ لے کر ساتھ رہتے ہیں۔

امرا کی حاضری اور تسلیمات کے طریقے

ہر ایک امیر کو واجب ہے کہ ہر روز صبح کو دس گیارہ بجے جب کہ بادشاہ دربار میں عدالت کے لئے بیٹھتا ہے۔ اور پھر شام کو چھ بجے تسلیمات کے لئے حاضر ہو ورنہ سزا ملتی ہے۔ اور ہر ایک کو اپنی اپنی باری پر قلعہ میں حاضر ہو کر ہفتہ وار ایک رات دن چوکی دینی پڑتی ہے۔ اُس وقت یہ لوگ اپنا بستر اور قالین اور اور سامان ساتھ لاتے ہیں مگر کھانا شاہی خاصہ میں سے عنایت ہوتا ہے جس کے ملنے کے وقت ایک خاص رسم ادا کی جاتی ہے۔ یعنی کھڑے ہو کر اور بادشاہ کے محل کی طرف رخ کر کے امیر تین دفعہ تسلیمات بجا لاتا ہے۔ یعنی اپنا ہاتھ اول زمین تک لے جا کر پھر ماتھے تک اُٹھاتا ہے۔

شاہی سواری کے ساتھ ہمرکابی

جب کبھی بادشاہ پالکی یا ہاتھی یا تختِ رواں پر سوار ہو کر نکلتا ہے تو تمام امرا کے لئے بجز اُن کے جو بیمار یا ضعیف العمر یا کسی خاص کام کی وجہ سے معاف ہوں ہمرکاب رہنا ضروری ہے۔ البتہ جب کبھی شہر کے قرب و جوار میں شکار کو یا کسی باغ کو یا نماز کے لئے مسجد کو جاتا ہے تو بعض اوقات چیدہ

بھی چلا جاتا ہے یعنی صرف وہی امراء ساتھ ہوتے ہیں جن کی اس روز چوکی ہوتی ہے — اور دستور ہے کہ بادشاہ پرتو خواہ شکار میں ہو خواہ فوج کو ساتھ لے کر کسی مہم پر جاتے خواہ ایک شہر سے دوسرے شہر کو جاتا ہو بخوبی سایہ ہوتا ہے۔ مگر امراء کو خواہ کیسی ہی دھوپ یا بارش کیوں نہ ہو اور گرد و غبار سے دم کیوں نہ گھٹا جاتے عموماً گھوڑے پر چڑھ کر بغیر کسی طرح کے سایہ کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔

منصب داروں کی تنخواہ کی تفصیل منصب دار ایک قسم کے سوار ہیں جو منصب کی تنخواہ پاتے ہیں۔ اور وہ ایک خاص قسم کی بیش قرار اور عزت کی تنخواہ ہے۔ اور اگرچہ امراء کی تنخواہ کے برابر نہیں ہے۔ مگر معمولی سواروں سے بہت زیادہ ہے اور اسی وجہ سے یہ کم درجہ کے امراء میں شمار ہوتے ہیں۔ اور انھیں میں سے امراء منتخب کئے جاتے ہیں۔ اور یہ بادشاہ کے سوا کسی کے ماتحت نہیں ہیں اور جو کام امرا سے لئے جاتے ہیں وہی ان سے لئے جاتے ہیں اور اگر اُن کے پاس بھی کسی قدر سوار ہوں جیسا کہ پہلے دستور تھا تو یہ بھی امراء کے برابر ہو جائیں مگر آج کل ان کے پاس صرف دو یا چار یا چھ گھوڑے ہوتے ہیں جن پر بادشاہی داغ لگا ہوا ہوتا ہے ان کی تنخواہ بعض اوقات ڈیڑھ سو روپیہ مہینہ ہوتی ہے۔ اور سات سو روپیہ ماہوار سے زیادہ کبھی نہیں ہوتی۔ ان کی تعداد معین نہیں ہے — لیکن امراء کی بہ نسبت بہت زیادہ ہیں اور ان کے سوا جو صوبوں میں یا افواج مامورہ مہمات میں متعین ہیں میں نے دربار میں دو تین سو سے کم کبھی نہیں[1] دیکھے۔

---

[1] امراء اور منصب داروں کی اسم وار فہرستیں جو بادشاہ نامہ میں موجود ہیں اُن سے ظاہر ہے کہ شاہجہاں کی حکومت کے دہ سالہ اول کے خاتمہ تک کل امیر اور منصب دار ہفت ہزاری سے پانصدی تک پانچ سو بانوے تھے جن میں سے ایک سو اڑسٹھ شخص اسی دہ سالہ میں مر گئے تھے اور ان کے علاوہ شہزادہ دارا شکوہ پنجدہ ہزاری اور شجاع اور اورنگ زیب دوازدہ ہزاری تھے اور شاہزادہ مراد بخش کو محض پانچ سو روپیہ روزینہ ملتا تھا۔ کیونکہ شاہزادوں کے لئے (بقول خافی خاں) دستور یہ تھا کہ جب تک اُمرا کی طرح کسی مہم وغیرہ پر مامور نہ ہوں منصب نہیں دیا جاتا تھا۔ اور صرف یمین الدولہ آصف خاں خانخاناں سپہ سالار وزیر اعظم (بطور ایک غیر معمولی عنایت کے) نہ ہزاری تھا۔ اور دہ سالہ دوئم کے خاتمہ میں جو فہرست ہے اُس میں شاہزادہ دارا شکوہ بست ہزاری اور شجاع اور اورنگ زیب پنجدہ ہزاری اور مراد بخش دوازدہ ہزاری تھے۔ اور آصف خاں کے مر جانے کے بعد نہ ہزاری کا

روزینہ داروں کی تنخواہ اور خدمات روزینہ دار بھی ایک قسم کے سوار ہی ہیں جن کی تنخواہ روزمرہ مل جاتی ہے جیسا کہ خود لفظ روزینہ دار سے ظاہر ہے۔ مگر اُن کی تنخواہ بیش قرار ہے۔ اور بعض اوقات تو اکثر منصب داروں سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ مگر یہ تنخواہ چونکہ خاص طور کی ہوتی ہے اس وجہ سے کچھ زیادہ عزت کی بات خیال نہیں کی جاتی۔ اور منصب داروں کی طرح یہ لوگ۔ اجناس یعنی ایسے قالین اور فرش فروش وغیرہ کے قیمتًا لینے پر بھی مجبور نہیں ہیں جو بادشاہی مکانوں میں استعمال میں آنے کے بعد منصب داروں کو حکمًا لینے پڑتے ہیں۔ اور بعض اوقات ایک فیروا جب قیمت لگا دی

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ منصب پھر کسی کو نہیں ملا۔ ہفت ہزاری کے درجہ تک رجو معمولی طور پر اس سے زیادہ منصب ہی نہ تھا اور بقول خافی خاں "ایک وقت میں چار امیروں سے زیادہ ہفت ہزاری نہ ہوتے تھے۔ اس دہ سالہ میں صرف چھ امیر پہنچے تھے۔ خان دوراں بہادر نصرت جنگ علی مردان خاں امیر الامرا۔ سعید خاں بہادر ظفر جنگ۔ اسلام خاں۔ علامی سعد اللہ خاں۔ افضل خاں اور شش ہزاری کا منصب سید خان جہان بارہہ وال۔ اعظم خاں۔ عبد اللہ خاں بہادر فیروز جنگ صدر الصدور سید جلال بخاری۔ خسرو ولد نذر محمد خاں ازبک والی ترکستان صرف پانچ شخصوں نے پایا تھا۔ ہندو امرا کی حد ترقی رجن کو آج کل کی انگریزی اصلاح کے موافق نیٹو کہنا چاہیئے) دوسرے دہ سالہ تک پنج ہزاری سے زیادہ نہ تھی) اور اس دہ سالہ کی فہرست میں کل پانچ سو آٹھ نام ہیں۔ جن میں سے ایک سو آٹھ یا بہ قدر پانچویں حصہ کے ہندو ہیں اور ایک اور فہرست سے جو تاریخ عمل صالح کے خاتمہ میں مندرج ہے۔ شاہجہاں کے عہد اخیر تک امرا اور منصب داروں کی تعداد آٹھ سو اڑسٹھ معلوم ہوتی ہے۔ جس میں ایک سو تریسٹھ ہندو امیروں کے نام درج ہیں۔ مگر چونکہ اس میں آصف خاں وعلی مردان خاں و سعد اللہ خاں وغیرہ کے نام بھی درج ہیں جو شاہجہاں کے مقید ہونے سے پہلے ہی مر چکے تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اُس فہرست میں اس بادشاہ کے سب زندہ و مردہ امیروں کو گن ڈالا ہے۔ اور اگرچہ حسب شرح بالا دہ سالہ اول و دوم میں کوئی نیٹو امیر پنج ہزاری سے زیادہ نہ تھا مگر دور اخیر میں یہ قید بھی توڑ دی گئی تھی۔ چنانچہ مہاراجہ جسونت سنگھ ہفت ہزاری اور راجہ مرزا جے سنگھ شش ہزاری ہو گئے تھے۔ ۱۲ س م ح

جاتی ہے۔ ان لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور چھوٹے چھوٹے کام ان کے متعلق ہیں۔ چنانچہ ان میں سے بہت سے متصدی اور نائب متصدی ہیں اور بہت سے اس کام پر مامور ہیں کہ "برات" یعنی اُن احکام پر جو روپیہ کے ادا کرنے کے باب میں صادر ہوتے ہیں سرکاری مُہر لگائیں اور وہ اُن احکام کے جلد جاری کر دینے کے عوض بے دھڑک رشوتیں لیا کرتے ہیں۔

عام سواروں کی تنخواہ کی تفصیل عام سوار اُمرا کے ماتحت کام کرتے ہیں۔ اور دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ ایسے جن کا پادشاہی خدمت کے واسطے حاضر رکھنا امرا پر لازم ہے اور جن کے گھوڑوں کی رانوں پر اُن امیروں کے داغ لگے ہوتے ہیں دوسرے ایک ایسے دو گھوڑے والوں کی تنخواہ اور قدر بہ نسبت ایک گھوڑے والوں کے زیادہ ہے۔ اور اگرچہ سرکار سے ایک ایسے سوار کی بابت روپیہ ماہوار کے حساب سے تنخواہ ملتی ہے۔ لیکن سواروں کو کم یا زیادہ دینا بہت کچھ امیر کی فیاضی پر موقوف ہے۔

پیدل سپاہی اور گولہ انداز پیدل سپاہیوں کی تنخواہ سب قسم کے مذکورہ بالا تنخواہ داروں سے کمتر ہے۔ اور منجملہ اُن کے جو لوگ بندوقچی ہیں حقیقت یہ ہے کہ وہ تو اچھے خاصے آرام کے وقت میں بھی، بہت ہی بدہیئت معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً بندوق چلانے کو جب زمین پر پھسکڑا مار کر! بیٹھتے ہیں اور اپنی بندوق کو لکڑی کے سہ پاؤں پر رکھکر جو بندوق کے ساتھ لٹکتی رہتی ہیں۔ چلاتے ہیں تو اُن کی یہ دھج دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ اور ماشاءاللہ اس احتیاط پر بھی یہ خوف لگا رہتا ہے کہ کہیں ہماری لمبی لمبی ڈاڑھیاں اور آنکھیں نہ جل جائیں! یا کسی جن بھوت کے خلل سے ہماری بندوق نہ پھٹ جائے۔

پیدل سپاہ میں کسی کی تنخواہ بیس روپیہ مہینہ ہے۔ کسی کی پندرہ اور کسی کی دس۔ مگر گولہ اندازوں کی تنخواہ بہت زیادہ ہے۔ خصوصاً فرنگی گولہ اندازوں کی یعنی پرتگیزوں انگریزوں، ڈچوں، جرمنوں اور فرانسیسوں کی جو گوا اور ڈچ و انگریز کمپنیوں کے کارخانوں میں سے بھاگ آتے ہیں۔ اول جب مغل توپ کے فن سے بہت کم واقف تھے تو اہلِ فرنگ کی تنخواہ زیادہ تھی اور اُن میں سے اب بھی کچھ لوگ باقی ہیں کہ جن کو دو سو روپیہ ماہوار ملتا ہے۔ مگر اب بادشاہ ان لوگوں کو مشکل سے نوکر رکھتا ہے۔

اور چھبیس روپیہ سے زیادہ تنخواہ نہیں دیتا۔

توپ خانہ توپ خانہ دو قسم کا ہے ایک بھاری دوسرا ہلکا جس کو ہم رکاب توپ خانہ کہتے ہیں۔ بھاری توپ خانہ کی بابت مجھے یاد ہے کہ جب بادشاہ بیماری کے بعد فوج سمیت لاہور کے راستہ سے گرمی کاٹنے کو کشمیر کو گیا تھا جس کو ہندوستان میں "کشمیر جنت نظیر" کہتے ہیں۔ تو اُس سفر میں زنبورکوں کے علاوہ جو دو تین سو چاق و چوبند اونٹوں پر اُسی طور سے کسے ہوئے تھے جس طرح ہمارے چھوٹے جہازوں میں رہکلے بند سے رہتے ہیں اور جو وزن میں دو دو بندوقوں کے برابر تھے۔ ستر بھاری توپیں جو اکثر برنجی تھیں ساتھ تھیں۔

بادشاہ کے سفر کشمیر کا حال میں کسی اور موقعہ پر بیان کروں گا۔ اور یہ بھی لکھوں گا کہ اُس لمبے سفر میں بادشاہ اکثر اپنا دل شکار میں کس کس طرح بہلاتا رہا۔ یعنی کبھی شکاری پرندوں کو کلنگ وغیرہ جانوروں پر چھوڑا اور کبھی نیل گائے کا شکار کیا جو ایک ° کی قسم کا جانور ہے۔ اور کسی دن چیتوں سے ہرنوں کو پکڑوایا۔ اور کبھی شیر کا شکار کھیلا جو بالتخصیص بادشاہی شکار ہے۔

ہم رکاب توپ خانہ جولاہور اور کشمیر کے سفر میں ساتھ گیا تھا مجھکو نہایت باقرینہ معلوم ہوتا تھا۔ اور اُس میں پچاس یا ساٹھ چھوٹی چھوٹی برنجی توپیں تھیں جو سب مضبوط اور خوبصورت رنگین تختوں پر چڑھی ہوئی تھیں جن کے ساتھ گولے بارود کے لئے ایک آگے اور ایک پیچھے دو دو پٹیاں تھیں اور ان پر سجاوٹ کے لئے مختلف وضع کی سرخ جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں ان میں دو دو عمدہ گھوڑے جُتے تھے۔ جن کو ایک ایک سوار ہانکتا تھا اور ایک تیسرا گھوڑا اور ایک اور سپاہی مدد کے واسطے ساتھ لئے رہتا تھا۔

بھاری توپ خانہ بادشاہ کے ساتھ نہیں رہتا تھا کیونکہ شکار کھیلنے یا پانی سے نزدیک رہنے کی غرض سے بادشاہ شاہراہ سے علیحدہ ہو کر چلتا تھا اور یہ توپیں ایسی بھاری تھیں کہ دشوار گذار راستوں یا کشتیوں کے پُلوں پر سے جو شاہی لشکر کے عبور کے لئے بنائے گئے تھے گذر نہیں سکتی تھیں۔ لیکن ہلکا توپ خانہ ہمیشہ بادشاہ کے ساتھ رہتا ہے۔ اور اسی لئے اُس کو ہم رکاب توپ خانہ کہتے ہیں۔ اور جب بادشاہ علی الصبح کوچ کرتا ہے۔ اور شکارگاہوں میں جو بادشاہ کے واسطے محفوظ ہوتے ہیں اور جانوروں کے روکے رکھنے کے لئے اُن کی ناکہ

بندی بھی شکار کے وقت کی جاتی ہے بندوق سے یا اور طرح شکار کھیلنا چاہتا ہے تو یہ توپ خانہ جس قدر جلد ممکن ہوتا ہے سیدھا اگلی منزل پر جہاں بادشاہ اور بڑے بڑے اُمراء کے خیمے پہلے سے لگے ہوئے ہوتے ہیں جا ٹھہرتا ہے۔ اور خیام شاہی کے سامنے توپوں کی قطار لگا دی جاتی ہے۔ اور جب بادشاہ خیمہ گاہ میں داخل ہوتا ہے تو اہلِ لشکر کی اطلاع کے لئے سلامی دی جاتی ہے۔

صوبوں کی فوج اور سواروں کی کُل فوج

جو فوج صوبوں میں مامور رہتی ہے اُس کی اور حاضر رکاب فوج کی حالت میں اس کے سوا اور کچھ فرق نہیں ہے کہ صوبوں کی فوج تعداد میں زیادہ ہے۔ اور ہر ایک صوبہ میں اُمراء منصب دار روزینہ دار، معمولی سوار، پیادے۔ اور توپ خانہ موجود رہتا ہے۔ چنانچہ ایک صوبہ دکن ہی میں بیس پچیس اور بعض اوقات تیس ہزار سوار رہتے ہیں جو کول کنڈے کے طاقتور بادشاہ کے دھمکانے اور بادشاہ بیجاپور اور اُن راجاؤں سے لڑنے کے لئے ضرورت سے کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ جو باہمی بچاؤ کی خاطر اپنی اپنی فوجیں لے کر شاہ بیجاپور کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔ صوبہ کابل میں جو فوج ہے اور جس کا ایران۔ بلوچستان۔۔۔ افغانستان اور سرحدی پہاڑی ملکوں کی مخالفانہ کارروائیوں کی روک تھام کے لئے رہنا ضروری ہے بارہ یا پندرہ ہزار سے کم نہیں ہو سکتی۔ صوبہ کشمیر میں چار ہزار سے زیادہ فوج ہے۔ اور بنگالہ میں جہاں ہمیشہ لڑائی جھگڑا رہتی ہے بہت زیادہ فوج رہتی ہے۔ اور چونکہ کوئی صوبہ ایسا نہیں ہے کہ جس میں بلحاظ اُس کی وسعت اور خاص موقعہ کے کم یا زیادہ فوج کا رکھنا ضروری نہ ہو۔ اس لئے کُل فوج کی تعداد اس قدر ہے جس پر مشکل سے اعتبار ہو سکتا ہے۔ چنانچہ فوج پیادہ کو جو شمار میں کم ہے الگ رکھ کر اور گھوڑوں کی اُس تعداد کو جو صرف نام کے لئے ہے اور جس کو سُن کر ناواقف شخص دھوکہ کھا سکتا ہے چھوڑ کر میں اور واقف کار لوگ خیال کرتے ہیں کہ سوار جو بادشاہ کے ہمرکاب رہتے ہیں راجپوتوں اور پٹھانوں سمیت پینتیس یا چالیس ہزار ہوں گے جو صوبوں کی فوج کے ساتھ مل کر دو لاکھ سے زیادہ ہوتے ہیں۔

پیدل فوج کی اصل تعداد اور لوگوں کے غلط اندازے

میں نے بیان کیا ہے کہ پیدل تھوڑے ہیں چنانچہ میری دانست میں پیادہ

فوج جو بادشاہ کے ہم رکاب رہتی ہے بندوقچیوں اور توپ خانہ کے پیدل سپاہیوں اور ان لوگوں سے جو توپ خانہ سے متعلق ہیں مل جل کر پندرہ ہزار سے زیادہ نہیں ہے - اور اسی سے صوبوں کی فوج کا اندازہ کیا جا سکتا ہے - مگر میں نہیں جانتا کہ بعض لوگ پیدل فوج کی تعداد کیوں بہت زیادہ بتاتے ہیں - شاید نفروں خدمت گاروں بھٹیاروں اور تمام اہل بازار کو جو ساتھ رہتے ہیں فوج ہی میں گن لیتے ہوں گے - اور واقعی اگر اس سب بھیڑ بھاڑ کو شامل کر لیا جائے تب تو صرف اُسی لشکر کی تعداد جو بادشاہ کی ذات خاص کے ساتھ رہتا ہے خصوصاً جب کہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ بادشاہ کا ارادہ کچھ مدت کے لئے تخت گاہ سے باہر رہنے کا ہے دو تین لاکھ پیادوں سے کم نہیں رہتی اور جب ان امور پر غور کیا جائے کہ کس قدر ڈیرے خیمے اور باورچی خانے اور اسباب اور ساز و سامان اور عورتیں عموماً لشکر کے ساتھ رہتی ہیں اور ان سب کے اٹھانے کے لئے کس قدر ہاتھی اونٹ بیل - گھوڑے اور حمال ضروری ہیں تو اس تعداد میں جو میں نے خیال کی ہے مبالغہ نہیں معلوم ہوگا[1] -

---

[1] بادشاہ نامہ میں جو شاہجہاں کے عہد سلطنت کے بیس سال کی بہت معتبر تاریخ ہے سوار فوج کی تعداد بموجب تفصیل ذیل دو لاکھ لکھی ہے - منصب دار - آٹھ ہزار - احدی اور برقنداز سات ہزار عام سوار ایک لاکھ پچاسی ہزار - اور پیدل فوج کی تعداد جس میں گولنداز - بان انداز اور بندوقچی سب شامل ہیں چالیس ہزار لکھی ہے جس میں سے دس ہزار حاضر رکاب اور تیس ہزار صوبوں اور قلعوں میں متعین رہتی تھی -

اور اب ہمارے زمانہ میں گورنمنٹ انگریزی کی اس فوج بری کی تعداد جو "رگولر" یعنی فوج آئین کہلاتی ہے حسب شرح ذیل دو لاکھ سولہ ہزار ایک سو دو ہے -

یوروپین	ہندوستانی	
۷۰۲۴۲	۱۴۵۹۳۹	
	ماتحت جناب کمانڈر انچیف سپہ سالار کشور ہند	ماتحت گورنمنٹ ہند
پیدل ۵۲۶۰۱	پیدل ۱۴۵۸۹	پیدل ۱۲۸۳۸
سوار ۵۶۵۷	سوار ۲۱۲۷۵	سوار ۴۸۳۹
توپ خانہ ۱۲۰۰۵	توپ خانہ ۱۸۳۳	توپ خانہ ۵۵۵
میزان ۷۰۲۴۳	میزان ۱۲۷۴۹۶	میزان ۱۸۲۳۲

مدد اور خدمت - یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ اس ملک کی طبعی حالت اور طرزِ حکمرانی کے لحاظ سے کہ (جہاں سلطنت کی زمین کا صرف پادشاہی مالک ہے) اس ملک کی دارالحکومت شہر آگرہ یا دہلی کے باشندوں کی معاش کا بڑا دار و مدار صرف فوج کی موجودگی پر ہے اور اس لئے وہ مجبور ہیں کہ جب کبھی بادشاہ کوئی لمبا سفر اختیار کرے تو وہ بھی ساتھ جائیں۔ اور یہ شہر پیرس سے کچھ مشابہت نہیں رکھتے بلکہ ان کی زیادہ صحیح تشبیہ ایک کیمپ سے دی جا سکتی ہے - اور صرف اتنا فرق ہے کہ بجائے خیموں کے ان میں مکان ہیں اور آسائش کے اور سامان بھی کیمپ کی نسبت کسی قدر اچھے ہیں -

ٹھیک وقت پر تنخواہ نہ ملنے کے نتائج یہ امر بھی بیان کرنا ضروری ہے کہ امراء سے لے کر سپاہیوں تک کی تنخواہ کا دو ماہہ وار تقسیم ہو جانا نہایت ضروری ہے - کیونکہ تنخواہ کے سوا جو بادشاہی خزانہ سے ملتی ہے کوئی اور ذریعہ اُن کی معاش

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ - مگر ایک لاکھ پینتالیس ہزار ایک سو چار باقاعدہ پولیس جو اندرونی نظم سلطنت کے قائم رکھنے کے لئے مختص ہے اس کے علاوہ ہے - جس میں سے تین ہزار اٹھاسی سوار ہیں اور باقی سب پیدل - اور دیہات میں جو چوکیدار متعلقہ پولیس مامور رہتے اور گاؤں سے تنخواہ پاتے ہیں وہ اس حساب سے خارج ہیں اور سوائے فوج آئین اور فوج پولیس کے سترہ ہزار فوج والنٹیر ہے جس میں سوار تھوڑے اور پیدل زیادہ ہیں - اور اس میں اب تک صرف یوروپین یا یوریشین وغیرہ عیسائیوں ہی کو داخل ہونے کا استحقاق ہے - یہ لوگ سرکار سے تنخواہ یا لباس جنگی وغیرہ کچھ نہیں پاتے - البتہ آئین و قانون اور ان کے عہدہ داروں کے منصب اور درجے سرکار مقرر کرتی ہے اور جن بڑے بڑے مقامات میں یوروپین اور یوریشین زیادہ رہتے ہیں وہاں کے سوداگر اہل حرفہ دفتروں کے کلرک وغیرہ اہلِ قلم اپنی مرضی اور خوشی سے اس جماعت میں داخل ہو کر جنگی قواعد اور آلاتِ حرب کا استعمال کرنا سیکھتے ہیں اور اپنی قوم اور سلطنت کی حفاظت کے لئے بوقت خطرہ کام دینے کو مستعد رہتے ہیں - پس اس حساب سے فی زمانہ میزان کل تینوں قسم کی فوج کی تین لاکھ اٹھتر ہزار سے کچھ زیادہ ہے - اور ہند کی فوج بحری جو منجملہ انگلینڈ کی بحری فوج کے ہے مگر ہندوستان کے لئے ایک جداگانہ افسرِ اعلیٰ کے ماتحت رہتی ہے اور جس کے سولہ جہاز بحر احمر سے خلیج فارس تک اور لنکا سے خلیج بنگالہ تک اور بمبئی سے سواحل افریقہ تک گشت لگاتے رہتے ہیں اس سے بالکل الگ ہے - س م ح ۱۲

کا نہیں ہے۔

فرانس میں اگر کسی وجہ خاص سے واجب الادا تنخواہ کے دینے میں گورنمنٹ کی طرف سے کچھ دیر ہو جاتی ہے تو سردار تو کیا سپاہی بھی اپنی کسی خاص آمدنی سے گذارہ کر سکتے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں اگر فوج کو تنخواہ کے ملنے میں کبھی غیر معمولی توقف ہوتا ہے تو یقیناً نہایت خوف ناک نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ یعنی سپاہی اپنا معمولی اسباب جو اُن کے پاس ہوتا ہے بیچ باچ کر چل دیتے اور بھوکے مرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ جس زمانہ میں کہ شاہزادوں کی باہمی جنگ و جدال قریب الختم تھی ــــــ میں نے بچشم خود دیکھا ہے کہ سواروں کا میلان اس طرف بڑھتا جاتا تھا کہ اپنے گھوڑے بیچ ڈالیں اور کچھ شک نہیں ہے کہ اگر لڑائی کو طول ہوتا تو ضرور ایسا ہی کرتے۔ اور یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ شہنشاہ مغل کے لشکر میں کوئی ایسا سپاہی مشکل سے مل سکتا ہے جو جورو بچے نوکر چاکر اور لونڈی غلام نہ رکھتا ہو۔ اور ان سب کی گذران اُسی تنخواہ پر موقوف ہے جو اُس کو سرکار بادشاہی سے ملتی ہے اور اسی وجہ سے میں نے ایسے بہت سے لوگوں کو دیکھا ہے جو اس حالت کو دیکھکر سخت حیرت میں رہ جاتے ہیں کہ خرچ کے لئے اتنا بے شمار روپیہ کہاں سے آتا ہے کہ جس سے لاکھوں بندگان خدا کی پرورش ہوتی ہے جن کا مدار معاش محض بادشاہی تنخواہ کے ذریعہ پر ہے۔

شہنشاہ مغل کے کثیر اخراجات

مگر یہ لوگ اس امر کا خیال نہیں کرتے کہ شہنشاہ ہندوستان ملک میں کس طرز خاص سے حکومت کرتا ہے اور اُس کی دولت مندی کے ذریعہ کس قدر ہیں۔ اور میں نے تو اس کے اخراجات کا گویا ابھی ذکر نہیں کیا مثلاً خیال فرماتے کہ آگرہ اور دہلی کے اصطبل میں دو یا تین ہزار تو صرف عمدہ گھوڑے ہی ہیں جو اوقاتِ ضرورت کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ اور آٹھ یا نو سو ہاتھی اور بار برداری کے لئے بہت سے ٹٹو اور خچر اور حمال جو اُن بے شمار اور بہت وسیع اور بڑے بڑے خیموں اور اُن کے متعلقہ چھوٹے خیموں اور بیگموں اور محل کی اور عورتوں اور ساز و سامان اور باورچی خانہ کے اسباب اور گنگا جل اور بہت سی چیزوں کے اُٹھانے کے لئے جن کا بادشاہ کے ساتھ رہنا سفر اور حضر میں ضروری ہے اور جو یورپ میں کسی کے تصور میں بھی نہیں آسکتیں رکھنے پڑتے ہیں۔ اس کے سوا محل سرا کے بے شمار اخراجات

ہیں جس میں عمدہ مخمل زربفت، مشجر، اور زری دار کپڑے اور موتی مشک عنبر اور عطر اس قدر صرف ہوتا ہے کہ خیال میں نہیں آسکتا۔ پس اگرچہ شہنشاہ مغل کے مداخل بے شمار ہیں مگر مخارج بھی اُسی قدر ہیں اور اسی وجہ سے (جیسا کہ بہت سے لوگ غلطی سے خیال کرتے ہیں) بہت زیادہ روپیہ پس انداز نہیں ہوتا۔

ہندوستان ایران اور روم کے محاصل کا مقابلہ

میں مانتا ہوں کہ سلطان روم اور شاہ ایران دونوں کے محاصل کو اگر ملائیں تو شہنشاہ مغل کا محاصل غالباً اُس سے بھی زیادہ ہے۔ لیکن اگر میں اُس کو دولت مند بادشاہ کہوں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ گویا وہ ایک ایسا خزانچی ہے جو ایک ہاتھ سے بے شمار روپیہ لیتا اور دوسرے ہاتھ سے دے دیتا ہے۔ اور میرے نزدیک واقعی دولت مند اُس بادشاہ کو کہنا چاہیے کہ جس کا محاصل اس قدر ہو کہ بغیر اُس کے کہ ظلم اور زیادتی سے رعایا فقیر ہو جائے اُمرا اور اہل دربار کا ایک عظیم الشان مجمع قائم رکھنے اور مفید خلائق اور عالی شان عمارتیں بنانے اور فیاض و کریم الطبع ہونے اور ملک کی حفاظت کے لئے فوج کثیر تیار رکھنے کے علاوہ اس قدر روپیہ پس انداز رکھ سکتا ہو کہ اپنے ہمسایوں کے ساتھ کسی اتفاقیہ لڑائی بھڑائی کے وقت، جو خواہ کئی برس تک جاری رہے کام میں لا سکے۔ اور اگرچہ شہنشاہ ہند کو ان میں سے اکثر باتیں حاصل ہیں لیکن اس قدر نہیں جس قدر کہ لوگ خیال کرتے ہیں۔

شہنشاہ مغل کی دولتمندی کی مبالغہ آمیز شہرت اور خزانے اور جواہرات کا ذکر

شہنشاہ مغل کے اخراجات کثیر اور لازمی کی نسبت جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اُس سے اُن دو باتوں سے جو مجھکو بخوبی تحقیق ہو چکی ہیں غالباً آپ کی رائے بھی یہی قرار پائے گی کہ شہنشاہ مغل کی دولت مندی کی شہرت مبالغہ سے خالی نہیں۔ چنانچہ اُن میں سے ایک تو یہ ہے کہ گذشتہ لڑائی کے خاتمہ کے قریب.. اورنگ زیب کو نہایت فکر تھی کہ فوج کی تنخواہ کس طرح ادا کی جاتے۔ حالانکہ لڑائی صرف پانچ برس رہی تھی اور فوج کی تنخواہ بھی معمولی سے کم تھی اور بنگالہ کے سوا جہاں سلطان شجاع اب تک لڑتا تھا اور سب صوبوں میں بالکل امن و امان تھا اور باپ کے اکثر خزانے بھی اُس کے قبضہ میں آ چکے تھے۔

دوسرے یہ کہ شاہجہاں جو بڑا کفایت شعار تھا اور کسی جنگ عظیم میں پھنسے اور اُلجھے

بغیر چالیس برس[1] سے زیادہ عرصہ تک سلطنت کرتا رہا۔ کبھی چھ کروڑ روپیہ سے زیادہ جمع نہیں کر سکا لیکن اس رقم میں میں اُن کثیر التعداد سونے چاندی کی طرح طرح کی مرصع چیزوں کو جن پر نہایت عمدہ عمدہ کام بنے ہوتے ہیں اور بڑے بڑے قیمتی موتیوں اور قسم قسم کے کثیر التعداد جواہرات کو شامل نہیں کرتا اور مجھے شک ہے کہ اس سے زیادہ جواہرات شاید ہی دنیا کے کسی اور بادشاہ کے پاس ہوں۔ چنانچہ اُس کا ایک تخت ہی (اگر میری یاد میں کچھ غلطی نہ ہو) تین کروڑ روپیہ کی قیمت کا ہے[2]۔ یہ سب جواہرات اور قیمتی چیزیں۔ راجپوتوں کے قدیمی خاندانوں۔ پٹھان بادشاہوں، اور امراء سے لوٹی ہوئی اور ایک مدت دراز میں جمع کی ہوئی ہیں۔ اور ہر ایک بادشاہ کے عہد میں امرائے سلطنت کے مقررہ سالانہ پیشکشوں کے ذریعہ سے جو اُن کو مجبوراً دینے پڑتے ہیں۔ اُن کا شمار بڑھتا گیا ہے۔ اور یہ سب خزانہ تخت کا مال سمجھا جاتا ہے اور اس کو چھیڑنا ممنوع ہے۔ یہاں تک کہ خود بادشاہ بھی کیسی ہی ضرورت کیوں نہ ہو اُس کی کفالت پر تھوڑا سا روپیہ بھی نہایت مشکل سے حاصل کر سکتا ہے[3]۔

---

[1] شاہجہاں کی مدت سلطنت کی صحیح تعداد اس جلد کے ۲۶۰ صفحہ کے حاشیہ میں مندرج ہے۔ م ح

[2] اس کا مفصل حال جلد دوم کے صفحہ ۲۸۹ کے حاشیہ میں دیکھنا چاہیے۔ م ح

[3] شاہجہاں کی سلطنت کے بیسویں سال کے خاتمہ پر ملا عبد الحمید لاہوری نے بادشاہ نامہ میں جو عبارت خزانہ اور جواہرات کی نسبت لکھی ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے :- خزانہ کہ امروز دریں دولت خدا داد فراہم آمدہ محاسب وہم و خیال در درک اندازہ آں بعجز و قصور معترف است۔ اگرچہ خزانہ کہ حضرت عرش آشیانی (محمد اکبر بادشاہ) در مدت پنجاہ و یک سال فرماں روائی جمع نمودہ بودند و اکثر آں را حضرت جنت مکانی (جہانگیر بادشاہ) در سلطنت بست و دو سال خرچ نمودند ہیچ یکے از سلاطین ہندوستان را میسر نشدہ تا بفرماں روایان دیگر ولایت چہ رسد۔ اما انچہ دریں عہد بمیامن نیت عالم آرا و معدلت گیتی پیرا باوجود فراوان اخراجات گرد آمدہ بمراتب ازاں افزون است و آنچہ در سرکار مقدس از افراد کاملہ اقسام جواہر زواہر و ندسرخ و سفید و طلا آلات و نقرہ آلات جمع شدہ غالباً بحسب کمیت و کیفیت نزد کل فرماں روایان عالم نباشد :

اور میر محمد ہاشم خافی المخاطب بہ ہاشم علی خاں و آخر کار مخاطب بہ خافی خاں نظام الملکی نے اکبر اور شاہجہاں دونوں کے خاتمہ احوال میں جو عبارتیں لکھی ہیں اُن کا خلاصہ یہ ہے (عبارت متعلق ذکر خزانہ عہد اکبری

اپنے اس خط کے ختم کرنے سے پہلے میں بات بیان کرنی چاہتا ہوں کہ اگرچہ سونا اور چاندی اکثر ملکوں میں پھر پھرا کر آخر کار ہندوستان میں آجاتا ہے۔ مگر اس پر بھی بہ نسبت اور ملکوں کے یہاں زیادہ محسوس نہیں ہوتا۔ اور ہندوستانی لوگ اور ملکوں کے باشندوں کی طرح متمول معلوم نہیں ہوتے جس کا سبب یہ ہے کہ اول تو بہت سا مال بار بار گلائے جانے اور عورتوں کے ہاتھوں کی چوڑیوں اور پاؤں کے کڑوں اور توڑوں وغیرہ اور بالیوں اور نتھوں اور انگوٹھیوں کے بنانے میں کھپ جاتا ہے اور اس سے بھی زیادہ مقدار زردوزی اور کارچوبی کام کے کپڑوں الاچوں اور پگڑیوں کے طرّوں اور سنہری روپہلی کپڑوں ۔ اوڑھنیوں اور پٹکوں مندیلوں اور کمخابوں کے بنانے میں خرچ ہو جاتا ہے اور یہ چیزیں اس قدر بنائی جاتی ہیں کہ سننے والے کو یقین نہیں آسکتا اور تمام فوجوں میں امرا سے لے کر سپاہیوں تک کچھ نہ کچھ ملمع اور طلاکاری کی چیزیں زیب و زینت کے لئے پہنتے ہیں اور ایک ادنیٰ سپاہی بھی دکنبہ خواہ بھوکوں کیوں نہ مر جائے جو ایک معمولی امر ہے اپنی بیوی اور بچوں کو کچھ نہ کچھ زیور ضرور پہناتا ہے ۔

داد رسی کے ناکافی انتظام کی وجہ

بادشاہ جو زمین کا مالک ہے اہل سپاہ کو کسی قدر زمینیں تنخواہ میں دیدیتا ہے کہ جس کو یہاں "جاگیر" اور سلطنت ٹرکی میں "تیمار" کہتے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ: در وقت وفات محمد اکبر بادشاہ زیادہ از پنج ہزار فیل کہ گاہ قریب بشش ہزار می رسید در فیل خانہ او موجود بود و ماز دہ ہزار اسپ طویلہ و ہزار یوز در چیتہ خانہ داشت و بعد وفات او کہ عرض خزانہ گرفتند دہ کروڑ روپیہ را اشرفی یازدہ ماشہ و سیزدہ ماشہ و چہاردہ ماشہ سوائے اشرفی ہائے کلاں کہ از صد تولہ تا پانصد تولہ ہزار اشرفی در خزانہ موجود بود و صد و ہفتاد و دو من طلائے غیر مسکوک و سہ صد و ہفتاد من نقرہ و یک من جواہر خاصہ کہ قیمت آں از سہ کروڑ روپیہ تجاوز نمودہ بود برآمد۔ (عبارت متعلقہ حال خزانہ عہد شاہجہاں) بہر تقدیر ظاہر است کہ اگرچہ در ملک گیری و استقلال بہ از محمد اکبر بادشاہ رونق افزائے سلطنت ہندوستان در تیموریہ نبودہ، اما در بند و بست و نسق فراہم آوردن خزانہ و آبادکاری ملک و قدر دانی سپاہ و رفاہ لشکر بہ از شاہجہاں بادشاہ در عرصہ تیہ وسعت ہندوستان فرمان فرمائے نگردیدہ۔ سوائے خرچ لازم و ملتزم سلطنت و آنچہ بہ خرچ عمارات و قلعہ و مساجد شاہجہاں آباد و دیگر بلاد و بانعام ایلچیان و مہم قندہار و بلخ کہ آخر رائیگاں رفتہ در آمدہ۔ بست و چہار کروڑ روپیہ و از جنس اشرفی سوائے طلا و نقرہ غیر مسکوک و ظروف طلائی و نقرئی و جواہر کہ تخمیناً تا پانزدہ شانزدہ کروڑ آں نیز می شد ماندہ بود۔ س م ح

ہیں اور جس کے معنی ہیں وہ جگہ کہ جہاں سے کچھ لیا جائے یا مقام وصول تنخواہ اور اسی قسم کی جاگیریں صوبہ داروں کو بھی اُن کی اور اُن کی فوج کی تنخواہ میں اس شرط پر دی جاتی ہیں کہ فاضل آمدنی میں سے ایک خاص رقم سال بسال خزانہ شاہی میں داخل کرتے رہیں اور جو زمینیں جاگیر میں نہیں دی جاتیں اور خاص بادشاہ اور اُس کے اہل خاندان کے متعلق ہیں اور شاذونادر ہی کسی کو جاگیر میں دی جاتی ہیں وہ مستاجروں کو دیدی جاتی ہیں جو سال بسال زر معینہ ادا کرتے رہتے ہیں اور اس طرح پر جو لوگ زمین پر قبضہ حاصل کرتے ہیں خواہ تیماردار ہوں خواہ صوبہ دار یا مستاجر۔ کاشت کاروں پر اُن کے اختیارات ایسے غیر محدود ہیں کہ گویا مطلق العنان ہی کہنا چاہیے۔ اور کاشت کاروں ہی پر منحصر نہیں بلکہ اپنے علاقہ کے گاؤں اور قصبوں کے اہل حرفہ اور سوداگروں پر بھی ویسا ہی اختیار ہے۔ اور جن طریقوں میں یہ اپنے ان اختیارات کو عمل میں لاتے ہیں اُس سے زیادہ کوئی بے رحمانہ اور تکلیف دہ امر خیال میں نہیں آسکتا اور ایسا کوئی شخص نہیں ہے کہ جس کے پاس یہ مظلوم کسان اور کاریگر اور سوداگر اپنا استغاثہ پیش کرسکیں یعنی نہ تو فرانس کی طرح یہاں کوئی گریٹ لارڈ ہے اور نہ پارلیمنٹ اور پریسیڈنل کورٹ کے جج جو ان بے رحم ظالموں کے ظلم کو روکیں اور جو قاضی یہاں مقرر ہیں اُن کو ان بد نصیب لوگوں کی دادرسی کا کافی اختیار نہیں ہے۔ مگر ان بلا قید اختیارات کا یہ اندھا دھند استعمال بڑے بڑے شہروں مثلاً دہلی اور آگرہ اور بنگالہ اور بڑے بڑے قصبوں کے قرب و جوار میں اس درجہ تک محسوس نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایسے مقاموں میں کوئی بڑی ناانصافی کا کام دربار شاہی سے مخفی رہنا آسان نہیں ہے۔

رعایا کی غلامانہ حالت

رعایا کی یہ غلامانہ حقیر حالت ترقی تجارت کی مانع اور لوگوں کے اوضاع و اطوار اور طریق معاشرت کی خرابی کا باعث ہے اور تجارت کرنے کا کسی کو اس لئے حوصلہ نہیں ہوتا کہ منافع کی صورت میں بجائے اس کے کہ وہ اُسے اپنے عیش و آرام میں صرف کرے اُس کو دیکھکر کسی ظالم اور ذی اختیار ہمسایہ کے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ جس کا میلان طبع ہمیشہ اس طرف ہے کہ کسی شخص کو اُس کی محنت کے ثمرہ سے محروم کردے اور اگر کسی کو دولت حاصل ہو بھی جاتی ہے (جیسا کہ بعض اوقات ہونا ضروری ہے) تو برخلاف اس کے کہ سابق کی نسبت آسودہ حالت میں رہے اور آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرے مفلسوں کی سی صورت بنائے رہتا ہے۔

اور لباس اور مکان اور اسباب خانہ داری بہت ہی ذلیل رکھتا ہے۔ اور سب سے ذلیل کھانے پینے میں خست دکھاتا ہے۔ اور اس حالت میں اُس کا روپیہ اور اشرفی زیر زمین کسی عمیق گڑھے میں گڑا رہتا ہے۔ اور سب لوگوں میں خواہ کاشت کار ہوں خواہ کاریگر یا اہل بازار ہندو ہوں یا مسلمان عموماً یہی طریقہ جاری ہے علی الخصوص ہندوؤں میں جن کے ہاتھ میں ملک کی دولت اور تجارت ہے اور جن کا یہ عقیدہ ہے کہ جو دولت ہم اپنے ایام حیات میں چھپا کر رکھیں گے مرنے کے بعد ہمارے کام آئے گی۔[1] البتہ بعض اشخاص جو بادشاہ یا امرا کے ہاں نوکر ہیں یا جن کا کوئی بڑا وسیلہ ہے اُن کو اپنی تنگ دستی دکھانے کی کچھ حاجت نہیں ہوتی اور عیش و آرام سے عمر بسر کرتے ہیں اور کوئی شک نہیں کہ سونے چاندی کو زیر زمین دفن رکھنے اور اس طرح ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جانے سے روکنے کی یہ عادت اُس ملک میں سونے چاندی کے بظاہر کم دکھائی دینے کا بڑا سبب ہے۔

رعایا کو حقِ ملکیت زمین حاصل نہ ہونے کے مضر نتائج

اب جو کچھ میں بیان کر چکا ہوں اُس سے لابدًا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر بادشاہ زمین کی مالکیت بالکل چھوڑ دے۔ اور یہ حق رعایا کو حاصل ہو جائے تو آیا یہ امر رعیت اور بادشاہ دونوں کے حق میں مفید ہوگا یا نہیں؟

اس کے جواب میں میں یہ کہتا ہوں کہ میں نے فرنگستان کی حالت کا کہ جہاں حقِ ملکیت زمین رعایا کو حاصل ہے اور اُن ملکوں کی حالت کا جہاں یہ حق اُن کو حاصل نہیں ہے احتیاط کے ساتھ مقابلہ کیا ہے۔ اور بعد غور میری رائے یوں قائم ہوئی ہے کہ یہ امر نہ صرف رعایا بلکہ خود بادشاہ کے فوائد کے لئے بھی بہت ہی مضر ہے۔ چنانچہ میں یہ امر بیان کر چکا ہوں کہ ہندوستان میں سونے چاندی کے کم دکھائی دینے کا کیا باعث ہے یعنی جاگیرداروں صوبہ داروں اور مستاجروں کا ظلم کہ جس کا انسداد اگر بادشاہ بھی چاہے تو نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً اُن صوبوں میں جو پایۂ تخت کے قریب نہیں ہیں اور یہ ظلم اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ کاشت کاروں اور اہل حرفہ کے پاس بسر اوقات کے لئے کچھ بھی نہیں رہنے دیتا اور وہ حالتِ افلاس اور تنگ دستی میں پڑے مرتے ہیں اور اسی ظلم کے سبب سے اول تو ان

[1] شاید فرانسیسی سے انگریزی میں ترجمہ ہونے کے وقت کچھ غلطی ہوئی ہے۔ کیونکہ ہندوؤں میں کوئی ایسا عام عقیدہ نہیں ہے غالباً اصل میں یوں ہوگا کہ مرنے کے بعد اولاد کے کام آئے گا۔ م ح

بیچاروں کے کچھ اولاد ہی نہیں ہوتی۔ اور اگر ہوتی ہے تو فاقوں کے مارے بچپن ہی میں چل بستی ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس ظلم وستم کی وجہ سے کاشتکار اپنے کمبخت وطن کو چھوڑ کر کسی قدر آسائش ملنے کی اُمید پر کسی ہمسایہ ریاست کے علاقہ میں جا رہتے ہیں یا فوج میں جا کر کسی سوار کے پاس نوکری کر لیتے ہیں اور چونکہ زمین کا بندوبست شاذونادر ہی جبر کے بغیر ہوتا ہے اور کوئی شخص اس قابل پایا نہیں جاتا کہ اپنی خوشی سے اُن نہروں اور نالیوں کی مرمت کرے جو آب پاشی کے لئے بنی ہوتی ہیں۔ اس وجہ سے بندوبست بخوبی نہیں ہوتا۔ اور خشکی کے سبب سے زمین کا ایک بڑا حصہ خالی پڑا رہتا ہے۔ اور زمین ہی پر کیا موقوف ہے مکانات بھی اکثر ویرانی اور تباہی کی حالت میں رہتے ہیں اور بہت ہی کم لوگ ایسے ہیں جو نئے مکان بناتے یا اُن کی مرمت کرتے ہیں اور ایک طرف تو کاشتکار اپنے دل میں ہمیشہ یہ خیال کرتے ہیں کہ کیا ہم اس لئے محنت کریں کہ کوئی ظالم آئے اور سب کچھ چھین لے جائے۔ اور اگر چاہے تو ہماری بسراوقات کے لئے بھی ہمارے پاس کچھ نہ چھوڑے — اور دوسری طرف جاگیردار اور صوبہ دار اور مستاجر یہ سوچتے ہیں کہ ہم کیوں اُفتادہ اور ویران زمین کا فکر کریں اور اپنا روپیہ اور وقت اُس کے بارآور بنانے میں لگائیں۔ کیونکہ نہ معلوم کس وقت ہمارے ہاتھ سے نکل جائے اور ہماری کوشش اور محنت کا ثمرہ نہ تو ہم کو ہی حاصل ہو اور نہ ہماری اولاد کو۔ پس زمین سے جو کچھ وصول ہو سکے کر لیں اور ہماری بلا سے کاشتکار بھوکے مریں یا اُجڑ جائیں۔ اور جب ہم کو اس کے چھوڑ دینے کا حکم ملے گا تو ویران اور غیر آباد چھوڑ کر چلے جائیں گے۔

لہ خافی خاں نے بھی اپنی تاریخ میں (جو اورنگ زیب عالمگیر کی وفات سے صرف بارہ برس بعد محمد شاہ کے زمانہ میں لکھی گئی تھی) جلال الدین محمد اکبر کے عہد دولت اور اُس کے مشیر خوش تدبیر راجہ ٹوڈرمل کے ذکر میں زمینداروں کی پرورش اور مال گذاری کے عمدہ انتظامات کی تعریف و توصیف لکھکر پھر اپنے زمانہ کے عاملوں اور مستاجروں کے ظلم وستم کی جو دردناک کیفیت نہایت ہی افسوس کے ساتھ لکھی ہے ہم اُس کو اس جگہ نقل کرتے ہیں یہ شخص اور اس کا باپ ابتدائے اورنگ زیب کے بھائی مراد بخش کے ملازموں میں سے تھے۔ اور اس نے شاہجہاں کے خوشحال عہد سلطنت سے لے کر محمد شاہ کے پُر اختلال زمانہ حکومت تک بہت کچھ دیکھا بھالا تھا۔ جن خرابیوں کا اس نے ذکر لکھا ہے اُن کی نسبت یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اورنگ زیب کے بعد یا مدا رنگیلے محمد شاہ

ہی کے زمانہ میں پیدا ہو گئی تھیں بلکہ ظاہر ہے کہ انتظامیہ اصولوں کی خرابی کے باعث پہلے ہی سے
چلی آتی تھیں۔ قولہ اما بر عقلا سے باہوش تجربہ کار ظاہر است کہ اعمال موافق تقاضائے وضع روزگار
بطریقہ عمدہ امور ملکی و رعیت پروری و آبادی ملک و افزونی محصول از میاں برخاستہ و عمال اجارہ
دار کہ مبلغہا خرچ دربار دادہ بر سر محالات می روند و باعث وبال حال رعایا ستے مال گذاری گردند
آنہا را اصلاً نظر بر آبادی ملک و خرابی حال رعایا نیست و از آنکہ اعتماد بر بحال ماندن۔ سال دیگر بلکہ
تمام سال ندارند ہر دو حصہ محصول را فروختہ می گیرند و زہے۔ خدا ترسی کہ بر ہمیں ظلم اکتفا نمودہ کار بفروختن
گاؤ ہا رابہ کہ مدار قطبہ راتی ہمآنست نہ رسانند و باز بخرچ دربار و سہ بندی و نقصان تعہدے کہ نمودہ
وفا نماید و بساط باقی ماندۂ رعایا را حتی اشجار میوہ دار و زمین ملکی و موروثی آنہا را بفروش نیارد و تاخت
و تاراج مفسدان آں نزاع علاوہ موجب ویرانی ملک و خرابی حال رعایا می گردد و از آنست کہ دہ کردہ
بست کردہ زمین نامزروع افتادہ بجائے زراعت اشجار خار دار دامن گیر مسافران و نشتر جگر
جاگیرداران بسیار یا ست بسیار پرگنہ و قصبہ جات سیر حاصل بمرتبہ خراب ویران از تعدی حکام بدانجام
گردیدہ کہ بیشۂ شیر و مسکن سباع گشتہ و آنقدر دیہات خرابۂ محض و بے چراغ شد کہ نام آبادی ماہ ہا
برخاستہ اگرچہ از شامت نفس رعایا و تقاضائے ایام بد فرجام است کہ روز بروز ملک زیادہ از یں
خراب شود و رعایا پامال جور و جفائے عمال بد آل گردد و جاگیرداران گرفتار و بال آہ عیال خرابیاں
مظلوم گردند ما ظلم و تعدی و بیداد حاکمان از خدائے بے خبر بجائے رسیدہ کہ اگر خواہم عشر عشیر
آں را با حاطۂ بیان آرد از سر رشتۂ کلام دور می افتد در صورتیکہ یکے از عمال کہ فی الجملہ اندیشۂ روز جزا
داشتہ باشد و خواہ بر خلاف دیگر ظلم پیشگان سختی و تعدی را جزو اعظم شیوۂ عاملی نداند و ترحمے
بر حال رعایا نماید و در پرداخت حال رعیت مال گزار و افزونی محصول سال بسال و نیکی عاقبت
و مآل کار خود و فرزندان خود داند مردم روزگار او را مطعون ساختہ از جملہ بے توفان ناکردہ کار محسوب
می نمایند۔ و اگر خدا نہ کردہ سال را بہ تمام نہ رسانید و تغیر گردید خراب و پامال خرچ سہ بندی و غیرہ
گشتہ بو بال نقصان مایہ و شماتت ہمسایہ گرفتار می گردد۔ چنانچہ مکرر بر مسودہ اوراق گذشتہ! حق
گذشتہ! حق سبحانہ تعالیٰ ہمہ بندہائے عاصی را از یں آفت در پناہ خود نگاہ دارد بحق محمد و آلہ الامجاد۔

اس مضمون کو پڑھ کر امید ہے کہ ناظرین کتاب کے دل میں خود بخود یہ خیال پیدا ہوگا کہ ہمارے
زمانہ میں گورنمنٹ انگریزی کی شائستہ حکومت کیسی خیر و برکت کی حکومت ہے۔ ملک کیسا سرسبز اور
کیسا آباد ہے اور رعایا کس امن و امان سے بے خلش زندگی بسر کرتی ہے۔ س م ح

شخصی حکومت کے نتائج

پس جو حقائق میں نے بیان کئے ہیں وہ اس امر کے ثبوت کے لئے کافی ہیں کہ ایشیائی سلطنتیں جلد جلد کس طرح زوال پذیر ہوتی ہیں اور حکومت کے اسی ناقص طریقہ کا یہ نتیجہ ہے کہ ہندوستان کے بہت سے شہروں کے مکانات کچے یا گھاس پھوس وغیرہ سے بنے ہوئے ہیں اور یہاں کے شہر اور قصبے خواہ بالفعل خستہ حال اور ویران نہ ہوں مگر ایسا کوئی بھی نہیں کہ جس میں جلد تباہ اور خراب ہو جانے کے آثار نہ پائے جائیں۔ اور ہندوستان ہی پر کیا منحصر ہے یہ تو ہم سے ایک بہت دور کی سلطنت ہے ہم اپنے قریب ہی کے بعض ایشیائی ملکوں کی حالت کا مقابلہ کر کے شخصی حکومتوں کے بے رحمانہ برتاؤ کے نتیجوں کی نسبت اپنی رائے قائم کر سکتے ہیں۔ مثلاً دریائے دجلہ اور فرات کے دوآبے کو اور ایشیائے کوچک اور فلسطین اور انطاکیہ کے قرب و جوار کے عمدہ میدانوں اور بہت سے اضلاع کو دیکھئے کہ قدیم زمانہ میں کس کثرت سے زراعتیں ہوتی تھیں اور کیسے زرخیز اور آباد تھے اور اب ویران پڑے ہیں بلکہ اُن کے بہت سے حصے دلدل ہو جانے اور آب و ہوا کی خرابی سے انسان کی بود و باش کے بھی قابل نہیں رہے۔ یہی اندوہناک صورت مصر کی دکھائی دیتی ہے جہاں کی رعایا غلامانہ حالت میں ہے اور اسّی برس کے عرصہ میں یہ بے نظیر ملک دسویں حصہ سے زیادہ ویران ہو گیا ہے۔ کیونکہ اس مدت میں کسی نے دریائے نیل کی نہروں کی کچھ خبر نہیں لی جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ دریا اپنے معمولی پاٹ کے اندر نہیں بہتا اور نیچی زمینیں بالکل غرقاب ہو جاتی ہیں۔ اور ریت سے اس قدر اَٹ گئی ہیں کہ بغیر بہت سے روپے اور محنت کے صاف نہیں ہو سکتیں پس ایسی حالت میں کیا یہ کچھ تعجب کی بات ہے؟ کہ ان ملکوں میں صنعت اور حرفت روز افزوں ترقی نہ ہو جیسی کہ ہمارے خوش نصیب فرانس اور اُن ملکوں میں ہے۔ جہاں کا طرز حکومت عمدہ ہے کیونکہ کسی صناع سے ایسے لوگوں میں رہ کر اپنے پیشہ میں جی لگانے کی اُمید نہیں ہو سکتی جو مفلس اور غریب ہوں یا اپنے تئیں مفلس ظاہر کرتے اور چیز کی خوبصورتی اور عمدگی کی جگہ صرف اُس کے ارزاں ہونے کا خیال رکھتے ہوں اور بڑے آدمیوں کا یہ حال ہو کہ صرف اپنی مرضی سے چیز کی حیثیت سے بہت کم قیمت جو چاہتے ہوں دے دیتے ہوں اور کسی کاریگر یا سوداگر کے اصرار کرنے کی حالت میں اُس کو کوڑوں سے پٹوانے میں بھی اُن کو تامل نہ ہوتا ہو اور کوڑا ایک لمبے اور وحشتناک چابک کو کہتے ہیں جو ہر ایک امیر کے دروازہ پر لٹکا

رہتا ہے۔ اور کیا کسی صناع کا حوصلہ پست کر دینے کے لئے یہ امر کچھ کم ہے کہ اس کو کسی زمانہ میں اپنے یا اپنے بال بچوں کے لئے کسی منصب سرکاری کے حاصل ہونے یا زمینداری کے خریدنے کی اجازت ملنے کی امید نہیں اور اس خوف سے کہ کوئی دولتمندی کا شبہ نہ ہو جائے۔ کبھی عمدہ پوشاک پہن سکتا ہے اور نہ اچھا کھانا کھا سکتا ہے اور نہ یہ ظاہر کر سکتا ہے کہ اس کے پاس کچھ تھوڑا سا بھی روپیہ ہے۔ ہندوستان کی صنعت کی خوبصورتی اور لطافت مدت سے جا چکی ہوتی۔ اگر بادشاہ اور بڑے بڑے امرا کے ہاں بہت سے کاریگر نوکر نہ ہوتے جو خود انہیں کے گھروں پر اور سرکاری کارخانوں میں بیٹھ کر کام کرتے اور اپنے شاگردوں اور لڑکوں کو سکھایا کرتے ہیں اور انعام کی امید اور کوڑوں کا خوف ان کو محنت کے ساتھ اپنے کام میں لگائے رکھتا ہے اور کچھ یہ بھی سبب ہے کہ بعض دولتمند تاجر اور سوداگر ایسے بھی ہیں کہ جن کو بڑے بڑے امرا کی سرکاروں سے تعلق اور توسل ہے اور وہ کاریگروں کو شرح مروجہ سے کسی قدر زیادہ مزدوری دے کر کام بنوایا کرتے ہیں۔ میں نے "کسی قدر زیادہ مزدوری" اس لئے کہا ہے کہ یہ تو سمجھنا ہی نہ چاہیئے کہ اچھی چیزیں بنانے سے کاریگر کی کچھ قدر کی جاتی ہے۔ یا اس کو کچھ آزادی حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ تو جو کچھ کرتا ہے صرف ضرورت یا کوڑوں کے خوف سے کرتا ہے۔ اور چونکہ تمول اور آسودگی حاصل ہونے کی کبھی امید نہیں ہوتی۔ اس لئے اگر روکھا سوکھا ٹکڑا کھانے کو اور موٹا جھوٹا کپڑا پہننے کو مل جائے تو اسی کو غنیمت سمجھتا ہے۔ اور روپیہ حاصل بھی ہو جائے تو اس کو کیا؟ کیونکہ وہ تو اس سوداگر کا مال ہے جو خود ہی اسی اندیشہ سے ہمیشہ مضطرب رہتا ہے کہ اگر کوئی زبردست ظلم و زیادتی کرنا چاہے تو اس سے کس طرح بچے۔

ہندوستانیوں کی بے علمی اور جہالت

لوگوں کی اس حالت کا قدرتی یہ نتیجہ ہے کہ تمام ملک میں علی العموم بے حد جہالت پھیلی ہوئی ہے اور یہ یہاں ممکن ہی نہیں کہ ایسے دارالعلوم اور کالج قائم ہو سکیں کہ جن کے اخراجات کے لئے کافی سرمایہ بذریعہ وقف کے موجود ہو اور ایسے لوگ کہاں جو اس طرح مدرسے اور کالج قائم کریں۔ اور بالفرض ایسے لوگ میسر بھی آ جائیں تو طالب علم کہاں اور لوگوں میں

اسی استطاعت کہاں کہ اپنے بچوں کو کالج بھیجیں۔ کم کہ اُن کے اخراجات کا انتظام کر سکیں الغرض یہ ہے کہ معدودے لوگ موجود بھی ہوں تو یہ جرأت کون کر سکتا ہے کہ اس طرح علانیہ اپنی دولت مندی ثابت کرے اور شاید اگر کوئی شخص یہ استقامت حرکت کر بھی بیٹھے تو عمدہ تعلیم سے جن دنیاوی فوائد کی توقع ہوتی ہے وہ کہاں اور ایسے اعتماد اور اعزاز کے عہدے اور منصب کہاں جو نوجوان طالب علموں کی اُمیدوں اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے شوق کو بیدار رکھتے ہیں، اور جن کے لیے علم اور قابلیت کی ضرورت ہے۔[۱]

۱؎ ہزار ہزار شکر ہے کہ ہمارے زمانہ میں ایسا حال نہیں ہے بلکہ جب سے اُس ملک میں گورنمنٹ برطانیہ کا مبارک قدم آیا ہے علاوہ دیگر رفاہ و فلاح کے مدبران سلطنت نے ابتدا ہی سے اہل ہندوستان کی تعلیم میں نہایت کوشش کی ہے۔ اگرچہ شروع میں ملک کے مذاق کے موافق پرانے طرز پر عربی۔ فارسی۔ سنسکرت زیادہ پڑھائی جاتی تھی۔ انگریزی اور علوم و فنون یورپ کم اور نہ اتنے سرکاری مدرسے اور کالج ہی تھے۔ اور نہ بی۔ اے اور ایم۔ اے وغیرہ ڈگریاں جو دس بارہ برس کی محنت شاقہ اور سخت امتحانوں کے بعد دی جاتی ہیں۔ مگر آخرکار مدبران سلطنت کے باہم ایک مدت تک بحث و مباحثہ اور غور و فکر ہو کر یہ طے ہوا کہ باشندگان ہند کو زبان انگریزی کے ذریعہ سے وہ تمام علوم و فنون بلا دریغ سکھائے جائیں کہ جن کے علم و عمل نے ممالک یورپ کو اُن کے موجودہ درجہ کمال پر پہنچایا ہے۔ چنانچہ ۱۸۵۴ء سے اس اُصول پر تعلیم جاری ہے جس کے انتظام و اہتمام کے لئے یعنی کلکتہ۔ مدراس۔ بمبئی میں جو تینوں پریزیڈنسیوں کے صدر مقام ہیں۔ تین یونیورسٹیاں قائم کی گئی تھیں اور اب لاہور اور الہ آباد میں بھی جو گورنمنٹ پنجاب اور ممالک مغربی و شمالی کے صدر مقام ہیں دو نئی یونیورسٹیاں اور قائم ہو گئی ہیں۔ ان یونیورسٹیوں کے تحت میں بڑے شہروں سے لے کر اکثر دیہات تک بہت سے مختلف حیثیتوں کے کالج اور مدرسے اور مکتب ہیں۔ اعلیٰ درجہ کی تعلیم میں علاوہ علوم اور زبان انگریزی کے عربی۔ فارسی۔ سنسکرت تینوں میں سے کسی ایک زبان کا بقدر مناسب جاننا بھی ضروریات سے ہے۔ اور تعلیم عام اور درجہ اوسط کے لئے ہندوستان کے اضلاع مختلفہ کی دیسی بولیوں میں سے اٹھارہ زبانوں میں مفید کتابیں تصنیف و تالیف و ترجمہ ہو کر پڑھائی جاتی ہیں۔ بعض مقامات میں خاص طور کے کالج

ہندوستان کی تجارت جس ملک میں اس قسم کی حکومت ہو وہاں آسودگی اور کامیابی کے ساتھ تجارت بھی نہیں ہوسکتی جیسے کہ انگلستان میں ہوتی ہے۔ کیونکہ ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں کہ جو اپنی خوشی سے محنت اور تکلیف اُٹھانے اور کسی دوسرے شخص کے فائدہ کے لئے خطرے میں پڑنے کو گوارا کریں

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ اور سکول ہیں۔ جن میں فن انجنیری۔ طبابت۔ زراعت۔ قانون۔ بیطاری (علم جانورانِ صنعت و حرفت۔ فارسٹری (علمی طریقوں سے جنگل اُگانا اور اُس کی حفاظت کرنا) وغیرہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اگرچہ پادری لوگ اپنے قایم کئے ہوئے مدرسوں میں مذہب عیسوی کی تعلیم دیتے ہیں اور ہندو مسلمان بھی اپنے قائم کئے ہوئے سکولوں اور مدرسوں میں علاوہ تعلیم دنیاوی کے اپنے مذہب کی تعلیم دیتے ہیں مگر از راہِ دانشمندی سرکاری مدرسوں میں کسی قسم کی مذہبی تعلیم مطلقاً نہیں دی جاتی۔ اور اگرچہ اس پچاس برس کے اندر اشاعت علوم کے بارہ میں بہت کچھ ہوا ہے اور چھاپہ کے فن کی ترقی نے جس کو گورنمنٹ انگریزی کے زمانہ سے پہلے اس ملک میں کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ اور دیسی زبانوں میں اخباروں اور رسالوں کے شائع ہونے نے گو ابھی وہ بہت پست حالت میں ہیں، عامہ خلایق کے قوائے عقلی کے شگفتہ کرنے اور خیالات کی عام تاریکی کم کرنے میں بہت بڑی مدد دی ہے۔ لیکن جو کچھ کیا گیا ہے فیاض طبع مدبرانِ سلطنت اس کو ابھی بہت تھوڑا سمجھتے ہیں اور علوم و فنون کی اشاعت و ترقی مزید کے لئے ہمیشہ کچھ نہ کچھ کئے ہی جاتے ہیں۔ چنانچہ گورنمنٹ کی ان حکیمانہ کوششوں کی بدولت ایک نہایت ہی مفید نتیجہ جس سے آئندہ کے لئے بہت پائدار اور اصل ترقی کی اُمیدیں بندھتی ہیں یہ ہوا ہے کہ اب خود باشندگان ملک باہمی چندہ وغیرہ کر کے خود اپنے خرچ اور اپنے اہتمام سے باقاعدہ کالج اور سکول قائم کرنے کی ضرورت پر متوجہ ہونے لگے ہیں۔ بالفعل تمام قسم کے مدارس میں ۳۵ لاکھ لڑکے اور ایک لاکھ لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں۔ کل خرچ اُن مدارس کا جو براہ راست سرکار کے اہتمام میں ہیں۔ یا جن کی کچھ امداد اور نگرانی وغیرہ سرکار سے ہوتی ہے اس وقت ڈھائی کروڑ روپیہ سالانہ ہے جس میں سے اسی لاکھ تو خاص سرکاری خزانہ سے دیا جاتا ہے جو سلطنت کے تمام سول انتظام کے بیسویں حصہ کے مساوی ہے اور باقی لوکل ریٹ۔ لوکل فنڈ۔ ا۔ چندہ اور اوقاف وغیرہ سے ادا ہوتا ہے۔ جو طالب علم یہاں تعلیمی امتحانوں میں اعلیٰ رہتے ہیں اُن کو علاوہ علمی القابوں کے زمرۂ اہل قلم میں اچھی نوکریاں مل جاتی ہیں یا جو یہاں سے تکمیل کے لئے یورپ جا کر وہاں کی جگہ مدارس انجنیری وغیرہ میں انگریزوں کے مساوی علمی لیاقت میں کامیابی کی سندیں حاصل کرتے ہیں تو اُن کو سول کے کاموں میں کچھ ایسے اعلیٰ عہدے بھی ملنے لگے ہیں جو پہلے صرف انگریزوں ہی کے لئے مخصوص تھے۔ س م ح

(دوسرے شخص سے میری مراد کوئی ایسا حاکم ہے۔ جو لوگوں کی کمائی چھین لینے سے دریغ نہیں کرتا) اور خواہ کتنا ہی نفع کیوں نہ حاصل ہو کمانے والے کو مفلسانہ لباس پہنتا اور اپنے غریب ہمسایوں سے بڑھکر کھانے پینے میں تکلف نہ کرنا ضروریات سے ہے۔ مگر ہاں جب کبھی کسی فوجی سردار سے کسی سوداگر کو توسل ہو جاتا ہے تو البتہ وہ بڑے بڑے تجارتی معاملے کرنے لگتا ہے۔ مگر اس حالت میں اُس کو اپنے مربی کی غلامی میں رہنا ضروری ہے جو حفاظت کے بدلے جس قسم کی شرطیں اُس سے چاہتا ہے کرالیتا ہے۔

اُمرائے ہندوستان کی جہالت اور غرور

شہنشاہِ ہند کو یہ بات میسر نہیں ہے کہ ملازمت کے لئے اپنی رعایا میں سے ایسے لوگوں کو منتخب کر سکے جو قدیمی رئیس زادے اور خاندانی امیروں اور شریفوں کے لڑکے اور بڑے بڑے کارخانہ داروں اور متمول سوداگروں کے بیٹے پوتے ہوں اور جنھوں نے بخوبی تعلیم پائی ہو اور اپنی عادات اور اطوار میں معقولیت اور سنجیدگی کا بدرجہ اعلیٰ خیال رکھتے ہوں اور جن کو اپنے بادشاہ سے محبت ہو اور دلیری اور دلاوری کے کاموں سے اپنے خاندان کی ناموری اور شہرت بڑھانے کے لئے مستعد اور بوقت ضرورت اس قابل ہوں کہ اپنی گرہ سے کھا کر دربار یا فوج میں بخوشی کام دے سکیں اور کسی اچھے وقت کی اُمید پر صرف بادشاہ کے ہنس کر بول لینے اور شاباش کہہ دینے پر قانع ہوں بلکہ بجائے اس قسم کے لوگوں کے شہنشاہ ہند کے اردگرد جاہل اور وحشی غلام یا وہ خوشامدی لوگ رہتے ہیں جنھوں نے بہت ہی اونی اور ذلیل حالت سے درجۂ اعلیٰ پر ترقی پائی ہے۔ اور جو وفاداری اور حب الوطنی اور معقولیت اور مردانگی اور عزت داری کے خیال سے بالکل خالی اور ناقابلِ برداشت غرور و تکبر سے بھرے ہوئے ہیں۔

سرکاری اخراجات کی وجہ سے رعایا کی تباہ حالی

ملک کا حال کثیر مصارف کے سبب رجو دربار کی شان و شوکت قائم رکھنے اور اس بڑی فوج کی تنخواہ ادا کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ جن کا ہونا رعایا کے قابو میں رکھنے کے واسطے ضروری ہے) تباہ و برباد ہے اور لوگ ایسی تکلیف اور مصیبت میں ہیں کہ خیال میں نہیں آسکتی اور صرف قمچیوں اور کوڑوں کے خوف سے دوسروں

کے فائدہ کے لئے کام پر لگے رہتے ہیں اور اگر فوج کا ڈر نہ ہو تو ایسی بے رحمانہ بدسلوکیوں سے مایوس ہو کر کہیں اور بھاگ جائیں یا فساد برپا کریں۔ اور اس بدقسمت ملک کی مصیبت اُس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب کہ کسی صوبہ کی حکومت بہت سا روپیہ لے کر کسی کو دے دی جاتی ہے جو عموماً مروج ہے اور لڑائی اور ہنگامہ کے وقت خصوصیت کے ساتھ جس پر عمل کیا جاتا ہے اور جس کا بالطبع یہ نتیجہ ہے کہ جو شخص اس طرح پر حکومت حاصل کرتا ہے اُس کا مقدم کام یہ ہوتا ہے کہ جو روپیہ اُس نے بہت بھاری سود پر قرض لے کر اپنی مطلب براری کے لئے خرچ کیا تھا اُس کو وصول کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی صوبہ دار اور جاگیردار اور مستاجر کو کسی نہ کسی طرح ہر سال بڑے بڑے نذرانے کسی وزیر یا خواجہ سرا یا محل کی کسی معزز بیگم یا کسی اور شخص کی خدمت میں کہ جس کو دربار میں ذی اقتدار خیال کرتا ہو پیش کرنا اور اس کے ساتھ بادشاہی خراج بھی معمولی وقت پر خزانہ شاہی میں پہنچاتے رہنا ضروری امر ہے۔ اور اگرچہ یہ لوگ دراصل صرف ذلیل اور قرضدار غلام ہوتے ہیں اور کچھ بھی جائداد نہیں رکھتے مگر حکومت ملتے ہی بڑے دانشمند اور متمول امیر بن جاتے ہیں۔ اور اس طرح تمام ملک میں ویرانی اور بربادی پھیلی ہوئی ہے۔ اور جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں یہ تمام صوبہ دار اپنی اپنی جگہ پر چھوٹے چھوٹے فرعون بے سامان ہیں جو غیر محدود اختیارات رکھتے ہیں۔ اور کوئی ایسا شخص موجود نہیں ہے کہ جس کے پاس مظلوم رعایا استغاثہ کر سکے۔ سادہ خواہ کیسا ہی اور بار بار ظلم کیوں نہ ہوا ہو اُس کو اپنی دادرسی کی کسی طرح اُمید نہیں ہے اگرچہ یہ بات درست ہے کہ بادشاہ تمام صوبوں میں "واقعہ نویس" مقرر کرتا ہے۔ جن کا یہ کام ہے کہ جو امر وقوع میں آئے اُس کی اطلاع دیتے رہیں۔ لیکن ان نالائق واقعہ نویسوں اور صوبہ داروں کے باہم خود ہی سازش ہو جاتی ہے پس وہ ظلم جو رعایا پر ہوتا ہے اُن کی موجودگی سے شاذ و نادر ہی رُکتا ہے۔

حکام کے تقرر کا عمل درآمد ہندوستان کے صوبہ داروں کی طرف سے جو بیش قیمت ہدیے اور تحفے موقعہ بموقعہ دیئے جاتے ہیں۔ اگرچہ تقریباً وہ اُن کے عہدوں کی قیمت ہی کا کام دیتے ہیں۔ مگر تاہم صوبوں کی حکومت جس قدر علانیہ اور جلد

جلد سلطان روم کی سلطنت ٹرکی میں فروخت ہوتی ہے اُس قدر علانیہ اور جلدی سے ہندوستان میں نہیں بکتی اور ہندوستان کے صوبہ دار روم کی بہ نسبت چونکہ اپنے عہدوں پر قائم بھی زیادہ عرصہ تک رہتے ہیں اس وجہ سے بہ نسبت اُس وقت کے کہ جب پہلے پہل وہ افلاس اور لالچ کی حالت میں صوبہ دار مقرر ہو کر جاتے ہیں رفتہ رفتہ رعایا کی نسبت اُن کا ظلم کم بھی ہو جاتا ہے۔ اور ایک یہ وجہ بھی کم ظلم کرنے کی ہے کہ اُن کو یہ خیال رہتا ہے کہ کہیں یہ لوگ ملک کو چھوڑ کر کسی راجہ کی عملداری میں نہ چلے جائیں جو فی الواقع اکثر ہوتا رہتا ہے۔ اور روم کی طرح ایران میں بھی جلد جلد اور علانیہ طور پر حکام کی تبدیلی نہیں ہوتی کیونکہ وہاں اکثر باپ کی جگہ بیٹا ہی حاکم مقرر کیا جاتا ہے۔ اور یہ عمل درآمد سلطنت روم کے دستور سے اچھا ہے اِس کا یہ بھی نتیجہ یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ایران کی رعیت روم کی رعایا کی بہ نسبت خوش حال ہے اور ایرانی ادب اور شایستگی میں بھی روم کے ترکوں سے بہتر ہیں۔ بلکہ کسی قدر کتابوں کے مطالعہ اور پڑھنے لکھنے میں بھی مصروف رہتے ہیں مگر ان تینوں ملکوں یعنی روم۔ ایران۔ اور ہندوستان میں "می ام اینڈ ٹوام" یعنی حق ملکیت کے اُصول کو زمین اور دوسری چیزوں کے بارے میں کوئی نہیں جانتا اور اس اصول کے نہ ہونے سے جو درحقیقت تمام خوبیوں اور برکتوں کی جڑ ہے۔ یہ تینوں ملک لازمی طور پر امور کلی میں باہم مشابہ ہیں اور ایک ہی قسم کی سخت غلطیوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور جلدی خواہ دیر میں بالضرور ظلم اور بربادی اور مصیبت سے جو ان غلطیوں کے طبعی نتائج ہیں ان کو دوچار ہونا پڑے گا۔

فرنگستان کی خوش حالی اور ترقی کے اسباب

جناب من۔ ہم کو خدا کا نہایت شکر کرنا اور خوش ہونا چاہئے کہ ہمارے ممالک فرنگستان میں بادشاہ زمین کے مالک علی الاطلاق نہیں ہیں۔ اور اگر ایسا ہوتا تو اس قدر آبادی اور زراعت کیونکر ہوتی اور ایسے عمدہ اور آسودہ شہر کہاں ہوتے اور شایستہ اور فارغ البال خلقت کس طرح دیکھنے میں آتی۔ اور اگر یہ برباد کن علی الاطلاق حق پادشاہوں کو یہاں بھی حاصل ہوتا تو آپ کی بہ نسبت اُن کی دولت اور اُن کی رعایا کی وفاداری اور عقیدت مندی کی کچھ اور ہی کیفیت ہوتی اور وہ صرف بیابان اور سنسان ملکوں اور وحشیوں اور ٹھگ گداؤں کے

بادشاہ ہوتے۔

حقیقت یہ ہے کہ بادشاہانِ ایشیا شریعت الٰہی اور قانون قدرت سے بڑھکر ناجائز خودمختاری حاصل کرنے کی حرص میں ایسے اندھے ہوجاتے ہیں کہ ہر چیز کو اپنے ہی ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آخرکار ہر ایک چیز اُن کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ یا اگر ہمیشہ ہی ایسا نہ ہوتا کہ سب کچھ اُن کے ہاتھ سے نکل جائے۔ مگر تو بھی اتنا تو ضرور رہی ہوتا ہے کہ جس قدر مال و دولت کے جمع کرنے کی طمع اُن کو دامنگیر رہا کرتی ہے برخلاف اپنی اُس آرزو کے اُس کے حاصل کرنے سے ہمیشہ مایوس اور محروم ہی رہتے ہیں

میں پھر کہتا ہوں کہ اگر ہمارے ملک کا طرز حکومت بھی یہی ہوتا تو ایسے رؤسا اُمرا علمائے دین متمول اہل شہر ترقی کنان اہل تجارت۔ ذہین اہلِ حرفہ اور تیز فہم کارخانہ دار کہاں ہوتے اور ایسے شہر جیسے فرانس میں پیرس۔ لائینس ٹولوز اور رائن۔ اور انگلستان میں لنڈن یا اور بڑے بڑے شہر ہیں کہاں پائے جاتے۔ اور اس قدر قصبات دیہات "کنٹری[2] ہوس" خوش نما میدان پہاڑ اور وادی جن میں نہایت ہوشیاری اور ہنرمندی اور محنت سے زراعت کی جاتی ہے کس طرح دکھائی دیتے اور ہمارے محاصل کثیر کی جو اس محنت اور مشقت کا نتیجہ ہے۔ اور جو بادشاہ اور رعایا دونوں کے لئے مفید ہے کیا حالت ہوتی بلکہ سب کچھ اس خوبصورت تصویر کے برعکس ہوتا۔ اور ہمارے بڑے بڑے شہر ناموافق ہوا کی وجہ سے سکونت کے قابل نہ رہتے اور ڈھے کر کھنڈر ہو جاتے اور کسی کو اُن کی مرمت کرنے اور زوال سے روکنے کی فکر نہ ہوتی۔ اور زرخیز پہاڑیاں کو لوگ چھوڑ کر چلے جاتے اور میدان اس سرے سے اُس سرے تک جھاڑ جھنکاڑ اور گھاس پھوس سے بھر جاتے۔ اور مضرِ صحت اور وبائی امراض پیدا کرنے والی دلدلیں سطح زمین کو ڈھانک لیتیں۔ اور مسافروں کے آرام و آسائش کے ذریعے معدوم ہوجاتے۔ مثلاً وہ اِن جو پیرس اور لائینس کے راستہ میں بنے ہوئے ہیں اپنے رتبہ سے گر کر دس بارہ

---

[1] الحق ہمابٔ الکلّ فوت الکلّ ۔ س۔ م۔ ح

[2] کنٹری ہوس۔ مکان مع باغیچہ کو کہتے ہیں جو اہل یورپ تبدیل آب و ہوا اور تفریح طبع کے لئے آبادی سے دور مضافات شہر میں بنا لیتے ہیں۔ فقط س م ح

کارواں سرائیں رہ جاتیں اور مسافروں کو خانہ بدوشوں کی طرح ہر شے اپنے ساتھ لے پھرنی پڑتی ۔

ممالک ایشیا کی کارواں سرائیں

ممالک ایشیا کی کارواں سرائیں ایک بڑے بارن (غلہ خانہ) کے مشابہ ہوتی ہیں جن کے چاروں طرف پونٹ نیوف کی طرح پختہ دیواریں بنی ہوئی اور پکا فرش لگا ہوا ہوتا ہے ۔ جن میں سیکڑوں انسان معہ اپنے گھوڑوں خچروں اور اونٹوں کے نظر آتے ہیں ۔ اور گرمی کے موسم میں تو یہ مکانات ایسے گرم ہوتے ہیں کہ دم گھٹا جاتا ہے ۔ اور جاڑوں میں سردی کے مارے مرنے سے بچنے کا کوئی ذریعہ بجز ان بہت سے حیوانات کے سانس کے نہیں ہوتا ۔ اس موقعہ پر اُمید ہے کہ بعض لوگ اعتراضاً پوچھیں گے کہ ایسے کئی ملک ہیں مثلاً سلطان روم کا ملک کہ جہاں می ام اینڈ ٹوام کے اصول کو کوئی بھی نہیں جانتا ۔ مگر پھر بھی نہ صرف بحال خود قائم اور موجود ہیں بلکہ اُن کی عظمت اور اقتدار یوماً فیوماً ترقی پر ہے ۔ مگر اس کا جواب یہ ہے کہ ایسی وسیع اور بڑی سلطنت جیسی کہ سلطان روم کی سلطنت ہے اور جس میں بہت سے صوبوں کی زمین ایسی طاقتور اور زرخیز ہے کہ کامل تردد کے بغیر بھی برسوں تک اُس کا زور قائم رہتا ہے بالضرور دولت مند اور طاقتور ہونی چاہیئے ۔ مگر غور کرنا چاہیئے کہ بمقابلہ اُس کی وسعت اور قدرتی خوبیوں کے اُس کی دولت اور طاقت کس قدر کم ہے اور اگر فرض کر لیا جائے کہ وہ ایسی ہی آباد ہے ۔ اور اُس میں ایسی ہی ہوشیاری سے کاشتکاری اور زراعت ہوتی ہے جیسی کہ حق ملکیت زمین کے رعایا کو حاصل ہونے کی صورت میں ممکن ہے تو اس صورت میں بے شک یہ ہونا چاہیئے کہ یہ سلطنت ایسی ہی بڑی اور عمدہ فوجیں نوکر رکھ سکتی ہے جیسی کہ قدیم زمانہ میں تھیں حالانکہ آج کل تو خاص قسطنطنیہ ہی میں یہ حال ہے کہ اگر پانچ چھ ہزار سپاہی بھرتی کرنے ہوں تو تین مہینے لگتے ہیں ۔ چنانچہ میں تقریباً اس تمام ملک میں پھرا ہوں اور میں نے اس کو نہایت ہی افسوسناک طور پر تباہ اور اُجڑا ہوا دیکھا ہے ۔ البتہ عیسائی غلام جو اس سلطنت کے تمام حصوں سے یہاں آتے ہیں اُن سے اس ملک کو کسی قدر مدد ملتی ہے ۔ لیکن اگر اس سلطنت کا طرز حکمرانی آئندہ بہت برسوں تک ایسا ہی رہا تو بالضرور یہ اپنی ہی اندرونی کمزوری کی وجہ سے تباہ ہو جائے گی ۔ اگرچہ

کہ فی الحال یہ کمزوری ہی اس کے قیام کا باعث ہے۔ کیونکہ کسی صوبہ کا کوئی فرماں روا یا کوئی اور شخص اتنی استطاعت نہیں رکھتا کہ کوئی چھوٹی سی بھی مہم کی تیاری کر سکے یا اس قدر سپاہی کہ جو اُس کے لئے کفتی ہوں بہم پہنچا سکے کیا عجیب بات ہے کہ جو امر اس سلطنت کے زوال کا باعث ہے وہی اُس کے چند روزہ قیام کا موجب ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان صوبوں میں بغاوت اور فساد کے روکنے اور اس قسم کے خطرات کے انسداد کامل کی غرض سے وہی عجیب و غریب تدبیر اس ملک کے بھی مناسب حال معلوم ہوتی ہے جو ملک پیگو کے ایک برہمن[۱] نے اختیار کی تھی کہ بہت عرصہ تک زمین کا جوتنا بونا بند کر دیا۔ ملک کو جنگل اور بن بنا دیا اور بیچ آدمی رعیت بھوکوں مار ڈالی۔ مگر اس سے بھی کچھ نہ ہوا اور اس کی یہ عمدہ تدبیریں ہی گئیں۔ کیونکہ ملک کئی حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ اور تھوڑا ہی عرصہ ہوا کہ اس ملک کے دار الحکومت شہر آوا پر تھوڑے سے چینی جو بھاگ کر آئے تھے قابض ہو گئے۔

مگر بہر حال ہم کو تسلیم کرنا چاہیئے کہ ہمارے جیتے جی غالباً سلطنت روم کی بالکلیہ برباد ہو جانے کی کم امید ہے۔ اور ہم خوش ہوں گے کہ اس سے زیادہ اُس کی خراب حالت نہ دیکھیں کیونکہ اس کی ہمسایہ ریاستوں کا تو یہ حال ہے کہ اس پر حملہ آور ہونا تو کیا بیرونی امداد کے بغیر اپنا بچاؤ بھی نہیں کر سکتیں۔ اور بیرونی امداد کی یہ کیفیت ہے کہ بُعد مسافت اور حسد اور رقابت کی وجہ سے اُس کے پہنچنے میں دیر ہوتی ہے اور اسی وجہ سے وہ امداد ناکافی بھی ہے اور ناقابلِ اعتماد بھی۔

اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ اس امر کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ایشیا کی سلطنتیں مفید قوانین سے کیوں مستفید نہیں ہو سکتیں اور صوبجات کے لوگ وزیر اعظم یا خود بادشاہ کے حضور میں استغاثہ کیوں نہیں کر سکتے تو میں قبول کرتا ہوں کہ البتہ وہاں بھی عمدہ قوانین ہیں اور بشرطِ آں پر کامل طور سے عمل ہو تو ایشیا بھی دنیا کے اور ملکوں کی طرح

---

[۱] ملک برہما کے باشندے چونکہ بودھ مت کے پیرو ہیں اس لئے اُن کے مذہبی مقتدا اگرچہ برہمن نہیں ہوتے مگر اصل کتاب میں ایسا ہی لکھا ہے۔ س م ح

پُند بیہودہ بلامدد باش کے قابل ہو جائے۔ لیکن جب کہ اُن پر عمل نہ ہو اور نہ اس امر کا امکان ہو کہ زور ان پر عمل کرایا جا سکے تو ایسے قوانین سے کیا فائدہ اور جب کہ حکام صوبجات اسی وزیر یا خود بادشاہ کے مقرر کردہ ہیں جو اُن کی نسبت نالش سننے کی طاقت رکھتا ہے اور ... ہے کہ فی الواقع ایسے ہی ظالم لوگوں کے سوا حکام کا مقرر کرنا وزیر اور بادشاہ کی دسترس سے بھی خارج ہے یا وہ وزیر یا خود بادشاہ کے نذرانے لے کر مقرر کیے ہوئے ہیں تو اُن کی نالش کس کے پاس کی جائے۔ اور بالفرض اگر وزیر یا بادشاہ کا میلان خاطر لوگوں کی سماعت نالش کی طرف ہو بھی تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک غریب کسان یا ستم رسیدہ کاریگر چار سو یا پانچ سو میل کے سفر کا خرچ کثیر اٹھا کر دارالسلطنت تک پہنچ سکے۔ اور اس کے سوا ایک یہ آفت ہے کہ یہ زبردست ظالم جیسا کہ اکثر ہوا ہے مستغیث کو راستہ ہی میں قتل کرا دیتے ہیں یا اُس کو اپنے قابو میں لا کر جو دل میں آتا ہے کرتے ہیں۔ اور اگر کسی اتفاق سے کوئی مستغیث بادشاہ تک پہنچ بھی جاتا ہے تو صوبہ دار کے طرفدار لوگ اصل حقیقت کو چھپا کر کچھ اور کا اور ہی بادشاہ کو باور کرا دیتے ہیں۔ غرضکہ صوبہ داروں کو اُن کے صوبجات کا بالکل مالک اور خود مختار حاکم سمجھنا چاہیئے وہ خود ہی جج ہیں۔ خود ہی پارلیمنٹ خود ہی پریسائیڈل کورٹ (عدالت اعلیٰ)، خود ہی اسیسر (تشخیص جرم کرنے والے) اور خود ہی محاصل شاہی کے وصول کرنے والے۔ چنانچہ ایک ایرانی نے ان ظالم اور لالچی صوبہ داروں اور جاگیرداروں اور مستاجروں کی نسبت کیا ہی خوب کہا ہے کہ "اینہا کاز ریگ روغن می کشند" (یہ تو ریت سے روغن نکال لیتے ہیں) اور اصل بات تو یہ ہے کہ ان کی عورتوں اور بچوں اور غلاموں اور لیٹرے مصاحبوں کے اخراجات کے لیے تو کوئی بھی آمدنی مکتفی نہیں ہو سکتی۔

اگر کوئی یہ کہے کہ ہمارے ملک فرانس کے بادشاہوں کی ملکیت خاص کی زمینیں ایسی ہی جوتی بوئی جاتی ہیں اور نہایت کثرت سے لوگ اُن میں آباد ہیں جیسی کہ رعایا کی ملکیت کی زمینیں جوتی بوئی جاتی ہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسی سلطنت کا جہاں کا بادشاہ صرف چند قطعات کا مالک ہے ایسی سلطنت کے ساتھ کہ جس کی کل زمین شاہی ملکیت ہے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ فرانس میں آئین و قوانین ایسے معقول ہیں کہ اُن کی تعمیل

سب سے اول بادشاہ پر واجب ہے۔ اور جو زمینیں اُس کے قبضہ میں ہیں اُن میں جو حق کسی کاشتکار کو حاصل ہے وہ اُس کو زائل نہیں کر سکتا۔ اور اُس کے کارندوں اور متاجروں پر قانون کے موافق نالش ہو سکتی ہے۔ اور مظلوم کسان یا کاریگر بے شک اپنے انصاف کو پہنچ سکتا ہے۔ لیکن ایشیا میں کمزوروں اور مظلوموں کے لئے کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔ اور قانون جس سے تمام جھگڑے فیصلہ پاتے ہیں صرف حاکم کا سونٹا یا اُس کی بے ٹھکانہ اور رنگارنگ رائے ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ بعض لوگ یہ کہیں گے کہ بعض فوائد ایسے ہیں کہ درحقیقت حکومت شخصیہ ہی کے ساتھ مخصوص ہیں شلاً وکلا ئے عدالت بہت کم ہوتے ہیں اور مقدمات بھی زیادہ دائر نہیں ہوتے۔ اور جو دائر ہوتے ہیں وہ بہت جلد فیصل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ میں بھی تسلیم کرتا ہوں کہ مقدمات کے انفصال میں طوالت کا ہونا ہر ایک سلطنت کے لئے سخت عیب ہے۔ اور بالضرور بادشاہ پر اس خرابی کی اصلاح واجب ہے لیکن یہ لوگ خواہ کچھ ہی کہا کریں مگر ہم تو ایران کی اس پُرانی مثل کی بہت بڑھ کر تعریف نہیں کر سکتے کہ "ناحق کوتاہ بہتر از حق دراز" کیونکہ یہ امر یقینی ہے کہ اس طوالت کے رفع کرنے کا اس سے زیادہ موثر علاج اور کچھ نہیں ہے کہ رعایا کا حق ملکیت مٹا دیا جاوے۔ اور جب یہ حق نہ رہے گا تو بے شمار قانونی کارروائیوں کی ضرورت خود ہی نہیں رہے گی۔ خصوصاً اُن کارروائیوں کی جو اہم اور طول طویل اور پیچیدہ مقامات میں ہوتی ہیں۔ نہ بہت سے مجسٹریٹوں اور ججوں کے رکھنے کی حاجت ہو گی۔ اور نہ بڑے بڑے وکلا اور مختار کاروں کی جماعت کثیر کی۔ جن کی گذر اوقات صرف مقدمات ہی پر موقوف ہے احتیاج ہو گی۔ لیکن کچھ شک نہیں ہے کہ یہ علاج مرض سے بدرجہا بدتر ہو گا اور جو مصیبت اس سے ملک پر پڑے گی اُس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور بجائے مجسٹریٹوں اور ججوں کے جن کی دیانت اور امانت پر بادشاہ بھروسہ کر سکتا ہے رعایا کے لوگ اُسی قسم کے حکام جابر کے اختیار میں جا پڑیں گے جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ممالک ایشیا میں اگر کبھی انصاف ملتا ہے تو صرف اُن غریب اور کم درجہ کے لوگوں کو ملتا ہے جو قاضیوں کو رشوت دینے کا مقدور نہیں رکھتے۔ یا کچھ دے کر جھوٹے گواہ نہیں بنا سکتے۔ جو ہمیشہ بہت سستے اور کثرت سے مل سکتے ہیں اور جو کبھی سزا نہیں پاتے۔

میرا یہ بیان اپنے کئی برس کے تجربہ پر مبنی ہے۔ اور مجھے مختلف ذریعوں سے ان امور

سے واقفیت حاصل ہوئی ہے اور یہ اُس تحقیق کا نتیجہ ہے جو ہندوستانی اور یورپین سوداگروں سے جو عرصہ سے اس ملک میں کاروبار کرتے ہیں اور مختلف سلطنتوں کے سفیروں، نمائندوں اور ترجمانوں سے نہایت کوشش کے ساتھ میں نے کی ہے میں جانتا ہوں کہ میری یہ شہادت میرے اکثر ہم وطن سیاحوں کے بیان کے برخلاف ہے شاید اُنھوں نے کسی شہر میں راستہ چلتے دو ذلیل شخصوں کو دیکھ لیا ہوگا کہ قاضی نے اُن میں سے ایک کے پاؤں کے تلوؤں[1] پر سخت جوتیں لگوا کر جلدی سے کچہری سے

---

[1] مجرموں کے تلوؤں پر قاضیوں کا جوتیں لگوانا جو مصنف نے لکھا ہے۔ چونکہ تعزیر کا یہ وحشیانہ طریقہ نہ تو شرع اسلام کے موافق ہے نہ ہندوستان کی رسوم متعارفہ میں سے ہے۔ اس لئے کچھ اس کا حال لکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

واضح ہو کہ سزادہی کے اس طریقہ کو ایرانی لوگ چوب و فلک یا چوب و فلک کردن کہتے ہیں اور پایا جاتا ہے کہ اُس ملک میں سیکڑوں برس سے یہ سزا نہ صرف چوروں، بدمعاشوں کو دی جاتی ہے بلکہ ایرانی میاں جی اپنے مکتبوں کے شریر لڑکوں کو بھی یہی سزا دیتے رہتے ہیں۔ چنانچہ رائے ٹیک چند بہار کی کتاب مصطلحات بہار عجم میں جو آج سے ایک سو باون برس پہلے یعنی ۱۱۵۲ھ کی تصنیف ہے لکھا ہے کہ "فلک چوبے باشد طولانی کہ دو سر دو ریسمان دو جا سوراخ کنند و ریسمانے ازاں بگزرانند و معلمان ہر دو پائے اطفال بازی گوش را دران بند کردہ تاب دہند آنگاہ چوب زنند و چوب و فلک نیز عبارت ازہمیں عمل است علی خراسانی گفتہ ع تا مکتب سرگشتگی گردید پیدا در فلک

مانند طفلان با خدم پائے تمنا در فلک ؛ ایضاً محمد قلی سلیم گفتہ ع

زمانہ مکتب اطفال گشتہ پنداری ؛ کہ ہر کہ ہست در شکوہ از فلک دارد ؛ ایضاً محمد سعید اشرف گفتہ ع چوں ز دلم بر دوا جمعہ طالع بچرخ بوکشم ؛ چارہ بے فلک بود طفل گریز پائے را ؛ ملا محسن تاثیر گفتہ ع رود چو طفل سر شکم بروں ز مکتب چشم نہد بپاش ز مژگاں ادیب غم فلکے، ملا نور الدین ظہوری گفتہ ع گرچہ تادیب خلق بر فلک است ؛ کہکشاں ہم بہانۂ او فلک است؛ و اغلب چوبے بود کہ در وسط آں ریسمان باشد" اور رائے ٹیک چند کے اُستاد سراج الدین علی خاں آرزو نے اپنی کتاب مصطلحات فارسی مسمّی بہ چراغ ہدایت میں جو بہار عجم سے چند سال پیشتر کی تصنیف ہے۔ یوں لکھا ہے کہ "فلک کردن" نوعے از تعذیب اطفال باشد کہ معلماں کنند و آں مانند آویختن است (لڑکوں کو سزا دینے کا ایک طریقہ ہے جو اُستاد برتتے ہیں اور وہ دراصل اُلٹا لٹکانے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ ۔ کا طریقہ ہے) اور اس آلے لٹکانے کے معنی کا استنباط اپنے شاعرانہ خیال میں محمد قلی سلیم کے مذکورہ بالا شعر سے بمناسبت لفظ فلک (یعنی آسمان) کر کے پھر ملا نورالدین ظہوری کا وہی شعر نقل کیا ہے اور اس میں کہکشاں کو اپنے تصور میں تسمہ سے مشابہ گردان کر یہ عبارت لکھی ہے کہ "لیکن ازیں شعر ظہوری یعنی تسمہ کہ معلمان بر اطفال زنند معلوم می شود" (لیکن ظہوری کے اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد وہ تسمہ ہے جس سے استاد لڑکوں کو پیٹتے ہیں) چونکہ فارسی زبان کے ان ہندوستانی نامور محققوں نے "چوب و فلک" کے معنوں میں احتمالی باتیں لکھی ہیں اس سے ظاہر ہے کہ ان کے وقت میں جو سنہ و سال کا حساب لگانے سے محمد شاہ کا عہد سلطنت معلوم ہوتا ہے جس نے سنہ ۱۱۳۱ھ میں تخت نشین ہو کر سنہ ۱۱۶۱ھ میں وفات پائی تھی۔ ہندوستان میں یہ سزا مروج نہ رہی تھی۔ انگریزی زبان میں اس طرح سزا دینے کا نام بسٹی نیڈو ہے چنانچہ ویبسٹر کی ڈکشنری میں جو زمانہ حال کی معتبر کتب لغات میں سے ہے۔ اس کی تصویر بھی لکھی ہے۔ اور بیان کیا ہے کہ دراصل یہ لفظ زبان فارسی کا ہے۔ اور اٹلی اور فرانس اور سپین کی زبانوں میں جو لفظ بسٹی نیڈو کے لئے قریب التلفظ الفاظ ہیں منجملہ اُن کے زبان فرنچ میں پہلے اس لفظ کو بستن کہتے تھے اور اب بتن کہتے ہیں۔ اور وہی مصنف لکھتا ہے کہ اس کے معنی ہیں چھڑی یا سونٹے سے ایک سخت چوٹ، اور خصوصاً اس طریق سزا کو کہتے ہیں جو ٹرکی یا چین وغیرہ سلطنتوں میں اس طرح پر دی جاتی ہے کہ مجرم کے تلووں پر لاٹھیاں مارتے ہیں اور اسی کتاب میں اس کی تصویر اس طرح بنائی ہے کہ ایک شخص کو منہ کے بل اوندھا لٹایا ہوا ہے۔ اور اُس کے دونوں پاؤں گھٹنوں تک اس طرح اونچے کئے ہوئے ہیں جیسے کہ پانی میں تیرنے کے وقت اکثر لوگ کر لیا کرتے ہیں۔ اور دونوں پاؤں کے برابر دو مضبوط کھونٹے گڑے ہیں اور اُس کے ٹخنوں میں تسمہ یا رسی ڈال کر اُن کھونٹوں کے ساتھ مضبوط باندھ دیا ہے۔ اس طرح سے کہ تلوے رو بآسمان ہیں اور اس کے پاس ایک شخص دونوں ہاتھوں میں لاٹھی اٹھائے کھڑا ہے جس کو آج کل کے رومی ترکوں کا سا یوروپین شالباس پہنایا ہوا ہے وہ زور سے اُس کے تلووں کو پیٹ رہا ہے چوب و فلک کی شکل و صورت اور اُس کے طریق استعمال کی نسبت جہاں تک ہم کو اہل ایران سے معلوم ہو سکا ہے۔ خلاصہ اُس کا یہ ہے کہ ڈنڈے کے طور کی کوئی دو گز لمبی اور ایک فٹ دور کی موٹی لکڑی کے دونوں سروں میں سوراخ کر کے اُن میں کمان کے چلّے کی طرح کوئی تین بالشت طول کی

باہر نکلوا دیا ہوگا۔ دیا دونوں کو "بیل بابا" (معلوم نہیں کون سے الفاظ کی خرابی ہے) یا کچھ اور ایسے ہی ملائم الفاظ کہکر جو قاضی لوگ اس وقت کہدیا کرتے ہیں جب کہ اُن کو فریقین میں سے کسی سے کچھ فتوح کی اُمید نہیں ہوتی جلدی سے رخصت کردیا ہوگا۔ اور کچھ شک نہیں ہے کہ کارروائی کا یہ مختصر طریقہ دیکھکر اُن کا تعجب بے محل نہیں۔ اور وہ اسی وجہ سے فرانس میں یہ کہتے ہوئے پہنچے کہ "واہ واہ کیا خوب اور کیسا جلدی انصاف ہوتا ہے اور اے راستی شعار قاضیان ہندوستان فرانس کے مجسٹریٹوں کو تمہارے نمونہ پر چلنا چاہیئے۔ اور ان بے چاروں کو اس کا خیال بھی نہیں ہوا کہ جھوٹے شخص کو اگر اس قدر استطاعت ہوتی کہ پانچ سات روپیوں سے قاضی یا اس کے محرروں کی مٹھی گرم کر دیتا یا دو چار روپیہ خرچ کرکے دو جھوٹے گواہ بہم پہنچا لیتا تو بے شک جیت جاتا یا مقدمہ کو جس قدر طول دینا چاہتا دے سکتا۔

جناب من۔ میں نہایت سچائی سے پھر عرض کرتا ہوں کہ اگر حق ملکیت جائداد زائل کردیا جائے تو ظلم بے انصافی۔ افلاس۔ اور وحشت اُس کے لازمی نتیجے ہوں گے اور زمین کا بندوبست موقوف ہوکر ملک سنسان اور ویران ہوجائے گا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس سے بادشاہ اور قوم دونوں کی تباہی اور بربادی کا راستہ کھل جائے گا۔ کیونکہ دنیا میں انسان اسی امید پر محنت کرتا ہے کہ اُس کا پھل اُس کو

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ ایک ڈھیلی رسی یا تسمہ ڈالے رکھتے ہیں اور جب مجرم کو سزا دینا چاہتے ہیں تو اُس کے پاؤں کو اول اُسی رسی میں بل دے کر کس لیتے ہیں اور بعد ازاں دو آدمی اس ڈنڈے کو دونوں سروں سے پکڑ کر مجرم کے تلوے اس طرح سے روبآسمان کر دیتے ہیں۔ گویا گھوڑے کی نعل بندی کراتے ہیں اور تیسرا شخص اکثر درخت انار کی شاخوں سے جو لچک دار ہونے کی وجہ سے زمانۂ حال کی عدالت ہائے انگریزی کے ضرب بید کا سا جو چوروں بدمعاشوں کی پشت پر مارتے ہیں، کام دیتے ہیں مجرم کے تلووں کو پیٹتا ہے۔ غرضکہ لفظ چوب سے دو شاخیں مراد اور فلک سے وہ ڈنڈا اور فی زمانہ ایران کے مکتبوں میں اُس ڈنڈے کو فلکہ بھی کہتے ہیں ہمارے ایک ایرانی دوست نے بمبئی سے مکتب کے بچوں اور چوروں کی سزا کے طورق میں جو فرق لکھا ہے بہتر ہے کہ اس کو اُنھیں کے الفاظ میں بیان کیا جائے۔ وہو ہذا۔

چوب زدن مخصوص حکام وسلاطین است کہ دزد وغیرہ راتنبیہ می کنند وے فلک در مکتب خانہ مخصوص بہ اطفال کوچک است وچوب آں یک ذرع وشاخ انار باریک دو طفل دیگر گرفتہ خود معلم

اور اُس کی اولاد کو ملے اور یہ اُمید ہی ہر ایک فائدہ مند اور عمدہ شے کی نیو رہے ۔ اور اگر ہم دنیا کی سلطنتوں کی حالت پر نظر ڈالیں تو ہم کو معلوم ہو جائے گا کہ اُن کی ترقی یا زوال صرف اسی اصول کے لحاظ یا عدم لحاظ پر موقوف ہے مختصر یہ کہ اسی اصول کے عمل درآمد یا اُس سے غفلت کرنے کا نتیجہ ہے جو ملکوں کے حالات میں الٹ پھیر ہوتی رہتی ہے۔

بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ ۔ می زنند بر کف پائے طفل کہ چنداں صدمہ نرسد مے گماشتگان شاہی قمچی چوب می زنند بر کف پائے شخص مجرم کہ تمام پائے شخص مجروح می شود و خون می آید قمچی می زنند کہ سر چوب قلم ہای خمیدہ زخم می شود بسیار بد است ۔ حال در ایران مروج است فقط س م ح

کوچ بہار اور آسام پر میر جملہ کی فوج کشی

یہ مہم (جیسا کہ ڈاکٹر برنیر نے لکھا ہے) صرف آسام ہی پر نہیں ہوئی تھی بلکہ کوچ بہار اور آسام دونوں پر ایک ہی وقت میں فوج کشی کی گئی تھی۔ اس کا اصلی سبب یہ تھا کہ سلطنت کے اخیر میں جب شاہجہاں کی بیماری نے طول پکڑا اور طرح طرح کی افواہیں پھیل گئیں حدود سلطنت میں فتور پیدا ہوا۔ اور چاروں شاہزادوں نے ایک اودھم مچادیا اور شجاع بنگالہ سے پٹنہ کوچ کر گیا۔ تو کوچ بہار کے باج گذار راجہ[1] پیم نرائن نے بھی یہ چل چلی دیکھکر پادشاہی علاقہ یعنی گھوڑاگھاٹ کو لوٹ لیا۔ اور وہاں کی رعایا میں سے ایک جماعت کثیر کو جس میں اکثر مسلمان تھے قید کر کے اپنے ملک کو لے گیا۔ اور اس پر بھی بس نہ کرکے بھولا ناتھ اپنے وزیر کو ایک انبوہ عظیم کے ساتھ کامروپ کے علاقہ پر تسلط کر لینے کے واسطے مامور کیا۔

آسام کے راجہ جے دھج سنگھ نے جو اس سے بھی زبردست تھا جب یہ حال دیکھا تو اس نے بھی ایک لشکر عظیم خشکی اور تری کی راہ سے علاقہ کامروپ پر روانہ کردیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کامروپ کا بادشاہی فوجدار کوچ بہار اور آسام کے لشکروں سے مقابلہ کی طاقت نہ دیکھکر اور بنگالہ کے صوبہ دار (سلطان شجاع) سے کمک پہنچنے کی امید منقطع سمجھکر جہانگیر نگر (راج محل) کو بھاگ آیا۔ اور چونکہ بھولا ناتھ بھی خود کو آسامیوں سے کمزور

---

[1] عالمگیر نامہ میں لکھا ہے کہ کوچ بہار کے علاقہ کے لوگ نارائن کی مورت پوجتے ہیں۔ اس لئے لفظ نارائن ہمیشہ یہاں کے راجہ کے نام کا جزو اخیر ہوتا ہے۔ بلکہ اسی وجہ سے یہاں کے سونے کے سکہ کو بھی نارائنی کہتے ہیں۔ اور قدامت خاندان کے باعث سے کوچ بہار اور آسام کے راجہ اس زمانہ میں اس طرف کے لوگوں کی نظر میں بہت معزز اور محترم خیال کئے جاتے تھے۔ اس کی ریاست بنگالہ کے شمال ومغرب میں حائل بشمال پچپن کوس کے طول اور پچاس کوس کے عرض میں دس لاکھ روپیہ آمدنی کی تھی اور دریائے سنکوش جو تبت اور بنگالہ میں بہتا ہے۔ آسام اور کوچ بہار میں حد فاصل تھا۔ س ع

بھکر پیچھے ہٹ گیا۔اس وجہ سے آسام والوں نے بے مقابلہ و مزاحمت بادشاہی ملک پر متسلط ہوکر خوب لوٹا اور اپنے دستور کے موافق بہت سی رعیت کو پکڑ کر قیدی بنا لیا اور یہاں تک بڑھے کہ بے روک ٹوک جہانگیر نگر سے تقریباً پانچ منزل کے فاصلہ پر موضع ست سلا پرگنہ کری باڑی میں اپنا تھانہ بٹھا دیا۔

یہ اسامی ایسے زبردست اور مغرور تھے کہ پہلے بھی کئی بار ایسی حرکتیں جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد میں کر چکے تھے۔چنانچہ ایک بار سید ابوبکر کو جو جہانگیر کا ایک امیر تھا معہ اُس کی فوج کے جدہرہ کے پاس سے اور دوسری دفعہ شیخ عبدالسلام حاجو کے فوجدار کو شاہجہاں کے زمانہ میں گواہٹی سے پکڑ کر لے گئے تھے اور کبھی بھی کسی مسلمان بادشاہ سے مغلوب نہ ہوئے تھے۔کیونکہ ایک تو یہ لوگ وحشی خصال اور جنگجو تھے۔علاوہ بریں اِن کا ملک بسبب کوہستان اور ندی نالوں، عمیق دریاؤں، جنگلوں اور ناقابل گذر بنوں وغیرہ کے سبب قدرتی طور پر محفوظ تھا۔شاہجہاں کے عہد میں مذکورہ بالا واقعہ کے باعث اگرچہ میر عبدالسلام مخاطب بہ اسلام خان صوبہ دار بنگالہ نے خاص اپنے بھائی کو سپہ سالار بنا کر آسام پر فوج کشی کی تھی۔مگر یہ حملہ آور سردار صوبہ بنگالہ۔اور آسام کی سرحد موضع کجلی سے ہنوز آگے نہیں بڑھا تھا کہ اتنے میں شاہجہاں نے میر عبدالسلام کو اپنا وزیر مقرر کر کے شجاع کو بنگالہ کی صوبہ داری پر مامور کر دیا۔اور جیسا کہ شخصی ارادے اکثر ادھورے رہ جایا کرتے ہیں اس تغیر و تبدل میں یہ مہم ناتمام رہ گئی تھی۔

میر جملہ کی راج محل میں آمد القصہ جب میر جملہ عالمگیر کے تیسرے سال جلوس میں شجاع کو دباتا ہوا راج محل میں جا پہنچا تو آسام کا راجہ اُس نامور مدبر کی لیاقت اور شجاعت کی شہرت سے اور یہ دیکھکر کہ وہ شجاع کو کیسی کامیابی سے مغلوب کر چکا ہے۔اپنی مذکورہ بالا پیش قدمی اور حماقت کا خیال کر کے خائف ہوا۔ اور وکیل کے ہاتھ میر جملہ کی خدمت میں ایک معذرت نامہ اس مضمون کا بھیجا کہ ہیم نرائن ہمارا دشمن ہے اور وہ چاہتا تھا کہ کامروپ کے علاقہ پر جو قدیم زمانہ میں آسام سے متعلق تھا متصرف ہو جائے۔اس سبب سے میری فوج نے اُس ملک پر قبضہ کر لیا تھا اب جس کو حکم ہو سونپ دیا جائے۔

میر جملہ نے مصلحت وقت سمجھکر اُس کی معذرت کو قبول کر لیا اور وکیل کو خلعت دیا۔

اور رشید خاں کو معہ اور چند سرداروں کے متعین کیا کہ آسامی جو اس قرارداد کے موافق علاقہ کامروپ کو خالی کرکے مناس ندی کے کنارہ تک ہٹ گئے تھے جاکر قبضہ کرلے۔

اس کے بعد بھیم نارائن نے بھی وکیل بھیج کر معذرت کی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ اس راجہ نے باوجود بادشاہی باج گذار ہونے کے اطاعت کے خلاف یہ گستاخی کی تھی اس لئے میر جملہ نے عذر قبول نہ کرکے وکیل کو قید کردیا۔ اور راجہ سوجان سنگھ بندیلہ اور مرزا بیگ اپنے ایک ذاتی ملازم کو کچھ اپنی اور کچھ بادشاہی فوج دے کر اُس کی گستاخی کی سزا دینے کیلئے کوچ بہار کو روانہ کردیا۔

چونکہ راجہ بھان سنگھ نے شہر کوچ بہار کے قریب پہنچ کر یہ اندازہ کیا کہ اپنی موجودہ جمعیت سے وہ اُس کو فتح نہیں کرسکتا۔ اس لئے ناچار کھ دوار کے سامنے جو کوچ بہار میں داخل ہونے کے لئے صدر دروازہ تھا اور جس کا ذکر بہ تفصیل آگے آئے گا ٹھیر گیا۔

ادھر سرحد آسام پر یہ معاملہ پیش آیا کہ رشید خاں جو بہ لحاظ قلت فوج ازراہ احتیاط کسی قدر جھجک جھجک کر آگے بڑھتا تھا اس باعث سے آسامیوں نے ان کو ضعیف سمجھ کر ایفائے وعدہ کا خیال چھوڑ دیا اور لڑنے کے لئے آمادہ ہوگئے۔

میر جملہ کی فوج کشی

آخر کار جب شجاع تباہ و برباد ہو کر بنگالہ سے اراکان کو چلا گیا اور میر جملہ نے اُس کے تعاقب سے فراغت پائی تو کوچ بہار اور آسام کے معاملات پر متوجہ ہوا۔ اور ان دونوں پر بذات خود فوج کشی کرنا مناسب سمجھ کر بادشاہ سے اجازت منگائی اور اُن تمام سرداروں اور امیروں سمیت جو شجاع کی مہم میں اس کے ساتھ مامور تھے خضر پور سے (جس کا نشان بنگالہ کے نقشہ پر نہیں ملا) اٹھارھویں ربیع الاول ۱۰۷۲ھ کو (مطابق سال چہارم جلوس عالمگیری) برسات کے بعد کشتیوں میں روانہ ہوا۔ اور بمقام بری تلا جو بادشاہی ملک میں کوچ بہار کی سرحد پر تھا جا ٹھیرا۔

دانشمندان قوم انگریز زمان رواں حال کی طرح جو از راہ دوراندیشی سپہ سالار عہد کے دفتر میں ہمیشہ ایک مستقل محکمہ ہی اندرونی و بیرونی ملکوں کی نسبت ہر قسم کی معلومات جمع کرتے رہنے کا قائم رکھتے ہیں اُس وقت پیش بینی کے یہ سامان کہاں تھے کہ اس سرحدی ریاست کے راستوں وغیرہ کے حالات سے اُس کو واقفیت ہوتی۔ اس لئے ناچار وہاں رُک کر اس ملک میں داخل ہونے کے لئے راستہ تلاش کرنے لگا اور بعد تحقیقات

یہ تین راستے دریافت ہوئے۔

ایک ولایت[1] مورنگ کی طرف سے دوسرا بادشاہی ملک کی سمت سے جو کہ دوار جھکر جاتا تھا۔ اور جدھر سے راجہ سبحان سنگھ اور مرزا بیگ نے داخل ہونے کا قصد کیا تھا تیسرا راستہ گھوڑا گھاٹ اور رنگا ماٹی کی جانب سے۔ سوائے ان تین مشہور راستوں کے بادشاہی ملک کی طرف سے ایک اور بھی غیر متعارف راستہ تھا۔ چنانچہ میر جملہ نے بوجوہ خاص اُس کو اختیار کیا۔

شہر کوچ بہار کا محلِ وقوع

شہر کوچ بہار اُس وقت اس طرح واقع تھا کہ اُس کے گردا گرد مدت ہائے دراز سے ایک نہایت عریض اور مرتفع بند جس کو اُس ملک کی اصطلاح میں آل کہتے تھے چوبیس کوس کے دورہ میں بطور حصار کے بنا ہوا تھا۔ جس کے اندر نہ صرف یہ شہر بلکہ کئی پرگنے بھی تھے۔ اور اس بند کے گردا گرد ایک عمیق خندق کے علاوہ بانس اور بید اور اور درختوں کا ایسا گھنا جنگل تھا کہ جس میں سے جانور بھی بمشکل گذر سکے اور اس بند میں چند مستحکم دروازے تھے جن پر بڑی بڑی توپیں اور لمبی لمبی بندوقیں اور زنبورک وغیرہ سامانِ جنگ کے ساتھ نگہبانی کے لئے راجہ کی فوج ہر وقت تعینات رہتی تھی۔ اور ان سب میں سے بڑا دروازہ جو شہر کے محاذی واقع تھا اُس کو کمہ دوار کہتے تھے۔

میر جملہ نے جو راستہ اختیار کیا تھا اگرچہ اس طرف آل کا عرض اور ارتفاع کمتر تھا لیکن ندیاں نالے اور بانس کا گھنا جنگل اس شدت سے تھا کہ بیم نرائن کو اس طرف سے حملہ ہونے کا ذرا بھی دغدغہ نہ تھا۔

میر جملہ کی فتح یابی

میر جملہ نہایت محنت کے ساتھ کوچ بکوچ ندی نالوں کو عبور کرتا اور جنگل کٹواتا ہوا غرہ جمادی الاول سنہ مذکور کو آل تک جا ہی پہنچا۔ اور خفیف سے مقابلہ کے بعد اُس سے پار ہو گیا۔

بیم نرائن جو اسی جنگل اور آل کے بھروسہ پر ساری شوخیاں اور سرکشیاں کرتا تھا شہر کو خالی چھوڑ کر اور اہل و عیال کو ساتھ لے کر بھوٹنت کے بلند اور پنہانی کوہستان کی راہ[2] ...

---

[1] عالمگیر نامہ وغیرہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت کی اصطلاح میں لفظ ولایت کا اطلاق ایسے علاقوں کی نسبت کیا جاتا تھا جو بادشاہی حکومت سے آزاد اور خود مختار رہتے تھے۔ س م ع

[2] بھوٹنت جس کو آج کل انگریزی نقشوں میں اکثر بھوٹان لکھتے ہیں جیسے دو راجہ ہوتے، ...

کے پاس جو ایک سو بیس برس کی عمر میں مرد مرتاض - تارک لذات اور صرف کیلا اسودہ کی غذا پر جینے والا اور باوجود کبر سن کے تندرست اور صحیح القویٰ اور نہایت منصف اور رعیت پرور جو مدت کا پیرو تھا چلا گیا اور میر جملہ ششم جمادی الاول سنہ ۱۰۷۲ھ کو (اس مہم پر روانگی سے تخمیناً ڈیڑھ مہینے کے بعد) شہر کوچ بہار پر قابض ہوگیا۔

عالمگیر نامہ میں لکھا ہے کہ فتح مندوں نے اس ملک کو طرح طرح کے پھولوں اور میووں اور سیاہ مرچ اور ادرک اور انواع و اقسام کے خوبصورت درختوں سے ایک قدرتی باغ کی طرح نہایت ہی سرسبز و شاداب پایا۔

مگر وہاں کے سیاہ فام اور قلماق صورت (یعنی گورکھیہ نما) زن و مرد حسن و جمال اور صباحت و ملاحت سے عموماً محروم وحشی اور جنگلی خصلت تھے جن کا حربہ تلوار اور بندوق کے علاوہ زیادہ تر زہر کے بجھے ہوئے تیر تھے۔

لیکن راجہ کی نسبت لکھا ہے کہ اس کی طبیعت زینت و نفاست عیش و عشرت اور صفائی و لطافت کی جانب نہایت مائل تھی اور اس کے مکانات ، خلوت خانہ، دیوان خانہ، حرم سرا۔ خواص پورہ - حمام - باغیچہ - نہر - فوارہ - آبشار وغیرہ ، بہت با قرینہ اور طرح دار زینت و تکلف کے ساتھ بنے ہوئے تھے اور شہر بھی بہت اچھے قرینہ سے بسا ہوا تھا۔ اور اکثر کوچوں اور بازاروں میں خیابان اور پھولوں کی کیاریاں تھیں اور ناگ کیسر اور کچنار کے خوبصورت درخت لگے ہوتے تھے۔ اور یہ صفائی اور نفاست کی باتیں جو انھوں نے وہاں جاکر دیکھیں ایسے جنگلی لوگوں کے ملک میں اُن کی توقع کے نہایت ہی خلاف تھیں۔

القصہ جب سب طرح عمل و دخل ہو چکا تو دوسرے دن سید صادق صوبہ بنگالہ کے صدر (متولی اوقاف) نے میر جملہ کے حکم سے ہیم نرائن کے سب سے اونچے محل کی چھت پر چڑھ کر (گویا اہل اسلام کی فتح کے علامت کے طور پر) اذان دی۔ جو بقول صاحب عالمگیر نامہ۔ اس ملک میں تہلیل و تکبیر کی یہ پہلی ہی صدا تھی اور بادشاہ کے نام کا سکہ و خطبہ جاری کیا۔ اور کھڑ دوار کے استحکام اور عمارت کو مسمار کرا دیا۔ اور اس کے گرداگرد سو سو گز تک جنگل بھی کٹوا ڈالا۔ ایک سو چھ توپیں اور ڈیڑھ سو سے زیادہ زنبورک اور رام جنگی (جو اس زمانہ میں ایک قسم کی لمبی بندوق کو کہتے تھے) اور بہت سی معمولی بندوقیں اور

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ ایک دینی دوسرا دنیاوی (دینی راجہ کا لقب دیب راج اور دنیوی کا دھرم راج ہوتا ہے۔
م ح

سامان جنگ ضبط کر لیا گیا۔ اور بھولا ناتھ وزیر جو کوچ بہار کے مغرب کی طرف بھاگ کر مورنگ کے دشوار گذار جنگلوں میں جا گھسا تھا اُس کو بھی بادشاہی فوج نے جا پکڑا اور راجہ کا بڑا بیٹا بشن نارائن جس کو اس کا باپ اکثر نظربند اور قید رکھتا تھا باپ سے جدا ہو کر میر جملہ کے لشکر میں آگیا اور اپنی خوشی سے مسلمان ہو گیا۔

اگرچہ کچھ سپاہ بیم نرائن کی گرفتاری کے لئے بھوٹنٹ کو بھی روانہ کی گئی تھی اور اس باب میں میر جملہ نے ایک پروانہ بھی وہاں کے راجہ کے نام لکھا تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے۔ کہ مغلیہ فوج جو اکثر سواروں کی ہوتی تھی اس لئے پہاڑ کے نیچے کے حصہ میں کچھ لاحاصل شور و غل مچا کر واپس چلی آئی اور راس کے پروانہ کی کسی نے پروا نہ کی۔ اور مصلحتاً یہ بھی چپ ہو رہا غرضکہ میر جملہ نے سولہ دن کوچ بہار میں ٹھیر کر نظم و نسق ملک کے لئے اپنے عہدہ دار مقرر

لہ یہ ریاست نی زمانہ گورنمنٹ بنگالہ کے ماتحت دار جلنگ کے قریب راج شاہی کی کمشنری کے متعلق ہے۔ شمال کی طرف ضلع جلپا گوری کے مغربی دواروں سے محدود ہے۔ اور جنوبی طرف میں ضلع رنگ پور اور مشرق میں گوال پاڑا۔ اور مغرب میں دیناج پور ہے۔ رقبہ اس کا تیرہ سو سات میل مربع اور آبادی خلائق چھ لاکھ دو ہزار چھ سو چوبیس ہے۔ فرماں روائے حال کا نام و خطاب مہاراجہ نرپ اندر نرائن بھوپ بہادر ہے۔ اور گورنمنٹ انگریزی سے تیرہ ضرب توپ کی سلامی کا اعزاز اور آنریری میجر کا فوجی لقب بھی حاصل ہے رئیس حال کی نابالغی کے زمانہ میں گورنمنٹ انگریزی نے اس ریاست کے طریق نظم و نسق کی بہت بڑی اصلاح کر دی ہے۔ اور اس زمانہ کی شائستہ طرز حکومت کے موافق صیغہ جات مال جوڈیشل پولیس۔ بندوبست۔ تعمیرات عامہ۔ تعلیم۔ اور ٹیلیگراف۔ اور ڈاک خانے اور باقاعدہ انتظام جیل خانہ وغیرہ موجود ہے۔ اور ملک کی آمدنی تخمیناً تیرہ چودہ لاکھ روپیہ سالانہ ہے سر چارلس ایچسن صاحب کی کتاب عہد نامجات سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۷۷۲ء سے یہ ریاست گورنمنٹ انگریزی کی حمایت میں آئی ہے۔ جب کہ وہاں کے خورد سال راجہ کو بھوٹیوں نے مقید کر کے ملک پر اپنا قبضہ کر لیا تھا اور گورنمنٹ ممدوحہ نے ملک کی نصف آمدنی کا خراج عائد کر کے اُن کو نکال دیا اور راجہ کو بحال کر دیا۔ اکتوبر ۱۸۸۸ء میں ہز ایکسیلنسی لارڈ ڈفرن ولیسرائے ہند کے دربار میں بمقام شملہ راقم نے رئیس حال کو دیکھا تھا کہ ایک سانولے رنگ کے کشیدہ قامت نوجوان ہیں اور اُس وقت فوجی وردی پہنے ہوئے تھے اور اپنے عادات و اطوار لباس و پوشاک وغیرہ میں عموماً یورپین وضع رکھتے ہیں اور مذہب میں برہمو طریقہ کے پیرو ہیں۔

کر دیئے۔ اور خود تفصیہ میں جمادی الاول کو (شروع کوچ سے تقریباً دو مہینے کے بعد) گھوڑا گھاٹ کے راستے آسام کو روانہ ہوا۔

آسام کے عمومی حالات

یہاں تک تو ناظرین ریاست کوچ بہار میں میر جملہ کے عمل و دخل، شاہی سکہ، خطبہ وغیرہ کے اجرا کا حال معلوم کر چکے ہم آسام میں میر جملہ کی جنگی کارروائیوں کے لکھنے سے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک کی حدود اور حالات طبعی اور وہاں کے باشندوں کے عادات و خصائل اور رسم و رواج وغیرہ کو (جس طرح پر کہ اُس وقت تھے اور جن کو صاحب عالمگیر نامہ نے اپنے طور پر بہت تفصیل سے لکھا ہے) توضیح مطلب کے لئے اول بیان کیا جائے (وہو ہذا)۔

یہاں کے لوگ اپنے راجہ کو سرگی راجہ کہتے اور یہ عجیب اعتقاد رکھتے تھے کہ اس خاندان کے بزرگ سُرگ کے راجہ تھے اُن میں سے ایک راجہ سونے کا زینہ لگا کر آسام میں اُتر آیا۔ کچھ عرصہ تک رہتے رہتے یہی جگہ پسند آگئی اور سُرگ کو واپس نہ گیا۔

ان راجاؤں نے کبھی ہندوستان کے کسی بادشاہ کی اطاعت نہیں کی تھی۔ اور جب کبھی فوج بھیجی گئی تو بجز ناکامی کے اور کچھ حاصل نہ ہوا۔ اور یہ ملک جو قدرتی طور پر دشوار گذار ہے اکثر رسد کا راستہ روک کر شب خون مار کر یا اور سی ایسی ہی تدبیروں سے ہمیشہ آسامی ہی غالب آتے رہتے تھے اور اگر مقابلہ سے بھی عاجز آئے تو رعیت کو پہاڑوں میں بھگا کر اور اشیاء مایحتاج لشکر کو جلا پھونک کر ملک کو ویران اور سنسان کر ڈالتے تھے اور پھر برسات کے دنوں میں (جو وہاں بہ شدت ہوتی ہے) غنیم کو دن رات کے حملوں سے تباہ و غارت کر دیتے تھے۔ اس سبب سے یہاں کے حالات غیروں سے اس قدر مخفی تھے کہ عموماً یہ مشہور تھا کہ اس ملک کے رہنے والے ساحر اور جادوگر ہیں اور جو کوئی وہاں جا پھنستا ہے۔ جادو کے زور سے پھر باہر نہیں آسکتا۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ بلکہ

بابو کیشب چندر سین ساکن کلکتہ مقتدائے فرقہ برہم سماج جو بیچارے ایک غریب آدمی مگر ذی علم اور نیک شخص تھے اُن کی لڑکی سے اُن کی شادی ہوئی ہے اور آج کل معہ مہارانی صاحبہ ممدوحہ بطریق سیر و سیاحت لندن میں تشریف فرما ہیں۔ فقط ن م ح

آسام کی حدود اور طول وعرض اس ملک کے طبعی حالات کے متعلق مصنف موصوف یوں لکھتا ہے کہ ملک آسام جو بنگالہ کے شمال ومشرق میں واقع ہے تقریباً دو سو کوس طول کا علاقہ ہے اور عرض میں جنوبی پہاڑوں سے لے کر شمالی تک تخمیناً آٹھ دن کا راستہ ہے۔ اور دریائے برہما پتر جو ملک خطا کی طرف سے اُن پہاڑوں میں سے آتا ہے جو آسام اور ملک آوا کے درمیان ہیں۔ طولاً اس ملک کے وسط میں سے گذرتا ہے۔ اس دریا کے شمالی کنارے کی طرف جو علاقے ہیں اُن کو اُترکون اور جنوب کے علاقہ کو دکن کون کہتے ہیں۔ اُترکون کے علاقوں کی ابتدا گواہٹی سے ہوتی ہے، جو ممالک بادشاہی کی سرحد ہے اور منتہا کے طول وہ پہاڑ ہیں کہ جن کے باشندوں کو مری اور مجمی (زمانہ حال میں مرسے ما) کہتے ہیں اور دکن کون کے علاقے طولاً کوہستان سری نگر سے شروع ہو کر سدیا کے علاقہ پر ختم ہوتے ہیں۔

جنوبی سمت کے پہاڑوں میں مشہور پہاڑ نامروپ کے ہیں جو راجہ کے دارالریاست کھڑگانوں سے چار منزل اوپر ہیں اور ایک وہ پہاڑ بھی مشہور ہے کہ جس کے رہنے والوں کو ناکت کہتے ہیں۔ (جو زمانہ حال میں ناگہ مشہور ہے) یہ لوگ ایسے وحشی ہیں کہ سر سے پاؤں تک ننگے رہتے۔ اور کتا۔ بلی۔ سانپ۔ چوہا وغیرہ سب چٹ کر جاتے ہیں۔ اگرچہ راجہ کی تابعداری کرتے ہیں مگر مال گذاری نہیں دیتے۔ اور وہ پہاڑی جن کو ڈفلے کہتے ہیں نام کو بھی تابعداری نہیں کرتے بلکہ اپنے پہاڑوں سے اُتر کر کبھی کبھی راجہ کے ملک کو لوٹ لیتے ہیں۔

صاحب عالمگیر نامہ شہر کھڑگانوں کا محل وقوع اس طرح بتاتا ہے کہ گواہٹی سے پچھتر کوس ہے اور کھڑگانوں سے راجہ پیگو کا دارالحکومت شہر آوا پندرہ منزل ہے۔ جن میں کوہستان نامروپ سے اُس طرف پانچ منزل تک تو جنگل اور دشوار گذار پہاڑ ہیں اور پھر آگے آوا تک زمین ہموار اور صحرائی ہے۔

وادیٔ برہم پترا کی سرسبزی وشادابی اس ملک کے مشہور دریا برہما پتر میں جو دریا شامل ہوتے ہیں اُن سب میں بڑا دریائے دہنگ ہے جو آسام کے جنوبی پہاڑوں سے آکر لکھو گڑھ کے مقام پر برہما پتر میں ملتا ہے اور ان دونوں دریاؤں کے درمیان پچاس کوس تک نہایت ہی آباد اور سرسبز وشاداب زمین ہے جس کا منتہا ایسے دشوار گذار بن پر ہوتا ہے جس میں ہاتھی بکثرت ہیں۔ آسام میں اس جنگل

کے علاوہ چار پانچ جن ہاتھی پکڑنے کے اور بھی ہیں اور ان سب میں سے ہر برس پانچ سو سے ہزار ہاتھی پکڑے جاتے ہیں۔ مذکورہ بالا قلعہ کے علاوہ ایک اور علاقہ جو سیلا گڈھ سے گھرگاؤں تک قریب پچاس کوس ہے۔ یہ لہلہاتے کھیتوں اور سرسبز درختوں کی کثرت سے ایسا دلکش اور پُربہار ہے کہ تمام سرزمین گویا ایک باغ ہے اوران گنجان اور شاداب اور خوبصورت درختوں میں رعیت کے گھر بہت ہی خوش نما معلوم ہوتے ہیں۔ غرضکہ خود رو درختوں اور باغات اور میووں اور پھولوں کا ان دونوں قلعوں میں کچھ شمار نہیں ہے۔

آسام کے طبعی حالات

اور چونکہ موسم برسات میں اکثر ان نشیب کی زمینوں پر پانی بھر جاتا ہے اس لئے سیلا گڈھ سے گھرگاؤں تک ایک اچھی چوڑی اور اونچی آل (سڑک) بنی ہوئی تھی جس پر سایہ کے لئے موزونیت کے ساتھ بانس کے درخت لگے ہوئے تھے اور سوائے آل کے خالی اور غیر مزروع زمین نام کو بھی نہ تھی۔ میوے اور مصالحے کی اقسام سے آم۔ کیلہ۔ ترنج۔ نارنج۔ لیمو۔ انناس۔ ادرک۔ پان۔ پونڈہ۔ سرخ و سیاہ سفید تینوں قسم کا نہایت نرم اور شیریں۔ اور ایک قسم کا نہایت عمدہ اور خوش ذایقہ آملہ۔ اور ناریل۔ سیاہ مرچ اور چھالیہ وغیرہ کے درخت کثرت سے تھے اور گھرگاؤں کے گرد ندد آلو۔ اور خود رو انار بھی بہت تھے اور غلات میں چاول اور ماش بکثرت۔ مسور کم۔ گیہوں بالکل نہیں ابریشم بھی بہت تھا جس سے مشجر اور مخمل اور دوسرے اچھے اچھے ریشمیں کپڑے بنتے تھے مگر ملک کی اندرونی احتیاج سے زیادہ نہ بناتے تھے۔

نمک کمیاب تھا اور اُس ولایت کا اصل نمک جو کیلہ کے درخت سے بناتے تھے نہایت ہی تلخ تھا۔

قوم ناگ کے پہاڑوں میں عود (اگر) نہایت عمدہ اور کثرت سے تھا جس کو وہ لوگ آسام میں لاکر نمک اور غلہ سے بدلتے تھے۔ عود نامروپ۔ سَندَیا۔ اور لکھو گڈہ کے پہاڑوں میں بھی تھا۔ اور کستورے سیرن بھی۔

صاحب عالمگیرنامہ لکھتا ہے کہ دکن کوہ کی طرف چونکہ تنگ اور دشوار گزار مقامات زیادہ ہیں اس لئے آسام کے راجاؤں نے پولیٹیکل مصلحتوں سے اپنا دارالحکومت اسی طرف بنا رکھا ہے لیکن دریائے برہما پتر کی شمالی جانب کا ملک بلحاظ قدرتی خوبیوں اور کثرت آبادی کے نہایت پُر رونق اور اس سے بہ بہا بہتر ہے اور اس طرف کے پہاڑ جو برہما پتر کے کنارہ سے کم از کم پندرہ

کوس اور زیادہ پچیالیس کوس کے فاصلہ پر ہیں سب ٹھنڈے اور برفانی ہیں۔ ان کے باشندے عموماً توانا قوی ہیکل اور وجیہ اور سڈول ہیں اور سرد ملکوں کے باشندوں کی طرح ان کا رنگ بھی سرخ و سفید ہے اور یہاں وہ سب میوے بھی پیدا ہوتے ہیں جو اور ٹھنڈے ملکوں میں ہوا کرتے ہیں اور اسی جانب قلعہ جدہرہ اور گواہٹی کی سمت میں جو علاقہ ورانگ کا پہاڑ ہے تمام باشندے یہاں کے عادات و اطوار و گفتار میں باہم مماثلت رکھتے ہیں اور صرف اپنے پہاڑوں اور قبیلوں کے نام سے علیحدہ علیحدہ تمیز کیے جاتے ہیں۔

پہاڑوں میں مشک اور سرہ گائے کی چوریاں بھی ہوتی ہیں اور کچھ گوٹ اوڈانگن بھی۔ اور ریگ شوئی سے سونا بھی نکلتا ہے بلکہ کل آسام کے دریاؤں کی ریگ شوئی سے سونا ملتا ہے۔ چنانچہ بارہ ہزار آدمیوں سے بیس ہزار تک بھی کام کرتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک شخص بطور سالانہ محصول کے ایک تولہ سونا راجہ کو دیتا ہے۔

آسامیوں کی زبان اور مذہب آسامی زبان بنگالہ سے بالکل الگ ہے اور مذہب میں بھی ان کا یہ حال ہے کہ بخلاف اہل ہندوستان کے کھانے پینے وغیرہ کی قیود میں سے کسی بات کے مطلق پابند نہیں ہیں۔ اور ہر کسی کے ہاتھ کا کھانا بے تکلف کھا لیتے ہیں اور یہاں تک بے قید ہیں کہ انسان کے گوشت کے سوائے کسی قسم کا گوشت نہیں چھوڑتے۔ بلکہ مردار بھی کھا لیتے ہیں۔ مگر تعجب یہ ہے کہ گھی بالکل نہیں کھاتے۔ اگر کسی کھانے میں اس کی بو بھی آجائے تو اس سے نفرت کرتے ہیں۔

عورتوں کے پردہ کی مطلق رسم نہیں حتی کہ راجہ کی رانیاں بھی کھلے منہ ننگے سر لوں ہی پھرا کرتی ہیں۔ آسامیوں کی اکثر چار پانچ عورتیں ہوتی ہیں جن کو بیچ بھی ڈالتے اور بدل بھی لیتے ہیں۔ ڈاڑھی مونچھ منڈاتے ہیں اور جو نہ منڈائے اُس کو بہت بُرا سمجھتے ہیں پوشش جنگلیانہ ہے۔ پگڑی کی جگہ سر پر کچھ یوں ہی کپڑا سا لپیٹ لیتے ہیں۔ پاجامہ کے عوض تہ بند باندھ کر اوپر سے ایک چادر اوڑھ لیتے ہیں اور جوتا بھی نہیں پہنتے۔ قوت و توانائی جرأت، بے باکی۔ وحشت اور جنگلی پن اُن کی صورت اور سیرت سے ظاہر ہے جسمانی محنت اور جفاکشی کے کاموں میں اکثر دنیا کے لوگوں سے زیادہ مضبوط ہیں اور سب کے سب سخت جان جنگجو کینہ خو۔ غدار و مکار ہیں۔ رحم و شفقت انس و الفت سچائی شرم و حیا اور عفت و وفا اور اہلیت و انسانیت کا نام تک نہیں جانتے۔

رہن سہن اینٹ پتھر کی عمارت سوائے گھڑگاؤں کے دروازوں اور مندروں کے اور کہیں نہیں امیر و غریب سب اپنے گھر لکڑی سے یا بانس اور گھاس پھوس سے بناتے ہیں۔ راجہ اور رائس کے اکثر سنگھاسن پر اور بڑے سردار اور رعیت کے دولت مند لوگ ڈولے میں جو سنگھاسن سے چھوٹا ہوتا ہے۔ سوار ہوتے ہیں گھوڑا۔ اونٹ۔ گدھا۔ اس ملک میں ہوتا ہی نہیں۔

اگر کوئی شخص کسی دوسری جگہ سے کوئی گدھا لے آتا ہے تو اس کو دیکھکر اور رکھکر بہت خوش ہوتے ہیں اور بڑی قیمت لگاتے ہیں اور اونٹ کو تو دیکھکر نہایت ہی متعجب ہوتے ہیں مگر گھوڑے سے بہت ڈرتے ہیں یہاں تک کہ بالفرض اگر ایک سوار سو آسامیوں پر حملہ کرے تو سب ہتھیار ڈال کر بھاگ جائیں یا مطیع ہو جائیں حالانکہ اگر کسی پیادے دشمن سے مقابلہ ہوتا ہے تو خوب دلیری سے لڑتے ہیں۔

اُس ملک کے قدیمی باشندے دو قوم ہیں۔ ایک آسامی دوسرے کلتانی۔ اگرچہ کلتانی سب باتوں میں مقدم ہیں لیکن سپہ گری اور لڑائی بھڑائی کے سخت کاموں میں آسامیوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ چنانچہ چھ سات ہزار آسامی راجہ کے مکان کے گرد ہمیشہ مسلح پہرہ دیا کرتے ہیں اور ایسے کاموں میں انھیں پرا عتماد ہے۔ اور راجہ کے جلاد اور میر غضب بھی یہی ہوتے ہیں۔ بندوق۔ تلوار۔ نیزہ کے علاوہ بانس کے تیر و کمان رکھتے ہیں۔ گمران کے قلعہ اور لزاڑہ میں توپیں اور لمبی بندوقیں بھی ہوتی ہیں اور اُن کا چلانا خوب جانتے ہیں۔

میر جملہ کا آسام میں داخلہ اس ملک میں داخل ہونے کے لئے میر جملہ نے تیئسویں تاریخ جمادی الاول کو کوچ بہار سے گھوڑا گھاٹ کی طرف کوچ کیا اٹھائیسویں کو دریائے برہما پتر کے کنارہ پہنچ کر رنگا ماٹی میں جہاں یہ دریا پہاڑوں سے باہر نکلتا ہے جا اُترا۔ چونکہ دونوں طرف کے پہاڑ بہت بلند اور لشکر کے لئے ناقابل گذر تھے۔ اور باوجود اس کے کہ دریا کے دونوں کنارے بن اور جنگل اور دلدل اور پانی کثرت سے تھا مگر اُس نے براہ دوراندیشی دریا کا راستہ اختیار کیا اور دریا کے کنارے جنگل کو کاٹ کاٹ کر راستہ بناتا جاتا تھا۔

یہاں تک کہ ششم جمادی الآخر کو بمقام جوگی گپھا جو گراٹی سے جالنتی کو س ہے اور

وہاں سے راجہ کا دارالحکومت گرگاؤں ایک جینے کا راستہ تھا جا پہنچا۔ یہاں برہما پتر کے کنارے پر آسامیوں کا ایک بہت مضبوط قلعہ تھا اس کی غربی دیوار جدھر سے حملہ آور کا راستہ تھا پہاڑ کی چوٹی تک گہری بھری تھی اور سمت جنوبی دریائے برہما پتر سے محفوظ تھی اور مشرق کی طرف دریائے مناس قلعہ کی دیوار کے ساتھ گذرتا ہوا دریائے برہما پتر سے جاملتا تھا اور شمال کی طرف حفاظت کے لئے خندق کے علاوہ پہاڑ اور گھنا جنگل تھا اور علاوہ اس کے حملہ آوروں کی روک کے لئے بانسوں کو نیزوں کی طرح تراش کر جابجا ورد تک گاڑا ہوا تھا جس کو اُن کی زبان میں "پہا نچا" کہتے تھے۔ پندرہ ہزار فوج مع توپ خانہ کے قلعہ میں اور تین سو بیس جنگی کشتیاں مع سازو سامان دریا میں موجود تھیں اور اس کے محاذی دریا کے پار کوہ پنچرتن پر ایک دوسرا قلعہ بہت مستحکم اور ایسے موقعہ کا بنا ہوا تھا کہ اگر پہلے قلعہ پر شکست ہو تو فوج نواڑہ میں بیٹھکر باسانی دوسرے قلعہ میں چلی جائے۔ اور چونکہ اُس تنگ مقام میں دریائے برہما پتر اس طرح دو شاخہ ہو گیا تھا کہ بیچ میں کچھ زمین ٹاپو کے طور پر تھی اس لئے آسامیوں نے فوج کو یہاں پر اس ارادہ سے قائم کیا ہوا تھا کہ جس کنارہ سے دشمن کی سپاہ گذرے گی اُس پر آگ برسائیں گے۔

میر جملہ نے یہ تدبیر کی کہ ایک حصہ اپنی فوج کا دریا کے دوسرے پار اُتارا اور کچھ سپاہ کو کوہ جوگی گپھا کے عقب میں دریائے مناس تک جنگل کاٹنے کے لئے اس غرض سے مامور کیا کہ اگر آسامی قلعہ چھوڑ کر جنگل کو بھاگنا چاہیں تو راستہ نہ پاسکیں۔ اور فوج کا بڑا حصہ ساتھ ساتھ کشتیوں میں چڑھا کر اس طرح سے روانہ کیا کہ دریا کنارہ کی فوج اور کشتیاں ایک دوسرے کی مدد کے لئے ساتھ ساتھ چلتی تھیں۔

میر جملہ کی اس تدبیر کو دیکھکر آسامیوں نے یہ خیال کیا کہ اگر حملہ آوروں نے قلعہ چھین لیا تو جنگل کی طرف بھاگنے کا راستہ مسدود ہو چکا ہے اس لئے خوف زدہ ہو کر نواڑہ میں بیٹھکر لڑنے کو ترجیح دی مگر ایسی نامردی کی کہ باوجود ایسے مضبوط قلعوں اور مقام قلب کے کہ جن کے ہاتھ آجانے کی حملہ آوروں کو ایسی آسانی سے توقع نہ تھی۔ خفیف سے مقابلہ کے بعد اس تدبیر سے سروپا ہو کر بھاگے کہ کچھ تو جنگل کو بھاگتے ہوئے مارے گئے اور بہت سے غرق اور گرفتار ہوئے ایک سو اڑتالیس کشتیاں اور چھوٹی بڑی چولسٹھ توپیں اور بے شمار بندوقیں اور بہت سا سکہ و بارود وغیرہ سامان جنگ چھین لیا گیا۔

میر جملہ کی پیش قدمی اس کامیابی کے بعد دونوں قلعوں پر قبضہ کرکے گواہٹی پہنچنے کی تدبیریں کی گئیں یہاں تک کہ اکیسویں جمادی الآخر کو میر جملہ گواہٹی کے نزدیک جا پہنچا۔ یہاں آسامیوں کے پھر دو مضبوط قلعے تھے۔ ایک بمقام سری گھاٹ پہاڑ کے دامن میں۔ اور دوسرا اس کے محاذی دریائے برہما پتر کے اُس پار کوہ ناندو کی چوٹی پر اور ایک لاکھ سے زیادہ آسامی اُن دونوں قلعوں میں جمع تھے۔ میر جملہ نے یہاں بھی وہی چال چلی اور اپنی فوج کے ایک سردار کو قلعہ کی سمت شمالی پر (جو آسامیوں کے بھاگنے کا راستہ تھا) مامور کیا۔ چنانچہ اس تدبیر کے نتیجہ سے وہ لوگ ایسے خائف ہوئے کہ رات کے وقت کشتیوں میں جیٹھکر خود بخود بھاگ گئے اور کچھ خشکی کے راستہ سے فرار ہوئے اور کچھ فوج نے دریا کے اُس پار حملہ کرکے قتل کرڈالے اور موضع کجلی میں قلعہ[1] ناندو سے سات کوس آگے جو ایک اور بہت مضبوط قلعہ تھا اس کو بھی خالی کرگئے اور میر جملہ سری گھاٹ اور ناندو اور موضع کجلی کے قلعوں اور گواہٹی پر جو بادشاہی ملک کی قدیم سرحد تھی بے کھٹکے قابض ہوگیا یہ ایسے مستحکم اور سازو سامان والے قلعے تھے کہ اگر آسامی کچھ دلیری کرکے برسات کا موسم آجانے تک ثابت قدمی اختیار کرتے تو بے شک آسام کا فتح ہونا خود حملہ آوروں کی دانست میں غیر ممکن تھا۔

سیلا گڈھ کی لڑائی مذکورہ بالا قلعوں اور گواہٹی پر قبضہ کرنے کے بعد میر جملہ نے کیسویں جمادی الآخر کو جمدہرہ کے مشہور قلعہ کی طرف رجو دریائے برہما پتر کے شمالی کنارے پہاڑ تراش کرتین حصاروں کے اندر اور اُس کے گرد دریائے برہما پتر کا پانی چھوڑ کر جزیرہ کے طور پر بنایا ہوا تھا) کوچ کیا۔ گرچونکہ اُس کی منزل مقصود (یعنی راجہ کا دارالحکومت گھڑ گانوں) اس دریا کے جنوبی کنارے کی طرف تھی اور اسی سمت میں سیلا گڈہ اور کلیابر کا قلعہ گھڑگانوں پہنچنے میں سدراہ تھا اس وجہ سے میر جملہ نے جمدہرہ کے محاصرہ وغیرہ میں کوشش کرنا بے فائدہ اور تضیع اوقات خیال کرکے سیلا گڈہ اور کلیابر کا

---

[1] عالمگیر نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے جادوگروں کی اُستانی لونا چماری اور اُن کے گرو گھنشال میاں۔ اسمٰیل جوگی جی کے خیطلاق نام جادو ولونز کے منتروں میں کامروپ دیس کے ساتھ ایسی باتوں کے معتقد اکثر جپا کرتے ہیں اُن کے اور کوم گھاکے مندر اس جگہ قلعہ ناندو کے متصل پہاڑ کی چوٹی پر نیچے سے اوپر تک قریب ایک ہزار زینہ کے پتھر تراش کر بنائے ہوئے ہیں۔ س م ع

فتح کرنا حصول مدعا کے لئے مقدم تھا۔ اور فوج کو جدہرہ کی طرف سے اُٹھا کر بندیہ کشتیوں کے اُس پار اُتارنا شروع کیا۔ اگرچہ عین حالت عبور میں طوفان آگیا۔ اور اُدلوں کی تندت سے کچھ نقصان بھی ہوا۔ مگر جس طرح بنا دو تین دن کے عرصہ میں کل لشکر کو پار اُتار کر گیارھویں رجب کو سیلا گڑھ کے قریب جا ڈیرہ کیا۔

دراصل سیلا گڑھ اور کلیا بر کو ایک ہی قلعہ کہنا چاہیئے۔ مگر حصار بیرونی کو سیلا گڑھ کہتے تھے اور قلعہ اندرونی کا نام کلیا بر تھا۔ اور اگرچہ قلعہ کلیا بر بھی بہت ہی مضبوط تھا۔ مگر سیلا گڑھ ایسا عظیم الشان اور عریض وطویل تھا کہ اس کی جنوبی دیوار دریا سے لے کر اُس پہاڑ تک جو کلیا بر کے عقب میں تھا چار کوس اور شمال کی طرف تین کوس کے طول میں تھی۔ اور مناسب طور پر اس میں کئی بڑے بڑے برج بھی بہت عمدگی سے لڑائی کے ڈھب کے بنے ہوئے تھے۔ جن کے آگے حصار کے طور پر ایک اور کنگرہ دار دیوار بنی ہوئی تھی جس کے اندر باہر دونوں طرف عمیق خندقیں تھیں جن میں کہیں پانی چھوڑا ہوا تھا اور جہاں پانی نہ تھا وہاں خوب باریک سرمہ سا مٹی بھری تھی۔ اور یہ اندرونی اور بیرونی دونوں قلعے سامان جنگ سے نہایت مکمل اور مرتب تھے۔ اور تین لاکھ آسامی اس وقت یہاں موجود تھے۔

میر جملہ نے اگرچہ دمدمے وغیرہ بنا کر سیلا گڑھ پر گولے مارنے شروع کئے۔ مگر اُس کے استحکام کے باعث ان کے توپ گولہ کا اثر تک بھی محسوس نہیں ہوا اور چونکہ وہ لوگ اس کے لشکر پر فصیل سے برابر گولے برساتے تھے اور کبھی دن کو اور کبھی رات کو حملے بھی کرتے تھے اور قدرتی مشکلوں کے باعث بھی یہ جگہ ایسی پُرخطر تھی کہ زمانہ سابق میں محمد شاہ تغلق اور حسین شاہ نامی بنگالہ کے ایک اور بادشاہ کے لشکر اسی مقام پر نیست ونابود ہو چکے تھے۔ اس لئے زیادہ توقف بعید از مصلحت سمجھکر یہ صلاح ٹھہری کہ ایک تو خندق کے نیچے سے سرنگ لگا کر قلعہ میں پہنچنے کا راستہ بنانا چاہیئے۔ دوسرے کسی مناسب موقعہ سے فصیل پر یورش کرکے قلعہ میں داخل ہونے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ جب سرنگ لگ چکی اور فرہاد خان نامی ایک سردار نے چاروں طرف سے حصار کو دیکھ بھال کر میر جملہ کو یہ اطلاع دی کہ جنوبی فصیل کی طرف حملہ کے لئے کچھ گنجائش ہے تو پندرھویں رجب کو اسم بامسمیٰ دلیر خاں آدھی رات کے وقت فوج کثیر ساتھ لے کر سوار ہوا اور اس طرح سے کارروائی شروع کی کہ میر مرتضیٰ سردار توپ خانہ کو دروازہ پر حملہ کرنے

لئے مامور کیا تاکہ دشمن ادھر ہی الجھے رہیں اور دلیر خاں کی طرف جو فصیل پر حملہ کرنا چاہتا تھا متوجہ نہ ہوں۔ چنانچہ میر مرتضیٰ نے قلعہ کے دروازوں پر زور شور سے توپیں مارنی شروع کیں اور اگرچہ آسامیوں کی توپ و بندوق کی زد سے اس کی سپاہ کو کوئی جائے پناہ نہ تھی اور اس وجہ سے اُن کو متواتر نقصان پہنچتا رہا۔ مگر اس نے سرگرمی اور بہادری کے ساتھ لڑائی کو جاری رکھا۔ اُدھر دلیر خاں کو یہ مشکل پیش آئی کہ اُس کا آسامی رہنما ایک ایسا شخص تھا جو سالہا سال سے بادشاہی فوج میں ملازم تھا اور خود میر جملہ سے عرض کر کے اُس نے یہ رہنمائی کی خدمت اختیار کی تھی۔ مگر دراصل ہم قومی کی وجہ سے اُس فوج کے تباہ کرانے کے لئے یہ چال کی کہ آسامیوں کو پہلے ہی خبردار کر دیا۔ اور دلیر خاں کو تمام رات حیران کر کے صبح ہوتے ہوتے ایک ایسی جگہ لے گیا جو سب سے زیادہ بے ڈھب تھی اور دشمن لڑائی کے لئے بخوبی مستعد تھے۔ غرض کہ وہاں پہنچتے ہی ان پر اس شدت سے توپوں اور بندوقوں کی آگ برسنے لگی کہ بہت سے سپاہی مجروح و مقتول ہو گئے۔ مگر دلیر خاں کی غیرت اور دلیری نے پسپا ہونے کی ذلت کو کسی طرح گوارا نہ کیا۔ اور باوجودیکہ آسامی اوپر سے توپ و بندوق اور "حقہ ہائے آتشیں" یعنی گراپ برسا رہے تھے۔ اور فصیل تک پہنچنے میں خندق عمیق اور پُر آب حائل تھی مگر اس دلاور سردار نے سب سے پہلے اپنا ہاتھی خندق میں ٹھیل دیا۔ اور اگرچہ خود اس پر اور اس کے ہاتھی پر تیروں کی بھی سخت بوچھاڑ پڑی مگر یہ شیر مرد اپنے چند بہادر رفیقوں کو ساتھ لے کر فصیل پر جا ہی چڑھا اور پھر تو اُس کی ہمت اور دلیری کو دیکھکر دوسرے سردار اور سپاہی بھی آ پہنچے۔ اسی اثنا میں اُدھر میر مرتضیٰ نے بھی دروازہ توڑ ڈالا اور اُس کی فوج بھی کچھ دروازہ کے راستہ اور کچھ سرنگ کی راہ سے داخل ہو گئی۔ اور فریقین میں ایک سخت دست بدست لڑائی ہوئی جس میں آسامی مغلوب ہو گئے اور حصار کے ایک راستہ سے جو جنگل کی طرف تھا سیلا گڑھ اور کلیا بر دونوں کو خالی کر کے بھاگ گئے۔ اور یہ قلعے معہ بے شمار سامان کے حملہ آوروں کے قبضہ میں آ گئے اور تعاقب کی حالت میں بہت سے آسامی مارے اور پکڑے گئے۔ اور اس واقعہ کی شہرت کا یہ اثر ہوا کہ قلعہ جمدہرہ بھی خود بخود خالی ہو گیا۔ اور ملک کامروپ کے رہنے والے بہت سے ہندو مسلمان رعایائے بادشاہی نے جو مدتوں سے آسامیوں کی قید میں تھے رہائی پائی۔

چونکہ دریائے برہمپترا اس جگہ سے دو منزل تک پہاڑ کی جڑ کے ساتھ ملا ہوا چلتا ہے

اور اس کے کناروں پر لشکر کے گذرنے کے لیے رستہ (جیسا کہ میر جملہ اب تک کرتا تھا) بالکل رستہ نہیں تھا۔ اس باعث سے کچھ فوج بذریعہ نواڑہ دریا میں سے اور باقی لشکر دریا کے متوازی پہاڑ کے پیچھے سے روانہ ہوا۔ منتشر شدہ آسامیوں نے بسبب اس کے کہ نواڑہ اور لشکر میں کئی کوس کا فاصلہ ہو گیا تھا ادھر اُدھر سے پھر جمع ہو کر اور آٹھ سو جنگی کشتیوں میں بیٹھ کر جو توپ بندوق سے خوب مسلح تھیں۔ نواڑہ پر رات کے وقت حملہ کیا اور پھر دن چڑھے تک بڑے جوش و خروش سے لڑتے رہے۔ قریب تھا کہ بادشاہی نواڑہ کو شکست ہو جائے مگر اتفاقاً محمد مومن نام ایک سردار جورات کے وقت توپوں کی آواز سن کر میر جملہ نے صدر لشکر سے روانہ کیا تھا اور پہاڑ کے سبب سے راستہ بھولا پھرتا تھا معہ چند سواروں کے لڑائی کی جگہ آن نکلا۔ اور دشمنوں کے دھمکانے کو یہ ہوشیاری کی چال چلا کہ اپنے ساتھ کے کرناچی (ترہی) کو حکم دیا کہ کرنا بجائے جس کے بجتے ہی آسامیوں کو یہ یقین ہو گیا کہ تازہ دم مغلیہ فوج دریا کے کنارہ سے بھی آپہنچی اور اس ناگہانی اندیشہ سے اُن کے جی ایسے چھوٹے کہ غالب سے مغلوب ہو کر اکثر تو بھاگتے ہوئے پانی میں ڈوب گئے۔ اور بہت سے مارے گئے۔ اور چار سو کشتیاں جن میں سے ہر ایک پر بڑی بڑی توپ معہ سامان کے تھی۔ چھین لی گئیں۔

آسام کے راجہ کا فرار ان متواتر فتوحات کا یہ نتیجہ ہوا کہ راجہ کے نخوت اور غرور کا نشہ کرکرا ہو گیا۔ اور دارالریاست کو چھوڑ کر دشوار گذار پہاڑوں میں جہاں مغلیہ فوج کے سواروں کے پہنچنے کا چنداں اندیشہ نہ تھا بھاگ گیا۔ اور راجہ کے سرداروں اور وزیروں نے جن کو اُن کی اصطلاح میں پھوکن کہتے تھے۔ میر جملہ کے پاس اپنے وکیل اور عجز و نیاز کی عرضیاں بھیجنی شروع کیں جن کا جواب یہ دیا گیا کہ شاہی سپاہ اور رعیت کا وہ سب مال اور وہ توپ خانہ جو تم لوگ گوہاٹی سے لوٹ لائے تھے۔ رعایائے بادشاہی کے تمام آدمیوں سمیت جن کو راجہ نے مدت سے قید کر رکھا ہے۔ اور راجہ کی لڑکی کا ڈولہ اور ایک معقول پیش کش فوراً حاضر کرو اور آئندہ کو اگر راجہ ہر سال چند عمدہ ہاتھی بطور خراج کے بھیجتا رہے اور بادشاہی احکام کی اطاعت کرتا رہے تو البتہ ہم واپس ہو جائیں گے ورنہ بادشاہی فوج کو گرگانوں میں پہنچا سمجھو مگر اس خیال سے کہ یہ عجز و نیاز کا اظہار صرف دفع الوقتی اور مکاری کے طور پر ہے جواب کا منتظر نہ رہ کر میر جملہ برابر بڑھے گیا۔ چنانچہ ستائیسویں رجب کو لکھوگڈہ میں جہاں دریائے دہنگ

کوہستانِ جنوبی سے آکر معہ اور بہت سی ندیوں اور نالوں کے برہانپور میں ملتا ہے جا پہنچا۔ اس جگہ ایک اور بھی زیادہ معتبر شخص نے جو راجہ کے مذہبی پیشواؤں میں سے تھا عجز و نیاز کر کے صلح چاہی اور راجہ کے ایک رشتہ دار نے بھی آن کر ایک طلائی پاندان ایک سونے کا لوٹا اور دو چاندی کی گاگریں اور کچھ اشرفیاں معہ ایک خط کے جس میں اظہار ندامت اور عذر و معذرت کے بعد فوج کی واپسی اور صلح کی درخواست اور پیش کش کی قبولیت درج تھی پیش کیا۔ جس کا جواب (جیسا کہ غالب اور فتح مند اکثر دیا کرتے ہیں) یہ دیا گیا کہ "اب تو لشکر نے کھڑ گاؤں پہنچنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ وہاں پہنچ کر جو مناسب ہوگا کیا جائے گا۔"

شہر کھڑ گاؤں دیکھو ندی کے کنارے آباد تھا اور اُس میں اس قدر پانی نہیں تھا کہ بڑی کشتیاں چل سکیں اس لئے بھاری نواڑہ کو لکھو گڈہ میں چھوڑ دیا اور چھوٹی کشتیاں ساتھ لے کر غرہ شعبان سنہ ۱۰۷۲ھ کو لکھو گڈہ سے آگے ایک مقام میں کہ جہاں نواڑہ کا کارخانہ تھا قریب ایک سو کے بڑی بڑی کشتیوں پر جو وہاں موجود تھیں قبضہ کیا۔ اور پھر وہاں سے دیول گاؤں میں جہاں دریا کنارے راجہ کا کسی اپنے گرو کے لئے بنوایا ہوا نہایت عمدہ مندر اور باغ تھا ڈیرہ کیا۔

کھڑ گاؤں پر قبضہ اور مالِ غنیمت اس جگہ بعض مسلمانوں نے جو رعایائے بادشاہی میں سے راجہ کے یہاں مدتوں سے قید تھے اور جن کو اپنی رہائی کی توقع خواب و خیال میں بھی نہ تھی میر جملہ کو تحریر میں بھیج کر مطلع کیا کہ راجہ دکن کون (جنوب) کی طرف نامروپ کے دشوار گذار اور بدآب و ہوا پہاڑوں کو جہاں وہ اپنے معتوب قیدیوں کو بھیجا کرتا تھا بھاگ گیا ہے اور اُس کی سپاہ اور سوار جنگلوں میں جا چھپے ہیں اور شہر بے وارث اور خالی پڑا ہے۔

یہ اطلاع پاکر میر جملہ نے براہِ احتیاط کچھ فوج اپنے پہنچنے سے پہلے وہاں بھیج دی اور بعد ازاں چھٹی شعبان کو اورنگ زیب کے جلوس کے چوتھے برس گویا گواہٹی سے پچھتر کوس کے فاصلہ پر ساڑھے چار مہینے کے عرصہ میں کھڑ گاؤں پہنچ کر بلا مزاحمت قابض ہو گیا۔

اور راجہ نے جو اپنی توپیں اور رہکلے وغیرہ تالابوں اور ندیوں میں ڈبو دیئے تھے۔ اور ہاتھی جنگلوں میں چھوڑ دیئے تھے ڈھونڈ ڈھونڈ کر سب پر قبضہ کیا۔ چنانچہ ایک سو

ہاتھی اور قریب تین لاکھ روپیہ کے سونا چاندی اور اسباب جس کو راجہ اپنے ساتھ لیجا نہ سکا تھا ضبطی میں آیا۔

مگر سب سے زیادہ عجیب مالِ غنیمت یہ تھا کہ وہاں کا دستور تھا کہ جب کوئی راجہ یا بڑا آدمی مرجائے تو پارسیوں کے دخمہ کی طرح متوفی کی لاش کو دفنانے بغیر یوں ہی کسی محفوظ جگہ میں رکھ دیتے تھے اور اُس کے ساتھ سونے چاندی کے برتنوں اور فرش لباس پوشاک اور سامان خورد و نوش اور لوازمات زندگی حتیٰ کہ اُس کی عورتوں خواصوں کو بھی مردہ کے لئے کارآمد سمجھ کر اُس کے پاس چھوڑ آتے اور ایک بہت بڑے چراغ کو تیل سے بھر کر اُس کے دروازہ کو بڑے بڑے تختوں سے بند کر دیتے تھے۔ اہلِ لشکر نے ایسے چند مقاموں کو جا کھولا اور اُن میں سے کئی ہزار کا سونا چاندی نکال لائے۔

اس تمام مہم میں مذکورہ بالا ہاتھیوں کے علاوہ کل چھ سو چھتر توپیں جن میں سے ایک اتنی بڑی تھی کہ اُس میں تین من کے قریب گولہ پڑتا تھا۔ اور دو ہزار تین سو سینتالیس زنبورک بارہ سو رام جنگی۔ اور چھ ہزار پانچ سو ستاون معمولی بندوقیں۔ پانچ ہزار من بارود کے دو ہزار صندوق۔ سات ہزار اٹھائیس ڈھالیں۔ لوہا۔ سکہ۔ گندھک بے حساب اور ایک ہزار سے زیادہ جنگی کشتیاں۔ اور خاص راجہ کی سواری کی مکلف ایک سو بیس کشتیاں ہاتھ آئیں۔

اور سب سے زیادہ کارآمد چیز جو قبضہ میں آئی وہ دھانوں کے ایک سو تہتر ڈھیر تھے جن میں سے ہر ایک ڈھیر دس ہزار من کے قریب تھا ان کی نسبت براہ دوراندیشی میر جملہ نے فوراً یہ بندوبست کیا کہ لوٹ کر ضائع نہ کئے جائیں۔ اور احتیاج سے زیادہ صرف نہ ہوں۔

تھانے اور چوکیوں کا قیام اور سکہ وخطبہ کے اجرا

خلاصہ یہ کہ میر جملہ نے کھڑگاؤں پر قابض ہو کر جو جو انتظام مناسب وقت تھے وہ کرنے شروع کئے اور جہاں جہاں موقعہ دیکھا اپنی جنگی چوکیاں اور تھانے مقرر کر دیئے۔ اگرچہ آسامی کچھ عرصہ تک جنگلوں اور پہاڑوں سے نکل نکل کر ان چوکیوں اور تھانوں پر حملے کرتے اور لڑتے رہے مگر آخرکار ایسے دبائے گئے کہ جابجا چپ ہو کر بیٹھ رہے اور بادشاہ کے نام کا سکہ وخطبہ کھڑگاؤں میں جاری ہو گیا۔

شہر کھڑگاؤں کے حالات

اُس وقت شہر کی آبادی (بقول مصنف عالمگیر نامہ) اس طرح تھی کہ دکھوندی بیچ میں بستی تھی۔ اور اُس کے

دونوں طرف آبادی تھی جس کے گرداگرد شہر پناہ کے طور پر نہایت گھنی اور ناقابل گذر بانس لگائی ہوئی تھی۔ اور اس میں اینٹ پتھر کی پختہ عمارت کے چار دروازے تھے۔ اور ہر دروازہ راجہ کے مکان سے تین تین کوس کے فاصلہ پر تھا۔ اور ایک اونچی اور چوڑی آل شہر کے اندر برسات میں آرام سے چلنے پھرنے کے لئے اس سرے سے اُس سرے تک بنی ہوئی تھی۔ اور یہ شہر کیا تھا گویا دیہات اور کھیتوں کا ایک مجموعہ تھا۔ کیونکہ ہر شخص کے گھر کے گرد و پیش باغ اور کھیتیاں تھیں اور معمولی بازار جن سے شہروں کی رونق اور زیب و زینت ہوتی ہے یہاں نہ تھے۔ شہر کے لوگ سال بھر کے واسطے غلہ وغیرہ سب قسم کے مایحتاج اپنے اپنے گھروں میں اکٹھا جمع رکھتے تھے اس سبب سے سوائے پنساریوں کی چند دکانوں کے بازار کی ضرورت ہی نہ تھی۔

راجہ کا مکان جس کے چاروں طرف بطور حصار ایک آل بنی ہوئی تھی دکھیو ندی کے کنارے تھا۔ اور جیسا کہ فصیلوں اور حصاروں پر دشمن کی زد سے بچنے کے لئے پناہ کی دیوار ہوتی ہے یہاں بجائے اُس کے یہ انجو بہ ترکیب تھی کہ خوب مضبوط بانسوں کو برابر برابر آل کے گرداگرد اس طرح سے گاڑا ہوا تھا کہ پناہ کا کام دیتے تھے اور آل کے چاروں طرف خندق تھی جو ہمیشہ پانی سے بھری رہتی تھی۔ جس کا دور ایک کوس سے زاید تھا اور اس احاطہ کے اندر راجہ کے بڑے بڑے مکانات تھے۔ مگر سب لکڑی کے یا پھوس اور بانس کے۔ جن میں سب سے عمدہ ڈیڑھ سو گز لمبا اور چالیس گز چوڑا ایک چوبین دیوان خانہ تھا جس کے چھیاسٹھ ستون ایسی موٹی لکڑی کے تھے جن کا چار چار گز کا دور تھا۔ اور اس مکان کے اطراف میں طرح طرح کی منبت کار لکڑی کی جالیاں لگی ہوئی تھیں اور پیتل کے پتر صیقل کرکے جالیوں کے اندر باہر اس طرح سے لگائے تھے کہ آفتاب کی شعاع پڑنے سے آئینوں کی طرح چمکتے تھے۔ تین ہزار بڑھئی اور بارہ ہزار مزدوروں نے دو سال تک برابر کام کرکے اس مکان کو بنایا تھا۔ جب راجہ اس دیوان خانہ میں آکر بیٹھتا یا سوار ہو کر کہیں جاتا تو بجائے نقارہ اور شہنائی کے ڈھول اور "داند" بجاتے تھے۔ اور یہ "داند" ایک موٹی اور مدور پیتل کی تختی اس قسم کی ہوتی تھی (جیسے کہ ہندو فقیروں کی جماعتوں کے ساتھ یا مردوں کے جنازوں کے آگے گھڑیال بجا کرتے ہیں)

آسامیوں کی سرکشی چونکہ برسات کی آمد کے آثار شروع ہوگئے تھے جو آسام میں تمام

نے اس ملک کے کچھ عام حالات اگرچہ اس سے پہلے بموجب بیان مصنف

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ ۔ عالمگیر نامہ لکھے گئے ہیں ۔ مگر اس موقعہ پر وہ حالات بھی جو زمانہ حال کی تصنیف شدہ کتابوں وغیرہ میں پائے جاتے ہیں لکھے جانے خالی از لطف نہ ہوں گے واضح ہو کہ ملک آسام جو صوبہ بنگالہ ۔ اور برہما ۔ اور تبت کے مابین واقع ہے (بحساب سنہ) اس صدی کے شروع سے سرکار انگلشیہ کا مقبوضہ خاص ہے ۔ چونکہ یہاں کے باشندے اس زمانہ میں بھی بہت خاصے جانگلو ہی ہیں ۔ اس لئے ۱۸۷۴ء تک حکام انگریزی نے طریقہ انتظام اور طرز حکومت کو مصلحتاً سرسری اور غیر قانونی طور پر رکھا ہوا تھا ۔ مگر ۱۸۷۴ء سے اس میں ایک حاکم اعلیٰ بلقب چیف کمشنر وں وغیرہ معمولی ماتحت عہدہ داروں کے مامور ہو گیا ہے ۔ جس کا دارالحکومت سلہٹ کے شمال کی جانب کھاسی اور جینتیا کے پہاڑوں میں بمقام شیلانگ ہے جو سطح سمندر سے ۴۷۰۰ پانچ ہزار چھ سو سٹھ فٹ بلند ہے مقرر کیا گیا ہے ۔ اور اس صوبہ میں اب ضابطہ اور آئین کی پابندی پہلے سے بہت زیادہ ہو گئی ہے یہ ملک کثرتِ بارش کے لئے تمام ہندوستان میں ایسا مخصوص ہے کہ راجہ شیو پرشاد صاحب سی ۔ ایس ۔ آئی ۔ سابق عہدہ دار سر رشتہ تعلیم ممالک مغربی و شمالی اپنے مشہور جغرافیہ جام جہاں نما میں (جو پہلے پہلے ۱۸۶۸ء کے قریب چھپا تھا) لکھتے ہیں کہ مقام چیرا پونجی میں جہاں موسم گرما میں بنگالا اور آسام سے انگریز لوگ جا کر اکثر رہا کرتے ہیں سال بھر کی بارش کی پیمائش تین سو چھ انچ تک کی گئی ہے ۔ حالانکہ یہ مقام سطح سمندر سے صرف ساڑھے چار ہزار فٹ کے قریب بلند ہے ۔ اور جس قدر ندیاں اور دریا اس ملک میں جاری ہیں یقین ہے کہ اور کسی جگہ نہ ہوں گے ۔ چنانچہ اکثر ندیاں تو ایسی ہیں جن میں بارہ مہینے ناؤ چلتی ہے ۔ اگلے زمانہ میں وہاں کے راجاؤں نے اس بارش کی کثرت ہی کے باعث سے پانی کے بیچ میں سے راستہ جاری رکھنے کو تین چار گز زمین سے اونچی سڑکیں (روہی آل) بنائی ہوئی تھیں ۔ اور راجہ صاحب لکھتے ہیں کہ اُن سڑکوں پر اب تو جنگل اُگا ہوا ہے اور بجائے انسانوں کے شیر اور بھالو چلتے ہیں ۔ اگرچہ سارا ہی ملک جنگل اور پہاڑ ہے مگر پورب اور اُتر کی طرف پہاڑ اور جنگل بہت ہی زیادہ ہیں جن میں مختلف ناموں کی جنگلی قومیں بستی ہیں ۔ اور اُن کی ذات اور مذہب کا کچھ ٹھکانا نہیں ہے سب چیز کھاتی ہیں ۔ تیروں کو زہر میں بجھاتی ہیں ۔ گندے ایسے کہ آب دست تک نہیں لیتے ۔ چوپایوں کی کھوپڑیاں خالی کر کے آرائش کے واسطے بندھن واروں کی طرح گھروں میں لٹکاتے ہیں ۔ کوئی اُن میں بُدھ کا مذہب بھی رکھتا ہے ۔ اکثر درختوں کی چھال کا لنگوٹ بنا کر باندھتے ہیں اور سینگ کا کنٹوپ پہنتے ہیں ۔ کوئی تکلف کرتا ہے تو کمبل بھی اوڑھ لیا کرتا ہے ۔ کہتے ہیں کہ ان اقوام میں گاڑو قوم کے لوگ جو برہما پتر کے دکن اور سلہٹ اور میمن سنگھ کے اُتر میں بستے ہیں

بقیہ حاشیہ در حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ سانپ کو بھی کھا جاتے ہیں۔ اور کتے کا پلہ تو ان کے بڑے مزے کی چاٹ ہے۔ پہلے اُس کو پیٹ بھر کر چاول کھلاتے ہیں بعد اس کے جیتا ہی آگ پر بھون کر کھا جاتے ہیں۔ اس قوم میں یہ بھی دستور ہے کہ جب ان کے آپس میں تکرار ہوتی ہے تو دونوں آدمی اپنے اپنے گھر میں چٹاگر کا درخت لگاتے ہیں اور اس بات کی قسم کھاتے ہیں کہ قابو پاتے ہی اپنے دشمن کا سر کاٹ کر اس پیڑ کے کھٹے پھل کے ساتھ کھا جائیں گے۔ اور جب دشمن کا سر کاٹ لاتے ہیں تو فی الحقیقت اُس کو چٹپٹا کر کے درخت کے ساتھ چٹ کر جاتے ہیں۔ بلکہ اپنے دوست آشناؤں کو بھی دعوت میں کھلایا کرتے ہیں اور پھر اُس پیڑ کو بھی (جو گویا لڑائی کی جڑ تھی) کاٹ ڈالتے ہیں۔ راجہ صاحب موصوف نے اُن لوگوں کی وحشت سے متعلق اپنی کتاب[1] میں شروع عملداری انگریزی کے وقت کی روایتیں یہاں تک لکھی ہیں کہ جب لڑائی جھگڑے میں کسی بنگالی زمیندار کا سر کاٹ لاتے ہیں تو اُس کے گرد پہلے سب کے سب مل کر ناچتے گاتے ہیں اور پھر اُس کی کھوپڑی صاف کر کے اپنے گھر میں لٹکا دیتے ہیں وہ کھوپڑیاں آپس میں بیچی بھی ڈالا کرتے ہیں۔ بلکہ اشرفی اور بنک نوٹ کی برابر وہاں یہ بنگالیوں کی کھوپڑیاں اُن کے بازار میں چلتی ہیں۔ چنانچہ ۱۸۵۱ء میں کالو مالو پاڑے کے زمیندار کی کھوپڑی ایک ہزار روپیہ کو چلتی تھی۔ اور اندر تعلقہ دار کی کھوپڑی پانچ سو روپیہ کو بھنائی جاتی تھی۔ وہ لوگ اپنے مردوں کو جلا کر بالکل راکھ کر ڈالتے ہیں۔ تاکہ کوئی آدمی کھوٹے روپیہ کی طرح کسی کا رٹو رکی کھوپڑی بنگالی کی کھوپڑی کے عوض میں دے کر انھیں ٹھگ نہ لیا کرے۔ شادی بیاہ وہاں عورت مرد کی خوشی اور رضامندی سے ہوتا ہے اور اگر اُن میں سے کسی کا باپ اُس شادی سے ناراض ہو جائے تو پھر وہ سب لوگ اُس کو اتنا پیٹتے ہیں کہ وہ بیچارہ راضی ہو جاتا ہے۔ خاوند کے مر جانے کے بعد وہاں کی عورتیں اپنے جیٹھ دیور سے نکاح کر لیتی ہیں اور اگر خاوند کا کوئی بھائی زندہ نہ ہو تو اپنے خسر سے شادی کر لیتی ہیں۔ مالک میراث وہاں چھوٹی لڑکی ہوتی ہے۔ مردہ کو چار روز کے بعد جلاتے ہیں۔ اور اگر اُن کا کوئی چھوٹا سردار مر جائے تو اُس کے ساتھ ایک غلام کا بھی سر کاٹ کر آگ میں جلا دیتے ہیں اور جو کوئی بڑے درجہ کا سردار مر جائے تو اُس کے سب غلام مل کر ایک ہندو کو پکڑ لاتے

---

[1] راجہ صاحب موصوف نے میرے خط کے جواب میں اس مضمون کے ماخذوں کی نسبت یہ ارقام فرمایا ہے کہ میں نے آسام کا حال معتبر انگریزی کتابوں سے نقل کیا ہے مثلاً والٹر ہیملٹن صاحب کا ایسٹ انڈیا گزیٹیر جو ۱۸۲۸ء میں چھپا تھا اس کے حصہ اول کا پچیسواں صفحہ اور ہیملٹن صاحب موصوف نے بعض حالات ۱۸۰۹ء کے کاغذوں سے نقل کئے ہیں۔ س م ع۔

ہندوستان سے پہلے اور اس شدت سے ہوتی ہے کہ ملک کے نشیبی حصوں میں سب جگہ پانی ہی پانی ہو جاتا ہے اس لئے میر جملہ نے میر مرتضیٰ سردار توپ خانہ اور راجہ امر سنگھ ہاڑہ کو کھڑگانوں میں ٹھہرا کر خود متھرا پور میں جو یہاں سے تین چار کوس آگے بڑھ کر کچھ اونچی جگہ تھی جا ڈیرہ کیا۔ اور جا بجا چوکیاں اور تھانے بٹھا دیئے۔

مگر چند ہی ہفتے بعد جب برسات کی معمولی شدت سے اس تمام نیچے کے ملک میں جہاں حملہ آوروں کا قبضہ تھا پانی ہی پانی ہو گیا اور اہل سپاہ کو ایک دوسرے سے ملنے اور کہیں آنے جانے میں بہت ہی دشواری ہو گئی۔ اس لئے آسامیوں نے جنگلوں اور پہاڑوں سے نکل کر میر جملہ کی چوکیوں اور تھانوں پر حملے شروع کر دیئے۔ اور لڑ بھڑ کر آخرکار شروع ماہ شوال میں اکثر مقامات پر پھر قابض ہو گئے خصوصاً اپنی قدیمی چال کے موافق رسد کی آمد روکنے کے لئے گھوگڈہ اور لکھی پور کے مابین دریائے دھنگ کے کنارے جا بجا مورچے بنا لئے اور رسد پہنچنے کا راستہ روک لیا۔

جب میر جملہ اس حال سے مطلع ہوا تو راستہ کے کھولنے کے لئے جب کچھ فوج دریا کے

بقیہ حاشیہ در حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ ہیں اور اس کا سر کاٹ کر اس کے ساتھ جلا ڈالتے ہیں۔ وہ لوگ محنت کش اور مضبوط ہوتے ہیں۔ صورت شکل ان کی یہ ہے کہ ناک حبشیوں کی سی پھیلی ہوتی اور آنکھیں چھوٹی ماتھے پر جھریاں پڑی ہوئیں۔ بڑا سا منہ۔ ہونٹھ موٹے۔ چہرہ گول۔ اور رنگ اُن کا گندمی ہوتا ہے عورتیں ناٹی اور ڈھنگی ایسی کہ مردوں سے زیادہ مضبوط کانوں میں اُن کے بیس بیس تیس تیس بالے چتیل کے اتنے بڑے بڑے پڑے رہتے ہیں کہ چھاتی تک لٹکا کرتے ہیں آسام کے امیر لوگ بھی گھاس پھوس کے بنگلے یا چھپروں میں رہتے ہیں پچھم کا حصہ آسام کا اب تک کامروپ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ لیکن ہندوؤں کے شاستروں میں جو سرحد کامروپ دیس کی لکھی ہوئی ہے۔ اس کے بموجب رنگپور میمن سنگھ سلہٹ۔ جینتیا پور۔ کچھار۔ منی پور اور آسام۔ یہ سب کامروپ دیس ٹھہرتا ہے۔ اور اگلے زمانہ کی پوتھیوں میں اس دیس کے بڑے بڑے اچنبھے کی باتیں اور نہایت تعجب کی حکایتیں لکھی ہیں نادان آدمی آج تک اس کو جادو کا گھر خیال کرتے ہیں۔ تانترک مذہب سی جگہ سے پھیلا تھا کامکشا دیوی کا مشہور مندر ۹۲ درجہ ۵۶ دقیقہ طول شرقی اور ۲۶ درجہ ۲۶ دقیقہ عرض شمالی میں واقع ہے۔ وہاں کے آدمیوں کی صورت شکل چینی والوں سے ملتی ہے۔ صدر مقام گوہاٹی کلکتہ سے تین سو پچپن میل گوشہ شمال و مشرق کی طرف جو کسی زمانہ میں کامروپ کا تخت گاہ تھا۔ اور اب وہاں صاحب کمشنر رہتے ہیں برہما پتر کے بائیں کنارے پر بستا ہے فقط انتہی کلامرس ہ ع

کنارے کنارے سرانداز خاں اُزبک کے زیر حکم اور کچھ بذریعہ نواڑہ محمد مراد بیگ کے ماتحت کھڑ گاؤں سے روانہ کی تاکہ ایک دوسرے کی مدد اور اتفاق سے کام کریں۔ مگر بدبختی سے تھوڑی ہی دور چل کر ان دونوں میں اتفاقاً ایسی ناچاقی ہو گئی کہ سرانداز خاں تو پیچھے رہ گیا۔ اور محمد مراد بیگ براہِ نخوت اُس کی مدد کی پروا نہ کر کے معہ اپنی کشتیوں کے آگے بڑھ گیا۔ اور آسامیوں نے موقعہ پا کر رات کے وقت جہاں یہ ٹھیرا ہوا تھا۔ ایک ایسا چھاپہ مارا کہ سب کشتیاں معہ ساز و سامان کے چھین لیں اور وہ ایسا سراسیمہ ہوا کہ معہ اپنی سپاہ کے بغیر لڑے ترمہانی کو بھاگ گیا۔ اس کامیابی سے آسامی اور بھی مغرور ہو گئے اور لکھو گڈھ سے رسد اور خبر آنے کا راستہ بالکل مسدود ہو گیا۔ اور جہاں کہیں بادشاہی فوجیں تھیں بجز اپنی حفاظت کے ادھر اُدھر کہیں نہیں جا سکتی تھیں۔ اور آسامی جو اس شدت طغیانی میں گویا ان ندی نالوں کی مچھلیاں بن گئے تھے۔ میدان اور پہاڑ سے اگر بے تکلف اور متواتر حملے کرتے تھے۔ یہاں تک کہ خود کھڑ گاؤں کے صدر لشکر پر بھی حملے شروع کر دیئے۔ ان حالتوں کو دیکھ کر رعایا کے لوگ بھی اطاعت اور فرمانبرداری سے منحرف ہو کر گڑ بیٹھے۔ اور اسی اثنا میں اتفاق سے کوچ بہار میں یہ واقعہ پیش آیا کہ عمال بادشاہی نے جو بیوقوفی سے ممالک محروسہ شاہی کی طرف کڑی جمع بندی کر کے سختی سے مطالبے شروع کر دیئے اس لئے رعایا نے باغی ہو کر بھیم نرائن کو بھوٹنٹ سے واپس بلا لیا اور فوجدار کو قتل کر کے (جیسا کہ ہم ایک حاشیہ میں قبل ازیں ذکر کر چکے ہیں) بادشاہی عمل و دخل اٹھا دیا اور تمام عہدہ دار مجبور ہو کر گھوڑا گھاٹ میں چلے آئے۔ اس خبر کے مشہور ہو جانے سے آسامیوں کے حوصلے اور بھی زیادہ بڑھ گئے اور بادشاہی فوج کی جرأت و ہمت پر بھی بُرا اثر پیدا ہوا۔

میر جملہ کی تدبیریں

میر جملہ نے اس سیلاب بلا کے روکنے کے لئے طرح طرح کی تدبیریں کیں اور چونکہ کھڑ گاؤں میں لکھو گڈھ سے رسد کا پہنچنا اور اس کے گرد و نواح کے مفسدوں کی تنبیہ و تادیب کر کے آمد و رفت کا راستہ کھولنا سب سے زیادہ ضروری تھا۔ اس لئے اُس نے ایک فوج باندازۂ مناسب متھرا پور سے زیر حکم فرہاد خاں راجہ سجان سنگھ بارہہ قراول خاں وغیرہ سرداروں کی معیت میں اس غرض کے لئے روانہ کی۔ اگرچہ فرہاد خاں نے کھڑ گاؤں پہنچ کر کمال ہمت سے ایسی کوشش کی کہ اوّل رات اپنے لشکر کو دکھو ندی سے جو بڑی طغیانی پر آئی ہوئی تھی پار اتارا۔ مگر آخر کچھ دور

آگے جاکر کثرتِ بارش اور شدت سیلاب سے یہ حالت دیکھی کہ تمام ملک مثل ایک سیلابِ بیکراں کے تھا اور باوجود کوشش کے کہیں راستہ نہ ملتا تھا۔ اور چونکہ بارش شدت سے ہو رہی تھی۔ سواروں اور پیادوں کو سوائے پانی میں کھڑے رہنے کی کوئی جگہ ہی نہ تھی اُس نے ناچار واپس آنا چاہا اور جب اس پانی ہی پانی میں ترہانی تک پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ آسامیوں نے وہاں سے لے کر دریائے دھنگ تک نہایت چوڑی اور عمیق خندقیں کھود کر اور کنارہ پر مستحکم مورچے بنا کر اور توپ اور ہتھلے وغیرہ سامانِ حرب سے مضبوط کر کے واپس جانے کا راستہ بند کر رکھا ہے اور یہ سپاہ اس مقام پر پہنچی ہی تھی کہ بہت آسامیوں نے اپنے مورچوں اور جنگی کشتیوں پر سے گولے برسانے شروع کئے۔ اور بادشاہی فوج کو اب بڑی وقت پیش آئی کہ نہ اُن کے پاس رسد اور چارہ تھا اور نہ کشتیاں کہ اُن پر سوار ہو کر اور دشمنوں کو دفع کر کے ندی نالوں سے پار ہو جائیں۔ اور نہ آگے جا سکتے تھے اور نہ کہیں پیچھے ہٹ سکتے تھے۔ اور کسی طرح کی مدد بھی نہیں پہنچ سکتی تھی۔ ناچار ایک آل پر جو اس نواح میں تھی جا چڑھے۔ میر جملہ نے اس حادثہ کی خبر پاکر محمد مومن کو فوج کشمیر کے ساتھ ان کی کمک کے لئے روانہ کیا۔ مگر وہ بھی ترہانی سے آگے نہ بڑھ سکا۔ خلاصہ یہ کہ فرہاد خاں اور اُس کی سپاہ اور تمام سردار آل پر گھرے ہوئے بھوک سے ناچار ہو کر لشکر کے بیلوں کا گوشت کھا کر مصیبت کے دن کاٹتے تھے۔ اور اس عرصہ میں اگرچہ آسامی کشتیوں پر سے بھی گولے مارتے تھے۔ اور دن اور رات میں کئی کئی بار آل تک پہنچ کر حملے بھی کرتے تھے۔ مگر یہ لوگ ایک ہفتے تک باوجود ہر طرح کی تکلیف کے کمالِ جرأت اور بہادری سے اُن کو پسپا ہی کرتے رہے۔

اور آخر کار فرہاد خاں نے ایک روز یہ تدبیر کی کہ جب آسامی راجہ سجان سنگھ کے راجپوتوں پر حملہ کرنے کے لئے بڑھے چلے آتے تھے تو اُس نے اُن کو بطور حکمت عملی پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ اور جب راجپوت پیچھے ہٹے اور یہ مجہول آسامی مغرور ہو کر اس قدر آگے بڑھ آئے کہ اُن کی کشتیوں سے جو دریائے دھنگ میں کھڑی تھیں اُن کو بہت فاصلہ ہو گیا۔ تو خان مذکور نے موقعہ دیکھ کر یک لخت دھاوا کیا اور ایسی تلواریں ماریں کہ حملہ کرنے والوں کے ٹکڑے اڑا دیئے۔ اور اُن کی چند کشتیاں بھی چھین لیں۔ لیکن چونکہ اُس کے پاس سپاہ کے کھانے کو کچھ نہیں تھا تو آخر یہی صلاح ٹھہری کہ جس طرح بنے اس مصیبت سے نکلنا

چاہیے گر نکلنے کے واسطے چونکہ کشتیاں کافی نہ تھیں۔ اور وہی چند کشتیاں تھیں جو دشمنوں سے چھینی تھیں اس لئے کیلے اور بانس کاٹ کر اور چھال اور گھاس سے باندھ کر بیڑے بنائے اور اُن پر چیدہ چیدہ بہادروں نے چڑھ کر طلوع آفتاب سے بہت پہلے کہ جب آسامی بالکل بے فکر پڑے سو رہے تھے یکایک حملہ کیا اور اُن کو وہاں سے بھگا کر اکتالیس کشتیاں چھین لائے اور پھر اُن کشتیوں پر اپنے لشکر کو ندی نالوں سے پار اُتار کر تمام لشکر کو صحیح سلامت متھرا پور۔ میں دوسری ذیقعدہ کو پہنچا دیا۔

مگر اس کے بعد بارش اس سے بھی زیادہ تیز ہوئی۔ اور تھانوں اور چوکیوں تک مدد کا پہنچنا بہت دشوار ہوگیا۔ تو میر جملہ نے از راہِ دانائی کل سپاہ کو سب جگہ سے اٹھا کر گھڑگاؤں اور متھرا پور میں جمع کر لیا اور دوبارہ آسامی تمام ملک پر قابض ہو گئے۔ اور وہ سوائے متھرا پور گھڑگاؤں۔ اور لکھوگڈہ کے اور کوئی مقام بادشاہی لشکر کے تصرف میں باقی نہ رہا۔ بلکہ آسامیوں کی جرأت اور جسارت یہاں تک بڑھی کہ متھرا پور اور گھڑگاؤں کے مابین جو صرف چند میل کا فاصلہ تھا یہاں بھی فوجی جمعیت کے بغیر آمدورفت نہیں ہو سکتی تھی۔

میر جملہ مشکلات میں

اب ظاہر ہے کہ اس حالت میں سرداروں اور اہل لشکر کی پریشانیوں کا کیا ٹھکانا تھا۔ اور قلت رسد اس پر اور بھی مستزاد تھی علاوہ بریں راجہ نے میر جملہ کے پاؤں اکھاڑنے کے لئے اپنے ایک بھوکن کو اپنا قائم مقام بنا کر اور بڑے بڑے اختیارات دے کر فوج کثیر کے ساتھ متھرا پور کو روانہ کیا۔ اور خود بھی قلعہ سولہ کوڑی میں جو گھڑگاؤں سے چار منزل اور آسام کے راجاؤں کا قدیمی دارالحکومت تھا آکر ٹھہر گیا۔ بھوکن مذکور ایک ندی کے کنارے جو متھرا پور کے نزدیک گذر کر دریائے دھنگ میں گرتی اور برسات کے موسم میں ایک بڑا دریا بن جاتی ہے آ اُترا۔ اور بے شمار آسامیوں کو جمع کر کے (بقول صاحب عالمگیر نامہ) ایک دیوار عریض و مرتفع تیس کوس لمبی اور انتہائی مستحکم کہ جس کا ایک سرا پہاڑ سے اور دوسرا دریائے دھنگ سے ملا ہوا تھا نہایت قلیل عرصہ میں اپنے لشکر کے آگے تیار کر لی۔ یہ شخص اکثر راتوں کو ندی سے پار اُتر کر متعدد بار سخت حملے کرتا رہا۔ مگر ہمیشہ ناکام ہی ہوتا رہا لیکن آخر میں میر جملہ نے ایک روز خود سوار ہو کر اُن کو ایسا تہ تیغ کیا کہ پھر اُس کو حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اور ایسا ہی چار دانگ کے راجہ کو بھی جو آسام کا ایک بہت بڑا ویل دار تھا اور جس نے متھرا پور کے نزدیک دوسری جانب سے مورچے لگ

لگاتے تھے راجہ سبھان سنگھ نے ایک سخت لڑائی لڑ کر بھگا دیا۔

جب آسامی اس طرح سے متھرا پور پر متواتر حملے کر کے ہمیشہ پسپا ہی ہوتے رہے تو اس جگہ کا خیال چھوڑ کر اوایل ذیقعدہ سے کھڑ گاؤں پر حملے کرنے شروع کئے۔ چنانچہ اکثر راتوں کو ایسے سخت حملے ہوئے کہ مدد کے لئے میر جملہ کو متھرا پور سے بعض سرداروں کو بھیجنا پڑا۔ اگرچہ اس پر بھی ذی الحجہ کے مہینہ میں آسامیوں نے کئی بار رات کو ایسی شدت سے حملے کئے کہ اگر بادشاہی سردار اور فوج ذرا سی کوتاہی کرتے تو ضرور مغلوب ہو جاتے۔ مگر یہ سپاہ کمال استقلال اور مردانگی سے اُن کے حملوں کو روکتی رہی۔

آخر کار روزمرہ کی لڑائی بھڑائی سے دق ہو کر مغلیہ فوج نے خود ایسے سخت حملے کئے کہ اُن کے مورچے چھین کر جلا ڈالے اور دشمنوں کو قتل اور غارت کر کے محصور و مغلوب سے پھر غالب ہو گئے اور اس دلیری اور ہمت کا یہ نتیجہ ہوا کہ دشمن منتشر ہو گئے اور فوج موجودہ کھڑ گاؤں کو روزمرہ کی لڑائیوں سے کسی قدر فرصت مل گئی۔ اسی طرح جو فوج معہ نواڑہ وغیرہ لکھو گڈھ میں ابن حسین داروغہ نواڑہ کے زیر حکومت تھی (جو نام سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی جہازراں عرب تھا) باوجود آسامیوں کی کوشش اور بے حد حملوں کے جو نواڑہ کے علاوہ دریا کنارہ سے بھی آ آ کر دق کرتے تھے کسی طرح مغلوب نہ ہوئی بلکہ ابن حسین اور اُس کے رفیق سرداروں نے خود حملے کر کے آسامیوں کی کئی کشتیاں چھین لیں۔ اور کتنے ہی اُن کے مورچے بھی تباہ کر ڈالے۔ اور ابتدائے برسات میں دیولی گاؤں وغیرہ سے جو تھانے اٹھ گئے تھے پھر قائم کر دیئے۔ بلکہ ایسا عمدہ بندوبست کیا کہ اُن کے کئی سردار بھی پکڑ لئے اور لکھو گڈھ سے گواہٹی تک اپنے رعب و دبدبہ کو جیسا کہ چاہیئے تھا قائم رکھا۔ اور گواہٹی سے رسد اور خبر کی آمد و رفت کے سلسلہ کو منقطع ہونے نہیں دیا۔

خلاصہ یہ کہ جب مذکورہ بالا بھوکن اپنی تمام جرأت اور بہادری خرچ کر چکا اور بادشاہی فوج باوجود قلت تعداد کے غالب رہی تو اس نے راجہ کی مرضی سے میر جملہ کے پاس متھرا پور میں وکیل بھیج کر پھر صلح کی درخواست کی۔ لیکن میر جملہ نے ازراہ مصلحت پہلے سے بھی زیادہ یہ کڑی شرطیں پیش کیں کہ پانچ سو ہاتھی تین لاکھ تولہ سونا معہ اپنی بیٹی کے جو بادشاہی بیگمات کی خدمت گذاری کے لئے بھیجی جائے بالفعل حاضر کرے۔ اور آئندہ کے لئے پچاس ہاتھی ہر سال بطور پیش کش بھیجتا رہے اور جہاں تک ہماری فوج پہنچ چکی ہے وہ تمام ملک ہمارے

قبضہ میں رہے۔ اور کوہستان نامروپ وغیرہ راجہ کے پاس۔ مگر ان سخت شرطوں کے ساتھ براہ دانائی یہ نرمی بھی ظاہر کی کہ پورن مل نامی اپنے ایک ہندو سردار کو بھوگن کی تسلی کے لئے بھی بھیج دیا۔ جس کی بھوگن نے نہایت درجہ کی خاطر اور تواضع وتکریم کرکے سب شرطوں کو قبول کر لیا۔ بلکہ ایک دن تخلیہ میں یہاں تک کہہ دیا کہ راجہ ان شرطوں کو منظور نہ کرے گا تو میں اُس کا ساتھ چھوڑ کر خود میر جملہ کی خدمت میں حاضر ہوجاؤں گا۔

بیماری اور قحط مگر یہ کام بنتے بنتے پھر اس طرح بگڑ گیا کہ اسی اثنا میں بدقستی سے ایک اور مصیبت پیش آگئی کہ شدت بارش سے متھراپور کے لشکر میں آب و ہوا خراب ہوکر تپ لرزہ اور دستوں کی بیماری ایسی پھیلی کہ اکثر لوگ مر گئے بلکہ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ وبا تمام ملک اور خصوصاً راجہ کی سپاہ اور رعایا کے لوگوں میں جو بھاگ کر پہاڑوں جنگلوں اور تنگ مقاموں میں جا گھسے تھے یہاں تک پھیل گئی تھی کہ اُس کے بعض ملازموں کے قول کے موافق دو لاکھ تیس ہزار آسامی ضائع ہوئے تھے؛ اس بیماری کے علاوہ میر جملہ کے لشکر میں رسد کا بھی ایسا قحط تھا کہ سوا اُن ایک سو تھوڑا نبار چاولوں کے جو کچھ ڈھیر پانی کی طغیانی اور دشمنوں کی دست وبرد سے بچے ہوئے تھے یا تو کسی قدر اُن پر گذران تھی یا اُن بیلوں کے گوشت پر جو لڑائیوں بھڑائیوں میں دشمنوں سے چھینے ہوئے تھے۔ بلکہ ایک مدت تک سوائے اس کے کہ بیل کا گوشت پانی میں جوش دے لیں یا اُسی کی چربی میں بھون لیں یا لیمو اور نارنج کے ساتھ جو اس ملک میں کثرت سے تھے تبدیل ذائقہ کر لیں بڑے بڑے طرانے نوش خور کو بھی کھانے کے لئے اور کچھ میسر نہ آتا تھا اور آخر کو یہ بھی نایاب تھا۔

بادشاہی لشکر کی اس مصیبت کا یہ نتیجہ ہوا کہ آسامی جو پہلے دب گئے تھے اُنھوں نے پھر سر اُٹھایا اور وہی بھوگن جو عجز و نیاز اور اطاعت کے پیغام و سلام بھیج رہا تھا۔ پھر لڑنے کو تیار ہوگیا۔ اور چونکہ متھراپور میں بیماری زیادہ تھی اور تقریباً تین مہینے سے دن رات کی بارش اور لڑائی اور قحط کی مصیبت نے مجبور کردیا تھا۔ اور اس لئے میر جملہ بادصبا محرم کو وہاں سے ڈیرہ اُٹھا کر گھڑگاؤں میں چلا آیا تھا۔ آسامیوں نے اس امر کو اور بھی زیادہ ان کی کمزوری پر محمول کیا اور از سر نو دن رات حملے کرنے شروع کردیئے یہاں تک کہ یہ بھوکی اور بیمار فوج رات بھر سونے نہیں پاتی تھی۔

لیکن ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ چاندنی رات میں آسامیوں نے جو دلیر خاں اور راجہ

سبھان سنگھ کے مورچوں پر بڑی جمعیت کے ساتھ حملہ کیا۔ لیکن وہ شکست کھا کر پسپا ہو گئے۔ دلیر خاں نے اپنی شجاعت کے جوش پر صرف اُن کے معمولی پس پا ہونے پر اکتفا نہ کر کے چاندنی رات کے موقعہ کو غنیمت سمجھا اور دور تک تعاقب کر کے اس قدر تہ تیغ کیا کہ اس کے بعد پھر اُن کو کھڑگاؤں پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

قصہ مختصر نصف ماہ صفر تک سب سرداروں اور سپاہیوں نے بیماری اور قحط کی مصیبت کو نہایت تحمل اور استقلال سے برداشت کیا اور چونکہ بارش میں بھی کچھ کمی ہونے لگی تھی اس لئے میر جملہ اور اُس کے سرداروں نے پھر کارروائی شروع کی اور معلوم کیا کہ براہ چارنگ دریا دیکھو کے پار دیول گاؤں تک دامن کوہ کے قریب ایک ایسی آل بنی ہوئی ہے جو برساتی پانی میں نہیں ڈوبتی اور اُس پر آمدورفت کے لئے خشک راستہ موجود ہے۔ اس لئے میر جملہ نے اکیسویں صفر کو تھوڑی سی فوج اور ابوالحسن نامی اپنے ایک معتبر سردار کو جو اُس کے ذاتی ملازموں میں سے تھا مفسدان کی سرکوبی کے لئے اور اُس راستہ کو کھولنے کے لئے مامور کیا اور یہ بھی ہدایت کی کہ ابن حسین لواڑہ کے داروغہ کو خبر دی جائے کہ رسد کی کشتیاں جس طرح ہو سکے دیول گاؤں میں بھیج دے۔ چنانچہ اس بندوبست کے موافق مخالفوں کی تنبیہ و تادیب کے بعد یہ دیول گاؤں میں پہنچ گیا۔ اور چونکہ دریا کنارے اب بھی آسامیوں کے مورچے اور نو تعمیر گڑھیاں تھیں اور رسد کی کشتیوں کے لئے اس وجہ سے اندیشہ تھا اس لئے کچھ رسد کشتیوں سے نکال کر جمعیت مناسب چارنگ کے راستہ سے کھڑگاؤں کو بھیج دی اور خود لواڑہ کے ساتھ ہو کر کھڑگاؤں کو روانہ ہوا اور اُن کی گڑھیاں جو دھنگ ندی کے کنارے تھیں اُن کو بھی چھین کر مسمار کر ڈالا۔ اور چارنگ اور گج پور اور دیول گاؤں میں راستہ کی حفاظت کا بخوبی بندوبست کر دیا۔

آسامی فوجوں کا فرار

خلاصہ یہ کہ یہ تدبیریں کارگر ہوئیں اور آخر ربیع الاول میں چھ مہینے کے بعد خشکی اور تری دونوں راستوں سے کھڑگاؤں میں رسد پہنچنے لگی۔ اور قحط کی مصیبت رفع ہو گئی اور برسات کے اُتار کے ساتھ آسامی بھاگ کر پھر جنگلوں دروں اور اونچے اونچے پہاڑوں پر جا چڑھے۔ اور راجہ بھی سولہ کوڑی سے پھر نامروپ کے پہاڑوں کو چلا گیا۔ اور اگرچہ اُس کا نامور سردار یعنی وہی مذکورہ بالا بھوکن بہ سبب اپنے مورچہ کی مضبوطی اور جمعیت فوج کے ابھی تک کھڑگاؤں کے قریب ایک

ندی کے کنارے گھیرا ہوا تھا۔ مگر اُس نے کبھی عاجزی سے پھر صلح کی درخواست کرنی شروع کی جس کو قبول نہ کرکے میر جملہ نے آٹھویں ربیع الثانی کو چند سرداروں اور فوج کو کشتیوں پر بٹھا کر اُس کو سزا دینے کے لئے روانہ کیا اور ایک سخت لڑائی ہوئی جس میں بھوکن مذکور سے اُس کا پانسوں کا قلعہ جو اُس نے اپنے لشکر کے گرداگرد بنا یا ہوا تھا چھین لیا گیا۔ مگر چونکہ اُس کے ساتھ جمعیت کثیر موجود تھی اور اُس نے ایک دوسرے قلعہ میں جو ڈُنڈکا ندی کے قریب تھا مورچے جمالئے تھے۔ اور اب وہ اس حملہ آور فوج اور کھرگانوں مقیم لشکر کے بیچ میں آگیا تھا۔ اس لئے چودھویں ربیع الثانی کو میر جملہ بذات خود کھرگانوں سے اس پر حملہ کے ارادہ سے روانہ ہوا۔ مگر چونکہ وہ پہلی ہی شکست سے ہمت ہار چکا تھا۔ اور اب میر جملہ کے بذات خود چڑھائی کرنے کا حال اُس کو معلوم ہوا تو خائف ہو کر اس مورچہ سے بھی جو بہت مضبوط تھا بے لڑے بھاگ گیا اس جگہ پر قابض ہو جانے کے بعد میر جملہ کو خبر ملی کہ ابھی ایک اور مورچہ دریائے دہنگ کے اُس پار باقی ہے۔ اس لئے وہاں سے اٹھارھویں ربیع الثانی کو روانہ ہو کر وہ اس دریا کے کنارے پر پہنچا ہی تھا کہ آسامی اس کو بھی خالی کر گئے حالانکہ دریا کے عرض و عمق کے باعث وہ حملہ سے محفوظ تھے۔

میر جملہ کی بیماری مگر اب قدرت ایزدی سے یہ عجیب اور منحوس واقعہ پیش آیا کہ مخالف تو اُس کو دریا کے پار ہی پہنچا ہوا دیکھ کر خود بخود بھاگے جاتے تھے۔ مگر یہاں میر جملہ پر یہ حالت گذری کہ جس وقت اپنے گھوڑے پر سوار اس کنارہ سے آسامیوں کے مورچوں اور ان کے حال احوال کو حملہ کی تدبیر سوچنے کے لئے بہ نظر غور و احتیاط دیکھ بھال رہا تھا۔ یکایک اس پر ضعف کی سی کیفیت ایسی طاری ہوئی کہ گھوڑے سے اُتر کر زمین پر لیٹ گیا۔ اور تھوڑی دیر تک بالکل بیہوشی اور غشی میں پڑا رہا اور اگرچہ تھوڑی دیر بعد ہوش آگیا مگر کئی روز تک اس کو یہیں مقام کرنا پڑا۔ اور اب باوجودیکہ اس کے مقابلہ سے دشمن بالکل ہٹ گئے تھے۔ بلکہ ایسا اچھا اثر پیدا ہو گیا تھا کہ رعایا کے لوگ عموماً اطاعت کرنے لگ گئے تھے اور بدلی بجھوکھن نامی جو آسام کے سرداروں میں راجہ کا ایک بہت بڑا رکن تھا۔ اور بہ سبب کسی رنجش کے راجہ سے اُس کی اَن بَن ہو گئی تھی اپنے اہل و عیال کی بھی پروا نہ کرکے اور راجہ کی رفاقت چھوڑ کر میر جملہ کے لشکر میں حاضر ہو گیا تھا بلکہ میر جملہ کی خواہش کے موافق راستوں وغیرہ کے بند و بست اور شاہی خدمات

کے لئے کئی ہزار آسامیوں کی فوج بھی بھرتی کرادی تھی۔ اور اس باعث سے راجہ کو اپنے سب سرداروں کی طرف سے ایسی بدظنی پیدا ہوگئی تھی کہ اس بیچارہ وفادار مذکورہ بالا پھوکن کو بھی جو نہایت بہادری کے ساتھ بادشاہی فوج کو کئی مہینے تک دق کرتا رہا تھا خواہ مخواہ سستی اور کوتاہی کا الزام لگا کر وحشیانہ رسم کے مطابق عیال و اطفال سمیت لوہے کی گرم سیخوں میں پروپرو کر سخت عذابوں سے مروا ڈالا۔ اور سارے معاملات ایک مدت تک خراب رہ کر اب سب طرح میر جملہ کے حسب دل خواہ ہو رہے تھے اور باوجود مرض کے بھی اس کا یہ مستقل ارادہ تھا کہ جس طرح بنے راجہ سے آسام کا کل ملک چھین کر اس کو خارج کر دے اور اسی ارادہ سے پانچویں جمادی الاول کو کوہستان نامروپ کی طرف یہاں سے کوچ بھی کر دیا تھا بلکہ ساتویں جمادی الاول کو قصبہ سولکوڑی میں پہنچ کر اور آٹھویں کو دریائے دھنک کے پار ہو کر (جس کے کنارہ یہ قصبہ آباد تھا) اور آگے بڑھکر جا اترا تھا۔

مگر اسی مقام پر اس کی بیماری بہت ہی سخت و شدید ہوگئی۔ سینہ اور معدہ میں درد ہو کر شدت سے تپ چڑھ گیا۔ اور دو تین دن کے بعد مرض ذات الصدر میں بھی مبتلا ہوگیا اس سبب سے اہل لشکر اور سردار جو متواتر لڑائیوں کے علاوہ گذشتہ بارش اور قحط اور بیماری سے تنگ آتے ہوئے تھے اب ان کو یہ فکر پیدا ہوئی کہ مبادا سردار مرجاتے یا مہم طول کھینچ کر دوبارہ برسات کا موسم آجائے اور لشکر تباہ ہو جائے اس لئے اکثر سرداروں نے یہ ارادہ کر لیا کہ اگر میر جملہ اس مہم کو زیادہ طول دینا چاہے تو خود سری اختیار کر کے بنگالہ کو چلے جائیں۔

راجہ کا پیغام صلح اگرچہ میر جملہ کو عین شدت مرض میں سرداروں کے اس ارادہ سے نہایت ہی رنج ہوا۔ مگر عالی ہمتی اور حسن تدبیر سے تاکہ دشمن دلیر نہ ہو جاتے باوجود بیماری کے ایک منزل اور آگے بڑھ گیا لیکن مذکورہ بالا وجوہ کی بنا پر اپنی اصلی آرزو کے برخلاف دل میں صلح کر لینے کا ارادہ کر لیا۔ اور اس عرصہ میں راجہ کے بھیجے ہوئے سفیر اور وکیل امراء کے ذریعہ سے معافی اور صلح کی متواتر درخواستیں کرتے تھے اور قبول نہیں کی جاتی تھیں۔ لیکن اب کہ جو راجہ نے دلیر خاں کے ذریعہ سے درخواست کی تو میر جملہ بھی بناچاری موقعہ دیکھکر راضی ہوگیا۔

اور سترھویں ماہ مذکور کو اپنے لشکرگاہ سے آگے بڑھکر موضع پتام میں جو نامروپ

کے درہ پدر تھا جا اُترا۔ یہ پتام کا علاقہ راجہ کے ایک رشتہ دار کی ریاست میں تھا۔ جس کو اُس کی طرف سے راجگی کا خطاب تھا۔ اور اس جگہ جنگل اور درہ کے سرے پر نہایت مضبوط مورچہ بنا ہوا تھا۔ غرضکہ اس جگہ راجہ کے وکیل حاضر ہوئے اور بہت سی قیل وقال کے بعد ان شرائط پر صلح ٹھہر گئی۔ کہ راجہ ایک اپنی بیٹی اور ایک راجہ پتام کی لڑکی بیس ہزار تولہ سونا۔ ایک لاکھ بیس ہزار تولہ چاندی بیس ہاتھی بادشاہی پیشکش میں پندرہ ہاتھی میر جملہ کو اور پانچ ہاتھی دلیر خاں کو دے۔ اور بعد ازیں بارہ مہینے کے اندر اندر تین لاکھ تولہ چاندی اور ۹۰ ہاتھی سرکار میں داخل کرے۔ اور بطور پیشکش سالانہ بیس ہاتھی بھیجتا رہے اور مذکورہ بالا شرائط کی تعمیل تک اپنے چار بڑے بڑے سرداروں کے بیٹوں کو یرغمال کے طور پر بنگالہ میں حاضر رکھے۔ اور بدلی بھوکس کے اہل وعیال کو (جو حسب شرح صدر میر جملہ کی خدمت میں حاضر ہو گیا تھا) علاقہ کامروپ کے بعض اشخاص کے ساتھ جو اب بھی نامروپ وغیرہ کے پہاڑوں میں قید تھے۔ پادشاہی لشکر میں پہنچا دیئے۔ اور ملک مفتوحہ کے اُتر کون کی طرف دریائے کلنگ راجہ اور بادشاہی علاقہ میں حد فاصل مقرر ہو گئی۔ راجہ نے یہ سب قبول کر لیا اور ان امور کی بابت آسامیوں کی طرف سے عہدنامہ اور میر جملہ کی طرف سے قول نامہ تحریر کیا گیا۔ اور پانچویں جمادی الآخر کو راجہ کے وکیلوں نے اس معاہدہ کی تعمیل میں دونوں لڑکیاں اور مقررہ سونا چاندی اور چاروں سرداروں کے لڑکے حاضر کر دیئے۔

میر جملہ کی مراجعت

میر جملہ نے دسویں جمادی الآخر کو اورنگ زیب کے جلوس کے پانچویں سال میں اس باعزت صلح کے بعد کوہستان نامروپ سے بنگالہ کو مراجعت کی (اس حساب سے من ابتدائے شروع کوچ جو جمادی الاول کی تیرھویں تھی دوسرے برس کی دسویں جمادی الثانی تک کل ایام مہم ایک برس سے کچھ زائد ہوئے) اور چونکہ اس کو بیماری سے کسی قدر افاقہ ہو گیا تھا منزل بمنزل جلد جلد کوچ کرتا ہوا بائیسویں ماہ مذکور کو لکھو گڈھ میں پہنچ گیا اور میر مرتضیٰ وغیرہ سرداروں اور ہمراہیوں کے انتظار میں جو کثیر [illegible] سے مع اشیا اموال بادشاہی اور معہ یک گروہ کثیر ہندو مسلمان زن ومرد کے جو قید سے رہائی پا کر آرہے تھے توقف کیا اور چونکہ مفتوحہ علاقوں درانگ اور ڈومرویہ وغیرہ کا بندوبست اور گواہٹی کے نظم ونسق کو جو آسامیوں کے ایام تصرف میں خلل پذیر ہو گیا تھا

دوبارہ درست کرنا تھا اور بھیم نارائن کو بھی اُس کی دوبارہ فسادانگیزی کے سبب سزا دینا ضروری تھا۔ اور برسات کا موسم قریب آگیا تھا اس لئے میر جملہ کچھ فوج اپنے ساتھ لے کر اور باقی فوج دلشکر دلیر خاں کے زیر کمان گھوگڈھ میں چھوڑ کر اٹھائیسویں جمادی الآخر کو گواہٹی کی طرف چل پڑا۔ اور یہاں سے غرہ رجب کو آسام کی نئی سرحد کے ملاحظہ کے لئے دامن کوہ کے راستہ سے کوچ کیا۔ چونکہ جنگل بہت گھنا تھا تین چار منزل لشکر نے بڑی تکلیف اُٹھائی۔ چہارم رجب کو دریائے کلنگ سے اُتر کر قلعہ کجلی کے نیچے ڈیرہ کیا۔ اور اس جگہ وہ انگ اور ڈومریہ کے راجاؤں کو جنھوں نے اس مہم میں اچھی خدمات انجام دی تھیں۔ مناسب حال عنایتوں سے سرفراز کیا۔

میر جملہ کی وفات مگر ان ایام میں میر جملہ کو بعض دواؤں کے استعمال کی وجہ سے جو اطبائے فرنگی یعنی یوروپین ڈاکٹروں نے دی تھیں اور صاحب عالمگیر نامہ کے خیال میں وہ حار تھیں (جیسا کہ ہمارے زمانہ میں بھی انگریزی دواؤں کی نسبت اکثر ہندوستانیوں کا یہی عجوبہ خیال ہے) پہلی بیماریوں کے علاوہ ضیق النفس اور خفقان و فرط عطش اور استسقا کے آثار پیدا ہو گئے۔ غرضکہ اسی حال میں تیرھویں رجب کو کجلی سے کوچ کر کے دریا پار قصبہ گواہٹی کے محاذی موضع اناندہ میں اُتر پڑا۔ اور بادشاہ کے حکم کے موافق رشید خاں کو سرکار نامروپ کا فوجدار مقرر کیا اور ضروری امور کا بندوبست مناسب کر کے چھبیسویں کو موضع ناندہ سے کشتی میں بیٹھ کر آخر تاریخ رجب کو مقام ہری تلا ریاست کوچ بہار کے راستہ پر پہنچ کر باوجود شدت مرض کے بھیم نارائن کی سزا دہی اور اس کا ملک چھیننے کے ارادہ سے اُتر پڑا۔ اور لشکر کے جمع ہو جانے کے انتظار میں جو پیچھے آتا تھا اسی جگہ ٹھیرا رہا۔ مگر شدت امراض سے جب اُس نے اپنے جان بر ہونے کی امید نہ دیکھی تو ناچار عسکر خاں کو کوچ بہار کی تسخیر کے لئے مامور کر کے خضر پور کو کوچ کیا۔ اور نو ماہ کے دن رمضان کی دوسری کو خضر پور سے دو کوس پر اسی دنیائے ناپائدار ہی سے سفر آخرت اختیار کیا وہ اسے بسا آرزو کہ خاک شدہ! اور جب یہ خبر بادشاہ کے پاس جب کہ وہ کشمیر کو جا رہا تھا لاہور میں پہنچی تو بادشاہ نے اُس کے بیٹے محمد امین خاں کو جو میر بخشی اور پنج ہزاری پنج ہزار سوار کا امیر تھا نہایت تسلی دے کر بہت سی شاہانہ عنایتوں سے سرفراز کیا۔ فقط

(حاشیہ متعلقہ صفحہ ۲۵۱)

پرتگیزوں کی ہندوستان میں آمد اور اُن کا عروج زوال

صفحہ ۲۰۸ میں ہم لکھ آئے ہیں کہ اس کتاب کے مترجم انگریزی مسٹر ارونگ براک نے پرتگیزوں کے ہندوستان میں آنے اور ممالک مشرقیہ میں اُن کے عروج و زوال کا حال ایک دلچسپ حاشیہ میں تفصیل سے لکھا ہے۔ جس کو خفیف تغیر و تبدل کے ساتھ ہم اس جلد کے خاتمہ میں لگائیں گے۔ چنانچہ وہ مطابق ذیل ہے۔

ہندوستان کی دولتمندی کی شہرت اور یہاں کے گرم مصالحوں کی افراط اور سوتی مہین کپڑوں کی عمدگی نے مدتہائے دراز سے یورپ کی اکثر قوموں کو اس ملک کے ساتھ اپنا کاروبار تجارت جاری کرنے کے لئے نہایت بے چین کر رکھا تھا۔ لیکن خشکی کے راستہ کی مشکلات اور سمندر کی راہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے سب لاچار تھے مگر آخر کار جب پرتگال کے بادشاہ جان دوم نے جو نہایت ذی ہوش شخص تھا عمل درآمد سابق کے برخلاف اپنے پائے تخت لزبن کو جو دریائے ٹیگس کے کنارے آباد ہے۔ ایک ایسا بندرگاہ قرار دیا کہ جس میں ہر طرف کے جہاز بغیر کسی طرح کی روک ٹوک کے آنے لگے اور اسی کی اعانت اور حسن توجہ سے بذریعہ علم ہیئت سمندر میں سفر کرنے کا نیا طریق جاری ہوا تو پرتگیزوں نے پہلے کیپ کا راستہ نکالا جو ممالک افریقہ کے انتہائے جنوب کی طرف واقع ہے۔ مگر یہ لوگ اُن تکلیفوں کے باعث جو یہاں تک پہنچنے میں طوفان کی شدت سے اُن کو اٹھانی پڑی تھیں اس کو کیپ آف سٹارم یعنی راس الطوفان کہنے لگ گئے تھے اور آگے بڑھنے سے کسی قدر جھجکتے تھے۔ لیکن اس بادشاہ کے خیال میں یہ امر یقینی تھا کہ وہاں سے ہندوستان کا راستہ ضرور ملے گا اس لئے اس نے اس کا نام بدل

ل زبت اف - ٹ ے گ ش کیِ ے ب آف س ٹ ارم

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ دینا مناسب سمجھ کر اس کا نام کیپ آف گڈ ہوپ یعنی راس نیک امید رکھ دیا۔ اور اس کے بعد جب اوائل تخت نشین ہوا تو وہ بھی خاندان کی اسی تدبیر کی پیروی میں معروف رہا۔ چنانچہ آٹھویں جولائی ۱۴۹۷ء کو ایسے چھوٹے چھوٹے چار جہازوں کا بیڑا جن میں صرف ایک سو ساٹھ آدمی سوار تھے زیر حکم واسکوڈی گاما ہندوستان کے راستے کی تلاش کے لیے پھر روانہ کیا گیا۔ یہ باہمت سردار اول کیپ آف گڈ ہوپ پہنچا اور پھر اس سے آگے ایسے سمندروں کو طے کرتا ہوا جن کو پہلے کسی نے نہیں دیکھا تھا دس مہینے لزدن کے ایک پر صعوبت اور طولانی سفر کے بعد سترھویں مئی روز جمعہ ۱۴۹۸ء کو ساحل ملابار پر آ پہنچا۔ اور جس کام کے لیے اولوالعزم لوگ ساٹھ برس سے جانیں کھپا رہے تھے آخر کار ان کی محنت ٹھکانے لگ گئی۔

اس وقت ہندوستان کا ملک دہلی کے علاوہ جنوب و مغرب کی طرف مختلف فرمانرواؤں میں منقسم تھا اور ان کے ماتحت اور چھوٹے چھوٹے راجہ اور باج گذار رئیس حکمران تھے۔ ان میں سے کالی کٹ کا فرماں روا جس کا لقب زیمورن[1] (سامری) تھا۔ ساحلوں اور

---

[1] فارسی تاریخوں میں زیمورن کو سامری لکھا ہے اور زمانہ حال کی بعض اردو تصانیف میں کالی کٹ کا تلفظ کلی کوٹ اور کہیں کہیں کالی کوٹ درج ہے۔ اس لیے ہم نے مدراس گورنمنٹ کے ایک عالی منزلت عہدہ دار کی معرفت خود صاحب کلکٹر ملابار سے اُن کی اصلیت دریافت کی تھی مگر افسوس کہ صاحب موصوف کو ان لفظوں کی اصلیت کا کچھ پتہ نہ مل سکا۔ آخر کار ہم نے حضور مہاراجہ صاحب بہادر سرگ باشی والی ٹراونکور، جو بہت صاحب علم رئیس تھے۔ اور ان کی ریاست بھی ساحل ملابار ہی پر واقع ہے۔ ان کی تحقیق چاہی چنانچہ حضور ممدوح کے حکم سے ان کے سکرٹری نے جو جواب بذریعہ انگریزی چٹھی کے لکھا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ زیمورن تو یورپین لوگوں نے بنالیا ہے ہم کی چٹھی کے ساتھ صحیح لفظ سامری ہے۔ مگر اس کے معنی اور اشتقاق معلوم نہیں۔

اور کالی کٹ کی اصل کالی کوڈ ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ کی نسبت یہ روایت لکھی کہ شاہ ملابار مسمّی چیرومان پیرومال نے جب اپنے راج گدی کے طور پر سب سے پہلے سامری کو ریاست نخشا کی تو ایک تلوار اور مرغا دے کر یہ حکم دیا تھا کہ مقام تالی میں کوڑ جو بعد ازاں سامریوں کا دار الحکومت ہوا

پرتگیزوں کا بقیہ حاشیہ۔ بندرگاہوں پر سب سے زیادہ حکومت اور اقتدار رکھتا تھا۔ اور ملابار کا تمام ملک اسی کے زیر فرمان تھا۔ جب واسکوڈی گاما نے سنا کہ کالی کٹ ایک بڑا تجارتی بندرگاہ ہے تو وہ اسی دیس کا ایک جہازی رہنما ہم پہنچا کر کالی کٹ میں پہنچ گیا۔ خوش قسمتی سے یہاں لومن[1] کا رہنے والا ایک مسلمان شخص ایسا مل گیا جو پرتگیزی زبان سے واقف اور ان سے میل جول اور انس و محبت کو پسند کرتا تھا۔ اس شخص کے ذریعہ سے واسکوڈی گاما نے سامری کے دربار میں باریابی حاصل کرکے اپنے بادشاہ کی طرف سے دو متحد المضمون نامے جو ایک پرتگالی میں اور دوسرا عربی میں تھا پیش کئے۔ اور یہ درخواست کی کہ دوستی اور تجارت کا ایک عہد نامہ بادشاہ پرتگال اور سامری کے باہم ہو جائے۔

یہ عہد نامہ ہو جانے ہی کو تھا کہ وہاں کے مسلمان تاجروں نے جو پرتگیزوں کی اولوالعزمی و مستعدی سے خائف تھے سامری کے دل میں کچھ شکوک ڈال دیئے اور ان کی باتوں نے ایسی تاثیر کی کہ اس کے اور واسکوڈی گاما کے باہم سخت ان بن ہو گئی۔ یہاں تک کہ چند ہی روز پہلے جن لوگوں

---

[1] افریقہ کے ساحل مغربی و شمالی پر ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست ہے جہاں کا ترک رئیس فی زمانہ محمد صادق بائی ہے۔ س۔م۔ع

بقیہ حاشیہ زیورن۔ جائے اور جہاں تک مرغ کی آواز پہنچے اس قدر علاقہ پر قبضہ کرلے۔ اس وجہ سے کالی کوڈو نام پڑ گیا۔ جس کے معنی وہاں کی زبان میں "مرغ کی ریاست" ہوتے ہیں۔ جس کو ہمارے ملک کے ہندی محاورہ کے موافق "کوکڑ راج" کہنا چاہیئے۔

بیورج صاحب کی تاریخ ہند سے بھی (جو ایک عمدہ اور جامع کتاب ہے) اسی روایت کی تائید ہوتی ہے چنانچہ صاحب موصوف نے ڈاکٹر بکانن صاحب کے سفر نامہ کے حوالہ سے یوں لکھا ہے کہ اس ملک میں افسانہ کے طور پر عام روایت یوں چلی آتی ہے کہ شاہ ملابار نے ایک روز اپنے سرداروں کو تمام ملک بانٹ دیا تھا۔ یہاں تک کہ جب سامری نامی ایک سردار نے اپنے لئے بھی علاقہ مانگا تو اس کے پاس دینے کو کچھ باقی ہی نہ تھا اس وجہ سے اپنی تلوار دیدی اور کہا کہ وہ سامنے مندر پر بیٹھا ہوا جو ایک مرغ بانگ دے رہا ہے جہاں تک اس کی آواز جائے اس قدر ملک پر تو بھی قبضہ کرلے۔ صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ یہ مرغ والی بات جو کالی کٹ کے قدیمی نام کالی کوڈو کی اصل بیان کی جاتی ہے اس کی اصلیت خواہ کچھ ہو یا نہ ہو مگر اس میں شک نہیں کہ خود بادشاہ کے ہاتھ کی تلوار مل جانے سے ان سب سرداروں پر سامری ہی غالب آگیا اور تمام ملک پر اسی کی حکومت ہو گئی۔ اور غالباً سامری ہی سے اس کے جانشینوں کا لقب رفتہ رفتہ سامری ہو گیا۔ س۔م۔ع

پرتگیزوں کا بقیہ حاشیہ۔ کی اُس نے بہت کچھ خاطر اور عزت کی تھی اُنھیں کے قتل کے درپے ہو گیا۔
واسکوڈی گاما یہاں کا نقشہ بگڑا ہوا اور ناقابل اصلاح دیکھ کر چل دیا۔ اور جاتے ہوئے سامری کو یہ کہلا بھیجا کہ مسلمان سوداگروں کے بہکانے سے تم نے ہم کو چور اور بے عزت تو سمجھا ہے۔ مگر یاد رکھو کہ عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ پرتگیز کون اور کیسے ہیں۔ اور اُس کی رعایا کے چند لوگوں کو بھی جو باہمی امن چین کی حالت میں پکڑ لئے تھے۔ اپنے بادشاہ اور اہل وطن کے دکھانے کے لئے ساتھ ہی لیتا گیا۔ اور اگرچہ سامری کے چند جہازوں نے کچھ دور تک اس کا تعاقب بھی کیا مگر باد مراد کی مدد سے وہ صحیح و سلامت نکل گیا۔ اور دو برس دو مہینے کے بعد ایک سو ساٹھ ہمراہیوں میں سے صرف پچاس آدمیوں کو زندہ لے کر بماہ ستمبر ۱۴۹۹ء اپنے وطن میں واپس پہنچ گیا۔

جب یہ لوگ دارالسلطنت میں پہنچے تو اہل شہر نے یہ خیال کر کے کہ اب تمام دنیا کی نہایت پُر منفعت تجارت ہمارے قابو میں آنے والی ہے بے حد خوشیاں منائیں اور واسکوڈی گاما کو اس کارگزاری کے صلہ میں بادشاہ نے ایک بھاری پنشن اور بڑے بڑے خطاب عنایت کئے۔

اور رومن کیتھولک فرقہ کے پیشوائے اعظم پوپ آف روم نے جو ہمیشہ اسی تاک میں رہا کرتے ہیں کہ عام خلائق کے دلوں میں اس خیال کو جمائے رکھیں کہ روئے زمین پر پوپ کی سی عظمت اور اقتدار کسی کا نہیں۔ بقول مشہور "آب از دریا بخشیدن" پر عمل کر کے اپنی طرف سے بھی ان اپنے مریدوں کو یہ عطیہ مرحمت کیا کہ مشرقی ملکوں میں جتنے ساحل اور بندرگاہیں تم دریافت کر لو گے وہ سب ہم نے تم کو بخش دیئے۔

اس کامیابی سے ایمانوئیل ایسا مسرور ہوا کہ اپنے القاب شاہی میں ایسے الفاظ اضافہ کئے کہ شاہ پرتگال۔ اتھوپیا۔ عرب۔ فارس اور ہند کے سواحل و جزائر کی فتوحات اور جہاز رانی کا بھی مالک ہے۔ اور تھوڑے سے ہی عرصہ بعد تیرہ جہاز بارہ سو آدمیوں کی جمعیت کو لئے ہوئے زیر حکم الوریس کابریل نویں مارچ ۱۵۰۰ء کو پھر کالی کٹ میں آئے۔ اگرچہ اُن کے آنے پر سامری کی طرف سے بھی کچھ بدسلوکی نہ ہوئی اور کابریل نے بھی اُن شخصوں کو جنھیں واسکوڈی گاما پکڑ کر لے گیا تھا واپس لا کر چھوڑ دیا۔ اور ان قیدیوں نے اس حسن سلوک اور رعایتوں کی بھی جو پرتگیزوں نے اپنے وطن میں اُن سے برتی تھیں نہایت تعریف و توصیف کی۔ لیکن سامری کے دل کے شبہات ایک مدت دراز کے بعد رفع ہوتے مگر چونکہ وہی عرب[1] یا افریقی تاجر جو سامری اور واسکوڈی گاما کے

---

[1] ملک مراکش جو افریقہ کے ساحل شمال و مغرب پر یورپ کے قریب واقع ہے اصل میں وہاں

پرتگیزوں کے حاشیہ کا بقیہ۔ باہم اُن بن کا باعث ہوتے تھے اس کے راجہ میں زیادہ اعتبار رکھتے تھے ان کے بہکانے سے اب یہ ایک اور نئی حرکت ہوئی کہ شہر کے لوگوں نے پچاس پرتگیزوں کو مار ڈالا۔ اس کے انتقام میں کابرل نے عربوں کے کل جہازوں کو جو بندرگاہ میں موجود تھے۔ جلادیئے اور شہر پر بھی خوب گولے مارے۔ اور وہاں سے کوچین کو ہوتا ہوا کاننا نور کو چلا گیا۔ اور ان دونوں شہروں کے راجاؤں نے اُس کو بہت سے گرم مصالحے اور روپیہ اشرفیاں نذر کیں۔ اور سامری کے برخلاف جس کے وہ باج گذار تھے اُس سے دوستی اور اتفاق کا عہد و پیمان کرنا چاہا۔ اور قرب وجوار کے اور کئی راجاؤں نے بھی یہی درخواست کی۔ ان سب کو یہ ہوس تھی کہ اس طرح سامری کی اطاعت سے آزاد ہو جائیں گے۔ اور اپنے اپنے ملکوں کی حدود کو بڑھالیں گے۔ چنانچہ اس دیوانگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام ملک مالابار پر پرتگیزوں کو اس قدر اقتدار حاصل ہو گیا کہ جہاں وہ پہنچتے تھے وہاں کے فرماں روا ہو جاتے تھے۔ اور کسی راجہ سے جب تک وہ اُن تین باتوں کو قبول نہ کرے اتفاق باہمی کا عہد و پیمان نہ کرتے تھے۔

اول۔ یہ کہ ہم ہمیشہ بادشاہ پرتگال کے تابعدار اور مطیع الحکم ہیں۔

دوسرے۔ یہ کہ پرتگیز اُس کی ریاست گاہ میں ایک قلعہ بنالیں۔

تیسرے۔ یہ کہ پرتگیز جو اجناس تجارت خریدیں اُس کی قیمت کی تشخیص اور کسی ایسی تکرار و نزاع کا فیصلہ وہ اپنی ہی رائے سے کرلیں۔

اس کے علاوہ سب غیر ملکی تاجروں پر یہ امر لازم کیا گیا کہ جب تک پرتگیز خرید مال سے فارغ ہو کر اُس کو اپنے جہازوں پر نہ چڑھالیں وہ سب لوگ مال کی خرید اور روانگی سے رُکے رہیں۔ اور اُن کے اجازت نامہ اور سندراہداری کے بغیر کوئی شخص سمندر کے سفر کا مجاز نہ تھا۔ اگرچہ پرتگیزوں کو چند بار لڑائیاں بھی لڑنی پڑیں۔ لیکن اس سے اُن کی تجارت میں چنداں خلل نہ پڑا۔ بلکہ اُنھوں نے اپنے تھوڑے سے سپاہیوں کے ساتھ بڑی بڑی فوجوں کو شکستیں دیں۔ اور چند ہی سال میں اس قدر اقتدار پیدا

بقیہ حاشیہ در حاشیہ۔ کے باشندوں کو جو مسلمان ہیں انگریزی میں مور کہتے ہیں۔ مگر جس طرح کل ممالک مختلفہ افریقہ کے سیاہ رنگ باشندوں کو ملک حبش کے قرب کے باعث عموماً حبشی کہتے ہیں۔ یا کل یورپین لوگوں کے لیے فرانس کے قرب کی وجہ سے بلالحاظ اختلاف اقوام لفظ فرنگی بولا جاتا ہے۔ اسی طرح انگریزی میں لفظ مور کا اطلاق مجازاً اُن سب عرب اور افریقی سانولے رنگ کے مسلمانوں پر کیا جاتا ہے۔ جن سے یورپ کے لوگوں کو مشرقی سمندروں میں سابقہ پڑتا تھا۔ س۔م۔ح

پرتگیزوں کے حاشیہ کا نتیجہ۔ کہ اُن کی مقبوضہ بندرگاہوں میں سامری یا اُس کے باج گذار راجاؤں یا عرب وغیرہ سوداگروں کے جہاز بالکل نہیں جا سکتے تھے۔ اسی عرصہ میں جب لفانسوالبوک کرک شاہ پرتگال کی طرف سے ویسرائے مقرر ہوکر آیا تو براہ دوراندیشی اُس کی یہ رائے ہوئی کہ ہندوستان میں ٹھہرنے کے لئے کوئی ایسی جگہ قرار دینی چاہیے جس کو دشمن کے حملے سے بآسانی بچا سکیں اور وہ ایک اچھی بندرگاہ بھی ہو۔ اور آب وہوا بھی عمدہ ہوتا کہ نوواردپرتگیز دور دراز بحری سفروں کے بعد وہاں آرام لے سکیں۔ چنانچہ اُس نے اپنے جزیرہ گوآ کو جو کنٹر کی حدود میں واقع ہے منتخب کیا۔ اگرچہ اُس وقت گوآ ایسا نامی مقام نہ تھا جیسا کہ آج کل ہے۔ لیکن پھر بھی وہاں کا بندرگاہ اُن اطراف میں ہر طرح سے مفید اور بہتر سمجھا جاتا تھا۔ ان دونوں میں یہ مقام فرمانروائے دکن (یعنی خاندان بہمنیہ) کے راج میں تھا۔ لیکن یوسف عادل خاں جو اُس کی طرف سے وہاں کا صوبہ دار تھا خودسر ہوکر ملابار تک اپنی حکومت پھیلانے میں کوشش کر رہا تھا۔ اور جب کہ یہ غاصب ملک گیری کے منصوبوں میں کسی طرف مصروف تھا تو البوکرک نے میدان خالی دیکھکر تموجی نامی اپنے ایک دوست کے مشورہ سے جو کنٹر کے علاقہ میں دریائی غارت گری کے ذریعہ سے بہت زبردست ہوگیا تھا (سنہ ۱۵۱۰ء) میں گوا پر ناگہاں حملہ کیا۔ اور شہر کو لے لیا۔ اس واقعہ کے باعث عادل خاں گوا کو واپس آیا۔ اور پرتگیز جو ابھی مستحکم طور سے پاؤں نہ جما چکے تھے ناچار شہر چھوڑ کر جہازوں پر جا چڑھے۔ لیکن اس سے تھوڑے عرصہ بعد جو عادل خاں کو وجی نگر کے راجہ سے لڑنے کو جانا پڑا تو البوکرک نے اپنے اُسی دوست کی امداد سے پھر ایک چھاپا مارا اور گوا پر قابض ہو بیٹھا اور مورچہ بندی کرکے اور حصار وغیرہ بناکر اُس کو خوب مستحکم کر لیا۔ اور کالی کٹ کا بندر جو کسی کام کا نہ تھا وہاں کی دولتمندی اور تجارت سب گوا میں سمٹ آئی۔ اور اُسی دن سے پرتگیزوں کے مقبوضات واقعہ ہند کے لئے شہر گوا بمنزلہ پایۂ تخت کے ہو گیا۔ اور رفتہ رفتہ جب پرتگیزوں کی حکومت خلیج فارس اور بحر عرب اور ساحل ملابار میں بخوبی قائم ہوگئی تو انھوں نے ایشیا کے اور مشرقی ملکوں کی طرف رخ کیا۔ اور اس مہم میں البوکرک نے سب سے پہلے جزیرہ سراندیپ کو مسخر کیا۔ اگر پرتگیز دوربینی اور عاقبت اندیشی کو کام میں لاتے تو اُن کے لئے یہ زیادہ مفید تھا کہ اپنی تمام قوت اور طاقت کو اسی جزیرہ میں قائم کر لیتے۔ کیونکہ اول تو یہاں کے بندرگاہ ہندوستان کی تمام بندرگاہوں سے بہتر تھے۔ دوسرے یہ جزیرہ مشرقی ملکوں کے وسط میں تھا اور تمام دولتمند ملکوں کے راستے ادھر ہی سے تھے اور اس کی سب بندرگاہیں ایسی تھیں کہ وہاں سے جنگی جہاز ایشیا کے تمام ملکوں پر دباؤ ڈالنے اور خوف قائم رکھنے کو بآسانی بھیجے جا سکتے تھے اور خود اس کے بندرگاہوں کی حفاظت وحراست تھوڑی

پرتگیزوں کے حاشیہ کا بقیہ۔ کسی نوع سے بخوبی ہو سکتی تھی۔ مگر نائب السلطنت مذکور نے ان فوائد کا کچھ خیال نہ کیا۔ بلکہ ساحل کارومنڈل پر قابض ہو جانے میں بھی فروگذاشت ہی کی۔ اور اگرچہ یہاں سے وہ عمدہ اور نہایت لطیف اور بھی سوتی کپڑے بہم پہنچ سکتے تھے جو دنیا بھر میں بے مثل گنے جاتے تھے۔ اور بنگالہ اور اور ممالک کی تجارت کے لئے یہ مقام قدرتی طور پر نہایت مفید اور موقعہ کا تھا۔ مگر باوجود اس کے بھی کوئی اچھی جگہ اس ساحل پر قائم نہ کی۔ حتیٰ کہ مقامات سین طامس اور ناگ پٹن بھی ایک مدت کے بعد قائم کئے۔ اس نے یہ خیال کر لیا تھا کہ درحالیکہ ہم جزیرہ سرندیپ کے مالک ہو گئے ہیں۔ (جن کی فتوحات کو ولیسرائے سابق ڈی المیڈا نے شروع کیا تھا) اگر ملک ملاکا بھی ہمارے قبضہ میں آ جائے تو پھر ساحل کارومنڈل کی تمام تجارت خود ہی ہمارے قابو میں آ جائے گی۔ پس اس وجہ سے اُس نے ملاکا ہی کو مقدم سمجھ کر اسی کی طرف عزیمت کی۔ یہ ملک جس کا دارالحکومت شہر ملاکا ہے طول میں تین سو میل کے قریب اور عرض میں بہت تنگ سا ہے۔ اس کے شمال کی طرف خشکی میں تو سیام کا ملک ہے اور باقی تین طرف سمندر ہے۔ چونکہ ملاکا اپنے موقعہ کے لحاظ سے ہندوستان کے تمام تجارتی مقاموں میں سب سے بہتر منڈی ہے۔ اور پرتگیزوں کو اس بات کی بڑی آرزو تھی کہ مشرقی ملکوں کی سب طرح کی تجارت میں جس طرح بنے سہیم و شریک ہو جائیں۔ اس لئے یہ لوگ اس ملک میں پہلے پہل صرف تجارت ہی کے لباس میں نمودار ہوئے۔ چونکہ اُن کی دست درازیوں نے جو وہ ہندوستان میں کرتے آئے تھے اُن کی تدبیروں کو بہت مشتبہ بنا دیا تھا۔ اس لئے اہل ملاکا اُن کے آنے سے بہت ڈرے۔ اور باہم تجویز کر کے بہت سوں کو مار ڈالا اور باقی ماندہ قید کر لئے۔ اگرچہ البیوکرک کو ملاکا پر حملہ کرنے کے لئے پہلے بھی کسی حیلہ بہانہ کی حاجت نہ تھی۔ مگر اب تو خود بخود ایک جائز سبیل نکل آئی۔ اس واقعہ کے باعث اہل ملاکا کو بھی یہی خیال تھا کہ کسی نہ کسی دن البیوکرک یکایک آن پڑے گا اس لئے وہ بھی لڑائی کے لئے ہر طرح تیاری کئے بیٹھے تھے۔ چنانچہ اوائل ۱۵۱۱ء میں جب البیوکرک ملاکا کے سامنے نمودار ہو تو اُن کو مقابلے کے لئے مستعد اور تیار پایا۔ پرتگیزوں نے شہر پر حملہ کیا۔ اور کئی بار سخت اور خونریز لڑائیاں ہوئیں۔ مگر آخر کار شہر چھین لیا گیا اور بے شمار مال و دولت اور سامان حرب و ضرب پرتگیزوں کے ہاتھ آیا۔ اور قبضہ قائم رکھنے کے لئے ایک قلعہ تعمیر کیا گیا۔ لیکن البیوکرک نے زیادہ دست اندازی مناسب نہ جان کر صرف شہر ملاکا ہی پر اکتفا کیا۔ سیام اور پیگو کے بادشاہوں اور قرب و جوار کے رئیسوں نے پرتگیزوں کی اس فتح سے جو اُن کے استقلال اور آزادی کے لئے از بس مضر تھی خائف ہو کر البیوکرک کی خدمت

پرتگیزوں کے حاشیہ کا نتیجہ۔ میں مبارک باد کے لئے سفیر بھیجے۔ اور درخواست کی کہ ہمارے اور شاہ پرتگال کے باہم دوستی اور اتفاق کا عہد و پیمان ہو جائے۔ اور یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ آپ ہمارے ملک میں کاروبار تجارت جاری کریں۔

جب شہر ملاکا میں پرتگیز اپنے قدم جما چکے اور قرب و جوار کے رئیسوں پر بھی اپنا رعب داب بخوبی بٹھا لیا تو البوکرک نے اپنے بیڑے میں سے چند جنگی جہاز جزائر متعلقہ ملاکا کی تسخیر وغیرہ کے لئے روانہ کئے۔

یہ ٹاپو بطور ایک مجموعہ جزائر کے ہیں۔ اور ان کے باشندے پشت ہا پشت سے ساگودانہ اور ناریل کے دودھ پر گذران کیا کرتے تھے۔ مگر اتفاقاً کسی طوفان وغیرہ کے حادثہ کے باعث سے جب ایک چینی جہاز وہاں آ گیا تو پہلے پہل انہیں کی بدولت لونگ اور جائپھل لے جو ان جزائر میں بکثرت تھے دنیا میں مشہور ہونا شروع کیا۔ چنانچہ اس سے تھوڑے ہی عرصہ بعد یہ مصالحے ہندوستان میں عموماً پسند اور مرغوب طبع ہو گئے۔ اور پھر ہند سے ایران اور فرنگستان میں جا پہنچے اہلِ عرب جو اس زمانہ میں تقریباً تمام دنیا کی تجارت پر قابض تھے بھلا اس پر منفعت سوداگری پر اُن کی آنکھ کیوں کر نہ پڑتی۔ چنانچہ عربی تاجروں کے قافلے کے قافلے ان جزیروں میں جو پیداوار کی جہت سے مشہور ہیں آکر دخیل ہو گئے اور تب سے اب تک یہاں کے مصالحوں کی تجارت اُنھیں کے ہاتھ میں تھی کہ یکایک یہ پرتگالی جو کسی جگہ اُن کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے یہاں بھی آن پہنچے اور اس تجارت کو اُن سے چھین لیا۔ اور اس وقت سے شاہان پرتگال نے ان جزیروں کو اپنی عمل داری سمجھنا شروع کیا۔ اور حقیقتاً چند روز بعد اُنھیں کے ہو بھی گئے۔

البوکرک نے ۱۵۱۵ء میں بمقام گوا انتقال کیا۔ اور لوپز سوارز اس کا جانشین مقرر ہوا۔ یہ شخص بھی تدابیر ملک گیری اور حدود سلطنت کے بڑھانے میں اپنے جانشین سابق ہی کا مقلد تھا۔ مگر کچھ عرصہ تک اُس کو ان مزاحمتوں کی روک تھام کی تدبیروں میں مصروف رہنا پڑا جو ہندوستان میں پرتگیزوں کے مقابلہ کے لئے قریب الوقوع تھیں لیکن ان تفکرات سے چھوٹتے ہی اُس نے چین کا راستہ معلوم کرنے کا عزم مصمم کیا۔

ملاکا میں البوکرک کے عمل داخل کرنے سے پہلے ملک چین اور وہاں کے لوگوں کے حالات فرنگستان میں کسی کو معلوم نہ تھے کیونکہ فرنگستان سے اب تک صرف مارکو پولو نامی شہر وینس واقع اٹلی کا رہنے والا ایک مشہور سیاح خشکی کے راستہ وہاں گیا تھا اور اُس نے اُس ملک کے کچھ کچھ

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ حالات لکھے تھے جس کو لوگوں نے باور نہ کرکے محض واہیات اور افسانہ سمجھا ہوا تھا۔ مگر جب البوکرک ملاکا میں چین کے بعض جہازی سوداگروں سے ملا۔ اور اُس نے اس عظیم الشان سلطنت کی وسعت وغیرہ کے حالات معلوم کئے اور اُن کو قلمبند کرکے فرنگستان کو بھیجا تب مارکوپولو کے بیان سے مطابق پا کر فرنگستان کے لوگوں نے بھی اس سیاح کی روایتوں کی تصدیق کی۔ چنانچہ ۱۵۱۷ء میں پائے تخت لزبن سے طامس پریز نامی ایک سفیر جس کے ساتھ چند جنگی جہاز تھے چین کو روانہ ہوا۔ جب یہ جہاز سفیر کو لے کر اُن جزیروں کے قریب پہنچے جو کانٹن کے آس پاس ہیں تو اُن کو چینی جہازوں نے آن گھیرا۔ فرڈی نینڈ اینڈ راڈا نے جو پرتگالی جہازوں کا سردار تھا ازراہ دانائی چینیوں کو اپنے جہازوں پر آنے کی اجازت دی۔ اور اپنے آنے کا مدعا بیان کرکے طامس پریز کو کنارہ پر اُتار دیا اور چینی اُس کو اپنے ملک کے پائے تخت شہر پکن میں لے گئے۔ وہاں پہنچ کر پریز کو معلوم ہوا کہ چین کے اہل دربار پرتگیزوں کے ساتھ رعایت اور خاطرداری سے پیش آنا چاہتے ہیں۔ جس کا سبب اول تو اُن کی وہ ناموری تھی جو تمام مشرقی ملکوں میں پہلے ہی پھیل رہی تھی اور اس کے علاوہ فرڈی نینڈ اینڈ راڈا کے معقول طریقہ کارروائی نے پرتگیزوں کو اہل چین کی نظروں میں اور بھی بڑھا دیا تھا۔ اس وجہ سے چین کی بندرگاہوں میں پرتگیزوں کو تجارت کرنے کی اجازت ملنے ہی والی تھی۔ اور طامس پریز کے ساتھ عہدنامہ ہونے ہی والا تھا کہ اتنے میں فرڈی نینڈ راڈا کا بھائی۔ سائمن اینڈ راڈا کچھ اور جنگی جہاز لے کر آ گیا۔ اور اہل چین سے وہی نا ملائم حرکتیں کرنے لگا جو یہ لوگ تمام اہل مشرق کے ساتھ کچھ مدت سے کیا کرتے تھے۔ اور بلا اجازت دربار چین کے ایک قلعہ جزیرہ ٹیمن میں تعمیر کر لیا اور وہاں ہو کر جو جہاز چین کی بندرگاہوں کو آتے جاتے تھے اُن کے ساتھ جبر و تعدی اور لوٹ کھسوٹ کا عمل کرنے لگا اور بہت سے چینیوں کو پکڑ کر غلام بنا لیا اور نہایت بیباکی کے ساتھ دریائی قزاقی اختیار کی۔

اہل چین ان حرکتوں کو دیکھ کر سخت غضبناک ہو گئے۔ اور ایک بڑا بیڑا جنگی جہازوں کا پرتگیزوں کی تنبیہ کے لئے مامور کیا۔ لیکن پرتگیز بغیر مقابلہ کئے بھاگ نکلے۔ اور فغفور چین نے طامس پریز کو جو پائے تخت میں موجود تھا قید کر لیا چنانچہ وہ قید ہی میں مر گیا۔

اس واقعہ کے باعث اگرچہ چند سال کے لئے پرتگیز چین کی حدود سے بالکل خارج ہو گئے تھے۔ مگر اس کے بعد چینیوں نے پرتگیزوں کو بندرگاہ چان سین میں تجارت کرنے کی اجازت دیدی۔ اور بعدازیں یہ اتفاق پیش آیا کہ ایک بحری قزاق جو اپنی متواتر کامیابیوں سے نہایت زبردست ہو گیا تھا۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ : جزیرہ مکاؤ پر قابض ہو گیا۔ اور وہاں سے چین کی بندرگاہوں کے ساتھ بند کردیئے اور یہاں تک بڑھا کر شہر کانٹن کو جا گھیرا۔ اُس کی ان حرکتوں سے شہر خاص کے حکام چین اس قدر تنگ ہوئے کہ پرتگیزوں سے مدد چاہی۔ یہ لوگ اس موقعہ کو غنیمت سمجھ کر کانٹن کے بچانے کے لئے دوڑ پڑے اور اُس قزاق کو شکست دے کر مار مار کر بھگا دیا۔ اس کے صلہ میں فغفور چین نے خوش ہو کر جزیرہ مکاؤ انھیں کو بخش دیا۔ اور ان لوگوں نے اس جزیرہ میں ایک شہر بسا لیا جو تھوڑی سی مدت میں کمائی رونق پکڑ گیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں جاپان کے ساتھ بھی اُن کی تجارت جاری ہو گئی۔ ۱۵۴۲ء میں پرتگیزوں کا ایک جہاز شدت طوفان سے بہہ کر جزایر جاپان میں جا پہنچا تھا۔ جاپانیوں نے ان کی بہت خاطر داری کی اور واپس آنے کے لئے جس جس چیز کی ضرورت تھی بخوشی مہیا کر دی۔ جب یہ لوگ گوا میں پہنچے تو جاپان کے حالات جو کچھ دیکھے تھے سب اپنے نائب السلطنت سے بیان کئے اور کہا کہ ہم ایک ایسا ملک دیکھ آئے ہیں جو نہایت آباد اور دولت مند ہے اور ہمارے تاجروں کو وہاں آنے جانے سے بہت فائدہ ہوگا یہ سنتے ہی پرتگالی سوداگر اور پادری جہاز نقل پر روانہ ہو پڑے اور جا کر دیکھا کہ حقیقت میں ایک بڑی مملکت ہے جو شاید چین کے سوا دنیا کی اور سلطنتوں سے زیادہ قدیم ہے۔

الغرض جب پرتگیز جاپان میں پہنچے تو اُن کے آنے سے سب لوگ خوش ہوتے اور عموماً اپنی بندرگاہوں میں تجارت کی اجازت دیدی۔ اور تمام چھوٹے چھوٹے فرمانروا رئیسوں نے اپنے اپنے علاقوں میں اُنھیں درخواست کر کے بلایا۔ اور سب کو ایک ایسی ریس پیدا ہوتی کہ ہر ایک رئیس یہی چاہتا تھا کہ سب سے بڑھکر اُن کی خاطر و مدارات کرے اور اُن کو فائدہ پہنچائے۔ اور بڑے بڑے حقوق عطا کرنے میں دوسروں سے سبقت لے جائے۔ یہ دیکھکر پرتگیزوں نے بھی تجارت کا بڑا ٹھاٹھ پھیلایا چنانچہ ہندوستان کا مال جاپان کو لے جاتے تھے اور فرنگستانی چیزیں ذخیرہ کے طور پر مکاؤ میں جمع کر کے بموقع مناسب اِدھر اُدھر بھیجتے رہتے تھے۔ چنانچہ انواع و اقسام کی ایشیائی اور فرنگستانی چیزیں فرمانروائے جاپان اور وہاں کے رؤسا اور شرفا اور عام خلایق کے صرف میں آنے لگیں اور جاپان میں تو ایسی جنسیں کہاں تھیں کہ اس کے معاوضہ میں پرتگیزوں کو دیتے کیونکہ جاپان کو اکثر کوہستانی اور سنگلاخ اور کم زراعت ملک ہے اور اُس میں کوئی چیز دساور کے لائق پیدا نہیں ہوتی۔ اور اگر اس ملک میں سونے اور چاندی اور تانبے کی کانیں کبھی نہ ہوتیں جو شاید تمام دنیا کی کانوں سے بہتر ہیں تو ملک کی آمدنی سے سلطنت کا خرچ بھی پورا نہ ہوتا۔ یہاں کی معدنی پیداوار میں سے یہ لوگ ہر سال بقدر چھ کروڑ روپیہ کے حاصل کر کے لے جاتے تھے اس کے علاوہ اُنھوں نے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ ۔ اس ملک کے اچھے اچھے گھرانوں میں شادیاں کرکے اس طرح پر وہاں کے امرا اور ذی اقتدار خاندانوں سے قرابتیں پیدا کرلی تھیں۔ ان فواید کے پیش نظر اگر پرتگیز لوگ ذرا قناعت کا طریق اختیار کرتے تو مناسب تھا۔ کیونکہ اس زمانہ میں سواحل ملک گنی اور بحر عرب اور خلیج فارس اور تمام سواحل ہند صر طرح ان کے قابو میں تھے۔ اور جزائر ملاکا اور سراندیپ اور سماٹرا میں تو خاص ان کی حکومت ہی تھی اور جزیرہ مکاؤ میں ان کے قیام کے باعث سے چین اور جاپان کی تجارت بھی گویا انھیں کے ہاتھوں میں تھی اور ان سب ممالک اور سواحل وسیعہ میں انھیں کی مرضی اور منشا بمنزلہ قانون اور حکم ناطق کے تھا۔ اور کسی قوم کو اتنی جرأت نہ تھی کہ بغیر ان کی اجازت کے بحری سفر کرسکے۔ اور بہت سا اجناس تجارت جن کے ذریعہ سے اکثر قومیں نہایت دولتمند ہو گئی ہیں وہ بالکل انھیں کے اختیار میں تھیں اور اس اختیار اور انحصار تجارت کے باعث سے فرنگستان کی مصنوعات اور ممالک ایشیا کی پیداوار کا نرخ صرف انھیں کی مرضی سے گھٹتا اور بڑھتا تھا۔ علاوہ بریں پرتگیزیوں نے اس حصہ افریقہ کی حکومت کو بھی حاصل کئے بغیر نہ چھوڑا تھا جو کیپ آف گڈ ہوپ اور بحر احمر کے درمیان ہے۔ ان اطراف میں ایک مدت سے اہل عرب قابض اور سکونت پذیر ہوگئے تھے اور انھوں نے ساحل زنگبار پر چھوٹی چھوٹی چند خودسر ریاستیں قائم کرلی تھیں جن کی رونق تمول اُن سونے اور چاندی کی کانوں کے سبب سے تھا جو ان ریاستوں میں موجود تھیں چنانچہ اسی دولت کے لالچ سے پرتگیزوں نے [illegible]ء میں ان کو مغلوب اور تباہ کرکے اپنے لئے ایک نئی سلطنت جو سفالہ سے میلندا تک پھیلی ہوئی تھی اور جس کا وسط اور دارالحکومت جزیرہ موزمبیق کو مقرر کیا تھا قائم کرلی تھی۔ پس یہ کامیابیاں اور فتوحات اگر معقول اصلاحوں سے محفوظ رکھی جاتیں تو ممکن تھا کہ ایسی سلطنت بن جاتی جس کا زوال و انتقال مشکل ہوتا۔ لیکن پرتگیز سرداروں کی بداعمالی اور حماقت اور دولت و حکومت کی ناقدرشناسی کی وجہ سے ان لوگوں کی چال ڈھال شروع ہی سے ایسی بے قید تھی کہ واسکوڈی گاما کابریل دی المیدا وغیرہ نے ایسی عجیب طرح کی بے رحمیاں کیں کہ جن کو شائستگی اور انسانیت کی پیشانی پر ایک کلنک کا ٹیکہ کہنا چاہیے ہندو مسلمان وغیرہ ایشیائی لوگوں کے بے وجہ لوٹ لینے اور غلام بنانے میں کچھ بھی دریغ نہ کرتے تھے سفاکی .... بیدردی اور دہشت یہاں تک ان کے خمیر میں تھی کہ بے گناہ قیدیوں مظلوم عورتوں اور معصوم بچوں کو بھی ان کی تلوار اور آگ سے پناہ نہیں ملی۔ بیچاری ہندوستانی عورتوں سے [illegible] کے اس برتاؤ میں بھی دریغ نہ تھا کہ کرسچن بنا کر فوج میں تقسیم کردی جاتی تھیں۔ چنانچہ خود البوکرک

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ جیسے نامور شخص کے عہد کی رجو حقیقتاً ان کے سرداروں میں سب سے بہتر تھا
کیا ہی لطیف روایت چلی آتی ہے کہ گوا کی آبادی کی تدابیر کے منجملہ ایک دفعہ یہ تدبیر بھی کی گئی
کہ بہت سی عورتیں اچھے برے خاندانوں کی جو بندی میں آئی تھیں اُن کی نسبت پادری صاحب
کو یہ خدمت سپرد ہوئی کہ کر سچن بنا کر پرتگیزوں سے اُن کے جوڑے ملا دیں۔ چونکہ پادری صاحب
کو جوڑے ملاتے ملاتے رات ہوگئی اور عین اتفاق سے روشنی بھی بجھ گئی تو ہجوم اجنبیت کے
باعث سے یہ تمیز نہ رہی کہ کونسی عورت کس مرد کے نکاح میں آچکی ہے پہلے تو پادری صاحب
اس مسئلہ کے حل کرنے میں چکرائے مگر آخرکار یہ فیصلہ کر دیا کہ اس دردسر میں پڑنے کی کون ضرورت
ہے جو عورت جس مرد کے ہاتھ لگ جائے وہ اُس کی سمجھی جائے! اور چونکہ یہ لوگ مشرقی سمندروں
کے بالکل مالک و مختار تھے ہر ایک ملک کے جہازوں سے جبراً خراج لیتے اور سواحل بھر پر غارت
گری کرتے تھے۔ اور امرا اور رئیسوں کو بے عزت کرتے تھے۔ آخر انھیں کرتوتوں کے باعث تھوڑے
ہی عرصہ میں تمام قوموں کی نظروں میں کھٹکنے اور دشمن شمار ہونے لگے اور جس وقت شاہ فلپ
دویم کے عہد میں اس قوم کی حکومت کا تنزل یورپ میں شروع ہوا تو جو پرتگیز ہندوستان میں
تھے انھوں نے اپنے پرتگال جانے کا خیال چھوڑ دیا۔ چنانچہ بعض تو خودسر بن بیٹھے اور بعض نے
دریائی غارتگری ایسی بے دھڑک اختیار کرلی کہ کسی قوم کے جہاز کا بھی لحاظ نہ کرتے تھے۔ اور بہت سے پرتگیز
ہندوستانی راجاؤں اور امیروں کے ملازم ہوگئے یہاں تک کہ اکثر سپہ سالاری اور وزارت تک پہنچ گئے۔ کیونکہ
اب تک بھی ان کی قابلیت اور لیاقتوں کا اثر لوگوں کے ذہنوں پر باقی تھا۔ اور ہندوستان میں جو علاقے
ان کے مقبوضہ تھے وہ ایسے علیحدہ علیحدہ حصوں میں منقسم ہوگئے کہ ایک کو دوسرا بالکل مدد نہ دیتا تھا بلکہ حسد اور
عداوت کے مارے ایک دوسرے کی تدبیروں میں مزاحم اور معترض ہوتے تھے۔ اور یہاں تک نوبت پہنچ گئی
تھی کہ ان کے سرداروں اور فوج میں آئین اور قاعدہ کی کوئی پابندی باقی رہی تھی اور نہ اطاعت اور
فرماں پذیری اور نہ شوق حصول نام و ننگ بلکہ بجائے ان باتوں کے اکثر عیش و عشرت اور فسق و فجور میں منہمک اور
مستغرق رہ کر تضیع اوقات کرتے تھے۔ اور اگلی شان و شوکت بالکل رخصت ہو چکی تھی کہ اتنے میں ڈچ لوگ
جب سنہ ۱۶۰۰ء میں سپین کی حکومت سے آزاد ہوتے تو وہ بھی ہندوستان پہنچے۔ اور پرتگیزوں سے ان کی
حکومت چھین لینے کے لئے جنگ و جدال اور معرکہ آرائیاں کرنے لگے یہاں تک کہ جزیرہ لنکا بھی
چھین لیا۔ اور ہندوستان کی تجارت اور بندرگاہوں میں سب جگہ انھیں کا زور اور غلب
ہوگیا۔ فقط

ح م س

جلد دوم

ڈاکٹر برنیئر کے خطوط کا مجموعہ

برنیئر کے خطوط مانشیور ڈی مرویلیس کے نام

(جو اورنگ زیب کے کشمیر کے سفر سے متعلق ہیں)

پہلا خط:- از دہلی

مورخہ ۱۴ دسمبر ۱۶۶۴ء

اورنگ زیب کی کشمیر کو روانگی

صاحب من جب سے اورنگ زیب کا مزاج مائل بہ صحت ہوا ہے اُسی وقت سے یہ خبر برابر مشہور ہو رہی تھی کہ بادشاہ بغرض تبدیل آب و ہوا اور آئندہ گرمی سے بچنے کے لئے جس کے باعث مرض کے لوٹ آنے کا اندیشہ تھا لاہور اور کشمیر کی سیر کا ارادہ کئے ہوئے ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ بہت سے معاملہ فہم اشخاص کو اس بات کا یقین کرنے میں تامل تھا کہ جس حالت میں کہ اُس کا باپ آگرہ کے قلعہ میں مقید ہے وہ ایسا دور و دراز سفر کرنے کی جرأت کس طرح کرے گا۔

لیکن حفظ صحت کا خیال مصالح سلطنت پر غالب آیا۔ اور زیادہ تر روشن آرا بیگم کی ترغیب و تحریص اس کا باعث ہوئی جو بہت دنوں سے اس امر کی آرزومند تھی کہ شہزادہ محلات

ل بعض فرانسیسی نام جو اس کتاب میں ہیں معلوم نہیں کہ خاص اُن کے لب و لہجہ کے موافق اُن کا صحیح تلفظ کیا ہے اگرچہ یہ دقت انگریزی میں بھی ہے کہ جن حروف سے کسی لفظ کو لکھتے ہیں اُس کا تلفظ اکثر ان حروف کی مقررہ آوازوں کے مطابق نہیں ہوتا۔ مگر یہ دقت فرانسیسی الفاظ و اسماء کی تہجی میں اور بھی زیادہ ہے اور خاص اہل زبان سے سنے بغیر تصحیح ناممکن ہے۔ س-م-ح

م-ن-تی ی ود وی-م مسعل س

ہے باہر زیادہ صاف اور خوش گوار ہوا سے تفریح حاصل کرے اور اپنے اس اقتدار کے زمانہ میں شان دار گروفر سے فوج کے ساتھ جائے جس طرح کہ اس کی بہن بیگم صاحب شاہجہاں کے عہد میں گئی تھی۔

دہلی سے لاہور الغرض بادشاہ نے اس مہینہ (دسمبر ۱۶۶۴ء) کی چھٹی تاریخ تین بجے دن کو کہ یہ مبارک ساعت (مہورت) جوتشیوں نے اس لمبے سفر کے واسطے تجویز کی تھی۔ کوچ کیا اور شالامار باغ میں جو پائے تخت سے چھ میل کے فاصلہ پر ہے جا کر قیام فرمایا اور وہاں چھ روز کامل اس غرض سے توقف فرمایا کہ اس لمبے سفر کے سازوسامان کے لئے جو ڈیڑھ برس میں ختم ہونے والا ہے لوگوں کو فرصت اور مہلت مل جائے۔ آج ہمارے سننے میں آیا ہے کہ بادشاہ نے حکم دیا ہے کہ شاہی سراپردے لاہور کی سڑک پر لگائے جائیں نیز یہ کہ دو مقام کرنے کے بعد پھر کوچ ہیں اور زیادہ توقف نہ ہوگا۔

سفر کشمیر میں فوج کی تعداد اس سفر میں بادشاہ کے ساتھ صرف وہی پینتیس ہزار سوار نہیں ہیں جو بطور قاعدہ مقررہ ہمیشہ اس کے ہمرکاب رہتے ہیں اور نہ صرف وہ معمولی پیادہ سپاہ جو دس ہزار سے زیادہ ساتھ رہا کرتی ہے بلکہ بھاری توپ خانہ اور ہمرکاب توپ خانہ بھی ساتھ ہے۔

توپ خانہ اس توپ خانہ کو ہمرکاب توپ خانہ اس واسطے کہتے ہیں کہ وہ بادشاہ کی ذات خاص سے کبھی جدا نہیں ہو سکتا کیونکہ بھاری توپ خانہ وقت بے وقت راہ کے نشیب و فراز وغیرہ کے باعث رکاب شاہی سے علیحدہ ہو کر پیچھے پیچھے بہ سہولت آتا ہے۔

بھاری توپ خانہ میں ستر توپیں ہوتی ہیں۔ جن میں زیادہ پیتل کی ہیں اور اکثر ایسی بھاری ہیں کہ بیلوں کی بیس بیس جوڑیوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور بعض تو ایسی بھاری ہیں کہ جب راہ ناہموار ہو یا کہ چڑھائی کا موقعہ ہو تو بیلوں کی مدد کے لئے ہاتھی درکار ہوتے ہیں تاکہ توپ کے تخت اور پہیوں کو اپنے سر اور سونڈ سے ڈھکیلیں۔

ہمرکاب توپ خانہ میں پچاس یا ساٹھ میدانی چھوٹی توپیں ہوتی ہیں اور سب پیتل کی ہیں اور ہر ایک توپ ایک چھوٹے سے خوبصورت اور خوش رنگ تخت پر چڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ جس پر زینت کے لئے چند سرخ جھنڈیاں لگا دیتے ہیں چنانچہ اس کا ذکر میں نے کسی اور مقام پر

بھی کیا ہے۔ ہر توپ کو دو خوبصورت گھوڑے کھینچتے ہیں۔ جن کو ایک گولہ انداز ہانکتا ہے۔ اور ہر ایک جوڑی کے ساتھ ایک تیسرا گھوڑا کوتل ہوتا ہے جس کو ایک اور سپاہی لے کر چلتا ہے۔ یہ میدانی توپیں بہت تیز ہانکی جاتی ہیں تاکہ بارگاہ شاہی کے سامنے قائم کی جائیں اور اتنی پہلے پہنچ جائیں کہ بادشاہ کے لشکرگاہ میں پہنچتے ہی سلامی دے سکیں۔

قندھار پر فوج کشی کی افواہ یہ بادشاہی لشکر اور ہم رکاب فوج ایسی بڑی اور کثیر التعداد ہے۔ جس سے لوگوں کو یہ شبہ ہو گیا ہے کہ ہم کشمیر جانے کی جگہ قندھار کے محاصرہ کے واسطے جا رہے ہیں۔ جو حدود ایران اور ہندوستان اور ملک ازبک کے مابین ایک نہایت اہم مقام ہے۔ قندھار ایک خوش نما اور زرخیز ملک کا دارالحکومت اور بڑی آمدنی کی جگہ ہے اور اس وجہ سے اس پر قبضہ کرنے کے لئے بادشاہان ایران اور ہندوستان کے باہم بڑے بڑے سخت معرکے اور محاربے ہمیشہ وقوع میں آتے رہے ہیں۔ اس عظیم الشان فوج کے کوچ کا اصل میں خواہ کچھ ہی منشا اور مقصد ہو مگر ہر ایک متنفس کو جو اس سے تعلق رکھتا ہے۔ اب دہلی سے روانہ ہونے میں جلدی کرنا ضروری ہو گیا ہے خواہ کتنے ہی اہم معاملات ہوں۔ اب مزید توقف کی گنجائش نہیں۔ اگر میں اپنی روانگی میں دیر لگاؤں تو لشکر میں شامل ہونا میرے لئے مشکل ہو جائے گا۔

نواب دانشمند خاں کا علمی ذوق علاوہ بریں ہمارے نواب دانشمند خاں کو میرا شدید انتظار ہو گا۔ کیونکہ ہمارے آقا کو جو امور ممالک غیر کا وزیر اور سواروں کی فوج کا میر بخشی ہے اپنے منصب کے اہم کاموں سے صبح کے وقت تو فرصت نہیں ملتی اس وجہ سے وہ اپنے سہ پہر کے وقت کو جو کتب حکمیہ کے مطالعہ کے لئے مختص کئے ہوئے ہے۔ ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ اس کو علم ہیئت اور جغرافیہ اور تشریح کا خاص شوق ہے۔ اور وہ گیسنڈی[1] اور ڈس کارٹس[2] کی تصانیف کو بڑے شوق سے پڑھتا ہے۔

سفر کی تیاری پس اپنے ذاتی امور کا بندوبست کر لینے کے بعد میں آج رات کو ہی روانہ ہو جاؤں گا اور چلنے سے پہلے مجھے اس قدر اسباب و سامان درست کر لینا چاہئے جس قدر کہ رسالہ کے ایک باعزت عہدہ دار کو درکار ہے۔ کیونکہ میری تنخواہ تین سو

---

[1] گ ی س ی ان ڈ ے

[2] ڈ س ک ار ٹ س

روپیہ ماہوار ہے اور اس لئے ضروری ہے کہ دو اچھے ترکی گھوڑے معہ ایک سائیس کے میرے پاس ہوں۔ اور ایک مضبوط ایرانی اونٹ بھی معہ ایک شتربان کے ساتھ ہونا چاہیئے اور ایک باورچی اور ایک خدمت گار ہونا چاہیئے جو ملک کے دستور کے موافق پانی کی صراحی لے کر گھوڑے کے آگے آگے چلتا ہے میں نے ضروری اور آرام کی اور بھی سب چیزیں تیار کر لی ہیں۔ مثلاً ایک درمیانہ خیمہ ایک قالین اور ایک ہلکی سفری چارپائی جو چار ہلکے اور مضبوط بانسوں سے بنتی ہے اور ایک تکیہ اور دو لحاف جن میں سے ایک کو دوہرا کر کے توشک کا کام لیا جاتا ہے۔ اور ایک گول چرمی دسترخوان کھانا کھانے کے لئے اور چند رنگین رومال اور تین چھوٹے تھیلے باورچی خانہ کے ظروف اور گلی ظروف وغیرہ کے واسطے یہ سب ایک بڑے تھیلے میں رکھے جاتے ہیں اور یہ بڑا تھیلا پھر ایک ٹاٹ کے بڑے سے شلیتہ میں جس کے دو حصے ہوتے ہیں اور جس میں تسمے لگے ہوئے ہوتے ہیں باندھا جاتا ہے۔ علاوہ بریں شلیتہ میں آٹا دال وغیرہ کھانے کی چیزیں آقا اور ملازموں کے بستر اور کپڑوں وغیرہ کے ساتھ رکھی جاتی ہیں میں نے احتیاطاً پانچ چھ روز کے خرچ کے موافق کچھ عمدہ چاول اور کچھ میٹھے بسکٹ بھی جن کو چاشنی اور لیموں کے عرق سے خوش ذائقہ بنایا گیا ہے رکھ لئے ہیں اس کے علاوہ باریک کپڑے کی ایک تھیلی ایک آہنی قلابے کے ساتھ جس میں لٹکا کر دہی کو چھانا جاتا ہے۔ میں نے یاد کر کے ساتھ رکھ لی ہے۔ کیونکہ اس ملک میں لیموں کا شربت اور دہی نہایت مفرح چیز ہے۔ یہ سب چیزیں جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا ہے ایک بڑے شلیتہ میں باندھ دی گئی ہیں جو حسب معمول ایسا بے ڈھنگا پھیلا ہوا ہے کہ اُسے تین چار آدمی مشکل سے اونٹ پر لاد سکتے ہیں حالانکہ اونٹ شلیتہ کے نہایت قریب بیٹھا ہوا ہوتا ہے اور لادنے والوں کو صرف اتنا ہی کرنا ہوتا ہے کہ شلیتہ کا ایک سرا زمین سے اُٹھا کر اونٹ کی پیٹھ پر اُلٹ دیں۔ ایسے لمبے سفر کو اگر آرام دہ بنانا ہو تو مذکورہ بالا اشیاء میں سے ایک بھی فالتو نہیں ہے۔ کیونکہ ایسے ملک میں ہم کو فرانس کے جیسے انؔ[1] (یعنی مسافر خانوں) اور آرام و آسائش کا سامان مل جانے کی امید نہیں ہے اور ہماری مہمان سرا صرف ہمارا وہی ڈیرہ ہے جس کو عرب اور تاتاریوں کی طرح ہم کو ایک منزل سے اکھاڑ کر اور دوسری منزل پر لے جا کر روزمرہ لگانا چاہیئے۔ اور ہم اپنی حاجت روائی لوٹ کھسوٹ سے کبھی نہیں

---

[1] سرائے

کر سکتے ہیں کیونکہ ہندوستان میں ایک ایک بالشت زمین خالصہ شریفہ سمجھی جاتی ہے علاوہ رعیت پر دست درازی اور تعدی کرنا گویا بادشاہ کے مال میں دست اندازی کرنا ہے۔

دہلی کی روٹی اور پانی

اس طویل سفر کے اختیار کرنے میں میرے دل کو صرف اتنی ہی خوشی ہے کہ ایک تو ہم شمال کی طرف کوچ کر رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ بارشیں ہو چکی ہیں اور اب موسم سرما کا آغاز ہے اور فی الحقیقت ہندوستان میں سفر کے لئے یہی موسم مناسب ہے کیونکہ جاڑے کے شروع میں بارش بھی ہو چکتی ہے اور گرمی اور گرد بھی ایسی نہیں۔ حتی کہ جس کی برداشت نہ ہو سکے۔ اور میں اس خیال سے بھی خوش ہوں کہ اب مجھکو دہلی کے بازار کی روٹی کھانے کی آفت نہ اٹھانی پڑے گی جو اکثر خراب پکائی جاتی ہے اور گرد و غبار سے صاف نہیں ہوتی اور اب یہ بھی امید ہے کہ پینے کا پانی بھی دہلی سے بہتر ملے گا جس کا میلا پن مجھ سے بیان نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ہر انسان و حیوان بے دھڑک لب آب پہنچ جاتے۔ اور پانی کو انواع و اقسام کے میل کچیل کا مخزن بنائے رکھتے ہیں۔ اس پانی سے ایسے بخار ہو جاتے ہیں کہ ان کا علاج مشکل ہوتا ہے۔ اور پنڈلی میں کیڑے یعنی نارو پیدا ہو جاتے ہیں جن میں بڑی سخت سوزش اور ورم ہوتا ہے۔ اگر مریض دہلی سے کہیں چلا جائے تو یہ کیڑے جلد دفع ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ کبھی ایک برس اور کبھی اس سے بھی زیادہ عرصہ تک تکلیف دیتے ہیں۔ یہ کیڑے اکثر عرض و طول میں چکارے کے تارے تانت کے موافق ہوتے ہیں اور جن پر بے تکلف نس یا پٹھے کا دھوکا ہوتا ہے۔ ان کے نکلنے میں بڑی احتیاط کرنی چاہیے تاکہ ٹوٹ نہ جائیں اور ان کے نکالنے کی سب سے بہتر تدبیر یہ ہے کہ ایک تنکے پر لپیٹ کر روزمرہ آہستہ آہستہ اور تھوڑا تھوڑا نکالا جائے۔

میرے لئے یہ بات نہایت اطمینان کی ہے کہ میں اس قسم کی بے آرامیوں اور خطروں سے محفوظ رہوں گا کیونکہ ہمارے نواب نے نہایت مہربانی سے حکم دیا ہے کہ ایک تازہ خانہ ساز روٹی اور گنگا کے پانی کی ایک صراحی ہر روز صبح کے وقت مجھے عنایت ہوا کرے کیونکہ اور امرائے دربار کی طرح ہمارے نواب نے بھی اپنے ساتھ گنگا جل کے بہت سے اونٹ لدوا لئے ہیں

پانی ٹھنڈا رکھنے کی ترکیب

پانی کی صراحی ایک ٹین[1] کا برتن ہے جس پر سرخ کپڑا منڈھا ہوا ہوتا ہے اور اس کو ایک خدمت گار ہاتھ میں لے کر اپنے

[1] اصل کتاب میں بجائے جست کے ٹین لکھا ہے۔ س م ع

آقا کے گھوڑے کے آگے آگے چلتا ہے اُس میں عموماً ایک سیر پانی آتا ہے۔ لیکن میں نے اپنی صراحی قصداً دو سیر کی بنوائی ہے اور مجھے اُمید ہے کہ یہ تدبیر میرے لئے بہت مفید ہوگی اس صراحی میں پانی خوب ٹھنڈا رہتا ہے۔ بشرطیکہ وہ کپڑا جو اس پر منڈھا ہوا ہوتا ہے تر ہے اور صراحی بردار اُسے ہلا ہلا کر ہوا دیتا رہے۔ یا اُسے ہوادار جگہ میں جیسا کہ یہاں عموماً معمول ہے زمین سے اونچی ایک تپائی پر رکھا جائے تاکہ زمین کی گرمی صراحی کو نہ لگے پس کپڑے کی نمی اور ہوا میں ہلانا یا ہوا میں رکھنا پانی ٹھنڈا رہنے کے واسطے نہایت ضروری ہے۔ کپڑے کی یہ نمی اُن چھوٹے چھوٹے آتشی اجزاء (فائری[1] پارٹیکلز) کو جو ہوا میں ہوتے ہیں اور جن سے پانی گرم ہو جاتا ہے صراحی کے اندر داخل ہونے سے روک لیتی ہے۔ نیز اُن شورہ والے اجزاء (نائٹرس[2] پارٹیکلز) اور دوسرے اجزا کو جو اس کپڑے اور ظرف کے اندر سرایت کر کے پانی میں خنکی پیدا کر دیتے ہیں نہیں روکتی جس طرح شیشے میں سے روشنی تو اندر آ جاتی ہے مگر پانی نہیں آ سکتا اور یہ امر شیشہ کی بناوٹ اور اُس کے اجزا کی خاصیت اور اس فرق کی وجہ سے ہے جو پانی اور روشنی کی لطافت میں[3] ہے۔

یہ صراحی سفر میں کام آتی ہے۔ لیکن جب ہم لوگ مکان پر ہوتے ہیں تو پانی کو مٹی کے مٹکوں میں جو مسام دار مٹی سے بنائے جاتے ہیں رکھتے ہیں اور اُن پر تر کپڑا لپیٹتے ہیں اور اگر

---

[1] ف اء ری پ ارٹ ی ک ل

[2] ن اء ٹ رس پ ارٹ ی ک ل

[3] جب کوئی سیال جسم مثلاً پانی مٹی کے ایک ایسے برتن میں بھرا جائے جس پر کابخ پھرایا ہوا نہ ہو تو پانی کے اجزا برتن کے مسامات میں سے بھاپ بن کر اُڑ جاتے ہیں اور اس بھاپ کے ساتھ بہت سی حرارت بھی جو پانی میں جذب رہتی ہے نکل جاتی ہے تو اس برتن میں پانی بے شک ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اسی طرح جم بھی سکتا ہے اور یہ تاثیر اس وقت اور بھی زیادہ پیدا ہو جاتی ہے جب کہ برتن کو دھوپ میں رکھا جائے اور اُس کے باہر کے سطح کو جس سے بھاپ خارج ہوتی رہتی ہے ہر طرف سے برابر تر کپڑا لپیٹا جائے۔ اگلے زمانہ کے علم کیمیا کے علما کا یہ قیاس تھا کہ کوئی نہایت لطیف شے جس کے انھوں نے مختلف نام رکھے ہوئے تھے اس عمل کے وقت برتن کے مسامات سے خارج ہوتی ہے اور زمانہ حال کے علماء اس شے کو کیلورک[1] یعنی جوہر حرارت کہتے ہیں ۱۲ مترجم انگریزی۔

---

[1] ک ےل ورک [2] ن ارٹ رس پ اٹ ی ک ل

یہ مٹکے ہوا میں رکھے جائیں تو ان کا پانی اُن صراحیوں سے زیادہ خنک ہوتا ہے۔

بڑے اُمرا خواہ شہر میں ہوں خواہ لشکر میں شورہ استعمال کرتے ہیں اور اُس کی ترکیب یہ ہے کہ یہ پانی یا جس چیز کو سرد کرنا مقصود ہو جست کی صراحی میں جس کی گردن لمبی اور پیٹ گول انگریزی بوتل کا سا ہوتا ہے ڈال کر اُس کو سات یا آٹھ منٹ تک اُس پانی میں ہلاتے ہیں جس میں تین چار مٹھی شورہ ڈالا ہوا ہوتا ہے۔ اس عمل سے صراحی کے اندر کی چیز نہایت سرد ہو جاتی ہے۔ میرا پہلے یہ خیال تھا کہ اس طرح ٹھنڈی کی ہوئی چیز مضر نہیں ہوتی ہے۔ لیکن معلوم ہوا کہ کبھی کبھی تلیّن کا اثر کرتی ہے۔

شاہم سفر سر پہ کھڑی ہوئی ہے۔ اور اس ملک کی جلتی دھوپ میں جو کسی موسم میں بھی اذیت سے خالی نہیں۔ روز مرہ چلنا پڑے گا اور ہر روز اسباب لادنا اور اُتارنا پڑے گا۔ اور نوکروں کے پیچھے سر کھپانا ہوگا۔ کبھی خیمہ لگانا اور کبھی اکھاڑنا ہوگا۔ کبھی رات کو اور کبھی دن کو کوچ کرنا پڑے گا خصوصاً حکم شاہی کے مطابق ڈیڑھ برس تک ایسی بے ٹھکانہ اور خانہ بدوشی کی گذران کرنی پڑے گی۔ بجائے اس کے کہ میں ان پریشان کن باتوں پر توجہ کرتا آخر یہ علمی جھگڑے کیوں لے بیٹھا۔

اچھا دوست خدا حافظ! میں اپنا وعدہ پورا کروں گا اور آپ کو اپنے حالات کی وقتاً فوقتاً اطلاع دیتا رہوں گا۔ اور چونکہ فوج اس موقعہ پر آہستہ آہستہ کوچ کرے گی کیونکہ کچھ اضطراب اور کسی دشمن کی فکر تو ہے ہی نہیں بلکہ ایک بڑی دھوم دھام اور شان و شوکت سے جیسا کہ بادشاہانِ ہند کا معمول ہے کوچ ہوں گے اس لئے میں سب دلچسپ واقعات لکھتا رہوں گا تاکہ لاہور پہنچتے ہی آپ کی خدمت میں بھیجوں۔

دوسرا خط

از لاہور

۲۵ر فروری ۱۶۶۳ء

جمنا کے کنارے ایک خوش گوار سفر

صاحب من! یہ شاندار کوچ فی الواقع آہستہ اور نہایت ہی دلچسپ ہے۔ جس سے ہم یہاں اعلیٰحضرت کا سفر کہتے ہیں۔ لاہور دہلی سے قریب سوا سو کوس[1] یا پندرہ منزل ہے۔ مگر ہم کو لاہور پہنچنے میں قریب دو مہینے لگے۔ یوں ہوا کہ بادشاہ نے فوج کا ایک بڑا حصہ ساتھ لے کر شارع عام

---

[1] یعنی تین سو پچتر (۳۷۵) میل ہے۔ س م ح

سے علیحدہ راستہ اختیار کیا تھا تاکہ شکار کے عمدہ مواقع ہاتھ آئیں اور دریائے جمنا کا پانی آسانی سے ملتا رہے۔ چنانچہ ہم اِن دونوں باتوں کی خاطر معمولی شارع عام سے دائیں طرف کو روانہ ہوئے اور جس طرح بادشاہ نے بہ لحاظ آرام و آسائش مناسب خیال کیا آہستہ آہستہ دریائے جمنا کے کنارے کوچ ہوتا رہا اور ایسی لمبی لمبی گھاس میں جس میں سوار بھی نظر نہ آتے تھے بندوق کا اور سب قسم کے شکاری جانوروں کا شکار ہوتا رہا اور ہر طرح کا شکار بکثرت ملا۔ اب ہم ایک عمدہ شہر میں بڑے آرام سے ٹھہرے ہوئے ہیں اور میرے لئے ان فرصت کے اوقات میں اس سے بہتر اور کوئی شغل نہیں ہے کہ وہ گوناگوں حالات جن کی طرف میں دہلی چھوڑنے کے وقت سے برابر متوجہ رہا ہوں، قلمبند کروں۔ مجھے اُمید ہے کہ میں بہت جلد آپ کو کشمیر کی سیر کراؤں گا اور آپ کو ایک ایسا ملک دکھاؤں گا جو دنیا میں ایک نہایت خوش نما قطعہ[1] ہے۔

---

[1] اس مضمون کی مزید تشریح کی خاطر اس سفر کا حال عالمگیرنامہ سے بطور انتخاب نقل کیا جاتا ہے اِس میں لکھا ہے کہ بادشاہ کشمیر کی سیر بھی کرنا چاہتا تھا اور بعض مصالح ملک داری کے لحاظ سے بھی پنجاب کا جانا ضروری تھا۔ اس لئے غرہ جمادی الاول ۱۰۷۴ھ کو کہ اس کے جلوس کا سال پنجم اور "روز جشن وزن مقدس" یعنی تل دان کا دن بہ تقریب سال گرہ آغاز سال چہل و نہم بحساب شمسی اور روز شروع سال چہل و ششم بحساب قمری تھا دارالخلافہ شاہجہان آباد سے خیمہ جات شاہی باغ اعزآباد میں ـــ (جس کو اس کتاب کے مصنف یعنی برنیر نے شالامار لکھا ہے) نصب ہوئے اور ساتویں ماہ جمادی الاول کو مطابق ۲۰ ماہ آذر فارسی ساعت مقررہ یعنی مہورت کے موافق حضرت شاہ شریعت پناہ نے سوار ہوکر باغ مذکور میں ڈیرہ کیا۔ گیارھویں کو یہاں سے کوچ کرکے چند روز اُن شکار گاہوں میں جو وہاں سے قریب تھیں بسر کئے اور پھر قصبہ سونی پت یعنی سنپت کی راہ سے ۲۰ کو کرنال پہنچا۔ یہاں سے فاضل خان میر سامان کو لشکر اور زائد اسباب کے ساتھ سیدھا لاہور کو روانہ کر دیا گیا اور بادشاہ معمولی شاہراہ چھوڑ کر مخلص پور کی سیر و شکار کو چلے گئے اور وہاں سے شکار کھیلتے ہوئے پانچویں جمادی الآخر کو قصبہ خضرآباد میں (جو جمنا کے دائیں کنارے فی زمانہ ضلع انبالہ تحصیل جگادھری سے متعلق ہے) دریا کے اس پار آپہنچے اور نواحی خضرآباد کے شکار کے بعد گیارھویں تاریخ کو انبالہ میں ڈیرہ کیا۔ پندرھویں کو سرہند اُنیس کو لدھیانہ پہنچے دریائے ستلج پر پہلے سے کشتیوں کا پل بندھ چکا تھا۔ اس لئے دوسرے دن پھلور ڈیرہ ہوا۔ چونکہ بادشاہی "قراولوں" یعنی میر شکاروں نے پھلور کے نزدیک کے جنگلوں میں دو شیر دیکھے تھے اس لئے

جب کبھی بادشاہ بڑے لاؤ لشکر کے ساتھ سفر کرتا ہے تو اس کے ذاتی آرام و آسائش کے لئے خیموں ڈیروں وغیرہ کا دوہرا سامان ہمراہ ہوتا ہے چنانچہ ان میں سے ایک پورا سامان ہمیشہ ایک دن آگے جاتا ہے تاکہ بادشاہ کو منزل پر پہنچتے ہی سب طرح سے سجا سجایا اور تیار ملے اور اسی واسطے اس کو پیش خانہ (پیش خیمہ) کہتے ہیں یہ دونوں پیش خانے قریب قریب ایک ہی سے ہیں۔ اور ایک پیش خانے کے اٹھانے کے واسطے ساٹھ ستر ہاتھی دو سو اونٹ سو خچر اور سو حمال درکار ہوتے ہیں۔ بھاری اسباب تو ہاتھیوں پر لادا جاتا ہے جیسے بڑے بڑے ڈیرے اور اُن کی بھاری بھاری چوبیں درازی اور وزن کی وجہ سے تین ٹکڑوں میں ہوتی ہیں۔ اور چھوٹے ڈیرے اونٹوں پر لادے جاتے ہیں۔ اور باورچی خانہ کا سامان خچروں پر اور ہلکی اور زیادہ قیمتی چیزیں حمال لے جاتے ہیں۔ جیسے چینی کے برتن جو بادشاہی دسترخوان پر لگائے جاتے ہیں۔ روغنی یا ملمع کئے ہوئے پایوں والے اور وہ قیمتی خرگاہ (سراپردہ) جس کا ذکر ہم بعد ازیں کریں گے۔

سراپردۂ شاہی پیش خانے کے منزل پر پہنچتے ہی میر ساماں ایک عمدہ موقعہ خیام شاہی کے واسطے تجویز اور انتخاب کرتا ہے اور کمال توجہ کے ساتھ

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ بادشاہ سوار ہوئے اور دونوں کو بندوق سے شکار کیا۔ اس کے بعد چھبیس[۲۶] کو نواحی تلونڈی میں ڈیرہ کیا (وہ تکلیف اور سرگردانی جو شیر کے شکار میں کل اہل لشکر کو اس سفر میں اٹھانی پڑی تھی اور جس کا ذکر ڈاکٹر برنیر نے آگے بہت تفصیل سے لکھا ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہی جگہ مابین پھلور اور تلونڈی کے تھی) بعد ازیں دریائے "بیاہ" یعنی بیاس کو بعضوں نے کشتی کے ذریعہ اور بعضوں نے پایاب عبور کیا اور فتح آباد میں مقام ہوا اور دوسری رجب کو لاہور پہنچ کر باغ فیض بخش میں (جو شاہجہاں کے وقت میں شالامار کشمیر کی طرز پر تعمیر ہوا تھا اور جسے ہمارے زمانہ میں عموماً شالامار کہتے ہیں) ڈیرہ کیا اور چونکہ شہر اور قلعہ لاہور میں داخلہ کی ساعت دسویں رجب غرہ اسفندیار ماہ فارسی وقت دوپہر سے پہلے نہیں تھی اس لیے تاریخ مقررہ تک اس باغ میں بدستور مقام رہا۔ واضح ہو کہ جمنا کی وہ نہر جو اس دریا کے بائیں کنارے سے دہلی کو گئی ہے اور جس کو نہر جمن شرقی کہتے ہیں۔ شاہجہاں نے اس کے سرے پر نہایت عمدہ عمارتیں عالی تعمیل کیں اور اس جگہ کو اس وقت مخلص پور کہتے تھے فی زمانہ مخلص پور کوئی بستی نہیں ہے۔ البتہ کچھ کھنڈر جن کو لوگ بادشاہی محل کہتے ہیں مابین فیض آباد موضع کھارا کہ جن کے باہم تخمیناً چار میل کا فاصلہ ہے اور جہاں اگلے زمانہ میں اس نہر کا سرا واقع ہے اُن عمارتوں کی یادگار ہیں۔ فیض آباد ضلع سہارنپور کے مضافات میں خضرآباد کے محاذی جمنا پار ایک مختصر سا قصبہ ہے س۔م۔ح

حتی الامکان اس کی کوشش کرتا ہے کہ تمام لشکرگاہ ترتیب اور قرینہ کے ساتھ ہو اور ایک مربع قطعہ جس کی چاروں حدود تین تین سو معمولی قدم کی تعداد سے زیادہ ہوتی ہیں داغ بیل لگا کر محدود کر دیا جاتا ہے اور سو بیل دار فوراً اس کو صاف و ہموار کر کے اس کی سطح کو چبوترے کے طور پر ذرا بلند کر دیتے ہیں۔ پھر اس کے گرداگرد قناتیں جن کی بلندی سات یا آٹھ فرانسیسی فٹ کے برابر ہوتی ہے گھیر دی جاتی ہیں جن کے کھڑے کرنے کی ترکیب یہ ہے کہ میخیں گاڑ کر ان کی رسیوں کو ان سے باندھ دیا جاتا ہے اور ہر دس قدم کے فاصلہ پر دو دو چوبیں جن کے نیچے کے سرے زمین پر جمے ہوتے ہوتے ہیں تھامنے کے واسطے دونوں طرف اس طور پر کھڑی کی جاتی ہیں کہ ایک چوب دوسری کے سہارے ہوتی ہے۔ یہ قناتیں ایک مضبوط کپڑے کی بنائی جاتی ہیں اور اس پر ہندوستانی چھینٹ سے نقش و نگار اور پھول وغیرہ بنائے ہوتے ہیں۔

بادشاہی ڈیوڑھی جو اس مربع قطعہ کے ایک ضلع کے عین وسط میں رکھی جاتی ہے وسیع اور مکلف ہوتی ہے اور اس کی قناتوں کے اندر نقش و نگار بہ نسبت ان قناتوں کے جن سے اس قطعہ کی باقی حدود گھیری جاتی میں زیادہ خوش نما اور خوبصورت اور قیمتی ہوتے ہیں۔

وہ پہلا اور سب سے بڑا ڈیرہ جو خیام شاہی میں لگایا جاتا ہے اس کو عام و خاص کہتے ہیں یہ جہاں بادشاہ اور امرا نو بجے صبح جمع ہو کر امور سلطنت پر غور اور انصاف و عدالت کیا کرتے ہیں۔ ہندوستان کے بادشاہ خواہ تخت گاہ میں ہوں خواہ سفر میں روزمرہ دو دفعہ دربار کرتے ہیں جس میں کبھی ناغہ نہیں ہوتا اور یہ دستور ایک فرض واجب اور منجملہ آئین سلطنت سمجھا جاتا ہے جس کی بجا آوری میں بہت ہی کم فروگذاشت ہوتی ہے۔

دوسرا ڈیرہ جو ذرا چھوٹا اور اندر کی طرف کو کچھ بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ اس کو غسل خانہ کہا جاتا ہے یہاں سب امرا شام کے وقت مجرے کے لئے اسی قاعدہ سے جمع ہوتے ہیں۔ جیسے کہ خاص دہلی میں۔

اس شام کے دربار سے امرا کو بہت بے آرامی اور تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ خیمہ گاہ شاہی کے طول طویل سنتروں میں سے مشعلیں ساتھ لئے ہوتے غسل خانہ کی طرف جاتے یا وہاں سے اپنے ڈیروں کو واپس آتے ہیں تو دور سے اندھیری رات میں یہ ایک بڑا اور دلچسپ تماشا دکھائی دیتا ہے۔ اگرچہ یہ مشعلیں ہمارے وطن فرانس کی طرح موم سے

نہیں بنتیں۔ لیکن بہت دیر تک جلتی ہیں اور صرف اس طرح سے تیار کی جاتی ہیں کہ ایک لکڑی پر لوہے کی ایک نلکی جڑی جاتی ہے اور اُس کے اندر گوڈر کا ایک موٹا فلیتہ لگا یا ہوا ہوتا ہے جو تیل میں تر ہوتا ہے اور جس پر تھوڑی دیر کے بعد تیل کی کپّی سے جو مشعلچی کے ہاتھ میں رہتی ہے اور جس کا گلا تنگ اور لمبا لوہے یا پیتل کا بنا ہوا ہوتا ہے تیل ڈالتے جاتے ہیں اور بوقت ضرورت اُس گوڈر کو بدلتے رہتے ہیں۔

ان دونوں سے چھوٹا اور زیادہ اندر کی طرف ایک تیسرا خیمہ ہوتا ہے جس کو خلوت خانہ کہتے ہیں اس خیمہ میں سوائے بڑے بڑے اُمرا اور وزرا کے کوئی شخص دخل نہیں پاتا اور سلطنت کے اہم اور خاص امور یہیں انجام پاتے ہیں۔

خلوت خانہ سے اور آگے کو بادشاہ کے خاص الخاص خیمے ہوتے ہیں جن کے گرداگرد ذرا چھوٹی قناتیں جو قدآدم سے زیادہ نہیں ہوتی لگی رہتی ہیں ان قناتوں میں سے بعض کے اندرونی جانب مچھلی پٹن کی عمدہ چھینٹ چڑھی ہوئی ہوتی ہے جس پر صدہا مختلف قسم کے پھول بنے ہوتے ہوتے ہیں اور بعض ریشمی مشجر سے آراستہ اور باریک ریشمی جھالر اُن پر ٹنکی ہوئی ہوتی ہے۔

زنانہ خیمہ گاہ ان شاہی خیموں کے متصل بیگمات اور معزز خاتونوں اور محل کی بڑی بڑی خادماؤں اور لونڈیوں کے ڈیرے لگے ہوتے ہیں۔ یہ ڈیرے بھی مختلف قناتوں سے گھرے ہوتے ہوتے ہیں اور اُن کے بیچ میں ادنیٰ درجہ کی عورتوں یعنی اصیلوں اور خانہ زادوں اور ملازم عورتوں اور متعلقات محل سرا کے ڈیرے ہوتے ہیں اور یہ ڈیرے اُن عورتوں کے مراتب اور درجہ کے لحاظ سے قرینہ کے ساتھ لگائے جاتے ہیں۔

عام خاص اور پانچ چھ اور خیمے سب ڈیروں سے بلند ہوتے ہیں جس سے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ گرمی سے حفاظت ہو۔ دوسرے یہ کہ دور سے پہچانے جا سکیں۔

ان کے باہر کی جانب کا کپڑا مضبوط اور گہرے سرخ رنگ کا ہوتا ہے جس پر سجاوٹ کے لئے بڑی بڑی رنگا رنگ کی پٹیاں لگی ہوئی ہوتی ہیں۔ لیکن اندر کی جانب خوبصورت مچھلی پٹن کی چھینٹ ہوتی ہے جو خاص طور پر اسی کام کے واسطے بنائی جاتی ہے۔ جس پر عمدہ اور بڑھیا رنگ رنگ کے ریشمی مشجر لگے ہوتے اور اس پر ریشم یا سرخ و سفید زری کا کارچوبی یا چکن کا کام نہایت نفیس اور باریک جھالر کے ساتھ بنا ہوا ہوتا ہے۔ اس میں تین چار ایک موٹے

روئی کے گدیلوں کا فرش ہوتا ہے اور اُن پر مکلف قالین اور زربفت کی مربع مسندیں آرام سے تکیہ لگا کر بیٹھنے کے لئے بچھی ہوئی ہوتی ہیں۔ ان خیموں کی چوبیں ملمع یا عمدہ روغن کاری کی ہوتی ہیں۔

اور ان دونوں ڈیروں میں جن میں بادشاہ معہ اُمرا و ارکانِ دولت رونق افروز ہو کر نظم و نسق اور امورِ مملکت انجام دیا کرتا ہے بادشاہ کے لئے ایک نہایت ہی مکلف اور آراستہ مرتفع جگہ ہوتی ہے جس پر ایک مخملی یا ریشمی مشجر کے وسیع شامیانہ کے تلے بیٹھکر بادشاہ لوگوں کا سلام مجرا لیتا اور عرض حال سنتا ہے۔

خرگاہ تمام ڈیروں میں ایسے ہی شامیانے ہوتے ہیں مگر اُن میں خرگاہیں ہوتی ہیں جو شکل ایک چھوٹی سی کوٹھری کے ہیں اور اُن کے چھوٹے چھوٹے دروازوں میں چاندی کے قفل لگے رہتے ہیں۔ خرگاہ کا نقشہ سمجھنے کے لئے یہ تصور کر لینا چاہیئے کہ گویا ہمارے ملک فرانس کا لپٹ جانے والا ایک مربع چھپر کھٹ[1] ہے۔ جو دو چھوٹی کی بلندی کے برابر ہے۔ مگر چھت اُس کی چورس نہیں ہے۔ بلکہ گنبد کی طرح کی ہے۔ لیکن خرگاہ اور چھپر کھٹ میں بڑا فرق یہ ہے کہ خرگاہ کے چاروں طرف پردوں کی جگہ بہت پتلے اور سُبک باہر کی جانب ملمع یا روغن کئے ہوئے تختے لگے ہوتے ہوتے ہیں اور زیبائش کے واسطے گرداگرد ریشم اور زری کی جھالر لگی ہوئی اور اندر کی طرف قرمزی رنگ کا ریشمی مشجر یا زربفت منڈھا ہوا ہوتا ہے۔

ان حالات کے لکھنے کے بعد مجھے یقین ہے کہ اس مربع قطعہ کے اندر جو جو امور قابل بیان و لحاظ تھے میں نے اُن میں سے کوئی نہیں چھوڑا۔

شاہی ڈیوڑھی اب اس مربع قطعہ کے بیرونی منظر کا ذکر کرتے ہوئے پہلے میں اُن دو

[1] اس جگہ لفظ چھپر کھٹ ہندوستانی مذاق کے موافق ترجمہ کیا گیا ہے مگر اصل کتاب میں لفظ اسکرین ہے جس کے معنی چھپر کھٹ کے نہیں ہیں بلکہ اوٹ اور پردہ کے ہیں اور چونکہ انگریزوں کے گھروں میں اکثر ایک قسم کے کپڑے سے منڈھے ہوئے لکڑی کے ایسے چوکھٹے دیکھنے میں آتے ہیں جو تہہ کئے جا سکتے ہیں اور جن کو کمرے کے اندر کسی مناسب جگہ پر کھڑا کر کے قنات یا پردہ کا کام لیا جاتا ہے تو اس سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً مصنف نے کسی ایسی ہی قسم کی چیز سے خرگاہ کو تشبیہ دی ہے۔ س۔م۔ح

[2] س ک ر ی ن

امرا اور فوج کا ڈیرہ

خوبصورت ڈیروں کے متعلق لکھوں گا جو شاہی ڈیوڑھی کے دونوں جانب ہوتے ہیں۔ یہاں پر چند عمدہ کوتل گھوڑے کسے کسائے اور نہایت تکلف سازو سامان سے سجے سجائے کھڑے رہتے ہیں تاکہ کسی ناگہانی ضرورت کے وقت فوراً کام آسکیں۔ لیکن بڑی غرض اس سے شان و شوکت اور تکلف دکھانا ہے۔

اسی شاہی ڈیوڑھی کے دونوں طرف ہمرکاب توپ خانہ کی پچاس ساٹھ توپیں جو چھوٹی چھوٹی ہوتی ہیں ایک قاعدہ سے لگی رہتی ہیں اور جس وقت بادشاہ خیمہ میں داخل ہوتا ہے اہل لشکر کی اطلاع کے لئے اُن سے سلامی دی جاتی ہے۔

بادشاہی ڈیوڑھی کے سامنے بقدر مناسب و ممکن ایک وسیع صحن جس میں کوئی خیمہ وغیرہ بالکل نہیں لگایا جاتا ہمیشہ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اور اس صحن کی انتہا پر ایک بڑا ڈیرہ کھڑا ہوتا ہے جس کو نقار خانہ کہتے ہیں کیونکہ اس جگہ نقارے اور شہنائیاں رہتی ہیں۔

اسی ڈیرہ کے قریب ایک اور بہت بڑا ڈیرہ لگتا ہے جس کو چوکی خانہ کہتے ہیں۔ یہاں امرا باری باری ہفتہ میں ایک بار چوبیس گھنٹے پہرہ دیتے ہیں۔ مگر اکثر امرا ایسا کرتے ہیں کہ خاص اپنے ہاں کا ایک ڈیرہ ٹھیک چوکی خانہ کے متصل زیادہ آسائش و خلوت کی غرض سے کھڑا کر لیتے ہیں۔

اس بڑے مربع قطعہ کی باقی ماندہ تینوں جانب کچھ تھوڑا سا فاصلہ دے کر بعض عہدہ داروں کے اور متعلقہ ضروریات کے وہ خیمے لگائے جاتے ہیں جن سے خاص خاص قسم کے شاہی امور متعلق ہیں اور اگر کوئی خاص وجہ یعنی جگہ کی تنگی وغیرہ مانع نہ ہو تو یہ خیمے ہمیشہ ایک ہی ترتیب اور قرینہ سے لگا کرتے ہیں۔ ان ڈیروں کے جدا جدا نام اور لقب ہیں۔ لیکن ان ناموں کا تلفظ مشکل ہے اور چونکہ میرا یہ مدعا نہیں ہے کہ میں آپ کو ہندوستانی زبان کی تعلیم دوں۔ پس یہ کافی ہے کہ اُن الفاظ کا مطلب بیان کر دوں یعنی اُن میں سے ایک ڈیرے میں تو بادشاہی ہتھیار رہتے ہیں اور دوسرے میں نہایت قیمتی زین اور جڑاؤ سانہ وغیرہ اور تیسرے میں کمخواب اور زربفت کی قبائیں وغیرہ جو بادشاہ کی طرف سے اکثر خلعت میں دی جاتی ہیں۔ اور چار علیحدہ علیحدہ خیمے گنگا جل اور شورے کے لئے مختص ہیں جس سے پانی ٹھنڈا کرتے ہیں اور قسم قسم کے میووں اور حلووں اور مٹھائیوں اور پان وغیرہ کے لئے ہوتے

ہیں۔ پان ایک قسم کا پتا ہے جو کچھ خاص مسالے لگا کر تیار کیا جاتا ہے اور بطور علامت عنایات و الطاف شاہی کے عطا ہوا کرتا ہے جس کے چبانے سے منہ سے خوشبو آتی ہے اور لب سرخ ہو جاتے ہیں۔ پندرہ سولہ ڈیرے اور ہوتے ہیں جو باورچی خانہ اور اُس کے متعلق اشیا کے کام آتے ہیں اور ان سب کے وسط میں بہت سے عہدہ داروں اور خواجہ سراؤں کے ڈیرے ہوتے ہیں۔

سب سے اخیر خاصے کے گھوڑوں کے لئے چھ ڈیرے اور ہیں جو نہایت لمبے لمبے ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سے ڈیرے خاص بادشاہ کی سواری کے ہاتھیوں اور شکاری جانوں اور شکاری جانوروں کے لئے جو ہمیشہ بادشاہ کے ہمراہ رہا کرتے ہیں اور جن سے دونوں مطلب حاصل ہوتے ہیں یعنی شان و شوکت بھی اور سواری کے وقت شکار بھی۔ ان ڈیروں میں شکاری کتوں اور چیتوں کے لئے جو ہرن اور نیل گائے کو پکڑتے ہیں۔ شیروں اور گینڈوں کے لئے جو شوکت دکھانے کے لئے ہمراہ لائے جاتے ہیں بنگالی بھینسوں[1] کے لئے جو شیر پر حملہ کرتے ہیں اور پلے ہوئے ہرنوں کے لئے جو اکثر بادشاہ کے سامنے لڑائے جاتے ہیں۔ علیحدہ علیحدہ احاطے بنے ہوتے ہیں۔

خیام شاہی لفظ خیمہ گاہ شاہی کا صرف یہی مطلب نہیں ہے کہ جو خیمے اُس مربع قطعہ کے اندر ہیں صرف اُنھیں سے یہ لفظ متعلق ہے بلکہ وہ بہت سے خیمہ جات جن کا ذکر میں ابھی کر چکا ہوں وہ بھی خیمہ گاہ شاہی کے مفہوم میں داخل ہیں اور یہ تمام شاہی خیمہ گاہ لازمی طور پر لشکر کے وسط میں ہوتی ہے۔

اب آپ بآسانی سمجھ لیں گے کہ یہ شاہی بارگاہ کس شان و شوکت اور کس کیفیت کی ہے اور جب یہ عظیم الشان سرخ خیموں کا مجموعہ ایک بڑی سپاہ کے بیچ میں قرب وجوار کی کسی بلندی سے دکھائی دیتا ہے تو دل پر اُس کی شان و عظمت کا ایک عجیب اثر ہوتا ہے۔ خصوصاً جب کہ لشکر گاہ کا میدان کافی کشادہ اور اس قسم کا ہو کہ بلا روک ٹوک سپاہ کے سب دستے اپنی اپنی معمولی ترتیب اور قرینہ سے اُس میں اُتر سکیں۔

لشکر کے بازار جیسا کہ پہلے بھی بیان ہو چکا ہے سب سے اول میر سامان کو یہ فکر کرنی پڑتی ہے کہ پیش خانہ شاہی کے لئے ایک معقول موقع انتخاب کرے۔ اور

---

[1] ان بھینسوں سے جنگلی بھینسے جن کو ارنا بھینسا کہتے ہیں مراد ہیں   س۔م۔ع

سب خیموں سے خیمہ عام و خاص بلند موقعہ پر لگایا جائے۔ کیونکہ تمام لشکر کے اُترنے کا انتظام اور ترتیب اسی کے باقرینہ نصب ہونے پر موقوف ہے۔ پھر وہ شاہی بازاروں کی جہاں سے تمام فوج کو رسد ملتی ہے داغ بیلیں لگواتا ہے۔ بڑا بازار ایک بڑی وسیع سڑک کی شکل پر کبھی عام و خاص کے داہنے اور کبھی بائیں اس طور سے لگایا جاتا ہے کہ کل لشکر کے اخیر سرے تک برابر چلا جاتا ہے۔ اور جہاں تک ممکن ہو ہمیشہ اُس طرف لگایا جاتا ہے کہ جس طرف سے کہ اگلی منزل کا راستہ نکلتا ہے۔ دوسرے بلو شاہی بازار جو عرض و طول میں اتنے بڑے نہیں ہوتے اور جن کے راستے اسی بڑے بازار میں سے ہوتے ہیں۔ بارگاہ شاہی کے کوئی ایک طرف اور کوئی دوسری طرف ہوتا ہے۔ اور ہر ایک بازار میں امتیاز اور شناخت کے واسطے ایک ایک نہایت بلند جھنڈا جس میں سرخ پھریرا اور سرے پر سرہ گائے کی دم ہے تین تین سو قدم کے فاصلہ پر نصب ہوتا ہے۔

امرا کی خیمہ گاہیں اس کے بعد میر سامان اُمرا کی خیمہ گاہوں کے لئے جگہ تقسیم کرتا ہے تاکہ ہمیشہ ایک ہی قرینہ اور ترتیب ملحوظ رہے اور ہر ایک امیر کی خیمہ گاہ بارگاہ شاہی سے مقررہ فاصلہ پر ہو خواہ بائیں اور خواہ داہنے اور کوئی شخص اپنی مقررہ جگہ کو جو اُس کے لئے مقرر ہے۔ یا اُس جگہ کو جو سفر شروع کرنے سے پہلے کسی شخص کی درخواست پر اُس کے واسطے مخصوص ہو چکی ہو بدل نہ سکے۔

جو تعریف میں نے اُس بڑے مربع قطعہ کی کی ہے اکثر صورتوں میں وہی تعریف اُمرا اور راجگان کی خیام گاہ پر بھی صادق آتی ہے یہ لوگ بھی عموماً اسی طرح دو پیش خانے رکھتے ہیں اور اُن کی خیمہ گاہیں بھی قناتوں سے جو اُن زنانہ سراپردہ کے بڑے خیموں کے گرداگرد لگائی جاتی ہیں گھری ہوئی مربع شکل کی ہوتی ہیں اور اُن کی ان مربع خیمہ گاہوں کے باہر بدستور اُن کے سرداروں اور سواروں کے ڈیرے کھڑے ہوتے ہیں اور اسی طرح ایک بازار بھی ہر امیر کی خیمہ گاہ کے متعلق ہوتا ہے۔ جس میں اُن کی فوج کے دوکان دار اور بہیر[1] کے لوگ چھوٹی چھوٹی پالیں وغیرہ لگا کر گھاس دانہ چاول گھی وغیرہ اجناس بیچا کرتے ہیں اور اس طرح اُمرا کے لشکریوں کو بادشاہی بازاروں سے جن میں کل سامان اور اجناس اکثر پائے تخت کی طرح میسر آسکتے ہیں کسی شے کی خریداری کی چنداں احتیاج نہیں پڑتی۔

---

[1] بہیر بنگاہ۔ رسد پہنچانے والے باربردار، مزدور اور ملازموں کے عملہ کو کہتے ہیں۔

ہر ایک بازار کے دونوں سروں پر ایک ایک جھنڈا معہ علیحدہ علیحدہ رنگ کے پھریروں کے بلندی میں بادشاہی بازاروں کے جھنڈوں کے برابر ہوتے ہیں استادہ رہتا ہے۔ تاکہ ہر ایک امیر کی خیمہ گاہ دور ہی سے جدا جدا معلوم ہو جائے۔

اگرچہ بڑے بڑے اُمرا اور بڑے بڑے راجہ اونچے اونچے ڈیرے رکھنا اپنا فخر جانتے ہیں مگر ضرور ہے کہ وہ اس قدر اونچے نہ ہوں کہ بادشاہ کی نظر اُن پر پڑ جائے اور وہ اُن کے گرا دینے کا حکم دیدے جیسا کہ اُس نے ہمارے اسی سفر میں کیا تھا۔ اور اسی وجہ سے یہ بھی ضرور ہے کہ اُن کے خیموں کی بیرونی جانب بھی تمام سرخ نہ ہو کیونکہ یہ رنگ صرف بادشاہی ڈیروں کے واسطے مخصوص ہے۔ اور شاہی تعظیم اور ادب کے خیال سے یہ بھی واجب ہے کہ اُمرا کے خیموں کے منہ عموماً عام و خاص اور خیام شاہی کی طرف رہیں (یعنی پشت وغیرہ اُس طرف نہ ہونے پائے)

باقی زمین جو خیام شاہی کی خیمہ گاہوں اور بازار کے درمیان ہوتی ہے اُس میں چھوٹے درجہ کے امیروں، منصب داروں، اہل توپ خانہ اور ہر قسم کے تاجروں دکان داروں، ملکی عہدہ داروں اور دوسرے اشخاص کے خیمے نصب ہوتے ہیں جو مختلف اغراض کے لئے لشکر کے ہمراہ رہتے ہیں اور اس سبب سے اس لشکر میں بے حد شمار خیمے ہوتے ہیں اور زمین کا ایک بہت ہی بڑا قطعہ اُن کو نصب کرنے کے لئے درکار ہوتا ہے۔

لشکر گاہ کی اراضی مغربی سیاحوں نے لشکر میں رہنے والے تمام اشخاص کی تعداد اور خیمہ گاہ کی زمین کی وسعت کے متعلق بہت مبالغہ سے کام لیا ہے لیکن حقیقت میں جب کبھی لشکر کا قیام کسی ایسے پڑاؤ میں ہوتا ہے کہ جس میں ترتیب معینہ کے موافق کل خیمہ جات پوری کشادگی کے ساتھ نصب ہوسکیں۔ تب بھی میرے قیاس میں لشکر کا کل دور چھ سات میل سے زیادہ نہیں ہوتا۔ حالانکہ لشکر گاہ کے اندر زمین کے بعض قطعات اکثر یوں ہی خالی اور بے مصرف پڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ البتہ مجھے اس جگہ یہ بات بھی ظاہر کر دینی ضروری ہے کہ بھاری توپ خانہ جس کو ہمیشہ بہت جگہ درکار رہتی ہے عموماً کل لشکر سے ایک دو منزل آگے چلا جایا کرتا ہے۔

لشکر گاہ کی تفصیلات علیٰ ہذا القیاس جو عجیب انتشار اور شور و غل لشکر میں برپا رہتا ہے اور جو کسی نو وارد شخص کو حیران کر دیتا ہے۔ اُس کے بیان

میں بھی بہت مبالغہ کیا گیا ہے۔ حالانکہ آپ کو اگر تھوڑی سی بھی واقفیت اس امر کی ہو کہ اس لشکر میں خیمے کس تنظیم و ترتیب سے نصب ہوتے ہیں تو آپ ایک تھوڑی سی وقت کے ساتھ ہر جگہ جہاں ضرورت ہو پہنچ سکیں گے۔

خیام شاہی اور ہر ایک امیر کے مخصوص الوضع والے خیمے اور نشان اور وہ سورہ گائے کی دُم والے جھنڈے جو بادشاہی بازاروں میں لگے ہوتے ہیں۔ اور جو دور دور سے نظر آتے ہیں۔ چند روز کے تجربہ کے بعد ایسے راہبر ہو جاتے ہیں کہ بھولنے نہیں دیتے۔ مگر واقعی باوجود ان سب احتیاطوں اور علامات کے بھی کبھی کبھی ڈیرے کے پہچاننے اور ملنے میں بڑی غلط فہمی اور دقت ہوتی ہے خصوصاً فجر کو جب فوج اپنی فرودگاہ پر آتی ہے اور ہر متنفس بڑی سرگرمی سے اپنی خیمہ گاہ کی تلاش اور ڈیرہ کرنے کے بندوبست میں مشغول ہوتا ہے اور گرد و غبار کے مارے یہ سب نشان اور علامتیں بالکل چھپ جاتی ہیں تو بارگاہ شاہی مختلف بازاروں اور اُمرا کے خیموں کا پہچاننا اور امتیاز کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔۔

علاوہ بریں وہ خیمے، جو نصب کئے جانے کے لئے پھیلائے ہوئے یا نیم استادہ ہوتے ہیں اکثر راستہ ملنے میں حارج ہوتے ہیں اور نیز وہ طول طویل رسیاں جو کم درجہ کے اُمرا اور منصب دار جن کے پاس پیش خیمے نہیں ہوتے ہیں اپنی اپنی حدود کے گھیر لینے کو اور عام آمد رفت کو روکنے کے لئے اور اُس غرض سے کہ بصورتیکہ اُن کے قبائل ساتھ ہوں، کہ اُن کے قریب کوئی غیر شخص ڈیرہ نہ کرسکے بندھوا دیتے ہیں بڑی سدِ راہ ہوتی ہیں۔ کیونکہ اُن کے نوکر چاکروں کی ایک فوج کی فوج ہاتھوں میں ڈنڈے لئے نگہبانی کے لئے کھڑی رہتی ہے جہاں رسیوں کو نہ تو سرکانے ہی دیتے ہیں اور نہ نیچا کرنے دیتے ہیں اور لامحالہ الٹے پاؤں پھرنا پڑتا ہے اور اس عرصہ میں جو اس طرف راستہ لینے میں بے فائدہ سعی ہوتی رہے دوسری طرف کا راستہ بھی بند ہو جاتا ہے۔

اب اونٹ لدے کھڑے ہیں اور اُن کے نکال لے جانے کی بجز اس کے کوئی سبیل نہیں ہے کہ اُن نوکر چاکروں کو دھمکایا جائے یا منت سماجت کی جائے اور سمجھائے بجھانے کے ساتھ کبھی ایسا غصہ دکھلایئے کہ گویا تم اُن کو ابھی پیٹ ڈالوگے مگر کسی کو ہاتھ تک لگانا نہیں چاہیئے۔ اور دونوں طرف کے نوکروں چاکروں کے باہم جب سخت تو تو میں میں ہو جائے تو پھر اُن کو یہ ڈرا دینا چاہیئے کہ اس حرکت کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ اور اس طرح اُن کے درمیان

صلح کرا کر وقت کو غنیمت جانیئے اور اپنے اونٹ نکال لے جاتے۔

شام کے وقت جب کسی کام کے لئے کچھ دور جانا پڑتا ہے تو حقیقت میں کمال دقت ہوتی ہے کیونکہ اس وقت عوام الناس اپنا اپنا کھانا پکاتے ہیں اور اکثر اُپلے اور اونٹوں کی مینگنیاں اور گیلی لکڑیاں جلاتے ہیں اور ان کے بے حد و بے شمار چولہوں کا دھواں خصوصاً جب کہ ہوا کم ہو نہایت مکروہ اور ناگوار ہوتا ہے اور آسمان بالکل تیرہ و تار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میں بھی تین چار بار اس دھوئیں کے سمندر میں پھنس گیا تھا اور ہر چند راستہ دریافت کرتا تھا مگر نہیں ملتا تھا اور اگرچہ ادھر اُدھر بہت سا چکراتا پھرا مگر کچھ معلوم نہ ہوتا تھا کہ کدھر جا رہا ہوں اور ایک مرتبہ تو ایسا ہوا کہ دھوئیں کے موقوف ہونے اور چاند کے نکلنے تک ایک جگہ توقف کرنا پڑا اور پھر ایک دوسری مرتبہ میں بڑی مشکل سے اکاس دیئے تک پہنچا اور اپنے گھوڑے اور سائیس کے ساتھ اُسی کے نیچے رات بسر کی۔

اکاس دیا یہ اکاس دیا جہاز کے ایک بڑے مستول کی مانند مگر نہایت نازک اور پتلا ہوتا ہے جس کو اُتارتے وقت الگ الگ تین ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ بارگاہ شاہی کی طرف نقارخانہ کے قریب لگایا جاتا ہے۔ اور رات کے وقت اس کی چوٹی پر ایک قندیل لٹکتی رہتی ہے۔ یہ نہایت ہی مفید چیز ہے۔ کیونکہ اس دھواں دھار تاریکی میں جب کچھ نظر نہیں آتا تو یہ دکھائی دیتا ہے اور جو لوگ راستہ بھول جاتے ہیں وہ یا تو اسی کے نیچے چوروں سے محفوظ رہ کر رات کاٹ لیتے ہیں یا وہاں پہنچ کر پھر اپنے ڈیرے کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر پتہ لگا لیتے ہیں۔

لفظاً اکاس دیا کا ترجمہ آسمانی روشنی کے لفظ کے ساتھ ہو سکتا ہے کیونکہ حقیقت میں یہ قندیل دور سے ستارے کی طرح چمکتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

لشکر شاہی میں چوکی پہرہ چوری کے انسداد کے لئے ہر ایک امیر اپنے اپنے خیمہ پر چوکیدار رکھتا ہے جو رات کو برابر ڈیرے کے آس پاس گشت کرتے "خبردار خبردار" پکارتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ تمام فوج کے گرداگرد پانچ پانچ سو قدم کے فاصلہ پر پہرہ والے ہوتے ہیں جو اپنے پاس آگ جلائے رکھتے اور "خبردار خبردار" پکارتے رہتے ہیں۔ اس احتیاط کے علاوہ کوتوال ہر ایک طرف اپنے برقندازوں کو لگا دیتا ہے جو خاص طور سے بازاروں کی زیادہ خبرگیری کرتے اور شور و غل کے علاوہ نرسنگا بھی بجاتے رہتے ہیں۔

مگر باوجود ان سب احتیاطوں اور خبرداریوں کے چوری اکثر ہوتی رہتی ہے اس لئے احتیاط کا تقاضہ یہ ہے کہ ہمیشہ بڑی خبرداری اور چستی سے رہنا چاہیئے اور اپنے ملازموں کی حفاظت اور ہوشیاری پر زیادہ بھروسہ نہ رکھنا چاہیئے اور رات کو اول وقت کچھ آرام کر لینا چاہیئے تاکہ باقی ماندہ رات میں نگرانی کرنے میں تکلیف نہ ہو۔

شاہی سواری اب میں شہنشاہ کے سفر کرنے کے وہ مختلف طریقے جو اس نے اس موقعہ پر اختیار کئے تھے بیان کرتا ہوں۔

اکثر اوقات بادشاہ تخت رواں پر سوار ہوتا ہے جس کو کہار اٹھاتے ہیں۔ یہ تخت ایک قسم کا مکلف چوبیں مختصر سا بالاخانہ ہوتا ہے جس پر روغن کاری کی ہوئی ہوتی ہے اور ملمع کے ستون اور آئینہ دار کھڑکیاں ہوتی ہیں جو تیز ہوا اور بارش وغیرہ کے وقت بند کی جاتی ہیں۔ اس تخت کے چاروں ڈنڈے جو کہاروں کے کاندھے پر ہوتے ہیں تیز رنگ کی سرخ باناتِ یا کمخواب سے منڈھے ہوئے اور زری اور ریشم کی نہایت کامدار جھالروں سے آراستہ اور بجے ہوتے ہیں اور ہر ایک ڈنڈے پر دو مضبوط اور خوش پوشاک کہار لگے رہتے ہیں جن کی بدلی کے واسطے نوبت بہ نوبت اور آٹھ کہار موجود رہتے ہیں۔

کبھی بادشاہ گھوڑے پر سوار ہوتا ہے خصوصاً جب موسم موافق اور شکار کے قابل ہو اور کبھی ہاتھی پر میگ ڈنبر یا ہودے میں بیٹھکر سفر کرتا ہے جو نہایت ہی شاندار اور باشوکت سواری ہے۔ کیونکہ اس کی جھول ایسی عمدہ اور ساز و سامان اس قدر قیمتی اور مرصع اور زرق برق ہوتا ہے کہ اس کی زیبائش پر کوئی چیز فوقیت نہیں لے جا سکتی۔

میگ ڈنبر روغن کاری اور ملمع کا ایک چھوٹا سا چوبی مربع شکل کا بالاخانہ ہوتا ہے۔ اور ہودا بیضوی شکل کی ایک نشست ہے جس کے سنہری اور نہایت منقش ستونوں پر ایک نہایت مکلف شامیانہ ہوتا ہے۔

ہم رکاب اُمراء ہر ایک سفر میں بادشاہ کے ہمراہ بہت سے امرا اور راجہ ہوتے ہیں جو بہت قریب قریب اس کے پیچھے گھوڑوں پر چلتے ہیں اور بطور ایک بے ترتیب مجمع کے سب باہم اس طرح ملے جلے چلتے ہیں جن میں چنداں لحاظ کسی قاعدہ کا نہیں ہوتا۔ سفر کے روز علی الصبح سب اُمرا باستثنا ان کے جن کی عمر زیادہ ہو یا ان کا عہدہ ہی اس استثنا کا مجاز ہو خیمہ عام و خاص میں جمع ہوتے ہیں اور اس

سفر سے امرا کو بہت کوفت اور ماندگی ہوتی ہے خصوصاً شکار کے دن کیونکہ اس حالت میں اکثر اوقات سہ پہر یعنی تین بجے تک برابر دھوپ اور گرد میں عام سپاہیوں کی مانند حیران ہونا پڑتا ہے۔

مگر یہ آسائش پسند امرا جب بادشاہ کے ہم رکاب نہیں ہوتے تو اور ہی طرح سفر کرتے ہیں اور نہ تو اُن کو دھوپ ہی ستاتی ہے اور نہ گرد ہی بلکہ حسب پسند بند یا کھلی پالکی میں ایسے جاتے ہیں جیسے پلنگ پر لیٹے ہوئے اور بلا وقت آرام سے سوتے ہوئے اپنے خیمہ میں جا پہنچتے ہیں جہاں اُن کو یقیناً عمدہ کھانا اور ہر ایک ضروری چیز تیار ملتی ہے کیونکہ یہ سب سامان رات کو کھانا کھانے کے بعد فوراً آگے کو روانہ کر دیا جاتا ہے۔

سواری کی حالت میں ان امرا کے گرد و پیش بہت سے سوار جن کو گرز بردار کہتے ہیں اور جن کے پاس چاندی کا گرز ہوتا ہے سب طرح سے ساز و سامان سے درست موجود رہتے ہیں۔ بہت سے گرز بردار بادشاہ کے بھی ہمرکاب ہوتے ہیں جو آگے آگے دائیں اور بائیں پیدلوں کے ایک بڑے جمگھٹ کے ساتھ چلتے ہیں۔ گرز بردار چیدہ اور وجیہہ جوان ہوتے ہیں اور احکام اور فرامین شاہی وغیرہ اُن کے ہاتھ بھیجے جاتے ہیں۔ اُن کے ہاتھ میں بڑے بڑے عصا ہوتے ہیں اور بادشاہ کی سواری کے آگے سے لوگوں کو ہٹاتے رہتے ہیں تاکہ راستہ صاف ملے۔

قور خانہ راجاؤں کی سواریوں کے بعد قور[1] چلتا ہے جس میں بہت سی شہنائیاں اور نقارے بھی ملے ہوتے ہیں۔ اس قور میں جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا ہے چاندی کی بنی ہوئی بہت سی مختلف الوضع چیزیں بھی جو ایک چاندی کی لمبی چوب پر نصب

[1] قور (ق و ر) بمعنی ہتھیار ترکی لفظ ہے اور اس سے بادشاہی سلاح خانہ مراد ہے۔ آئین اکبری میں لکھا ہے کہ شہنشاہ اکبر نے یہ آئین باندھا تھا کہ مختلف قسم کے سلاحات مثلاً تلوار، نیزہ، خنجر، کمان، جمدھر، کٹار وغیرہ جیسے کہ اُس وقت مروج تھے معہ ایک مقررہ تعداد کے موافق منصب داروں اور احدیوں کی ایک جماعت کو اس مطلب سے سپرد رہتے تھے کہ بادشاہ سفر اور حضر میں جس وقت چاہے اُن میں سے کوئی ہتھیار لے کر خواہ خود استعمال کرے خواہ رسم وقت کے موافق کسی سردار یا سپاہی کو حسب ضرورت بخش دے اور سفر کے وقت جب یہ سلاح خانہ چلتا تھا تو شان و شوکت دکھانے کے لئے سامان جلوس شاہی یعنی نشانوں اور ماہی مراتب اور نقاروں وغیرہ کے ساتھ مل جل کر چلتا تھا گو در اصل یہ کارخانے قور سے علیحدہ تھے۔ س م ح

کی ہوئی ہوتی ہیں شامل ہوتی ہیں۔ جن میں سے بعض تو عجیب عجیب جانوروں کی صورت کی ہیں۔ بعض ہاتھ کے پنجہ اور ترازو اور مچھلی وغیرہ جیسی اور بعض ناقابل فہم اشیا رسے مشابہ

اس کے پیچھے ایک بڑا غول منصب داروں یعنی کم درجہ کے اُمرا کا آتا ہے جو ہتھیار سجائے عمدہ گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں یہ لوگ اُن امراء سے جو بادشاہ سے پیچھے چلتے ہیں۔ تعداد میں کہیں زیادہ ہیں۔ کیونکہ ان منصب داروں کے علاوہ جن کو اپنے پہرہ کی وجہ سے علی الصبح بادشاہی خیمہ پر بادشاہ کی ہمرکابی کے لئے جمع ہونا ضرور ہے اور بھی بہت سے منصب دار اس غرض سے شریک جلوس سواری ہو جاتے ہیں کہ بادشاہ کی نظر میں رہ کر کچھ ترقی حاصل کریں۔

بیگمات کی سواریاں شہزادیاں اور محل کی بڑی بڑی بیگمیں بھی کئی قسم کی سواریوں میں چلتی ہیں جن میں سے کسی کو توچوڈول[1] پسند ہے جس کو کہار اُٹھاتے ہیں جو تخت رواں جیسا ہوتا ہے اس پر ملمع اور روغن کاری کا کام بنا ہوا ہوتا ہے۔ اور رنگا رنگ کے ریشمیں خوش نما تہ بہ تہ پردے پڑے ہوئے اور زری کی جھالریں اور خوبصورت پھندنے وغیرہ لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ بعض عمدہ عمدہ پالکیوں میں چوڈولوں کی طرح خوب سجی سجائی ہوتی ہیں سوار ہوتی ہیں۔ اور بعض شاہزادیاں بڑے بڑے محملوں میں، جو دو مضبوط اونٹوں یا دو چھوٹے ہاتھیوں کے بیچ میں معلق ہوتے ہیں چلتی ہیں۔ چنانچہ میں نے کبھی کبھی روشن آرا بیگم کو محمل میں سوار دیکھا ہے اور کئی بار یہ بھی دیکھا ہے کہ محمل کے آگے کی جانب جو کھلی ہوتی تھی ایک نوجوان خوش لباس لونڈی بیٹھی ہوئی گرد اور مکھیوں کے دور کرنے کے لئے بیگم کو مورچھل کر رہی تھی۔ بیگمیں اکثر ہاتھیوں پر بھی سوار ہوتی ہیں جن کے بڑے بڑے چاندی کے گھنٹے پڑے ہوتے اور بڑے قیمتی سازوسامان سے سجے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور جن کی جھولیں وغیرہ نہایت زرق برق اور بیش قیمت اور وہ آرائشی چیزیں جھول وغیرہ میں لٹکائی جاتی ہیں نہایت عمدہ زردوزی کام کی ہوتی ہیں۔ یہ حسین اور ممتاز بیگمیں ہاتھیوں پر میگھ ڈنبروں میں بیٹھی ہوئی یوں دکھائی دیتی ہیں گویا ہوا میں پریاں اُڑی جاتی ہیں۔ اور ہر ایک میگھ ڈنبر میں آٹھ عورتیں بیٹھ سکتی ہیں۔ چار ایک طرف چار دوسری طرف اور میگھ ڈنبر کے ہر ایک خانہ پر ریشمیں جالی کا غلاف پڑا

---

[1] اصل لفظ چنڈول ہے۔

ہوا ہوتا ہے ۔ اور چوڈول اور تخت رواں کی شان و شوکت اور زرق برق سے کسی طرح کم نہیں ہوتا ۔ اور بیگمات کی سواریوں کا تجمل اتنا دل کش ہوتا ہے کہ اس سفر میں یہ تماشا میرے لئے انتہائی دلچسپ رہا اور اُس کی یاد اور خیال سے اب بھی طبیعت کو ایک مسرت حاصل ہوتی ہے ۔

روشن آرا بیگم کا جلوس

چنانچہ آپ اپنے خیال کو خواہ کیسی ہی وسعت اور طول دیجئے مگر روشن آرا بیگم کی سواری سے زیادہ کوئی دلچسپ اور اعلیٰ درجہ کا تماشا تمہیں اس میں نہ آئے گا ۔ یہ بیگم پیگو کے ایک نہایت عمدہ اور بڑے قد آور ہاتھی پر ایک میگھ ڈنبر میں سوار ہوتی ہے جس کی سنہری اور لاجوردی رنگتوں کی چمک دمک قابل دید ہے ۔ اُس کے ہاتھی کے پیچھے پانچ چھ اور ہاتھی چلتے ہیں جن پر اُس کے محل کی معزز عورتیں ہوتی ہیں ۔ اور اُن کے میگھ ڈنبر بھی شان اور خوبصورتی میں روشن آرا بیگم کے میگھ ڈنبر جیسے بلکہ قریباً ویسے ہی ہوتے ہیں شاہزادی کے قریب بڑے بڑے اور خاص خاص خواجہ سرا بھاری بھاری پوشاکیں پہنے ہوئے نفیس گھوڑوں پر سوار ہاتھوں میں چھڑیاں لئے ہوئے چلتے ہیں اور اُس کے ہاتھی کے اردگرد ایک رسالہ کشمیری اور تاتاری عورتوں کا ہوتا ہے جو بڑے بناؤ سنگار کئے ہوئے خوبصورت اور بادپا گھوڑوں پر سوار ہوتی ہیں جن کے ساتھ ایک بڑی بھیڑ پیدل ملازموں کی ہوتی ہے جو ہاتھوں میں بڑی بڑی چھڑیاں لئے ہوئے شاہزادی کی سواری کے دائیں بائیں بہت دور آگے اس غرض سے چلتے ہیں کہ راستہ کو صاف اور کھلا رکھیں ۔ اور ہر ایک شخص کو جو سامنے آجائے ہٹاتے جائیں ۔

روشن آرا بیگم کی سواری کے ساتھ ہی محل کی بڑی بیگم کی سواری نمودار ہوتی ہے اور قریباً یہی سب تکلفات اُس میں بھی ہوتے ہیں ۔ غرضکہ اسی طرح پندرہ سولہ بڑی بڑی بیگمیں شان و شوکت اور دھوم دھام کے ساتھ جو اُن کے مرتبہ مشاہرہ اور منصب کی مناسبت سے کم زیادہ ہوتی ہے گذرتی ہیں ۔

ان ساٹھ ستر ہاتھیوں کا وہ تول تول کر قدم رکھنا اور میگھ ڈنبروں کی وہ چمک دمک علاوہ نہایت خوش لباس اور بے شمار ہمراہیوں اور خدم و حشم کا انبوہ کثیر واقع میں دیکھنے والے کے دل پر شاہی شان و شوکت کا ایک عجیب اثر ڈالتا ہے ۔ اگرچہ ان سب دل فریب مناظر کو ظاہر

بے اتفاقی کی نظر سے نہ دیکھتا تو بے شک میں بھی انھیں ہندوستانی شاعروں کی مانند جو استعارے کے طور پر یہ کہتے ہیں کہ یہ شاہزادیاں نہیں بلکہ دیویاں ہیں جو ہاتھیوں پر بیٹھ کر مغرور سے بیٹھی ہوئی خلائق کی نظروں سے پوشیدہ پوشیدہ جا رہی ہیں اپنے خیالات کی بلند پروازی سے مغلوب ہوتا۔

ایک یادگار واقعہ

یہ ناممکن اور انتہائی مشکل ہے کہ کوئی متنفس ان بیگمات کے نزدیک جا سکے اور مجال ہے کہ وہ کسی انسان کو نظر آ سکیں۔ اُس سوار کے حال پر ہزار افسوس جو کسی اتفاق سے بیگمات کی سواری کے نزدیک جا نکلے کیونکہ یہ شخص خواہ کیسا ہی ذی رتبہ کیوں نہ ہو خواجہ سراؤں اور خواصوں وغیرہ کے ہاتھ سے پٹے بغیر نہیں رہ سکتا اور یہ لوگ ایسے موقعہ پر بڑے شوق سے اُس کی خوب ہی گت بناتے ہیں۔ چنانچہ میں قطعًا اس واقعہ کو نہیں بھول سکتا۔ جب کہ میں بھی ایسی ہی ایک بلا میں پھنس گیا تھا اور بہ ہزار دقت و مشکل اُس بے رحمانہ سلوک سے نجات پائی تھی جس میں بہت سے سوار گرفتار تھے میں نے یہ ٹھان لی تھی کہ خواہ کچھ ہی سخت مقابلہ کئے بغیر میں اُن سے مار نہیں کھاؤں گا۔ پس میں نے اپنی تلوار کھینچ لی اور خوش نصیبی سے میرا گھوڑا بھی مضبوط اور بہت جان دار تھا اور اس طرح اس قابل ہو گیا کہ تیغ بکف اُن حملہ آوروں کی بھیڑ کو چیر کر نکل گیا۔ اور ایک تیز رو ندی میں جو سامنے تھی گھوڑا ڈال کر پار اُتر گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام فوج میں یہ بات ایک مثل کی طرح مشہور ہے کہ تین موقعوں سے بچنا اور احتیاط کرنا نہایت ضروری ہے۔ اوّل خاصے اور کوتل گھوڑوں میں جا گھسنے سے جہاں دولتیاں اور پشکیں بے حساب لگتی ہیں۔ دوئم شکارگاہ میں داخل ہونے سے۔ سوئم بیگمات شاہی کی سواری کے قریب جانے سے۔ اور ایران میں تو یہ تیسری صورت سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ کیونکہ میں سنتا ہوں کہ وہاں کوئی شخص خواجہ سراؤں کو اتنے فاصلہ پر بھی نظر پڑ جائے کہ جہاں سے بیگمات تک ایک میل کا فاصلہ ہو تو اس غریب کی جان نہیں بچ سکتی اور یہ ضرور ہے کہ جس شہر اور گاؤں میں ہو کر بیگمات کی سواری نکلے وہاں کے تمام مرد اپنے اپنے مقام و مسکن کو چھوڑ کر بہت فاصلہ پر بھاگ جائیں۔

شہنشاہ مغل شکار میں

اب میں کچھ بادشاہ کے شکار کا بیان کرتا ہوں میری سمجھ میں کبھی نہ آتا تھا کہ شہنشاہ مغل ایک لاکھ آدمی کے لشکر کے

ساتھ کس طرح شکار کھیل سکتا ہے ۔ لیکن بلا شبہ ایک خاص صورت ہے جس کے سبب سے دو لاکھ بلکہ اس سے بھی زیادہ فوج کے ساتھ شکار کھیلا جا سکتا ہے ۔ چنانچہ وہ صورت یہ ہے کہ آگرہ اور دہلی کے نواح میں دریائے جمنا کے کنارے کنارے کوہستان تک اور اُس شاہراہ کے دونوں جانب جو لاہور کو جاتا ہے زمین کا ایک بڑا حصہ بنجر پڑا ہوا ہے جو جنگلی درختوں اور جھاڑیوں اور مختلف الاقسام گھاس سے جو دو دو گز اونچی ہے ڈھکا رہتا ہے ۔ اور ان سب زمینوں کی بڑی نگرانی سے محافظت کی جاتی ہے ۔ اور سوائے تیتر بٹیر اور خرگوش کے جن کو ہندوستانی لوگ جال سے پکڑتے ہیں ۔ کوئی شخص خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو شکارگاہ میں جا کر کسی قسم کے شکار کو جو احتیاط اور حفاظت کی وجہ سے بے شمار ہے نہیں چھیڑ سکتا ۔ جب کبھی بادشاہ شکار کو جاتا ہے تو وہ شکاری جس کے ضلع کے قریب ہو کر لشکر شاہی کا گذر ہوا حاضر ہو کر میر شکار شاہی کو اپنے علاقہ کے مختلف القسم شکاروں کی تفصیلات اور اُس جگہ کے حالات جہاں شکار بافراط موجود ہوتا ہے مطلع کرتا ہے اور اُس کے اطلاع دینے پر شکارگاہ کے ناکوں اور خاص خاص موقعوں پر پہرے بٹھائے جاتے ہیں ۔ تاکہ وہ قطعے جو منتخب کئے گئے ہیں کامل طور پر محفوظ رہیں ۔ یہ قطعات کبھی کبھی دس دس میل کی وسعت میں ہوتے ہیں اور اُس شکارگاہ سے کہ جہاں بادشاہ شکار کھیلنا چاہتا ہے اہل لشکر کوچ کے وقت داہنی یا بائیں کو اس طرح پر بچ کر چلتے ہیں کہ بادشاہ بغیر کسی طرح کی دقت کے صرف اُس قدر اُمرا اور لوگوں کے ساتھ جن کو اجازت دی گئی ہو شکارگاہ کے اندر داخل ہو جاتا ہے اور حسب موقعہ تمام انواع و اقسام کے شکاروں سے محظوظ و مسرور ہوتا ہے ۔

اب میں اول یہ بیان کرتا ہوں کہ سدھائے ہوئے چیتوں سے ہرن کا شکار کس طرح کیا جاتا ہے ۔ مجھکو یاد ہے کہ میں نے کسی اور موقعہ پر آپ کو لکھا تھا کہ ہندوستان میں سینگ والے ہرن کثرت ہیں جو ہمارے ملک کے اُس قسم کے ہرن سے جس کو فاؤن[1] کہتے ہیں بہت مشابہ ہیں ۔ اور ان کی ڈاریں ہوتی ہیں جن میں اکثر پانچ چھ ہرن سے زیادہ نہیں ہوتے ۔ اور ایک نر ہرن ڈار کے پیچھے چلتا ہے جو اپنے رنگ سے با سانی پہچانا جاتا ہے ۔
اب شکار کا طریقہ سنئے کہ ہرنوں کی ڈار کے نظر پڑتے ہی ایک چیتے کو جو ایک چھوٹی

---

[1] فاون

سی گاڑی پر زنجیر سے بندھا رہتا ہے وہ ڈار دکھلا دیتے ہیں اور یہ سیانا اور مکار جانور فوراً اس کی طرف نہیں دوڑ پڑتا بلکہ بڑی احتیاط سے اُن کے اردگرد چھپ چھپ کر اور دبک کر چلتا ہے اور اس طریق سے نامعلوم طریقے پر ایسا نزدیک جا پہنچتا ہے کہ ناقابلِ تصوّر سرعت کے ساتھ پانچ ہی چھ جستوں میں اُن کو جا پکڑتا ہے۔ اور اگر اپنے حملہ میں کامیاب ہوتا ہے تو فوراً شکار کے خون اور دل و جگر سے پیٹ بھر لیتا ہے۔ اور اگر وار خالی جاتا ہے (چنانچہ اکثر ایسا ہوتا ہے)، تو پھر دوسرا حملہ نہیں کرتا بلکہ چپکا کھڑا ہو جاتا ہے۔ فی الواقع یہ توقع کرنا کہ سیدھی اور واجبی دوڑ میں چیتا ہرن کو پکڑلے بے فائدہ ہے کیونکہ ہرن چیتے سے بہت تیز رو اور دمدم ہوتا ہے۔ چیتے بان اُس کو پکڑ کر گاڑی پر بٹھا دیتا ہے۔ کچھ دقت نہیں اُٹھانی پڑتی چنانچہ آہستگی سے اُس کے پاس جا کر چمکارتا اور دو ایک گوشت کے ٹکڑے آگے ڈال کر اور آنکھیں بند کر کے زنجیر سے باندھ دیتا ہے۔

اسی سفر میں ایک چیتے نے اتفاقاً ہم لوگوں کو ایک عجیب اور حیرت افزا تماشا دکھلایا یعنی ایک روز جو ہرنوں کی ایک ڈار فوج کے درمیان ہو کر نکل بھاگی جیسا کہ اکثر ہوا کرتا ہے تو اتفاقاً دو چیتوں کے بہت ہی قریب ہو کر نکلی جو حسب معمول گاڑیوں پر زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے اور اُن میں سے ایک نے جس کی آنکھیں بند نہ تھیں ایک ایسی تیز جھپٹ کی کہ زنجیر توڑ کر ہرنوں کے پیچھے دوڑ پڑا۔ لیکن کسی کو پکڑ نہ سکا مگر لوگوں کے شور مچانے اور تعاقب سے مجبور ہو کر یہ ہرنوں کی ڈار جب پھر پیچھے کو ٹی اور ایک ہرن اُسی چیتے کے پھر قریب ہو کر نکلا تو اُس نے باوجودیکہ بہت سے گھوڑے اور اونٹ بیچ میں حائل تھے جھپٹ کر اُس کو پکڑ لیا اور اُس سے یہ عام مقولہ کہ "چیتا اپنے شکار پر جو اول دفعہ کی جھپٹ سے بچ جائے پھر نہیں دوڑتا" غلط ثابت ہو گیا۔

نیل گائے کے شکار کرنے کا طریقہ کچھ زیادہ دلچسپ نہیں ہے۔ ان کو بڑے بڑے وسیع جالوں میں گھیر کر بتدریج ان کے دائرہ کو تنگ کرتے جاتے ہیں اور جس وقت اُس کی وسعت بہت کم رہ جاتی ہے تو بادشاہ امرا اور شکاریوں کو ساتھ لے کر اُس میں داخل ہوتا ہے اور ان کو تیر، برچھی، تلوار اور قرابین سے مار لیتے ہیں اور کبھی کبھی یہ جانور اس قدر مارے جاتے ہیں کہ بادشاہ اُن کا گوشت تحفہ کے طور پر سب اُمرا کے لئے بھیجتا ہے۔

کونجوں کے پکڑنے کا عجیب اور قابلِ دید طریقہ ہے اور اُن کی اس جرأت کو دیکھ کر

جو وہ اپنے بچاؤ اور حفاظت کے لئے شکاری پرندوں کے مقابلہ میں دکھاتی ہیں بڑا لطف حاصل ہوتا ہے حتیٰ کہ کبھی کبھی وہ اپنے حریف کو مار بھی لیتی ہیں لیکن سست پرواز کی وجہ سے جو پھرتی کے ساتھ ادھر اُدھر نہیں پھر سکتیں۔ دشمنوں سے جن کی تعداد دم بدم بڑھاتی جاتی ہے۔ مغلوب ہو جاتی ہیں لیکن ان سب شکاروں میں شیر کا شکار صرف خطرناک ہی نہیں بلکہ خاص بادشاہی شکار ہے کیونکہ بجز خاص اجازت کے جو کسی امیر کو دی جاتی بادشاہ اور شہزادوں کے سوا اس شکار میں کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔ اس کے شکار کے لئے سب سے پہلے یہ ترکیب کی جاتی ہے کہ شکاری لوگ جب یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ شیر فلاں جگہ آکر سوتا ہے تو وہاں ایک گدھا باندھ دیتے ہیں جس بدنصیب کو شیر پھاڑ کھاتا ہے اور چونکہ یہ اُس کے پیٹ بھرنے کو کافی ہوتا ہے پھر وہ کسی اور شکار کی تلاش نہیں کرتا اور بغیر اس کے کہ کسی بیل یا بھیڑ بکری یا کسی چوپایہ کو ستائے پانی کی تلاش میں جاتا اور پانی پی کر پھر اپنی اُسی آرام گاہ پر آ جاتا ہے اور اگلی فجر تک پڑا سویا کرتا ہے۔ چنانچہ شکاری لوگ چند روز تک یہی حکمت اُس کے ایک ہی جگہ پر مائل رہنے کے لئے کرتے رہتے ہیں اور جب بادشاہ کے قریب پہنچنے کی اطلاع ملتی ہے تو وہ ایک اور گدھا جس کے حلق میں بہت سی افیون ٹھوس دی جاتی ہے اُسی موقعہ پر جہاں اس قدر گدھے قربان ہو چکے ہوتے ہیں باندھ دیتے ہیں اور یہ آخری دعوت بے شک اس مُراد سے ہوتی ہے کہ شیر کھا پی کر تُکّہ کی نیند سو جائے اس کے بعد یہ تدبیر کی جاتی ہے کہ قرب وجوار کے گنواروں کو جمع کر کے بڑے بڑے وسیع جال جو خاص اسی کام کے واسطے بنائے ہوئے ہوتے ہیں تنوا دیتے جاتے ہیں اور جیسا کہ نیل گائے کے شکار میں کیا جاتا ہے ان کو بتدریج کھینچ کھینچ کر اُن کے دائرہ کی وسعت کو تنگ کرتے جاتے ہیں اور جب سب سامان اس طرح پر تیار ہو جاتا ہے تو بادشاہ ایک ہاتھی پر جس پر فولادی پاکھر پڑی ہوتی ہے معہ میر شکار اور چند فیل نشین امیروں اور بہت سے گرز بردار سواروں اور پیدل شکاریوں کے جن کے ہاتھ میں چھوٹی چھوٹی برچھیاں ہوتی ہیں۔ جال کے باہر کی طرف ٹھہر کر شیر پر ایک بڑی بندوق سے فیر کرتا ہے۔ اب شیر جو اپنی عادت معہودہ کے موافق زخم کھا کر ہاتھی پر جھپٹتا ہے تو جال میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے اور بادشاہ پیہم گولیاں مار کر اُس کو مار لیتا ہے۔

اسی سفر کے ایک شکار میں ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ ایک بپھرا ہوا شیر جال پر سے کود کر ایک سوار پر جا پڑا اور اُس کے گھوڑے کو مار ڈالا اور اس طرح جان بچا کر بھاگ گیا مگر شکاریوں

سے تلاش اور پیروی کرکے ڈھونڈھ ہی لیا اور پھر جال سے جا گھیرا! شیر کے بھاگ جانے کی اس واردات سے تمام فوج کو نہایت دقت اور پریشانی اٹھانی پڑی یہاں تک کہ ہم تین چار روز تک برابر ایک ایسی سرزمین میں سرگرداں رہے جس میں پہاڑوں سے ندیاں اور نالے آکر گرتے تھے اور تمام میدان جھاڑیوں اور اونچی اونچی گھاس سے جس میں اونٹ تک چھپ جائیں ڈھکا ہوا تھا کچھ بازاروں کا بندوبست بھی نہ ہوا تھا اور کوئی شہر اور بستی بھی نزدیک نہ تھی۔ بس وہ لوگ بڑے ہی خوش نصیب تھے جو اس پریشانی اور سرگردانی میں کسی طرح کچھ اپنی گرسنگی رفع کر سکے! کیا اب میں آپ کو اس بیہودہ مقام میں غیر ضروری توقف کا اصلی سبب بھی بتا دوں؟ اور لو بتائے دیتا ہوں۔ آپ کو خوب جان لینا چاہئے کہ جب بادشاہ ایک شیر مارتا ہے تو یہاں اس کو بڑی مبارک فال سمجھا جاتا ہے اور اس کے برعکس اگر شیر بچ جائے تو بے حد نہایت بدشگونی اور سلطنت کے واسطے بڑی بدفالی خیال کی جاتی ہے اس لئے جب شیر کے شکار کا انجام حسب دل خواہ ہوتا ہے تو اس مبارک تقریب میں بڑے اہتمام اور تکلفات عمل میں لائے جاتے ہیں۔ چنانچہ بادشاہ کے حضور میں لایا جاتا ہے اور جب اس کی لاش بڑی احتیاط سے ناپ لی جاتی ہے اور بڑی تفصیل اور باریک بینی سے اس کا امتحان اور ملاحظہ ختم ہو لیتا ہے تو بادشاہی دفتر میں لکھ کر رکھا جاتا ہے کہ فلاں بادشاہ نے فلاں تاریخ ایک شیر اس قدر لمبا اس طرح کے قد و قامت اور جلد و پوست کا جس کے دانت اس قدر دراز تھے اور جس کے پنجوں کی مقدار ایسی اور ایسی تھی شکار کیا۔

شکار کی اس کیفیت کے ساتھ مجھکو چند لفظ اس افیون کی بابت بھی جو گدھے کو کھلائی جاتی ہے اضافہ کرنے ضروری ہیں۔ چنانچہ ایک ذی رتبہ میر شکار نے مجھ سے کہا کہ یہ تو صرف محض عوام کی بنائی ہوئی کہانی ہے۔ اصل یہ ہے کہ شیر جب خوب پیٹ بھر کر کھا لیتا ہے تو یہ شکم سیری ہی اس کی گہری نیند کا باعث ہو جاتی ہے۔

پنجاب کے دریا اور کشتیوں کے پل میں نے دیکھا کہ بڑے بڑے دریاؤں پر عموماً پل نہیں ہیں اور ان دریاؤں پر سے فوج نے بذریعہ دو تین کے پلوں کے جو کشتیوں سے کسی قدر سو سو ڈیڑھ ڈیڑھ سو کے ساتھ بنائے گئے تھے عبور کیا۔ ان پلوں کے باہم دو تین سو قدم کا فاصلہ رکھا جاتا ہے اور اُن کی سطح پر مٹی اور پھوس ملا کر ڈال دیا جاتا

ہے تاکہ چو پایوں کے پاؤں نہ پھسلیں گھران دونوں کے سروں پر ایک بڑی گھبراہٹ اور پریشانی اور دھکا پیل کا موقعہ ہوتا ہے نہ صرف اس وجہ سے کہ وہاں ایک سخت بھیڑ بھاڑ اور بڑے ہنگامے اور چپقلش کی جگہ ہوتی ہے بلکہ زیادہ تر اس باعث سے کہ اُن کے دونوں سروں کی گذرگاہ چونکہ نرم اور گیلی پھسلنی مٹی سے بناتی جاتی ہے اس وجہ سے راستہ ٹوٹا پھوٹا ہوتا ہے اور اُس میں اتنے گڑھے پڑے ہوئے ہوتے ہیں کہ گھوڑے اور لدے ہوئے بیل ایک دوسرے پر گرے پڑتے ہیں اور اہل لشکر کو اُنھیں گرے پڑے حیوانات کے اوپر سے کمال بے ترتیبی اور گھبراہٹ سے گذرنا پڑتا ہے اور اگر کل فوج کو ایک ہی دن میں پار اترنا پڑتا ہے تو یہ خرابی نہایت ہی بڑھ جاتی ہے۔ لیکن بادشاہ یہ تدبیر کرتا ہے کہ دریا کے اس طرف ایک میل کے فاصلہ پر اپنے ڈیرے کھڑے کرواکر ایک دو دن وہیں ٹھہرے رہنے کی تکلیف گوارا کرتا ہے اور پھر اسی طرح دریا کے پار جا کر دوسرے کنارے پر قیام کرتا ہے اور اس تین دن کے عرصہ میں سب اہل لشکر آہستہ آہستہ دریا سے عبور کر جاتے ہیں۔

شاہی لشکر کی تعداد اور رسد لشکر کے لوگوں کی تعداد کی نسبت فوج اور بھیڑ سمیت ایک ٹھیک اور صحیح حد مقرر کرنی آسان نہیں ہے کیونکہ کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ۔ مگر بہرحال میں بھروسہ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کشمیر کے اس سفر میں کم سے کم ایک لاکھ تو سوار ہوں گے اور ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ جانور یعنی گھوڑے خچر اور ہاتھی اور ان کے علاوہ اونٹ بھی پچاس ہزار سے کم نہ ہوں گے اور قریباً اسی قدر بیل اور ٹٹو جن پر غریب بازاری لوگ خانہ بدوشوں کی طرح اپنے اہل و عیال اور غلّہ وغیرہ اجناس لادے ہوئے لشکر کے ساتھ رہتے ہیں۔

اہل فوج کے نوکر چاکر بھی بے شمار ہوتے ہیں کیونکہ بغیر اُن کی مدد کے کچھ کارروائی نہیں ہو سکتی۔ مثلاً میرا درجہ صرف ایک دو اسپہ سوار کی مانند ہے اور اس پر بھی تین نوکروں سے کم میں میری گذر نہیں ہو سکتی۔ اکثر لوگوں کی یہ رائے ہے کہ کل لشکر کی تعداد تین اور چار لاکھ آدمی کے اندر ہوگی۔ بعض کا یہ قیاس ہے کہ یہ تخمینہ بہت کم ہے اور بعض لوگ اس تعداد کو مبالغہ سمجھتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ صحیح تعداد بغیر مردم شماری کے معلوم نہیں ہو سکتی۔ البتہ میں اعتماد عولی ضرور کر سکتا ہوں کہ فوج کا ہجوم اور انبوہ بے حد اور قیاس سے باہر ہے اور دہلی کی تمام خلقت حقیقتاً لشکر میں جمع ہے۔ کیونکہ اُن کے کام کاج اور

گذران بادشاہ اور لشکر ہی پر منحصر ہے اور ان کے لئے اس کے سوا کچھ چارہ نہیں ہے کہ یا لشکر کے ساتھ جائیں یا دہلی میں پڑے بھوکے مرا کریں۔ کچھ شک نہیں ہے کہ آپ اس کیفیت کو پڑھ کر مجھ سے یہ سوال ضرور کرنا چاہیں گے کہ اس قدر انسانوں اور حیوانوں کے لئے کوچ کی حالت میں خوراک اور چارا کس طرح بہم پہنچتا ہوگا؟ اس کا مختصر اور سب سے بہتر جواب یہ ہے کہ ہندوستانیوں کی خوراک نہایت سیدھی سادی ہے چنانچہ ایک لاکھ سواروں میں سے صرف دس ہزار بلکہ پانچ چھ ہزار ہی ایسے ہوں گے جو گوشت کھاتے ہوں ورنہ سب کے سب کھچڑی ہی پر قانع رہتے ہیں۔ جو چاولوں کے ساتھ مونگ یا ماش وغیرہ ملا کر پکاتے ہیں اور تھوڑا سا گھی اس میں ڈال لیتے ہیں اور یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اونٹ یہاں تک سفر اور بھوک پیاس کی تکلیف اٹھا سکتے ہیں جس سے حیرت ہوتی ہے اور تھوڑے سے ہر قسم کے چارے پر قناعت کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ہر کوچ کے بعد جنگل میں چرنے کو چھوڑ دیئے جاتے ہیں اور ہر قسم کا گھاس پھوس اور جھاڑی وغیرہ ان کے چارے کا کام دیتی ہے۔

یہ امر بھی لحاظ کے لائق ہے کہ وہ اہلِ بازار جو دہلی میں سب قسم کے اجناس وغیرہ بیچا کرتے ہیں وہی سفر میں بھی ان اشیا کی بہم رسانی کے ذمہ دار ہوتے ہیں اور انھیں کی دکانیں خواہ دہلی میں ہوں خواہ سفر میں رسد رسانی کے لئے برابر موجود رہتی ہیں ــــ ان بیچاروں کو گھاس اور چارے کے بہم پہنچانے میں بڑی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے اور وہ اس کام کے لئے گاؤں در گاؤں پھرتے ہیں مگر جو چیز لاتے ہیں اس کو فوج میں اچھے داموں پر بیچنا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کا عموماً یہ معمول ہے کہ ایک خاص قسم کی گھاس جو تمام میدانوں اور جنگلوں میں جا بجا موجود ہے زمین میں سے کھرپے سے کھود لاتے ہیں اور اس کو جھاڑ کر یا دھو کر لشکر میں کبھی تو بہت گراں اور کبھی بہت ارزاں فروخت کرتے ہیں۔

خیمہ گاہ کی خصوصی رسمیں

بادشاہ کے حالات کے سلسلہ میں ایک عجیب بات ابھی کہنی باقی ہے۔ جس کا بیان کرنا میں بھول ہی گیا تھا اور وہ یہ ہے کہ بادشاہ لشکر گاہ میں کبھی تو ایک طرف سے اور کبھی دوسری جانب سے داخل ہوتا ہے۔ یعنی ایک دن تو ایک جانب کے امرا کے خیموں کے قریب سے گذرتا ہے اور اگلے دن دوسرے طرف کے امرا کے ڈیروں کے نزدیک سے۔

آپ یہ گمان نہ فرمائیں کہ یہ ایک اتفاقیہ امر ہے نہیں بلکہ اس کی غرض یہ ہے کہ وہ امرا جن کو بادشاہ اُن کے ڈیروں کے قریب ہو کر گذرنے کا افتخار بخشتا ہے اُن کے لئے ضروری ہے کہ اپنے اپنے خیموں سے اشرفیوں کی ایک ایک تھیلی جن کی تعداد اُن کے حوصلے اور مشاہرے کے موافق بیس سے پچاس تک ہوتی ہے۔ پیش کش کے واسطے ہاتھوں میں لئے ہوئے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ میں اُن شہروں اور قصبوں کا جو دہلی اور لاہور کے راستہ میں پڑتے ہیں کچھ بیان نہیں کرنا چاہتا۔ کیونکہ میں نے اُن میں سے شاید ہی کسی کو دیکھا ہے۔ سبب یہ کہ ہمارے آقا کا ڈیرہ فوج کے وسط میں نہیں ہوتا تھا جہاں سے اکثر شارع عام مل جاتی ہے بلکہ دائیں جانب کے سامنے ہوتا تھا اور اس لئے ہم لوگوں کا یہ معمول تھا کہ رات کو کوچ کے وقت ستاروں کا خیال رکھکر کھیتوں اور پگڈنڈیوں کے راستہ سے چل پڑتے تھے اور اس سبب سے اکثر راہ بھول جاتے تھے اور ڈیرہ پہنچنے تک سیدھا راستہ ملنے میں بڑی دشواریاں پیش آتی تھیں اور اس طرح پر بجائے دس بارہ میل کی مسافت کے جو دونوں پڑاؤں میں معمولاً ہوتی ہے پندرہ یا اٹھارہ میل کی منزل روزمرہ طے کرنی پڑتی تھی۔

تیسرا خط

لاہور سے لکھا گیا

پنجاب کے دریا اور شہر لاہور

صاحب من! یہ امر بے وجہ نہیں ہے کہ وہ ملک جس کا پایۂ تخت لاہور ہے پنجاب کہلاتا ہے کیونکہ واقع میں پانچ دریا اُن بڑے پہاڑوں سے جنھوں نے ولایت کشمیر کا محاصرہ کیا ہوا ہے نکل کر اس صوبہ کے میدانوں میں بہکر دریائے اباسین میں گرتے ہیں جو ملک سندھ میں خلیج فارس کے دہانے کے قریب سمندر میں جا ملتا ہے۔

میں تعیین سے نہیں کہہ سکتا کہ لاہور وہی قدیم شہر ہے جس کو یونانی لوگ بیوسس فلا[1] کہتے تھے۔ کیونکہ اگرچہ الگزینڈر کا نام جس کو اس ملک میں سکندر ابن فیلقوس کہتے ہیں بخوبی

[1] بیوس فلا یونانی میں بیل کے سر کو کہتے ہیں اور یہ ایک گھوڑے کا نام تھا اس مناسبت سے رکھا گیا تھا کہ اس کو اس شکل کا داغ دیا ہوا تھا اور اس کے مرنے کے مقام پر بطور یادگار ایک شہر اُس کے نام پر بسایا گیا تھا۔ م ح

معروف و مشہور ہے۔ مگر یہاں کے باشندے اس کے گھوڑے کی نسبت کچھ واقفیت نہیں رکھتے۔

دریائے راوی وہ دریا جس کے کنارے شہر لاہور آباد ہے پنجاب کے پانچ دریاؤں میں سے ایک بڑا دریا ہے جیسا فرانس میں دریائے لوائیر ہے اور ویسے ہی بلند اور سنگین پشتہ کا محتاج ہے جیسا کہ لوایر کے کنارے پر بنا ہوا ہے۔ کیونکہ اس دریا میں اکثر سیلاب[1] آتے رہتے ہیں جس سے بڑا نقصان ہوتا ہے اور دریا اپنی جگہ کو اکثر بدلتا رہتا ہے۔ چنانچہ چند ہی سال کے اندر پورا نصف میل لاہور سے دور ہٹ گیا ہے جس سے باشندوں کو انتہائی زحمت اور تکلیف ہوتی ہے۔

لاہور کی عمارتیں لاہور کی عمارتیں دہلی اور آگرہ کے برخلاف بہت اونچی ہیں اور چونکہ بیس برس سے زیادہ ہوئے کہ بادشاہ معہ امرا۔ دربار آگرہ یا دہلی میں رہتا ہے اس لئے لاہور کے اکثر مکانات ویران سے ہیں۔ بہت سی عمارتیں تو بالکل منہدم ہو گئی ہیں اور پچھلے چند برسوں کی شدید بارشوں میں بہت بڑے بڑے ہیں جن میں سے دو تین تو طول میں دو میل سے بھی متجاوز ہیں لیکن ان میں اکثر مکانات بالکل گرے پڑے ہیں۔ اور چونکہ دریا کا رُخ تبدیل ہوتا جاتا ہے اس لئے پادشاہی محل دریا کے کنارے سے دور ہو گئے ہیں اور یہ شاہی مکانات بھی اگرچہ بہت عمدہ اور عالی شان بنے ہوئے ہیں۔ لیکن محلات شاہی واقع دہلی اور آگرہ سے ہر ایک بات میں بہت کم ہیں۔

لاہور سے کشمیر دو مہینے سے زیادہ ہوئے کہ اس انتظار میں کہ کوہستان کشمیر کی برف پگھل کر راستہ آسانی سے گذر کے لائق ہو جائے ہم لاہور میں مقیم تھے۔ مگر اب کل ہمارا کوچ ہونے والا ہے اور بادشاہ کو تو لاہور چھوڑے دو روز ہو چکے ہیں[2] میں نے کل رات ایک خوبصورت چھوٹا سا کشمیر کے لائق خیمہ خرید لیا ہے کیونکہ میرے دوستوں نے یہ صلاح دی تھی کہ اپنے پہلے خیمے کو جو بڑا اور بھاری ہے اب آگے نہ لے جانا چاہیئے۔ وہ کہتے ہیں کہ کشمیر کے پہاڑوں پر جہاں اونٹ نہیں جا سکتے ہمارے تمام خیموں کے واسطے جگہ ملنی بہت مشکل ہوگی اور چونکہ اس صورت میں مجھکو اپنی باربرداری کے واسطے مزید اور قلی درکار ہوں گے تو اپنے پہلے خیمے کے ساتھ لیجانے کی حالت میں بہت خرچ پڑتا

---

[1] ل د ای ر

[2] عالمگیر نامہ میں لکھا ہے کہ انیسویں رمضان ۱۰۷۴ھ کو لاہور سے کوچ ہوا تھا۔ س م ح

چوتھا خط

جو لاہور و کشمیر کی درمیانی منزلوں سے لکھا گیا

راستہ کی سخت گرمی اور اُس کے اسباب

صاحب من ! مجھکو یہ اُمید تھی کہ جیسی گرمی اپنے باب المندب کے قریب بمقام مُخا میں اُٹھا چکا ہوں آفتاب کی ایسی جلا دینے والی شعاعیں روئے زمین پر کسی جگہ نہ پاؤں گا۔ لیکن چار روز ہوئے یعنی جب سے کہ فوج نے لاہور سے کوچ کیا ہے میری اس امید کا خاتمہ ہو گیا۔۔۔ ہندوستانی لوگ جو اسی گرم ملک کے باشندے ہیں جب کہ وہ کبھی لاہور سے چلتے وقت یہ اندیشہ اور تردد ظاہر کرتے تھے کہ بھمبر تک پہنچنے میں (جو کوہستان کشمیر کا دروازہ اور گیارہ دن کا سفر ہے) بڑی ہی تکلیف اٹھانی پڑے گی۔! تو یہ سُن کر مجھے تعجب ہوتا تھا۔ مگر اب تو فی الواقع میرا تعجب بالکل رفع ہو گیا ہے اور میں بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ گرمی کی شدت سے نزع کی حالت کو پہنچ گیا ہوں اور کوئی باور نہ کرے گا کہ آج صبح جب میں اُٹھا تو مجھے بہت ہی تھوڑی اُمید تھی کہ آج کی دھوپ مجھ کو زندہ چھوڑے گی۔

یہ عجیب گرمی کشمیر کے بلند پہاڑوں کے باعث سے ہے جو ہمارے راستے پر شمال کی طرف ہونے کی وجہ سے ٹھنڈی اور فرحت بخش شمالی ہوا کے پہنچنے میں سدِ راہ ہیں! اور مزید برآں آفتاب کی سوزاں شعاعیں ان پہاڑوں سے منعکس ہو کر جب اس قطعہ ملک پر پڑتی ہیں تو تمام زمین کو خشک کر دیتی ہیں اور ان سے لبس سمجھئے دم گھٹنے لگتا ہے۔ لیکن اس شدید گرمی کے بارے میں، جو شاید کل تک مجھے زندہ بھی نہ چھوڑے ایسی فلسفیانہ رائیں لکھنے سے گلو خلاصی ہو جاتے یہ کہاں ممکن ہے!

پانچواں خط

کشمیر جاتے ہوئے چھٹی منزل سے

دریائے چناب اور اُس کا پانی

صاحب من! کل میں ہندوستان کے ایک بڑے دریا سے جس کو "چناب" کہتے ہیں پار اُترا اس دریا کے لطیف اور عمدہ پانی سے جس کو بڑے بڑے اُمرا بجائے گنگا کے پانی کے جواب تک اُن

کے ساتھ تھا اپنے اپنے صرف کے لئے بھر رہے ہیں ۔ مجھکو یہ اُمید ہوتی ہے کہ اس دریا کا منبع جدھر کو ہم جا رہے ہیں ہمیں تحت الثریٰ کو نہیں لے جائے گا بلکہ فی الواقع کشمیر کی طرف رہنمائی کرے گا ۔ جس کی بابت سب لوگ مجھکو تسلی دے رہے ہیں کہ وہاں کی برف اور یخ کے سیر و تماشے سے تم خوش ہو جاؤ گے ۔

ہر روز روز گذشتہ سے زیادہ ناقابل برداشت ہوتا ہے اور جتنے ہم آگے بڑھتے ہیں اُتنی ہی گرمی بھی بڑھتی جاتی ہے ۔

اگرچہ یہ بات درست ہے کہ میں نے ٹھیک دوپہر کی دھوپ میں جب کہ سب لوگ اپنے اپنے ڈیروں میں دن ڈھلنے کے انتظار میں آرام کر رہے تھے کشتی کے پُل سے عبور کیا ۔ لیکن اگر میں اپنے ڈیرے میں گھسا بیٹھا رہتا تو غالبًا مجھے اپنی تکالیف میں کچھ کمی ہو جانے کی توقع نہ تھی ۔ اور میں نے جس غرض سے یہ تدبیر اختیار کی تھی وہ مطلب حاصل ہو گیا ۔ یعنی یہ کہ ہم بلا دقت و تشویش پُل سے پار ہو گئے ۔

جب سے ہم دہلی سے روانہ ہوتے ہیں ایسی پریشانی اور چپقلش میں نے کسی دریا کے گھاٹ پر نہیں دیکھی مگر شاید میری ہوشیاری اور دور اندیشی ہی اس امر کا باعث ہوئی کہ میں اس دریا پر کسی تہلکہ میں پڑ جانے سے بچ گیا ۔ کیونکہ پُل کے دونوں سروں کا داخلہ چڑھنے اور اُترنے کے لئے نہایت خراب اور خطرناک تھا جس کا سبب یہ تھا کہ داخلہ کی یہ گذرگاہ جسے "سلامی" کہتے ہیں ۔ جس پر چڑھنا اور اُترنا امر ضروری ہے نرم مٹی اور ریت سے بنائی گئی تھی جو بے شمار جانوروں کے پاؤں کے نیچے دریا کے زور کے مارے بہہ جاتی تھی اور اسی وجہ سے بڑے بڑے گڑھے پڑ گئے تھے جن میں بہت سے اونٹ بیل اور گھوڑے گرتے اور لوگوں کے پاؤں تلے کچلے جاتے تھے اور اس پر طرہ یہ تھا کہ ہر طرف برابر دھکم دھکا اور گھونسم گھانسی ہوتی تھی ۔ کیونکہ ایسے موقعوں پر عمومًا یہ ہوتا ہے کہ عہدہ دار اور سوار جو اُمرا کے ہم رکاب ہوتے ہیں ! اپنے آقا اور اُن کے اسباب وغیرہ کو پہنچانے کی خاطر راستہ میں سے لوگوں کو ہٹانے کے لئے بڑی بے باکی سے ڈنڈے بازی کرتے ہیں ۔ اس دریا پر ہمارے نواب کا بھی ایک اونٹ معہ لوہے کے تنور کے جوائس پر لدا ہوا تھا ضائع ہو گیا ہے اور اب مجھکو یہ فکر ہے کہ ہمیں بازار کی روٹی کھانی پڑے گی ۔

چھٹا خط

کشمیر کی آٹھویں منزل سے

گرمی کی شدت

شفیقِ من! ایک یوروپین شخص کا ایسی سخت گرمی کے تحمل پر آمادہ ہو جانا اور ایسی ہولناک اور پُر تعب منازل اور سفر کے جھمیلوں میں پڑ جانا حیرت انگیز ہے اور خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کون سی چیز ہے کہ جس کے سبب سے کوئی شخص خواہی نخواہی ان مصیبتوں کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہو جائے؟ افسوس کہ اس کا جواب بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ ہم لوگوں میں دنیا کے عجائبات کی دید کا شوق حد سے بڑھا ہوا ہے وہی ان سب تکلیفوں کا باعث ہے حالانکہ شوق کیا ہے ایک سخت حماقت و ناعاقبت اندیشی ہے چنانچہ اس سفر میں میری جان ایک مسلسل اور غیر منقطع خطرہ کی حالت میں ہے اور کچھ امید ہے تو صرف یہ ہے کہ شاید اس بُرائی میں کوئی بھلائی اور فائدہ بھی نکل آئے۔

جب میں لاہور میں تھا تو ایک بار رات کو سایہ کئے بغیر صحن میں چبوترے پر سو گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شبنم اور سردی کے سبب سے سخت زکام اور اعضا کی دکھن میں مبتلا ہو گیا تھا (حالانکہ دہلی میں اس طرح سونے سے عموماً کچھ اندیشہ نہیں ہوتا) اور میری صحت خراب ہو گئی تھی۔ لیکن جب سے سفر شروع ہوا ہے تو آٹھ لوروز سے بے حد پسینہ آنے کی وجہ سے تمام فاسد رطوبتیں جسم سے خارج ہو گئی ہیں اور میرا جلا بھُنا اور مرجھایا ہوا جسم گویا پانی کی چھلنی بن گیا ہے۔ اور سیر بھر پانی جو میں ایک ہی دم میں چڑھا جاتا ہوں بدن کے رویں رویں بلکہ اُنگلیوں کے پوروں تک سے فوراً نکل پڑتا ہے۔ چنانچہ آج میں نے دس گیارہ سیر سے کم پانی نہیں پیا ہوگا۔ مگر ان سب آفتوں اور مصیبتوں میں یہ بڑی تسکین کی بات ہے کہ جس قدر جی چاہے ہم اُسی قدر پانی بشرطیکہ صاف اور شیریں ہو بلا اندیشہ پی سکتے ہیں۔

ساتواں خط

سفر کشمیر دسویں منزل صبح کے وقت

زیست سے ناامیدی

صاحب من! آفتاب اب تک اچھی طرح نکلا بھی نہیں مگر

اس پر بھی گرمی کا یہ عالم ہے کہ اُٹھائی نہیں جاتی - بادل نام کو بھی نہیں اور ہوا کی یہ حالت ہے کہ پتہ تک نہیں ہلتا۔ میرے گھوڑے بالکل تھک گئے ہیں ۔کیونکہ جس دن سے لاہور چھوڑا ہے ان غریبوں نے ہری گھاس کا تنکا تک نہیں دیکھا ۔ میرے ہندوستانی نوکروں کو بھی باوجود اپنے کالے خشک اور سخت بدن کے آگے قدم بڑھانے کا حوصلہ نہیں رہا ۔ ہمارے چہرے اور پاؤں اور ہاتھوں کی جلد تمام پھٹ گئی ہے اور سارا بدن چھوٹے چھوٹے سرخ گرمی دانوں سے بھر گیا ہے جو سوئی کی طرح چبھتے ہیں ۔ کل ہمارا ایک غریب سوار جس کے پاس ڈیرہ نہ تھا ایک درخت کے نیچے جس کے سایہ میں وہ ٹھہرا ہوا تھا مُردہ ملا اور مجھے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ گویا آج دن ہی دن میں تمام ہو جاؤں گا ! اور میری ساری امیدیں یا تو اُن چار پانچ کاغذی نیبوؤں پر منحصر ہیں جو ابھی باقی ہیں یا تھوڑے سے خشک کئے ہوئے دہی پر جس کو میں پانی اور قند ملا کر ابھی پینے والا ہوں۔

اچھا تو خدا حافظ ! سیاہی قلم کی نوک پر خشک ہوئی جاتی ہے اور قلم ہاتھ سے گرا جاتا ہے ۔

اٹھواں خط

آگ کی بھٹی صاحب من ! آخرکار ہم بھمبر میں آ پہنچے جو ایک اونچے اور سیاہ اور جھُلسے ہوئے پہاڑ کے دامن میں ہے اور ہمارا خیمہ ایک خشک پہاڑی ندی کے بہاؤ میں پتھریلوں اور جلتی ہوئی ریت پر جس کو آگ کی بھٹی کہنا چاہیئے لگا ہوا ہے ۔ اور اگر آج اتفاق سے ایک اچھا خاصا مینہ کا چھینٹا نہ پڑ جاتا اور عین وقت پر پہاڑ سے ایک معقول مقدار میں نیبو دہی اور مرغ وغیرہ نہ پہنچ جاتے تو معلوم نہیں کہ آپ کے اس بیچارے وقائع نگار کا کیا حال ہو جاتا ۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ فی الحال تو ہوا کسی قدر سرد ہو گئی ہے اور میری بھوک بھی کھُل گئی ہے اور قوت میں اضافہ معلوم ہوتا ہے اور سب سے پہلے جو میں نے اپنی بازیافتہ صحت سے کوئی کام لیا ہے تو وہ اس خط ہی کا لکھنا ہے ! اب آپ کو نئی نئی منزلوں اور پیش آنے والی تکالیف سے

ضرور مطلع کیا جائے گا۔

کل رات کو بادشاہ نے اس جگہ جہاں دم گھٹا جاتا ہے چھوڑ دیا ہے اور اس کے ہمراہ روشن آرا بیگم اور محل کی اور بیگمیں اور راجہ رگھناتھ جو وزیر کے فرائض انجام دیتا ہے اور فاضل خاں میر سامان اعلیٰ چلے گئے ہیں! اور اس سے پہلی رات کو بادشاہی میر شکار بھی کئی بڑے بڑے عہدہ داروں متعلقہ کارخانہ جات خاصہ شریفہ اور چند معزز خاتونوں کے ساتھ روانہ ہو گیا ہے آج رات ہماری باری ہے۔ اور ہمارے گروہ میں ہمارے نواب دانشمند خاں کے کنبے کے لوگوں کے سوا محمد امین خاں خلف میر جملہ جس کا بہت کچھ ذکر لکھا جا چکا ہے اور میرا معزز دوست دیانت خاں اور اس کے دو بیٹے اور بہت سے اور امرا اور راجہ اور منصب دار شامل ہیں! اور امرا بھی جنھیں کشمیر چلنے کا حکم ہے۔ اسی طرح نوبت بہ نوبت روانہ ہوں گے تاکہ اس پانچ دن کے مشکل اور کوہستانی راستہ میں جو بھمبر اور کشمیر کے مابین ہے بے آرامی اور ابتری کم ہو جائے۔

پہاڑ پر چڑھائی باقی اہل دربار جیسے فدائی خاں میر آتش (افسر اعلیٰ توپ خانہ) اور تین چار بڑے بڑے راجہ اور بہت سے امرا تین چار مہینے تک یعنی جب تک کہ گرمی کا موسم گذر جائے اور بادشاہ سلامت واپس تشریف لائیں محافظت کے واسطے پہرہ کے طور پر اسی قصبہ یا اس کے قرب وجوار میں مقیم رہیں گے۔ جن میں سے بعض تو اپنے ڈیرے دریائے چناب کے کنارے لگا لیں گے اور بعض قریب اور گردو نواح کے شہروں اور دیہات کو چلے جائیں گے اور باقی کو اسی بھمبر کی جلتی ہوئی زمین پر ڈیرے ڈالے پڑے رہنا ہوگا۔

بادشاہ کے ہم رکاب بہت ہی کم اور خاص خاص لوگ جائیں گے تاکہ کشمیر کی چھوٹی سی ولایت میں رسد وغیرہ کی طرف سے دقت عائد نہ ہو۔

بیگمات میں سے صرف وہ اعلیٰ درجہ کی خاتونیں جائیں گی جو روشن آرا بیگم کی ہمدم اور سہیلیاں ہیں۔ یا وہ عورتیں جن کا ساتھ ہونا خدمات و ہمراہی کے لئے ضروری ہے! امرا اور فوج کے لوگ بھی جہاں تک ممکن ہے کم ہی ہوں گے اور جن امرا کو ہمراہی کی اجازت

۱؎ اس بایا فت بڈھے ہندو وزیر نے اسی سفر میں انتقال کیا اور اس کے بعد بھی فاضل خاں وزیر ہوا تو وہ بھی صرف چند روز زندہ رہ کر اسی سفر میں بمقام کشمیر چل بسا۔ س م۔ ح (از عالمگیر نامہ)

لی ہے اُن کے ساتھ اُن کے سواروں میں سے فی صدی پچیس سوار سے زیادہ نہ ہوں گے لیکن جو ضروری ملازم عہدہ داروں کے ذاتی کارخانہ جات پر مقرر ہیں وہ بہرحال ساتھ جائیں گے۔

ان قاعدوں کی بجا آوری میں کوئی مباشہ پیش نہیں چل سکتا کیونکہ ایک امیر پہاڑ کے درّے پر متعین کیا گیا ہے جو ایک ایک آدمی آدمی کو شمار کرتا ہے اور اپنے اختیارات کے مطابق منصب داروں کی بھیڑ کو جو کشمیر کی ٹھنڈی اور لطیف ہوا کے مشتاق ہیں اور اُن کے چھوٹے چھوٹے دکان داروں اور اہلِ بازار کو جو صرف کھانے کمانے کی خاطر آئے ہیں درّے میں داخل ہونے سے روکتا رہتا ہے۔

چند منتخب ہاتھی بھی زنانی سواریوں اور باربرداری کے واسطے بادشاہ کے ساتھ ہیں ۔۔ اگرچہ یہ جانور بہت بھاری اور بڑے قدوقامت کے ہیں ۔۔ لیکن نہایت ہی جانچ کر قدم رکھتے ہیں اور راستہ کے مشکل اور خطرناک ہونے کی حالت میں اس طرح ٹٹول ٹٹول کر چلتے ہیں کہ جب تک پہلا قدم بخوبی جم نہیں جاتا دوسرا قدم نہیں اُٹھاتے۔ بادشاہ کے ہمراہ کچھ خچریں بھی ہیں ۔۔ لیکن اُونٹ جو بہت کار آمد ہیں پیچھے چھوڑ دیئے گئے ہیں کیونکہ اُن کی سخت اور لمبی لمبی ٹانگوں کے لئے یہ پہاڑی راستے موزوں نہیں ہیں۔

باربرداری اس لئے اُن کے عوض قلی اور مزدوروں سے کام لیا جاتا ہے ۔۔ اور جیسا کہ میں نے سُنا ہے کہ صرف اکیلے بادشاہ کے واسطے چھ ہزار مزدور مطلوب ہیں تو اس سے آپ قیاس کر سکتے ہیں کہ کس قدر مزدور درکار ہوں گے۔ چنانچہ مجھے اپنی ذاتِ خاص کے واسطے تین مزدور بہم پہنچانے ضروری ہیں باوجودیکہ میں نے اپنا بڑا خیمہ اور بہت سا اسباب لاہور میں چھوڑ دیا ہے اور ہر شخص نے بلکہ بڑے بڑے اُمرا اور خود بادشاہ نے بھی ایسا ہی کیا ہے ۔۔ پھر بھی حساب لگایا گیا ہے کہ کم سے کم پندرہ ہزار مزدور بھمبر میں جمع ہو چکے ہیں جو کچھ تو کشمیر کے صوبہ دار اور قرب وجوار کے راجاؤں نے بھیجے ہیں اور کچھ اپنی مرضی سے مزدوری کرنے کو چلے آتے ہیں اور بادشاہ کے حکم سے شرح اُجرت یہ قرار پائی ہے کہ سوامن یعنی پچاس سیر بوجھ کے واسطے پچیس[۲۵] روپے مزدوری دی جائے۔ اور شمار کیا گیا ہے کہ کوئی تیس ہزار مزدور اس وقت مطلوب ہیں۔ اور جب کہ بادشاہ اور اُمرا اپنا اپنا اسباب اور سوداگر اپنی سب قسم کی رسد وغیرہ ایک مہینے پہلے سے برابر بھیجتے رہتے ہیں تو مزدوروں

کی تعداد نہایت ہی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

نواں خط

کشمیر جنت نظیر سے تین ابیہ

سرزمین کشمیر صاحب من! کشمیر کے قدیم راجاؤں کی تاریخ میں یوں مندرج ہے کہ یہ تمام ملک اگلے زمانہ میں ایک بہت بڑی جھیل تھا جس کے پانی کو ایک بڈھے رشی نے جس کا نام کاشپ تھا اپنی کرامات سے بارہ مولا کے پہاڑ کو چیر کر نکال دیا۔

یہ حال اُس کتاب میں مل سکتا ہے جو جہانگیر کے حکم سے کشمیر کی قدیم تاریخوں کا خلاصہ کرکے فارسی زبان میں لکھی گئی تھی اور جس کا میں آج کل ترجمہ کر رہا ہوں ۔ بے شک میرا دل کبھی اس بات کے انکار کرنے کی طرف مائل نہیں ہوتا کہ یہ حصہ زمین کسی وقت پانی میں ڈوبا ہوا نہیں تھا۔ چنانچہ تھسلی[1] اور اور ملکوں کی نسبت بھی ایسی ہی روایتیں چلی آتی ہیں ۔ لیکن میں آسانی سے یہ امر باور نہیں کرسکتا کہ یہ شگاف کسی انسان کا کام ہے ۔کیونکہ یہ پہاڑ جس میں سے پانی کا گذر ہوا ہے بہت ہی لمبا چوڑا اور نہایت بلند ہے۔ بلکہ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہاڑ کسی قدرتی خلا میں جو سرنگ کی طرح پہاڑوں میں اکثر ہوتی ہیں کسی سخت بھونچال کے صدمہ سے جو اس ملک میں بہت ہی آتے رہتے ہیں دھس گیا ہے ! اگر ہم اُس نواح کے عربوں کے قول کا بھی اعتبار کرلیں تو ماننا پڑے گا کہ باب المندب بھی کسی زمانہ میں اسی طرح بنا تھا کہ تمام شہر اور پہاڑ ایک غار میں دھس کر بڑے بڑے تالاب اور جھیلیں بن گئیں۔

ولایتِ کشمیر کا طول وعرض بہرحال اب تو کشمیر جھیل نہیں ہے بلکہ ایک خوش نما ملک ہے جس میں بہت سی متفرق پہاڑیاں اور پہاڑ ہیں ۔ اور جس کا طول قریب تیس لیگ یعنی نوّے میل انگریزی کے ہے اور عرض دس بارہ لیگ ۔ ولایت کشمیر لاہور سے شمال کی طرف ملک ہندوستان کے انتہا پر واقع ہے اور اس کی سرحد پر ایسے پہاڑوں کا سلسلہ ہے جو کوہ قاف سے نیچے چھوٹی اور بڑی تبت

---

[1] ملک یونان کے ایک ضلع کا نام ہے د س ۔م ۔ ح تھسلی ۔ تھس سے لی نی

کے بادشاہوں اور راجہ گو ان[1] کی عمل داریوں میں ہیں۔

جو پہاڑ کشمیر کے گرداگرد اور بہت ہی نزدیک ہیں اُن کی بلندی اوسط درجہ پر ہے اور سرسبز درختوں سے آراستہ اور چراگاہوں سے مالا مال ہیں جن پر گائیں۔ بھیڑیں۔ بکریاں۔ گھوڑے۔ اور سب قسم کے مویشی چرتے نظر آتے ہیں۔

مویشی، شکار اور شہد سب قسم کے شکار مثلاً تیتر۔ خرگوش اور سینگوں[2] والے ہرن اور کستورا ہرن کبثرت موجود ہیں اور شہد کی مکھیاں بھی بافراط ہیں۔

برخلاف ہندوستان کے ایک عجیب اور نادر بات دیکھنے میں آئی ہے کہ یہاں موذی جانور مثلاً سانپ، ریچھ۔ شیر۔ چیتا وغیرہ کمیاب کیا بلکہ معدوم ہیں اور ان اوصاف کے باعث ان پہاڑوں کو صرف خوش نما اور بے ضرر اور بے خلش ہی نہیں کہنا چاہیے۔ بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ گویا اُن میں دودھ اور شہد کی نہریں افراط کے ساتھ جاری ہیں۔ ان پہاڑوں سے پرلی طرف اور بڑے بڑے عظیم الشان پہاڑوں کی بلندیاں نظر آتی ہیں جن کی برف سے ڈھکی ہوئی سفید سفید چوٹیاں بادلوں سے ہمیشہ زیادہ بلند اور اونچی اور کوہ اولیمپس[3] کی مانند روشن اور صاف معلوم ہوتی ہیں۔

---

[1] گِ دَمَ ان

[2] فرنگستان میں سینگ والے ہرن کم ہوتے ہیں۔ اس لئے مصنف نے ہرن کے لفظ کے ساتھ سینگوں والے کا لفظ لکھا ہے ۔ س۔م۔ح

[3] یہ پہاڑ یوناں کے صوبہ تھسّلی اور میسی ڈونیا (مقدونیا) کے مابین سرحدی خط پر واقع ہے اور مقدونیا کے میدان سے جو اس کے شمال میں اور خوش نما وادی ٹیمپ سے جو اس کے جنوب میں ہے نو ہزار سات سو چوں فٹ اونچا اور آس پاس کے سب پہاڑوں کی چوٹیوں سے بلند ہے۔ اور شاہ بلوط اور اخروٹ وغیرہ درختوں کے جنگلوں سے لدا ہوا ہے۔ اس کا چٹان دار حصہ کچھ آگے بڑھکر بہت سی چوڑی چوڑی کھوؤں میں منقسم ہوگیا ہے اور اس کی چوڑی چوٹی برف کی سفید اور چمکدار چادر اوڑھے ہوئے گویا آسمان سے باتیں کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اولیمپس کی اس عظمت و شان کی وجہ سے قدیم یونانیوں نے اس کو اپنے دیوتاؤں کا مسکن خیال کیا تھا اور اُن کا یہ اعتقاد تھا کہ اُن کا دیوتا جوُدجو جوپِٹر یعنی مشتری کا دوسرا نام ہے۔ اور جس کو اہلِ ہند کے معتقدات کے

چشمے اور دریا ان سب پہاڑوں میں سے بے شمار چشمے اور نہریں بڑے زور شور سے جاری ہیں جو مصنوعی ذریعوں سے اس وادی کے چھوٹے چھوٹے ٹیلوں پر بھی پہنچا دی جاتی ہیں۔ اور اس طرح سے لوگ اپنے دھانوں کے کھیت بخوبی سینچ سکتے ہیں؛ اور یہ سب پانی اس دلچسپ ملک میں ہزاروں چشمے اور آبشاریں بن کر آخر کا خوبصورت اور کشتیوں کے چلنے کے لائق ایک ایسا دریا بن جاتا ہے جیسا ہمارے ملک فرانس میں دریائے "سین" ہے۔ یہ دریا تدریج اور آہستگی کے ساتھ اس ملک کے گرداگرد پیچ کھاتا اور یہاں کے شہر پائے تخت میں سے ہو کر چپ چاپ بارہ مولا کی طرف خم کھاتا ہوا نکل گیا ہے جہاں اس کو دو عجیب چٹانوں کے مابین ایک مخرج ملتا ہے اور یہاں سے بہت سی چھوٹی چھوٹی ندیوں سمیت جو پہاڑوں سے نکلتی ہیں ایک بہت سیدھی ڈھال پر گر کر شہر اٹک کے نزدیک دریائے اباسین سے آملتا ہے۔

سرسبزی اور شادابی بے شمار نہریں اور آبشار جو پہاڑوں سے جاری ہیں۔ وہ اس وادی اور یہاں کی پہاڑیوں کو نہایت سرسبز اور شاداب رکھتے ہیں اور تمام ملک سرسبز اور سیر حاصل اور ایک پھولا پھلا باغ معلوم ہوتا ہے اور اس خوش نما اور دل کش سرسبزی کے اندر کہیں تو گاؤں اور مزارعے دکھائی دیتے ہیں۔ اور کہیں ہری بھری چراگاہیں اور انگور۔ دھان۔ گیہوں۔ سن۔ زعفران اور ترکاریوں کے کھیت جن میں کہیں تو چھوٹے چھوٹے تالاب ہیں اور کہیں نہریں اور نالے اور کسی جگہ

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ لحاظ سے اس جگہ تمثیلاً اندر کہنا چاہئے اسی پہاڑ پر بیٹھ کر آسمان کو گرجنے والے بادلوں سے پُر کرتا اور اپنی بجلی کے آتشیں تیروں کو ادھر اُدھر پھینکتا تھا اور وہ اپنے محل میں جس کو وکن یعنی دیو یونانیوں کے اعتقاد میں پاتال یعنی زیر زمین کی آگ اور دھاتوں کا دیوتا تھا؛ اس کے لئے یہاں بنایا تھا دیوتاؤں کو جمع کر کے بیاہ اور جگ رچایا کرتا تھا اور ایک راستہ سے جو اس آسمانی محل کو یہاں گنبد میں بنایا گیا تھا اور جس کے دروازے پر نہایت گاڑھے بادل تختوں کا کام دیتے تھے جب جی چاہتا تھا اس جہاں کے اس طرف چلا جایا کرتا تھا۔ یونان کے قدیم شاعروں نے اس پہاڑ کی تعریف میں بہت کچھ کہا ہے اور فی الواقع وہ اب بھی اپنے سرسبز اور ہرے بھرے سایہ دار جنگلوں (یعنی) دھاروں اور کھوؤں اور سفید سفید چمکیلی چوٹیوں کے سبب سے ایسا ہی قابل تعریف ہے۔ فقط ماخوذ از انسائیکلو پیڈیا برطانیکا۔ س۔م۔ح۔

آبشاریں اور چشمے جو ایک عجیب اور دل فریب کیفیت دکھاتے ہیں اور زمین کی تمام سطح فرنگستان کے پھولوں اور پودوں سے مینا کار نظر آتی ہے۔ اور ہمارے ملک کے میووں سیب ناشپاتی۔ آلوچہ، خوبانی اور اخروٹ کے درختوں سے جن میں بے شمار پھل لگے ہوئے ہیں۔ سارا علاقہ لدا ہوا ہے۔ خربوزہ تربوز اور ہمارے دیس کی اکثر ترکاریاں مثل چقندر وغیرہ اور اور ساگ پات اور نباتات جن سے ہم واقف بھی نہیں یہاں کے عام کھیتوں اور باغیچوں میں بکثرت ہیں۔

یہاں کے پھل ہمارے ملک کے میووں سے خوبی میں بلاشبہ کم ہیں اور نہ اتنی قسم ہی کے ہیں لیکن مجھے یقین کامل ہے کہ یہاں کی زمین کا قصور نہیں ہے بلکہ اس باعث کاشت کاروں اور باغبانوں کی نادانی ہے جو اہل فرانس کی طرح فن زراعت اور درختوں کو پیوند وغیرہ کرنے کے ہنر میں ماہر نہیں ہیں۔ بہرحال میں نے اپنے قیام کشمیر کے زمانہ میں نہایت نفیس اور لطیف میوے بکثرت کھائے ہیں اور کچھ شک نہیں ہے کہ اگر یہاں کے لوگ تخم کاری کو ترقی دیں اور ان میں غیر ملکوں کے درختوں کے پیوند لگانے کی طرف ذرا توجہ کریں تو یہاں کے میوے فرنگستان کے میووں کی خوبی کو پہنچ سکتے ہیں۔

شہر اور ڈل ملک کشمیر کے پائے تخت کا نام بھی کشمیر ہی ہے اور اس کے گرد کوئی شہر پناہ نہیں ہے۔ اس کا طول دو میل سے کچھ زیادہ ہے اور عرض ڈیڑھ میل! شہر کشمیر ایک میدان میں واقع ہے جس کا فاصلہ پہاڑوں سے قریب چھ میل کے ہے۔ اور یہ پہاڑ نصف دائرہ کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ اور شہر ایک شیریں اور خوشگوار پانی کے "ڈل" کے کنارے جس کا محیط بارہ یا پندرہ میل سے کم نہ ہوگا آباد ہے یہ ڈل اُن چشموں اور نالوں سے بن گیا ہے جو پہاڑوں سے آکر گرتے ہیں۔ اور اس کا پانی بذریعہ ایک نہر کے جس میں کشتیاں بے تکلف چل سکتی ہیں اُس دریا میں جا ملتا ہے جو شہر کے بیچ میں بہتا ہے۔ شہر میں اس دریا پر لکڑی کے دو پل بنے ہوئے ہیں اور شہر کے مکانات اگرچہ اکثر چوبی ہیں۔ لیکن خوبصورت اور دو منزلے اور سہ منزلے بنے ہیں۔

عمارتیں اگرچہ اس ملک میں ایک نہایت نفیس رنگ[1] دار پتھر پایا جاتا ہے اور پرانے

[1] اصل کتاب میں لفظ نرگی مشون ہے۔

پرانی عمارتیں اور ہندوؤں کے بہت سے پرانے مندر جو یہاں کے کھنڈروں میں موجود ہیں پتھر ہی کے ہیں۔ لیکن یہاں کے لوگ لکڑی کو پتھر پر اس واسطے ترجیح دیتے ہیں کہ ایک تو ارزاں ہے دوسرے یہ کہ پہاڑوں سے ان بے شمار ندی نالوں کے ذریعہ بآسانی پہنچ جاتی ہے

اکثر مکانات میں جو دریا کے دونوں کنارے بنتے چلے گئے ہیں۔ نہایت خوش نما چھوٹے چھوٹے باغیچے ہیں جو خصوصاً بہار اور گرمی کے موسم میں جب کہ عیش و نشاط کے بہت سے جلسے پانی پر کئے جاتے ہیں عجب کیفیت سی رہتی ہے۔

اس شہر کے اکثر مکانوں میں کہیں باغ اور ایسی نہریں ہیں جن میں سیر و تفریح کے لئے کشتیاں پڑی رہتی ہیں۔ اور مالک مکان جب چاہتے ہیں سوار ہو کر ڈل کی سیر کر آتے ہیں۔

ہری پربت شہر کے پرے سرے پر ایک ایسا ٹیلہ نظر آتا ہے جو بالکل الگ ہے اور اُس کی ڈھلانوں پر کئی خوبصورت مکان بنے ہوئے ہیں اور ہر ایک مکان کے ساتھ ایک ایک باغ ہے اور اس کی چوٹی کی طرف ایک نہایت اچھی مسجد ہے جس کے ساتھ عابدوں اور گوشہ نشینوں کے لئے عمدہ عمدہ حجرے بنے ہوئے ہیں۔ اور پہاڑ کی چوٹی پر ایک جھنڈ بہت سے خوبصورت درختوں کا ہے اور ان سب چیزوں کا مجموعہ نہایت ہی دلچسپ منظر پیش کرتا ہے۔ اور ان سرسبز درختوں اور باغوں کی وجہ سے اس جگہ کا نام اس ملک کی زبان میں ہری پربت۔ یعنی سرسبز پہاڑ[1] مشہور ہے۔

تخت سلیمان اس پہاڑ کے مقابل ایک اور پہاڑ نظر آتا ہے اور اُس پر بھی ایک چھوٹی سی مسجد معہ باغ کے بنی ہوئی ہے۔ ایک اور نہایت ہی قدیم

---

[1] یہ وجہ تسمیہ خلاف محاورہ ہونے کی وجہ سے غلط ہے۔ کیونکہ سرسبز پہاڑ کو ہری پربت نہیں کہہ سکتے بلکہ ہرا پربت کہنا چاہئیے۔ اور وہ وجہ تسمیہ صحیح معلوم ہوتی ہے جو دیوان کرپارام صاحب آنجہانی دیوان ریاست جموں و کشمیر مولف تاریخ موسوم بہ گلزار کشمیر نے اپنی اس کتاب مطبوعہ ۱۸۷۰ء میں لکھی ہے یعنی یہ کہ چونکہ کشمیری زبان میں ہاری شارک کو کہتے ہیں جو ایک معروف جانور ہے پس اس پہاڑ پر شارکا دیوی کے مندر کے ہونے کی وجہ سے اس کا یہ نام مشہور ہو گیا ہے۔ اور صحیح نام ہاری پربت ہے۔ ۔س م ع۔

عمارت موجود ہے جو ظاہری علامتوں سے ہندوؤں کا مندر معلوم ہوتی ہے اگرچہ اُس کا نام تخت سلیمان ہے اور یہاں کے مسلمانوں کا یہ دعویٰ ہے کہ حضرت سلیمان نے بموقع سیر کشمیر اُس کو تعمیر کیا تھا۔ لیکن مجھے شبہ ہے کہ اُس مشہور بادشاہ[1] نے اپنی تشریف آوری سے کبھی اس ملک کو مشرف کیا ہو اور میری رائے میں یہ لوگ اس کا کوئی ثبوت نہیں دے سکتے۔

سرسبز ٹاپو کشمیر کے ڈل میں بہت سے چھوٹے چھوٹے خوش منظر ٹاپو ہیں جو پانی کے اندر بالکل سرسبز اور نہایت ہی خوبصورت اور میوہ دار درختوں سے لدے ہوئے نظر آتے ہیں اور اُن میں نہایت خوش اسلوبی سے بہت سی روشیں بنائی ہوتی ہیں جن پر عموماً دونوں جانب سے سفیدے کے درخت جو دو دو قدم کے فاصلہ سے لگائے ہوئے ہیں۔ ان درختوں کی موٹائی اگرچہ اس قدر ہے کہ سب سے بڑا درخت آدمی کی کولی میں آسکتا ہے مگر اونچائی میں جہاز کے مستول کے برابر ہیں اور اُن کی چوٹی پر کھجور کی طرح ڈالیوں اور پتوں کی چھتری ہے۔

خوش منظر پہاڑ جو پہاڑ ڈل کے پرلی طرف ہیں اُن کی ڈھلانوں پر بے شمار گنجان مکانات اور پھلواری کے باغیچے بنے ہوتے ہیں اور یہاں کی ہوا نہایت صحت بخش سمجھی جاتی ہے اور موقعہ نہایت خوش نما اور دلچسپ ہے جابجا چشمے اور کولیں جاری ہیں۔ اور یہاں سے ڈل اور اُس کے ٹاپوؤں اور شہر کا نظارہ نہایت ہی دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔

شالامار باغ ان سب باغوں میں بادشاہی باغ کا نام شالامار[2] ہے جو نہایت ہی خوبصورت ہے۔ اس میں داخل ہونے کا راستہ ڈل سے ایک بڑی وسیع کے ذریعہ

---

[1] عیسائی اگرچہ حضرت سلیمان کے مُلہم اور صاحب وحی ہونے کے قائل ہیں مگر مسلمانوں کی طرح اُن کو پیغمبر نہیں جانتے بلکہ ایک نہایت ہی دانا اور عاقل بادشاہ کہتے ہیں س م ح

[2] ٹیک چند بہار نے اس کا نام شالا مار لکھا ہے اور اس کو سنسکرت کا لفظ بتایا ہے اور لکھا ہے کہ شالا اور مار سے مرکب ہے جو بمعنی خانہ اور قوت شہوی کے ہے اور مجازاً باغ کے معنی میں مستعمل ہو گیا ہے اور اس کی سند میں مرزا عبدالغنی قبول کا یہ شعر لایا ہے ؎ زباغ زلف درخ یار داد داست فرام کہ سبل ہیش کم زشالہ مار نباشد۔ لیکن ان معنوں کی غلطی خود ظاہر ہے کیونکہ شاعر نے اس لفظ کو

ہے جس کے دونوں کناروں پر گھاس جمائی ہے اور چنار کے درخت برابر دورویہ نصب ہیں اور جس کا طول پانچ سو قدم کا ہے اور اسی میں سے ہو کر ایک ایسے مکان[1] میں جو خاص طور پر گرمی کے موسم کے لئے بنایا گیا ہے اور باغ کے عین وسط میں ہے پہنچتے ہیں اس نہر کے علاوہ ایک اور نہر جو اس سے بھی زیادہ نفیس ہے ایک ایسے ہی دوسرے مکان میں جو باغ کے دوسرے سرے پر ہے پہنچاتی ہے اس دوسری نہر میں بڑے بڑے ریتیلے قسم کے پتھروں کا فرش ہے اس کے ڈھلواں کنارے بھی اسی پتھر سے بنے ہوئے ہیں۔ اس نہر کے وسط میں ایک بڑی قطار نواروں کی ہے جن کے باہم پندرہ پندرہ قدم کا فاصلہ ہے اور ان کے علاوہ ادھر ادھر بڑے بڑے گول حوض ہیں۔ جن میں مختلف شکل و صورت کے نوارے چھوٹتے ہیں۔ یہ مکان چونکہ مذکورہ بالا نہروں کے وسط میں واقع ہیں۔ اس لئے ان کے اردگرد پانی بہتا رہتا ہے اور ان کے دونوں اطراف پر دو قطاریں چنار کے بڑے بڑے درختوں کی لگی ہوئی ہیں۔ یہ دونوں مکان گنبد کی شکل کے ہیں اور گرداگرد غلام گردش ہے اور ان کے دروازے جو چار چار ہیں ان میں سے ایک ایک دروازہ تو دونوں طرف نہر پر کھلتا ہے اور ایک ایک دونوں جانب کے ان پلوں کے رخ جن پر سے ہو کر کنارے کی زمین پر پہنچ سکتے ہیں۔ ان میں سے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ : باغ کے عام معنوں میں نہیں لیا ہے اور ظاہرا یہ ترکیب قواعد زبان سنسکرت کے بھی خلاف معمول ہوتی ہے کیونکہ اگر یہ لفظ ہندی ہوتا تو مار شالا ہونا چاہئیے تھا۔ جیسے دھرم شالا۔ پاٹ شالا گؤ شالا وغیرہ۔ اصل یہ ہے کہ یہ صرف اس جگہ کا نام تھا جہاں شہنشاہ جہانگیر کے پندرھویں سال جلوس میں شاہجہاں نے باپ کی فرمائش سے باغ بنایا تھا اور مقام تعمیر کی مناسبت سے اس کا نام شالامار پڑ گیا تھا۔ جس کو شاہجہاں نے اپنے عہد کے ساتویں سال میں بدل کر فرح بخش نام رکھا۔ چنانچہ تزک جہانگیری اور شاہجہاں نامہ وغیرہ کتب تاریخ میں صاف اور صریح لکھا ہے اور دیوان کرپارام صاحب نے جو اپنی کتاب موسوم بہ گلزار کشمیر کے صفحہ دو سو نواسی پر شاہجہاں کا ایک فرمان نقل کیا ہے اس کے ایک فقرے سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے اور وہ فقرہ یہ ہے "و باغ فرح بخش کہ واقع است در موضع معروف شالمار بدولت و اقبال۔ ایام فرخندہ جام شاہزادگی احداث فرمودہ بودیم" س م ح

[1] اصل کتاب میں لفظ سمر ہوس ہے۔ (س م ح)

ہر ایک کے وسط میں ایک بڑا کمرہ اور چاروں کونوں پر چار چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں جن میں اندر کی طرف سنہری اور رنگین اور منقش کام بنا ہوا ہے اور سب کمروں کی دیواروں پر نہایت خوش خط فارسی قلم میں فقرات وغیرہ لکھے ہوئے ہیں۔ ان کے چاروں دروازے نہایت ہی قیمتی ہیں یعنی پتھر کے عجیب اور نایاب بڑے بڑے قطعات سے بنے ہوئے ہیں اور ہر ایک دروازے کی محراب دو دو ستونوں پر جو ازبس خوش نما ہیں قائم ہے۔ یہ محرابیں اور ستون ہندوؤں کے کسی مندر سے جس کو شاہجہاں نے منہدم کرادیا تھا آئے تھے اور اس وجہ سے اُن کی قیمت کا اندازہ کرنا ناممکن ہے۔ میں اس پتھر کی ذات اور قسم کی بابت کچھ بیان نہیں کر سکتا لیکن عقیق اور سنگ مرمر کی تمام قسموں سے کہیں بڑھکر ہے۔

کشمیر میری نظر میں

مجھے یقین ہے کہ آپ نے خود بخود پہلے ہی سمجھ لیا ہوگا کہ میں کشمیر پر فریفتہ ہو گیا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی سیر سے پہلے اس کی خوبصورتی اور خوش نمائی کی نسبت میرے تخیلات اور تصورات جس قدر اونچے تھے یہ اُن سے کہیں بڑھ چڑھ کر سرسبز و دل فریب ہے اور غالبًا تمام دنیا میں بے نظیر ہے اور کوئی دوسرا ملک جس کا طول و عرض اتنا ہی ہو اس کی خوبیوں کو نہیں پہنچتا! اور حق یہ ہے کہ ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے کیونکہ اگلے زمانہ میں یہ اعجوبہ روزگار بڑے بڑے اولوالعزم راجاؤں کا تخت گاہ تھا اور تمام گردونواح کے کوہستان بلکہ تاتار اور کل ہندوستان جزیرہ سراندیپ تک اُس کی حکومت میں داخل تھا اور یہ بات کچھ خلاف قیاس نہیں ہے کہ سلاطینِ مغلیہ اس کو بہشت ہند (یعنی کشمیر جنت نظیر) کہتے ہیں۔ اور محل تعجب نہیں ہے کہ شہنشاہ اکبر اپنی کوششوں میں اس ملک کی خاطر متواتر اتنا سرگرم رہا کہ اُس نے یہ ملک وہاں کے فرماں رواؤں کے ہاتھ سے کسی نہ کسی طرح آخر چھین ہی لیا۔ اور اُس کا بیٹا جہانگیر تو اس چھوٹی سی مملکت پر ایسا لٹو ہو گیا تھا کہ اُس نے کشمیر کو اپنی دل پسند آرام گاہ مقرر کر لیا تھا۔ اور اکثر کہا کرتا تھا کہ ہماری اس عظیم الشان سلطنت کا سارا ملک اگر ہاتھ سے نکل جائے اتنا رنج نہ ہو جتنا کہ کشمیر کا۔

ایک مشاعرہ

ایک مشاعرہ جو بڑے جوش و خروش کے ساتھ شعرائے کشمیر اور بادشاہی شاعروں کے باہم ہوا تھا میں نے بڑے شوق سے اُسے دیکھا تھا یعنی ہمارے

کشمیر پہنچتے ہی اورنگ زیب کے حضور میں شعرائے مذکور نے کشمیر کی تعریف و توصیف میں قصائد پیش کئے جن کو بادشاہ نے قبول فرما کر بہت مہربانی سے مناسب صلے عطا فرمائے۔ ان قصائد میں حد سے بڑھکر غلو اور مبالغے کئے گئے تھے۔ اور مجھکو یاد ہے کہ ایک شاعر نے کشمیر کے گرداگرد کے پہاڑوں کی بابت یوں بیان کیا تھا کہ " اُن کی عجیب بلندی ہی نے ان آسمانوں کو جو نظر آتے ہیں اس مقدس شکل کا بنادیا ہے۔ اور یہ کہ "خالق کائنات اپنی تمام حکمت اور خوبی ایجاد و صنعت کو اس ملک کے پیدا کرنے پر ختم اور خرچ کر چکا اور خالق مطلق نے پہاڑوں کا یہ حصار بنا کر اس ملک کو دشمن کی فوج کے حملہ سے محفوظ اور مامون فرمایا اور چونکہ ولایت کشمیر تمام روئے زمین کے ملکوں کی ملکہ ہے۔ اس لئے فی الواقع ایسا ہی مناسب تھا کہ وہ کامل امن اور چین کی حالت میں بغیر کسی کی اطاعت کے تمام عالم پر حکومت کر سکے " شاعر آگے یوں کہتا ہے کہ " جو پہاڑ ذرا دور اور بہت اونچے ہیں اُن کی چوٹیاں سفید اور چمک دار پوشاک سے آراستہ کی گئی ہیں۔ اور جو چھوٹے ہیں وہ سرسبز اور چمک دار ہرے بھرے درختوں سے سجائے گئے ہیں اور یہ اس لئے ہے کہ دنیا کے تمام ملکوں کی ملکہ کے سر پر ایسا ہی تاج زیبا ہے۔ جس کی کلغی کے ہیروں کی کرنیں زمرد میں نمودار ہوں، جب ہمارے نواب صاحب نے اِس شاعر کے ان نتائج طبع کو میری تفریح خاطر کے لئے مجھے دکھلایا تو میں نے کہا کہ " یہ شاعر اگر اپنے مضمون کو یہاں تک اور بڑھا دیتا کہ کوہستان اور ممالک قرب وجوار کو (جن سے چھوٹی تبت اور ریاست راجہ گوماں اور کاشغر اور سری نگر مراد ہے)[1] سرحد کشمیر میں داخل کر دیتا (کیونکہ اکثر ادعا کیا جاتا ہے کہ ایک زمانہ میں یہ ملک کشمیر کے باجگزار تھے) اور اس سے بھی بڑھکر اگر وہ یہ کہتا کہ دریائے گنگا اور سندھ اور چناب اور جمنا (جو خوبی اور عظمت میں دریائے جیحون وغیرہ سے جن کا کتاب مقدس میں ذکر ہے کچھ کم نہیں ہیں) مملکت کشمیر ہی سے نکلتے ہیں تو کچھ مضائقہ نہ تھا اور اسی بنیاد پر وہ یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ باغ عدن بھی کشمیر ہی میں لگایا گیا تھا نہ کہ آرمینیا میں جیسا کہ لوگوں کا عقیدہ ہے[2]۔

---

[1] یہاں وہ سری نگر مراد ہے جہاں سلیمان شکوہ نے پناہ لی تھی۔ س۔م۔ح

[2] شاعر کا یہ شعر کہ ؎ اگر فردوس بر روئے زمین است۔ ہمین است ہمین است وہمین است کشمیر کے خوب حسب حال ہے۔

کشمیریوں کی خصوصیات کشمیری لوگ لطافت و ظرافت میں مشہور ہیں اور بہ نسبت اور ہندوستانیوں کے زیادہ ہوشیار اور ذہین سمجھے جاتے ہیں۔ اور شاعری اور فضائل علمیہ میں بھی ایرانیوں سے کچھ کم نہیں ہیں۔ یہ لوگ محنتی اور چست و چالاک بھی ہوتے ہیں اور خوبصورت اشیا کے بنانے میں ان کی کاریگری جیسے پالکی پلنگ کے پائے صندوق صندوقچے قلمدان چمچے وغیرہ فی الواقع قابلِ تعریف ہے۔ اور وہاں کے کارخانوں کی بنی ہوئی چیزیں ہندوستان کے تمام اضلاع میں برتی جاتی ہیں۔ یہاں کے لوگ روغن کاری کے فن میں نہایت کامل ہیں اور نہایت باریک اور نفیس سنہری تاروں کو کسی چیز میں جما کر ہر ایک قسم کی لکڑی کے رگ و ریشہ کی ایسی خوبصورتی سے ہوبہو نقل اتارتے ہیں کہ میں نے کبھی کوئی ایسی نفیس اور بے عیب شے نہیں دیکھی۔

کشمیری شال لیکن جو شے کہ کشمیر سے مخصوص اور بڑی تجارت کی چیز ہے اور جس نے خاص کر وہاں کی سوداگری کو چمکا کر کشمیر کو دولت سے مالا مال کر رکھا ہے وہ شال[1] ہے جس کو وہ اپنے کارخانوں میں بناتے ہیں۔ اور جن کی کثرت کے باعث اُن کے چھوٹے چھوٹے بچوں تک بھی بے شغل نہیں رہتے۔ ان شالوں کا طول قریب ڈیڑھ گز فرانسیسی کے ہوتا ہے اور عرض ایک گز اس کے دونوں پلوں پر بہت نفیس نقش و نگار ہوتے ہیں جو ایک اڈے پر جس کا عرض قریب ایک فٹ فرانسیسی کے ہوتا ہے بنائے جاتے ہیں۔ مغل اور ہندوستانی مرد اور عورتیں سب ان شالوں کو جاڑوں میں بطور رضائی کے سر سے اوڑھ کر دائیں طرف سے بائیں طرف کو اپنے جسم پر ڈالے رہتے ہیں۔ شالیں یہاں دو قسم کی بنتی ہیں ایک تو کشمیری اُون کی جو ملک اسپین کی پشم سے زیادہ نفیس اور ملائم ہوتی ہے دوسرے اُس پشم کی جس کو توز[2] کہا جاتا ہے

[1] آج کل کے زمانہ میں انگریزی سادے کپڑوں کے رواج پا جانے کے سبب سے ہندوستان میں عموماً شال کی پوشش بہت کم ہو گئی ہے اور اگرچہ اب سے دس پندرہ برس پیشتر کشمیر کی عمدہ شالیں فرانس کو کثرت جاتی تھیں۔ لیکن اب وہاں بھی انقلابات کے باعث اس کی مانگ بہت کم ہو گئی ہے جس سے بچارے کشمیر کے شال باف بہت مفلس ہو گئے ہیں ——— س م ح

[2] ایک کشمیری سے تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ تبت کی طرف سے جو پشم آتی ہے اُس کو تبتی لوگ

اور جس کی ملائمت اور نفاست کو بیور یعنی سگ آبی کی پوستین بھی نہیں پہنچتی اور بڑی تبت میں ایک قسم کی جنگلی بکریوں کی چھاتی پر سے اُتاری جاتی ہے۔

کشمیری اُون کے ریشے سے توز کی شالیں زیادہ عمدہ اور پسندیدہ ہوتی ہیں۔ چنانچہ میں نے اُن میں سے چند شالیں دیکھی ہیں جو اُمرا کے واسطے فرمایشی تیار ہوئی تھیں اور ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپیہ لاگت آئی تھی۔ اور کشمیری اون کی شال میں نے کبھی پچاس روپیہ سے زیادہ کو فروخت ہوتے نہیں سُنی۔

شال کو اگر کئی مرتبہ کھول کر ہوا نہ دی جائے تو بہت جلد کیڑا لگ جاتا ہے۔ ہرچند پٹنہ آگرہ اور لاہور میں ایسی شالیں بنانے کے واسطے بڑی بڑی کوششیں عمل میں آئیں مگر باوجود ہر طرح کی ہوشیاری کے کشمیری شال کی ملائمت اور عمدہ بافت نصیب نہ ہوئی۔ اور شاید یہ اُس ملک کے پانی ہی کا خاصہ ہے جس کے باعث کشمیری ریشے کو یہ بے نظیر نفاست حاصل ہے۔ چنانچہ مچھلی پٹن کی چھینٹوں وغیرہ کی اعلیٰ رنگت کو بھی جن کو ہاتھ سے چھاپتے ہیں اور جو ہر دھلائی میں اور عمدہ نکل آتی ہیں وہاں کے پانی ہی کی خاصیت سے منسوب کرتے ہیں۔

حُسنِ کشمیر کشمیری لوگ خوبصورتی اور صباحت کے لئے اہلِ فرنگ کی طرح ضرب المثل ہیں اور نہ تو تاتاریوں کی طرح اُن کی ناک چپٹی ہوتی ہے اور نہ سور کی سی بدنما چھوٹی آنکھیں جو اہل کاشغر اور اکثر بڑی تبت کے رہنے والوں کی علامت ہے۔ خصوصاً عورتیں بہت ہی حسین ہوتی ہیں اور قریباً ہر شخص جو اول ہی اول سلطنت مغلیہ میں آ کر اُمرا دربار کی ذیل میں داخل ہوتا ہے اسی ملک سے اپنے لئے بیوی

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ توسا، کہتے ہیں جس کو اصل کتاب کے مصنف یا غالباً مترجم انگریزی نے اپنی زبان کے لہجہ کے موافق زیڈ یعنی زے کے ساتھ لکھدیا ہے۔ س م ع (توز، تَوز)

[1] ہمارے اس زمانہ میں تین چار سو روپیہ سے کم قیمت کی شال امیرانہ پوشش کے لائق نہیں سمجھی جاتی اور فرمایشی شالیں تو ایک ہزار سے لے کر دو ڈھائی ہزار روپیہ تک کی قیمت کی بھی بن سکتی ہیں۔ مگر عموماً معمولی قیمت اچھی شال کی دو سو روپیہ سے لے کر سات آٹھ سو تک ہے۔ پس اس وقت اور اُس وقت کی قیمت میں جس کا ذکر مصنف نے کیا ہے اختلاف کا سبب شاید یہ ہو کہ اُس وقت ایسا عمدہ اور باریک کام نہ بنتا ہوگا یا یہ سبب ہو کہ اُس وقت کی بہ نسبت چاندی کی قیمت تنا سبہ کم ہو گئی ہے س م ع

یا حرم پسند کرتا ہے تاکہ اُس کی اولاد بہ نسبت ہندوستانیوں کے زیادہ گوری ہو اور اصل مغلوں میں محسوب ہو سکے۔ اور جب کہ بازار میں اور دُکانوں پر ادنیٰ اور غریب لوگوں کی عورتیں حسین دیکھنے میں آتی ہیں تو میرے قیاس کی رو سے اونچے گھرانوں کی عورتوں کے جمیل ہونے میں کچھ بھی شک نہیں ہے۔

تاک جھانک قیام لاہور کے زمانہ میں حسین مستورات کے دیکھنے کی خاطر میں نے بھی اُسی طرح کا ذرا سا مکر کیا تھا جیسے کہ مغل لوگ اکثر تاک جھانک کی غرض سے کیا کرتے ہیں کیونکہ بہ نسبت تمام ہندوستان کے اُس شہر کی عورتیں زیادہ حسین ہوتی ہیں۔ رنگ گندمی ہوتا ہے۔ اور فی الواقع نزاکت اور لطافتِ اندام میں اُن کی شہرت بجا ہے۔ چنانچہ میں بعض ہاتھیوں کے پیچھے پیچھے ہو لیا خصوصًا ایک ایسے ہاتھی کے پیچھے جس پر جھول اور سامان بہت زیادہ مکلف پڑا ہوا تھا اس تدبیر سے مجھے یقین تھا کہ جس نظارے کا میں طالب ہوں وہ غالبًا مجھے حاصل ہو جائے گا کیونکہ وہاں کی مستورات اُن نقرئی گھنٹوں کی آواز سنتے ہی جو ہاتھی کے دونوں طرف لٹکائے جاتے ہیں اکثر کھڑکیوں سے سر باہر نکال نکال کر دیکھنے لگ جاتی ہیں۔

شوقِ دیدار پہلے پہل کشمیر میں بھی میں اپنا دل اکثر اسی تدبیر سے بہلاتا رہا مگر آخرکار جب اس سے بھی زیادہ ایک اور عمدہ طریق ان کے دیکھنے کا اُس شہر کے ایک مشہور بڈھے ملّا نے جس سے میں فارسی نظم کی کتاب پڑھا کرتا تھا مجھے سکھلایا تو میں نے اپنے مدعا کے حصول کے لئے اُس پر عمل کرنا شروع کیا چنانچہ وہ طریق یہ تھا کہ بہت سی مٹھائی خرید کر میں اُس کے ساتھ پندرہ سولہ گھروں میں جہاں وہ بغیر روک ٹوک کے جا سکتا تھا گیا۔ ان سب گھروں میں مجھے اُس نے اپنا رشتہ دار ظاہر کیا اور کہا کہ ابھی ایران سے آیا ہے اور بڑا متمول آدمی ہے اور شادی کرنا چاہتا ہے۔ اور جونہی ہم کسی گھر میں داخل ہوتے تھے وہ فورًا ہی اپنے بال بچوں کو شیرینی تقسیم کرنے لگ جاتا تھا اور اس حکمت سے اس گھر کی سب عورتیں کیا بیاہی کیا کنواری کیا بڈھی کیا جوان نہ صرف مٹھائی لینے کی خاطر بلکہ اس غرض سے بھی کہ میں اُن کو دیکھ لوں میرے گرد جمع ہو جاتی تھیں۔ اگرچہ اس شوق کے پورا کرنے میں میرا بہت سا روپیہ خرچ ہوا مگر اس تدبیر سے مجھے کوئی شک نہ رہا کہ حقیقتًا کشمیر میں ویسا ہی حسن ہے جیسا کہ تمام

فرنگستان میں۔

دلچسپ کوہستانی سفر اب مجھکو صرف اس سفر کی کیفیت لکھنی رہ گئی ہے جو بھمبر سے کشمیر تک کوہستان کے اندر مجھے کرنا پڑا اور جو مجھے اپنے اس خط کے شروع ہی میں لکھنا چاہیے تھا۔ اس کیفیت میں کچھ حقائق تو ایسے ہیں جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھکر لکھے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو کوہستان قرب وجوار کشمیر کی بابت لوگوں سے حتی الوسع تحقیق کرکے بہم پہنچاتے ہیں۔ پس اب بھمبرت راستہ کا حال سنئے کہ جونہی ہم اس ہولناک دلوار عالم کی دوسری جانب پہنچے جس سے میری مراد بھمبر کا وہ بلند اور سیدھا اور درختوں سے خالی سیاہ پہاڑ ہے تو ہم کو ایک صاف اور ملائم اور تازگی بخش ہوا ملی اور میں پہلی ہی رات اپنے آپ کو منطقہ حارہ معتدلہ میں پاکر متعجب ہوا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ہندوستان میں پہنچ گیا ہوں۔ جن پہاڑوں میں سے ہوکر ہمارا گذر ہوا وہ ہر قسم کے فرنگستانی درختوں اور جھاڑیوں سے سبز ہو رہے تھے مگر ان میں زوفا زیرہ۔ اور ضمیران[1] اور روز میری قسم کا گلاب نہ تھا۔ اور گویا میں خود کو آورن[2] کے پہاڑوں میں پاتا تھا جن میں صنوبر۔ بلوط وغیرہ کے درخت کثرت سے ہیں اور اس سیرگاہ اور ہندوستان کے جلتے تپتے میدانوں میں جن کو ہم ابھی چھوڑ کر آئے تھے اور جہاں کوئی شے بھی اس قسم کی نظر نہیں پڑتی تھی ایک نہایت بیّن فرق معلوم ہوتا تھا۔ اور میری توجہ خصوصاً اس پہاڑ کی طرف تھی جو کوہ بھمبر سے دو دن کی مسافت پر تھا اور جس کے دونوں ڈھال مختلف قسم کے درختوں سے لدے ہوتے تھے۔ یعنی جو طرف جنوب رویہ اور ہندوستان کی جانب ہے اُس پر تو ہندوستانی اور فرنگستانی دونوں قسم کے اشجار کھڑے ہیں اور دوسری طرف یعنی جانب شمال صرف فرنگستانی درختوں اور نباتات سے بھرے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک طرف تو ہندوستان اور فرنگستان دونوں کی ہوا اور طبیعت برابر ملی جلی ہے اور دوسری جانب دباعتبار زیادہ اعتدال کے) صرف فرنگستان کی سی آب و ہوا ہے۔ راستہ میں میں اس حال کو دیکھکر بھی نہایت متعجب ہوا کہ ادھر تو بے شمار درخت کھوہوں اور غاروں میں جہاں

---

[1] ضمیران ایک قسم نازبو کی ہے۔ س۔م۔ع

[2] فرانس کے ایک ضلع کا نام ہے۔ س۔م۔ع

انسان کو کبھی جانے کی بھی جرأت نہیں ہوتی۔ نیچے اوپر پڑے ہوئے سڑ گل کر خاک ہو رہے ہیں اور اُدھر اس طرح بے حد درخت اور نئے نئے پودے اُن کی قائم مقامی اختیار کرنے کے لئے بڑی خوش نمائی سے سرسبزی اور شادابی کی حالت میں لہلہا رہے ہیں۔ میں نے بعض جگہ جلے ہوئے درخت بھی دیکھے مگر میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اُن پر بجلی گری تھی یا ایک دوسرے کے ساتھ رگڑ کھانے سے جل گئے تھے۔ کیونکہ تیز و تند ہوا کے چلنے سے درختوں میں یہ حالت اکثر واقع ہو جاتی ہے۔ یا یہاں کے لوگوں کے خیال کے موافق خشک اور پُرانے ہو کر اُن میں خود بخود آگ لگ اُٹھتی تھی۔

حیرت انگیز آبشار خوش نما آبشاروں نے جو یہاں چٹانوں کے بیچ میں اکثر بڑے زور و شور سے گرتے ہیں۔ سیر و تفریح کے لطف کو دوبالا کر دیا ہے خصوصاً ایک آبشار جو اپنی نظیر آپ ہی ہے میں نے اُس کو ایک اونچے پہاڑ پر کھڑے ہو کر کچھ فاصلہ سے دیکھا

کہ پانی کا ایک سیلاب ایک لمبے اندر تاریک راستہ سے جو برابر درختوں سے ڈھکا ہوا ہے آ کر بڑی تیزی کے ساتھ دفعتہً ایک بڑی سیدھی اور بلند چٹان پر سے گرتا ہے جس سے ایسا شور ہوتا ہے کہ کان سُن ہو جاتے ہیں۔ بادشاہ جہانگیر نے اس آبشار کے متصل ایک پہاڑ کو ہموار کرا کر اُس پر ایک عالی شان عمارت تعمیر کرا دی ہے تاکہ اہلِ دربار اس حیرت افزا تماشۂ قدرت کو وہاں سے بآرام بیٹھ کر ملاحظہ کر سکیں — اس آبشار اور اُن درختوں سے جن کا ذکر اوپر ہوا قدامت اور کہنگی کے آثار ایسے نمایاں ہیں کہ آفرینشِ عالم کے ہم سن کہنا شاید بے جا نہیں ہے۔

دردناک حادثہ اس جگہ ایک ایسا سخت حادثہ پیش آیا جس سے ہمارے سیر و تماشے کا لطف بالکل منغص ہو گیا۔ پادشاہ اس وقت پیرپنجال پہاڑ کی چڑھائی پر تھا جو سب پہاڑوں سے اونچا ہے اور جہاں سے ملک کشمیر پہلے ہی پہل دکھائی دینے لگتا ہے اور بادشاہ کے پیچھے پیچھے ہاتھیوں کی ایک لمبی قطار چلی آتی تھی جن پر عماریوں اور میکھڈنبروں میں بیگمیں سوار تھیں اس اثنا میں کا سب سے اگلا ہاتھی لوگوں کی دانست میں راستہ کی بلندی اور درازی سے خوف کھا کر پیچھے کو ہٹا اور اُس ہاتھی پر آن گرا جو اُس کے پیچھے آتا تھا اور اسی طرح پندرہ ہاتھیوں کے ایک دوسرے پر گر پڑنے

کی نوبت پہنچ گئی۔ اور اب نہ تو وہ گھوم ہی سکتے تھے اور نہ دائیں بائیں حرکت کر سکتے تھے کہ اُس تنگ اور ڈھلواں راستے سے اپنے آپ کو نکال لیں اور آخر بے خود ہو ہوکر نیچے جا گرے۔ مگر جس مقام پر یہ ہاتھی گرے تھے خوش قسمتی سے وہ جگہ چنداں بلند نہ تھی اس لئے صرف تین یا چار ہی عورتوں کی جان تلف ہوئی۔ لیکن ہاتھیوں میں سے کسی ایک کے بچانے کی بھی کوئی صورت نہ نکلی۔ یہ جانور جب کبھی بھاری بوجھ سے جو اکثر اُس پر لادتے ہیں دب کر بیٹھ جاتا ہے تو پھر اچھے راستہ پر بھی نہیں اُٹھ سکتا پس ایسی خراب جگہ میں کس طرح اُٹھتے۔ چنانچہ جب ہم دو روز بعد پھر اُسی راستہ سے گذرے تو ہم نے دیکھا کہ بیچارے کئی ہاتھی اب تک پڑے ہوئے اپنی سونڈیں ہلا رہے تھے۔ اُس فوج کو جو چار دن سے قطار باندھ کر ان پہاڑوں میں کوچ کر رہی تھی اس حادثے کے باعث سخت تکلیف اٹھانی پڑی کیونکہ اُس روز کا باقی ماندہ دن اور تمام اگلی رات بیگمات کی جان بچانے اور اسباب سنبھالنے میں گذرے اور اتنی دیر تک سپاہ کو مجبوری اُسی جگہ ٹھہرنا پڑا اور اس سبب سے ہر ایک شخص اپنی اپنی جگہ گویا بندھا کھڑا رہا۔ کیونکہ بہت سے مقامات ایسے تھے کہ وہاں سے آگے بڑھنا یا پیچھے ہٹنا ناممکن تھا اور قلی جن کے پاس خیمے اور رسد تھی وہ پہنچ نہیں سکتے تھے۔ مگر حسب معمول خوش قسمتی میرے ساتھ تھی۔ میں راستہ سے الگ نکل کر ایک ایسی جگہ جا چڑھا کہ جہاں میں نے اور میرے گھوڑے نے بآرام وقت بسر کیا اور تھوڑی سی روٹی جو میرے نوکر کے پاس تھی ہم دونوں نے بانٹ کھائی۔

بچھو کا منتر مجھکو یاد ہے کہ اُسی جگہ پر پتھروں کے ہلانے جلانے سے ایک بڑا سیاہ بچھو نکل آیا جس کو ایک نوجوان مغل نے جو میری جان پہچان میں سے تھا اُسے اٹھا کر اپنی مٹھی میں دبا لیا اور پھر میرے نوکر کے اور میرے ہاتھ میں دیدیا مگر اُس نے ہم میں سے کسی کو بھی نہ کاٹا۔ اُس نوجوان سوار نے اس کا باعث یہ بیان کیا کہ میں نے اس پر قرآن کی ایک آیت پڑھکر پھونک دی ہے۔ اور اکثر بچھوؤں پر میں اسی طرح پڑھکر پھونک دیتا ہوں مگر مجھے اُس آیت کے سکھلانے سے انکار کرنے کی اُس نے یہ وجہ بیان کی کہ اُس کی تاثیر اُس سے منتقل ہوکر میرے وجود میں آجائے گی جیسا کہ بقول اُس کے اُس کے اُستاد کا حال ہوا تھا۔ یعنی جب اُس نے اُس نوجوان کو یہ عمل سکھلایا تو فوراً اُس کی تاثیر اُستاد کے ہاتھ سے جاتی رہی۔

پیرپنجال کے عجائبات جب ہم پیرپنجال پر سے جا رہے تھے۔ میں نے اپنے فلسفیانہ خیالات کے ساتھ تین عجیب باتوں کا ملاحظہ کیا۔

(۱) گرمی و سردی کا اتصال ایک تو یہ کہ ایک ہی ساعت میں گرمی اور سردی کی دو متضاد کیفیتیں محسوس ہوئیں یعنی چڑھائی کے وقت تو دھوپ بہت سخت معلوم ہوتی تھی اور ہم پسینے پسینے ہوتے جاتے تھے۔ لیکن چوٹی پر پہنچتے ہی ہم نے اپنے تئیں جمی ہوئی برف کے اندر پایا جس کو کاٹ کر شکر کے گذرنے واسطے راستہ بنا لیا تھا جہاں خفیف خفیف برفانی بارش بھی ہو رہی تھی اور ٹھنڈی ہوا ایسی تندی کے ساتھ چل رہی تھی کہ بیچارے ہندوستانی لوگ جن میں سے اکثر نے کبھی سردی کی شدت نہیں اٹھائی تھی پہلے ہی پہل اس برف کو دیکھکر بڑی تکلیف اور حیرت میں پڑ گئے اور بعض تو گھبرا کر بھاگ بھی گئے۔

(۲) دو مخالف ہوائیں دوسری یہ کہ صرف دو سو قدم کی مسافت کے اندر ہی دو مخالف سمتوں سے ہوا چلتی تھی یعنی چڑھائی کے وقت تو سامنے کی ہوا تھی جو شمال کی جانب سے آتی تھی اور اتار کے شروع ہوتے ہی ہماری پشت یعنی جنوب کی طرف سے چلنے لگ گئی۔ غور کرنے سے اس کا سبب یہ معلوم ہوتا تھا کہ سب طرف سے بخارات اٹھکر جب پہاڑ کی چوٹی پر پہنچتے ہیں تو وہاں کی سردی سے کثیف ہوکر اس ہوا کی پیدایش کا باعث ہوتے ہیں جو وہاں چلتی رہتی ہے اور اتار کے دونوں مخالف اطراف میں ہوا چلنے کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ گرمی کے سبب سے جو نیچے زیادہ ہوتی ہے۔ نیچے کی ہوا جب ہلکی اور لطیف ہو جاتی ہے تو اوپر کی ثقیل ہوا اس کی جگہ لینے کو نیچے اتر آتی ہے اور یہ اتار چڑھاو ہوا کی حرکت کا باعث رہتا ہے۔

پیرپنجال کا درویش تیسری یہ کہ اس پہاڑ کی چوٹی پر ایک عمر رسیدہ درویش کو دیکھا جو جہانگیر کے وقت سے یہاں رہتا ہے اس کے مذہب سے تو کسی کو کچھ واقفیت نہ تھی مگر لوگ یہ بیان کرتے تھے کہ اس سے خرق عادات اور کرامتیں ظاہر ہوتی ہیں جس سے بادلوں میں عجیب عجیب طرح کی گرج۔ طوفان۔ برف۔ اولے۔ اور مینہ پیدا ہو جاتا ہے اس کی سفید اور الجھی ہوئی ڈاڑھی بہت گھن دار اور لمبی تھی اور چہرے سے کچھ وحشت اور بدمزاجی کے آثار بھی نمایاں تھے اور خیرات کبھی ایک اکھڑ پن سے مانگتا

تھا اور لوگوں کو اُن مٹی کے پیالوں سے پانی پینے کی اجازت دیتا تھا جو ایک بڑے سے پتھر پر اُس نے بطور قطار کے چنے ہوئے تھے اور ہاتھ سے اشارہ کرتا جاتا تھا کہ یہاں توقف نہ کرو جلد اُتر جاؤ اور جو لوگ کچھ غل مچاتے تھے اُن سے سخت ناراض ہوتا تھا۔ مگر جب میں اُس غار میں کہ جہاں وہ بیٹھا تھا پہنچا اور موقع طور پر اُس کے ہاتھ پر ایک اشرفی رکھکر اُس کا مزاج ٹھنڈا کیا تو اُس نے مجھ سے کہا کہ یہاں شور وغل مچانے سے ہوا اور مینہ کا ایسا سخت طوفان پیدا ہوجاتا ہے جو انسان کے خیال میں بھی نہیں آسکتا۔ اور کہا یہ اورنگ زیب کی دانائی ہے جو اُس نے ہماری نصیحت مان کر سپاہ و لشکر کو چپ چاپ اور تعجیل کے ساتھ اُتر جانے کا حکم دیدیا ہے اور اس کا باپ شاہجہاں بھی ایسے ہی حزم و احتیاط کے ساتھ عمل کیا کرتا تھا۔ مگر جہانگیر نے ایک دفعہ ہماری نصیحت کو ہنسی میں اڑا کر باوجود ہماری تاکیدی ممانعت کے نقارے اور نفیریاں بجانے کا حکم دے دیا تھا مگر وہ ایسے طوفان میں گھرا کہ ہلاک ہوتے ہوتے بچ گیا۔

چشموں کی سیر اب میں آپ کی خدمت میں اُس سیر و سیاحت کا حال بیان کرنا شروع کرتا ہوں جو میں نے اس ملک کے مختلف حصوں میں کی ہے۔ شہر کشمیر میں پہنچتے ہی ہمارے نواب دانشمند خاں نے مجھکو اس ملک کی پرلی حد تک بھیجا جو دارالحکومت سے ہلکی سی تین منزل ہے تاکہ میں اُن عجائبات کا ملاحظہ کروں جو ایک اُبلتے چشمے سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ میرے ہمراہ ایک وہاں کا باشندہ اور محافظت کے واسطے نواب صاحب کا ایک سوار بھی تھا۔

سوند بماری عجائبات یہ ہیں کہ ماہ مئی میں جس وقت برف پگھلنے لگتی ہے پندرہ روز تک یہ چشمہ فوارہ کی طرح برابر جاری رہتا ہے اور رات دن میں تین بار یعنی طلوع آفتاب کے وقت اور دوپہر اور رات کو بند ہوجاتا ہے۔ اکثر پون گھنٹہ تک اُس سے متواتر پانی نکلتا رہتا ہے اور ایک ایسے مربع حوض کے بھر دینے کو جو دس بارہ ... فٹ مربع ... فٹ عمق اور اسی قدر طول و عرض رکھتا ہے کافی سے زیادہ ہے اور جب پندرہ روز گذر جاتے ہیں تو پانی کی آمد کسی قدر کم ہوکر اُس کا بہاؤ معمولی اندازہ پر آجاتا ہے اور ایک مہینہ گذرنے کے بعد پانی کی آمد بالکل بند ہوجاتی ہے مگر سخت اور متواتر بارشوں میں مثل اور چشموں کے بلا انقطاع اور بلا اندازہ جاری رہتا ہے۔ اس حوض کے کنارے

ہندؤں کا ایک مندر ہے جو برار دیوتا کے نام سے منسوب ہے اور اسی وجہ سے یہاں کے لوگ اُس کو سوندہ براری یعنی آب برار کہتے ہیں۔ چنانچہ جاتری لوگ دور دور سے آکر اس مندر پر جمع ہوتے ہیں تاکہ اس معجز نما اور پوتر پانی سے اشنان کریں۔ اس چشمہ کی اصلیت کی بابت لوگ بہت سی حکایتیں بیان کرتے ہیں جو لغو اور بیہودہ ہونے کی وجہ سے اُن کا بیان چنداں دلچسپ نہ ہوگا۔ پانچ چھ روز جو مجھکو ٹھہرنے کا اتفاق ہوا تو میں اس عجوبگی کا سبب دریافت کرنے کی کوشش کرتا رہا چنانچہ میں نے اُس پہاڑ کو جس کے دامن میں یہ عجیب چشمہ نکلتا ہے بغور ملاحظہ کیا اور سخت محنت اور مشکل کے ساتھ اُس کی چوٹی پر پہنچ کر اس کے چپے چپے کو چھان مارا۔ اُس کا طول شمال سے جنوب کی جانب ہے اور اگرچہ اور پہاڑوں کے بہت قریب ہے مگر تاہم سب سے بالکل جُدا ہے اُس کی ہئیت گدھے کی پیٹھ کے مشابہ ہے اور اگرچہ چوٹی کا طول بہت بڑا ہے مگر عرض غایت درجہ سو قدم بھی مشکل سے ہوگا اس کی ایک طرف شمال رویہ ہے جس پر سبز گھاس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ مگر صبح کے آٹھ بجے تک مقابل کے پہاڑوں کے حائل ہو جانے کی وجہ سے اُس پر دھوپ نہیں آتی۔ اور غربی جانب درختوں اور نباتات سے پُر ہے۔ پس یہ حالات دیکھکر میں نے اپنے دل میں خیال کیا کہ شاید حرارتِ آفتاب اس کے موقعہ کی خصوصیت اور اندرونی کیفیتوں سے مل کر اس عجوبگی کو پیدا کرتی ہے اور اس بنا پر میں نے اپنی یہ رائے قائم کی کہ جاڑے کے موسم میں جب کہ تمام زمین برف سے ڈھک جاتی ہے کچھ پانی پہاڑ کے اندرونی حصوں میں رس کر اور منجمد ہوکر اُسی طرح محفوظ پڑا رہتا ہے اور جب صبح کے وقت سامنے کی دھوپ سے پہاڑ کا وہ حصہ گرم ہو جاتا ہے جس پر سب سے پہلے دھوپ آتی ہے تو وہ پانی پگھل کر پہاڑ کی درازوں میں سے دوپہر کے وقت چشمہ کی جگہ پھوٹ نکلتا ہے اور جس وقت وہ مقام جو صبح کی دھوپ سے گرم ہوا تھا آفتاب کے بلند ہو جانے کے باعث سرد ہو جاتا ہے تو اُس جگہ سے پانی کا آنا بند ہو جاتا ہے۔ اور پھر جب دوپہر کے وقت آفتاب کی شعاع پہاڑ کی چوٹی پر اُس کے سر کی طرف سے پڑنے لگتی ہے تو پہاڑ کی دوسرے حصہ کا پانی پگھلنا شروع ہوتا ہے اور بتدریج دوسرے راستوں سے اُنھیں پہلے راستوں میں آجاتا ہے اور رات کو چشمہ سے بہنے لگتا ہے۔ پھر جب آفتاب کی دھوپ پہاڑ کی مغربی سمت پر پڑتی ہے تو وہی تاثیر اُس طرف کے منجمد پانی پر ہوتی ہے جو صبح کے

وقت پانی نکلنے کا باعث ہے۔ مگر اس دفعہ جو پانی چشمہ سے آہستگی کے ساتھ نکلتا ہے اُس کا باعث یہ ہے کہ مغربی سمت کے پانی کا ذخیرہ چشمہ کے منہ سے کسی قدر فاصلہ رکھتا ہے اور یہ بھی سبب ہے کہ کثرتِ اشجار کی وجہ سے تمازتِ آفتاب سے پہاڑ کی وہ طرف کم اثر پذیر ہوتی ہے یا فقط رات کی سردی اُس کا سبب ہے کہ جس کے باعث پانی کی روانی کسی قدر سست ہو جاتی ہے۔

میرے ان دلائل کو اس بات پر غور کرنے سے تائید پہنچتی ہے کہ پہلے دنوں میں پانی کثرت سے نکلتا ہے اور پھر بتدریج گھٹ کر بالکل بند ہو جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو پانی پہاڑ کی دراڑوں میں جما ہوا پڑا تھا ابتدا میں زیادہ تھا اور آخر میں کم ہوتا گیا علاوہ برعں یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ اس چشمہ سے پانی کے بہاؤ کی مقدار خواہ ابتدائی موسم ہی میں کیوں نہ ہو بالکل غیر معین طور پر ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض اوقات دوپہر کو رات یا صبح کی نسبت زیادہ ہو جاتی ہے اور کبھی صبح کو بہ نسبت دوپہر کے کثیر المقدار ہوتا ہے جس کا سبب ظاہر ہے یعنی یہ کہ کسی دن گرمی زیادہ ہوتی ہے اور کسی دن کم اور بعض اوقات ابر کے سبب دھوپ کی حرارت میں کمی اور زیادتی کا ہو جانا پانی کے بہاؤ میں کمی اور زیادتی کا باعث ہوتا ہے۔

جوشندہ چشمہ سوندہ براری سے واپسی کے وقت میں شاہراہ سے تھوڑا سا چکر کھا کر آیا تھا تاکہ اچھ بل کی بھی سیر کرتا چلوں! یہ جگہ شہر کشمیر کے ملحقات میں ایک بادشاہی باغ ہے جو سابق میں راجگان کشمیر سے متعلق تھا اور اب شاہانِ مغلیہ کی سیرگاہ ہے جو چیز کہ خصوصیت سے اس جگہ کی حسن و خوبی کا باعث ہے وہ ایک جوشندہ چشمہ ہے جس کا پانی سیکڑوں چھوٹی چھوٹی نہروں میں منقسم ہو کر اُس مکان کے گرد اور کل باغ میں گھوم جاتا ہے اور خالی از لطف نہیں۔ اس چشمہ سے پانی اس شدت سے اُچھلتا ہے کہ گویا کسی کنوئیں کی تہ سے جوش مار رہا ہے اور اتنا زیادہ ہے کہ اُس کو دریا کہنا چاہیئے نہ کہ چشمہ۔ اور نہایت لطیف اور برف کی مانند سرد ہے یہ باغ بہت خوبصورت ہے اُس کی روشیں نہایت اسلوب سے بنی ہوئی ہیں۔ اور میوہ دار درختوں، مثل سیب، ناشپاتی آلوچہ اور زرد آلو سے بھرا ہوا ہے۔ فوارے مختلف وضع اور شکل کے اور مچھلیوں کے رکھنے کے لئے حوض کثرت سے بنے ہوئے ہیں۔ اس جگہ ایک آبشار ایسی بلند ہے کہ گرتے وقت تیس یا

چالیس قدم کے طول میں ایک سفید اور خوبصورت چادر کی شکل بن جاتی ہے۔ اور ایک ایسی عجیب کیفیت پیدا کرتی ہے جو بیان سے باہر ہے۔ خصوصاً رات کے وقت جب اس کے نیچے دیوار کے طاقوں میں جو اس غرض سے بنائے ہوئے ہیں صدہا چراغ روشن کر دیئے جاتے ہیں تو اور ہی سماں نظر آتا ہے۔

طلائی مچھلیاں اچھا بل سے چل کر میں ایک اور بادشاہی باغ میں پہنچا وہ بھی ایسا ہی آراستہ ہے اور اس باغ کے حوض کی مچھلیاں آدمیوں سے ایسی مانوس ہیں کہ بلانے یا روٹی کا ٹکڑا ڈالنے سے نزدیک آ جاتی ہیں۔ اور بڑی بڑی مچھلیوں کے جبڑوں میں سونے کے بالے پڑے ہوئے ہیں جن پر کچھ لکھا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ بالے نور محل (نور جہاں بیگم) نے جو اورنگ زیب کے دادا جہانگیر کی بیگم تھی پہنائے تھے۔

بارہ مولا کا مقبرہ جب میں نے واپس آکر سوندہ براری کے حالات دانشمند خاں سے بیان کئے تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ اُن کو سن کر خوش ہوتے۔ پھر انھوں نے مجھ سے ایک اور طرف جانے کی فرمائش کی تاکہ میں بھی اُس عجیب امر کی تصدیق کروں جس کو اور لوگوں کی طرح وہ بھی فی الحقیقت کرامت سمجھتے تھے اور اُن کے گمان میں وہ ایسی کرامت تھی کہ میں اُسے دیکھکر مسلمان ہو جاؤں گا۔ اُنھوں نے فرمایا کہ "آپ ذرا بارہ مولا تک ہو آئیے جس کا فاصلہ سوندہ براری سے کچھ زیادہ نہیں ہے۔ وہاں ایک مقبرہ ہے جس میں ایک مشہور پیر کا مزار ہے جو اگرچہ اب زندہ نہیں ہیں مگر اُن کی کرامت سے اب تک بیمار اور ناتوان لوگوں کو شفا ہوتی ہے۔ اور مرض یا شفا کے فی الواقع ہونے کو شاید آپ نہ مانیں، مگر اُس بزرگ کی کرامت سے ایک اور کرشمہ ظہور میں آتا ہے جس کو دیکھکر ہر شخص کو تسلیم ہی کرنا پڑتا ہے یعنی وہاں پتھر کی ایک بڑی متوسل پڑی ہے جس کو نہایت طاقتور آدمی بھی زمین سے نہیں اُٹھا سکتا لیکن گیارہ آدمی اُس ولی کے حق میں کچھ فاتحہ وغیرہ پڑھکر اپنی انگلیوں کے سرے سے ایسی آسانی کے ساتھ اُٹھا لیتے ہیں کہ جیسے ایک گھاس کا تنکا اُٹھا لیا۔ میں نے اس دوسرے سفر کی تکلیف کو بھی بخوشی گوارا کر لیا اور اپنے دونوں پہلے رفیقوں کے ساتھ چل دیا۔

بارہ مولا کو میں نے ایک فرحت بخش جگہ پایا۔ اور اگرچہ مقبرہ کی مکانیت کچھ بڑی قیمت اور لاگت کی نہ تھی مگر اُس پیر کی قبر البتہ تکلف سے آراستہ تھی۔ اور اُس کے چاروں

طرف لوگ دعا وغیرہ میں مشغول تھے اور کہتے تھے کہ ہم بیمار ہیں اُس مقبرہ کے متصل ایک باورچی خانہ ہے جہاں مجھکو بڑی بڑی دیگیں گوشت اور چاولوں سے بھری ہوئی نظر پڑیں جس سے میں نے فوراً تاڑ لیا کہ بس یہی بیماروں کے یہاں کھینچ لانے کے لئے مقناطیس کا کام دیتی ہیں اور یہی اُن کی شفا کے لئے کرامات کا حکم رکھتی ہیں۔ مقبرہ کے دوسری جانب ایک باغ اور مجاوروں کے حجرے ہیں جنھوں نے اپنے پیر کی مقدس کرامتوں کے اظہار کو اپنی گذران کے لئے ایک بے خلش حیلہ بنا رکھا ہے اور اُس کی کرامتیں اور محامد اور مناقب بڑی سرگرمی کے ساتھ بیان کرتے رہتے ہیں۔ لیکن چونکہ میں ایسے معاملات میں ہمیشہ سے بدقسمت ہوں پس جب تک میں بارہ مولا میں رہا پیر صاحب نے کسی مریض پر اپنی کرامت کا اثر نہیں ڈالا اور میں اُس کے مشاہدہ سے محروم ہی رہا۔

اب اُس بھاری سل کا حال سنئے جو مجھے مسلمان بنانے والی تھی۔ میں نے دیکھا کہ مجاوروں میں سے گیارہ آدمیوں نے اُس کے گرد حلقہ باندھ لیا مگر اُن کی نیچی نیچی قباؤں اور مشق کی ہوئی بلا فصل حلقہ بندی کی وجہ سے مجھے اُس طریقہ کے دیکھنے میں جس سے وہ اُس پتھر کو اُٹھاتے تھے بڑی دقت پیش آئی مگر غور کرنے سے مجھے اُن کی سب مکاری اور ہاتھ کی صفائی معلوم ہوگئی اور اگرچہ یہ لوگ بڑی شدومد سے ادعا کرتے تھے کہ ہر شخص نے اپنی انگلی کی صرف ایک ہی پور لگائی ہے اور پتھر ایسا سبک محسوس ہوتا رہا ہے جیسا کہ ایک پر ہوتا ہے مگر مجھے صاف معلوم ہوگیا کہ سارا زور لگائے بغیر وہ زمین سے نہیں اُٹھایا گیا۔ اور مجھے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ مجاوروں نے اُس پتھر کے اُٹھانے میں صرف اپنی انگلیاں ہی نہیں لگائیں بلکہ اپنے انگوٹھے بھی لگائے تھے مگر با این ہمہ میں بھی اُن کے اور اُن کے طرف داروں کے ساتھ جو "لفظ کرامت کرامت" پکار رہے تھے ہم آواز اور ہم آہنگ ہوگیا۔ پھر میں نے اُن کو ایک روپیہ نذر کیا اور نہایت عقیدت مندانہ صورت بنا کر التجا کی کہ اگر ارشاد ہو تو میں بھی ایک دفعہ اس مقدس پتھر کے اٹھانے والوں کے حلقہ میں شریک ہونے کا شرف حاصل کرلوں۔ یہ لوگ پہلے تو متامل ہوئے مگر جب میں نے ایک روپیہ اور نذر کیا اور کرامت کی سچائی کی نسبت اپنا اعتقاد ظاہر کیا تو اُن میں سے ایک نے مجھے اپنی جگہ دیدی۔ کیونکہ اُن کو یقیناً یہ اُمید تھی کہ دس آدمی کچھ زیادہ زور لگا کر اس پتھر کو اٹھالیں گے خواہ میں اپنی انگلی کی صرف ایک پور لگانے کے سوا اُس کے اُٹھا

دینے میں کچھ زیادہ مدد نہ دوں۔ اور اُن کو یہ بھی توقع تھی کہ ایسی چالاکی کے ساتھ اُس کے اُٹھانے کا انتظام کریں گے کہ مجھکو اُن کا فریب معلوم نہ ہو سکے گا۔ مگر جب اُن کو یہ معلوم ہوا کہ پتھر جس کو میں بجز اپنی انگلی کی پور کے اور کچھ سہارا نہیں لگاتا تھا برابر میری طرف جھکا اور گرا جاتا ہے تو وہ سخت نادم ہوئے اور بالآخر میں نے عیاری کی راہ سے اُس پتھر کو اپنی انگلی اور انگوٹھے کے ساتھ بزور تھامنا مناسب سمجھا اور ہم سب اُس کو بڑی مشکل کے ساتھ اُس کی معمولی بلندی تک لے آئے اور جب میں نے دیکھا کہ ہر شخص میری طرف بری نگاہ سے گھور رہا ہے اور خدا جانے میری نسبت کیا کیا خیال کر رہے تھے۔ مثلاً یہ کہ یہ شخص پتھر کے اُٹھانے کے خطرے میں پڑنے کے باعث خود پتھر بن جانے کی سزا کے لائق ہے تو میں نے مناسب جان کر پھر "لفظ کرامت کرامت" پکارنے میں اُن کا شریک ہو جانا پسند کیا اور ایک تیسرا روپیہ اُن کی طرف اور ڈال کر اُس اژدحام سے جھٹ پٹ آنکھ بچا کر نکل آیا۔ اور اگرچہ صبح سے میں نے مطلق کچھ نہیں کھایا تھا۔ مگر وہاں ٹھہرنا مناسب نہ جانا اور فوراً اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر پیر صاحب اور اُن کی کرامت کو اہلاً سہلاً تک وہیں چھوڑ آیا۔ اس جگہ کی آمد و رفت سے یہ فائدہ البتہ ہوا کہ اُن مشہور چٹانوں کو دیکھ لیا جن کے درمیان سے تمام ولایت کشمیر کی نہروں اور چشموں کا پانی ایک دریا بن کر نکلتا ہے۔ اور جس کا اشارہ میں اس خط کے شروع میں کر چکا ہوں۔

تیرتا ہوا مکان میں اپنے شوق کی وجہ سے شاہراہ سے علیحدہ ہو کر ایک بڑی جھیل کی طرف چلا گیا جو معمولی شاہراہ سے کچھ فاصلہ پر تھی۔ اس جھیل میں مچھلیوں اور خصوصاً مارماہی کی بڑی کثرت ہے اور مرغابیاں اور راج ہنس اور بہت سے آبی پرندے بکثرت رہتے ہیں اور صوبہ دار کشمیر جاڑوں میں اس جگہ شکار کھیلنے اکثر آتا ہے اور اُس وقت پرندوں کی اس جگہ نہایت کثرت ہوتی ہے اس جھیل کے وسط میں ایک فقیر کا چھوٹا سا ایک باغیچہ اور حجرہ ہے جس کو لوگ سمجھتے ہیں کہ کرامت سے پانی پر تیرتا ہے اور جو فقیر یہاں رہتا ہے مدت العمر اسی میں بسر کرتا ہے اور یہاں سے کبھی باہر نہیں جاتا۔ اُن ہزاروں مہمل اور بیہودہ حکایات سے، جو اس حجرہ کی بابت مشہور ہیں بجز ایک معتبر روایت کے کہ کشمیر کے راجگان سلف میں سے کسی راجہ نے صرف تماشے کی غرض سے پند نہ کار اور مضبوط شہتیروں کو باہم جوڑ کر اُن پر ایک حجرہ تعمیر کروایا تھا۔ میں اپنے

اس خط کو سیاہ کرنا نہیں چاہتا۔ وہ دریا جو بارہ مولا کو جاتا ہے اس جھیل کے وسط میں ہو کر گذرتا ہے۔

اُترتا چڑھتا چشمہ اس جھیل سے چل کر ہم ایک چشمہ کی تلاش میں گیا جس کو نہایت عجیب و غریب خیال کرتے تھے۔ یہ چشمہ بلبلے کی شکل میں آہستگی کے ساتھ اُبلتا اور کسی قدر زور سے تھوڑا سا بلند ہوتا جاتا ہے! اس کے پانی میں کسی قدر صاف اور شفاف ریگ ملی ہوئی نظر آتی ہے جو کچھ زور سے پانی کے اوپر کو چڑھکر پھر نیچے چلی جاتی ہے۔ اور اس کے بعد دو ایک لمحہ تک پانی کا جوش کھانا اور ریگ کا اوپر کو چڑھنا ختم ہوجاتا ہے اور پھر بدستور سابق پانی زور کرتا ہے اور ریگ اوپر کو چڑھکر نیچے بیٹھ جاتی ہے۔ اور اس چشمہ کا یہ حرکت اور سکون اسی طرح کے غیر معین نظام میں جاری رہتا ہے۔ سب سے زیادہ عجیب امر جو اس چشمہ کی نسبت بیان کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ بہت تھوڑا سا شور خواہ بولنے سے ہو خواہ زمین پر پاؤں مارنے سے پانی میں حرکت پیدا کردیتا ہے اور جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا اُس کے اُبلنے اور بیٹھنے کا باعث ہوجاتا ہے۔ میں نے دریافت کرلیا کہ اُس میں نہ تو بولنے سے حرکت پیدا ہوتی ہے نہ پاؤں مارنے سے بلکہ اُس کی حرکت اور سکون کا حال خواہ آپ بولیں یا نہ بولیں ایک ہی سا رہتا ہے! اور چونکہ میں نے اس کے اصل سبب کی نسبت بخوبی غور نہیں کیا۔ اس لئے آپ کی خدمت میں کوئی قابل اطمینان تشریح نہیں لکھ سکتا مگر شاید یہ سبب ہو کہ ریت اپنے ثقل طبعی کے باعث اُس کم زور چشمہ کے تنگ مجرا میں عود کرکے پانی کے اُچھلنے میں روک پیدا کرتا ہے اور اس سبب سے پانی جب اندر زیادہ جمع ہوجاتا ہے تو ریت کے ہٹانے اور راستہ کے کھولنے کے لئے پھر زور کرتا ہے۔ یا اغلب غالب شاید یہ ہو کہ جو ہوا اس کے مجرا میں بھری ہوئی ہوتی ہے وہ لمحہ بہ لمحہ اوپر کو چڑھتی ہے جیسے کہ عموماً فواروں میں یہ کیفیت مشاہدہ ہوا کرتی ہے۔

برفانی جھیل جب ہم اس چشمہ کو اچھی طرح دیکھ چکے تو ایک اور وسیع جھیل کے دیکھنے کو پہاڑ پر چڑھے جس میں گرمی کے موسم میں بھی برف موجود رہتی ہے اور تند ہوا کے چلنے سے برف کے بہت بڑے بڑے ٹکڑے بحر منجمد کی طرح کبھی مجتمع اور کبھی منتشر ہوتے رہتے ہیں۔

سنگ سفید کے پُربہار پھول اس کے بعد ہم اُس مقام سے ہو کر گذرے جس کو سنگِ

سفید ہوتے ہیں۔ یہ جگہ دو باتوں کے لئے مشہور ہے۔

(۱) ایک یہ کہ موسم بہار میں یہاں ہر قسم کے ویسے ہی پھول پیدا ہوتے ہیں جیسے کسی بڑے عمدہ باغ میں۔

(۲) دوسرے یہ کہ یہاں قدیم سے ایک یہ روایت چلی آتی ہے کہ جب آدمیوں کا زیادہ اژدحام ہوتا ہے اور وہ شور و غل مچا کر ہوا میں حرکت پیدا کرتے ہیں تو مزور شدت سے بارش ہونے لگتی ہے۔ ایسا اتفاق خواہ عموماً ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو مگر اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ چند سال گذرے جب شاہجہاں بادشاہ یہاں آیا تھا تو گو اُس نے غیر ضروری شور و غل کی ممانعت کے واسطے احکام بھی جاری کر دیئے تھے مگر پھر بھی غیر معمولی اور شدید بارش کے باعث اُس کے تمام ہمراہی ہلاکت کے خطرے میں پڑ گئے تھے اس بیان کو سُن کر آپ اس بڈھے فقیر کی گفتگو یاد فرمائیں گے جو کوہ پیر پنجال پر مجھ سے ہوئی تھی۔

میرا ارادہ تھا کہ اس پہاڑ کے ایک غار کو بھی دیکھتا چلوں جو سنگ سفید سے دو دن کی راہ پر تھا اور اس میں عجیب عجیب طرح کی منجمد چیزیں قابل مشاہدہ تھیں۔ مگر اتنے میں میرے پاس خبر پہنچی کہ ہمارے نواب صاحب میری بہت دنوں کی غیر حاضری سے فکرمند اور متردد ہیں اس لئے مجھے اپنا ارادہ ترک کرنا پڑا۔

قرب وجوار کے پہاڑی ملک

جب سے میں یہاں آیا ہوں ہر چند میرے خیالات اسی مضمون کی طرف مائل رہتے ہیں مگر مجھے کوئی ہم شوق اور ہم خیال شخص نہیں ملا اور نہ کوئی ایسا آدمی ملا جس کو کاوش اور تلاش ہوا اور اُن امور سے واقفیت رکھتا ہو جن کو میں تحقیق کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے مجھے افسوس ہے کہ کشمیر کے قرب وجوار کے کوہستان وغیرہ کی نسبت میں مختصر اور غیر مکمل ہی اطلاع دے سکتا ہوں۔ مگر بہرحال جو کچھ میں نے دریافت کیا ہے آپ کو لکھتا ہوں، وہ تاجر لوگ جو شال بنانے کی عمدہ پشم کے جمع کرنے کے لئے سال بسال پہاڑوں میں پھرتے رہتے ہیں متفق اللفظ بیان کرتے ہیں کہ اُن پہاڑوں کے اندر جو اب بھی کشمیر کے توابع میں شمار ہوتے ہیں زمین بہت زرخیز ہے اور اُن میں سے ایک علاقہ تو ایسا ہے کہ جس کے سالانہ خراج میں صرف اُون اور چمڑا دیا جاتا ہے اور عورتیں حسن وجمال اور پاک دامنی اور درست کاری میں ضرب المثل ہیں اور اس سے

آگے بڑھ کر ایک اور علاقہ ہے جس کی وادی بہت خوش نما اور میدان سیرحاصل ہیں وہاں چاول اور کئی قسم کا غلہ اور سیب اور ناشپاتی اور زرد آلو اور نفیس خربوزہ اور انگور جس سے عمدہ شراب بنتی ہے، کثرت سے ہوتا ہے اور اس کا خراج بھی چمڑے اور گُون ہی سے دیا جاتا ہے اور بعض اوقات ایسا بھی اتفاق ہوجاتا ہے کہ اس کے باشندے اپنے ملک کی دشوار گذاری کے بھروسہ پر ادائے خراج سے انکار کر بیٹھتے ہیں۔ لیکن سرکاری فوج ہمیشہ جاکر پھر مطیع کر لیتی ہے۔ سوداگر لوگوں سے میں یہ بھی سنتا ہوں کہ دُور دور کے پہاڑوں میں جو اب کشمیر کے باج گذار نہیں ہے اور بھی اچھے اچھے خوش نما علاقے ہیں جہاں کے لوگ سرخ و سفید اور خوش اندام ہوتے ہیں لیکن اپنے وطن سے ایسا اُنس رکھتے ہیں کہ کبھی شاذ و نادر ہی باہر جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض علاقوں میں کوئی حاکم بھی نہیں ہوتا۔ اور جہاں تک تحقیق ہوا ہے ان کا کچھ مذہب بھی معلوم نہیں ہوتا۔ مگر ہاں بعض بعض اقوام مچھلی کو ناپاک سمجھ کے کھانے سے پرہیز کرتے ہیں۔

اب میں وہ حال بیان کرتا ہوں جو چند روز ہوئے مجھ سے ایک بڈھے نیک مرد نے کہ جس نے کشمیر کے ایک قدیم راجہ کی نسل میں شادی کی تھی بیان کیا تھا۔ جس زمانہ میں جہانگیر بادشاہ راجگان کشمیر کے خاندان کے لوگوں کی بڑی سرگرمی سے تلاش کر رہا تھا یہ بڈھا بچ کر اپنے تین متعلقوں کے ساتھ مذکورہ بالا کوہستان کی جانب نکل گیا تھا اور کچھ نہیں جانتا تھا کہ کدھر جاتا ہوں مگر پھرتے پھرتے آخرکار وہ ایک خوش نما چھوٹے سے ضلع میں جا نکلا جہاں اُس کے شرف خاندان سے مطلع ہوتے ہی لوگ بڑے اخلاص اور عقیدت سے پیش آئے اور اس خوش نصیب شخص کے روبرو پیش کش اور نذرانوں کے انبار لگا دیئے۔ اور شام کو اپنی سب سے زیادہ خوبصورت لڑکیاں اس التجا سے لے کر حاضر ہوئے کہ آپ ان میں سے کسی کو پسند فرمالیں تاکہ اس ملک کو آپ کی نسل سے فخر حاصل ہو۔

پھر یہ میرا دوست ایک اور ضلع میں جو اس ضلع کے قریب ہی تھا گیا اور وہاں بھی اُس کی ویسی ہی آؤ بھگت ہوئی لیکن شام کے وقت کی تواضع میں ایک بات کا فرق ہوا یعنی وہاں کے لوگوں نے اپنی لڑکیاں حاضر کی تھیں اور یہاں والوں نے اپنے ہمسایوں کو بیوقوف سمجھ کر اور مآل اندیشی کر کے کہ لڑکیاں تو آخرکار اپنے خاوندوں کے ساتھ اپنی اپنی سسرال کو چلی جائیں گی اپنی جوروئیں پیش کیں۔

چھوٹی تبت کے فرماں روا کی آمد

چھوٹی تبت جو کشمیر کی سرحد پر ہے اُس کے فرمانروا خاندان کے لوگوں میں چند سال سے بڑے بڑے تنازعے ہو رہے تھے جن میں سے آخرکار ایک شخص[1] نے جو حکومت ریاست کا دعوے دار تھا۔ پوشیدہ صوبہ دار کشمیر سے مدد کی درخواست کی اور شاہجہاں کے حضور سے حکم ہو گیا کہ مدد دکار ہو دی جائے۔ چنانچہ صوبہ دار نے یورش کی اور بعض دعوے دار تو قتل ہوئے بعض بھاگ گئے اور اس کو اس شرط کے ساتھ مسند پر بٹھا دیا گیا کہ سال بسال کسی قدر بلور، مشک اور شال بنانے کی اُون بطور خراج دیا کرے اور یہی وجہ تھی کہ اس شخص کو یہ چیزیں بطور پیش کش لے کر بذات خود اورنگ زیب کے حضور میں حاضر ہونا پڑا مگر ایسے حقیر سامان کے ساتھ آیا ہے کہ میں تو کبھی اُس کو عالی رتبہ شخص خیال نہیں کر سکتا! ہمارے نواب نے اِس شخص سے اُس کی دعوت کی کہ اُس سے اُس کے علاقہ کے کچھ حالات معلوم کر سکیں۔ چنانچہ اُس نے ہم سے بیان کیا کہ بڑی تبت میری ریاست کی حد شرقی ہے اور اُس کا عرض قریب قریب ایک سو بیس میل کے ہے اور کہا کہ گو ہمارے ہاں بلور، مشک اور پشم بہ افراط بہم پہنچتی ہیں۔ مگر میں چنداں متمول نہیں ہوں اور لوگوں کا یہ عام گمان کہ میرے قبضہ میں سونے کی کانیں ہیں بالکل غلط ہے۔ اُس نے یہ بھی بیان کیا کہ اُس کے ملک کے بعض اضلاع میں عمدہ عمدہ میوے پیدا ہوتے ہیں خصوصاً خربوزہ جو کئی قسم کا ہوتا ہے۔ مگر کثرت برف کے باعث جاڑا بڑی شدت سے پڑتا ہے اور وہاں کے باشندے پہلے بُت پرست تھے مگر اب اکثر مسلمان ہو گئے ہیں۔ چنانچہ میں بھی مسلمان ہوں اور شیعہ ہوں۔ اُس نے یہ بھی ذکر کیا کہ سترہ اٹھارہ برس گذرے کہ شاہجہاں نے بڑی تبت کو جس پر راجگان کشمیر کی اکثر تاخت رہتی تھی تسخیر کرنے کا ارادہ کیا تھا اور سپاہ نے سولہ دن کے بعد ایک مشکل سفر کے جو کوہستان میں سے کرنا پڑا تھا ایک قلعہ کو محاصرہ کر کے لے بھی لیا تھا اور وہاں کے لوگوں میں ایسی ہل چل ڈال دی تھی کہ یقیناً تمام ملک مسخر ہو جاتا اگر سپاہ شاہی ایک مشہور اور تیز رو دریا سے جو راستہ میں آتا ہے اُتر کر اُسی وقت جرأت کر کے ریاست گاہ کو جا لیتی۔ مگر چونکہ مخالف موسم آ پہنچا تھا صوبہ دار کشمیر اس فوج کا حاکم تھا وہ اس اندیشہ سے واپس آ گیا کہ کہیں برف نہ آن دبائے اور اس مفتوحہ قلعہ میں کسی قدر

۱؎ عالمگیر نامہ میں اس شخص کا نام "مراد خاں" لکھا ہے۔ س م ح

سپاہیوں کو اس لئے چھوڑ آیا کہ فصل بہار کے شروع میں پھر یورش کروں گا مگر فوج متعینہ قلعہ نے عجیب حرکت کی کہ قلعہ کو یا تو دشمن کے خوف سے یا قلت رسد کی وجہ سے ناگہاں اور خلاف توقع خالی کر دیا۔ اور اس طرح سے بڑی تبت کا ملک جس کی تسخیر آئندہ فصل بہار پر ملتوی رکھی گئی تھی محکوم ہونے سے بچ رہا۔

بڑی تبت کے سفیر کی حاضری

چونکہ اُس ملک کو اورنگ زیب کی فوج کشی کا خوف تھا وہاں کے رئیس نے بادشاہ کی کشمیر میں تشریف آوری سُن کر اپنے ایک سفیر کو اپنے ملک کے تحائف بطور پیشکش۔ سنگ یشب اور سُرہ گائے کی سفید اور عمدہ دُمیں دے کر جو خاص طور سے اُسی ملک میں ہوتی ہیں اور زیبائش کی خاطر ہندوستان میں ہاتھیوں کے کانوں میں لٹکا دیتے ہیں بھیجا۔ سنگ یشب جو اس دفعہ پیشکش میں آیا ہے خلاف معمول بہت بڑا قطعہ ہے اور اسی جہت سے بیش قیمت ہے۔ دربار مغلیہ میں یہ پتھر بڑی قیمت اور قدر پاتے ہیں۔ ان کا رنگ سبزی مائل ہوتا ہے اور اُس میں سفید سفید دھاریاں ہوتی ہیں اور ایسا سخت ہوتا ہے کہ صرف الماس کے بُرادہ کے ساتھ تراشا جاتا ہے پیالے اور پھول دان اسی پتھر کے بنتے ہیں۔ چنانچہ میرے پاس بھی اس پتھر کی چند عمدہ بنی ہوئی چیزیں ہیں جن میں سنہری تار اور جواہرات جڑے ہوئے ہیں۔

ان جناب ایلچی صاحب کے ہمراہ تین چار تو سوار تھے اور دس بارہ لمبے لمبے قد والے دبلے اور سوکھے ہوئے پیادہ [illegible] جن کے منہ پر چینیوں کی طرح ڈاڑھی کا کوئی بال صرف نام کو تھا اور ایک طرح کی غریبانہ سی [illegible] ٹوپیاں [illegible] پہنے ہوئے تھے جیسے کہ ہمارے ملاحوں کے سر پر ہوتی ہیں اور ان کے باقی لباس کی شان و شوکت کا ان ٹوپیوں ہی سے خیال کر لیجئے اور سمجھ لیجئے۔ ان میں سے صرف چار پانچ [illegible] تلواریں باندھے ہوئے تھے باقی کے پاس ہتھیار نہ تھے اور بالکل خالی ہاتھ ایلچی کے پیچھے پیچھے چلا کرتے تھے۔

الغرض اس شخص نے اپنے آقا کی طرف سے اورنگ زیب کے ساتھ عہد و پیمان کیا کہ دارالریاست تبت میں ایک مسجد تعمیر کرائی جائے گی جہاں اہل اسلام کے طریقہ پر نماز ہوا کرے گی اور سکہ کے ایک طرف اورنگ زیب کا نام منقوش ہوگا۔ اور ایک رقم سالانہ

خراج کی بھیجی جایا کرے گی۔ مگر اس بارے میں کسی شخص کو بھی شبہ نہیں ہے کہ اورنگ زیب کے کشمیر سے مراجعت کرتے ہی اس عہد و پیمان پر کچھ بھی عمل نہ کیا جائے گا اور تبت کا راجہ عہد و پیمان کو اس سے زیادہ بجا نہ لائیگا جیسے اس عہد کے شرائط کو بجا لایا تھا جو شاہجہان اور اس کے ... باہم ہوئے تھے[1]۔

تبت کے ایک طبیب سے ملاقات

اس ایلچی کے ہمراہیوں میں ایک طبیب تھا جس کو کہتے تھے کہ ... لا ما کا ... رہنے والا ہے اور ... لاما[2] ...

---

[1] عالمگیر نامہ میں لکھا ہے کہ اورنگ زیب نے کشمیر سے واپس آ کر سیف خاں صوبہ دار کشمیر کو پاس والدان نجل بڑی تبت کے "زمیندار" یعنی راجہ کے نام کا ایک فرمان اس مضمون کا لکھ کر روانہ کیا کہ اگر تم ہماری اطاعت اختیار کر کے اپنے ملک میں ہمارا سکہ اور خطبہ جاری کر دو اور مسجد بنا کر شعائر اسلام کو رواج دو تو بہتر تمہارا ملک و مال بحال رہے گا ورنہ فوج کشی کی جائے گی۔ چنانچہ یہ فرمان ہدایت شاہی کے موافق محمد شفیع نامی ایک بادشاہی سردار کے ہاتھ کشمیر سے اس کے پاس بھیجا گیا جس کا دلدن نجل نے تین میل تک استقبال کیا اور بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ فرمان کو اپنے سر پر رکھا اور فرستادگان شاہی کی بہت خاطر و مدارات کی اور اس سے دوسرے روز جو جمعہ کا دن تھا ایک بڑے مجمع عام میں بادشاہ کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور جب محی الدین محمد اورنگ زیب کا نام خطبہ میں لیا گیا تو خطیب کے سر پر بہت سا سونا چاندی لٹایا گیا اور خطبہ کے بعد مسجد کی نیو رکھی گئی اور بہت سے سونے چاندی پر بادشاہ کا سکہ لگایا گیا اور اس کے بعد ایک عرضداشت جس میں بہت سے عجز و نیاز اور وفائے عہد کے وعدے تھے مع ایک طلائی کنجی کے جو بطور علامت ... کی ... والا ... کے تھی اور ایک ہزار اشرفی اور ... ہزار روپیہ جس پر بادشاہ کا سکہ لگایا تھا مع اور ... تحائف کے حوالہ کر کے محمد شفیع کو رخصت کیا اور لکھا ہے کہ اس ... روائی کے ... چھوٹی تبت کے راجہ مراد خاں نے بہت کچھ کوشش کی تھی اور یہ پہلی ... دفعہ تھی کہ بڑی تبت والوں نے کسی مسلمان بادشاہ کی اطاعت اختیار کی تھی۔ اسی کتاب میں ... حال اس ... کا طول ... پہنچنے کے راستہ ... زیادہ اور عرض بعض ... پہنچنے کا اور ... کشمیر۔ کماؤں۔ سری نگر ... مغرب ... بنگالہ اور مشرق میں ... اور شمال اور تبت خرد اور کاشغر اور تمام مغولستان اور جنوب دو دشت قبچاق ہے اور یہاں کے راجہ کی فوج بارہ ہزار سوار اور بہت سے پیادے ہیں اور سپاہ میں اکثر فرقہ قلماق قوم کے لوگ ہوتے ہیں۔ س۔م۔ح

[2] بدھ مذہب والے اپنے گرو اور پیشوائے مذہب کو لاما کہتے ہیں اور سب سے بڑا لاما شہر لاسا

میں ہندوستان کے برہمنوں کی طرح مذہبی امور میں مقتدا اور رہنما سمجھے جاتے ہیں۔ مگر برہمنوں کے طریقے کے برخلاف ان میں ایک گرو بھی ہوتا ہے جس کی تعظیم و تکریم صرف ملک لاسا ہی میں نہیں بلکہ کل تاتار میں ہوتی ہے اور اُس کا ایسا اعزاز و احترام کرتے ہیں جیسے کسی بڑے دیوتا کا۔ اس طبیب کے پاس نسخوں کی ایک کتاب تھی اور میں نے ہر چند چاہا کہ وہ اُس کو بیچ ڈالے مگر اُس نے نہ دی۔ اس کتاب کا خط دور سے کچھ ہمارے خط کے مشابہ دکھلائی دیتا تھا۔ ہم نے اُس سے اُس خط کی ابجد لکھوائی مگر اُس نے بڑی مشکل سے اور ایسی بدخطی سے لکھی کہ ہم نے جان لیا کہ وہ سب بے علم اور جاہل ہے۔

مسئلہ تناسخ پر اس شخص کو بڑا اعتقاد تھا جس کی نسبت اُس نے عجیب و غریب

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ دارالحکومت ملک تبت میں رہتا ہے اور تبت اور چین کے وہ لوگ جو بدھ مذہب رکھتے ہیں لاسا کے بڑے لاما کو مجسم بدھ جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ حیات ابدی رکھتا ہے اور جب کبر سن کے باعث اُس کا جسم بوسیدہ ہو جاتا ہے تب نئے قالب میں چلا جاتا ہے۔ لیکن یورپین سیاح اس کی نسبت یہ خیال کرتے ہیں کہ جب لاما مر جاتا ہے تو اس کے کارپرداز مخفی طور سے کسی تورت کے پیدا ہوئے لڑکے کو لاکر لاما کی مسند پر بٹھا دیتے ہیں۔ اور اُس کو ایسے طور پر پالتے پوستے اور سکھاتے پڑھاتے ہیں کہ وہ تمام باتیں پہلے لاماؤں کے وقت کی بتانے لگتا ہے اور اُس کے ناواقف اور جاہل پیرو اس کو لاما کے کشف و کرامات کا کرشمہ سمجھکر یقین کر لیتے ہیں۔ کپتان ٹرنر صاحب جو ۱۷۸۳ء میں سرکار آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے تبت کے راجہ کے پاس جو لاما کا نائب ہوتا ہے بطور سفارت لاسا کو گئے تھے لکھتے ہیں کہ اُس وقت جو لاما تھا اگرچہ اُس کی عمر صرف ڈیڑھ برس کی تھی لیکن صاحب موصوف کی ملاقات کے وقت وہ بڑی شان و شوکت اور تحمل و استقلال کے ساتھ مسند پر بیٹھا رہا اور برابر اُن کی طرف متوجہ رہا۔ صاحب موصوف جب کوئی بات کہتے تو جواب میں اس انداز سے گردن ہلاتا کہ جیسے کوئی امیر کسی بات کو سمجھکر اشارہ کرے۔ جب صاحب موصوف کا چائے کا پیالہ خالی ہوتا تو لاما ناک بھوں چڑھا کر سر کو ہلاکو مچنا اور اپنے نوکروں کو اور چائے دینے کا اشارہ کرتا بلکہ ایک دفعہ تو ایک سونے کی طشتری میں سے کچھ مٹھائی اُٹھا کر اپنے ہاتھ سے اُن کو دی۔ لاما جب قالب تبدیل کرتا ہے تو اس کے مردہ جسم کو سکھا کر اور چاندی سے منڈھ کر مندر میں پرستش کے لئے رکھ دیتے ہیں۔

(ماخوذ از جام جہاں نما) س۔م۔ح

حکایتیں سنائیں چنانچہ اُس نے بیان کیا کہ ایک بار جب بڑا لاما بہت بڈھا ہو گیا اور اُس کی موت کا وقت آن پہنچا تو اُس نے مجلس جمع کی اور ارشاد کیا کہ میری روح ایک نوزائیدہ بچے کے قالب میں حلول کرے گی۔ چنانچہ اُس بچے کو جس کی نسبت اُس نے یہ نمود دی تھی بڑی غور اور پرداخت سے پالا گیا اور جب وہ چھ سات برس کا ہو گیا تو بہت سا مختلف قسم کا اسباب خانہ داری اور پوشاکیں وغیرہ امتحاناً اُس کے روبرو رکھی گئیں اور اُس نے ازراہِ فراست اپنے اور بیگانے اسباب میں فوراً امتیاز کر دیا۔ یہ حکایت اس طبیب کے لئے مسئلہ تناسخ اور نقل ارواح پر اعتقاد کے لئے ایک نہایت قاطع دلیل تھی ۔۔ پہلے تو ہم کو یہ گمان ہوا کہ یہ شخص ہنسی کے طور پر اس قسم کا قصہ بیان کر رہا ہے لیکن جلد معلوم ہو گیا کہ نہیں فی الواقع اُس کو اس روایت کی صحت پر پکا اعتقاد ہے۔۔

ایک روز میں اُس ایلچی کے مکان پر اس طبیب کی ملاقات کو گیا اور ایک کشمیری سوداگر کو ترجمانی کے لئے اپنے ساتھ لے گیا۔ یہ تو میرا صرف بہانہ ہی تھا کہ مجھے کچھ پشمینہ جو اُس کے پاس تھا خریدنا ہے بلکہ اصل مطلب یہ تھا کہ اُس سے اُن ممالک کے حالات دریافت کروں جن کی کیفیت مجھے مکمل طور پر معلوم نہیں ہے مگر کوئی نئی بات دریافت نہ ہوئی اکثر وہ یہی کہتا رہا کہ بڑی تبت ہمارے ملک کے ساتھ ہمسری نہیں کر سکتی ہمارے ہاں سال بھر میں پانچ مہینے سے زیادہ عرصہ تک برف پڑتی۔ اور اکثر تاتاریوں سے ہماری ہمیشہ لڑائی رہتی ہے۔۔ مگر وہ یہ نہیں بتا سکا کہ تاتاریوں سے اُس کی مراد کون سے تاتاری تھے۔ آخرکار مجھے معلوم ہو گیا کہ جو وقت اُس کی ملاقات میں صرف ہوا ناحق ضائع ہوا کیونکہ میں نے اُس کو اپنے اکثر سوالات میں سے کسی ایک کے جواب دینے پر بھی قادر نہ پایا۔

کشمیر سے چین تک تجارتی راستے

بیس برس سے پہلے کشمیر سے چین کو ہر سال کارواں جایا کرتے تھے اور اُن کا راستہ بڑی تبت کے کوہستان اور ملک تاتار میں سے تھا اور تقریباً تین مہینے کے عرصہ میں چین میں پہنچ جاتے تھے ۔۔ یہ راستہ بہت دشوار گذار ہے اور ایسے تیز رو دریا اُترنے پڑتے ہیں کہ جن پر سے گذرنا صرف ایسے لمبے لمبے رسوں کے ذریعے سے ممکن ہے جو دریا کے آر پار بڑے بڑے پتھروں سے بندھے ہوئے[1]

---

[1] جہاں دریا پہاڑوں کے اندر بہت زور سے بہتے ہیں اور پتھروں کے سبب سے کشتی کو

ہیں۔ یہ قافلے چین سے مشک۔ چوب چینی۔ ریوند۔ اور ممیران۔ جو امراض چشم کے معالجہ کے باب میں ایک چھوٹی سی نہایت مشہور جڑ ہے لاتے تھے۔ جب یہ لوگ واپسی کے وقت بڑی تبت میں ہوکر گذرتے تھے تو اس ملک کے تحائف بھی مثل مشک۔ بلور۔ سنگ یشب اور خاص کر بھیڑوں اور جنگلی بکریوں کی پشم کے (جس کو ان اطراف میں توز کہتے ہیں اور جو حسب بیان سابق ملائمت میں بیدؔ کے مشابہ ہے) بھر لاتے تھے مگر جب سے شاہجہاں نے بڑی تبت پر حملہ کیا ہے وہاں کے راجہ نے نہ صرف کاروانوں کا آنا جانا بند کر دیا ہے بلکہ یہاں تک ممانعت کر دی ہے کہ کوئی کشمیر کا رہنے والا بھی ہماری قلمرو میں قدم نہ رکھنے پائے۔ یہی وجہ ہے کہ اب ہندوستان کے کاروان شہر پٹنہ سے جو گنگا کے کنارے بنا ہے چل کر سیدھے ملک لاسا میں جا پہنچتے ہیں اور بڑی تبت کو بائیں ہاتھ چھوڑ دیتے ہیں۔

ملک کاشغر اُس ملک کی نسبت جو یہاں (یعنی ہندوستان میں) بنام کاشغر مشہور ہے اور ظن غالب یہ ہے کہ وہی ملک ہے جس کو ہمارے جغرافیہ کے نقشوں میں کا سکر کہتے ہیں میں وہ سب حالات بیان کروں گا جو مجھکو اُس ملک کے رہنے والے سوداگروں سے معلوم ہوئے ہیں۔ یہ لوگ یہ سُن کر کہ اورنگ زیب کشمیر کی سیر کو آیا چاہتا ہے بہت سے کم عمر غلام اور لونڈیاں بیچنے کو لائے ہیں اُن کا بیان ہے کہ کاشغر تھوڑا سا شمال کو جھکتا ہوا کشمیر کے شرق میں ہے اور ان دونوں ملکوں میں سیدھا اور نزدیک کا راستہ بڑی تبت میں سے ہے مگر اس سبب سے کہ اب وہ

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ = خوف ہوتا ہے وہاں لوگ جھولے یا چھینکے کے ذریعے پار اُترتے ہیں۔ جھولا اس کو کہتے ہیں کہ دریا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک کئی مضبوط رسے برابر برابر باندھکر تختوں سے پاٹ دیتے ہیں جن کی چوڑان اکثر ہاتھ دو ہاتھ سے زیادہ نہیں ہوتی اور سہارے کے واسطے دونوں جانب برابر رسیاں باندھ دیتے ہیں۔ لیکن چھینکا اس سے بھی بدتر ہے وہ صرف ایک رسا ہوتا ہے اس کنارے سے اُس کنارے تک بندھا ہوا جس میں لوہے کے قلابے کے ساتھ ایک چھینکا لٹکا دیتے ہیں اور اُس میں مسافر کو بٹھاتے ہیں۔ اس چھینکے میں دو رسیاں بندھی ہوتی ہیں ایک رسی کا سرا اُن کنارے والے کے ہاتھ میں اور دوسری رسی کا سرا دوسرے کنارے والے کے ہاتھ میں ہو تو پہلا اُس طرف کے مسافر کو اس کنارے والا اور اس طرف کے مسافر کو اُس کنارے والا اپنی رسی سے کھینچ لیتا ہے۔ س م ح

ہند سے ہم مجبوراً چھوٹی تبت ہو کر آتے ہیں۔ پہلا شہر جو ہماری واپسی کے وقت راستہ میں آتا ہے اُس کا نام گورچی ہے جو توابع کشمیر میں سے عین سرحد پر واقع ہے اور کشمیر سے چار دن کا راستہ ہے گورچی سے چل کر ہم آٹھ روز میں اسکردو میں پہنچتے ہیں جو چھوٹی تبت کا دارالریاست ہے اور وہاں سے دو دن میں قصبہ چکیرہ میں[1] آتے ہیں جو چھوٹی تبت ہی کے علاقہ میں اُس ندی کے کنارے آباد ہے جس کا پانی بمنزلہ دوا کے مشہور ہے۔ اور یہاں سے پندرہ روز کے عرصہ میں ایک بڑے بن میں جو چھوٹی تبت کی سرحد پر ہے پہنچتے ہیں۔ اور پھر پندرہ روز میں کاشغر پہنچ جاتے ہیں جو ایک چھوٹا سا شہر ہے اور جو اگلے زمانہ میں حاکم نشین مقام تھا اب کاشغر کا رئیس جورستہ میں رہتا ہے جو ذرا زیادہ شمال کی طرف کاشغر سے دس منزل کے فاصلہ پر ہے۔

کاشغر سے چین کو کاروانی راستے

ان سوداگروں نے یہ بھی بیان کیا کہ شہر کاشغر سے چین تک دو مہینے سے زیادہ کا سفر نہیں ہے اور کاشغر سے ہر سال کاروان چین کو جاتے ہیں اور وہاں سے وہ جنسیں لے کر جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے ملک ازبک کے راستہ سے ایران کو چلے جاتے ہیں اور بعض کاروان ایسے بھی ہوتے ہیں جو چین ہو کر ہند میں آنے کے لئے پٹنہ کا راستہ اختیار کرتے ہیں انہی تاجروں نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ کاشغر سے چین کو ایک اور راستہ بھی ہے جو ایک ایسے قصبہ میں ہو کر گذرتا ہے جو ختن سے آٹھ منزل پر ملک کاشغر کی سرحد پر سب سے آخر شہر ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ کشمیر سے کاشغر تک راستہ نہایت ہی خراب ہے اور منجملہ اور مشکلات کے ایک جگہ ایسی بھی آتی ہے کہ جہاں ہر موسم میں مسافر کو آدھے میل تک برابر برف ہی برف پر جانا پڑتا ہے۔

مشفق من: یہ کل واقعات ہیں جن کو میں ایسے لوگوں سے حاصل کر سکا ہوں

---

[1] یہ مقام مع اپنے متعلقہ علاقہ کے فی الحال مہاراجہ صاحب والی جموں و کشمیر کی عملداری میں ہے اور گورچی اور چکیرہ غیر معروف مقام ہیں مگر چکیرہ کا صحیح نام ایک تبت کے رہنے والے نے ہم کو شکر چا یا تھا اور فی الحقیقت ایک مستند انگریزی نقشہ میں بھی ایسا ہی لکھا ہوا ہے مگر گورچی کی صحت کچھ معلوم نہیں ہو سکی علیٰ ہذا القیاس جورستہ وغیرہ ناموں کا بھی پتہ نہیں لگ سکا س م ح

سکردو۔ اس ک رد و) رچکیرہ۔ پچے ک ر) رشکرچا۔ ش ک ر) روخ ق ر

جن کی نادانی اور جہل رحم کے قابل ہے - پس جو حالات اور جو کیفیات ایسے لوگوں سے حاصل ہوں بلا شبہ مختصر اور بے ترتیب ہی ہوں گے جیسے کہ یہ ہیں ۔
علاوہ بریں مجھے ایسے مترجموں سے بھی کام لینا پڑتا تھا جن کو خود میرے سوالات کے سمجھنے اور پھر بیان کرنے اور اُن کا جواب شافی دینے میں دقتیں اور مشکلیں واقع ہوتی تھیں۔

پانچ سوال اور اُن کے جواب

اس موقعہ پر میرا ارادہ تھا کہ اپنے اس خط کو جسے ایک کتاب کہنا چاہیئے ختم کر دوں اور میں دہلی واپس پہنچنے تک آپ سے بالکل رخصت ہو لوں لیکن میرا شوقِ تحریر ابھی خاموشی کی اجازت نہیں دیتا اور کچھ فرصت بھی ہے۔ اس لئے میں مسٹر تھیوی نٹ صاحب کے پانچ سوالوں کا جواب لکھنا چاہتا ہوں کیونکہ صاحب موصوف نہایت ہی محقق اور جانکاہی کرنے والے شخص ہیں اور بہ نسبت اُن لوگوں کے جو ملکوں ملکوں سیر کرتے پھرتے ہیں کتابوں کے مطالعہ ہی سے بڑے بڑے نئے انکشافات اور اہم معلومات حاصل کر لیتے ہیں ۔

پہلا سوال کشمیر میں یہودی

اُن کا پہلا سوال یہ ہے کہ آیا یہ سچ ہے کہ یہودی ایک طویل عرصہ سے کشمیر میں بود و باش رکھتے ہیں اور آیا اُن کے پاس کتاب مقدس موجود ہے یا نہیں ۔ اور اگر ہے تو اُن کی اور ہماری کتاب عہد عتیق میں کچھ اختلاف ہے یا نہیں۔

دوسرا سوال ہندوستان میں موسم برسات

دوسرا یہ کہ جو جو تجربے ہندوستان کے موسم برسات کی نسبت مجھے حاصل ہوئے ہیں - میں اُن کی خدمت میں لکھ بھیجوں ۔

تیسرا سوال مشرقی سمندروں کی آب و ہوا

تیسرا یہ کہ مشرقی سمندروں میں جو ایک خاص طرح کے انضباط اور نظام معینہ کے موافق ہواؤں کا احتزاز اور پانی کے دھاروں کا بہاؤ رہتا ہے اُن کی نسبت میں اپنی رائے اور خیالات ظاہر کروں۔

چوتھا سوال بنگالہ کی زرخیزی چوتھا یہ کہ کیا ملک بنگالہ واقع میں ایسا ہی زرخیز اور دولت مند اور خوش نما ہے جیسا کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے

پانچواں سوال دریائے نیل کی طغیانی پانچواں یہ کہ دریائے نیل کی طغیانی اور چڑھاؤ کے اسباب کی نسبت زمانہ قدیم سے جو ردو قدح چلی آتی ہے میں اس کی نسبت ایک قطعی رائے پیش کروں۔

پہلے سوال کا جواب اگر میں یہودیوں کو اس پہاڑی ملک میں دیکھ پاتا تو مجھ کو ویسی ہی خوشی ہوتی جیسی کہ تھیوی نٹ صاحب کو، میری مراد اُن یہودیوں سے ہے جن کے پائے جانے کی صاحب موصوف خواہش رکھتے ہیں یعنی وہ یہودی جو اُن قبائل کی اولاد سے ہوں جن کو شال[۱] میں نے سر نے جلاوطن کیا تھا لیکن صاحب موصوف کو آپ یقین دلائیے کہ گو بظن غالب بعض وجوہ سے پایا جاتا ہے کہ اُن میں سے بعض لوگ پہلے اس ملک میں آباد تھے لیکن اب تو یہاں کے کل باشندے ہندو ہیں یا مسلمان۔ البتہ چین میں غالباً اس قوم کے لوگ موجود ہیں۔ کیونکہ میں نے اپنے پادری صاحب مقتدائے فرقہ جیسویٹ کے پاس جو دہلی میں رہتے ہیں۔ اس فرقہ

۱؎ توریت میں اس شخص کا نام سلمانصار آیا ہے۔ مگر انگریز مورخ " شال میں سے سر" یا " شال منی زر" لکھتے ہیں! یہ ملک شام کا بادشاہ تھا اور مشہور شہر بابل اس کا پایہ تخت تھا اس نے سات سو انیس برس قبل از سنہ عیسوی ملک یہودا کے بادشاہ ہوشاع[۲] پر جو بنی اسرائیل میں سے تھا مگر بت پرست ہو گیا تھا چڑھائی کی اور اُس کو اپنا باج گزار بنا لیا۔ لیکن پھر یہ سن کر کہ وہ فرعون مصر کے ساتھ سازش رکھتا ہے دوبارہ اُس کے شہر شومرون[۳] کو جا گھیرا اور تین برس کے محاصرہ کے بعد اُس کو فتح کر لیا اور ہوشاع اور اُس کی تمام قوم کے لوگوں کو قید کر کے بابل میں لے آیا اور اُن کی جگہ بابل کے لوگ آباد کئے۔ اور تیرہ برس سلطنت کر کے آخر وہ بھی اس دنیا سے چل بسا (ماخوذ از تاریخ التواریخ و انسائیکلو پیڈیا برطانیہ کا) س۔م۔ح

(شَ ل مَ ن ے ی ز ر)

۱؎ (شَ ل مَ ا ن اَ ع سَ ا ز) سلمانصار

۲؎ (ہُ و شِ ا عْ) ہوشاع

۳؎ (شُ رُ م ن ذُ ن) شومرون

کے ایک پادری صاحب باشندہ جرمنی مقیم شہر پیکن دارالسلطنت چین کے خطوط دیکھے ہیں جن میں وہ لکھتے ہیں کہ "میری اس شہر یعنی پیکن میں یہودیوں سے گفتگو ہوئی ہے جو مذہب موسوی کے پابند ہیں اور توریت وغیرہ کتب عہدِ عتیق اُن کے پاس موجود ہیں۔ اُن کو حضرت عیسیٰ کی وفات کا حال مطلق معلوم نہیں اور اُنھوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ فرقہ جیسویٹ کے پادری صاحب کو ہم اپنا کاکان[1] مقرر کرلیں گے بشرطیکہ پادری صاحب سؤر کے گوشت کھانے سے پرہیز کریں"۔ بہرحال کشمیر میں یہودیت کی بہت سی علامتیں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ پیرپنجال سے گذر کر جب میں اس ملک میں داخل ہوا تو دیہات کے باشندوں کی صورتیں یہودیوں کی سی دیکھکر مجھے حیرت ہوئی۔ اُن کی صورتیں اور اُن کے طور وطریق اور وہ ناقابل بیان خصوصیتیں جن سے ایک سیاح مختلف اقوام کے لوگوں کی خودبخود شناخت اور تمیز کر سکتا ہے سب یہودیوں کی پرانی قوم کی سی معلوم ہوتی تھیں۔ میری بات کو آپ محض خیالی ہی تصور نہ فرمایئے گا۔ ان دیہاتیوں کے یہودی نسل ہونے کی نسبت ہمارے پادری صاحب اور بہت سے فرنگستانیوں نے بھی میرے کشمیر جانے سے کافی عرصہ پہلے ایسا ہی لکھا ہے[2]! دوسری علامت یہ ہے کہ اس شہر کے باشندے باوجودیکہ تمام مسلمان ہیں مگر پھر بھی اُن میں سے اکثر کا نام موسیٰ ہے۔

تیسرے۔ یہاں یہ عام روایت ہے کہ حضرت سلیمان اس ملک میں آتے تھے اور بارہ مولا کے پہاڑ کو کاٹ کر اُنھیں نے پانی کا راستہ کھول دیا تھا۔

چوتھے۔ یہاں لوگوں کو یہ بھی گمان ہے کہ حضرت موسیٰ نے شہر کشمیر ہی میں وفات پائی تھی اور اُن کا مزار شہر سے قریب تین میل پر ہے۔

پانچویں یہ بات دیکھی جاتی ہے کہ یہاں عموماً سب لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ ایک اونچے پہاڑ پر جو ایک مختصر اور نہایت ہی پرانا مکان نظر آتا ہے اُس کو حضرت سلیمان نے تعمیر کرایا تھا اور اسی سبب سے اُس کو آج تک تختِ سلیمان کہتے

---

[1] اس لفظ کی تحقیق نہیں ہوسکی مگر شاید خاقان ہو جس سے اس جگہ پیشوا اور امام مراد ہو۔ م ع

[2] کرنل جارج فاسٹر صاحب نے اپنی ایک چٹھی میں جو کشمیر سے ۱۷۸۳ء میں لکھی تھی لکھا ہے کہ "جب پہلے پہل میں نے کشمیریوں کو کشمیر میں دیکھا تو اُن کے لباس اور چہرے کی ساخت سے جو لمبا اور سنجیدہ طور کا ہے اور اُن کی ڈاڑھی کی وضع سے یہ خیال کیا کہ گویا میں یہودیوں کے ملک میں آگیا ہوں" مترجم انگریزی۔

ہیں؟

مشفق من! وجوہ مذکورہ کے باعث میں اس بات سے انکار کرنا نہیں چاہتا کہ یہودی لوگ کشمیر میں آ کر نہ بسے ہوں میں خیال کرتا ہوں کہ پہلے تو اُن کے مذہبی مسائل زمانہ گذرنے پر بگڑ گئے ہوں گے اور آخرکار رفتہ رفتہ تنزل کرتے کرتے وہ بت پرست بن بن گئے ہوں گے اور بعد ازاں شمل اور بہت سے بُت پرستوں کے مذہب اسلام اختیار کرنے کی طرف مائل ہو گئے ہوں گے۔ اور یہ بات تو تحقیق ہے کہ بہت سے یہودی ایران میں بمقامات لار اور اصفہان آباد ہیں اور ہندوستان میں بھی جزیرہ گوا اور کوچین[1] کے بعض مقامات میں بستے ہیں اور میں سنتا ہوں کہ اتھوپیا[2] میں تو یہودی بہت ہی زیادہ آباد ہیں جو اپنی شجاعت اور جنگی لیاقتوں کی وجہ سے مشہور ہیں اور اگر میں اُن دو سفیروں کی بات کا یقین کروں جو حال ہی میں شاہ اتھوپیا[3] کی طرف سے اورنگ زیب کے دربار میں آئے ہوئے تھے تو پندرہ سولہ برس سے وہاں ایک یہودی ایسا بااختیار ہو گیا تھا کہ اُس نے ایک دشوار گذار چھوٹے سے کوہستانی ضلع میں خود مختار ریاست قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔

دوسرے سوال کا جواب ہندوستان میں سال بھر خصوصاً آٹھ مہینے تک گرمی اس سختی اور شدت سے پڑتی ہے کہ زمین جل کر بالکل ناقابل زراعت اور غیر آباد ہو جاتی ہے۔ مگر خداوند تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اُس کی اصلاح کے واسطے یہ معقول انتظام کر دیا ہے کہ جولائی میں جب گرمی نہایت ہی شدت سے پڑتی ہے تو مینہ برسنا شروع ہو جاتا ہے اور متواتر تین مہینے

---

[1] تعجب ہے کہ ایسی بے سرو پا باتوں کو مصنف نے اپنی رائے کی بنیاد قرار دیا ہے اور شاید اُس کو معلوم نہ ہوگا کہ مسلمان اکثر حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ اور دوسرے قدیم پیغمبروں کے نام پر قدیم سے اپنے نام رکھتے چلے آئے ہیں۔ س۔م۔ح

[2] مدراس پریذیڈنسی کے متعلق ساحل مالابار پر سمندر کے کنارے ایک ہندوستانی ریاست ہے مگر بندرگاہ کوچین خاص گورنمنٹ انگریزی کی حکومت میں ضلع مالابار میں ہے۔ س۔م۔ح

[3] ملک لوبیا یا لوبہ کا جو افریقہ کا ایک حصہ ہے قدیم نام ہے۔ س۔م۔ح

رق ذ پ ٹی آ   دا ثقہ ی اُ ذ ب ئی آ

تک برستا رہتا ہے اور اس طرح ہوا میں اس قدر اعتدال آ جاتا ہے کہ برداشت کے لائق ہو جاتی ہے اور زمین کبھی ناقابل زراعت نہیں رہتی۔ مگر یہ بارشیں ایسی باقاعدہ نہیں ہوتیں کہ ضرور اسی دن یا اسی ہفتہ میں ہوں چنانچہ مختلف مقامات خصوصًا دہلی میں جہاں میں زیادہ عرصہ رہا ہوں میں نے دیکھا ہے کہ ایک سال کی بارش دوسرے سال سے کبھی مطابق اور یکساں حالت پر نہیں ہوتی۔ چنانچہ بعض اوقات بارشیں دو دو تین تین ہفتے آگے پیچھے شروع اور ختم ہوتی ہیں اور کسی سال میں پہلے سال کی نسبت زیادہ ہوتی ہیں۔ میں نے ایک مرتبہ یہ بھی دیکھا ہے کہ دو برس کامل ایسا امساک رہا کہ ایک بوند بھی نہیں پڑی اور اس غیر معمولی خشک سالی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جدھر دیکھئے بیماری اور قحط کی مصیبت نظر آ رہی تھی۔ اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ اس ملک کے مختلف حصوں میں برسات اُسی قدر آگے یا پیچھے اور کمی یا زیادتی سے ہوتی ہے جس قدر کہ وہ ایک دوسرے سے قریب یا بعید ہیں۔ مثلاً بنگالہ میں اور ساحل کارومنڈل سے لے کر جزیرہ سراندیپ تک ساحل مالابار کی نسبت برسات ایک مہینہ پہلے شروع اور ختم ہو جاتی ہے اور بنگالہ میں چار مہینے تک شدت سے بارش رہتی ہے اور اس عرصہ میں کبھی کبھی بڑے زور سے آٹھ آٹھ روز کی جھڑی لگی رہتی ہے اور تھوڑی دیر کے لئے بھی بارش بند نہیں ہوتی۔ مگر دہلی اور آگرہ میں نہ تو اس قدر بارش ہی ہوتی ہے اور نہ اس قدر مدت تک رہتی ہے اور اکثر یہ حال ہوتا ہے کہ دو تین روز یوں ہی خالی گذر جاتے ہیں یا یہ کہ صبح کو دن نکلنے کے بعد کوئی نو دس بجے تک اکثر خفیف سی بارش ہوا کرتی ہے اور بعض اوقات تو بالکل ہی نہیں ہوتی۔ میں خصوصًا اس بات کو دیکھکر بہت متعجب ہوا کہ مختلف ممالک میں مختلف اطراف سے مینہ آتا ہے۔ مثلاً دہلی اور اس کے نواح میں مشرق یعنی بنگالہ کی طرف سے بارش آتی ہے۔ اور بنگالہ اور ساحل کارومنڈل پر جنوب کی جانب سے اور ساحل مالابار پر تقریبًا ہمیشہ مغرب کی طرف سے۔ میں نے ایک اور بات بھی دیکھی جس کی نسبت تمام ہندوستان میں بلا اختلاف ایک ہی رائے ہے یعنی یہ کہ جس قدر گرمی کی تپش پہلے یا پیچھے شروع ہوتی ہے اور کم یا زیادہ سختی سے گرمی پڑتی ہے اور تھوڑے دنوں یا دیر تک قائم رہتی ہے اسی قدر برسات بھی پہلے یا پیچھے شروع ہوتی اور اُسی نسبت سے کم یا زیادہ اور تھوڑے یا بہت عرصہ تک جاری رہتی ہے اور سے لحاظ

ان امور کے مجھے یقین ہے کہ زمین کی گرمی اور اُس کے سبب سے ہوا میں جو خفت آ جاتی ہے وہی ہندوستان میں بارش کا سبب ہے۔ اور یہی دونوں چیزیں بارش کو اس ملک میں کھینچ لاتی ہیں۔ یعنی آس پاس کے سمندروں کی ہوا چونکہ سرد اور بھاری اور کثیف ہوتی ہے اُن بخارات کو اپنے میں جذب کر کے پُر ہو جاتی ہے جو گرمی کی شدت سے پانی سے اُٹھتے ہیں اور قرب و جوار کی ہوائیں جب اُس کو دھکیلتی اور حرکت میں لاتی ہیں تو بادلوں کی صورت میں طبعًا اُس زمین پر جہاں کی ہوا اُس کی نسبت زیادہ گرم اور لطیف اور کم وزن اور کم مزاحم ہوتی ہے بخارات سے خالی ہو جاتی ہیں اور بخارات کا پیدا خراج اُسی قدر کمی یا زیادتی کے ساتھ ہوتا ہے جس قدر کہ گرمی پہلے یا پیچھے شروع ہوتی اور کم یا زیادہ سختی سے پڑتی ہے۔ اس تقریر میں جو وجوہ بیان کئے گئے ہیں اُن میں اس بات کا خیال کرنا بھی مناسب ہے کہ ساحل مالابار کی نسبت ساحل کارومنڈل پر برسات پہلے شروع ہونے کی یہی وجہ ہے کہ گرمی پہلے پڑنے لگتی ہے۔ اور اس کے خاص اسباب ہوں گے جن کی تحقیق غالبًا اُس ملک کو دیکھنے کی صورت میں شاید مشکل نہ ہوگا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ زمین کے مختلف حصوں میں سمندروں یا پہاڑوں اور اُن کے ریگستانی یا پہاڑی درختوں اور جنگلوں کی مناسبت سے گرمی جلدی یا دیر سے شروع ہوتی اور کم و بیش پڑتی ہے۔ اور یہ بات بھی کچھ تعجب کی نہیں ہے کہ بارش مختلف اطراف سے آتی ہے۔ مثلاً ساحل کارومنڈل پر جنوب کی طرف سے اور ساحل مالابار پر مغرب کی جانب سے کیونکہ یہ بات ظاہر ہے کہ جو سمندر پاس ہوگا اُسی سے مینہ آئے گا۔ چنانچہ ساحل کارومنڈل کے پاس جو سمندر ہے وہ اس سے جنوب کی طرف ہے۔ اور وہ سمندر جو ساحل مالابار کو سیراب کرتا ہے مغرب کی طرف باب المندب اور عرب اور خلیج فارس کی سمت کو پھیلا ہوا ہے۔ میں نے خوب غور کیا کہ اگرچہ بظاہر دہلی میں بادل مشرق کی طرف سے آتے ہیں مگر اُن کی اصل اُنھیں سمندروں سے ہوگی جو جنوب کی طرف ہیں اور ایسی زمینوں یا پہاڑوں کے حائل ہونے کی وجہ سے جن کی ہوا زیادہ سرد اور کثیف اور زیادہ مزاحم ہے اپنا راستہ بدل لیتے ہیں اور ایسے ملک میں جا برستے ہیں جہاں کی ہوا زیادہ ہلکی اور کم مزاحم ہو۔ میں ایک اور بات بیان کرنی بھول گیا جس کا مجھکو دہلی میں تجربہ ہوا۔ یعنی یہ کہ کبھی اچھی بارش نہیں ہوتی تاوقتیکہ کئی دن تک بہت سے بادل

مغرب کی طرف جمع نہ ہو جائیں۔ گویا یہ بات ضروری ہے کہ دہلی کے پچھم میں ہوا کا طبقہ اوّل بادلوں سے بھر جائے۔ اور پھر ان بادلوں کو کوئی چیز مثلاً کوئی ایسی ہوا جو کم گرم اور کم لطیف اور زیادہ بھاری اور قابل مزاحمت ہو روکے یا اور بادل اور مخالف ہوائیں مقابل ہو کر اُن کو ایسا کثیف اور وزنی کر دیں کہ پھٹ کر برسنے لگیں جس طرح کسی پہاڑ کی ہوا بادلوں کو جب پیچھے ہٹا دیتی ہے تو وہ برسنے لگتے ہیں۔

تیسرے سوال کا جواب

جب شروع اکتوبر میں عموماً بارش کا موسم ختم ہو جاتا ہے تو سمندر جنوب کی طرف بہنا شروع ہوتا ہے اور ٹھنڈی شمالی ہوا چلنے لگتی ہے جو چار پانچ مہینے تک برابر ایک ہی حالت پر بلا طوفان وغیرہ ایک ہی طرف کو چلتی رہتی ہے۔ البتہ اس عرصہ میں کبھی ایک آدھ روز اپنا رخ بدلتی یا ٹھہر جاتی ہے۔ اور اس کے بعد کوئی دو مہینے تک بے قاعدہ ہوائیں چلتی ہیں جن کو ہم لوگ وسطی موسم اور ڈچ لوگ غیر معین اور مختلف ہواؤں کا زمانہ کہتے ہیں۔ اور جب یہ دو مہینے ختم ہو جاتے ہیں تو سمندر پھر اپنا رخ جنوب سے شمال کو کر لیتا ہے اور جنوبی ہوا چلنی شروع ہوتی ہے۔ اور چار پانچ مہینے تک اسی طرف سے چلتی رہتی ہے اور سمندر کا بہاؤ بھی اس تمام عرصہ میں بدستور شمال ہی کو رہتا ہے۔ اور اس کے بعد پھر دو مہینے تک وہی وسطی موسم رہتا ہے اور ان وسطی موسموں میں جہاز رانی کرنا نہایت مشکل اور خطرناک ہوتا ہے۔ لیکن اُن دونوں معمولی موسموں میں جنوبی ہواؤں والے موسم کے اواخر کو چھوڑ کر باقی تمام عرصہ میں جہاز رانی بہت آسان اور خوش آیند ہوتی ہے۔ پس آپ کو اس بات سے متعجب ہونا نہیں چاہیئے کہ ہندوستانی جو بہت ڈرپوک اور فن جہاز رانی سے محض ناآشنا ہیں خاصے لمبے اور مفید بحری سفر اختیار کر لیتے ہیں۔ مثلاً بنگالہ سے تناسرم (دھنا سری) آچین۔ ملاکا۔ سیام۔ اور میڈی گاسکر۔ گویا مچھلی پٹن۔ سراندیپ جزائر مالدیپ۔ بندر مخا۔ اور بندر عباسی کو اپنے جہاز لے جاتے ہیں اور بڑی احتیاط کے ساتھ جانے اور آنے کے موسم کی عمدگی کا حساب لگائے رہتے ہیں۔ مگر اس پر بھی ایسا ہوتا ہے کہ مناسب وقت سے زیادہ کہیں رُک جانے کی صورت میں بادمخالف سے مغلوب ہو کر تباہ ہو جاتے ہیں۔ البتہ یہ صورت بعض وقت فرنگستانیوں کو بھی پیش آجاتی ہے جو بہت من چلے اور زیادہ تجربہ کار اور واقف ہیں اور جن کے جہازوں کی حالت اور

سا نوسا ان زیادہ عمدہ ہیں۔ دونوں وسطی موسموں میں سے وہ موسم جو جنوبی ہوا کے بعد آتا ہے چونکہ اس میں طوفان اور ناگہانی جھکولے اکثر آتے رہتے ہیں اس لئے ایسا خطرناک ہوجاتا ہے کہ اور کوئی موسم ایسا نہیں ہوتا اور یہ جنوبی ہوا اپنے عین موسم میں بھی شمالی ہوا کی نسبت زیادہ تند اور غیر مساوی ہوتی ہے مجھے اس موقعہ پر یہ بات بھی بیان کردینی چاہیئے کہ جنوبی ہوا کے موسم کے خاتمے اور برسات کے موسم میں گو سمندر میں کامل سکون کی حالت ہو مگر کناروں پر پچاس ساٹھ میل کے فاصلہ تک ہوا نہایت طوفانی ہوتی ہے۔ پس فرنگستانی اور غیر فرنگستانی جہازوں کے کپتانوں اور ناخدایوں کو اس امر کی بڑی احتیاط رکھنی چاہیئے کہ ہندوستان کے کسی بندر مثلاً سورت یا مچھلی پٹن پر ٹھیک برسات کے ختم ہوتے ہی نہ جا نکلیں ورنہ ان کے جہازوں کو زمین سے ٹکرا جانے کا خطرہ پیش آ سکتا ہے۔ پس میں اپنے مختصر اور جزوی تجربہ کی رو سے کہہ سکتا ہوں۔ کہ ہندوستان میں موسموں کی ترتیب اس طرح پر ہے۔

کاش مجھکو ہر ایک نتیجے کے اصلی سبب کے معلوم کرلینے کی قدرت ہوتی ۔مگر پروردگار عالم کے تمام بھیدوں کا دریافت کرلینا انسان کی طاقت سے باہر ہے۔لیکن اس مسئلہ میں اپنی غور و فکر سے جو رائے میں نے قائم کی ہے اس کی بنیاد چند خیالات پر ہے۔ چنانچہ خیال اول تو یہ ہے کہ جو ہوا ہمارے کرہ کو گھیرے ہوئے ہے سمندر اور دریاؤں کے پانی کی طرح اس کو بھی ہمارے کرہ کا ایک جزو سمجھنا چاہیئے کیونکہ یہ دونوں چیزیں اس کی طرف جھکتی اور ایک ہی مرکز کی طرف میل کرتی ہیں۔

جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ چیزیں ہمارے کرہ سے علیحدہ نہیں ہیں اور پھر اس سے یہ مطلب حاصل ہوتا ہے کہ یہ کرہ ہوا، پانی اور مٹی تین چیزوں سے بنا ہوا ہے! اس کے بعد دوسرا خیال یہ ہے کہ ہمارا یہ کرہ ایک ایسے خلا میں معلق ہے کہ جس میں خالق نے اپنی مرضی سے اس کو کچھ اس طرح آویزاں کردیا ہے کہ اگر یہ کسی اور نامعلوم جسم سے ٹکرا جائے تو اپنی جگہ سے آسانی سرک سکتا ہے۔ پھر تیسرا خیال یہ ہے کہ جب آفتاب خط استوا سے گذر کر کسی قطب مثلاً قطب شمالی کی طرف حرکت کرتا اور اپنی شعاعیں اس طرف ڈالتا ہے اس کے اثر سے قطب شمالی کسی قدر جھکنے لگتا ہے اور قطب شمالی اسی قدر جھکتا جاتا ہے جس قدر کہ سورج اس کی طرف بڑھتا جاتا ہے۔اسی طرح

جس قدر کہ سورج خط استوا کی طرف واپس آتا ہے اُسی قدر قطب شمالی بتدریج اُبھرنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ آفتاب کی کرنوں کی طاقت سے وہی اثر قطب جنوبی کی طرف پیدا ہو جاتا ہے۔ اب اگر ان خیالات کو صحیح فرض کر لیا جائے اور اُس کے ساتھ زمین کی روزانہ حرکت پر غور کیا جائے تو ہندوستانیوں کا یہ قول بے وجہ نہیں ہے کہ سورج اپنے ساتھ سمندر اور ہوا کو کھینچتا اور چلاتا ہے۔ کیونکہ اگر یہ بات سچ ہے کہ آفتاب خط استوا سے گذر کر کسی قطب کی طرف جاتے ہوئے زمین کے محوّر کی تبدیل حرکت اور اُس قطب کے نیچے کو جُھک جانے کا باعث ہوتا ہے تو اس کا یہ لازمی نتیجہ ہونا چاہیئے کہ دوسرا قطب اونچا ہو جائے اور سمندر اور ہوا جو دو سیال اور وزن دار جسم ہیں نچلی جانب بہنے لگیں۔ پس میرے نزدیک اس بات کا کہنا درست ہے۔ کہ سورج کسی قطب کی طرف جا کر اُس طرف کے سمندر اور ہوا کے ایک باقاعدہ بہاؤ کا باعث بن جاتا ہے اور ہوا کے اس بہاؤ سے موسمی ہوا پیدا ہوتی ہے۔ یعنی سورج کے کسی قطب کی طرف جانے اور واپس آنے کے وقت سمندر اور ہوا میں دو مختلف قسم کی رفتار پیدا ہو جاتی ہے۔ میرے اپنے خیال میں اس قیاس کی بنا پر یہ بات کہی جا سکتی ہے۔ کہ قطب شمالی اور جنوبی سے سمندر کے دو بالکل ہی مختلف بہاؤ پیدا ہوتے ہیں۔ اور اگر ایک قطب سے دوسرے قطب تک ایک ایسا سمندر ہوتا جو زمگستان میں ہو کر گذرتا تو ہم وہاں بھی ہر حالت میں سمندر کی ایسی ہی دو قسم کی باقاعدہ لیکن مختلف رفتار پاتے جیسے کہ ہندوستان میں ہے۔ اور اس قاعدہ کے عام نہ ہونے کی یہ وجہ ہے کہ قطعات زمین کے حائل ہو جانے کے سبب سے سمندر کا بہاؤ رُک کر دوسری جانب کو ہو جاتا ہے جیسے کہ بعض لوگوں کا قول ہے کہ معمولی مدّوجزر اُن سمندروں میں جو بحیرہ شام کی طرح مشرق سے مغرب تک پھیلے ہوئے ہیں رُک جاتا ہے اور اس خیال کے اعتبار سے میری رائے میں یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ ہوا کی بھی دو قسم کی ایک دوسرے سے مختلف رفتار ہے۔ اور اگر ساری زمین صاف برابر اور ایک جیسی ہوتی تو مذکورہ بالا خیال کے موافق شمالی اور جنوبی ہواؤں کی رفتار بھی عموماً اسی قاعدہ پر ہوا کرتی۔

چوتھے سوال کا جواب ہر زمانے میں ملک مصر کو دنیا میں سب سے عمدہ اور زرخیز بیان کیا گیا ہے۔ بلکہ حال کے مورخ بھی یہی کہتے ہیں کہ کسی اور

ملک میں اس خصوصیت کے ساتھ قدرتی وسائل موجود نہیں ہیں۔

لیکن بنگالے میں دو مرتبہ جانے سے جو واقفیت مجھکو اس ملک کی نسبت حاصل ہوئی ہے اس سے مجھکو یقین ہے کہ جو فضیلت ملک مصر سے منسوب کی گئی ہے وہ زیادہ تر بنگالہ کا حق ہے۔

بنگالہ کی پیداوار بنگالے میں چاول اس کثرت سے پیدا ہوتا ہے کہ نہ صرف آس پاس کے ملک دور دور کے ملکوں کو جاتا ہے۔ چنانچہ گنگا کے راستہ پٹنہ کو اور سمندر کی راہ سے مچھلی پٹن وغیرہ بنادر ساحل کارومنڈل خصوصاً جزیرہ سراندیپ اور جزائر مالدیپ کو بھیجا جاتا ہے۔

نکاس کا ذکر اسی طرح کھانڈ وغیرہ بھی کثرت سے ہوتی ہے جو گول کنڈا اور تمام کرناٹک کو جہاں یہ بہت کم پیدا ہوتی ہے اور مکا اور بصرہ کو ہوکر عرب اور عراق کو اور بندرعباس کے راستہ سے ایران کو جاتی ہے۔

بنگالے کے مربے بھی مشہور ہیں خصوصاً ان مقامات کے جہاں پرتگیز لوگ آباد ہیں اور جو نہایت عمدہ مربے بناتے ہیں چنانچہ وہ میووں میں سے ویسے ہی بڑے بڑے مٹکوتروں کا جیسے کہ فرنگستان میں ہوتے ہیں اور ایک خاص قسم کی روئیدگی کی جڑ کا جو عشبہ کی جڑ کی مانند ہوتی ہے اور آم کا اور انناس کا جو ہندوستان کے دو عام میوے ہیں۔ اور آملہ اور نیبو اور ادرک کا مربہ بناتے ہیں۔ یہ مربے وہاں کی اہم اشیائے تجارت میں شامل ہیں۔

یہ سچ ہے کہ بنگالے میں مصر کی برابر گیہوں پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن یہ یہاں کے باشندوں کا قصور ہے جو مصر والوں کی نسبت چاولوں پر زیادہ گذران کرتے ہیں اور روٹی بہت کم کبھی کبھار کھاتے ہیں مگر پھر بھی ملک کی ضرورت کے لحاظ سے گیہوں کچھ کم نہیں بویا جاتا۔ چنانچہ فرنگستانی اہل جہاز مثلاً ڈچ انگریز اور پرتگیز وغیرہ سستے داموں گیہوں خریدتے اور سمندر کے سفر کے واسطے بسکٹ بناتے ہیں۔

بنگال کی ارزانی اس ملک کے لوگوں کی غذا زیادہ تر تین چار قسم کی ترکاری اور چاول اور گھی ہے جو بہت ہی تھوڑی سی قیمت سے حاصل ہو سکتی ہے اور ایک روپیہ میں بیس سے زیادہ عمدہ مرغ مل سکتے ہیں اور بطخیں اور مرغابیاں بھی اسی قدر ارزاں ہیں۔ بھیڑ بکریوں کی بھی افراط ہے اور سور تو اتنے سستے ہیں کہ جو پرتگیز یہاں

آباد ہیں وہ قریباً تمام سور ہی کا گوشت کھاتے ہیں۔ اور سستا جان کر انگریز اور ڈچ بھی اپنے جہازوں کے واسطے نمک لگا کر رکھ لیتے ہیں۔ اور ہر قسم کی تازہ اور نمک سود مچھلی بھی اسی افراط سے ملتی ہے۔

غرضکہ بنگالے میں معیشت کی ہر ایک چیز افراط سے ہے۔ اور اس افراط ہی کا طفیل ہے کہ بہت سے پرتگیز اور دوغلے یوروپین اور دوسرے عیسائیوں نے جن کو ڈچ لوگوں نے اُن کی مختلف نوآبادیوں میں سے نکال دیا ہے اس زرخیز ملک میں آکر پناہ لی ہے۔ چنانچہ فرقہ جیسوئٹ اور اگسٹین کے لوگوں نے جن کی بڑی بڑی مذہبی جماعتیں ہیں اور جو اپنے اعمال مذہبی کو آزادانہ اور بلا دقت عمل میں لا سکتے ہیں مجھے اس بات کا یقین دلایا کہ صرف ہگلی میں آٹھ ہزار سے نو ہزار تک عیسائی بستے ہیں اور اس ملک کے اور حصوں میں تو اُن کی تعداد پچیس ہزار سے بھی زیادہ ہے۔ اور اس ملک کی زرخیزی عورتوں کے حسن اور حلیم الطبعی نے پرتگیز۔ ڈچ اور انگریز لوگوں میں یہ بات زبان زد کردی ہے کہ "بنگالے میں داخل ہونے کے واسطے تو سو دروازے ہیں مگر نکلنے کے لئے ایک بھی نہیں"۔

بنگال کی روئی اور ریشم | تجارتی نقطۂ نظر سے اتنی عمدہ اور موزوں اشیاء کی وجہ سے جو غیر ملکی سوداگروں کی کشش کا باعث ہوتی ہیں۔ میرے خیال میں بنگالے کی برابری کوئی ملک نہیں کرسکتا۔ اور علاوہ اس قند و شکر کے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ اور جس کو قیمتی لائق تجارت اجناس کی فہرست میں درج کرنا چاہئے۔ اس ملک میں روئی اور ریشم بھی اس قدر ہوتا ہے کہ اس ملک کو نہ صرف ہندوستان بلکہ آس پاس کے ملکوں اور نیز یورپ کا گودام گھر کہنا زیبا ہے۔ میں بعض اوقات روئی کے ہر قسم کے باریک اور موٹے اور سفید اور رنگ دار کپڑوں کی افراط کو دیکھکر حیران ہوتا تھا۔ جن کو خصوصیت کے ساتھ ڈچ لوگ مختلف مقامات خصوصاً جاپان اور یورپ کو بھیجتے ہیں اور انگریز اور پرتگیز اور خاص۔ یہاں کے سوداگر بھی ان چیزوں کی بہت سی تجارت کرتے ہیں۔ اور یہی کیفیت ریشم اور ہر قسم کے ریشمی کپڑوں کی ہے۔ جس قدر روئی کا کپڑا تمام سلطنت مغلیہ میں لاہور اور کابل تک بلکہ عموماً تمام غیر ملکوں کو یہاں سے جاتا ہے اُس کی مقدار معلوم کرنا ناممکن ہے۔

حقیقت میں یہاں کا ریشم ایسا عمدہ نہیں ہوتا جیسے کہ ایران ۔شام۔ صیدا[1] ۔ اور بیروت کا لیکن سستا بہت ہے اور میں قطعی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ اگر عمدہ چھانٹ لیا جائے اور احتیاط سے صاف کیا جائے تو اس سے نہایت ہی عمدہ کپڑا بن سکتا ہے ۔

ڈچ لوگوں کے قاسم بازار کے ریشم کے کارخانہ میں بعض اوقات سات آٹھ سو آدمی کام کرتے ہیں ۔ اور اسی قدر انگریزوں اور دوسرے سوداگروں کے کارخانوں میں ۔

بنگالہ شورے کی بھی بڑی منڈی ہے اور گنگا کے راستے سے بہت سا شورہ پٹنہ سے لاد کر جاتا ہے اور ڈچ اور انگریز شورے کی بہت سی کھیپیں ہندوستان کے مختلف مقامات اور فرنگستان کو بھیجتے ہیں ۔

اس زرخیز ملک سے گوند ، افیون ۔ موم ۔ مشک ۔ بلائی ۔ گھیپل اور دوسری بہت سی دوائیں حاصل ہوتی ہیں اور گھی جو آپ کو ایک ناچیز جنس معلوم ہوگی یہاں اس افراط سے ہوتا ہے کہ اگرچہ غیر ملکوں کو اس کا بھیجنا خاصا وقت طلب ہے ۔ مگر پھر بھی سمندر کی راہ سے بے شمار باہر جاتا ہے ۔

بنگال کی ناموافق آب وہوا

لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ یہاں کی ہوا خصوصاً سمندر کے پاس کی اجنبی لوگوں کو شاذ ہی موافق ہوتی ہے ۔ چنانچہ ڈچ اور انگریزی لوگوں میں جب کہ پہلے پہل یہاں آکر رہے کثرت سے اموات ہوئیں اور بندرگاہ بالا سور میں میں نے دو خوبصورت انگریزی جہازوں کو جو ڈچ لوگوں کے ساتھ لڑائی ہونے کی وجہ سے یہاں سال بھر تک ٹھیرے رہے تھے اس حال میں پایا کہ بہت سے ملاحوں کے مر جانے کی وجہ سے اس قابل نہ تھے کہ کہیں جا سکیں ۔ لیکن اب یہ دونوں قومیں بہت احتیاط سے رہتی ہیں اور اموات بھی کم ہو گئی ہیں ۔ جہازوں کے مالک اس بات کی احتیاط رکھتے ہیں کہ اُن کے آدمی شراب کو پنچ[2] بنا کر نہ پئیں جو قندی شراب اور نیمو کے عرق اور پانی اور جائفل ملا کر بناتے تھے ۔ اور جس کا ذائقہ گو بہت اچھا تھا ۔ مگر نتائج مہلک تھے ۔ اور ہندوستانی عورتوں کے نزدیک نہ جائیں شراب اور تمباکو بیچنے والوں سے نہ ملیں ۔ لیکن عمدہ قسم کی انگوری شراب اور شیرازی خام شرابیں ، ان کو اگر اعتدال

---

[1] ملک فلسطین اور شام کی دو بندرگاہوں کا نام ہے (س م ح) ص سے دا ۔ ب سے رُوت

[2] شراب کے اس قسم کے مرکب کو جو بغرض تفریح تیار کیا جاتا ہے انگریزی میں پنچ کہتے ہیں ۔ س م ح

کے ساتھ استعمال کیا جائے تو مخالف آب و ہوا کے اثر سے بچنے کے لئے بہت مفید ثابت ہوتی ہیں۔

بنگالہ سے راج محل تک اس ملک کی خوش نمائی کو بیان کرتے ہوئے اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ اس ملک میں جو دریائے گنگا کے دونوں طرف راج محل سے سمندر تک قریب تین سو میل ہے بے شمار نہریں ہیں جو دریائے گنگا سے بڑی محنت کے ساتھ اس لئے کاٹی گئی ہیں کہ تجارتی مال کے لے جانے میں آسانی ہو اور گنگا کا پانی جس کو ہندوستانی تمام پانیوں سے بہتر سمجھتے ہیں۔ مختلف مقامات میں پہنچ سکے۔ ان نہروں کے دونوں طرف قصبے اور گاؤں آباد ہیں جن میں ہندوؤں کی بہت گنجان آبادی ہے اور چاول اور ایکھ اور غلہ اور بہت قسم کے ساگ پات اور سرسوں اور تل کے بڑے بڑے کھیت موجود ہیں اور ریشم کے کیڑوں کی غذا کے واسطے کوئی دو تین فرانسیسی فٹ کے برابر چھوٹے چھوٹے شہتوت کے درخت ہیں۔

لیکن بنگالے کو اُن بے شمار قطعوں نے جو بطور ٹاپوؤں کے دریائے گنگا میں ہیں اور جن کی وسعت بعض جگہ چھ سات منزل کی مسافت کی ہے عجیب خوبصورت بنا رکھا ہے۔ ان ٹاپوؤں کی وسعت کم و بیش ہے۔ لیکن سب نہایت زرخیز اور جنگلوں سے بھرے ہوئے اور میوہ دار درختوں اور اناس سے پُر اور سبزے سے بالکل ڈھکے ہوتے ہیں۔ ہزاروں نہریں اتنی دور تک کہ جہاں نظر کام نہیں کرتی ان میں جاری ہیں اور ایسی معلوم ہوتی کہ گویا لمبی لمبی روشیں درختوں کی محرابوں کے نیچے بنی ہوئی ہیں۔

خلیج بنگال کے جزیرے سمندر کے پاس کے بہت سے جزیروں کو جن پر اراکان کے قزاق لوٹ مار کرتے رہتے تھے اور جن کا ذکر اور کسی مقام پر کیا گیا ہے وہاں کے باشندوں نے چھوڑ دیا ہے اور اب وہ بالکل اُجاڑ پڑے ہیں جہاں بجز ہرنوں جنگلی سوروں پرندوں اور شیروں کے جو بعض اوقات ایک جزیرے سے پیر کر دوسرے جزیرے میں چلے جاتے ہیں اور کوئی جان دار مخلوق نظر نہیں آتی۔ چھوٹی کشتیوں میں بیٹھ کر دریائے گنگا کو عبور کرتے ہوئے ان جزیروں میں جانے کا معمولی طریقہ ہے) اکثر مقامات میں خشکی پر اُترپڑنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ اور اس بات کی احتیاط رکھنی چاہیے کہ رات میں کشتی کو کسی درخت سے باندھ دیا جائے تو وہ کنارے سے کچھ فاصلہ پر

کیونکہ ہمیشہ ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ کوئی نہ کوئی آدمی شیر کا شکار ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ خون خوار جانور جب لوگ سوئے پڑے ہوں کشتی میں آجاتے اور بقول اس ملک کے ملاحوں کے (بشرطیکہ یہ سچ ہو) کسی ایسے آدمی کو پہچان کر اٹھا لے جاتے ہیں جو سب سے موٹا تازہ ہو۔

ایک یادگار دریائی سفر

مجھے وہ نو دن کا دریائی سفر یاد ہے جو میں نے پیپلی سے ہگلی تک ان جزیروں اور نہروں میں سے کیا تھا جس کو میں بیان کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ اُس سفر میں کوئی دن ایسا نہیں گذرا جو کوئی نہ کوئی عجیب واقعہ پیش نہ آیا ہو۔ ان جزیروں اور نہروں کی طرف جاتے ہوئے جب ہماری سات ڈانڈ والی کشتی دریائے پیپلی سے نکل کر دس پندرہ میل سمندر میں بڑھ گئی تو ہم نے سمندر کو مچھلیوں سے جو ظاہرا بڑی کارپ کی قسم کی معلوم ہوتی تھیں۔

اور جن کے پیچھے تعاقب کے طور پر کثرت سے ڈالفن[1] مچھلیاں لگی چلی آتی تھیں بھرا ہوا دیکھا میں نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ کشتی کو ان کی طرف لے چلیں اور میں نے دیکھا کہ بہت سی مچھلیاں پہلو کے بل اس طرح پڑی ہوتی ہیں جیسے مُردہ اور بعض کچھ کچھ حرکت

[1] صاحب فرہنگ رشیدی نے اس کا تلفظ ڈلفین لکھا ہے اور اُس کی عادت جو بظاہر ایک افسانہ سے کم نہیں یہ لکھی ہے کہ ڈوبے ہوئے آدمی کو دریا سے نکال کر کنارے پر ڈال دیتی ہے چنانچہ اُس کی اسی عادت کے اعتبار سے شیخ ابراہیم ذوق نے بھی اپنی ایک مثنوی میں محبوب کے بازوں کی تعریف میں لکھا ہے۔ "مچھلی بازو کی ماہی دُلفین۔ غرقہ کش بحر خون سے مردم بین"۔ اور کتاب مخزن الادویہ میں اس کی نسبت یہ عبارت لکھی ہے کہ "اسم یونانی است و بعضے گفتہ اند بلغت رومی (یعنی لیٹن) اسم نوعی از سمک است کہ بعربی خنزیر البحر و بفارسی خوک ماہی و ماہی بینی دراز و بدیلمی گجہ ماہی و بہندی سوس نامند" (یونانی نام ہے اور بعض کہتے ہیں رومی لغت (لیٹن۔ لاطینی) میں ایک قسم کی مچھلی کا نام ہے جسے عربی میں "خنزیر البحر اور فارسی میں" خوک ماہی" اور ماہی بینی دراز" اور دیلمی میں "گجہ ماہی" ہندی میں "سوس" کہتے ہیں) اور انگریزی کتابوں میں یہ ہے کہ یہ لفظ لیٹن زبان کا ہے اور اُنھوں نے اس کو ایک قسم وھیل مچھلی کی لکھا ہے اور وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ جب طوفان آنے کو ہوتا ہے تو یہ مچھلی اُچھلنے کودنے لگتی ہے جس سے ملاح ہوشیار ہو جاتے ہیں اور اس باعث سے اس کو انسانوں کا دوست کہتے ہیں اور یہ بھی مشہور ہے کہ یہ قریب المرگ ہوتی ہے تو گرگٹ کی طرح اپنا رنگ بدلنے لگتی ہے۔ س۔م۔ح

کرتی تھیں اور بعض نزع کی حالت میں بیہوش پڑی لوٹتی تھیں چنانچہ ہم لوگوں نے چند ہیں مچھلیاں اپنے ہاتھوں سے پکڑ لیں اور دیکھا کہ ہر ایک کے منہ سے ایک پھکنا باہر نکلا ہوا ہے جیسا کہ کارپ مچھلی کے ہوتا ہے اور اُس میں ہوا بھری ہوئی ہے اور اس کا سرا سرمئی نما رنگ کا ہے۔ میں نے آسانی سے معلوم کر لیا کہ یہی پھکنا مچھلیوں کو ڈوبنے نہیں دیتا۔ مگر یہ بات بالکل میری سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ باہر کو کیوں لٹک رہا تھا۔ لیکن شاید یہ سبب ہو کہ ڈالفن مچھلیوں نے دیر تک ان کا پیچھا کیا ہوگا اور سانس کے سخت دباؤ سے یہ پھکنا باہر نکل پڑا۔ میں نے اس کا ذکر سیکڑوں جہازرانوں سے کیا مگر کسی نے یقین نہیں کیا۔ البتہ ایک ڈچ ملاح نے مجھ سے کہا کہ چین کے کنارے پر جب کہ میں ایک بڑی کشتی پر سفر کر رہا تھا تو میں نے بھی ایک ایسی ہی صورت دیکھی تھی اور کشتی سے باہر ہاتھ نکال کر بہت سی مچھلیوں کو پکڑ لیا تھا۔

قمری قوس قزح کا نظارہ اگلے دن ہم کچھ دیر کر کے ان جزیروں میں پہنچے اور ایک ایسی جگہ پسند کر کے جہاں شیر کا خوف نہ تھا خشکی پر اُتر پڑے اور آگ روشن کر لی اور میں نے اپنے نوکروں کو کھچڑی و مرغ اور کچھ مچھلیاں تیار کر لیں اور خوب مزے سے کھانا کھایا۔ اور یہ مچھلیاں فی الواقع لذیذ تھیں۔ میں نے پھر کوچ کیا اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ رات ہونے تک برابر چلے چلیں کیونکہ ان نہروں کے درمیان اندھیرے کے باعث راستہ بھول جانے کا خوف تھا۔ اور ایک محفوظ کھاڑی تلاش کر کے ہم بڑی نہر سے اُس میں چلے گئے اور کشتی کو کنارے سے معقول فاصلہ پر ایک درخت کے موٹے ٹہنے سے باندھ کر رات بسر کی۔ اور جب کہ میں نگہبانی کے لئے جاگ رہا تھا تو میں نے آسمان پر ایک عجیب شکل دیکھی۔ جیسے دو مرتبہ دہلی میں بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ یعنی ایک قمری قوس[۱] قزح دیکھی اور اپنے سب ساتھیوں کو جگا کر دکھایا جو دیکھکر بہت متعجب ہوئے۔

[۱] قمری قوس قزح کو بعض ہمارے اس زمانہ کے لوگوں نے بھی دیکھا ہے چنانچہ کتاب نامہ دانشوران میں (جس کو علما و فضلا کی ایک کمیٹی نے بحکم ناصرالدین شاہ بادشاہ حال ایران مشہور و معروف اہل علم کے تذکرے کے طور پر تالیف کیا ہے اور جو خوش قسمتی سے مطبع شاہی طہران کی چھپی ہوئی ہمارے کتب خانہ میں موجود ہے) ابن بُطلان طبیب کے تذکرے کے ذیل میں لکھا ہے کہ شاہزادہ علی قلی میرزا وزیر علوم (ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم ایران) نے اپنی ایک تالیف میں لکھا ہے کہ ۱۲۶۰ھ میں جب کہ ہم وہا

خصوصاً دو پرتگیز جو کشتیوں اور جہازوں کے معلم یعنی رہنما تھے اور جن کو میں نے اپنے ایک دوست کے کہنے سے اپنے ساتھ چڑھا لیا تھا۔ اُنھوں نے کہا کہ ہم نے ایسی قوس کبھی دیکھی نہ سُنی تیسرے دن ہم ان نہروں میں راستہ بھول گئے اور اگر ہم کو بعض پرتگیز جو ایک جزیرے میں نمک بنا رہے تھے نہ ملتے تو میں نہیں جانتا کہ ہم کو سیدھا راستہ کیونکر معلوم ہوتا۔ اس رات کو جب کہ ہماری کشتی ایک چھوٹی سی محفوظ کھاڑی میں لگی ہوئی تھی میرے پرتگیز رفیقوں نے جو شب گذشتہ کے عجیب مشاہدے کے خیال سے اپنی نظر میں ہر وقت آسمان کی طرف لگائے ہوئے تھے مجھکو نیند سے جگایا اور ویسی ہی قوس قزح پھر دکھائی جیسی کہ ہم نے کل رات دیکھی تھی۔ یہ آپ کو خیال نہ کرنا چاہیئے کہ میں غلطی سے چاند کے ہالہ کو قوس سمجھتا ہوں۔ نہیں میں ہالے کو خوب جانتا ہوں کیونکہ بمقام دہلی برسات میں ہر شخص جیسے اکثر چاند کے گرد ہالہ دیکھ سکتا ہے۔ لیکن ہالہ اُسی وقت نظر آتا ہے جب کہ چاند اُفق سے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ ء کے خوف سے بادشاہ کے ساتھ موضع الامہ میں ڈیرے ڈالے پڑے تھے ایک رات کو جو شب ماہ تھی اور خفیف سا ترشح ہو رہا تھا آدھی رات کے وقت جو میں ایک کام کے لئے اپنے خیمہ سے باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ چاند اُفق کے قریب ہے اور اس کے مقابل مشرق میں قوس پڑی ہوئی ہے چونکہ دیکھنا تو کیا چاند سے قوس کا پڑنا کبھی سنا بھی نہ تھا مجھکو نہایت حیرت ہوئی اور میں نے امیرزادہ محسن مرزا اور ملا علی محمد اصفہانی اور حکیم قاآنی اور شمس الشعرا سروش۔ اور جناب نصیر الدولہ میرزا عبد الوہاب خاں وزیر تجارت کو جو میرے ساتھ تھے جگا کر دکھایا اور وہ بھی متعجب ہوئے اور پھر میں نے اس کا ذکر جو اکثر اہل کمال سے کیا تو میں دیکھتا تھا کہ وہ بظاہر ہاں ہاں تو کرتے تھے مگر دل سے اس کا اُن کو یقین نہ تھا۔ اس کے بعد میں نے کتاب تاریخ الحکما میں قمری قوس کا ہونا پڑھا جس سے مجھکو نہایت تقویت ہوئی اور ہمیشہ میں اپنے قول کی صداقت کی خاطر اس کتاب کا حوالہ دیتا تھا۔ مگر چونکہ مجھکو ہمیشہ اس کی تحقیق کا خیال تھا پھر میں نے علم طبیعات کی کئی کتابوں میں دیکھا کہ حکمائے فرنگستان میں سے کئی شخصوں نے قمری قوس کو دیکھا ہے۔ چنانچہ کتاب فزیک کالو کا مصنف لکھتا ہے کہ سورج کی طرح چاند سے بھی قوس پڑتی ہے مگر قمری قوس کے رنگ بہت ہلکے ہوتے ہیں اور کتاب فزیک راکن میں جو چار جلدوں میں ہے لکھا ہے کہ قمری قوس کے رنگ بہ نسبت آفتاب کے چاند کی روشنی کے کم ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے کم متمیز ہوتے ہیں اور ایک اور کتاب میں لکھا ہے کہ کبھی کبھی چاند سے بھی قوس پڑتی ہے چنانچہ ۱۴ ستمبر ۱۸۱۶ء میں شہر شو ٹریس جو ملک فرانس کا ایک شہر ہے دیکھی گئی تھی ع - م - ح

بہت بلند ہوتا چنانچہ میں تین چار رات تک متواتر دیکھتا رہا ہوں اور بعض اوقات دوہرا ہالہ بھی دیکھا ہے مگر جس قوس کا میں ذکر کرتا ہوں وہ چاند کے گرد کوئی ہالہ نہ تھا بلکہ وہ چاند کے مقابل اسی طرح جیسے آفتاب کی قوس ہوتی ہے موجود تھی۔ چنانچہ جب کبھی میں نے قمری قوس کو دیکھا تو چاند کو مغرب میں پایا اور قوس کو مشرق میں۔ اور چاند قریباً پورا تھا۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو میرے نزدیک اس کی شعاع قوس پیدا کرنے کے قابل نہ ہوتی یہ قوس ہالے کی طرح سفید نہ تھی اور اچھی طرح نمایاں تھی بلکہ طرح طرح کے رنگ بھی اس میں نمودار تھے۔ اس لحاظ سے تو جناب میں متقدمین کی نسبت زیادہ خوش نصیب ہوں جنھوں نے ارسطو کے قول کے بموجب اس کے زمانے سے پہلے قمری قوس قزح کا ہونا بیان نہیں کیا۔

عجیب و غریب روشنیاں چوتھے روز کی شام کو معمول کے موافق ہم بڑی نہر میں سے ایک محفوظ جگہ چلے آتے اور وہاں ہم نے ایک غیر معمولی رات بسر کی۔ ہوا نام کو بھی نہ تھی! اور گرمی اور گھمس کا یہ عالم تھا کہ دم لینا مشکل تھا اور آس پاس کی جھاڑیوں میں جگنو اس کثرت سے چمکتے تھے گویا آگ لگی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور ہر لحظہ شعلوں کی طرح آگ نکل نکل کر ہمارے ملاحوں کو ڈراتی تھی جن کو یقین تھا کہ یہ سب جن بھوت ہیں۔ ان نورانی صورتوں میں سے دو صورتیں بہت عجیب و غریب تھیں یعنی ایک تو بڑا آتشیں گولا جو اس قدر عرصہ سے جو دعائے پیٹر ماسٹر[1] کے پڑھنے میں گذرتا ہے زیادہ دیر تک قائم رہا۔ دوسرا ایک چھوٹا سا آتشیں درخت جو پاؤ گھنٹے سے زیادہ عرصے تک رہا۔

سخت طوفان اور بارش پانچویں دن کی رات بڑے ہی خوف و خطر میں گذری! ایسی سخت ہوا آئی کہ گو ہم اپنے خیال کے موافق درختوں کے نیچے بڑی محفوظ جگہ میں تھے اور کشتی بھی احتیاط سے بندھی ہوتی تھی مگر لنگر کا رسا ٹوٹ گیا۔ اور اگر میں اور میرے وہ دونوں پرتگیز ساتھی دفعتاً اپنے پانو درختوں کے ٹہنوں میں ڈال کر ان کو دو گھنٹے ٹیک یعنی جب تک کہ وہ طوفانی ہوا برابر شدت سے چلتی رہی ہوئے دور سے نہ پکڑے رہتے تو بالضرور ہم بڑی نہر میں جا گرتے اور آخر کار وہیں مرجاتے۔ کیونکہ ہندوستانی ملاحوں سے جن پر بالکل خوف چھا رہا تھا کسی طرح کی امید نہ تھی۔ اس وقت ہماری حالت

---

[1] عیسائیوں کے رومن کیتھلک فرقہ کی ایک دعا کا نام ہے۔ س م ع

بڑی ہی دردناک تھی! مینہ اس شدت سے پڑ رہا تھا کہ کشتی میں گویا ڈول کے ڈول پانی کے گر رہے ہیں۔ اور بجلی کی چمک اور کڑک ہمارے سروں کے آس پاس اس قدر تیز تھی کہ ہم اس ہولناک رات کو اپنی جانوں سے مایوس ہو چکے تھے۔ گر ہمارا باقی سفر ایسی عمدگی سے گذرا کہ اُس سے زیادہ اور کیا ہوگا۔

نویں روز ہم ہگلی میں پہنچے اور اس خوش نما ملک کو دیکھ دیکھکر جس میں سے ہمارا گذر ہوا میری آنکھیں سیر نہیں ہوتی تھیں۔ گر میرا صندوق اور تمام پہننے کے کپڑے بھیگ گئے تھے۔ مرغیاں مرگئی تھیں۔ مچھلیاں تلف ہو چکی تھیں اور تمام بسکٹ مینہ سے گیلے ہوگئے تھے۔

پانچویں سوال کا جواب میں نہیں جانتا کہ میرا اس پانچویں سوال کا حل قابل اطمینان ہوگا یا نہیں۔ لیکن جو رائیں میں پیش کروں گا وہ مشاہدہ اور تحقیق پر مبنی ہیں کیونکہ میں نے دریائے نیل[1] کی طغیانی کو دو مرتبہ دیکھا ہے اور اپنی

[1] اس غرض سے کہ دریائے نیل کے منبع وغیرہ کی بابت مصنف کے بعد کے زمانے میں جو تحقیقاتیں عمل میں آئی ہیں اس مضمون کے ساتھ ناظرین اُن کو بھی پڑھ لیں ہم تاریخ مصر میں سے جس کو سنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ نے ڈاکٹر رولن صاحب کی تاریخ اقوام قدیم میں سے انتخاب کرکے باضافہ بعض مفید مضامین از حاشیوں کے ۱۸۶۷ء میں چھاپا تھا عبارات ذیل نقل کرتے ہیں۔ س۔ م۔ ع

دریائے نیل کی طغیانی

مصر میں دریائے نیل بھی ایک عجیب چیز ہے۔ اس ملک میں مینہ بہت ہی کم برستا ہے۔ گر اس دریا کی طغیانی سے تمام ملک سیراب ہو جاتا ہے۔ اور مینہ برسنے کی کمی سے جو نقصان ہوتا ہے اُس کا بدلہ یہ دریا دیدیتا ہے۔ کیونکہ اور ملکوں کی بارش کو بطور محصول کے جمع کرکے مصر میں پہنچا دیتا ہے۔ چنانچہ ایک شاعر نے مصر کے کھیتوں کے حق میں خوب کہا ہے۔ شعر عجیب طور کی تھیں مصر کی چراگاہیں کہ میں قحط میں بارش کی واں نہ تھی پروا۔ اس فیض رساں دریا سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کے لئے مصریوں نے زمینوں کے اندازہ پر اور مناسب مناسب موقعوں پر بے شمار نہریں مناسب عرض و طول کی بنائی تھیں اور اُن کے ذریعہ سے دریائے نیل اپنی نیاض دھاروں سے ہر جگہ گذر خیز کرتا تھا۔ نہروں کی راہ سے لوگ سفر کرتے تھے اور خشکی پر چلنے اور خشکی کے سفر کی مصیبت جاتے رہنے سے گویا اس دریا نے شہروں کو پاس پاس کر دیا تھا۔ اور دریائے قلزم کو بحیرہ روم سے ملا دیا تھا اور اس

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ ۔ سبب سے ملک کی اندرونی و بیرونی تجارت بہت رونق پر تھی اور دشمنوں سے بھی ملک محفوظ تھا ان سب باتوں کے سبب کہا جاتا ہے کہ حقیقت میں یہ دریا مصر کا مربی اور اُس کا بہت بڑا محافظ ہے ۔ مصر والے کھیتوں میں دریا کے پانی کو جانے سے نہ روکتے تھے مگر شہروں میں جو بڑی محنت سے بنے تھے اور چوطرف پانی بھر جانے سے جزیروں کی طرح دکھائی دیتے تھے ۔ پانی نہیں جا سکتا تھا وہاں کے رہنے والے اُن میدانوں کو جو دریائے نیل کے پانی سے بھر جاتے تھے اپنے اپنے مکانوں پر چڑھکر نہایت خوشی سے دیکھتے تھے ۔

دریائے نیل کے مخرج

متقدمین خیال کرتے تھے کہ دریائے نیل کا مخرج اُن پہاڑوں میں ہے جو کوہ قمر کے نام سے مشہور ہیں اور جو خط استوا سے دس درجہ عرض جنوبی میں واقع ہیں ۔ تقویم البلدان میں بو علی سینا کا یہ قول لکھا ہے کہ دریائے نیل تمام دنیا کے دریاؤں سے بڑا اور لمبا ہے ۔ مگر یہ پُرانے زمانہ کی بات ہے یورپ کے سیاحوں اور جغرافیہ دانوں نے جو نئی نئی تحقیقاتیں کی ہیں اُن سے معلوم ہوگیا ہے کہ دنیا میں بہت سے دریا دریائے نیل سے بڑے اور لمبے ہیں ۔ سب سے بڑا دریا دنیا میں امریکہ کے ملک میں امیزن ہے اور دریائے نیل کی لانبائی سے دو گنے سے بھی زیادہ لمبا ہے ۔ دریائے نیل کا مخرج اگلے زمانہ میں اچھی طرح تحقیق نہیں ہوا تھا عربی جغرافیہ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ خط استوا کے جنوب کی طرف بالکل ویرانہ ہے اور اس سبب سے وہاں کا حال دریافت نہیں ہو سکتا اور جو کچھ یونانیوں نے لکھا ہے اُس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں ہوا ۔ رولن صاحب لکھتے ہیں کہ ہمارے زمانہ کے سیاحوں نے یہ تحقیق کیا ہے کہ خط استوا سے بارہ درجے عرض شمالی میں اس کا منبع ہے اور اس سبب سے متقدمین کی تحقیقات کی بہ نسبت اس دریا کی لمبائی کو قریب بارہ یا پندرہ سو میل کے کم بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دریائے نیل ایک بڑے پہاڑ کی جڑ میں سے نکلتا ہے جس کا نام گویام ہے اور مملکت ابی سینا میں واقع ہے مگر زمانہ حال میں انگلستان کے شاہی جغرافیہ کی سوسائٹی نے اس دریا کے مخرج دریافت کرنے کو بہت سی کوششیں کیں اور کپتان اسپیک صاحب تین دفعہ اس کا مخرج دریافت کرنے کے لئے افریقہ میں گئے ۔ اخیر عفر اُن کا ۱۸۶۲ء میں تھا ۔ اُنھوں نے اپنے سفروں میں عین خط استوا کے نیچے ایک بہت بڑی جھیل پائی اور وکٹوریا منیزا اُس کا نام رکھا اُن کے نزدیک وہی جھیل درحقیقت دریائے نیل کا مخرج ہے جنوبی سرا اس جھیل کا قریب تیسرے درجہ عرض جنوبی پر واقع ہے ۔ جو گویا دریائے نیل کا سرا ہے ۔ اس حساب سے دریائے نیل چونتیس درجوں کی لمبائی یعنی دو ہزار تین سو میل کے

طول میں بہتا ہے اس جھیل کے جنوبی سرے سے مغرب کی طرف آؤ تو کیگرل نامی ایک دریا ملتا ہے جو اس جھیل میں پڑتا ہے مگر کپتان اسپیک صاحب کہتے ہیں کہ اس دریا سے اور دریائے نیل سے کچھ واسطہ نہیں ہے۔ اور اگر جھیل کے اُسی جنوبی سرے سے مشرق کی طرف جاؤ تو وہاں کوئی بڑا دریا نہیں ہے۔ کیونکہ عرب کے سیاحوں سے انھوں نے تحقیق کیا کہ لوگی ماندجارو کے مغرب کی طرف نمک کی جھیلیں اور نمک کے میدان ہیں اور پہاڑی ملک ہے پانی کی بہت قلت ہے۔ کبھی کبھی کوئی چھوٹی ندی بہ آتی ہے۔ اس جھیل کے شمالی کنارے سے دریائے نیل نکلتا ہے اس جھیل کے شمال مشرق میں اور جھیل ہے مگر کپتان اسپیک صاحب کا وہاں تک جانا نہیں ہوا مشہور ہے کہ وہاں ایک آبنائے ہے جو ان دونوں جھیلوں کو ملا دیتی ہے۔ اس پچھلی جھیل سے بھی ایک دریا نکلتا ہے جس کا نام آسو ہے اور تخمیناً سوا تین درجہ عرض شمالی تک بہکر دریائے نیل میں مل جاتا ہے۔ وکٹوریا نینزا جھیل کے شمالی کنارے میں سے تین دھاریں نکلتی ہیں اور تھوڑی دور بہکر سب آپس میں مل جاتی ہیں اور ایک دریا یعنی دریائے نیل ہو جاتا ہے۔ ان میں سے مشرقی دھارا اس طرح پر نکلی ہے کہ جھیل میں سے ایک حصہ پانی کا شمال کی طرف نکلا ہے۔ اسپیک صاحب نے اُس کا نام نپولین چینل فرانس کے پادشاہ کے نام پر رکھا ہے کیونکہ فرانسیسی جغرافیہ کی شاہی سوسائٹی نے اس کا حال تحقیق کرنے کے صلہ میں اُن کو سونے کا تمغہ دیا تھا۔ اس چینل سے ایک بہت بڑی چادر پانی کی نہایت زور شور سے جس کا عرض چار سو پانچ سو فٹ تک ہے گرتی ہے اور وہ بہکر دریا کی دھار بن جاتی ہے۔ کپتان اسپیک صاحب نے اس چادر کا نام رائپن رکھا ہے۔ کیونکہ وہ دریائے نیل کے مخرج کی تحقیقات کو روانہ ہوئے تو انگلستان کے جغرافیہ کی شاہی سوسائٹی کے پریذیڈنٹ رائپن صاحب تھے کپتان اسپیک صاحب کے نزدیک کی جغرافیائی تحقیق کے بارے میں جو کچھ ضروری امور تھے وہ پورے ہو چکے ہیں۔

مگر اکثر محققین کے نزدیک ابھی اور زیادہ تحقیقات کی ضرورت ہے۔

دریائے نیل کے آبشار

جن مقاموں میں کہ دریائے نیل سخت پتھروں میں ہو کر زور سے نیچے گرتا ہے اُن کو آبشار کہتے ہیں ملک مصر میں آنے سے پہلے یہ دریا اتھیوپیا کے جنگل میں آہستہ آہستہ بہکر آبشار کی طرح گرتا ہے۔ اور پھر وہاں سے دفعتاً نہایت تیزی اور زور شور سے بہتا ہے کہ اُس کی آواز نو میل پر سے سنائی دیتی ہے۔ اس ملک کے رہنے والے بھی کو اس دریا میں آنے جانے کی عادت ہو گئی ہے اُن لوگوں کو جو یہاں سیر کرنے کو آتے ہیں ایک عجیب تماشا دکھاتے ہیں جن میں بہ نسبت دل لگی کے خوف زیادہ معلوم ہوتا

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ ۔ ہے ! ایک چھوٹی سی ڈونگی میں دو آدمی بیٹھکر دریا میں جاتے ہیں اُن میں سے ایک تو ڈونگی کھیتا ہے ۔ اور دوسرا ڈونگی میں سے پانی اُلیچتا جاتا ہے ۔ بہت دیر تک وہ ڈونگی لہروں کی تیزی سے ٹکراتی ہے مگر وہ لوگ ہر طرح کا صدمہ اُٹھا کر اور ڈونگی کو ہوشیاری اور چالاکی سے اپنے قابو میں لاکر تیز دھار پر ے جاکر بہاؤ پر چھوڑ دیتے ہیں اور تیر کی طرح اُس میں سے نکل جاتے ہیں ۔خوف زدہ تماشا دیکھنے والے یہ گمان کرتے ہیں کہ جس بلندی سے اُن لوگوں نے اپنی ڈونگی کو چھوڑا ہے اُس کے نیچے جاکر وہ لوگ ڈوب گئے لیکن وہ لوگ جب اصلی دھار پر جا پڑتے ہیں تو بہت دور تک بہ جاتے ہیں اور جہاں پانی دھیما ہو جاتا ہے وہاں سے نکل آتے ہیں اس عجیب تماشے کا بیان سینکا صاحب نے کیا ہے اور حال کے زمانہ کے سیاح بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

دریائے نیل کی طغیانی کے اسباب

اگلے زمانہ کے لوگوں نے مثلاً ہیرو ڈوٹس اور ڈیوڈورس اور سیکولس اور سینکا نے دریائے نیل کی طغیانی کی وجوہ کے متعلق بڑی نکتہ آفرینی کی ہے ۔لیکن وہ پرانی باتیں اور صرف ناتحقیق خیالات تھے جو حال کے زمانہ میں کچھ زیادہ التفات کے لائق نہیں رہے ۔ اس زمانہ میں سب کا اتفاق ہے کہ اتھو پیا میں جہاں سے یہ دریا آتا ہے نہایت کثرت سے بارش ہونے کے سبب دریائے نیل میں اس قدر طغیانی ہوتی ہے کہ اول اتھو پیا کو اور اُس کے بعد مصر کو غرقاب کر دیتا ہے اور یہی دریا اس بارش کے سبب سمندر بن کر تمام ملک میں پھیل جاتا ہے ۔ مٹرے صاحب کہتے ہیں کہ متقدمین کا صرف یہ قیاس تھا کہ نیل کی طغیانی اتھو پیا میں کثرت سے بارش ہونے کے سبب سے ہوتی ہے۔ لیکن اس قیاس پر وہ اس کا اضافہ کرتے ہیں کہ بہت سے سیاحوں نے اُس کو اپنی آنکھ سے دیکھا ہے ۔ چنانچہ ٹولیمی فلیڈ لفس یعنی بطلیموس ثانی بادشاہ مصر نے جو علوم اور فنون کی تحقیقات میں نہایت شوق رکھتا تھا اس امر کی تحقیقات کے لئے نہایت قابل قابل شخصوں کو وہاں بھیجکر اس کی تحقیق کرائی تھی ۔

دریائے نیل کی طغیانی کے موسم

ہیروڈوٹس اور اسی طرح ڈایوڈورس اور سیکولس اور دوسرے بہت سے مصنف بیان کرتے ہیں کہ دریائے نیل گرمی کے موسم میں یعنی ماہ جون کے آخر میں بڑھنا شروع ہوتا ہے اور ستمبر کے آخر تک روز بروز بڑھتا جاتا ہے ۔ اور اکتوبر اور نومبر میں رفتہ رفتہ گھٹنا شروع ہوتا ہے یہاں تک کہ اپنے اصلی حال پر آ جاتا ہے ۔ اس زمانہ کے لوگ بھی اس بیان کی تصدیق کرتے ہیں اور حقیقت میں جو اصلی سبب اس دریا کی طغیانی کا ہے اُسی پر اُس کی بنیاد ہے اور وہ سبب وہی اتھوپیا کی بارش ہے جو لوگ وہاں

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ گئے ہیں وہ بیان کرتے ہیں کہ اپریل کے مہینے میں وہاں بارش شروع ہوتی ہے اور پانچ مہینے تک یعنی اگست کے نصف آخر یا ستمبر کے نصف اول تک برابر بارش رہتی ہے اس لئے مصر میں دریائے نیل کا چڑھاؤ ابی سینا میں بارش شروع ہونے سے تین ہفتے یا ایک مہینے بعد ہوتا ہے۔ سیاحوں کا قول ہے کہ دریائے نیل مئی کے مہینے سے بڑھنا شروع ہوتا ہے۔ مگر اول نہایت آہستہ آہستہ بڑھتا ہے اور اپنے کناروں سے باہر نہیں نکلتا اور جون کے ختم ہونے کے قریب تک بھی اس میں طغیانی نہیں ہوتی۔ ہیروڈوٹس صاحب کہتے ہیں کہ اس کے بعد جو تین مہینے آتے ہیں انھیں تین مہینوں میں اس دریا میں طغیانی ہوتی ہے۔ اگلے مصنفوں کی اصل کتابوں میں ایک اختلاف ہے جس کو میں بیان کرتا ہوں ہیروڈوٹس اور ڈایوڈورس ایک طرف ہیں اور سٹرابو اور پلے نی اور سولینس دوسری طرف ہیں۔ یہ تینوں دریائے نیل کی طغیانی کے زمانہ کو بہت کم گنتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ تین مہینے یا سو دن میں کنارے کے باہر کی زمینوں پر سے لوٹ جاتا ہے اور زیادہ تر تعجب یہ ہے کہ پلے نی صاحب اپنی رائے کی بنیاد ہیروڈوٹس کی گواہی پر قائم کرتے ہیں۔

دریائے نیل کی طغیانی کی بلندی

پلے نی صاحب بیان کرتے ہیں کہ طغیانی کے دنوں میں دریائے نیل ٹھیک ٹھیک چوبیس فٹ اونچا چڑھ جاتا ہے جب کہ اُس کا چڑھاؤ اٹھارہ یا ساڑھے اٹھارہ فٹ اونچا آتا ہے تو ملک میں قحط سالی ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اور جبکہ چوبیس فٹ اونچا چڑھاؤ آتا ہے تو غرقابی کا اندیشہ ہوتا ہے۔ شہنشاہ جولین نے ایک چٹھی موسومہ اکیڈیشیس مورخہ بیسویں ستمبر ۱۸۶۲ء میں دریائے نیل کی طغیانی کی بلندی بائیس فٹ لکھی ہے۔ دریائے نیل کے چڑھاؤ کی بلندی کے بارے میں متقدمین کے درمیان اور نیز زمانہ حال کے مورخوں میں اتفاق نہیں ہے۔ مگر بہت زیادہ تفاوت بھی نہیں ہے۔ اور اُس کے سبب یہ ہوں گے اوّل یہ کہ اگلے زمانہ کے اور زمانہ حال کے پیمانوں میں شاید کچھ تفاوت ہو جس کا دریافت کرنا مشکل ہے۔ دوسرے متقدمین مورخوں نے بے پروائی سے اپنے بیانوں کو لکھا ہو۔ تیسرے یہ کہ خود نیل کی طغیانی میں تفاوت ہوتا ہے کیونکہ وہ دریا جس قدر سمندر کے پاس آتا جاتا ہے اُس کے چڑھاؤ کی بلندی کم ہوتی جاتی ہے چونکہ مصر کے ملک کی زرخیزی دریائے نیل کی طغیانی پر منحصر تھی اس لئے مصریوں نے اُس کے چڑھاؤ کے تمام حالات کو اور اُس کے مختلف درجوں پر بخوبی غور کیا تھا اور ایک مدت تک باقاعدہ امتحانوں سے جو بہت سے برسوں میں ہوتے تھے خود دریائے نیل کے چڑھاؤ سے یہ بات معلوم ہونے لگی تھی کہ اس سال میں چڑھاؤ سے کیسی فصل پیدا ہوگی۔ مصر کے بادشاہوں نے شہر ممفس میں ایک پیمانہ لگایا تھا

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ ۔ اور اس پر دریائے نیل کے چڑھاؤ کے مختلف درجے لکھے تھے ۔ اور ان درجوں پر حساب کر کے تمام ملک مصر میں اطلاع دی جاتی تھی کہ اب کی فصل میں کیا نقصان آئے گا یا کیا فائدہ ہوگا ۔ سڑے بو صاحب کہتے ہیں کہ اسی مطلب کے لئے شہر سیٹین کے قریب دریائے نیل کے کنارے پر بھی ایک کنواں بنا ہوا ہے ۔ شہر قاہرہ میں ایک مسجد کے صحن میں ایک مینار ہے اور اس پر دریائے نیل کے چڑھاؤ کے درجوں کے نشان بنے ہوئے ہیں ۔ اور آج تک وہاں یہ رسم ہے کہ شہر کے ہر گلی کوچہ میں ہر روز منادی ہوتی ہے کہ دریائے نیل میں اس قدر چڑھاؤ پر منحصر ہے جس دن دریائے نیل کا چڑھاؤ ایک معین بلندی پر پہنچ جاتا ہے اس دن بہت خوشی ہوتی ہے اور عیش و عشرت کے جلسے ہوتے ہیں ۔ آتش بازی چھوٹتی ہے ۔ اور آپس میں دعوتیں ہوتی ہیں ۔ قدیم زمانہ میں بھی دریائے نیل کی طغیانی ہونے سے تمام مصر میں عام خوشی کی جاتی تھی ۔ اس لئے کہ اس ملک کی خوشی اور آسودگی کی بنیاد یہی دریا ہے ۔ اگلے زمانہ میں مصر کے لوگ جو بت پرست تھے دریا کی طغیانی کو اپنے دیوتا سراپس کا اثر سمجھتے تھے اور جس مینار پر اس کے چڑھاؤ کے درجوں کے نشان لگے ہوئے ہیں اس کو اس مندر میں مقدس سمجھکر رکھا تھا شہنشاہ قسطنطین نے اس مینار کو وہاں سے اٹھا کر اسکندریہ کے گرجا میں لے جانے کا حکم دیا ۔ اس پر مصریوں نے یہ مشہور کیا کہ سراپس دیوتا کی خفگی کے سبب دریائے نیل میں کبھی چڑھاؤ نہیں آنے کا ۔ دوسرے سال دریائے نیل میں معمول کے مطابق چڑھاؤ آیا شہنشاہ جولین مرتد نے جو بت پرستی کا مربی تھا اس مینار کو اسی مندر میں بھجوا دیا مگر شہنشاہ تھیوڈوشئیس نے پھر اس کو وہاں سے اٹھوا منگایا ۔

نیل کی نہریں اور پانی کھینچنے کی کلیں

اگرچہ خدا تعالیٰ نے مصر کے ملک کو ایسا فیض رساں دریا دیا تھا مگر اس پر بھی یہ نہیں چاہا کہ وہاں کے رہنے والے سست اور کاہل ہو جائیں اور بغیر محنت و مشقت کے ایسی بڑی نعمت کا فائدہ اٹھائیں یہ بات از خود معلوم ہو سکتی ہے کہ دریائے نیل تمام ملک کو سیراب نہیں کر سکتا تھا اس لئے بہت سی محنت و مشقت زمین کے پانی دینے میں کی جاتی تھی اور بہت سی نہریں ہر جگہ پانی پہنچانے کے لئے کاٹی گئی تھیں جو دیہات دریائے نیل کے کنارے کے پاس اونچی زمینوں پر تھے ۔ ان میں نہریں بنائی تھیں اور مناسب وقت پر بہت سے دیہات میں پانی پہنچانے کے لئے کھولی جاتی تھیں جو دیہات کو بہت دور دراز فاصلہ پر ملک کی سرحد پر تھے ان میں بھی پانی پہنچانے کے لئے نہریں بنی ہوئی تھیں ۔ اور اس طرح سے نہایت دور دور کے مقاموں میں بھی نہر سے پانی پہنچتا تھا جب تک کہ دریائے نیل ایک معین حد پر نہ چڑھ جاتا تھا ۔ اس وقت تک لوگوں کو پانی لینے اور نالیاں کاٹنے اور دہانوں کے کھولنے کی اجازت

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ ۔ نہ ہوتی تھی۔ کیونکہ اگر اس سے پہلے پانی ملنا شروع ہو جاتا تو بعض زمینوں کو بہت سا پہنچ جاتا اور بعض کھیتوں کو کم پہنچنے کا احتمال ہوتا۔ سو جب اُن قاعدوں کے جو ایک کتاب میں لکھے ہوئے تھے اور جس میں سب طرح کے اندازے مقرر تھے پہلے اوپر کے حصہ ملک مصر میں اور پھر نیچے کے حصہ میں نہروں کا کھولنا شروع ہوتا تھا اس طرح پر پانی کی ایسی احتیاط سے تقسیم ہوتی تھی کہ تمام زمینوں کو بخوبی پہنچ جاتا تھا جن ضلعوں میں کہ دریائے نیل کا پانی از خود پھیلتا تھا وہ اس قدر کثرت سے ہیں اور ایسے نیچے ہیں اور اُن میں اس قدر نہریں بنی ہوئی ہیں کہ جس قدر پانی جون اور جولائی اور اگست میں مصر میں پھیلتا تھا یقین ہوتا ہے کہ اُس کا دسواں حصہ بھی سمندر تک نہیں جاتا تھا۔ مگر باوجود اس قدر نہروں کے بہت سی زمینیں ایسی بلند ہیں کہ نیل کی طغیانی کا پانی وہاں تک نہ پہنچتا تھا اس لئے پیچ دار کلوں سے اُن زمینوں میں پانی پہنچا دیتے تھے اُن کلوں کو بیل پھراتے تھے اور پانی نلوں میں جا کر اُن اونچی زمینوں میں پہنچتا تھا۔ ڈیوڈورس صاحب کہتے ہیں کہ جب آرکی میڈیز صاحب مصر کی سیاحت پر گئے تو انھوں نے لوگوں کے لئے یہ کل ایجاد کی تھی۔

دریائے نیل سے مصر کی زرخیزی

دنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں ہے جس کی زمین مصر کی زمین سے زیادہ زرخیز ہو اور یہ صرف دریائے نیل کا فیض ہے اور دریاؤں کا یہ دستور ہے کہ جب وہ اُترتے ہیں زمین کی مٹی کو جس سے نمی رہتی ہے بہالے جاتے ہیں اور ریت چھوڑ جاتے ہیں۔ مگر برخلاف اس کے دریائے نیل اپنی رو میں اوپر سے چکنوٹ مٹی بہا لاتا ہے۔ اور وہاں چھوڑ جاتا ہے اور زمینوں کو زرخیز کر دیتا ہے اور اس سبب سے اگلی فصل ہونے سے زمین جس قدر کمزور ہو جاتی ہے پھر اُتنی ہی زور آور ہو جاتی ہے۔ کاشت کار کو ملک میں ہل چلانے اور زمین توڑنے کی حاجت نہیں پڑتی۔ جب دریائے نیل ہٹ جاتا ہے تو بجز اس کے کہ زمین کے اوپر جو چکنوٹ مٹی رہ گئی ہے اس کو الٹ پلٹ کر نیچے کی ریتلی مٹی سے ملا کر اس کے مزاج کو معتدل اور اُس کی قوت کو کمزور کیا جائے اور کچھ کام کرنا نہیں پڑتا۔ اس کے بعد نہایت آرام سے اس میں بیج ڈال دیا جاتا ہے اور اس سبب سے کھیتی کرنے میں کچھ خرچ کرنا نہیں پڑتا۔ دو مہینے میں سب زمینیں پھل پھول کر سرسبز ہو جاتی ہیں اور کھیتیاں لہلہانے لگتی ہیں اور اُن میں کثرت سے اناج پیدا ہوتا ہے۔ مصر والے اکثر نومبر اور اکتوبر میں جب کہ دریائے نیل کا پانی کم ہونے لگتا ہے کھیتی بوتے ہیں اور مارچ و اپریل میں فصل تیار ہو جاتی ہے۔ مصر کی زمینیں فصلی اور چوفصلی ہیں۔ یعنی ایک زمین میں ہر سال تین یا چار قسم کی مختلف چیزیں بوئی جاتی ہیں۔ پہلی دفعہ کھیرا ککڑی بو کر کاٹ لیتے ہیں اس کے بعد اناج بوتے ہیں اور جب اناج کی

تمام غور و فکر اس مضمون پر صرف کی ہے اور ہندوستان میں بھی بعض ایسی معلومات حاصل ہوئی ہیں جن سے اس امر کی تحقیق میں مجھے کچھ آسانی ملی ہے اور میں یقین کرتا ہوں کہ ایسی آسانی یقیناً اس مشہور و معروف شخص[1] کو حاصل نہ ہوئی ہوگی جس نے بغیر اس کے کہ ملک مصر میں سیاحت کی ہو صرف اپنی ذہانت اور سیر کتب اور مطالعہ کی ذریعے اس دلچسپ مسئلہ میں ایک عمدہ اور عالمانہ مضمون تحریر کیا ہے۔

دریائے نیل کے متعلق تحقیقات

میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ جب اتھوپیا کے دو سفیر دہلی میں آئے تھے تو میرے آقا دانشمند خاں جن کو

بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ ۔ فصل تیار ہو کر کٹ لیتی ہے تو مختلف قسموں کی ترکاریاں جو خاص کر مصر میں ہوتی ہیں بوتے ہیں۔ چونکہ مصر میں آفتاب بہت تیزی سے نکلتا ہے اور دھوپ کی تپش بہت ہوتی ہے اور مینہ بہت کم برستا ہے اگر اس ملک میں نہریں اور چشمے بکثرت نہ ہوتے جن سے نالیاں بنا کر کھیتوں اور باغوں میں بخوبی پانی دیا جاتا ہے تو قیاس کہتا ہے کہ وہاں کی زمینیں جلد خشک ہو جاتیں اور ایسی شدۃ گرمی سے اناج اور ترکاریاں جل جاتیں ۔ دریائے نیل سے مویشی کی پرورش میں بھی جو مصر کی دولت کا دوسرا ذریعہ ہے کچھ کم مدد نہیں ملتی ۔ مصر والے اپنے مویشی نومبر کے مہینے میں چرنے کے لئے باہر نکال دیتے ہیں اور مارچ تک چراتے ہیں ۔ لفظوں میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ اُن چراگاہوں کی زرخیزی کا بیان ادا ہو سکے ۔ مویشیوں کے ریوڑ کے ریوڑ جو بسبب معتدل اور خوش آئند ہوا کے دن رات باہر رہتے ہیں تھوڑی ہی مدت میں بہت تازہ اور فربہ ہو جاتے ہیں جن دنوں میں کہ نیل کی طغیانی ہوتی ہے اُن دنوں میں مویشی کو کٹی اور گھاس اور جو اور مٹر کھلا کر پرورش کرتے ہیں ۔

مسٹر کاربنل لی بروئن اپنی سیاحی کے حال میں لکھتے ہیں کہ مصر کے ملک پر خدا کی بہت بڑی عنایت ہے کہ ایک معین موسم میں اتھیوپیا میں اس قدر مینہ برستا ہے کہ مصر کو پانی دے کر نہال کر دیتا ہے جہاں بالکل بارش نہیں ہوتی ۔ اور اس اپنی عنایت سے ایسی خشک اور ریتلی زمین کو دنیا کا ایک عمدہ زرخیز ملک بنا دیتا ہے ۔ ایک اور بات بھی نہایت عمدہ ہے جس کو یہاں کے رہنے والے بیان کرتے ہیں کہ جون میں اور اس کے اگلے چار مہینے شمالی اور مشرقی ہوائیں چلتی رہتی ہیں تاکہ دریائے نیل کا پانی رُکا رہے اور جلدی سے بہ کر سمندر میں نہ چلا جائے اگلے لوگوں نے بھی اس قدرتی حکمت کے نکتہ کو بخوبی محسوس کر لیا تھا ۔

[1] مسٹر تھیوی نٹ سے مراد ہے ۔ س م ح

معلومات حاصل کرنے کا ہمیشہ شوق رہتا ہے اُن کو اکثر دعوت کی تقریب سے اپنے ہاں بلاتے تھے اور میں بھی ہمیشہ شریک مجلس ہوتا تھا۔ اور اس سے نواب صاحب کی اصل غرض یہ ہوتی تھی کہ اُن کے ملک کی حالت اور حکومت کی وضع سے واقفیت حاصل کریں۔

اتھوپیا کے سفیروں کا بیان چنانچہ علاوہ اور باتوں کے ہم نے اُن سے دریائے نیل کے منبع کی نسبت جس کو وہ آبا بائیل کہتے ہیں بہت گفتگو کی اُنھوں نے کہا کہ اس کے منبع کا حال تو ہر کسی کو خوب معلوم ہے اور اُس کی نسبت کسی کو کچھ شک نہیں ہے۔ بلکہ ان سفیروں میں سے ایک نے ایک مغل کے ہمراہ جو انھیں کے ساتھ ہندوستان واپس آیا تھا اُس کو دیکھا بھی تھا اُنھوں نے کہا کہ دریائے نیل کا منبع اگوس[1] کے ملک میں ہے اور وہ دو بڑے جوشندہ چشمے ہیں جو ایک دوسرے کے قریب ہی زمین سے نکل کر اوّل تو کوئی تیس یا چالیس قدم لمبی ایک چھوٹی سی جھیل بن جاتی ہے اور پھر اس میں سے

دریائے نیل کی گذرگاہ نکل کر یہ دریا بہت پھیل جاتا ہے اور اس کے بعد راستہ میں اور بہت سے ندی نالے مل جاتے ہیں اور ایک دریائے زخار بن جاتا ہے۔ اُنھوں نے یہ بھی کہا کہ یہ ایسے طور پر پیچ کھا کھا کر گیا ہے کہ جس سے زمین کا ایک وسیع حصہ جزیرہ نما کی صورت بن گیا ہے اور پھر بہت اونچی اونچی چٹانوں پر سے اُتر کر ایک بڑی جھیل میں جو مملکت ڈیمبیا[2] میں اس کے منبع سے صرف چار پانچ منزل اور گونڈار دارالحکومت اتھوپیا سے تین ہلکی منزلوں کے فاصلہ پر ہے جا گرتا ہے۔ اور اس جھیل میں گرتے ہی آگے کو بڑھتا ہے اور ممالک فنجی[3] یعنی بربرستان[4] جو شاہ اتھوپیا کے باج گذار ہیں اُن کے خاص شہر سینار[5] میں سے گذرتا ہوا آبشاروں کی صورت میں ہو کر ملک مصر کے میدانوں میں آنکلتا ہے۔

دریائے نیل کا منبع جب یہ سفیر دریائے نیل کا منبع اور اُس کی کیفیت بیان کر چکے تو میں نے اُس ملک کا موقع دریافت کرنا چاہا جہاں اس دریا کا یہ منبع ہے پس میں نے پوچھا کہ ڈیمبیا باب المندب سے کس طرف کو اور افریقہ کے کون سے حصہ

---

[1] راگوس اگ ڈس

[2] ڈی م ب ی آ گ دن ڈار [3] ف ن ج ی

[4] بربرستان [5] س ی ن آ ر

میں واقع ہے۔ لیکن اُنھوں نے بجز اس کے اور کچھ جواب نہ دیا کہ وہ مغرب کی طرف ہے۔ مجھکو یہ تقریر سُن کر حیرت ہوئی خصوصًا ایک مسلمان سفیر سے جس کو کسی عیسائی کی نسبت مقامات کے نسبتی فاصلوں سے زیادہ سے زیادہ واقف ہونا چاہیے تھا۔ کیونکہ مسلمانوں پر یہ فرض ہے کہ اپنی پنجگانہ نماز پڑھتے وقت شہر مکہ کی طرف رُخ کریں۔ مگر بہر حال اُس مسلمان سفیر نے یہ امر باصرار بیان کیا کہ ڈیمبیا باب المندب کے مغرب میں ہے۔ پس ان سفیروں کے قول کے بموجب دریائے نیل کا منبع خط استوا کے شمال میں ہے۔ نہ کہ جنوب میں جہاں بطلیموسؔ نے قرار دیا ہے۔ اور ہمارے نقشوں میں جنوب ہی میں درج ہے۔

---

[1] بطلیموس۔ اس شخص کا نام انگریزی مورخ کلاڈیس ٹولیمی اور مسلمان مصنف بطلیموس ابن قلوذیس لکھتے ہیں یہ اصل میں یونانی تھا اور اسکندریہ میں آبسا تھا۔ لکھا ہے کہ جب اُس نے ذرا ہوش سنبھالا تو مشہور حکیم جالینوس کی شاگردی اختیار کی اور جب علوم حکمیہ میں اچھی دستگاہ ہو گئی تو ریاضیات کی طرف اس کو زیادہ توجہ ہوئی چنانچہ جب یہ آدریانوس کے عہد میں جو آذریان قیصر روم کی طرف سے ملک مصر کا حاکم تھا اور جو اس کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ اپنے وطن سے اسکندریہ میں آیا تو رات دن ریاضیات ہی کا اس کو شغل تھا۔ یہاں اس نے ستاروں اور افلاک کی گردش وغیرہ دریافت کرنے کے لئے رصدخانہ بنایا۔ اور متقدمین علمائے اہل ہئیت خصوصًا ہپارکس (ابرخس) کے سیاروں اور ثوابت کی فہرستوں کی تصحیح کی اور ایسی جدولیں بنائیں جن سے سورج چاند وغیرہ کی گردش کا حساب لگ سکتا ہے اور یہ پہلا شخص ہے جس نے اصطرلاب وغیرہ آلات رسدی ایجاد کئے اور اگرچہ بعض مورخوں کی یہ رائے ہے کہ ہپارکس ان کا موجد ہے۔ لیکن اعمال ریاضی اور آلات رصد جن سے اس زمانہ میں بھی کام لیا جاتا ہے۔ اُن کی تصحیح اور توضیح تو فی الواقع اسی نے کی تھی۔ چنانچہ اُس نے اپنی مشہور کتاب مجسطی کے تیسرے مقالہ کی آٹھویں نوع میں خود لکھا ہے (اس کتاب کے برابر اس فن میں آج تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی) چنانچہ نامور مسلمان علمائے ہئیت فضل بن یحییٰ تبریزی و محمد بن جابر و ابوریحان خوارزمی جنھوں نے اس کتاب پر حاشیے اور شرحیں لکھی ہیں جس قدر اُنھوں نے اس کتاب کے مسائل کی تحقیق و تدقیق کی اسی قدر بطلیموس کی فضیلت کا اعتراف کیا۔ اس کتاب کے تیرہ مقالوں کا ترجمہ اول چند یونانی علمائے خلیفہ ہارون رشید عباسی کے وزیر یحییٰ بن خالد برمکی کے حکم سے جو سنہ ۱۷۰ھ مطابق سنہ ۷۸۶ء سے سنہ ۱۸۷ھ مطابق سنہ ۸۰۲ء تک وزیر رہا تھا یونانی سے عربی زبان میں کیا تھا لیکن وہ اس کو پسند نہ آیا اور اس نے ابو حیان اور ایک اور عالم کو اس کے دوبارہ

نیل کی طغیانی کا راز

ہم نے ان صاحبوں سے یہ بھی دریافت کیا کہ اتھوپیا میں بارش کب ہوتی ہے اور یہ کہ ہندوستان کی طرح مقررہ موسم میں ہوتی ہے یا اور طرح انھوں نے جواب دیا کہ بحر احمر کے ساحل پر سواکن اور آرکیکو اور جزیرہ مصوع سے لے کر باب المندب تک اس سے زیادہ بارش نہیں ہوتی جیسی کہ مخا میں ہوتی ہے جو اس سمندر کے دوسرے کنارے پر ملک یمن میں ہے مگر اس ملک کے اندر کی طرف سلطنت ڈیمبیا کے صوبہ اگوتس میں اور آس پاس کے صوبوں میں گرمی کے اُن دو مہینوں میں بہت بارش ہوتی ہے جن میں کہ ہندوستان میں بھی ہوتی ہے اور میرے قیاس کے بموجب یہ ٹھیک وہ وقت ہے جب کہ مصر میں دریائے نیل طغیانی پر آتا ہے۔ اُن سفیروں نے کہا کہ ہم کو خوب معلوم ہے کہ دریائے نیل کی طغیانی اور اس سے ملک مصر کی سیرابی کا باعث اتھوپیا کی بارشیں ہیں۔ اور ملک مصر کی زرخیزی کا باعث وہ چکنی مٹی ہے جس کو دریائے نیل بہا کر یہاں لا ڈالتا ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ انہیں حالات کی وجہ سے شاہان اتھوپیا کو ملک مصر سے خراج لینے کا استحقاق حاصل

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ ترجمہ کرنے کا حکم دیا جنھوں نے نہایت عمدگی سے اس کام کو انجام دیا اور حجاج بن مطر ثابت بن قرہ اور اسحاق نے اُس کے الفاظ کی اصلاح کی اور تر یب ۱۲۳۰ء کے بھی عربی ترجمہ سے یہ کتاب زبان لیٹنی میں ترجمہ ہوئی۔ بطلیموس نے اس فن میں ایک اور رسالہ بھی اپنے شاگرد سوری کے واسطے لکھا تھا جس کا ترجمہ ابراہیم بن صلت نے عربی میں کیا اور حنین بن اسحاق نے اُس کی اصلاح کی۔ غرض بطلیموس متقدمین ہیئت دانوں کا بادشاہ خیال کیا جاتا ہے جو اس علم کو کمل کر کے ہمارے لئے چھوڑ گیا۔ اس کے نظام مقررہ کو نظام بطلیموسی کہتے ہیں جس کا بڑا اصول یہ ہے کہ زمین مرکز عالم ہے اور تمام ستارے اور افلاک اس کے گرد حرکت کرتے ہیں بخلاف نظام مسلمہ حال کے جو نظام فیثاغورسی کہلاتا ہے جس میں آفتاب کو مرکز عالم قرار دیا گیا ہے اور بطلیموس نے مارنیس باشندہ شہر ٹائر کے اصولوں کی بنیاد پر فن جغرافیہ میں بھی ایک کتاب لکھی تھی جس کا کندی نے عربی میں ترجمہ کیا اور لیٹن میں بھی اُس کا ترجمہ ہوا۔ جو اب موجود ہے طول شرقی اور خط شمالی اسی نے قائم کئے اگرچہ اس کا یہ کام مکمل نہیں سمجھا جاتا مگر تاہم نئے جغرافیہ بنانے والوں کے لئے بڑا مفید ہے اور متن میں بطلیموس کی اسی کتاب کی طرف اشارہ ہے۔ یہ علم موسیقی کا بھی بڑا ماہر تھا اور اُس کی ایک نہایت عمدہ کتاب تین جلدوں میں اس فن میں بھی موجود ہے۔ اس کی وفات اٹھتر برس کی عمر میں ۱۶۹ء میں واقع ہوئی
(ماخوذ از تاریخ التواریخ و انسائیکلوپیڈیا برطانیکا) س۔م۔ح

تھا اور جب اُس ملک پر مسلمان مسلط ہو گئے اور وہاں کی عیسائی رعایا ظلم رسیدہ اور ذلیل ہو گئی تو شاہ اتھیوپیا نے چاہا تھا کہ دریا کا رخ بحر احمر کی طرف پھیر دیا جائے اور یہ ایسی تدبیر تھی کہ مصر کی زر خیزی بالکل مفقود ہو کر یہ ملک برباد ہو جاتا۔ لیکن یہ منصوبہ اگرچہ غیر ممکن نہ تھا مگر ایسا عظیم الشان تھا کہ مطلق عمل میں نہ آیا۔ ان تمام باتوں سے میں بمقام گنگا پہلے ہی واقف ہو چکا تھا۔ کیونکہ گونڈار کے رہنے والے دس بارہ سوداگروں سے جو بادشاہ اتھوپیا کی طرف سے ہر سال اس شہر میں اس غرض سے آتے تھے کہ ہندوستان کے آئے ہوئے جہازوں کے ساتھ لین دین کریں، مجھکو طرح طرح کی گفتگو کا موقع ملا تھا۔ اور جو معلومات مجھکو اُن سے حاصل ہوئی تھیں وہ بھی بہت مفید ہیں۔ کیونکہ اُن سے بھی دریائے نیل کی طغیانی کا باعث صرف وہ بارشیں ہی ثابت ہوتی ہیں جو اُس کے منبع کے قریب اور ملک مصر سے کچھ فاصلہ پر ہوتی ہیں۔ لیکن تاہم میں اپنے ذاتی مشاہدوں کو جو اس دریا کی طغیانی کے وقت مجھکو دو مختلف اوقات میں ہوئے تھے زیادہ معتبر سمجھتا ہوں اور ان سے آپ کو ظاہر ہو جائے گا کہ مصر کے عوام الناس کی جو رائیں اس بارے میں ہیں وہ غلط ہیں بلکہ ثابت ہو جائے گا کہ وہ محض بے معنی قصے کہانیاں اور ایسے لوگوں کی من گھڑت ہیں جو توہمات میں اس وجہ سے پھنسے ہوئے ہیں کہ وہ ایسے موسم میں یعنی جب گرمی شدت سے ہوتی ہے ایسے ملک میں کہ جہاں بارش کو کوئی جانتا بھی نہیں دریا کی طغیانی کو دیکھکر سخت متحیر ہو جاتے ہیں۔

مصریوں کے اوہام چنانچہ منجملہ اُن توہمات اور تخیلات کے مصری مراد اس جگہ خاص طور سے اُن کے مفصلہ ذیل غلط خیالات سے ہے یعنی ایک تو وہاں کے لوگوں کا یہ اعتقاد ہے کہ دریائے نیل کی طغیانی شروع ہونے کا ایک خاص دن مقرر ہے دوسرے یہ کہ ایک خاص قسم کی شبنم جس کو گوٹ[1] کہتے ہیں۔ طغیانی کے اول ہی دن پڑنی شروع ہوتی ہے اور اس کے شروع ہوتے ہی وبائے طاعون فوراً جاتی رہتی ہے۔ تیسرے یہ کہ جب گوٹ گرنے لگ جاتی ہے تو پھر اس مرض میں اگر کوئی شخص مبتلا بھی ہو تو ہلاک نہیں ہوتا۔ چوتھے یہ کہ اس دریا کی طغیانی کے اسباب ایسے مخفی اور پُر اسرار ہیں کہ جو کسی کو معلوم نہیں ہیں۔ مگر میرے مشاہدات کا خلاصہ یہ ہے اور مجھ پر یہ بخوبی منکشف ہو گیا ہے کہ یہ مشہور دریا بھی شامل اور دریاؤں کے صرف بارشوں کی کثرت سے طغیانی پر آتا ہے نہ یہ کہ اس کی طغیانی اس سبب سے

---

(۱) گ ۔ وٗ ۔ ٹ

وقوع میں آتی ہے کہ مصر کی زمین اپنی شوریت کی وجہ سے جوش کھا کر اس کی طغیانی کا باعث بن جاتی ہے چنانچہ ایک مرتبہ میں نے دیکھا کہ طغیانی کے اس تخیلہ دن سے قریب ایک مہینہ پہلے ہی یہ دریا ایک فرانسیسی فٹ سے زیادہ چڑھا ہوا اور نہایت گدلے پن کی حالت میں بہہ رہا تھا۔ اور میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ جب یہ دریا طغیانی پر آتا ہے تو قبل اس کے کہ اس کی نہروں کے دہانے کھولے جائیں۔ یہ پہلے تو چند روز تک ایک دو فٹ چڑھتا ہے۔ اور بعد ازاں تدریج اُترنا شروع ہوتا ہے اور پھر چڑھنے لگتا ہے اور ٹھیک اسی اندازے سے چڑھتا یا اُترتا ہے جس قدر کہ اس کے منبع کے قریب بارش کی قلت یا کثرت ہوتی ہے اور اس کی یہ حالت بعینہ ہمارے دریائے لوائر کی سی ہے جس کا چڑھاؤ اور اُتار اسی نسبت سے ہوتا ہے جس قدر کہ بارشیں اُن پہاڑوں پر ہوتی ہیں جہاں سے یہ نکلتا ہے۔

شبنم اور طاعون اُس دن سے قریب ایک مہینہ پہلے جب کہ گوٹ کا گرنا بیان کیا جاتا ہے ایک مرتبہ بیت المقدس سے واپس آتے ہوتے میں ڈمیٹا (یعنی دمیاط) سے شہر قاہرہ تک اس دریا کی بالائی جانب کو آیا تھا اور صبح کو ہمارے کپڑے شبنم کی وجہ سے جو رات بھر پڑی تھی تر ہو گئے تھے۔

گوٹ گرنے کے آٹھ دس روز بعد بمقام روسیٹا (یعنی رشید) مجھے اپنے والس کونسل (یعنی) نائب وکیل) مانسیور دی برمن صاحب کے ساتھ شب کو کھانا کھانے کا اتفاق ہوا تھا اور حاضرین طعام میں سے تین شخص اُسی رات کو طاعون کے مرض میں مبتلا ہوئے تھے۔ جن میں سے دونوں آٹھویں دن مر گئے اور تیسرا مریض بھی جو اتفاق سے خود دی برمن صاحب ہی تھے۔ شاید اس بیماری سے جاں بر نہ ہوتا اگر میں جرأت کر کے یعنی اُس شبنم کی تخیلہ تاثیر کے بھروسہ پر نہ رہ کر اُن کا پھوڑا نہ چیر ڈالتا اور دوا تجویز نہ کرتا۔

اس موقعہ پر خود مجھکو بھی یہ متعدی بیماری لگ گئی تھی اور اگر میں فوراً بزآف انٹی منی یعنی سرمہ کا جوہر استعمال نہ کرتا تو میں بھی مر جاتا۔ اور یہ بات ثابت ہو جاتی کہ گوٹ کے گر جانے کے بعد بھی آدمی وبا سے مرجاتے ہیں۔ اس تے للنے کی دوا نے جو میں نے بیماری کے آغاز ہی میں پی لی تھی عجیب اثر کیا اور میں تین چار دن سے زیادہ بیمار نہ رہا۔ ایک میرا بدوی نوکر جو اس بیماری میں میری خدمت کرتا تھا میری ڈھارس بندھانے

ملہ رُزّوس ے ٹ ا

کی خاطر وہ یخنی جو میرے پینے سے بچ جاتی تھی بے تامل پی جاتا تھا۔ اور چونکہ وہ ایک متوکل شخص تھا طاعون سے ڈرنے والوں کے خیال پر ہنستا تھا۔

میں اس بات سے انکار نہیں کرتا کہ گوٹ کے گرنے کے بعد اس بیماری میں عموماً ہلاکت کا کم خوف ہوتا ہے لیکن میری غرض یہ ہے کہ اس خوف کے کم ہونے کو گوٹ سے منسوب نہ کرنا چاہئے کیونکہ میری رائے میں بیماری کم ہوجانے کا سبب گرمی کی وہ شدت ہے جو اُن دنوں میں بہ نسبت پہلے کے زیادہ ہوجاتی ہے جس سے مسامات کھل کر وہ سب مضر اور وبائی رطوبتیں جو جسم میں رُکی رہتی ہیں خارج ہوجاتی ہیں۔

ریبز ملاحوں کا بیان علاوہ بریں میں نے بہت احتیاط سے اکثر ملاحوں سے بھی جن کو "ریبز"[1] کہتے ہیں اور جو دریائے نیل پر مصر کے میدانوں کی حد اخیر یعنی چٹانوں اور آبشاروں تک سفر کرآتے تھے دریافت کیا تو انھوں نے بھی مجھے یہی بتایا کہ جب یہ دریا مصر کے میدانوں اور اُس زمین پر جو شور اور پُرجوشی بیان کی جاتی ہے طغیانی پر آتا ہے تو آبشاروں اور پہاڑوں میں بھی بہت چڑھا ہوا ہوتا ہے اور ان آبشاروں کو غیر معمولی طور سے طغیانی پر لے آتا ہے حالانکہ اُن پہاڑوں کی زمین خاص ہرا شور نہیں ہے۔

سینار کے حبشیوں کا بیان میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ سینار کے حبشیوں سے بھی جو نوکری کے واسطے قاہرہ کو جاتے ہیں اور جن کا ملک دریائے نیل کے کنارے پر اُن کو ہستانی قطعات میں واقع ہے جو مصر کے جنوب کی طرف ہیں اور شاہ اتھوپیا کا باج گذار ہے۔ تحقیق کی تو انھوں نے بھی متفق اللفظ یہی بیان کیا کہ جس وقت دریائے نیل مصر کے میدانوں میں چڑھتا ہے تو یہ ہمارے ملک میں بھی چڑھتا اور زور پر آتا ہے۔ اور اس کا باعث وہ بارشیں ہیں کہ جو نہ صرف ہمارے پہاڑوں میں ہوتی ہیں بلکہ ہمارے ملک سے اوپر کی طرف اتھوپیا میں بھی ہوتی ہیں۔

دریائے گنگا کی طغیانی ہندوستان کی موسمی بارشوں اور دریائے نیل کے مصر میں ایک ہی وقت میں طغیانی پر آنے سے جو خیالات میرے دل میں گذرے اُن سے یہ مضمون بہت صاف ہو جاتا ہے۔ اور آپ خیال کر سکتے ہیں

[1] اس لفظ میں حرف اخیر یعنی ز جمع کی علامت ہے۔ س م ح ریئے ز

کہ دریائے سندھ اور گنگا اور اس ملک کے اور دریا گویا دریائے نیل ہیں اور ان کے آس پاس کی زمینیں گویا مصر کی زمینیں۔

نیل اور گنگا مصر اور بنگال یہ خیالات میرے دل میں اس وقت گذرے تھے جب کہ میں بنگالے میں تھا اور مندرجہ ذیل عبارت وہ عبارت ہے جو میں نے اُس وقت اس بحث کے متعلق لکھی تھی: خلیج بنگالہ میں دریائے گنگا کے دہانے پر وہ متعدد جزیرے جو زمانہ گذرنے پر آپس میں مل گئے۔ اور آخرکار براعظم سے ملحق ہو گئے ہیں مجھکو دریائے نیل کے دہانوں کی یاد دلاتے ہیں۔ جب میں مصر میں تھا تو صنایع قدرت کو دیکھکر مجھے خیال آتا تھا کہ ارسطو کا یہ قول۔ کہ ملک مصر دریائے نیل کی صنعت ہے۔ بنگالے پر بھی صادق آتا ہے جو دریائے گنگا کا بنایا ہوا ہے: ان دونوں دریاؤں میں صرف اتنا فرق ہے کہ دریائے گنگا نیل کی نسبت بہت بڑا ہے اور اسی وجہ سے نیل سے زیادہ مٹی اپنے ساتھ سمندر میں بہالے جاتا ہے جس کے سبب سے اس کے جزیرے نیل کے جزیروں کی نسبت بڑے ہیں۔ اور یہ فرق بھی ہے کہ دریائے نیل کے جزیرے درختوں سے خالی ہیں بخلاف گنگا کے جزیروں کے جو اُن چار مہینوں کی متواتر اور کثیر بارشوں کے سبب سے جو گرمی کے موسم میں ہوتی ہیں درختوں سے لدے ہوئے ہیں۔

مصر میں جو نہریں آب پاشی کی خاطر نیل سے کاٹی جاتی ہیں بنگالے میں موسمی بارشوں کی بدولت اُن کی حاجت نہیں ہے اگرچہ وہ بھی بآسانی تیار ہو سکتی ہیں کیونکہ دریائے گنگا اور دوسرے دریا گرمی کے موسم میں اُن بارشوں کے سبب سے جو اس موسم میں ہمیشہ ہوتی ہیں اُسی طرح چڑھتے ہیں جس طرح نیل چڑھتا ہے۔ دونوں ملکوں میں یہ تفاوت ہے کہ مصر میں سمندر کے کنارے کے سوا جہاں کبھی کبھی خفیف سی بارش ہو جاتی ہے خواہ کوئی موسم ہو بارش کو کوئی جانتا بھی نہیں اور صرف اتھوپیا میں دریائے نیل کے منبع کے قریب بارش ہوتی ہے بخلاف ہندوستان کے جہاں بارش اُن ملکوں میں ہمیشہ مقررہ موسم میں ہوتی ہے جن میں دریا بہتے ہیں۔

سندھ اور مصر مگر معلوم رہے کہ یہ حالت عام نہیں ہے۔ چنانچہ دریائے سندھ کے دہانے پر ملک سندھ میں جو خلیج فارس کی طرف واقع ہے

برسوں ایک بوند بھی نہیں پڑتی خواہ اس دریا میں کیسی ہی طغیانی کیوں نہ ہو اور یہ ملک اُس وقت مصر کی طرح صرف نہروں سے سیراب کیا جاتا ہے۔

تھیونٹ صاحب نے جو یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ جو جو تجربے اور مشاہدے مجھکو بحر قلزم اور سوئیز اور طور اور کوہ سینا اور جدّہ میں (جو مکہ سے آدھے دن کے راستہ پر ایک مقدس مقام سمجھا جاتا ہے) اور جزیرے کامیرن اور لوہیا میں ہوتے ہیں اُن کا مفصل حال آپ کے پاس لکھ بھیجوں اس لئے میرا ارادہ ہے کہ جب مجھے اپنی قلمی یادداشتوں کے کھولنے کی فرصت ملی اُن کی تمنا کو پورا کروں گا اور جو واقفیت مجھکو بمقام مخا ملک ایتھوپیا اور وہاں جانے کے لئے عمدہ راستہ کی نسبت حاصل ہوئی ہے اُس کو بھی لکھوں گا۔

خط

بنام مسٹر چیپلین از شیراز (ایران) ۱۰ جون ۱۶۶۸ء

ہندوؤں کے عقائد توہمات اور رسومات کے بیان میں

سورج گہن

فرانس والوں کے توہمات

صاحب من! سورج گہن کے دو واقعے میں نے ایسے دیکھے ہیں کہ جن کو میں کبھی نہیں بھولوں گا اپنے ہی ملک میں ۱۶۵۴ء میں دیکھا تھا اور دوسرا ۱۶۶۶ء میں بمقام دہلی۔ پہلا گہن مجھے اس سبب سے یاد ہے کہ اُس سے اہل فرانس کی طفلانہ زود اعتقادی اور اُن کے بے بنیاد خوف و

۱؎ کسی مصنف کی کوئی ایسی رائے جو کسی قوم یا فرقہ کے مذہبی خیالات کے مخالف ہو اُس قوم یا فرقہ کے لوگوں کو اکثر ناگوار ہوا کرتی ہے بخصوصاً جب کہ الفاظ بھی کسی قدر سخت ہوں۔ پس اس کتاب کی اس فصل کے ترجمہ کرتے میں اگرچہ مورخ کی رائے پر تو ہمارا اختیار نہ تھا کہ اس کو بدل دیا جاتا مگر ہاں بلا اندیشہ فوت مطلب جس جگہ ترجمہ میں کوئی ملائم لفظ اختیار کیا جاسکتا تھا۔ بپاس خاطر اپنے ہم وطنوں کے وہاں ایسا کیا گیا ہے بلکہ بعض لفظ چھوڑ بھی دیئے گئے ہیں اُمید کہ ناظرین وقت پسند ہماری اس فروگذاشت کو معاف فرمائیں گے۔ السید محمد حسین

ہراس کے عجیب عجیب تماشے دیکھنے میں آئے تھے۔ چنانچہ اُن کے یہ اعتقاد وہراس اس حد کو پہنچ گئے تھے کہ بعض لوگوں نے ٹوٹے ٹوٹکے کرکے بچ جانے کے لئے قسم قسم کی جڑی بوٹی اور دوائیں مول لیں اور بعض نے محفوظ مکانوں اور تہ خانوں میں نہایت احتیاط سے اپنے تئیں بند کر لیا تاکہ اُس منحوس وقت کے آفتاب کی شعاع اُن تک نہ پہنچے اور ہزاروں آدمی گرجاؤں میں دعا مانگنے گئے۔ بعض یہ سمجھتے تھے کہ اب کوئی ناگہانی آفت آنے والی ہے اور بعض کی یہ رائے تھی کہ قیامت کا دن یہی ہے اور یہ جہان آج ہی ملیامیٹ ہوجائے گا اور اگرچہ گے سینڈی[1] اور رابرول[2] وغیرہ اہل ہیئت اور حکما اور فرنگستان نے پہلے ہی بڑی تکرار کے ساتھ لکھ دیا تھا کہ اس گہن میں اگرچہ دھوپ بالکل نہ رہے گی مگر یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے اور جس طرح پر ہمیشہ ہوتے رہے ہیں یہ بھی بالکل بے خطر ہے نجومیوں اور رمالوں کے سے بیہودہ توہمات نہ کرنے چاہئیں مگر اس پر بھی ہمارے ہم وطنوں کو ایسے ایسے وسواس اور توہمات تھے کہ بس پناہ بخدا۔

دہلی میں سورج گہن کا نظارہ

جو گہن بمقام دہلی سنہ ۱۶۶۶ء میں ہوا وہ ہندوؤں کے توہمات اور عجیب و غریب حرکات کی وجہ سے مجھے یاد رہے گا جب گہن کا وقت آیا تو میں اپنی حویلی کی چھت پر، جو جمنا کے کنارے تھی اور جہاں سے

---

[1] گے سینڈی ملک فرانس کے نامی حکما میں گنا جاتا ہے۔ یہ سنہ ۱۵۹۵ء میں پیدا ہوا تھا اور سنہ ۱۶۵۵ء میں مرا۔ یہ ابتداء عمر ہی سے علوم ریاضی کی طرف مائل تھا۔ چنانچہ سولہ برس کے سن میں تحصیل علم سے فارغ ہوا اور اٹھارہ برس کی عمر میں بمقام ای علم الادیان اور فلسفہ کا پروفیسر مقرر ہوا۔ اسی زمانہ میں اس نے ارسطو کی تردید میں ایک کتاب لکھکر چھپوائی جس کے باعث یہ تمام فرنگستان میں مشہور ہو گیا۔ سنہ ۱۶۲۸ء میں یہ جب ملک ہالینڈ سے اپنے ملک میں واپس آیا تو علم ہیئت کی طرف زیادہ متوجہ ہوا اور سنہ ۱۶۳۱ء میں عطارد کے آفتاب کے سامنے سے گذرنے کی خبر دی جس کو انگریزی میں ٹرینزٹ اور عرب ہیئت داں لوگوں کی اصطلاح میں قِرآن یا مرور کہتے ہیں۔ (ماخوذ از کتاب روضۃ الحکما)۔ س۔م۔ح ٹ رَ نْ زِ ٹ

[2] رابرول ایک فرانسیس عالم تھا اور ریاضیات اور خصوص ہندسہ میں بہت بڑی دستگاہ رکھتا تھا مگر علما اور حکما کے طریق کے برخلاف بخل اور خود غرضی سے اُن مسائل کو جو اُس نے اپنے زور طبیعت سے نکالے تھے اور لوگوں کو کم بتاتا تھا (ماخوذ از انسائیکلو پیڈیا برطانیکا)۔ س۔م۔ح

دریا کے دونوں کنارے نظر آتے تھے جن میں تخمیناً ایک "لیگ" یعنی تین میل کا فاصلہ ہے جا کھڑا ہوا ہزاروں لاکھوں ہندو کمر کمر پانی میں سورج کی طرف ٹکٹکی باندھے کھڑے دیکھ رہے تھے تاکہ گہن کے شروع ہوتے ہی غوطہ لگائیں۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں اور لڑکے بالکل ننگے تھے۔ مرد صرف دھوتیاں باندھے ہوتے تھے۔ بیاہی ہوئی عورتیں اور چھ چھ سات سات برس کی لڑکیاں صرف ایک چادر یا ساڑی اوڑھے ہوئے تھیں۔ صاحب مقدور اشخاص اور بڑے بڑے آدمیوں یعنی راجاؤں متمول اور صاحب امتیاز لوگوں نے جو دربارِ شاہی میں معزز ہیں۔ اور صرافوں، مہاجنوں، جوہریوں اور بیوپاریوں وغیرہ نے یہ بندوبست کیا تھا کہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ دریا کے اُس کنارے سے اس کنارے آکر پانی میں ڈیرے اور قناتیں کھڑی کرالیں اور اس طرح پردے میں اشنان وغیرہ کیا۔ ہندوؤں کے اس مجمع نے جوں ہی گہن لگتے دیکھا ایک عجیب و غریب نعرہ مارا اور چند بار متواتر غوطے لگائے۔ پھر پانی میں کھڑے ہوئے اور اپنے ہاتھ اور آنکھیں سورج کی طرف اٹھائے ہوئے بڑے حضورِ قلب سے عبادت اور پوجا کرتے دکھائی دیئے۔ اور چند بار دونوں ہاتھوں میں پانی لے کر سورج کو چڑھایا اور بہت ادب سے سر جھکا کر کبھی دائیں کبھی بائیں پانی دیتے تھے۔ اور گہن کے ختم ہونے تک یہ بیچارے غلطی میں پڑے ہوئے لوگ ایسی ہی حرکتیں کرتے رہے اور جب جانے لگے تو جمنا میں دور سے روپے اور دوتیاں چونیاں وغیرہ پھینکیں اور برہمنوں کو جو بھلا ایسی تقریب پر وہاں آنے سے کیوں چوکنے لگے تھے بہت کچھ پن دان دیا۔ میں نے دیکھا کہ ہر ایک شخص نے پانی سے نکلنے پر نئی پوشاک جو دریا کے کنارے ریت پر رکھی ہوئی تھی پہنی۔ بلکہ بہت سے لوگوں نے جو زیادہ دھرم آتما تھے اپنی پُرانی پوشاکیں برہمنوں کو پُن کر دیں۔

اس طرح سے میں نے اس عظیم الشان سورج گہن کی پوجا کا تماشا اپنے مکان کی چھت پر سے دیکھا۔ اور جیسا کہ یہاں ہوا ویسا ہی دریائے سندھ گنگا اور ہندوستان کے اور دریاؤں بلکہ عام تالابوں پر بھی ہوا۔ کہتے ہیں کہ تھانیسر[1] میں قریب ڈیڑھ لاکھ

[1] ہندوستان کی تاریخ میں یہ واقعہ بھی قابل یاد رکھنے کے ہے کہ ۱۵۶۷ء مطابق ۹۷۴ھ میں جو شہنشاہ اکبر لاہور سے دہلی کی طرف آتا ہوا تھانیسر میں ٹھہرا تو اتفاق سے وہاں سورج گہن کے نہان کا میلہ تھا۔ پس کسی بات پر تکرار ہوئی اور سنیاسیوں اور جوگیوں میں جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا اور دونوں بادشاہ

آدمیوں کے ہندوستان کے ہر ایک حصہ سے اشنان کے واسطے آن کر جمع ہوتے تھے۔ کیونکہ اُس ندی کا پانی جو وہاں بہتی ہے گہن کے دن اور دریاؤں اور ندیوں کی نسبت زیادہ متبرک اور پاک سمجھا جاتا ہے۔

ہندوؤں کی رسومات اور سلاطین مغلیہ

سلاطین مغلیہ اگرچہ مسلمان ہیں لیکن ان پرانی رسموں کے آزاد طور پر بجا لانے کو یا تو اُس خیال سے منع نہیں کرتے کہ ہندوؤں کے مذہبی معاملات میں دست اندازی کرنا چاہتے ہی نہیں ! یا دست اندازی کی جرأت نہیں رکھتے۔ مگر ہاں اتنی بات بے شک ہے کہ تھانیسر کے میلہ سے پہلے چند برہمن اپنی قوم (ہندوؤں) کی طرف سے بطور وکیل حاضر ہوکر ایک لاکھ روپیہ پیش کش کرکے پوجا وغیرہ کی اجازت حاصل کرتے ہیں اور اس کے عوض کچھ خلعت اور ایک کم قیمت ضعیف ہاتھی اُن کو عطا ہوتا ہے۔[1]

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ ۔ کے پاس فریادی آئے اور درخواست کی کہ ہم کو تلوار سے لڑکر آپس میں فیصلہ کر لینے کی اجازت ملے۔ بادشاہ نے اول تو بہت سمجھایا مگر جب اُنھوں نے نہ مانا تو یہ عجیب فیصلہ کیا کہ لڑنے کی اجازت دیدی اور حکم دیا کہ سنیاسیوں کے جو جوگیوں سے تعداد میں کم یعنی قریب تین سو کے تھے اور جوگی پانچ سو۔ ہمارے سپاہی شامل ہوکر جوگیوں سے لڑیں۔ پس پادشاہی سپاہی بھی بھبوت مل کر سنیاسیوں کے ساتھ میدان میں آکودے اور بادشاہ کی آنکھوں کے سامنے خوب لڑائی ہوئی اور حضرت شہنشاہ بڑے لطف سے بیٹھے تماشا دیکھا کئے۔ آخرکار جوگیوں کا ناس کرکے سنیاسی غالب آئے اور اس کے بعد بادشاہ نے انتظام کر دیا کہ یہ کچھ اور زیادہ فساد نہ کرنے پائیں۔ یہ روایت بدایونی کی ہے۔ مگر ابوالفضل نے لکھا ہے کہ پُری اور گری جو دونوں سنیاسیوں ہی کے فرقے ہیں اُن میں اس بات پر جھگڑا ہوگیا تھا کہ میلے میں تیرتھ کے کنارے پریوں کے بیٹھنے کی جو جگہ تھی اور جہاں خوب چڑھاوا چڑھتا تھا وہ گریوں نے چھین لی تھی ۔ س۔م۔ح

[1] ہندو راجہ اور بڑے بڑے امیر سورج گہن کے موقع پر اکثر ہاتھی کا دان ایک قسم کے برہمنوں کو جو معمولی برہمنوں سے ذات میں کم سمجھے جاتے ہیں اور جن کو ہمارے ملک اور روہیلکھنڈ میں ڈکوت یا مہابرہمن یا گجراتی یا اچارج کہتے ہیں دیا کرتے ہیں پس غالب ہے کہ بادشاہ کی طرف سے یہ ہاتھی اور پوشاک برہمنوں کو بطور دان دیا جاتا ہوگا۔ اور یہ بات کچھ تعجب کی نہیں ہے کیونکہ سلاطین مغلیہ نے ہندوؤں کی تالیف قلوب کے لیے اُن کی بعض رسمیں اختیار کر لی تھیں جو اکبر کے عہد سے لے کر اس سلسلہ کے اختتام

گہن کے موقعہ پر پوجا پاٹھ

اب میں اس گہن کی پوجا کی وجہ اور منشا اور یہ کہ یہ رسمیں کیوں جاری ہیں بیان کرتا ہوں۔ ہندو کہتے ہیں کہ ہمارے چار بید (یعنی دکتب آسمانی) جو خدا نے ہم کو برہما کی وساطت سے دیئے ہیں یہ بتلاتے ہیں کہ ایک دیوتا جس نے راچھس کا اوتار لیا ہے اور جو نہایت مفسد اور شریر اور نہایت کالا کلوٹا اور ازبس نجس اور میلا کچیلا ہے سورج کو پکڑ کر بُری طرح میلا اور کالا کر دیتا ہے۔ سورج بھی اگرچہ ایک دیوتا ہے مگر چونکہ نہایت رحم دل اور نیک نہاد ہے اس شریر کالی بلا کے پنجہ میں پھنس کر سخت تکلیف اور ایذا پاتا ہے۔ پس ہر ایک شخص کو یہ لازم اور واجب ہے کہ سورج بھگوان کو اس حالت سے نجات اور رہائی دلانے میں کوشش کرے اور اس کی صرف یہی سبیل ہے کہ اشنان اور پوجا پاٹھ اور پن دان کیا جائے۔ کیونکہ یہ دھرم کرم گہن کی حالت میں نہایت ہی مہاتم اور گنُ رکھتے ہیں اور جو پن دان اُس وقت کیا جائے وہ بہ نسبت معمولی پن دان کے سوگنا پھلتا ہے۔ پس ہندو لوگ یہ کہتے ہیں کہ بھلا کون ایسا شخص ہوگا کہ جس کام میں سوگنا فائدہ ہو اُس کو نہ کرے۔

صاحب من۔ یہی وہ دونوں سورج گہن ہیں کہ جن کی نسبت میں نے آپ سے کہا تھا کہ ان کو ہرگز نہ بھولوں گا۔

جگن ناتھ کی رتھ جاترا

سورج گہن کی رسموں وغیرہ کے ذکر سے مجھکو طبعًا اور خواہی نخواہی یہ تحریک ہوتی ہے کہ کچھ اور حال بھی ان لوگوں کی بعض وحشیانہ رسموں کا آپ کو سناؤں جن کے متعلق جیسا مناسب جانیں نتیجہ نکال لیں۔

جاتریوں کا ہجوم

خلیج بنگالہ میں جگن ناتھ نامی ایک شہر ہے اور وہاں ایک مشہور مندر ہے جس میں جگن ناتھ کی مورت نصب کی ہوئی ہے۔ اور اگر میری یاد میں غلطی نہ ہو وہاں ہر سال ایک میلہ ہوتا ہے جو آٹھ نو روز تک رہتا ہے اور

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ تک سب بادشاہ اُن کو کہلاتے تھے مثلاً تل دان یعنی سال شمسی اور قمری کے حساب سے جب بادشاہ کی عمر کا کوئی سال شروع ہوتا تو بادشاہ کو سونے اور چاندی کے ساتھ تولا جاتا تھا اور وہ سب سونا اور چاندی مستحقین کو بطور خیرات دیا جاتا تھا اور اس موقعہ پر ایک بڑا جشن کیا جاتا تھا۔ س۔م۔ح۔

اس موقعہ پر لوگوں کا بڑا بھاری مجمع ہوتا ہے۔ جیسا کہ اگلے زمانہ میں ہمّن[1] کے مندر پر ہوتا تھا یا ہمارے وقت میں مکہ میں ہوتا ہے اور کہتے ہیں کہ قریب دو لاکھ کے جاتری جمع ہو جاتے ہیں۔

جگن ناتھ کی رتھ اور مورت

لکڑی کا ایک نہایت عجیب و غریب رتھ بنا ہوا ہے۔ (جس کا نقشہ ہندوستان کے بعض مقامات میں میں نے

[1] ہمّن انگریزی جوپی ٹر کا ایک دوسرا نام ہے جو قدیم بُت پرست یونانیوں اور رومیوں کا سب سے بڑا دیوتا تھا۔ یہ مندر جس کا ذکر متن میں ہے لیبیا کے (افریقہ کا ایک قدیم نام ہے) اُس ضلع میں تھا۔ جس کا ہمارے زمانہ میں شہر برقہ دار الحکومت ہے۔ جہاں یہ مندر بنا ہوا تھا اُس سے کسی قدر فاصلہ پر اب سِیْوَہ نامی ایک گاؤں آباد ہے جو برقہ اور قاہرہ کے مابین قاہرہ سے مغرب کی طرف تخمیناً تین سو بیس میل کے فاصلہ پر ہے۔ رومیوں کی سلطنت کے زمانہ میں یہ بے حد و شمار جواہرات اور سونے چاندی سے بھرا ہوا تھا۔ لیکن اُن کی سلطنت کے زوال کے بعد اُن لوگوں نے جو ونڈل کے نام سے مشہور تھے اُس کو لوٹ کر برباد کر دیا۔ جس ضلع میں یہ مندر بنا ہوا تھا اُس کے چاروں طرف کی زمین بالکل بیابان تھی جس میں نہ گھاس تھی اور نہ پانی۔ مگر اس مندر کے آس پاس کی زمین نہایت سرسبز اور شاداب تھی۔ اور اُس بیابان میں صرف وہی ایک قطعہ تھا جہاں اوس پڑتی تھی مشہور رومی مورخ ہیروڈوٹس کہتا ہے کہ اس مندر کے نزدیک ایسا چشمہ تھا جس کا پانی صبح کو گرم اور دوپہر سے ذرا پہلے ٹھنڈا اور ٹھیک دوپہر کو نہایت سرد ہوتا تھا جس کی خنکی دن کے گھٹنے کے ساتھ گھٹتی جاتی تھی یہاں تک کہ شام ہوتے تک گرم ہو کر رفتہ رفتہ آدھی رات کو کھولنے لگتا تھا سنہ ۱۶۹۲ء میں بُروِنی نامی ایک سیاح نے اس مندر کا مقام دریافت کیا اور سنہ ۱۷۹۸ء میں ہوارنی میں نامی ایک دوسرے سیاح نے اس چشمہ کو معلوم کیا۔ اور ان کے بعد سنہ ۱۸۱۶ء میں ایک اور سیاح نے جس کا نام بلزونی تھا۔ اس مقام کو دیکھا وہ لکھتا ہے کہ یہ چشمہ کھجوروں کے خوشنما جنگل کے درمیان واقع ہے اور چونکہ اُس کے پاس تھرمامیٹر نہ تھا۔ اس لئے اُس نے اس کے پانی کی نسبت قیاساً یہ لکھا ہے کہ اس کی گرمی صبح کو (اسّی) دوپہر کو (چالیس) شام کو (ساٹھ) اور آدھی رات کو (سو) درجے ہو جاتی ہے۔
(ماخوذ از جام جم و انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا)

دیکھا بھی ہے، جس پر بے شمار مورتیں بنی ہوئی ہیں جن میں سے کسی کے تو اُن جنوں کی تصویروں کی طرح جو ہمارے ملک میں ہوتی ہیں۔ دو سر ہیں یعنی آدھا جسم انسان کا ہے اور آدھا حیوان کا اور کسی مورتی کا نہایت مہیب بندر اور دیو وغیرہ کی طرح ایک سر ہے۔ یہ رتھ پندرہ سولہ پہیوں کا ہے اور پچاس ساٹھ آدمیوں کے زور چلتا ہے اور اُس کے بین وسط میں جگن ناتھ کی مورت کو نہایت مکلف اور زرق برق پوشاک پہنا کر رکھتے اور عظمت و شان کے ساتھ ایک مندر سے دوسرے مندر کو لے جاتے ہیں۔

جگن ناتھ کے درشن پہلے روز جس وقت اس مورت کے درشن کرائے جاتے ہیں۔ اس قدر اژدحام ہوتا ہے کہ بہت سے جاتری جو کالے کوسوں چل کر نہایت ضعف اور کمزوری کی حالت میں یہاں پہنچتے ہیں لوگوں کے دھکم دھکا سے کچل جاتے ہیں اور اُن کے اردگرد کے لوگ یہ تعریف و توصیف کرتے ہیں کہ بڑے ہی خوش نصیب تھے۔ جو اتنی دور سے ایسی متبرک جگہ آن کر مرے۔

ناوالوں کی خوش عقیدگی یہ رتھ جس کے ساتھ ایک قیامت کا شور و غوغا ہوتا ہے جب اہتمام کے ساتھ چلتا ہے تو میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ یہ لوگ ایسے نادان خوش عقیدہ ہیں کہ اپنے تئیں اُس کے پہیوں کے نیچے ڈال دیتے ہیں۔ جو اُن کو بالکل کچل دیتے ہیں اور دیکھنے والے اس امر سے ذرا بھی تعجب اور نفرت نہیں کرتے۔ کیونکہ اُن کے خیال میں کوئی کرم (عمل) ایسا بہادرانہ اور اس سے زیادہ راحت بخش نہیں ہے۔ اور جان دینے والا یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ جگن ناتھ جی اُس کو بجائے اپنے بچّے کے سمجھیں گے اور اگلے جنم میں بہت آرام اور عزت اور عیش کی زندگانی بخشیں گے!

برہمن لوگوں کو ان توہمات اور ان بھاری غلطیوں کے ارتکاب کی اور بھی ترغیب دیتے رہتے ہیں جس کے وسیلے سے اُن کو دولت اور بڑائی حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ لوگوں کا اُن کے متعلق یہ اعتقاد ہے کہ یہ غیب کے بھیدوں سے واقف ہیں اور اس لئے اُن کی بہت تعظیم و تکریم کرتے ہیں اور وہ پُن دان لے کر مال دار ہو جاتے ہیں۔

جگن ناتھ کی دُلھن برہمنوں کی دغا اور فریب یہاں تک بڑھا ہوا ہے۔ کہ تاوقتیکہ میں نے قطعی دلیلوں سے بخوبی تحقیق نہ کر لیا مجھکو اس بات پر یقین نہ آتا تھا کہ یہ ایک خوبصورت لڑکی کو جگن ناتھ کی شادی کے واسطے انتخاب کرتے ہیں جو بڑی

دھوم دھام سے مورت کے ساتھ مندر کو جاتی اور تمام رات وہاں رہتی ہے اور یہ برہمن اُس کو یہ دم دیتے ہیں کہ خود جگن ناتھ جی رات کو تیرے ساتھ آکر رہیں گے اور تو دیوتا سے پوچھیو کہ اب کی دفعہ سال کیسا ہوگا اور آپ کی اس کرپا کے عوض کس قسم کی پوجا اور چڑھاوا اور رتھ کی روانگی کا جلوس آپ کو پسند ہوگا اور رات کے وقت ایک شہوت پرست برہمن ایک چھوٹی سی چور کھڑکی کی راہ سے مندر میں پہنچ جاتا اور اُس بیچاری کنواری لڑکی سے جو اُس کو جگن ناتھ سمجھے ہوتی ہے ہم بستر ہوتا ہے اور جس بات کی برہمنوں کو ضرورت ہو اُس کو یقین کرا جاتا ہے۔ اور جب صبح کو ویسی ہی دھوم دھام سے اس کو دوسرے مندر میں لے جاتے ہیں تو برہمن اُس سے کہتے ہیں کہ جو کچھ تم نے دیوتا کی زبان سے سُنا ہے وہ علانیہ لوگوں کو سُنا دو۔

بے حیائی کے مظاہرے اب ہم ایک اور بیوقوفی کا ذکر کرتے ہیں یعنی جگن ناتھ کے رتھ کے سامنے بلکہ خاص مندر میں بھی میلہ کے دنوں میں ناچ کے وقت کسبیاں اپنے بدن کی مختلف حرکات سے نہایت بے شرمی اور بے حیائی کا مظاہرہ کرتی ہیں[1] اور برہمن ان لغویات کو بالکل اپنے ملک کے مذہب کے مطابق خیال کرتے

[1] مصنف کی مراد اس عبارت سے وہ بیہودہ ناچ معلوم ہوتا ہے جو اب تک بھی بنگالہ میں مروج ہے اور نوجوان بنگالی اپنے عیش و عشرت کے بے تکلفانہ جلسوں میں رنڈیوں کو بالکل برہنہ نچا کر خوش ہوتے ہیں اور اس قسم کے ناچ کو اُن کی زبان میں کیمٹا کا ناچ کہتے ہیں بعض تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۰۳ء میں جب وہ صوبہ جہاں یہ مندر ہے سرکار انگریزی کے ہاتھ آیا تو اُس وقت تین سو ناچنے والی عورتیں مندر کی ملازم تھیں جو گورنمنٹ کے حکم سے موقوف کی گئیں اور مندر کی آمدنی خزانہ سرکار میں داخل ہوتی تھی اور اس کے وصولی کے لئے ایک عہدہ دار مقرر تھا مگر کچھ زمانہ بعد پادریوں نے جو مندر کے چڑھاوے کی آمدنی کا لینا اپنی عیسائی سرکار کے لئے حرام جانتے تھے۔ حکام سرکاری کے ساتھ جھگڑا کرکے خزانہ سرکار میں اس کی جمع بندی کو موقوف کرایا اور اس طرح یہ آمدنی خالص پجاریوں کا حق ہو گیا۔ م ح

اس کتاب کے انگریزی مترجم مسٹر ارونگ براک صاحب نے اس موقعہ پر ڈاکٹر کلاڈی اس بکانن صاحب کی کتاب یادداشت سے ایک حاشیہ لکھا ہے جس کو مناسبت مقام کے سبب سے ترجمہ کرکے اس جگہ نقل کیا جاتا ہے۔ تو ڈاکٹر کلاڈی اُس بکانن صاحب جنھوں نے ۱۸۰۶ء میں ملک اڑیسہ کے دورہ کے موقعہ پر مندر جگن ناتھ کی نسبت اپنی کتاب یادداشت میں بعض حالات تحریر کئے ہیں، یوں

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ لکھتے ہیں کہ آج بتاریخ تیئسویں مئی سنہ ۱۸۶۰ء ہم بمقام کہدیک مقیم ہیں اور اگرچہ جگنن ناتھ اب بھی ہم سے پچاس میل سے زیادہ فاصلہ پر ہے۔ لیکن ہم کئی دن سے برابر انسانوں کے ڈھانچے شاہراہ پر پڑے ہوئے دیکھتے آتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب ہم جگنن ناتھ سے قریب ہوتے جارہے ہیں۔ اس مقام پر قریب دوہزار کے جاتری ہم کو آملے ہیں جو ہندوستان کے اضلاع شمالی کے مختلف مقامات سے آتے ہیں۔ چنانچہ بعض اُن میں سے یوں کہتے ہیں کہ ہم کو اپنا گھر چھوڑے دو مہینے ہوئے اور باوجودیکہ آج کل موسم سخت گرمی کا ہے مگر اس پر بھی یہ لوگ صرف تنہا نہیں بلکہ مع عیال و اطفال آتے ہیں یہ جاتری لوگ بہت سے راستہ ہی میں مرجاتے ہیں اور اُن کی لاشوں یا ہڈیوں کو کوئی دفن تک نہیں کرتا اور اسی طرح شاہراہ پر پڑی رہتی ہیں چنانچہ اس منزل پر جہاں ہم مقیم ہیں ندی کے کنارے جو جاتریوں کے اُترنے کے لئے ایک سرائے بنی ہوئی ہے کوئی قریب سو کھوپڑیوں کے ہم نے پڑی دیکھیں آج ہم کو ایک ایسا خوش اعتقاد جاتری ملا جو ہر قدم پر پوری ڈنڈوت کرتا اور گویا اپنے جسم سے جگن ناتھ کا راستہ ناپتا جاتا تھا اور اپنی دانست میں دیوتا کے خوش کرنے کے واسطے اس طریق کو نہایت عمدہ سمجھکر بجالا رہا تھا۔ پھر وہ چودھویں جون سنہ ۱۸۶۰ء کو خاص جگنن ناتھ سے یوں لکھتے ہیں۔ کہ میں نے جگنن ناتھ کو دیکھا کوئی کتاب تاریخ اس دار الفنا اور وادی موت کا حال ٹھیک بیان نہیں کرسکتی۔ البتہ اس کے مشابہ وادیِ ہنّوم[۱] ہو تو ہو جیسا کہ مولک کی مورت پر شہر کنعان میں اگلے وقتوں میں انسان کی قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں۔ ویسا ہی اگر جگن ناتھ کی مورت کو اس زمانہ کا مولک کہا جائے تو کچھ ناواجب نہیں ہے۔ کیونکہ جگن ناتھ کے آگے اپنے تئیں بلی دان اور قربانی کرنے والے لوگ بھی نہ تو مولک کی قربانیوں سے تعداد ہی میں کم ہیں اور نہ اس بُری طرح جان کھونے ہی میں جگنن ناتھ کے ساتھ اُس کے بھائی اور بہن بلرام اور سوبھدرا کے نام سے دو اور مورتیں بھی ہیں اور تینوں کی پوجا ہوتی ہے اور تقریباً تینوں کی مانتا ایک ہی سی ہے۔ کیونکہ تینوں کے سنگھاسن بلندی میں تقریباً برابر ہیں۔ آج صبح کو میں مندر دیکھنے کے لئے گیا۔ نہایت وسیع اور عالی شان عمارت ہے۔ اور فی الواقع ایسے ہی ہولناک بادشاہ کی شان و منزلت کے لائق ہے اور جیسا کہ سب مندروں میں اس مندر کے دیوتا کے حالات خیالات اور معتقدات کی مناسبت سے اس شکل کی مورتیں وغیرہ بنا کر قائم کی جاتی ہیں ویسا ہی اس مندر میں اس ساری ناشائستگی اور عیوب کی بے شمار اور

---

[۱] ملک شام میں بیت المقدس کے قریب ایک جگہ کا نام ہے جہاں ایام سلف میں مولک نامی ایک بت استادہ تھا اور اُس پر اکثر لوگ اپنی اولاد کو قربانی کرتے تھے۔ س م ح

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ مختلف مورتیں موجود ہیں جو خاص اس کی پوجا کے طریق کا لب لباب ہیں چنانچہ مندر کی دیواروں اور دروازوں کے تختوں پر ایسی خلاف تہذیب شکل کی مورتیں ہیں جن کو دیکھ کر شرم آتی ہے بھاری بھاری اور پائدار پتھروں سے تراشی ہوئی کھڑی ہیں۔ میں سمندر کے کنارے کی ریتی کو بھی دیکھنے گیا تھا وہاں بھی بعض مقامات جاتریوں کی ہڈیوں سے بالکل سفید نظر آتے تھے۔ شہر کے نزدیک میں نے ایک اور جگہ جس کو انگریز گلگوتھا کہتے ہیں دیکھی جہاں جاتریوں کی لاشیں یوں ہی پھینک دی جاتی اور کتے اور گدھ وغیرہ وہاں ہمیشہ جمع رہتے ہیں۔

میں جیمس ہنٹر صاحب کے مکان میں جو سرکار آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے جگن ناتھ کے مندر کے منتظم اور جاتریوں سے سرکاری محصول کے وصول کے ذمہ دار ہیں اُترا ہوا ہوں جو سمندر کے کنارے مندر سے ایک میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہ صاحب شہر کے قریب اس واسطے نہیں رہتے کہ وہاں متعفن لاشوں کے باعث نہایت بدبو آتی ہے اور ان لوگوں کے گوناگوں توہمات کے مشاہدہ سے قطع نظر شہر میں اور بھی بہت سی ایسی نازیبا باتیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ جن سے آدمی کے حواس پراگندہ ہو جاتے ہیں۔ مثلاً فاقوں کے مارے ہوئے ہزاروں جاتری نیم مردہ اور بھوت کی سی ڈراؤنی صورت کے ساتھ شہر میں دیکھے جاتے ہیں۔ جن میں سے اکثر بھوک اور بیماریوں کے مارے شہر کے گلی کوچوں ہی میں مرجاتے ہیں یا یہ کہ اکثر وہ لوگ جو بڑے بھگت اور خوش عقیدہ ہوتے ہیں بالوں کے جوڑے باندھے اور بدن کو کئی طرح کے رنگوں سے پوتے ہوئے اور اپنی جان کو طرح طرح کے عذاب دیتے رہتے ہیں جس کو وہ عبادت سمجھتے ہیں۔ اس کے سوا عورتیں اور مرد بغیر کسی قسم کے ستر اور حجاب کے شہر کے قریب رہتے ہیں اور قضائے حاجت کے لئے برابر بیٹھے دکھائی دیتے ہیں جن کے فضلہ کو سانڈ جن کو یہ لوگ مقدس سمجھ کر چھوڑ رکھتے ہیں بے تکلف آکر چٹ کر جاتے ہیں۔

پھر صاحب موصوف اٹھارویں جون سنہ۱۸۰۶ء کو جگن ناتھ ہی سے یوں لکھتے ہیں کہ "میں ابھی ایک تماشا دیکھ کر جس کو عمر بھر نہ بھولوں گا اپنے مکان پر آیا ہوں۔ آج اس دیوتا کا ایک بڑا دن ہے۔ چنانچہ دوپہر کے وقت ہندو جگن ناتھ کی مورت کو مندر سے باہر لائے۔ اس وقت لاکھوں جاتری اور عقیدت مند لوگ اپنے بجے بجے کار سے نہایت شور و غل کرتے ہوئے ساتھ تھے اور جب مورت کو سنگھاسن پر بٹھایا اُس وقت تو ایسا غل پڑا کہ میں نے کبھی نہیں سُنا تھا۔ پھر تھوڑی سی خاموشی کے بعد دور سے کچھ شور سا سُنائی دیا۔ اور تمام خلقت کی آنکھیں اس طرف کو اُٹھ گئیں اور میں نے دیکھا کہ درختوں کا ایک جھنڈ سا چلا جاتا ہے۔ ذرا قریب آنے پر معلوم ہوا کہ بہت سے آدمیوں کا ایک

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ جلوس بڑی جلدی سے چلا آتا ہے اور ہر ایک کے ہاتھ میں کھجور یا کسی اور درخت کی سبز ٹہنی ہے۔ اس جلوس کے لئے خلقت نے راستہ چھوڑ دیا اور جب وہ جگن ناتھ کے سنگھاسن کے سامنے جس پہ مورت رکھی ہوئی تھی پہنچے تو زمین پہ سرتا پا گر کر ڈنڈوت اور پوجا بجا لائے۔ اُس وقت جگن ناتھ کا سنگھاسن ایک بہت اونچے رتھ پہ رکھا گیا جو مثل ایک برج کے ۔۔ اٹھ فٹ بلند تھا اور جس کے پہیے بوجھ کے مارے زمین میں دھنسے جاتے تھے۔ اس رتھ میں جہاز کی سی بھاری اور لمبی لمبی چھ زنجیریں لگی ہوئی تھیں اور ہزاروں مرد عورت اور بچے اُن کو کھینچتے تھے اور اس قدر اژدہام تھا کہ بعض لوگ صرف ایک ہی ہاتھ لگا سکتے تھے۔ بچوں سے اس زنجیر کے کھچوانے کی وجہ یہ تھی کہ ایسے دیوتا کی زنجیر کو کھینچنا ایک بڑے دھرم کی بات سمجھی جاتی ہے۔ رتھ کے اوپر سنگھاسن کے پاس برہمن اور پجاری لوگ کھڑے تھے اور میں نے سنا کہ شاید ایک سو میں پجاری رتھ پر موجود تھے۔ جگن ناتھ کی مورت ایک لکڑی کا بنا ہوا قالب ہے (جسے ہندو گلے ور کہتے ہیں) اُس کا چہرہ کالا رنگا ہوا اور نہایت مہیب ہے اور منہ بڑا سا اور کھلا ہوا لال رنگ سے بھرا ہوا ہے۔ بازو سونے کے ہیں اور پوشاک نہایت مکلف اور نفیس پہنائی ہوئی ہے اور وہ دونوں مورتیں جو اُس کے ساتھ ہیں ایک کا رنگ سفید اور دوسری کا زرد ہے۔ پانچ ہاتھی جن کے اوپر بڑی اونچی اونچی جھنڈیاں بھی تھیں اس تین گنبد والے رتھ کے آگے آگے چلتے تھے۔ ان ہاتھیوں پر لال رنگ کی جھولیں پڑی ہوئی تھیں اور دونوں جانب معمولی گھنٹے بھی لٹکتے تھے۔ میں بھی اس جلوس میں جا شامل ہوا بلکہ خاص رتھ کے قریب پہنچ گیا۔ جس کو بہت سے لوگ بمشکل تمام کھینچتے تھے۔ اور اس کے پیچھے جو بہت سے تھے اُن میں سے گرج کی سی آواز نکلتی تھی۔ چند لمحہ بعد رتھ رُک گیا اور پوجا شروع ہوئی یعنی ہندو کے بڑے پجاری نے رتھ پر چڑھکر اور مورت کے سامنے آکر چند فحش گیت گائے اور بیان کیا کہ جگن ناتھ جی کو ایسے گیت بہت پسند ہیں اور جب ان گیتوں سے خوش ہوتے ہیں تب ہی ان کا رتھ چلتا ہے۔ چنانچہ ان گیتوں کے گانے کے بعد رتھ ذرا سا آگے بڑھ کر پھر کھڑا ہو گیا۔ تب ایک لڑکا جس کی عمر کوئی بارہ برس کی ہوگی۔ سامنے کیا گیا۔ اس نے اُس پجاری سے بھی بڑھ کر چند قابل شرم گیت اس اُمید سے گانے شروع کئے کہ شاید اُن کا دیوتا قدم آگے بڑھانے اُس لڑکے نے دیوتا کی تعریف اور ا ستت بڑی دل رُبا آواز سے کی اور گیت کے مضامین کو جسمانی حرکات یعنی بتانے سے بھی ادا کیا کہ جس سے دیوتا خوش ہو گیا۔ اور لوگوں نے ایک مصنوعی خوشی کا شور کرکے رتھ کو ذرا آگے بڑھا دیا مگر چند لمحے بعد رتھ پھر ٹھہر گیا۔ پھر اس دیوتا کے ایک بڈھے پجاری نے کھڑے ہو کر اور اپنے ہاتھ

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ :۔ میں ایک لمبی چھڑی لے کر اور اُس کو تھوڑے عرصہ تک ناشائستہ طور پر ہلا ہلا کر اس مکروہ تماشے کو ختم کیا۔

واضح ہو کہ جگن ناتھ کی پوجا میں کو میں ہندوستان کا مونک کہتا ہوں فحش اور خون ریزی دو باتوں سے مرکب ہے۔ چنانچہ فحش کا ذکر تو ہو چکا۔ اب خون ریزی کا بیان سُنیئے۔ جب رتھ تھوڑی دور اور آگے بڑھا تو ایک جاتری بولا کہ میں جگن ناتھ جی پر اپنی جان قربان کرنے کو تیار ہوں۔ چنانچہ اُس نے چلتے ہوئے رتھ کے پہیوں کے آگے اپنے آپ کو ہاتھ پھیلا کر منہ کے بل زمین پر ڈال دیا اس وقت اژدہام خلائق نے اُس کے لئے جگہ چھوڑ دی اور رتھ کے پہیوں سے وہ کچل کر مر گیا۔ اس حرکت پر جاتریوں کے اژدہام نے مورت کی طرف دھیان کر کے بڑے زور سے جے جے کار کی صدا بلند کی۔ کیونکہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ جب اس طرح سے دیوتا کو خون چڑھایا جاتا ہے تو دیوتا مسکراتا ہے۔ پھر ان لوگوں نے اس جاتری کی لاش پر اس کے اس فعل کے متعلق اپنی خوشنودی ظاہر کرنے کے لئے کوڑیاں پھینکنی شروع کیں پھر بیسویں جون ۱۸۰۶ء کو اسی مقام سے صاحب موصوف یہ لکھتے ہیں۔ کہ یہ ہولناک رسمیں ابھی بدستور جاری ہیں۔ چنانچہ کل پھر ایک عورت نے اپنے آپ کو قربان کر دیا۔ مگر وہ رتھ کے نیچے چونکہ سیدھی نہیں پڑی تھی اور معمول کے خلاف ترچھی پڑ گئی تھی اس وجہ سے فوراً ہلاک نہ ہوئی بلکہ کئی گھنٹوں میں اُس کی جان نکلی۔ مگر آج صبح کو جب میں اُس مُردوں کی کھوپڑیوں والی جگہ پر سے گذرا تو میں نے دیکھا کہ اُس عورت کی لاش میں بجز ہڈیوں کے اس وقت اور کچھ باقی نہ رہا تھا۔ پھر ۲۱ جون ۱۸۰۶ء کو یوں لکھتے ہیں کہ ابھی رتھ جاترا کے تماشے بدستور جاری ہیں۔ لیکن ایسے افعال اور بے رحمیوں کو دیکھتے دیکھتے میں اس قدر تنگ آ گیا ہوں کہ اب دل یہی چاہتا ہے کہ یہاں سے جلد بھاگ چلئے۔ آج صبح کو اُس مقام پر جہاں مُردوں کو پھینکا جاتا ہے۔ میں نے ایک اور بھی زیادہ دردانگیز واقعہ دیکھا کہ ایک عورت جو مُردہ یا قریب المرگ پڑی ہوئی تھی اُس کی لاش کو کتے اور گدھ چیٹے ہوئے تھے۔ اور اُس کے دو بچے اُس کی لاش کی طرف بحسرت تک رہے تھے۔ اور جاتری لوگ جو اُس طرف ہو کر جاتے تھے۔ ان بچوں کی حالت پر کوئی بھی ذرہ برابر متوجہ نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اُن بچوں سے دریافت کیا کہ تمہارا گھر کہاں ہے انھوں نے کہا کہ جہاں ہماری ماں ہے وہیں ہمارا وطن ہے۔ افسوس اس جگہ رحم نام کو بھی نہیں ہے۔ اس وقت جاتری لوگ یہاں اس قدر جمع ہوئے ہیں کہ اُن کی تعداد کا اندازہ ٹھیک ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ خاص تہواروں پر جس قدر جاتری جمع ہوتے ہیں اُن کی تعداد کی نسبت یہاں کے

لوگ ذکر کرتے ہوئے یوں کہتے ہیں کہ اگر بالفرض میلے میں سے ایک لاکھ آدمی چلا جائے تو کثرتِ خلائق میں کچھ کمی محسوس نہیں ہو سکتی میں نے ایک برہمن سے پوچھا کہ بڑے سے بڑے میلے پر تمھاری دانست میں کس قدر جاتری آتے ہوں گے تو اُس نے یہ جواب دیا کہ میں کس طرح کہہ سکتا ہوں کہ مٹھی بھر ریت میں کتنے ذرے ہوتے ہیں۔

انگلستان میں انگریزوں کو اس بات پر یقین نہیں آئے گا کہ یہ سب خونریزیاں جو جگن ناتھ میں ہوتی ہیں آیا کلکتہ میں حکام انگریزی کو بھی معلوم ہیں یا نہیں۔ لیکن افسوس کہ گورنمنٹ پیلس کے دروازے کے آگے اور سپریم گورنمنٹ کی نظروں کے سامنے یہ سب باتیں ہوتی ہیں۔ خاص بنگالے میں بھی جو ایک خوش نما اور ایسا سرسبز اور شاداب ملک ہے جس کو دنیا کا باغ کہا جاتا ہے اس ہندوستان کے مولک کے کئی مندر ہیں۔ چنانچہ ایشڑا[1] جو کلکتہ سے آٹھ میل کے فاصلہ پر گنگا کے کنارے ایک خوش نما گاؤں ہے (اور جہاں پہلے وارن ہیسٹنگس صاحب گورنر جنرل ہند رہا کرتے تھے اور اب بھی گورنر جنرل حال کے باغ[2] سے یہ جگہ سامنے نظر آتی ہے) خاص اُس کے متصل ہی جگن ناتھ کا مندر موجود ہے جہاں اکثر انسان کی قربانی کا خون بُت کو چڑھایا جاتا ہے۔ چنانچہ ماہ مئی سنہ ۱۸۰۶ء جب کہ ڈاکٹر بکانن صاحب رتھ جاترا کے میلے پر اس جگہ موجود تھے ایک بہت خوبصورت اور تازہ توانا نوجوان شخص نے کہ جس کے لمبے لمبے سیاہ بال بکھرے ہوئے تھے اور گلے میں پھولوں کا ہار پہنے ہوئے تھا یہ حرکت کی کہ اُچھلتا کودتا آیا اور رتھ کے سامنے تھوڑی دیر تک اول تو بہت ذوق و شوق سے ناچتا اور گاتا رہا اور پھر یکایک اُس کے پہیوں کے نیچے جا گھسا اور اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالا فقط انتہیٰ۔! س۔م۔ع

---

[1] شاید یہ لفظ دراصل چھیڑا ہے۔ جس کو بنگالی چھیڑا کہتے ہیں۔ کیونکہ ایشڑا کا نام ہندوستان کے نقشوں میں کلکتہ کے نزدیک کہیں نہیں ملتا۔ اور وہ باغ شاید بارک پور المعروف اچانک سے مراد ہے۔ س۔م۔ع

[2] اصل کتاب میں لفظ کنٹری ہوس ہے۔ شہروں کے رہنے والے ذی مقدور یورپین لوگوں میں رسم ہے کہ ایسے مکان معہ باغ بیرونجات میں اس مدعا سے بنا رکھتے ہیں کہ جب کبھی شہر میں رہتے رہتے طبیعت دق ہو جاتی ہے تو تفریح خاطر اور تبدیل آب و ہوا کے لئے وہاں جا رہتے ہیں۔ س۔م۔ع

ایشڑا (ایسے خن ڑا)

سادھوا ور کسبیاں میں کئی ایک خوبصورت کسبیوں کو جانتا پہچانتا ہوں جو باوجود اس پیشہ کے نہایت محتاط ہیں یعنی ہر کسی کے پاس نہیں چلی جاتیں چنانچہ ان عورتوں کو کئی اہل اسلام اور عیسائی اور بعض پردیسی قوم کے بُت پرستوں نے بہت کچھ دولت اور روپیہ دینا چاہا لیکن انھوں نے بایں عذر قبول نہ کیا کہ ہم نے اپنے تئیں دیوتاؤں اور برہمنوں اور اُن سادھوؤں پر جو ننگے دھونی رماتے اور خاک بدن کئے مندر کے چاروں طرف بیٹھے ہیں (جن کی وضع کا بیان میں جلد کروں گا) وقف کیا ہوا ہے۔

ستی کی رسم

ستی کی رسم اور حکام مغلیہ کی پالیسی ہندوستان کی عورتوں کے ستی ہونے کی نسبت جو روایتیں فرنگستان میں مشہور ہیں اگرچہ پہلے بھی اُن کی تصدیق بہت سے سیاحوں اور مسافروں کے بیانات سے ہو چکی ہے مگر اُمید ہے کہ میرے ہم وطن اس پُرانہ دوہ کیفیت کو سُن کر اب تو شبہ کرنا بالکل چھوڑ دیں گے۔

لے ستی کی رسم ہندوستان میں بہت عرصہ سے تھی اور چونکہ منوسمرتی میں باوجودیکہ بیوہ عورتوں کے وظائف چلن وغیرہ کا ذکر آیا ہے ستی کی نسبت کچھ اشارہ پایا نہیں جاتا اس لئے انگریز مورخ یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ یہ رسم منوجی کے زمانہ سے پیچھے جاری ہوئی تھی اور چونکہ بحر بید کی تالیف و ترتیب کا زمانہ سنہ قبل مسیح اُنھوں نے ثابت کیا ہے اس لئے منوسمرتی کا تقریباً نو سو برس قبل سن مسیحی مرتب ہونا قرار دیتے ہیں۔ بہرحال دو ہزار برس سے زیادہ عرصہ سے ہندوؤں میں اس رسم کا ہونا یقینی معلوم ہوتا ہے۔ مسلمان بادشاہوں نے اس کے امتناع کی نسبت کچھ توجہ نہیں کی اور ایک بے پروائی سے کبھی کبھی اس کی مزاحمت کی۔ لیکن انگریزوں کو جب خدا نے اس ملک کی حکومت عنایت کی تو پولیٹیکل خیالات سے مدت تک ان کا حال بھی مسلمان بادشاہوں ہی کا سا رہا یعنی یہ کہ بیوہ صرف اپنی مرضی سے ستی ہو یا اُس حالت میں ستی ہو جب کہ اُس کے رشتہ داروں کی خوشی ہو یا گرو کا حکم ہو غرض زبردستی نہ جلائی جائے۔ ایک دفعہ لارڈ ویلزلی کے عہد میں اس کے امتناع کے لئے تحریک ہوئی تھی مگر اس وقت وہ ولایت کو جانے والے تھے جاتے جاتے کیا کر سکتے تھے مگر پھر بھی چلتے چلتے وہ اتنا لکھ گئے کہ اس رسم کا موقوف ہونا مناسب ہے۔ دنی اپریل سنہ ۱۸۰۵ء کو محکمہ صدر نظامت بنگالہ نے اپنا ایک سرکلر اس مضمون سے جاری کیا کہ بغیر اطلاع مجسٹریٹ یا افسر پولیس

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ کہ کوئی بیوہ ستی ہونے نہ پائے اور یہ عہدہ داران امور کی تحقیق کیا کریں کہ بیوہ خود اپنی مرضی سے ستی ہوتی ہے اور کوئی اس پر زور و ظلم تو نہیں کرتا؟ کسی نے اُسے نشہ پلا کر تو یہ سنت نہیں چڑھا دیا؟ یا کسی اور طریقے سے بیہوش و حواس تو نہیں کر دیا؟ اُس کی عمر سولہ برس سے کم یا وہ حاملہ تو نہیں ہے۔

یہ سرکلر اگرچہ مخالفت کے لئے تھا مگر غور کرو تو حقیقت میں ایک طرح کی اجازت تھی ۔! گورنمنٹ بمبئی نے ایک عجیب و غریب حکم یہ جاری کیا کہ چتا کو ایک انگریز عہدہ دار بنایا کرے جس سے یہ غرض تھی کہ بیوہ اگر آگ کے شعلوں سے دُور کر نکل بھاگنا چاہے تو بھاگ سکے۔ ۱۸۲۳ء میں اس معاملہ میں ہندوستان اور انگلستان میں بڑے زور شور سے مباحثہ شروع ہوا مگر کسی کو یہ حوصلہ نہ ہوا کہ اس کے امتناع کا قطعی حکم دیدے۔ بلکہ بعض کی تو یہ رائے ہوئی کہ اس کا روکنا گورنمنٹ کے اس بڑے اصول کے مخالف ہے کہ سرکار رعایا کے مذہب اور رسم و رواج میں بشرطیکہ وہ انسانیت اور عقل اور انصاف کے خلاف نہ ہوں کبھی مزاحم نہ ہوگی۔ چنانچہ تمام موافق و مخالف رائیں جمع کر کے صاحبان کورٹ آف ڈائرکٹرز نے ۱۸۲۳ء میں گورنمنٹ ہند کے پاس بھیجیں اور لکھا کہ ہم کو کمال خوشی ہوگی اگر یہ رسم بغیر کسی فتنہ و فساد پیدا ہونے کے موقوف ہو جائے۔ اس پر لارڈ ایم ہرسٹ[1] نے پھر تمام دانشمند عہدہ داروں سے مشورہ لیا مگر یہی بات قرار پائی کہ اس کا انسداد تو ضرور چاہیے۔ لیکن بتدریج ہندوؤں کے اخلاق اور تہذیب اور عقل میں ترقی پیدا کر کے اور یہ جواب ولایت کو بھیجا گیا کہ فی الحال یہ رسم قطعی موقوف نہیں ہو سکتی مگر بتدریج اشاعت اور ترقی تعلیم سے خود موقوف ہو جائے گی۔ ۱۸۲۷ء میں پھر گورنر جنرل کے پاس ولایت سے لکھا آیا کہ کسی طرح یہ رسم شائستگی کے ساتھ بہت جلد موقوف بھی ہو سکتی ہے؟

اس پر لارڈ ولیم بینٹنگ[2] نے جو ابھی گورنر جنرل ہو کر آئے تھے پھر جنگی اور ملکی عہدہ داروں سے مشورہ لیا اور ہمت کر کے آخر کار چودھویں دسمبر ۱۸۲۹ء کو ایکٹ نمبر سترہ جاری کر ہی دیا جس کی رو سے یہ دردناک رسم ہمیشہ کے واسطے ہندوستان سے دفع ہو گئی۔ اور اگرچہ کلکتہ کے دولت مند بابوؤں نے بہت غل مچایا اور اخباروں کے صفحہ کے صفحہ کالے کر ڈالے مگر اس بابت تخص سے: ایک اپیل اور خاص شاہی کونسل کی خدمت میں جو اپیل دائر کیا گیا تھا اور جس پر فرقہ

---

[1] ایم ہرسٹ (ا ے م ہ ر س ٹ)

[2] ولیم بینٹنگ (و ل ی م ب ی ن ٹ ن)

جو بیانات ستی کی بابت لکھے گئے ہیں اُن میں بلاشک مبالغہ کیا گیا ہے اور آج کل پہلے کی نسبت ستی کی تعداد کم ہو گئی ہے کیونکہ مسلمان جو اس ملک کے فرماں روا ہیں اس وحشیانہ رسم کے نیست و نابود کرنے میں حتی المقدور کوشش کرتے ہیں۔ اور اگرچہ اس کے امتناع کے واسطے کوئی قانون مقرر کیا ہوا نہیں ہے۔ کیونکہ اُن کی پالیسی (تدبیر مملکت) کا یہ ایک جزو ہے کہ ہندوؤں کی مذہبی خصوصیات میں جن کی تعداد مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہے دست اندازی کرنا مناسب نہیں سمجھتے بلکہ اُن کی مذہبی رسوم کے بجالانے میں اُن کو آزادی دیتے ہیں۔ لیکن تاہم ستی کی رسم کو بعض رکاوٹیں پیدا کرکے روکتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ کوئی عورت اپنے صوبہ کے حاکم کی اجازت کے بغیر ستی نہیں ہو سکتی اور صوبہ دار ہرگز اجازت نہیں دیتا جب تک کہ قطعی طور پر اس امر کا یقین نہیں ہو جاتا کہ وہ اپنے ارادہ سے ہرگز باز نہ آئے گی۔ صوبہ دار بیوہ کو بحث مباحثہ سے سمجھاتا ہے اور بہت سے وعدے وعید کرتا ہے اور اگر اس کی فہمائش اور تدبیریں کارگر نہیں ہوتیں تو کبھی ایسا بھی کرتا ہے کہ اپنی محل سرا میں بھیج دیتا ہے تاکہ بیگمات بھی اس کو اپنے طور پر سمجھائیں۔ مگر باوجود ان سب امور کے ستی کی تعداد اب بھی بہت ہے خصوصاً ان راجاؤں کے علاقوں اور عملداریوں میں جہاں کوئی مسلمان صوبہ دار متعین نہیں ہے۔ لیکن ہر ایک عورت کے واقعات کے بیان سے جن کو میں نے بچشم خود ستی ہوتے دیکھا ہے میں آپ کی دردسری اور سامعہ خراشی کا سبب نہیں بنوں گا۔ بلکہ منجملہ اُن کے صرف دو تین رکھ وہ واقعات ہی کا بیان کروں گا۔ اور ان میں بھی صرف ایک ہی عورت کے مفصل حالات لکھوں گا جس کو ستی ہونے کے مستقل اور خوفناک ارادہ سے روکنے کے واسطے میں بھیجا گیا تھا۔

ستی سے روکنے کا قصہ

بندی داس نامی میرا ایک دوست تھا جو دانشمند خاں کا میر منشی تھا وہ تپ دق کی بیماری سے جس کا معالجہ میں نے دو برس سے کچھ زیادہ عرصہ تک کیا تھا مر گیا اور اُسی وقت اُس کی زوجہ نے اپنے شوہر کی لاش کے ساتھ ستی ہونے کا ارادہ کر لیا۔ اس کے رشتہ دار میرے آقا کے نوکر تھے اور ان کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ اس

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ برہم سماج کے مشہور بانی راجہ رام موہن رائے کے بھی دستخط تھے ۱۸۳۲ء میں ولایت سے خارج ہو گیا۔ اور اس رسم کی موقوفی کی نیک نامی جو خدا نے سلطنت انگریزی کی قسمت میں لکھی تھی وہ اُس کو ہمیشہ کے لئے حاصل ہو گئی۔ (ماخوذ از تاریخ ہند مولفہ انفنسٹن صاحب و نیز ذکاء اللہ صاحب) س۔م۔ع

دیوانگی کی حرکت سے باز رکھیں چنانچہ انھوں نے اُسے سمجھایا کہ اگرچہ تمھارا یہ قصد پسندیدہ اور باعث عزت اور خوشنودی خاندان اور سراسر لائق تحسین اور ہمت کا کام ہے لیکن تم کو خیال کرنا چاہیے کہ تمھارے بچے کم عمر ہیں اور اُن کو چھوڑ نا نہایت بے رحمی ہے اور تم کو اپنے فرزندوں کی بھلائی کی فکر اس محبت سے جو تم اپنے متوفی شوہر کی نسبت رکھتی ہو بہت زیادہ ہونا چاہیے اس بیوقوف اور دیوانی عورت نے جب ان کی نصائح کو کسی طرح نہ مانا تو انھوں نے مجھ سے درخواست کی کہ آپ چل کر سمجھائیں۔ چونکہ ہمارے آقا کی بھی یہی مرضی تھی اور اس خاندان سے میری دیرینہ دوستی تھی اس لئے میں اُس کے پاس گیا۔ جب مکان میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سات آٹھ بدصورت بڈھی عورتیں اور چار پانچ مسن اور ضعیف العقل برہمن لاش کے ارد گرد جمع ہیں اور یہ سب عورتیں باری باری بڑے شور و فغاں اور آہ و زاری سے روتی اور بڑے زور سے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیٹتی ہیں۔ یہ عورت لاش کے پائنتی بیٹھی تھی اور بال کھلے ہوئے تھے اور چہرہ زرد ہو رہا تھا مگر آنکھوں میں آنسو نہ تھا لیکن جب حاضرین مجلس کی طرح وہ بھی بہت زور سے چلاکر رونے لگی تو آنکھیں لال انگارا ہو گئیں اور باتفاق اُس خوفناک گروہ کے اپنی باری پر وہ بھی پیٹتی رہی جب یہ رونا پیٹنا فرد ہوا تو میں اُس کمبخت گروہ کے قریب گیا اور آہستگی اور نرمی کے ساتھ اُس بیوہ سے کہا کہ میں دانشمند خاں کے حکم سے تمھیں اطلاع دینے آیا ہوں کہ نواب تمھارے دونوں بیٹوں کے واسطے دو دو کرون یعنی پانچ پانچ روپے ماہواری کا وظیفہ جاری رکھے گا بشرطیکہ تم اپنی جان تلف نہ کرو۔ کیونکہ تمھارا جیتا رہنا تمھارے بچوں کی خبرگیری اور تربیت کے واسطے از بس ضرور ہے اور تم کو خوب معلوم رہے کہ ہم ہر طرح سے تمھارے چتا پر بیٹھنے اور ستی ہونے کو روک سکتے ہیں اور اُن لوگوں کو جو تمھیں اس نامعقول بات کی جرأت دلاتے ہیں سزا دے سکتے ہیں۔ تمھارے سب عزیز و اقارب تمھاری اولاد کی زندگی کی خاطر تمھارا زندہ رہنا پسند کرتے ہیں۔ اور اس حالت میں تم پر کم ہمتی کا الزام اور وہ بدنامی بھی عاید نہ ہوگی جو ایک ایسی عورت کی نسبت عاید ہوسکتی ہے جو باوجود اولاد نہ ہونے کے اپنے مالک کے ساتھ ستی ہونے کی جرأت نہ کرے اور میں نے کئی بار اس تقریر کو دُہرایا لیکن اُس نے مطلق جواب نہ دیا آخر کار بڑے استقلال سے آنکھ ملاکر یوں بولی کہ "خیر اگر میں ستی ہونے نہ پاؤں گی تو دیوار سے سر پھوڑ کر مرجاؤں گی" یہ سُن کر میں نے اپنے دل میں ذرا سوچا اور

پھر نہایت غصہ سے پکار کر کہا کہ کیا تیرے سر پر کوئی بھوت چڑھا ہے۔ بہت اچھا ستی ہوجا۔ لیکن اے بدبخت بے رحم پہلے اپنے بچوں کے گلے کاٹ کر اُن کو اسی چتا پر جلا دے کیونکہ ہم کو یہ ہرگز گوارا نہیں ہے کہ تو تو ستی ہوکر اس دنیا سے چل دے اور اُن کو بھوکا مرنے کو پیچھے چھوڑ جائے اور میں ابھی دانشمند خاں کے پاس جاتا ہوں اور تیرے لڑکوں کا وظیفہ منسوخ کراتا ہوں۔ میرے اس مستقل طور پر بلند آواز سے کہنے کا یہ اثر ہوا کہ وہ چُپ ہوگئی اور فوراً سر جھکا کر گھٹنوں پر رکھ لیا پھر تو وہ بُڑھیا عورتیں اور برہمن بھی دروازے کی طرف کھسک گئے اور یہ دیکھکر مجھے مناسب معلوم ہوا کہ اب اس کو اس کے رشتہ داروں کے سپرد کرکے جو میرے ساتھ آئے تھے وہاں سے چل دوں چنانچہ میں اپنے گھوڑے پر سوار ہوکر اپنے گھر کو چلا آیا۔

شام کے وقت جب کہ میں دانشمند خاں کے پاس اس حال کی اطلاع کرنے کے لئے جارہا تھا راستہ میں اُس کا ایک رشتہ دار ملا اور بعد ادائے شکر بولا کہ اُس کے شوہر کی لاش بغیر اُس کے جلائی گئی اور اُس نے اپنی جان نہیں گنوائی۔

ستی کا ایک دردناک واقعہ

اب اُن عورتوں کا حال سنئے جو فی الواقع جل مرتی ہیں۔ میں نے یہ اندوہناک واقعے اتنی مرتبہ دیکھے ہیں کہ آئندہ ستی کے کسی اور واقعہ کے دیکھنے کا حوصلہ نہیں رہا۔ اور نہ اُس کا اعادہ عبرت اور نفرت سے خالی ہے۔ بہرحال جو کچھ میری آنکھوں کے سامنے گذرا ہے حتی الامکان اُس کو بیان کرتا ہوں[1]۔ لیکن مجھکو یہ توقع نہیں ہے کہ ان ستی ہونے والی دیوانی عورتوں کی جرأت اور

---

[1] مشہور و معروف سیاح شیخ ابو عبداللہ محمد ابن عبداللہ افریقی معروف ابن بطوطہ۔ جو ۷۳۳ھ میں محمد شاہ تغلق کے زمانہ میں ہندوستان میں آیا تھا اپنے سیاحت نامہ میں جو عربی زبان میں ہے اور جس کی ایک نقل خوش قسمتی سے ہمارے کتب خانہ میں بھی موجود ہے لکھتا ہے کہ جب کبھی ستی کا کوئی واقعہ سلطان ہند کی قلمرو میں ہوتا ہے تو اوّل سلطان سے اجازت حاصل کی جاتی ہے اور اُس کے بعد عورت ستی ہوتی ہے۔ اور پھر ایک اپنی آنکھوں دیکھے واقعہ کا یوں ذکر کرتا ہے کہ میں ملک سندھ ہی میں تھا کہ ایک شہر کے قریب (جس کا نام اُس نے اُمجری لکھا ہے) قزاقوں نے جو نزدیک ہی کے رہنے والے تھے اور سلطان کی حکومت نہیں مانتے تھے چند مسافروں کو لوٹ لیا اور حاکم شہر کے ہمراہیوں میں سے جو مسلمان تھا اُن سے لڑنے کے لئے نکلا تھا اس لڑائی

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ ۔ میں چند ہندو مارے گئے تو اُن میں سے تین کی عورتوں نے ستی ہونے کا ارادہ کیا جو ہندوؤں کے نزدیک اگرچہ فرض نہیں مگر ثواب کا کام ہے اور جو عورت ستی ہو جاتی ہے وفادار اور اپنے خاندان کے لیے باعث عزت سمجھی جاتی ہے اور جو ستی نہیں ہوتی وہ موٹے جھوٹے کپڑے پہنتی اور بے وفائی کی وجہ سے کنبہ والوں کے نزدیک بدنصیب اور ذلیل خیال کی جاتی ہے اگرچہ ستی ہونے پر مجبور نہیں کی جاتی ۔ چنانچہ جب انھوں نے اپنا ستی ہونا ٹھان لیا تو تین دن تک گانے بجانے اور خوشیاں منانے میں مصروف رہیں گویا دنیا سے رخصت ہوتی ہیں اور ادھر اُدھر کی عورتیں اُن کی ملاقات کو آتی رہیں ۔ چوتھے روز کی صبح کو خوب بناؤ سنگار کرکے اور عطر وغیرہ لگا کر گھوڑوں پر سوار ہوئیں اور دائیں ہاتھ میں ایک ایک ناریل اور بائیں میں ایک ایک آئینہ لیا جس کو اُچھالتی اور اُس میں اپنا منہ دیکھتی جاتی تھیں اور ہندو آدمی اُن سے کہتے جاتے تھے کہ ہمارے باپ یا ماں یا بھائی یا دوست کو ہمارا سلام کہہ دینا ۔ جس کے جواب میں وہ ہنس کر کہہ دیتی تھیں کہ اچھا! میں اپنے ساتھیوں سمیت اُن کے ستی ہونے کی کیفیت دیکھنے کے لئے گیا اور کوئی تین میل چل کر ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں بہت سا پانی اور گھنے سایہ کے درخت تھے اور اُن میں چار مٹ بنے ہوئے تھے جن میں پتھر کی ایک ایک مورت تھی اور ان مٹوں کے بیچوں بیچ ایک بڑا اور پختہ تالاب تھا ۔ جس پر درختوں نے ایسا گھنا سایہ کیا ہوا تھا کہ دھوپ نہیں پڑ سکتی تھی ۔ یہ عورتیں جب اِن مٹوں کے قریب پہنچیں تو تالاب کے پاس جا کر اُتر پڑیں اور کپڑے اور گہنا پاتا اُتار کر خیرات کر دیا اور پانی میں غوطہ لگا کر ایک بغیر سلا ہوا موٹی کپڑا سر سے پاؤں تک اوڑھ لیا ۔ تالاب کے قریب ہی ایک نشیب زمین میں بہت سی آگ جلائی جا رہی تھی جس پر بھڑکانے کے لئے تلوں کا تیل ڈالا جا رہا تھا اور کوئی پندرہ آدمی باریک ایندھن کے گٹھے ہاتھوں میں لئے کھڑے تھے اور تقریباً دس آدمیوں کے پاس بڑی بڑی لکڑیاں تھیں ۔ اور ڈھول اور سنکھ بجانے والے لوگ ان عورتوں کے منتظر کھڑے تھے ۔ اور اس خیال سے کہ کہیں دیکھ کر ڈر نہ جائیں لوگوں نے آگ کے سامنے قنات سے پردہ کر رکھا تھا جس کو ہاتھوں سے تھامے ہوئے تھے ۔ القصہ اِن میں سے ایک عورت کو میں نے دیکھا کہ جب قنات کے پاس پہنچی تو اُس کو لوگوں کے ہاتھ سے جھٹک کر کھینچ لیا اور ہنس کر بولی کہ ”مارا میترسانی از اطیش و آتش ، من می دانم کہ ار آطیش است رہا کنی لما“ جس کے یہ معنی ہیں کہ کیا تم مجھکو آگ سے ڈراتے ہو ۔ میں جانتی ہوں کہ یہ جلا ڈالنے والی آگ ہے ۔ پھر اُس نے آگ کو سلام کرنے کی خاطر اپنے دونوں ہاتھ سر پر جوڑے اور اس میں کود پڑی اور مٹھا نقارے اور

دہلا دہلا دینے والا ناک جان کھونے کا بیان میں ٹھیک ٹھیک ادا کر سکوں۔ جو جو کچھ اس پر اندوہ اور خوفناک اور بدانجام رسم میں ہوتا ہے۔ یقین ہے کہ بے دیکھے کوئی بھی اس کو سچ نہ جانے گا

جب میں احمد آباد سے راجستان ہو کر آگرہ جا رہا تھا اور ہمارا قافلہ دو پہر کاٹنے کو ایک قصبہ میں سایہ تلے ٹھیرا ہوا تھا سُنا کہ ابھی ایک عورت اپنے شوہر کی لاش کے ساتھ ستی ہوا چاہتی ہے۔ پس میں فوراً دوڑا ہوا وہاں گیا اور دیکھا کہ ایک بڑے تالاب میں جو بجز تھوڑی جگہ کے زیادہ تر خشک پڑا تھا ایک بڑا گڑھا لکڑیوں سے بھرا ہوا ہے اور اس پر مردے کی لاش رکھی ہوئی ہے اور اسی پر ایک عورت بیٹھی ہے اور چار پانچ برہمن اس کو ہر طرف سے آگ لگا رہے ہیں اور پانچ ادھیڑ عورتیں کسی قدر اچھی پوشاکیں پہنے ایک دوسری کا ہاتھ پکڑے چتا کے گرد اگرد ناچتی گاتی ہیں اور بہت سے زن و مرد یہ تماشا دیکھ رہے ہیں۔ چتا جس پر بہت سا گھی اور تیل ڈالا گیا تھا جلد بھڑک اٹھی اور عورت کے کپڑوں کو جن پر عطر اور زعفران وغیرہ چھڑکا ہوا تھا آگ لگ گئی۔ مگر میں نے کوئی علامت دکھ درد یا گھبراہٹ کی اس میں نہ دیکھی اور کہتے ہیں کہ اس نے بڑے یقینی طور پر پانچ اور دو کا لفظ کہا جس کا مطلب تھا کہ یہ پانچویں دفعہ ہے کہ میں اپنے اسی خاوند کے ساتھ ستی ہوتی ہوں۔ اور اب صرف دو دفعہ اور ستی ہونا باقی ہے۔ پھر میں تناسخ (آواگون) کے مسئلہ کے موافق "مکتی" کو پہنچ جاؤں گی یعنی پیدا ہونے اور مرنے سے چھوٹ جاؤں گی اور یہ لفظ اس نے اس طرح سے کہے کہ گویا اس اخیر وقت میں کسی اوتار یا رشی کی روح نے اس میں حلول کیا ہے۔ لیکن ابھی اس خوفناک طور پر جان کھونے کی واردات کی ابتدا ہی تھی اور میں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ وہ پانچ گانے والی عورتیں بجز ایک امر رسمی کے کسی خاص مطلب کے لئے نہ ہوں گی۔ مگر جب میں نے یہ دیکھا کہ ان میں سے بھی جب ایک عورت کے کپڑوں تک آگ پہنچ گئی تو اس نے بھی اپنے آپ کو سہکے بل اس آتشیں گڑھے میں گرا دیا اور اسی طرح جب ایک دوسرے کے کپڑے جلنے لگے اس نے بھی اس دہشت ناک حرکت کی تقلید کی اور اسی طرح باری باری وہ تینوں عورتیں بھی جو

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ ۔ سنکھ اور نفیریاں بجنے لگیں۔ جن لوگوں کے ہاتھ میں ایندھن تھا وہ انھوں نے اس پر ڈال دیا۔ پھر اور لوگوں نے لکڑیاں ڈال دیں تاکہ ہل نہ سکے اور بڑا شور و غل ہوا۔ اور یہ سانحہ دیکھکر میری ایسی حالت ہوئی کہ اگر میرے ساتھی مجھکو نہ سنبھالتے اور پانی سے میرا منہ نہ دھوتے تو قریب تھا کہ میں اپنے گھوڑے سے گر پڑتا۔ س م ۔ ح

ایک دوسری کا ہاتھ پکڑے کمال بے فکری اور آرام سے ناچ رہی تھیں میرے دیکھتے ہی دیکھتے آگ میں کود کر جل مریں۔ تب تو مجھ پر سخت حیرت طاری ہوئی مگر اب مجھکو ایک شخص کے ساتھ کئی عورتوں کے ستی ہونے کے مطلب بھی جلد معلوم ہو گیا یعنی یہ کہ یہ پانچوں عورتیں لونڈیاں تھیں۔ اور جب اُن کی بی بی کا مالک مرض الموت میں مبتلا تھا اُنھوں نے اس بی بی کی جانب سے اپنے شوہر کی نسبت کمال محبت دیکھی تھی جس نے اُس سے یہ وعدہ کیا تھا کہ تمھارے بعد میں بھی زندہ نہ رہوں گی۔ پس یہ لونڈیاں بھی جوشِ اُلفت سے اس قدر مغلوب ہوئیں کہ اُنھوں نے بھی اپنا مرنا ٹھان لیا اور اُسی آگ میں جل مریں جس میں اُن کی پیاری بی بی ستی ہوئی تھی۔

ستی ہونے کا اصل سبب بہت سے لوگ جن سے میں نے اُس وقت ستی ہونے کی نسبت گفتگو کی مجھکو اس بات پر یقین دلانے کی کوشش کرتے رہے کہ ہندوستان کی عورتوں کے ستی ہونے کا سبب اپنے خاوندوں کے ساتھ شدتِ محبت ہے۔ لیکن مجھے جلد معلوم ہو گیا کہ اس مکروہ رسم کا باعث صرف ایک قسم کے تعصب اور توہم کا اثر ہے۔ جو لڑکپن ہی سے لڑکیوں کے دلوں میں جمایا جاتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ ایک عمیق جڑ پکڑ گیا ہے۔ کیونکہ ہر ایک لڑکی کو اُس کی ماں یہ تعلیم کرتی رہتی ہے کہ عورت کی پارسائی اور تعریف اسی میں ہے کہ اپنے پتی کے ساتھ ستی ہو جائے۔ اور پتی پرتا عورتوں کا یہی طریق ہے کہ اس مقررہ رسم سے ہرگز منہ موڑیں۔ علاوہ بریں مرد بھی عورتوں کو یہی عقیدے ہمیشہ تعلیم کرتے رہتے ہیں تاکہ عورتوں کی توجہ اپنے مالکوں کی اطاعت اور تیمارداری میں مشغول رہنے کے واسطے بآسانی حاصل ہو۔ اور اس طرح عورتوں کی طرف سے مالکوں کو زہر وغیرہ دے دینے کا ڈر بھی نہیں رہتا۔

اب میں ایک نہایت عجیب اور زیادہ تر ہولناک واقعہ کا بیان کرتا ہوں۔

ستی کا حیرت انگیز واقعہ اگرچہ یہ حادثہ میرا چشم دید نہیں ہے۔ مگر اس نظر سے انتخاب کیا گیا ہے کہ جس قدر ستی کے واقعات میں نے دیکھے ہیں۔ یہ واقعہ بہ لحاظ اپنی خصوصیات کے اُن سب سے کہیں بڑھ کر ہے اگرچہ ایسے بہت سے معاملات ہیں کہ باوجود دیکھ میں نے خود دیکھے ہیں مگر میں اُن پر اعتماد اور یقین نہیں کرتا۔ لیکن آپ کو یا مجھے یہ نہیں چاہیئے کہ اس حکایت کو صرف اس وجہ سے نامعتبر تصور کر لیں کہ اُس میں ایک خاص طور کا الوکھاپن ہے۔ ہندوستان میں یہ قصہ ہزاروں آدمیوں کی زبان پر ہے اور عموماً صحیح خیال کیا ہے۔ اور شاید کہ اب تک فرنگستان میں بھی پہنچ گیا ہو۔ چنانچہ وہ قصہ ہے کہ ایک عورت کچھ

ذات سے ایک نوجوان مسلمان درزی کے ساتھ جو اس کا ہمسایہ تھا اور طنبورہ بجایا کرتا تھا ناجائز لگاؤ رکھتی تھی اُس نے اپنے شوہر کو زہر دے دیا اور اُس سے جاکر کہا کہ اب اپنے وعدہ کے موافق مجھ سے نکاح کرلو اور جھٹ پٹ کہیں کو نکل چلو۔ کیونکہ اگر ذرا بھی دیر ہوگی تو مجھے بہ سبب دنیا کی لاج کے مجبوراً اپنے خصم کے ساتھ ستی ہونا پڑے گا۔ مگر جب اُس جوان نے اس امر کو مشکل اور خطرناک سمجھ کر انکار کر دیا تو یہ عورت بغیر کسی طرح کے اضطراب اور تردد کے فوراً اپنے خویش و اقارب کے پاس گئی اور اُن سے کہا کہ میرا خاوند ناگہانی موت سے مر گیا ہے اور میرا مصمم ارادہ ستی ہونے کا ہے۔ وہ لوگ اُس کی اس پُرہمت ارادہ سے جو باعث افتخار خاندان تھا بہت خوش ہوئے۔ اور چتا تیار کر کے لاش کو اُس پر رکھ دیا اور آگ لگا دی۔ جب سب تیاری ہوچکی تو وہ چتا کے گرد اس غرض سے پھرنے لگی کہ گلے مل مل کر اپنے خویش و اقربا اور ہمسایوں وغیرہ سے رخصت ہو۔ اتفاقاً اُن لوگوں میں وہ مسلمان طنبورہ نواز بھی کھڑا تھا جو سازندوں کے ساتھ جو ملک کی رسم کے موافق ستی کے سامنے باجے بجاتے ہیں بلایا ہوا آیا تھا۔ پس جوں ہی یہ عورت اُس کے قریب پہنچی تو غصہ سے آگ بھبوکا ہو کر آخری رخصت کے بہانہ سے اُس کا گریبان اس شدت اور زور سے پکڑا کہ کسی طرح چھڑا نہ سکا اور کھینچ کر اپنے ساتھ چتا میں لے گری اور اس طرح پر اس جھوٹے عاشق سے اپنا بدلہ لے لیا۔

سورت کی ایک عورت چتا پر سورت سے ایران کو آتے ہوئے میں نے ایک اور بیوہ کے ستی ہونے کی کیفیت دیکھی اُس وقت کئی اہل فرنگ بھی یعنی انگریز اور ڈچ اور شہر پیرس کے رہنے والے۔ چارڈن صاحب بھی موجود تھے۔ یہ عورت عمر کی ادھیڑ اور اچھی خاصی طرح دار تھی۔ مگر میری زبان میں یہ طاقت کہاں جو اُس کی وہ حیوانوں جیسی جرأت، دلیری اور وہ وحشیانہ جھلک جو اُس وقت اُس کے چہرہ سے عیاں تھی اور اُس کا وہ بے دھڑک چتا کی طرف آنا اور بڑے استقلال اور دل جمعی کے ساتھ لوگوں سے بات چیت کرنا، اشنان کرنا اور بڑے اطمینان اور نہایت بے پروائی سے ہماری طرف دیکھنا اور ہر قسم کے رنج و فکر سے آزاد اور آرام و اطمینان کی

لہ مندرجہ ذیل ضرب المثل سے بھی جو عورتوں کی ہجو کے موقعہ پر استعمال کی جاتی ہے یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ بعض عورتیں اس طرح بھی مزہ دستی ہوتی تھیں: تریا چلتر جانے نہ کوئے خصم مار کے ستی ہوئی" س م ح چارڈن - ہے اڈیشن -

حالت میں اس کی وہ بلند ہمتی اور بغیر کسی قسم کی گھبراہٹ اور پریشانی کے اپنی، گیا، کہ وہ گھاس پھوس اور پتلی پتلی لکڑیوں کو اوپر نیچے چن کر چتا پر بنائی گئی تھی دیکھ بھال کرنا اور پھر شوہر کا سر گود میں لے کر اس میں بیٹھنا اور ایک مشعل لے کر خود اپنے ہاتھ سے اس میں اندر کی طرف سے آگ لگانا۔ اور پھر نہ معلوم کتنے برہمنوں کا باہر کی طرف سے اس کو جلانا ٹھیک ٹھیک بیان کر سکوں! حقیقت یہ ہے کہ نہ تو اپنے بیان سے اس دردناک واقعہ کی کیفیتوں کا کامل خاکہ ہی آپ کے سامنے کھینچ سکتا ہوں اور نہ اُس حالت ہی کو کچھ بیان کر سکتا ہوں۔ جو اس حادثہ کو دیکھتے وقت میرے دل پر گذری اور یہ ہیبت ناک واقعہ اب تک مجھے ایسا یاد ہے کہ گویا میری آنکھوں کے آگے ہے۔ اور شدت اندوہ سے اگرچہ چاہتا ہوں کہ خواب و خیال کی طرح اُسے بھلا دوں مگر ہرگز نہیں بھول سکتا۔

جبراً ستی کرنے کے واقعات میں نے چند ایسی بدنصیب بیواؤں کی مصیبت بھی دیکھی ہے جو چتا کی شکل دیکھتے ہی بھاگنے لگی تھیں۔ اور اس حالت کو دیکھکر میرے دل کو بالکل یقین تھا کہ اگر یہ بے درد برہمن ستی ہونے سے انکار کر دینے کی اجازت دیں تو وہ بخوشی تمام اس سے رُک جائیں۔ مگر یہ کمبخت اِن خوف زدہ اور اجل گرفتہ عورتوں کو ستی ہو جانے کی خاطر صرف ترغیبیں اور بڑھاوے ہی نہیں دیتے بلکہ اُن کو زبردستی آگ میں ڈال دیتے ہیں۔ چنانچہ میرے سامنے ایک غریب جوان عورت اسی طرح زبردستی آگ میں ڈال دی گئی تھی۔ اسی طرح میں نے ایک اور بیچاری بدنصیب عورت کو دیکھا کہ اُس کے اردگرد جب آگ بھڑکنے لگی تو اُس نے نکل بھاگنا چاہا۔ مگر اِن دیو سیرت جلادوں کے لمبے لمبے بالنوں کے مارے نکل نہ سکی۔

چتا سے بھاگ نکلنے کی سزا لیکن یہ عورتیں ان خونی برہمنوں کی آنکھ سے بچ کر کبھی نکل بھی جاتی ہیں۔ چنانچہ میری ایک حسین عورت کے پاس اکثر آمد و رفت رہتی تھی جس نے خاکروبوں کی مدد سے اپنی جان بچائی تھی۔ یہ لوگ جب سنتے ہیں کہ ستی ہونے والی جوان اور حسین عورت ہے اور اُس کے گھر والے چنداں نام آور اور ذی مقدور نہیں ہیں اور صرف گنتی کے آدمی اڑوسی پڑوسی اُس کے ساتھ ہوں گے تو وہاں بکثرت جمع ہو جاتے ہیں۔ لیکن جو عورت یہ سامانِ مرگ دیکھکر ہمت ہار دیتی ہے۔ اور ان لوگوں کی مدد سے اس بن آئی موت سے بچ نکلتی ہے تو یہ اُمید وہ ہرگز نہیں کر سکتی کہ اپنی زندگی کے

ذاتی وقت فارغ البالی سے کاٹنے کی یا ہندو لوگ اس کے ساتھ عزت اور محبت سے برتاؤ کریں گے۔ بلکہ وہ پھر کبھی اُن میں نہیں مل سکتی اور کوئی ہندو کسی وقت اور کسی حالت میں بھی اس عورت سے جس نے خود کو اس طرح بے عزت کر ڈالا ہو ہرگز میل جول نہیں کرتا۔ اس طرح انتہائی بدنام اور مطعون ہو جاتی ہے۔ اور عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اُس کی اس حرکت نے ہندو دھرم کو کلنک لگا دیا۔ اس لئے وہ ہمیشہ اپنے نئے کمین اور رذیل.. محافظوں کی بدسلوکیاں سہتی اور زندگی کے دن پورے کرتی ہیں۔

جب کوئی ستی چتا پر جا پہنچے تو کسی مغل کو یہ جرأت نہیں ہوتی کہ اُس کی جان بچائے یا کہ جب وہ برہمنوں کے پنجے میں سے بھاگ نکلی ہو اُس کو پناہ دینے کی جوکھوں اُٹھائے۔ کیونکہ ایسا کام کرتے ہوئے یہ لوگ ڈرتے ہیں۔ البتہ پرتگیزوں نے بعض بندرگاہوں میں جہاں اُن کا زور زیادہ تھا بہت سی بیواؤں کو بچا لیا ہے۔

ایک کم سن لڑکی میں کچھ بیان نہیں کر سکتا کہ ان حرکات کو دیکھکر غصہ کے مارے میری طبیعت کا کیا حال ہوتا تھا۔ اور میں کس جوش سے چاہتا تھا کہ کوئی اختیار ان کمبخت برہمنوں کے استیصال کا ہاتھ آ جائے۔ چنانچہ لاہور میں میں نے ایک نہایت خوبصورت کم سن بیوہ کو ستی ہوتے دیکھا۔ جس کی عمر بارہ برس سے زیادہ نہ ہوگی۔

یہ بدنصیب لڑکی جب چتا کے پاس آئی تو خوف کے مارے اُس پر مُردنی چھا گئی۔ اور میں بیان نہیں کر سکتا کہ وہ کس طرح کانپتی اور بلک بلک کر روتی تھی۔ لیکن تین برہمنوں اور ایک بڑھیا نے جس نے اُسے گود میں لے رکھا تھا زبردستی اُسے چتا پر بٹھا ہی دیا اور اُس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے تاکہ بھاگنے نہ پائے۔ اور اس طرح پر اُس بیچاری معصوم کو جلا کر خاک کر دیا۔ اُس وقت کچھ نہ پوچھئے کہ غصہ کے مارے میرا کیا حال تھا۔ اور میں نے کس طرح سے اپنے آپ کو تھاما۔ لیکن چونکہ کچھ بس نہ تھا ناچار دل ہی دل میں کڑھتا تھا کہ ہائے غضب یہ لوگ کیسے قابل نفرت توہمات میں گرفتار ہیں اور میں نے شاعر کے یہ اشعار جو اُس نے۔ ایگے ممنن[1] کی بیٹی[1] ایفیجینیا کے باب میں کہے تھے۔ جس کو اُس کے باپ نے ڈائنا[1] پر قربانی

[1] ڈاکٹر برنی اَر کے اس خط میں ڈائنا۔ ایگے ممنن اور ایفیجینیا کا ذکر چونکہ قصہ طلب باتیں ہیں اس لئے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا اور کتاب جام جم وغیرہ سے ان کا علیحدہ علیحدہ ذکر اس جگہ لکھ دینا مناسب معلوم ہوا۔

پڑھایا تھا۔ ان کے حسب حال پائے۔

لیٹن کے اشعار کا خلاصہ

٭ ایسی چیزوں کے نیست و نابود کر دینے میں بھی جو خوبصورت اور اچھی تھیں بعض اوقات

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔

ڈائنا

ڈائنا قدیم زمانہ کے یونانیوں اور رومیوں کی ایک دیوی تھی جس کو وہ شکار وغیرہ کی دیوی کہتے تھے۔ اور اُس میں مار ڈالنے اور بچا لینے کی دونوں قدرتیں تصور کرتے تھے اور اس مناسبت سے اُس کی صورت ایک ایسی سرو قد کنواری اور جوان عورت کی سی بناتے تھے جس کے سر کے بال گردن کے پیچھے تک پڑے ہوئے ہوں اور داہنے ہاتھ میں ترکش میں سے تیر نکالتی اور بائیں ہاتھ سے بارہ سنگی کو جو بھاگنا چاہتا ہو سینگ سے پکڑے ہوئے اور پاؤں تک ایک لمبی پوشاک پہنے ہوئے ہو۔ اور اس خیال سے کہ وہ چاند کی اوتار ہے۔ اُس کے ماتھے کو ہلال سے سجاتے تھے۔ ایشیا کوچک کے لوگ بھی اس کو پوجتے تھے مگر مثل ہندوستان کی وشنو دیوی کے یونانیوں کے عقیدہ کے برخلاف وہ اس کو صرف مخلوق کے پالنے والی خیال کرتے تھے۔ اور اس لئے اُس کی صورت ایک ایسی عورت کی سی بناتے تھے جس کی بہت سی چھاتیاں ہوں اور اُس کے پجاری خوجے ہوتے تھے۔ اس کا مندر جو شہر الفیسس واقع ایشیائے کوچک میں تھا لکھا ہے کہ دو سو بیس برس میں بن کر تیار ہوا تھا۔ اور اس مدت میں ایک سو ستائیس بادشاہوں نے اُس کی تعمیر کے واسطے روپیہ دیا تھا۔ یہ مندر چار سو پچیس فٹ لمبا اور دو سو پچیس فٹ چوڑا تھا اور سنگ مرمر کے ایک سو ستائیس ستونوں پر جو ساٹھ ساٹھ فٹ اونچے اور ڈیڑھ ڈیڑھ سو ٹن (ایک ٹن اٹھائیس من انگریزی کا ہوتا ہے) کے وزنی تھے بنایا گیا تھا۔ اور بیس ہزار آدمی اُس میں بفراغت بیٹھ سکتے تھے۔ تین سو چھپن برس قبل از سن عیسوی یعنی جس رات کو سکندر اعظم کی ولادت ہوئی ایس کوطرتوس نامی ایک شخص نے اس مجنونانہ خیال سے جلا ڈالا کہ اس حرکت سے اُس کا نام دنیا میں باقی رہے گا یہ مندر اگرچہ دوبارہ بھی بنایا گیا مگر ویسا نہ بنا اور پھر اس کو بھی گاتھ قوم کے لوگوں نے (جو پرانے جرمنی

لہ اے گ ے م م ن ٹ — ڈا یے ن اُ

لہ اِ ف ی ح ی ن ی آ

٭ دیکھو ایکٹ نمبر ۱ ۱۸۲۹ء مصدرہ گورنمنٹ ہند درباب امتناع رسم ستی — س م ح

الیفیسس ۔ اے ف ی س س — اراس طرتوس ۔ اڑاٹ طریٹ ڈش

مذہب نے بڑے بڑے بدکام کئے ہیں ۔ چنانچہ بیچاری نوجوان اِفِ یانا سا (یعنی انیجنیا) کو کس بے دردی سے ڈائنا کی قربان گاہ پر قربانی کرنے کو بٹھا دیا گیا تھا ۔ افسوس ! یہ مذہب انسان سے کیسے بدکام کرا دیتا ہے ۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ ۔ ایک مشہور لڑاکا اور وحشی قوم تھی ، ۱۵۶ء میں جلا ڈالا اور اس کے بعد پھر کسی نے اس کو تعمیر نہیں کیا ۔ شہر ایفیسس شہر ازمیر[۲] سے جو ایشیائے کوچک میں فی الحال سلطنت ترکیہ عثمانیہ کا ایک حاکم نشین مقام ہے ستائیس میل جنوب کی طرف ہے اور ہمارے زمانہ میں اُس کا نام ایاز[۳] لوک مشہور ہے ۔

اگمنن اور انیجنیا

قدیم زمانہ میں بحیرہ شام کے کنارے ایشیائے کوچک میں ٹرائے[۱] ایک نہایت عظیم الشان شہر تھا جس کے گرد نہایت مضبوط پچاس ہاتھ اونچی دیوار جس کا محیط چار میل تھا بنی ہوئی تھی ۔ پولڈا کیز[۵] ملقب بہ پرائم[۲] جب یہاں کا راجہ ہوا تو اس نے اپنے دشمن یونانیوں کے پاس اپنے بیٹے پیرس[۷] نامی کو صلح کا پیام دے کر بھیجا ۔ پیرس نے یہ نالائق حرکت کی کہ سپارٹا[۸] کے راجا منی لاس[۹] کی رانی ہیلن[۱۰] کو بھگا لایا ۔ اس پر یونان کے تمام راجاؤں کو نہایت غصہ آیا اور اس امر کا بدلہ لینے کو اُن کی متفقہ فوج جو ایک لاکھ آدمی کے قریب تھی ایک ہزار ایک سو چھیاسی جہازوں پر بندرگاہ اَلِس[۱۱] سے جو یونان کے صوبہ بوہیا[۱۲] میں ہے سوار ہوئے اور منی لاس کا بھائی اگمنن ان کا سپہ سالار بنا اتفاق سے ایک بارہ سنگا جو ڈائنا کا خاص جانور سمجھا جاتا تھا ۔ اگمنن کے ہاتھ سے شکار میں مارا گیا ۔ اور اس کے بعد موافق ہوا بند ہو گئی اور جو لوگ جہازوں میں ایک قسم کی وبا سے مرنے لگے جس کو اپنی جہالت سے انھوں نے ڈائنا کی خفگی سے منسوب کیا اور اگمنن نے بارہ سنگا مارنے کی ہتیا کا پراشچت (یعنی کفارہ) تجویز کیا کہ اپنی بیٹی انیجبینا کو ڈائنا پر قربانی چڑھانا چاہا ۔ جس وقت قریب تھا کہ وہ قربانی ہو جائے تو ڈآینا نے خوش ہو کر انیجنیا کو معاف کر دیا ۔ اور اُس کے عوض کوئی اور بدنصیب عورت قربانی کی گئی ! اور یونانی اپنے جہاز ٹرائے کی طرف بڑھا لے گئے اور دس برس کے محاصرہ کے بعد شہر میں داخل ہو کر باشندوں کو قتل کر ڈالا اور شہر کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا ۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ واقعہ ۱۱۸۴ قبل از سنہ عیسوی وقوع میں آیا تھا ۔ انتہیٰ س م ع

(۱) گ اتھ (۲) ازم ی ر (۳) آئی ازل وک (۴) ٹ رائے (۵) اپ وڈ اک ی ز
(۲) پ ر ا م (۷) پ ے رس (۸) س پ ا رٹ ا (۹) م ن ی ل اس
(۱۰) ہ ے ل ن (۱۱) آ ل س (۱۲) ی وُ ب ی ُا

زندہ درگور

میں نے ابھی پورا ذکر ان کی وحشت اور سنگ دلی کا نہیں کیا۔ کیونکہ ہندوستان کے بعض حصوں میں تو یہ غضب ڈھاتے ہیں کہ جلا کر ستی کر دینے کے عوض عورت کو اول رفتہ رفتہ گردن تک زمین میں گاڑ دیتے ہیں اور پھر دو تین برہمن یکایک اس کی منڈیا مروڑ ڈالتے ہیں۔ اور جب دم نکل جاتا ہے تو مٹی کی ٹوکریاں ڈال کر پاؤں سے دبا دیتے ہیں۔

ہندوؤں کا اپنے مُردوں سے سلوک

داغ دے کر لاش کو دریا میں بہا دینے کی رسم

اکثر تو یہی دستور ہے کہ ہندو اپنے مُردوں کو جلاتے ہیں۔ مگر بعض ایسا بھی کرتے ہیں کہ دریا کے کنارے مُردے کے کسی عضو کو گھاس پھوس سے جھلس کر ایک اونچے اور سیدھے کنارہ سے پانی میں ڈھکیل دیتے ہیں۔ چنانچہ میں نے اس داغ دے کر بہا دینے کی رسم کو گنگا کے کنارے کئی مرتبہ دیکھا ہے۔ لاش کے ادھر اُدھر چیلوں اور کوؤں کی ٹکڑیاں کی ٹکریاں منڈلاتی رہتی ہیں۔ اور یہ پرندے اور دریا کی مچھلیاں اور مگرمچھ اُس سے اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔

قریب المرگ بیمار کی غرقابی

بعض ایسا بھی کرتے ہیں کہ قریب المرگ بیمار کو دریا کے کنارے لے آتے ہیں اور اُس کے پاؤں پانی میں رکھکر بتدریج اُس کو گردن تک ڈبوتے ہیں۔ اور جب سمجھ لیتے ہیں کہ اب مرنے ہی کو ہے تو سارا بدن ڈبو دیتے ہیں۔ اور اُس کو وہیں چھوڑ کر اور رو پیٹ کر چلے آتے ہیں۔ اس رسم کا جس کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے یہ مدعا ہے کہ اس طرح تمام گناہ جن سے مُردے کی روح اپنی جسمانی تعلق کے وقت ناپاک ہو رہی تھی دھوئے جاتے ہیں۔ یہ بے معنی خیال عام لوگوں ہی پر منحصر نہیں بلکہ میں نے بڑے بڑے مشہور پڑھے لکھے شخصوں کو بڑے زور شور سے اس کی تائید کرتے سُنا ہے۔

ہندو فقیر

گرو یا مہنت

ہندوستان کے فقیروں اور درویشوں میں جو بے شمار اور طرح طرح کے ہیں اور ہندوؤں کے مذہبی فرقوں میں بہت سے ڈیرے اور اکھاڑے ہوتے ہیں۔ جن میں ایک ایک گرو یا مہنت ہوتا ہے جس کے سامنے اُس کے چیلوں سے یہ عہد و پیمان لئے جاتے ہیں کہ پارسائی اور ترک دنیا اور عاجزی سے گرو کی اطاعت میں رہ کر زندگی

بسر کریں۔

جوگیوں کی خوفناک زندگی

یہ لوگ ایسے عجیب ڈھنگ سے عمر بسر کرتے ہیں کہ اگر میں اُس کو بیان کروں مجھے شک ہے کہ آیا اُس پر کوئی اعتبار بھی کرے گا۔ خصوصاً میرا اشارہ اُن لوگوں کی طرف ہے جو جوگی کہلاتے ہیں۔ اور جس کے معنی ہیں خدا رسیدہ۔ بہت سے جوگی بالکل ننگے، رات دن اکثر توتالابوں کے پاس بڑے بڑے درختوں کے نیچے یا مندروں کے اردگرد کے مکانوں میں راکھ کا بستر کئے بیٹھے یا پڑے رہتے ہیں۔ بعض کی جٹیں پنڈلیوں تک لٹکتی ہیں۔ اور اُلجھکر اُن میں اس طرح گرہیں پڑجاتی ہیں جس طرح پر کہ ہمارے ملک کے پشمی کتوں کے بالوں میں (خصوصاً جن کو وہ آزار ہو جس کو پولش ڈسیز کہتے ہیں) پڑی ہوتی ہیں۔ بہت سے جوگی ایک یا دونوں ہاتھ اوپر کو اُٹھائے رکھتے ہیں۔ ناخنوں کو اس قدر بڑھاتے ہیں کہ بڑھکر مڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک شخص کے ناخن میری چھنگلیا کے نصف سے جس سے میں نے اُن کو ناپا تھا زیادہ تھے۔ ان کے بازو ایسے سخت اور غیر طبعی ریاضت کی حالت میں کافی غذا نہ پہنچنے کے سبب اُن لوگوں کی طرح جو مزمن بیماریوں میں مبتلا رہ کر مرجاتے ہیں۔ سوکھ کر نہایت دُبلے پتلے ہو جاتے ہیں۔ اور رگوں اور پٹھوں کے خشک اور سخت ہو جانے کے باعث اس قابل نہیں رہتے کہ جھکا کر اُن سے کچھ منہ میں ڈال سکیں۔ اُن فقیروں کے پاس ان کے چیلے حاضر رہتے ہیں جو ان کو مہاتما سمجھکر ان کا بڑا ادب کرتے ہیں۔ جوگیوں کا ننگا اور کالا جسم لمبے لمبے بال دُبلی اور پتلی بانہیں اور بل کھائے ہوئے ناخن اور وہ ڈراونی وضع جو میں نے بیان کی ہے اس عالم سفلی میں اس سے زیادہ متھور شکل خیال میں نہیں آسکتی۔

ناننگے فقیر

میں نے عموماً بعض بعض راجاؤں کے راج میں ان ناننگے فقیروں کی اکثر ٹولیاں کی ٹولیاں دیکھی ہیں۔ جن کے دیکھنے سے ڈر لگتا ہے۔ بعض کے تو ہاتھ (جیسے کہ اوپر بیان ہو چکا ہے) اوپر کو اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ بعض کے دہشت ناک بال، یا تو کھلے لٹکتے ہیں یا سر کے گرد بندھے ہوئے اور بل دیئے ہوئے ہوتے ہیں۔ بعض کے پاس ایک بڑا بھاری سونٹا ہوتا ہے۔ اور بعض کے کاندھے پر شیر کی خشک اور نا ملائم کھال ڈالی ہوئی ہوتی ہے۔ اور اس دیش سے میں نے اُن کو سخت بے حیائی کی حالت میں بالکل ننگے بڑے بڑے شہروں میں پھرتے دیکھا ہے۔

اور جیسے کہ ہمارے فرانس کے گلی کوچوں میں کسی راہب کو پھرتے دیکھکر کوئی خیال بھی نہیں کرتا ویسے ہی یہاں مرد عورتیں اور لڑکیاں ان کو کچھ تعجب کی نگاہ سے نہیں دیکھتیں بلکہ عورتیں بڑے اعتقاد سے ان کو خیرات لاکر دیتی ہیں۔ اور اُن کو یہ یقین ہے کہ یہ لوگ بڑے ہی مقدس اور سب سے زیادہ پارسا اور نفس کو قابو میں رکھنے والے ہیں۔

صوفی سرمد کا قصہ میں عرصہ تک سرمدؔ نام ایک مشہور فقیر سے جو دہلی کے بازاروں اور گلی کوچوں میں ننگا مادرزاد پھرا کرتا تھا نفرت کرتا رہا۔ اُس نے نہ تو اورنگ زیب کی دھمکیوں ہی کو مانا اور نہ اُس کے وعدوں ہی کو۔ اور آخر اسی وجہ سے کہ اُس نے کپڑے پہننے سے بڑی ضد کے ساتھ بالکل انکار ہی کردیا اُس کا سر اُتار اگیا[1]

[1] سرمدؔ کاشان کا رہنے والا اور قوم کا یہودی تھا مگر مسلمان ہوگیا تھا اور صاحب علم اور تجارت پیشہ تھا۔ لکھا ہے کہ جب یہ بتقریب تجارت اپنے وطن ایران سے شہر ٹھٹھہ واقع ملک سندھ میں آیا تو ایک مہاجن کے لڑکے پر جس کا نام ابھے چند تھا عاشق ہوگیا اور تمام مال و دولت کھو بیٹھا اور دیوانگی کی سی حالت ہوگئی رفتہ رفتہ وہ لڑکا بھی مال و دولت سے ہاتھ اُٹھا اُسی کے رنگ میں رل گیا۔ اور شاہجہاں کے عہد میں دونوں بالاتفاق دہلی میں آئے۔ اُس وقت کے اکثر لوگ اُس کو بڑا خدارسیدہ اور عارف موحد اور صاحب کشف سمجھتے تھے۔ چونکہ داراشکوہ بھی جو فقیر دوست تھا۔ اکثر سرمد کے پاس آتا جاتا۔ اور پادشاہ سے اُس کے کشف و کرامات کے تذکرے کرتا رہتا تھا اس لئے شاہجہاں نے عنایت خاں نامی ایک امیر کو اُس کے تفحص حال کے واسطے مامور کیا اور اُس نے سرمد کو دیکھ بھال کر بطور عرض حال آکر یہ شعر پڑھا ؎ برسرمد برہنہ کرامات تہمت است ؍ کشفے کہ ظاہر ست از و کشف عورت است ۔ جب شاہجہاں کو اورنگ زیب نے قید کرلیا۔ اور داراشکوہ گرفتار ہوکر قتل کیا گیا تو ملا شیخ عبدالقوی کو جو بڑا عالم تھا اور اعتماد خاں کا خطاب اور پنج ہزاری کا منصب رکھتا تھا حکم ہوا کہ سرمدؔ کو کپڑے پہننے کا حکم دے۔ پس سرمد طلب ہوا اور ملاّ نے اُس سے پوچھا۔ کہ "عریاں چرامی باشی" سرمدؔ نے اُس کا یہ ظریفانہ جواب دیا کہ "شیطان قوی است"۔ پس ملاؤں اور علماء کی اتفاق رائے سے اس کے قتل کا فتوٰی لکھا۔ اور بادشاہ نے اُس کو منظور کیا۔ لکھا ہے کہ جب جلاّد تلوار لے کر سامنے آیا تو سرمدؔ نے کہا "سرجدا کرد از تنم شوخیکہ بامایار بود ، قصہ کوتہ کرد ورنہ دردسر بسیار بود" اور عاقل خاں رازی نے اپنی مختصر تاریخ عالمگیری میں لکھا ہے۔ کہ جب جلاد قتل کرنے لگا تو سرمد نے نہایت بے تکلفی اور بے غمی کی حالت میں اخیر وقت یہ شعر پڑھا۔ "عریانی تن بود غبار رہ دوست ؍ آں نیز بہ تیغ از سرما وا کردند" سرمد کو شعر گوئی میں بھی

...گیوں کی عبادت اور ریاضت

بہت سے فقیر لمبی لمبی تیرتھ جاترا کرتے ہیں اور اس موقعہ پر وہ صرف ننگے ہی نہیں ہوتے بلکہ بڑی ی ... ہے کی زنجیروں سے جیسی کہ ہاتھیوں کے پاؤں میں پڑی ہوئی ہوتی ہیں ۔ لدے ہوتے ... تے ہیں ۔میں نے بہت سے فقیروں کو دیکھا ہے کہ جو کسی خاص تپسیا کی خاطر سات آٹھ روز تک بغیر اس کے کہ کبھی بیٹھ جائیں یا پڑ جائیں سیدھے کھڑے رہتے ہیں ۔ اور بجز اس کے کرات کے وقت چند گھنٹے ایک طناب کے سہارے آگے کو جھک جاتیں اور کوئی سہارا نہیں لیتے اور اس عرصہ میں اُن کی پنڈلیاں سوج کر رانوں کے برابر ہو جاتی ہیں ۔ بعض کو میں نے دیکھا ہے کہ گھنٹوں ہاتھوں کے بل سر نیچے اور پاؤں اوپر بڑے استقلال سے کھڑے رہتے ہیں۔ میں ایسی ہی اور بہت سی حالتوں کے نام لے سکتا ہوں جن میں کہ یہ بدنصیب لوگ اپنے جسم کو بے فائدہ دُکھ دیتے ہیں ۔ ان میں سے بہت سی صورتیں تو ایسی سخت اور مشکل ہیں کہ ہمارے ملک کے نٹ بھی ان کی تقلید نہیں کر سکتے ۔ اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ یہ تمام باتیں تقوٰی اور دین داری کے ایک مفروضہ خیال سے کی جاتی ہیں ۔ حالانکہ ہندوستان کے کسی حصہ میں بھی تقوٰی اور دینداری نے اپنا سایہ تک نہیں ڈالا ۔

جب میں پہلے پہل ہندوستان میں آیا تو اِن لوگوں کے یہ بے حد توہمات دیکھکر حیران رہ گیا ۔ اور کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ان کی نسبت کیا رائے قائم کروں ، بعض اوقات تو مجھے یہ خیال گذرتا تھا کہ یہ فقیر اگر حکمائے قدیم یونان کے اُس بُرلنے اور بدنام فرقے کے جن کا نام سینیکس[1] (یعنی کلبیین) تھا بانی نہیں ہیں تو اُن کا بقیہ تو ضرور ہیں ۔ بشرطیکہ ان میں نیت آ...

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ : اچھا دخل تھا ۔ چنانچہ اُس کا دیوان رباعیات جو چھوٹا سا ہے ۔ انھیں دنوں یعنی ۱۹۰۱ء میں جب کہ یہ کتاب تیار کی جا رہی ہے شہر دہلی میں چھپ بھی گیا ہے ۔ سرمد کی قبر مسجد جامع دہلی کے قریب ہی ہے اور لوگ اس پر اکثر پھول چڑھاتے اور روشنی وغیرہ کرتے رہتے ہیں ۔ اور سرمد کے قتل کی نسبت اب تک عام گمان یہ ہے کہ محض داراشکوہ کی دوستی اس بیچارہ کے قتل کا باعث ہوئی تھی ۔ فقط س م ح

[1] زبان یونانی میں لفظ سے نک کے معنی کتے کے ہیں ۔ اور حرف (س) علامت جمع کی ہے چونکہ اس قدیم فرقے کے حکما کو اپنے اس طرز زندگانی پر بڑا گھمنڈ تھا کہ ہم مال و دولت اور علوم فنون اور ... سےنکس (س ے ن ک س) کلبیین (ک ل ب ی ی ن)

اور جہالت کے سوا اور کوئی بات دیکھ پاتا۔ یا اگر مجھے ان میں آدمی کی ظاہری شکل صورت کے سوا کوئی بات انسانیت کی بھی دکھائی دیتی۔ کبھی مجھے یہ خیال گذرتا تھا کہ اگرچہ یہ گمراہ ہیں مگر ہیں سچے فقیر۔ لیکن آخرکار معلوم ہوگیا کہ حقیقت میں یہ لوگ تقوٰی اور تقدس سے جہاں تک خیال کیا جائے بالکل مُعرّا ہیں۔ میں نے پھر یہ خیال کیا کہ آوارہ گردی اور سستی اور مطلق العنانی کی زندگی ان پر قوی اثر رکھتی ہے۔ اور ان کو بھلی معلوم ہوتی ہے۔ یا یہ کہ خود پسندی جو انسان کے ہر کام میں لگی ہوئی ہے۔ اور جو دیو جانس[1] کی پھٹی پرانی گدڑی میں

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ حرفت، وصناعت اور لہو و لعب سے نفرت کرتے ہیں اس لئے یہ لحاظ ان کی ترش روئی اور بدمزاجی کے ان کا یہ لقب پڑ گیا تھا۔ س م ح۔

[1] دیو جانس یہ حکما یونان میں مشہور حکیم گذرا ہے۔ مذکورہ بالا سے نکت فرقہ میں سے تھا اور اسی وجہ سے اہلِ عرب اُس کو دیو جانس کلبی کہتے ہیں۔ یہ شہر کارنتھ کا رہنے والا تھا اور چارسَو بیس برس قبل از مسیح پیدا ہوا تھا اور چھیانوے برس کا ہوکر ۳۲۳ء قبل از مسیح میں فوت ہوا۔ یہ تارک الدنیا تھا اور موٹے جھوٹے کپڑے پہنے اور ایک لکڑی کا پیپا سر پر اُٹھائے ننگے پاؤں پھرا کرتا تھا اور جو کچھ مل جاتا کھا لیتا۔ اور جہاں جاتا سو رہتا اور کبھی اس لکڑی کے پیپہ میں بیٹھ کر آرام لے لیتا تھا! لکھا ہے کہ جب سکندرِ اعظم نے شہر کارنتھ کو فتح کیا اور اُس کی ملاقات کو گیا تو اس وقت یہ سو رہا تھا۔ سکندر نے ٹھوکر مار کر کہا کہ تو پڑا سوتا ہے اور تیرا شہر میں نے فتح کرلیا۔ اُس نے جواب دیا کہ شہروں کا فتح کرنا پادشاہوں کا کام ہے۔ لیکن لات مارنا گدھوں کی خصلت ہے۔ سکندر نے خفا ہوکر کہا کہ شاید تو یہ سمجھتا ہے کہ تجھکو کبھی مجھ سے غرض نہ پڑے گی اور یہ ممکن نہیں ہے اُس نے کہا کہ مجھکو اپنے غلام کے غلام سے کبھی غرض نہ پڑے گی۔ سکندر نے پوچھا وہ کون ہے؟ کہا تو! کیونکہ حرص و شہوت کو میں نے اپنا غلام بنا رکھا ہے اور تو اُن کا غلام ہے۔ ایک روز سکندر نے اس سے پوچھا کہ نیکی کس طرح حاصل کی جاسکتی ہے؟ جواب دیا نیک کام کرنے سے اور تو تو ایک دن میں وہ کچھ حاصل کرسکتا ہے جو اور لوگ برسوں میں نہیں کرسکتے۔ لکھا ہے کہ ایک روز سکندر جو اُس کی ملاقات کو گیا تو یہ اپنے اُس لکڑی کے پیپہ پر بیٹھا ہوا دھوپ کھا رہا تھا۔ سکندر نے کہا کہ کوئی خدمت فرمایئے۔؟ جواب دیا کہ بس یہی خدمت ہے کہ آپ یہ سے ہٹ جائیں اور میری دھوپ نہ روکیں فقط ماخوذ از تاریخ التواریخ و جام جم س م ح

ایسی ہی صاف معلوم ہوتی تھی جیسی کہ افلاطون[1] کے خوش نما لباس میں ان تمام انجوبہ کاریوں کی پوشیدہ محرک ہوگی۔

تپسیا کا پھل

میں نے سُنا ہے کہ یہ فقیر بڑی بڑی سخت تپسیا اس اُمید کرتے ہیں کہ ہم اگلے جنم میں راجہ ہو جائیں گے اور اگر راجہ نہ بھی ہوئے تو ہماری حالت ایسی ترجیح ہوگی کہ ہم کو ان سے بھی زیادہ آرام و عیش حاصل ہوں گے۔ لیکن جیسا کہ میں ان سے اکثر میں کہا کرتا تھا یہ کیونکر یقین کیا جا سکتا ہے کہ اگلی زندگی کی خاطر اِس زندگی کو مصیبت سے کاٹا جائے۔ حالانکہ وہ زندگی بھی بالصرور ایسی ہی مختصر اور بے تحقیق ہوگی جیسی کہ یہ زندگی ہے۔ اور جس میں زیادہ آرام اور خوشی ملنے کی اُمید نہیں کی جا سکتی۔ خواہ کوئی شخص اودے پور کے رانا ہی کے رتبہ کو کیوں نہ پہنچ جائے اور خواہ اُس کی حالت ہندوستان کے مطلق راجاؤں جے سنگھ اور جسونت سنگھ ہی کے مشابہ کیوں نہ ہو جائے۔ میں نے اُن سے کہدیا کہ میں تو ایسی جلدی

[1] افلاطون چار سو برس قبل مسیح میں پیدا ہوا تھا۔ اور اکیاسی برس کا ہوکر اس دنیا سے رخصت ہوا۔ یہ سقراط کا شاگرد اور ارسطو کا استاد تھا۔ پس اسی سے سمجھ لینا چاہیے کہ یہ کیسا شخص تھا۔ ابتدائے عمر میں اس کو کشتی اور شعر گوئی کا شوق تھا۔ اور بہت ہی خوب شعر کہتا تھا۔ مگر سقراط کی نصیحت سے شعر کہنا چھوڑ دیا اور تحصیل فلسفہ کی طرف متوجہ ہوا اور اول سقراط سے اور اُس کی وفات کے بعد مصر وغیرہ میں تحصیل علوم کرتا رہا۔ یہ بہت خوبصورت خوش وضع اور خوش اخلاق آدمی تھا اور اپنے اور بیگانہ سے برابر احسان اور نکوئی سے پیش آتا تھا اس نے مختلف علوم میں چھوٹی بڑی اکسٹھ اپنی تصنیفات دنیا میں چھوڑیں۔ مرنے کے بعد یہ اس باغ میں دفن کیا گیا جو اُس کی ملکیت تھا۔ اور اُس کی متروکات مانی پینے کا ایک پیالہ ایک لوٹا اور سونے کا ایک کان کا بُندا تھا جس کو بچپن میں پہنا کرتا تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ اس دنیا کا کوئی بنانے والا اور بغیر کسی نمونہ کے پیدا کرنے والا ہے جو ہمیشہ سے بغیر کسی سہارے کے موجود ہے۔ اور اپنی تمام مخلوقات کو جانتا ہے۔ اور ازل میں اس کے وجود کے ساتھ کوئی علی وجود نہ تھا اگرچہ مثالیں جن سے اُس کی مراد چند مجرد اور بسیط چیزیں ہیں جو پہلی ہوئی ہیں اور تمام محسوس اور مادی صورتیں انھیں کلیات بسیط کی جزئیات ہیں اور اس جہان میں جو کچھ موجود ہے وہ اس جہان یعنی عالم مثال کا نمونہ ہے اور یہ کہ ہر اثر کے لئے ایسے موثر کا ہونا ضروری ہے جو کسی نہ کسی طور پر اُس اثر سے مشابہت رکھتا ہو مطلب یہ کہ عالم مثال یا عالم مجردات عالم کلی ہے اور عالم مادی یا عالم مرکبات عالم جزی ہے۔ اور جو کچھ اس عالم جزی میں ہے وہ اُس عالم کلی کا نمونہ ہے۔ (ماخوذ از ناسخ التواریخ) س م ع

تمہارے فریب میں آتا نہیں۔ کیونکہ یا تو تم سخت احمق ہو یا تم مفسدا ماروں کی گرفت میں ہو۔ جن کو تم ہوشیاری کے ساتھ دنیا سے چھپاتے ہو۔

خدا رسیدہ جوگی

بعض فقیروں کی نسبت مشہور ہے کہ وہ بڑے روشن ضمیر شمت اور کامل جوگی اور حقیقت میں خدا رسیدہ ہیں اور ان کی نسبت بالکل تارک الدنیا ہونے کا گمان ہے۔ یہ فقیر ہمارے راہبوں کی طرح آبادی سے دور کسی باغ میں تنہا زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور شہر میں کبھی نہیں آتے۔ کوئی ان کو بھوجن لا کر دیدے تو لے لیتے ہیں۔ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ بغیر بھوجن کے بھی یہ مہاتما ساوھو زندہ رہ سکتے ہیں اور اپنی پہلی فاقہ کشیوں اور نفس کشیوں کی بدولت یہ خدا کے بھروسہ پر جیتے ہیں۔

یہ مقدس جوگی اکثر مراقبہ میں محو رہتے ہیں۔ ان کا یہ ادعا ہے اور ایک فقیر نے جسے لوگ بہت ہی مانتے تھے خود مجھ سے کہا کہ ہماری روحیں گھنٹوں بے خودی اور استغراق کی حالت میں رہتی ہیں۔ ہمارے حواس ظاہری معطل ہو جاتے ہیں۔ اور جوگیوں کو خدا کا دیدار حاصل ہوتا ہے جو ایک ناقابل البیان سفید اور روشن نور کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ اور ہم کو دنیا کے الجھیڑوں سے ایسی نفرت ہو جاتی ہے۔ اور سرور خالص کی حالت میں ہم ایسے محو ہو جاتے ہیں جو قابل بیان نہیں۔ اور میرے ان مقدس سنت صاحب نے جو مجھے یہ کیفیت بتا رہے تھے کہا کہ میں جب چاہتا ہوں گھنٹوں ایسی محویت کی حالت میں چلا جاتا ہوں۔

جو لوگ جوگیوں کے پاس آتے جاتے ہیں اُن میں سے کسی کو ان لاف و گزاف کے استغراقات کے سچ ہونے میں کلام نہیں۔ مگر میرے خیال میں یہ امر ممکن ہے کہ انسان کا دل ہمیشہ کی تنہائی اور فاقہ کشیوں کی وجہ سے کمزور ہو کر اس قسم کے تخیلات میں پڑ جاتا ہوگا۔ یا ان فقیروں کے یہ استغراقات اُن طبعی بے خودیوں کے مشابہ ہوں گے۔ جن کی نسبت کارڈن[1] کا قول ہے کہ وہ جب چاہتا تھا اس حالت میں ہو جاتا تھا۔

---

[1] جے روم کارڈن ملک اٹلی[2] کا رہنے والا سنہ ۱۵۰۱ء میں پیدا ہوا تھا اور اپنے زمانہ کا ایک مشہور طبیب اور ریاضی داں اور فلسفی تھا۔ اس عجیب شخص کی سوانح عمری بھی عجیب ہے۔ اس کا باپ شہر میلان میں ایک اچھا ذی مقدور شخص تھا مگر جے روم اپنی سوانح عمری میں لکھتا ہے کہ میں روز ولادت سے مصیبتوں اور افلاس میں رہا ہوں۔ مورخین لکھتے ہیں کہ یہ اپنے باپ کا شرعی بیٹا نہ تھا اور جب وہ حمل میں تھا تو اُس

---

[1] جے روم کارڈن [2] اٹلی

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ ، کی ماں نے ہرچند اسقاط کے لئے کئی دفعہ کوششیں کیں مگر یہ سخت جان بچہ ہرگز نہ نکلا اور آخرکار جب نکلا تو اس طرح پر کہ اُس کی ماں کا پہلو چیر کر نکالا گیا۔ روز پیدائش سے یہ بچہ ارسطو ضعیف القوٰی تھا اور اس کے علاوہ اس کے باپ کے گھر میں اس کے ساتھ کئی طرح کی بدسلوکیاں بھی ہوتی رہتی تھیں۔ مگر تحصیل ریاضیات میں اس نے پھر بھی بہت بڑی ترقی کی۔ اور اگرچہ ابتدا میں فرانسس کن گروہ کے تارک الدنیا درویشوں میں شامل ہوگیا تھا۔ مگر تھوڑے دنوں بعد اس نے اُس گوشہ نشینی کے طریق کو ترک کرکے بہت شوق سے علم طب اور علم فلسفہ کو حاصل کرنا شروع کیا یہاں تک کہ اٹلی کے ایک مشہور و معروف مدرسہ طبی سے ایم۔ڈی۔ کی ڈگری یعنی خطاب ڈاکٹری حاصل کیا۔ اس مدرسہ میں یہ ایسا مستعد طالب علم تھا کہ اپنے مدرس کی غیر موجودگی میں اقلیدس اور منطق کی جماعتوں کو خود تعلیم دیا کرتا تھا اور آخر اس کے علم و فضل و طبابت کی شہرت اس قدر ہوئی کہ اُس وقت کے بڑے امرا اور بادشاہوں سے بھی اس کی ملاقاتیں ہوتیں اور کئی جگہ اُمرا نے اپنے طبی مدارس میں اس کو مدرس وغیرہ بھی مقرر کیا۔ مگر اس کا قدیمی رفیق افلاس اس کے ساتھ تھا۔ یہاں تک کہ ایک بار ۱۵۷۰ء میں زیر بلائے قرض کے باعث کچھ عرصہ تک قید بھی رہا۔ اور جب وہاں سے رہائی پائی تو پوپ گریگوری سیزدہم کے پاس چلا گیا۔ جس نے ازراہ قدردانی اس کو اپنے مدرسۃ الاطبا کا ایک ممبر مقرر کرکے گذراوقات کے لئے کچھ پنشن بھی کردی۔ اور اس نے بقیہ عمر شہر روم ہی میں بسر کی اور اپنی کتاب سوانح عمری لکھنے کے بعد ۱۵۷۶ء میں قضا کی۔ یہ شخص احکام نجوم کا اس قدر معتقد تھا کہ ایک بار اُس نے ملک اسکاٹ لینڈ کے ایک مشہور و معروف پادری کو جو سخت مریض تھا۔ اور جس کو جرمنی کے بڑے بڑے نامی ڈاکٹر جواب دے چکے تھے اپنے معالجہ سے تندرست کیا۔ مگر اپنی اس کامیابی کی نسبت اس کو بھی خیال تھا کہ چونکہ میں نے اُس کی جنم پتری کے حساب کو خوب طرح سمجھ کر علاج کیا تھا محض اسی وجہ سے یہ فائدہ ہوا ہے۔ اس کے شدت اعتقاد نجوم کی نسبت اس کے زمانہ کے دو مشہور عالموں نے ایک یہ روایت بھی کی ہے کہ اُس نے اپنی جنم پتری کی رو سے اپنی عمر کی ایک حد قرار دے رکھی تھی۔ پس جب وہ وقت قریب آیا چونکہ یہ بھلا چنگا تھا اور کوئی بیماری وغیرہ نہ تھی جس سے مرگ کا گمان ہو سکتا اس وجہ سے یہ خیال پیدا ہوا کہ مبادا میری جنم پتری کا حساب غلط ہو جائے۔ اس لئے اس قدر بھوکا مرنا شروع کیا کہ آخر جنم پتری کی بدولت مرگیا۔ اس کی تصانیف کے رسالے اور کتابیں طبعیات۔ ریاضیات علم ہیئت۔ فن احکام نجوم۔ فصاحت و بلاغت۔ تاریخ اخلاق۔ منطق۔ نیچرل ہسٹری یعنی علم ماہیت و حقائق طبیعیات۔ موسیقی۔ علم الادویہ فن تشریح وغیرہ میں ایک سو بائیس ہیں۔ اور ان میں طرح طرح کے مضامین

جوگیوں کا گیان دھیان یہ خیال اس وجہ سے قریب القیاس ہے کہ یہ لوگ اپنے ان اشغال میں کسی نہ کسی کرتب کو دخل دیتے ہیں۔ چنانچہ حواس کو بتدریج روکنے کی غرض سے وہ اپنے لئے خاص خاص قاعدے مقرر کرتے ہیں۔ مثلاً اُن کا بیان ہے کہ بہت دنوں تک کھانا پینا ترک کرنے کے بعد کسی تخلیہ کی جگہ میں تنہا بیٹھنا اور بڑے استقلال سے نظر کو آسمان کی طرف جمانا چاہیئے۔ اور جب کچھ عرصہ تک اس کے عامل ہو جائیں تو پھر دونوں آنکھوں کو بتدریج نیچے کیا جائے اور اس طرح دھیان جمائیں کہ ایک ہی وقت میں ناک کی سپھنگل اور ناک کے دونوں اطراف برابر دکھلائی دینے لگیں۔ اور یہ تصور کا طریق علی الاتصال اس وقت تک جاری رکھنا چاہیئے جب تک کہ نور عرفان صاف جلوہ گر ہو جائے۔ یہ تصور اور مراقبہ اور اُس کے حاصل کرنے کا طریقہ ہندو جوگیوں اور مسلمان صوفیوں میں ایک بڑی بھاری راز کی بات ہے اور میں اس کو راز اس لئے کہتا ہوں کہ وہ ان باتوں کو آپس ہی میں پوشیدہ رکھتے ہیں۔ اور ایک ہندو پنڈت کی مدد کے بغیر جس کو دانشمند خاں نے نوکر رکھ لیا تھا اور جو اپنے آقا سے کوئی بات چھپا نہ سکتا تھا مجھ کو یہ معلومات ہرگز حاصل نہ ہوتیں اور ایک یہ بھی وجہ ہے کہ میرا آقا صوفیوں کے مسائل سے پہلے ہی سے واقف تھا۔

ان فقیروں کی صورتیں جو بظاہر درویشانہ نظر آتی ہیں۔ اس کا بڑا سبب میرے گمان میں یہ ہے۔ کہ ریاضات شاقہ اور مدتوں کے برت اور فاقہ کشیاں اور سخت حالت افلاس ان کو دیکھنے میں ایسا بنا دیتی ہیں۔

ہمارے یورپ کے ولایتیوں اور راہبوں کو ہرگز یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ وہ ان باتوں میں ہندو جوگیوں یا دیگر ممالک ایشیا کے مذہبی فرقوں سے وہ کبھی فوقیت لے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ ہیں۔ مگر اس شخص نے مسائل علمیہ کے ساتھ اپنے مبالغہ آمیز تخیلات اور بیہودہ تصوفات کو ان سب میں شامل کر دیا ہے۔ اور بسبب اس کے کہ وہ سن طفولیت سے آخر عمر تک بدسلوکیاں اور مصیبتیں جھیلتا رہا تھا اُس کے مزاج میں تلخی و تندی اور انتقام پسندی کی عادت تھی اور اس کی خصلت اور مزاج اس درجہ نرالا اور انوکھا تھا کہ لوگ اس کو عموماً پاگل اور خبطی کہتے تھے اور وہ اپنے آپ کو نوع انسان سے بالکل علیحدہ سمجھتا تھا اور اس عجیب بات کا اُس کو پکا یقین تھا کہ میرے سامنے ہمیشہ ایک ایسی شے جس کو میں بخوبی پہچانتا ہوں حاضر رہتی ہے اور اُس کے باعث سے میں جب چاہتا ہوں عالم ارواح سے بات چیت کر لیتا ہوں۔ (ماخوذ از انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا) [illegible]۔

طریق عبادت وریاضت اور روزہ داری وغیرہ میں ارمنی قبطی یونانی نسطوری بے کاف یعنی یعقوبی اور سے روئیث عیسائیوں کو بہ نظر مقابلہ دیکھا جائے تو ہمارے یورپین زاہد بالکل مبتدی معلوم ہوں گے۔ مگر ہاں اس تجربہ کی رو سے جو مجھے ہندوستان میں ہوا ہے یہ بات ضرور قابل تسلیم ہے کہ فاقہ اور روزہ رکھنے کی جس قدر تکلیف فرنگستان کے سرد ملکوں میں ہوتی ہے ہندوستان وغیرہ میں اُتنی نہیں معلوم ہوتی۔

شعبدہ باز جوگی اب میں ایسے فقیروں کا ذکر کرتا ہوں جو اُن فقیروں سے جن کا بیان اوپر ہوچکا ہے بالکل مختلف ہیں۔ مگر ہیں یہ بھی عجیب لوگ۔ یہ ہمیشہ تمام ملک میں برابر پھرتے رہتے ہیں اور ہر چیز کو فضول بتلاتے ہیں اور یہ ظاہر کرتے ہیں کہ گویا اُن کی زندگی بڑی بےفکری سے بسر ہوتی ہے۔ وہ بڑے رازداں ہونے کا ادّعا کرتے ہیں۔ عموماً لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ مقبول بندے سونا بنانا جانتے ہیں۔ اور پارہ کو ایسے عمدہ طریقہ سے تیار کرسکتے ہیں کہ ہر صبح کو ایک دو چاول کے برابر کھانے سے بیمار آدمی تندرست اور توانا ہوجاتا ہے۔ اور معدہ اتنا قوی ہو جاتا ہے کہ شوق سے جتنا چاہے کھائے آسانی سے ہضم ہو جاتا ہے اور صرف یہی نہیں ہے۔ بلکہ اس قسم کے دو جوگی جب کہیں آپس میں مل بیٹھتے ہیں اور اُن میں تقابل کا جوش پیدا ہوتا ہے تو اپنے فن کی ایسی عجیب عجیب طاقتیں ظاہر کرتے ہیں کہ مجھے شک ہے کہ آیا سیمن میگس[1] بھی باوجود اپنی تمام شعبدہ بازیوں کے ایسے عجیب کام کرسکتا تھا یا نہیں۔ وہ کسی شخص کے دل کا بھید بتلا دیتے ہیں اور گھنٹہ بھر میں درخت کی ایک شاخ کو زمین میں گاڑ کر اُس میں پتے اور پھول پھل لگا دیتے ہیں۔ اور پاؤ گھنٹہ سے کم عرصہ میں انڈے کو بغل میں سے کر جس جانور کی فرمائش کی جائے۔ وہی پیدا کر دیتے ہیں جو کمرے میں اِدھر اُدھر اُڑنے لگتا ہے اور بہت سے اور ایسے ہی تماشے کرتے ہیں جن کے بیان کی ضرورت نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ لوگ جو کچھ ان شعبدہ بازوں کی نسبت بیان کرتے ہیں میں اُس کے سچ ہونے کے باب میں اپنی شہادت نہیں دے سکتا۔ میرے آقا نے ان میں سے ایک کو بلایا اور وعدہ کیا کہ اگر تو کل میرے دل کی بات بتلا دے گا تو میں تین تو روپے تجھے دوں گا۔ اور اس خیال سے کہ میری طرف سے بے ایمانی کا گمان نہ ہو میں اُس بات کو ابھی تیرے روبرو کاغذ پر لکھ دوں گا اسی وقت میں نے بھی یہ کہا کہ اگر تو میرے

---

[1] اس شخص کا حال باوصف تلاش کے کہیں نہیں ملا۔ س م ح

دل کی بات تبلاوے گا پچیس روپے میں بھی نذر کروں گا۔ مگر وہ غیب گو پھر ہمارے مکان کے پاس بھی نہ پھٹکا۔ ایک مرتبہ پھر میں نے ایک شعبدہ باز کو کسی بات پہ بیس روپئے دینے کا وعدہ کیا مگر میں پھر بھی محروم و مایوس ہی رہا۔ اگرچہ میں ان کی ہر بات کی کنہ کو پہنچنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ میری بدقسمتی تھی کہ بیچ کبھی کوئی ایسا عجیب تماشا نہ دیکھا جو سمجھ میں نہ آسکے۔ اور جب میں کسی ایسے تماشے کے قریب جا نکلتا تھا جس کو دیکھکر لوگ متحیر تھے تو یہ عموماً میری بدقسمتی تھی کہ میں اُن سے بہت سے سوال کیا کرتا اور اُن کا امتحان کئے جاتا تا وقتیکہ مجھے معلوم نہ ہو جاتا کہ اُس میں کیا فریب یا کیا ہتھ پھیری ہے۔

مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں نے ایک شخص کا فریب پکڑ لیا تھا۔ جس نے دعویٰ کیا تھا کہ کٹورا گھمانے کی ترکیب سے میں اُس شخص کا نام بتلا دوں گا۔ جس نے میرے آقا کا روپیہ چرایا تھا۔

جین مت کے سادھو

لیکن بہرحال ایسے فقیر بھی ہیں جو ان فقیروں سے جن کا ہم ذکر کرتے آئے ہیں بہت چپ چاپ اور شائستہ صورت معلوم ہوتے ہیں۔ اور اُن کی زندگی کا طرز اور طریق عبادت بھی اتنا فضول نہیں ہے۔ یہ ایک دھوتی باندھے ہوئے جو ان کے گھٹنوں تک ہوا کرتی ہے اور ایک سفید چادر اوڑھے ہوئے جو دائیں بغل کے نیچے سے ہوکر بائیں کاندھے پر پڑی رہتی ہے سروپا برہنہ گلیوں اور بازاروں میں پھرا کرتے ہیں۔ اور اس کے سوا اور کوئی کپڑا ان کے بدن پر نہیں ہوتا مگر اِن کے جسم ہمیشہ دُھلے ہوئے ہوتے ہیں اور وہ صاف ستھرے معلوم ہوتے ہیں[۱]۔ عموماً وہ بڑے اعتدال کے ساتھ دو دو ہوکر پھرتے ہیں اور ہاتھ میں ایک چھوٹا سا خوبصورت مٹی کا پیالہ[۲] ہوتا ہے۔ جس کے تین پائے اور دو دستے ہوتے ہیں۔ یہ اور فقیروں کی طرح دُکان دکان مانگتے نہیں پھرتے بلکہ بے تکلف ہندوؤں کے گھروں میں چلے جاتے ہیں جہاں اُن کی بڑی آؤ بھگت ہوتی ہے۔ اور ان کے آنے کو گھر والے باعث برکت سمجھتے ہیں۔

---

[۱] یہ لوگ نہاتے تو نہیں البتہ کپڑا اتر کرکے بدن کو اس سے ہمیشہ صاف کر لیتے ہیں۔ س م ح

[۲] یہ ظرف مٹی کا تو کم اور اکثر روغن کیا ہوا ایک کاٹھ کا برتن مثل لوٹے کے ہوتا ہے جس کے اکثر نہایت چھوٹے چھوٹے تین پائے بھی ہوتے ہیں اُس کو ان کی اصطلاح میں پاتلا اور پاتری کہتے ہیں۔ س م ح

ان پاک فقیروں اور گھر کی عورتوں میں جو معاملات در پردہ ہوتے ہیں۔ اگرچہ اُن کو سب لوگ جانتے ہیں مگر جو کوئی ایسا الزام اُن کو لگادے تو اُس کا خدا ہی حافظ ہے مگر اس بات کو اس ملک کی رسم خیال کیا جاتا ہے اور اسی وجہ سے ان کے تقدس میں کچھ فرق نہیں آتا۔ گھروں کی عورتوں کے ساتھ ان فقیروں کے جو جو معاملات رہتے ہیں اُن کے بیان پر میں چنداں زور دینا نہیں چاہتا۔ کیونکہ ہم اور آپ سب جانتے ہیں کہ ایسی حرکتیں صرف شہنشاہ مغلیہ ہی کی سلطنت میں نہیں ہوتیں۔ لیکن درحقیقت جو بات مضحکہ خیز ہے وہ یہ ہے کہ یہ بے ادب ہمارے پادریوں مقیم ہندوستان کے ساتھ اپنا مقابلہ کرتے ہیں۔ بعض اوقات میں ان کی خود پسندی اور ضعیف العقلی سے خوب اپنا جی بہلا لیا کرتا تھا اور ان سے بڑے خُلق اور مدارات سے بولتا۔ اور بظاہر بڑا ادب کرتا تھا۔ چنانچہ فوراً آپس میں ایک دوسرے کی طرف اشارہ کرکے وہ یوں کہنے لگتے تھے "یہ فرنگی جانتا ہے کہ ہم کون ہیں یہ کئی سال ہندوستان میں رہ چکا ہے اور خوب جانتا ہے کہ ہم ہندوؤں کے پادری ہیں"

ہندوؤں کے قوانین مذہبی اور علوم وفنون

میں ان فقیروں کا بہت کچھ ذکر کرچکا اور اب مجھے ان کے دھرم شاستر اور اور علوم کی پوتھیوں کا ذکر کرنا چاہیے۔ اگرچہ میں زبان سنسکرت سے جو اب ہندوستان کے خاص پنڈتوں اور غالباً قدیم زمانہ کے کل برہمنوں کی عام زبان تھی ناآشنا ہوں اور باوجود اس کے سنسکرت کی پوتھیوں کا ذکر کرتا ہوں تو یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ میرے آقا دانشمند خاں نے کچھ تو میری درخواست سے اور کچھ اپنے شوق کی خاطر ہندوستان کے ایک مشہور پنڈت کو نوکر رکھ لیا تھا جو پہلے شاہجہاں کے بڑے بیٹے داراشکوہ کی سرکار سے متعلق تھا۔ تین سال کے عرصہ میں اُس نے اور کئی بڑے بڑے ودیادان پنڈتوں سے میری ملاقات کرادی تھی جن کو وہ اپنے ساتھ لے آیا کرتا تھا۔ جب میں اپنے آقا کو پیکیٹ[۱] اور ہاروے[۲] کے علم تشریح کی معلومات جدیدہ کا حال سُناتے سُناتے تھک جاتا اور

---

[۱] ڈاکٹر پے کیٹ ایک فرانسیسی طبیب تعلیم یافتہ مدرسہ مونٹ پیلیر واقع فرانس کا تھا اس نامور محقق نے ۱۶۴۷ء میں برخلاف عقیدہ جمہور اطبا ر متقدمین کے یہ نئی بات دریافت کی

گیسنڈی اور ڈسکارٹس[۱] کے فلسفہ پر جس کا میں نے اپنے آقا کے لئے فارسی میں ترجمہ کر دیا تھا اور پانچ چھ سال تک خصوصیت سے میرا یہی شغل تھا، گفتگو کرتے کرتے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ مطلب یہ کہ جگر کو خون بنانے سے کچھ تعلق نہیں۔ بلکہ عروق ماساریقا سے صفوت کیلوس اول بشکل ایک سفید رطوبت کے ایک بڑی رگ میں سے ہو کر قلب کے دائیں خانہ میں جا کر مبدل بہ خون ہو جاتی ہے!

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ ۳؎ ڈاکٹر ولیم ہاروے انگریز تھا یکم اپریل ۱۵۷۸ء شہر فوک سٹون واقع صوبہ کینٹ میں پیدا ہوا۔ انیس برس کی عمر میں کیمبرج کالج سے بی اے کی ڈگری حاصل کر کے شہر پاڈوا واقع ملک اٹلی کے مدرسہ طبی میں جو اس زمانہ میں اس فن کا بہت مشہور مدرسہ تھا داخل ہوا۔ اور بڑے بڑے نامی اُستادوں سے تعلیم پا کر چوبیس برس کی عمر میں ایم ڈی کی ڈگری حاصل کی اور وہاں سے اپنے وطن انگلینڈ میں واپس آکر لندن میں سکونت اختیار کی۔ ۱۶۱۵ء میں یہ شخص انگلستان کے ایک طبی مدرسہ میں فن تشریح اور جراحی کا لیکچرار مقرر ہوا۔ اور یہاں اس نے اپنی تحقیقات کے جدید مسئلہ دورانِ خون کو ظاہر کیا۔ اور کئی برس تک اپنے اور یورپ کے اور ملکوں کے ڈاکٹروں کے ساتھ بحث مباحثہ کر کے اس مسئلہ کو ثابت کر دکھایا۔ ڈاکٹر ہاروے اپنی لیاقتوں کے باعث انگلستان کے بادشاہ جیمس اول کا طبیب مقرر ہوا اور اس کے بعد بادشاہ چارلس اول کے ہاں بھی بہت قابل اعتماد رہا۔ اور جب کہ اس کی شہرت و ناموری تمام فرنگستان میں پھیل چکی تھی تیسری جون ۱۶۵۷ء کو اسی برس کی عمر میں مرض فالج سے قضا کی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں محققوں کے ان نئے مسائل خصوص ہاروے کے مسئلہ دوران خون نے فن طب میں ایسے عجیب انقلاب پیدا کئے ہیں کہ گویا طبابت قدیم کے اصول ہی کو بدل ڈالا ہے۔ (ماخوذ از انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا۔ س م ح

۱؎ ڈس کارٹس جس کو ڈی کارٹس بولتے ہیں مشاہیر حکمائے فرانس سے ہے۔ جو ۱۵۹۶ء میں پیدا ہوا تھا اور ۱۶۵۰ء میں مرا۔ یہ پہلا شخص تھا جس نے علم مناظرہ مرایا کے مسائل کو دلائل سے ثابت کیا۔ اور خواص مقناطیس کے باب میں کثیر تجربات حاصل کئے اور اپنے مخصوص نظریات کی وجہ سے مجدد علم فلسفہ مشہور ہے۔ اثبات نفس ناطقہ کی بحث میں اس نے یہ لکھا ہے کہ ہم ہر شئے کے وجود کی نسبت شک کر سکتے ہیں لیکن اپنے شک کے وجود کی نسبت شک نہیں کر سکتے اور شک کرنا خود بمنزلہ مدرک ہونے کے ہے اور مدرک ہونا

---

(۱) ف و ک س ش و ن (۲) ک پ ے ن ٹ

تنگ ہو جاتا تھا تو اُس وقت ہم اپنے پنڈت کی طرف مخاطب ہو کر کہتے تھے کہ ہاں پنڈت جی۔ اب آپ کی باری ہے۔ اپنے طور پر بحث کیجئے اور اپنے افسانے سُنا ئیے۔ چنانچہ وہ نہایت ہی سنجیدگی کے ساتھ۔ یہاں تک کہ اثنائے گفتگو میں کبھی تبسم تک نہ کرتا اپنی باتیں سناتا تھا۔ لیکن آخر کار ہم اُس کی کہانیوں اور بچکانہ دلیلوں سے بیزار ہو گئے

چار شاستر ہندوؤں کا یہ ادعا ہے کہ خدا نے جس کو وہ اچر[1] (یعنی غیر متحرک) کہتے ہیں ہمارے واسطے چار بید[2] بھیجے ہیں (بید ایک لفظ ہے جس کے معنی علم

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ: صاحب ادراک کے وجود کی دلیل ہے پس ہمارا یہ کہنا کہ ہم ہیں۔ یا ہم ذی وجود ہیں ایک ایسا جملہ ہے کہ جب ہم اس کو زبان پر لائیں یا اس کے تصور کو دل میں جگہ دیں ہر حال میں اس کی صحت پر ہم کو اطمینان حاصل رہتا ہے اور اس کہنے سے ہم کو صرف اپنے وجود ہی کا علم ہوتا ہے بلکہ اپنے ذی ادراک ہونے کا بھی علم ہوتا ہے اور اس کے بعد کہتا ہے کہ چونکہ ہم اپنے وجود میں ایک ایسی غیر مادی شے پاتے ہیں جو ہر ایک نقصان سے منزہ ہے تو اس کے لئے کسی علت کا ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ علت کے بغیر معلول کا وجود ناممکن ہے۔ اور چونکہ ناقص کامل کی علت نہیں ہو سکتا اس لئے ہم جو ایک مادی اور ناقص وجود ہیں اُس کی علت نہیں ہو سکتے اور اس لئے ضرور ہے کہ ہمارے سوا اُس کی علت کوئی اور ایسا ذی وجود ہو جس کی عظمت اور کمال اور قدرت کے متعلق یہ معلول ہمیں خبر دیتا ہے کہ یہ وہ ذی وجود جس نے اپنے اس معلول کے ذریعہ ہمارے نفس پر اپنا ایک نشان منقش کر دیا ہے۔ مگر اس نشان سے خود اس علت کا وجود مُراد نہیں ہے پس ہمارا ہونا ہم کو خدا کے ہونے کی بھی خبر دیتا ہے۔ س۔ م۔ ح

[1] مترجم انگریزی نے اپنی زبان کے لہجہ کے موافق غالباً غلطی سے لفظ اکبر کو جس کے معنی خدا کے ہیں اچر سمجھا ہے۔ اور اسی بنیاد پر اصل کتاب میں توسین کے اندر اس کے معنی غیر متحرک کے لکھے ہیں۔ کیونکہ مصنف کی تحریر میں جو حروف سی ایچ حرف شین قرشت کے تلفظ کے لئے مستعمل ہوئے ہیں اُن کا اکثر یہ تلفظ زبان انگریزی میں حرف چے یعنی جیم فارسی کا ہے۔ س م ح

[2] جس طرح برہما کی عمر کا شمار بے انتہا برسوں سے کیا جاتا ہے اسی طرح بیدوں کی نسبت اہل ہند کا یہ ادعا ہے کہ لاکھوں برس سے ہیں۔ مگر یورپ کے محققوں نے بڑی چھان بین کے بعد ان کی تالیف کا زمانہ چودھویں صدی قبل از مسیح قرار دیا ہے اور ان کی اس رائے کا صحیح ہونا نہایت وثوق کے ساتھ ایک مقام سے جس کو سر ایڈورڈ کالبروک صاحب نے بیدوں ہی میں دریافت کیا ہے صحیح ٹھہرتا ہے۔

کے ہیں) چنانچہ اُن کا قول ہے کہ بید میں سب علوم ہیں اول بید کا نام اتھربن بید ہے دوسرے کا یجُر بید، تیسرے کا رگ بید چوتھے کا سام بید۔

چار برن بید کا قول ہے کہ تمام لوگ جیسے کہ وہ حال میں ہیں چار قوموں پر تقسیم ہوگئے اول برہمن یعنی حاملان شریعت دوسرے چھتری یعنی جنگ جو، تیسرے وَیش یعنی سوداگر اور دوکان دار جن کو عرف عام میں بنیا بولتے ہیں۔ چوتھے شودر یعنی دست کار اور مزدور۔ اور ان مختلف قوموں کو آپس میں شادی کرنے کی اجازت نہیں ہے یعنی برہمن کی چھتری کے ہاں شادی نہیں ہو سکتی۔ علیٰ ہذا اور قوموں کی نسبت بھی یہی حکم ہے۔

تناسخ ارواح کا عقیدہ ہندو لوگ تناسخ ارواح یعنی آواگون کے مسئلہ کے قائل ہیں اور جان داروں کے مارنے اور کھانے کو حرام سمجھتے ہیں۔ مگر چھتری اس سے مستثنیٰ ہیں بشرطیکہ وہ گائے اور مور کا گوشت نہ کھائیں۔ کیونکہ ہندو ان دو جانوروں کا بڑا ادب کرتے ہیں۔ خصوصاً گائے کا اس خیال سے کہ اُس کی دُم پکڑ کر ہی اُس دریا (یعنی بے ترنی) سے پار ہو سکتے ہیں جو دنیا اور آخرت کے مابین حائل ہے۔ ممکن ہے کہ جن لوگوں نے پرانے وقتوں میں ایسے قانون بنائے تھے انھوں نے مصر کے چرواہوں کو اسی طرح بائیں ہاتھ سے بھینس یا گائے کی دُم پکڑے ہوتے اور اُن کے ہانکنے کے لئے دائیں ہاتھ میں لاٹھیاں لئے ہوئے دریائے نیل سے پار ہوتے دیکھا ہوگا یا گائے کا ایسا بڑا لحاظ غالباً اس وجہ سے ہوگا کہ وہ ایک نہایت ہی فائدہ بخش جانور ہے اور دودھ اور گھی جو اُن کی اہم غذا ہے اسی سے حاصل ہوتا ہے اور یہ کہ بیل زراعت کا بڑا بھاری ذریعہ ہے۔ اور اس وجہ سے گویا کہ گائے بیل اُن کی زندگی کے محافظ ہیں یہ بات بھی قابلِ بیان ہے کہ چراگاہوں کی قلت کی وجہ سے ہندوستان میں بہت سے مویشی

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ چنانچہ اس کی تشریح وہ یوں لکھتے ہیں کہ ہر بید میں علم ہیئت کا ایک ایک رسالہ اس غرض سے لگا ہوا ہے کہ تہوار کی ترتیب معلوم ہو اور اُس سے فرائض منصبی کے اوقات دریافت ہو جایا کریں۔ پس وہ صریح اور قطعی دلیل جس پر اُنھوں نے اپنی مذکورہ بالا رائے قائم کی ہے یہ ہے کہ جو مقام راس سرطان اور راس جدی کا اس رسالہ میں قرار دیا ہے وہ وہی مقام ہے جو چودھویں صدی قبل از سنہ مسیح میں ان دونوں راسوں کا تھا۔ پس کچھ شک نہیں ہے کہ بیدوں کی تالیف اسی زمانہ میں ہوئی تھی۔ (ماخوذ از تاریخ ہند مولفہ الفنسٹن صاحب) س م ع۔

پالنا بھی مشکل ہے۔ کیونکہ سال میں آٹھ مہینے گرمی ایسی سخت پڑتی ہے اور زمین ایسی خشک رہتی ہے کہ مویشی بھوک کے مارے سوروں کی طرح تمام قسم کے خس و خاشاک اور نجاستیں چر جاتے ہیں۔ پس اگر ہندوستان میں فرانس اور انگلستان کی طرح گوشت کھایا جائے تو تمام جانور یکسر ختم ہو جائیں اور ملک بالکل بے زراعت رہ جائے۔

گاؤکشی کی ممانعت کا حکم چنانچہ قلت مویشی ہی کی وجہ سے جہانگیر نے برہمنوں کی درخواست پر چند سال کے لئے گاؤکشی کی ممانعت کردی تھی۔ اور تھوڑا ہی عرصہ گذرا کہ انھوں نے ایک ایسی ہی عرضی اورنگ زیب کو بھی دی تھی اور اُس کی منظوری کی خاطر بہت سا نذرانہ دینا چاہتے تھے۔ اور ظاہر کیا تھا کہ پچھلے پچاس ساٹھ سال میں جو ملک کے بہت سے حصے ویران اور بے کار رہے اس کی وجہ یہی تھی کہ بیل کم اور گراں قیمت تھے۔ شاید ہندوستان کے قدیم اچارجوں کو جنھوں نے ایسے قوانین بنائے تھے یہ اُمید ہوگی کہ گوشت کھانے کی ممانعت کر دینے سے لوگوں کی عادات میں ایک مفید اثر پیدا ہوگا اور جب اُن کو قطعاً یہ حکم دیا جائے گا کہ وہ جانوروں کے ساتھ ہمدردی سے پیش آئیں تو وہ آپس میں بھی بے رحمی کے مرتکب نہ ہوں گے تناسخ کا مسئلہ بھی جانوروں کے ساتھ نیک برتاؤ کرنے کا باعث ہوا کیونکہ ان کو یہ یقین ہے کہ کسی جانور کو مار ڈالنا یا کھا لینا اپنے باپ دادا کو مار ڈالنے کے برابر ہے۔ اور اس سے بڑھکر اور کوئی گناہ کیا ہو سکتا ہے۔ اور ممکن ہے کہ برہمنوں کو یہ خیال بھی ہوا ہو کہ ہمارے ملک میں بجز جاڑے کی مختصر مدت کے گائے بیل کا گوشت لذیذ اور صحت بخش بھی نہیں ہوتا۔

ترکال سندھیا اور اشنان بید کی بمو جب ہر ہندو کو فرض ہے کہ رات دن میں تین مرتبہ صبح دوپہر اور شام کو مشرق کی طرف منہ کر کے پوجا اور تین ہی مرتبہ اشنان کرے اور کم سے کم کھانے سے پہلے تو ضرور ہی نہانا چاہیئے اور ٹھیرے ہوئے پانی کی نسبت بہتے پانی میں نہانا اور پوجا کرنا زیادہ ثواب کی بات ہے! یہاں غالباً پھر اسی بات کا لحاظ کیا گیا ہوگا جس کا ہندوستان جیسی گرم ولایت میں کیا جانا صرف مناسب ہی نہیں بلکہ ازبس فائدہ مند اور ضروری تھا مگر جو لوگ سرد ولایت میں رہتے ہیں یہ قانون اُن کے مناسب حال نہیں ہے۔ اور میں نے اپنے سفر کی حالت میں اکثر لوگوں

کو اس قانون کی پابندی کے باعث دریاؤں اور تالابوں میں کودتے اور غوطے لگاتے اور اگر یہ میسر نہ ہو تو سر پر پانی کے بڑے بڑے ڈول ڈالتے اور اس وجہ سے جان کے اندیشہ میں پڑتے دیکھا ہے۔ بعض اوقات میں نے اُن کے مذہب پر یہ اعتراض کیا کہ اس میں یہ ایک ایسا قانون ہے جس پر سردی کے موسم میں سرد ولایتوں میں عمل کرنا ناممکن ہے۔ بلکہ اسی سبب سے میرے جی میں صاف یہ بات آئی ہوئی تھی کہ یہ کچھ خدا کا حکم نہیں ہے اور صرف ایک انسانی ایجاد ہے انھوں نے یہ مضحکہ خیز جواب دیا کہ ہم یہ نہیں کہتے کہ ہمارا قانون ہر جگہ برتا جا سکتا ہے بلکہ خدا نے یہ محض ہمارے ہی واسطے بنایا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم غیر شخص کو اپنے مذہب میں نہیں ملا سکتے۔ اور ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ تمھارا مذہب جھوٹا ہے یہ تمھاری حالتوں اور حاجتوں کے مناسب ہوگا۔ کیونکہ خدا نے جنت میں جانے کے مختلف طریقے مقرر کر دیئے ہیں۔ میں نے ان کو اس بات کا یقین دلانا ناممکن سمجھا کہ تمام روئے زمین کے واسطے عیسائی مذہب ہی بنا ہے۔ اور تمھارا مذہب محض ایک قصہ اور بیہودہ بناوٹ ہے۔

دیوتاؤں کی پیدائش اور صفات بید کا قول ہے کہ جب خدا نے چاہا کہ دنیا کو پیدا کرے تو اپنے اس ارادہ کے پورا کرنے سے پہلے اُس نے یہ تین دیوتا پیدا کیے۔ برہما۔ بشن۔ مہادیو۔ برہما کے معنی تمام موجودات میں رچے ہوئے کے ہیں۔ بشن کے معنی تمام چیزوں میں موجود رہنے والے کے ہیں۔ مہادیو کے معنی بڑا دیوتا برہما کے ذریعہ سے اُس نے دنیا کو پیدا کیا۔ بشن کے وسیلہ سے وہ اُس کو قائم رکھتا ہے، اور مہادیو کے ہاتھوں وہ اس کو نیست و نابود کرے گا۔ اور خدا کے حکم سے برہما نے چار بیدوں کو وجود عطا کیا۔ چنانچہ اسی وجہ سے بعض مندروں میں برہما کی مورت چومکھی ہوتی ہے۔

بید اور مسئلہ تثلیث میری گفتگو ان یورپین پادریوں سے بھی ہوئی جن کو گمان تھا کہ ہندو بھی اُن اسرار سے جو تثلیث کے مسئلہ میں ہیں کچھ نہ کچھ آگاہ ہیں اور کہتے ہیں کہ بید میں صاف لکھا ہوا ہے کہ یہ تین وجود اگرچہ بظاہر تین ہیں مگر وہ در اصل ایک ہی خدا ہے۔

دیوتاؤں کی حقیقت یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جس کی نسبت میں نے پنڈتوں کو نہایت طولانی بحث کرتے سنا ہے۔ لیکن اُن کا بیان ایسا الجھا ہوا ہوتا ہے کہ ان کی رائے صاف طور پر میری سمجھ میں کبھی نہیں آئی۔ بعض اُن میں سے

یہ کہتے ہیں کہ تین وجود جن کا ذکر ہے حقیقت میں تین مستقل وجود ہیں۔ جن کو وہ دیوتا کہتے ہیں۔ مگر وہ یہ صاف صاف نہیں بیان کر سکتے کہ لفظ دیوتا سے اُن کی اس جگہ کیا مراد ہے اور جیسے کہ ہمارے قدیم بُت پرست جینائی اور نیومینا دونام لیا کرتے تھے اور میری رائے میں واضح طور پر وہ کبھی نہیں بیان کر سکتے تھے کہ اُن کی مراد ان الفاظ سے کیا ہے ایسے ہی ہندوستانیوں کے یہ دیوتا بمنزلہ اُس جینائی اور نیومینا کے ہوں گے۔ بعض نہایت ذی علم پنڈتوں نے گفتگو آنے پر یہ بیان کیا کہ خدا ایک ہی ہے اور یہ تین وجود ایک ہی خدا سے مراد ہے جو تین مختلف صفتوں سے تعبیر کیا جاتا ہے یعنی تمام چیزوں کا پیدا کرنے والا پالنے والا۔ اور نابود کرنے والا۔ لیکن اُنھوں نے یہ نہیں کہا کہ خدا بہ لحاظ ان تین علیحدہ علیحدہ صفتوں کے کسی قسم کے جدا جدا وجودوں کا اپنے وجود میں جامع ہے۔

فادر رُؤا[1] آنے جو آگرہ میں ایک جرمن جیسوٹ مشنری تھے اور سنسکرت خوب جانتے تھے مجھ سے کہا کہ ہندوؤں کی پوتھیوں میں صرف یہی نہیں لکھا کہ تین دیوتا مل کر ایک خدا بنتے ہیں۔ بلکہ یہ بھی کہ دوسرے دیوتا یعنی کشن نے نو مرتبہ اوتار لیا ہے۔ یعنی مجسم ہو کر دنیا میں ظہور کیا ہے۔ اُنھوں نے یہ بھی کہا کہ جب میں شہر روم کو واپس جاتا ہوا شیراز میں ٹھہرا وہاں کارمیلائٹ فرقہ کے ایک پادری نے بڑی عمدگی سے اس بات کی توضیح کی کہ ہندوؤں کے مندرجہ ذیل مسائل ہیں۔ ہندو کہتے ہیں اس وجہ سے اوتار لیا ہے کہ جو جو پاپ دنیا میں پھیلے ہوئے تھے۔ اُن سے لوگوں کو چھٹکارا دلایا۔ جس میں سے آٹھویں دفعہ کا اوتار لینا بہت مشہور ہے۔ کیونکہ ہندو کہتے ہیں کہ جب دنیا دشمنوں کی طاقت سے مغلوب ہوگئی تو کشن نے آدھی رات کے وقت کنواری لڑکی کے پیٹ سے پیدا ہو کر اوتار لیا اور دنیا کو نجات دی۔ اور اس تمام رات کو آسمان سے پھولوں کی بارش ہوتی رہی اور فرشتے گاتے رہے۔ یہ بات کسی قدر عیسائی مذاق کے موافق ہے مگر آگے بڑھکر یہ کہانی کچھ اور ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ساتھ ہی یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس اوتار نے ایک دیئت کو مارنا شروع کیا جو آسمان کی طرف اُڑ گیا اور وہ ایسا قوی ہیکل تھا کہ اُس نے آفتاب کو ڈھانک لیا۔ اور جب نیچے گرا تو تمام زمین کانپنے لگی اور وہ اپنے ہی بوجھ سے اس قدر زمین میں دھس گیا کہ فوراً جہنم میں جا گرا۔ اس قوی الجثہ دیئت کے ساتھ لڑتے لڑتے کشن جی خود بھی بھالوں سے زخم کھا کر گر گئے۔ لیکن ان کے گرنے سے تمام دشمن بھاگ گئے اور وہ پھر اُٹھے

اور دنیا کو اس بلا سے چھڑا کر آسمان پر چلے گئے۔ اور چونکہ ان کے پہلو میں زخم آ گیا تھا اس لئے وہ عموماً زخمی پہلو والے[1] کے نام سے مشہور ہیں۔ ہندو یہ بھی کہتے ہیں مگر بید سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی کہ لوگوں کو مسلمانوں کے ظلم سے بچانے کے واسطے دسواں اوتار اور ہوگا۔ اور ہم عیسائی لوگوں کے اندازہ کے بموجب یہ اُس وقت ہوگا جب کہ دجّال ظہور کرے گا۔ ہندو کہتے ہیں کہ مہا دیو بھی دنیا میں آتے ہیں۔ اور اُن کی نسبت یہ روایت ہے کہ کسی راجہ کی لڑکی جب سن بلوغ کو پہنچی تو اُس کے باپ نے پوچھا کہ تو کس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ اور جب اُس نے یہ جواب دیا کہ میں بجز کسی دیوتا کے اور کسی سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔ تو مہا دیو آگ کا روپ دھار کر راجہ کے سامنے آئے اور راجہ نے بیٹی کو اس پُر مسرت واقعہ کا حال کہلا بھیجا اور وہ بلا تامل شادی کرنے پر راضی ہو گئی۔ اور مہا دیو اس آگ ہی کی شکل میں راجہ کے دربار میں بلائے گئے اور جب اُنھوں نے دیکھا کہ راجہ کے وزیروں کی رائے شادی کی نسبت نہیں ہے تو اُنھوں نے اول اُن کی ڈاڑھیاں جلا ڈالیں اور پھر اُن سب کو معہ راجہ کے خاندان کے جلا کر بھسم کر دیا اور اس کے بعد راج کنیا سے شادی کر لی۔ بشن جی کی نسبت ہندوؤں کا یہ بیان ہے کہ اُن کا پہلا اوتار شیر کا، دوسرا شُور کا، تیسرا کچھوے کا، چوتھا سانپ کا۔ پانچواں صرف ایک ہاتھ بھر کی لونی۔ برہمنی کا چھٹا شیر کی شکل کے آدمی کا۔ ساتواں مچھ کا۔ آٹھواں جو اوپر بیان ہو چکا ہے۔ نواں بغیر دُم کے بندر کا اور دسواں اوتار ایک بڑے بہادر کا ہوگا[2]

---

[1] اگرچہ ہم نے اپنے بعض دوست پنڈتوں کی معرفت بہت سی کوشش کی کہ بشن پر اُن کی جس کتھا سے ڈاکٹر برنی ار نے یہ مضمون لیا ہے اُس سے موازنہ کر کے اس کی صحت اور تشریح کی جاتے۔ خصوصاً بشن سہنیر کے نام کے سلسلہ میں بشن کا وہ لقب صحیح کر کے لکھا جاتے جس کے معنی اُس کتھا کے لحاظ سے زخمی پہلو والے کے ہوں۔ مگر اطمینان کے لائق کوئی بات حاصل نہ ہوئی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح غیر ملک کے لوگ بعض اوقات غلطیاں کیا کرتے ہیں۔ اُسی طرح یہاں بھی کچھ خلط بحث ہو گیا ہے اور سری کرشن جی، جو بشن کے اوتار تھے کچھ تو اُن کی ولادت وغیرہ کی کتھا اور کچھ بشن کی کتھا کو باہم ایسے طور پر ملا دیا گیا ہے کہ جس سے کسی اصل کتھا کے ساتھ یہ بیان مطابق نہیں ہوتا۔ (س م ع)

[2] مصنف نے پادری رو آ کے قول کے موافق اوتاروں کی بابت جو یہ مضمون لکھا ہے اس میں کئی غلطیاں ہیں جن کو ہم پنڈتوں سے بڑی تحقیق کے بعد بیان کرتے ہیں۔ اول یہ کہ شیر کا اوتار کوئی نہیں ہوا۔ دوئم یہ

مجھے اس میں کچھ شک نہیں کہ فادر روا کو ہندوؤں کے مسائل کی واقفیت بیدوں سے حاصل ہوئی تھی اور انھوں نے جو کچھ مجھ سے بیان کیا۔ بے شک ہندوؤں کے مذہب کی یہی بنیاد ہے۔

مذہب ہنود پر تحریریں کچھ عرصہ ہوا کہ میں نے مذہب ہنود کی نسبت ایک رسالہ لکھا تھا اور ہندوؤں کے مندروں کے بتوں کی بہت سی مورتوں کی تصویریں معہ سنسکرت کے حرفوں کے اپنی اُس کتاب میں لگائی تھیں مگر میں نے دیکھا کہ میری کتاب کا جو لب لباب تھا وہ فادر کیرکر کی کتاب مسمیٰ بہ چائنا الیسٹریا میں موجود ہے۔ اور فادر کیرکر کو فادر روا سے جب وہ روم میں تھے معلومات کا ایک معتد بہ حصہ حاصل ہوا تھا۔ اس لئے میں آپ کو فادر موصوف کی کتاب کے مطالعہ کی صلاح دیتا ہوں مگر ہاں اس جگہ یہ بتانا ضرور سمجھتا ہوں کہ لفظ انکارنیشن (یعنی ظہور ثانی بحیثیت اوتار) جس کو اُس کو محترم فادر نے استعمال کیا ہے مجھکو نیا معلوم ہوا۔ کیونکہ پہلے میں نے اس لفظ کو ٹھیک ان معنوں میں بولے جاتے کبھی نہیں سُنا تھا۔

اوتار اور دیوتا کا مفہوم بعض پنڈتوں نے مجھ سے اپنا مسئلہ اس طرح بیان کیا کہ جن مختلف صورتوں کا اوپر ذکر ہوا ہے اگلے زمانہ میں ان میں خدا ظہور فرماتا رہا ہے۔ اور مندرجہ بالا عجائبات اُس نے انہیں صورتوں میں پورے کئے ہیں۔

بعض پنڈتوں کا یہ قول تھا کہ بڑے بڑے نامور سورما اور بہادروں کی روحیں

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ کہ بونے برہمن کا اوتار ہوا ہے برہمنی کا نہیں ہوا جیسا کہ پادری روا نے بیان کیا ہے۔ سوئم یہ کہ بغیر دُم کے بندر کا کوئی اوتار نہیں ہوا اور جیسا کہ آئین اکبری میں کافی شرح و بسط کے ساتھ درج ہے۔ ہندو شاستروں کے موافق اوتار دو قسم کے ہیں۔ اول پورن اوتار دوئم آنش اوتار۔ پورن اوتار وہ ہیں جو علیٰ وجہ الکمال ذات الٰہی کے مظہر ہوئے ہیں۔ اور آنش اوتار وہ ہیں جن میں ذات باری نے من وجہ ظہور لیا ہے۔ اگرچہ اوتاروں کا شمار چوبیس تک بھی مانتے ہیں مگر منجملہ اُن کے دس اوتار مفصلہ ذیل بالاتفاق مانے جاتے ہیں اول مچھ دوئم کورم یا کچھ سوئم باراہ چہارم نرسنگھ پنجم باون معروف باون ششم پرسرام سات‌واں رام یعنی رامچندرجی مہاراج آٹھویں سری کرشن مہاراج نہم بدھ، دسواں کلکی جس کا اب تک ظہور نہیں ہوا۔ مترجم

جن کو ہم فرنگستان والے ہیرو کہتے ہیں ان مختلف جسموں میں جن کا اوپر ذکر ہوا ہے آتی رہی ہیں اور وہ ہی دیوتا ہو گئے ہیں ۔ یا اگر قدیم بت پرستوں کی اُن اصطلاحوں میں جن سے ہم واقف ہیں کہا جاتے تو وہ طاقتور دیوتا نیومینیا ۔ جینائی ۔ ڈیمین (بمعنی دیو) خواہ یہ کہو کہ سپرٹ (بمعنی روح) اور فیری (بمعنی پری) بن گئے ۔ کیونکہ ہندوستانی لفظ دیوتا کے معنی بجز الفاظ مذکورہ بالا میں بیان نہیں کر سکتا ۔

تصور آتما لیکن ہندوؤں کے اس اعتقاد کے پیش نظر کہ ہماری روحیں ذات الٰہی کی جزو ہیں تو یہ دوسرے معنی بھی تقریباً پہلے ہی معنی بن جاتے ہیں ۔

بعض پنڈتوں نے یہ عمدہ تشریح کی کہ جن اوتاروں یا راکھسوں کا ہماری پوتھیوں میں ذکر ہے ان کے معنی پوشیدہ ہیں اور اِن سے یہ غرض ہے کہ خدا کی مختلف صفات ظاہر ہوں ۔ نہ یہ کہ ان کے لفظی معنی لئے جاویں ۔

بعض نہایت فاضل پنڈتوں نے آزادانہ صاف طور پر یہ کہا کہ ان اوتاروں کے قصّے سے زیادہ لغو اور کوئی قصہ نہیں ہے اور اُن اچارجوں نے جنھوں نے قوانین مذہبی کی کتابیں بنائی تھیں اِن کو صرف اس غرض سے ایجاد کر لیا تھا کہ لوگ کسی نہ کسی قسم کے مذہب کے پابند رہیں ۔

آتما اور پرم آتما ہندوؤں کا عموماً یہ عقیدہ ہے کہ ہماری روحیں ذات باری کے جزو ہیں اور باوجود اس کے اِس منطقی برہان کو نہیں سمجھتے ہیں کہ درحالیکہ وہ خود خدا ہیں پھر اپنے اوپر کس لئے کسی پوجا پاٹ اور مذہبی پرستش کو قائم کرتے اور گنت اور کرک اور سُرگ کو مانتے ہیں ۔ اور تعجب ہے کہ باوجود ایسے قوی اعتراض کے بھی پنڈت لوگ یہ کہتے ہیں ۔ کہ اس سے اوتاروں کے وجود اور اصلیت میں ہرگز کسی طرح کی قباحت لازم نہیں آتی ۔ بلکہ اُن کی حقیقت کو بطور ایک مذہبی اسرار کے ماننا ضروری ہے ۔

علوم و فنون پر کتابیں ہنری لارڈ صاحب اور ابراہام راجر صاحب کا اتنا ہی ممنون ہوں جتنا کہ فادر کیرکز اور فادر روآ کا کیونکہ میں نے ہندوؤں کی نسبت بہت سے حقایق جمع کئے تھے مگر بعد ازاں ۔ اِن صاحبوں کی لکھی ہوئی کتابوں میں دیکھا کہ انھوں نے حقایق و حالات مذکورہ کو نہایت عمدہ نظم و ترتیب سے لکھا ہے ۔ جن کو بغیر

بڑی مشقت اور جانکاہی کے میں اُس خوبی سے نہیں لکھ سکتا۔ اس لئے میں ہندوؤں کے علوم و فنون کے متعلق بلا کسی نظم و ترتیب کے سیدھے انداز میں مختصراً لکھتا ہوں۔

ہندوؤں کا دارالعلم شہر بنارس شہر بنارس جو دریائے[1] گنگا کے کنارے ایک خوبصورت موقعہ پر اور ایک بڑے خوش نما اور نہایت زرخیز

---

[1] مترجم انگریزی نے کرنل جارج فاسٹر صاحب نامی ایک انگریز سیاح کی تحریروں سے شہر بنارس کی نسبت ایک حاشیہ لکھا ہے جس کو دلچسپ سمجھکر ہم بھی اپنے اس ترجمہ میں بطور خلاصہ نقل کرتے ہیں۔ قولہ۔ شہر بنارس اپنی دولت مندی اور عالی شان عمارتوں اور کثرت آبادی کی وجہ سے اُن شہروں میں جو بالفعل ہندوؤں کے قبضہ میں باقی ہیں اول درجہ کا شہر گنا جاتا ہے۔ اس شہر میں ہندوؤں کے بے شمار دیوتاؤں کے بے شمار مندر ہیں اور یہ شہر ہندوؤں کے باقی ماندہ علوم و فنون کا گویا مخزن ہے۔ جب کوئی شخص گنگا کے راستہ سے اس شہر کو آتا ہے تو اُس کو آٹھ میل کے فاصلہ سے ایک مسجد کے دو بلند مینار نظر پڑتے ہیں۔ جس کو اورنگ زیب نے مہادیو کے ایک قدیمی مندر کی بنیاد پر تعمیر کرایا تھا۔ ہندوؤں کی ایسی متبرک جگہ پر ایسی باشان و شوکت اسلامی عمارت کے بنانے سے جو اپنی بلندی کی وجہ سے بزبان حال اپنے غلبہ اور فتحمندی کو جتا رہی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کے دل میں بے جا خواہش پیدا ہوئی ہوگی کہ ہندوؤں کے مذہب کی تحقیر کروں۔ اگر فی الواقع اُس کی یہی خواہش تھی تو وہ حقیقت میں کامل طور پر کامیاب ہوا! ان میناروں پر سے تمام شہر بخوبی نظر آتا ہے۔ جو گنگا کے مشرقی کنارے پر طولاً ڈھائی میل اور عموماً ایک میل تک عرض میں آباد ہے۔ اکثر مکانات اس شہر میں پتھر کے بہت اونچے اونچے بنے ہوئے ہیں۔ مثلاً کوئی چھ منزل اور کوئی سات منزل کا ہے۔ یہ پتھر جو اس نواح میں بکثرت دستیاب ہوتا ہے اس قسم کا ہے جو فرنگستان میں پورٹ لینڈ کی کان سے نکلتا ہے۔ لیکن شہر کے گلی کوچے جن میں یہ اونچی اور مستحکم عمارتیں بنی ہوئی ہیں۔ ایسے تنگ ہیں کہ دو گاڑیاں بھی برابر نہیں چل سکتیں۔ علاوہ اُس حبس کے جو ان مکانات کے بے ڈھنگے پن سے ہوا میں پیدا ہوتا ہے گرمی کے موسم میں اُس پانی سے جو شہر میں بہت سی جگہ بھرا رہتا ہے ناقابل برداشت بو آتی ہے اور یہی پانی معہ اپنے کناروں کی زمین کے اہل شہر کی حوائج ضروریہ کے لئے مختص ہے۔ اس کے علاوہ کوڑا کرکٹ جو شہر والے اپنے گھروں سے نکال کر گلی کوچوں اور راستوں پر ڈال دیتے ہیں اُسی جگہ پڑا رہتا ہے۔ کیونکہ ہندوؤں میں ستھراپن بہت ہی کم ہے۔ اور یہ ایک اور ذریعہ ہے جو دوسری عفونتوں میں شامل ہوکر سخت بدبو کا سبب بن جاتا ہے۔ یہ شہر اپنی عمدہ عمدہ عمارات کے سبب سے اُن تمام بڑے بڑے شہروں پر فوقیت رکھتا ہے۔ جن کے

ملک میں واقع ہے۔ ہندوؤں کا دارالعلم خیال کرنا چاہیے۔ اور یہ ہندوستان میں اُسی مرتبہ کی جگہ ہے جیسا کہ یونانیوں کے لئے شہر اتیھنز تھا۔

بنارس کے پنڈت یہاں برہمن اور پنڈت ہر ملک سے آتے رہتے ہیں اور صرف یہی لوگ ہیں جو اپنی اوقات تحصیل علوم اور مطالعہ میں صرف کرتے ہیں۔ اس شہر میں ہماری یونیورسٹیوں کی طرح کوئی کالج یا باقاعدہ جماعتیں نہیں ہیں۔ بلکہ قدیم زمانہ کے مکتبوں کی سی حالت ہے۔ اُستاد یعنی پنڈت شہر کے مختلف حصوں میں اپنے اپنے گھروں اور خصوصًا شہر کے باہر باغوں میں جہاں رہنے کے لئے بڑے بڑے ساہوکاروں نے ان کو سہولت دے رکھی ہے رہتے ہیں۔ بعض کے پاس چار شاگرد ہوتے ہیں۔ بعض کے پاس چھ یا سات۔ اور جو بڑا ہی فاضل پنڈت ہو اُس کے پاس بارہ یا پندرہ مگر اس سے بڑھ کر تعداد نہیں ہوتی۔ یہ ایک معمول ہے کہ یہ شاگرد دس بارہ سال تک اپنے اُستادوں کے زیر تعلیم رہتے ہیں مگر اس عرصہ میں اُن کی تعلیم بہت آہستہ آہستہ ہوتی ہے کیونکہ عمومًا ہندوستانیوں کی طبیعت زیادہ تر ان کی غذا اور ملک کی گرمی کی وجہ سے کاہل ہوتی ہے اور چونکہ ان میں نہ تو سابقت کا جوش وغیرہ ہی ہوتا ہے اور نہ یہ اُمید ہوتی ہے کہ اگر معمولی اندازہ سے کچھ زیادہ کمال حاصل کریں گے تو کوئی بارآور پیشہ اور اعزاز یعنی خطاب فضیلت حاصل ہو سکتا ہے۔ اس لئے یہ لوگ معمولی اور سست طریقہ پر اپنی تحصیل کو جاری رکھتے ہیں اور ایام طالب علمی میں اُنھیں کھانے کو صرف کھچڑی ملتی ہے۔ جو بعض دولت مند ساہوکاروں کی طرف سے ان کے لئے تیار ہوا کرتی ہے۔

سنسکرت اور اُس کی قدامت سب سے اول سنسکرت سکھائی جاتی ہے جو ایک ایسی زبان ہے جس کو صرف پنڈت ہی جانتے ہیں۔ اور اُس بولی سے جو آج کل ہندوستان میں بولی جاتی ہے بالکل مختلف ہے۔ فادر کرزگرنے جو ایک الف بے تے چھپوا کر مشتہر کی ہے وہ سنسکرت ہی کے حروف ہیں۔ اور اُن کو یہ حروف فادر رو کسے حاصل ہوتے تھے۔ لفظ سنسکرت کے معنی خالص یا منجھی ہوئی زبان کے ہیں۔ اور چونکہ ہندوؤں کا یہ اعتقاد ہے۔ کہ خدا نے چار بید برہما کے ذریعہ سے سنسکرت ہی میں بھیجے تھے اس لئے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ دیکھنے کا مجھے ہندوستان میں اتفاق ہوا ہے۔ بشرطیکہ اُس کی گلیاں ایسی بے قاعدہ اور تنگ اور طرز تعمیر ایسا گنجان نہ ہوتا جس نے عمارات شہر کی زیب و زینت کے لطف کو کھو دیا ہے۔ س م ح

وہ اس کو دیو بھاشا یعنی زبانِ مقدس و زبانِ الٰہی کہتے ہیں۔ اُن کا قول ہے مگر میں نہیں جانتا کہ کس دلیل سے ہے کہ یہ زبان ایسی ہی قدیم ہے جیسے کہ خود برہما اور برہما کی عمر کا شمار لاکھوں برس سے کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کی مذہبی کتابیں جو حقیقت میں نہایت پُرانی ہیں اسی زبان میں ہیں اس لئے اس کے نہایت درجہ قدیم ہونے کو نہ ماننا ناممکن ہے۔ سنسکرت میں فلسفہ اور طب کی کتابیں نظم میں ہیں اور ان کے سوا بہت سی اور طرح طرح کی کتابیں بھی ہیں کہ جن سے بنارس میں ایک بہت بڑا کمرہ بالکل بھرا ہوا ہے۔

پوران اور بید جب طالب علم اس قدیم اور مشکل زبان کی واقفیت حاصل کر لیتے ہیں۔ اور میں اسے مشکل اس وجہ سے کہتا ہوں کہ اس کی صرف و نحو اچھی نہیں ہے۔ تو عموماً پرانوں کو پڑھتے ہیں۔ جو بیدوں کی تشریح یا اختصار ہوتا ہے۔ یہ کتابیں جو مجھے بنارس میں دکھلائی گئی تھیں اگر وہ بید ہی تھے تو بڑی ضخامت کی ہوتی ہیں اور یہ ایسی نایاب ہیں کہ میرے آقا کو باوجود بڑی تلاش اور شوق خریداری کے ایک کتاب بھی نہیں ملی۔ ہندو ان کو بڑی ہوشیاری سے چھپائے رکھتے ہیں کہ مبادا مسلمانوں کے ہاتھ لگ جائیں۔ اور جیسا کہ اکثر[1] ہوا ہے جلا دی جائیں۔

---

[1] "اکثر ہوا ہے" کہنا صحیح نہیں ہے۔ مولف کتاب آئینہ تاریخ نما جو زمانہ حال کے قابل لوگوں میں سے جن ت کا ایک بہت باخبر ہندو مصنف ہے اور جس کا طرز تحریر ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کی نسبت نہایت متعصبانہ ہے۔ اور جس نے اُن کے عیب چُن چُن کر اپنی کتاب میں درج کئے ہیں باوجود بڑی تلاش اور جستجو کے اس کو بھی اس قسم کی صرف ایک ہی بات ملی ہے۔ چنانچہ کتاب فتوحات فیروز شاہی کے حوالہ سے وہ لکھتا ہے کہ "کچھ ہندوؤں نے مل کر موضع کوہانہ میں بت خانہ بنایا تھا۔ پس میں نے (یعنی فیروز شاہ تغلق نے) حکم دیا کہ ان کی پوتھیاں اور تمام بت اور پوجا کے برتن سب اُسی جگہ پھونک دیئے جائیں" مگر ہندوؤں پر کیا منحصر ہے فیروز شاہ نے تو شیعہ مذہب کے مسلمانوں کی کتابیں بھی جلوا دی تھیں لکھتا ہے کہ "فرقہ شیعہ کے بعض لوگوں نے اہل سنت کو اپنے مذہب میں لانا چاہا تھا اور کتابیں اور رسالے بھی اس باب میں لکھے تھے۔ تب میں نے (یعنی فیروز شاہ نے) ان سب رافضیوں کو گرفتار کیا اور جو جو اُن کے سردار تھے اُن کو سیاست میں ڈالا۔ اور اُن کی تمام کتابوں کو آگ سے جلوا دیا۔ اور مذکورہ مولف اس سے چند صفحے پہلے طبقات ناصری کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ "قطب الدین ایبک کے زمانہ میں بختیار خلجی نے شہر بہار کو جب فتح کیا تو وہاں ہندوؤں کا ایک کتب خانہ نہایت عظیم الشان دستیاب ہوا۔ لیکن قتلِ عام ہو جانے کے باعث سے کوئی آدمی اُن پوتھیوں کا مضمون بتانے والا نہ مل سکا" جس سے ثابت

فلسفہ کی تعلیم | پُرانوں کے بعد بعض طالب علم تحصیل علم فلسفہ پر اپنا جی لگاتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ اس میں ترقی بہت کم کرتے ہیں۔ اور یہ تو میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ ہندوستانیوں کی طبیعتیں سُست اور کاہل ہوا کرتی ہیں۔ اور جیسا کہ یورپ کی یونیورسٹیوں میں کسی معزز پیشہ میں ترقی کرنے کی خاطر لوگوں کو شوق ہوا کرتا ہے وہاں کو مطلقاً نہیں ہوتا۔

کھٹ شاستر کے پیرو | ہندوستان میں جو بڑے بڑے اچارج (حکیم) ہوئے ہیں اُن میں چھ شخص بہت نامور ہیں جو ہندوؤں کے علیحدہ علیحدہ[1] چھ فرقوں کے بانی ہیں۔ اور اس اختلاف عقائد کے باعث اُن کے پیروؤں کے باہم ازبس رشک اور بحث مباحثے ہوا کرتے ہیں۔ کیونکہ ہر فرقہ کے پنڈت یہی ادعا کرتے ہیں کہ ہمارے ہی مسائل سب سے زیادہ صحیح اور بید کے موافق ہیں۔

بُدھ مت اور اُس کے پیرو | اور ساتواں فرقہ بُدھ کے پیروؤں کا ایک اور ہو گیا ہے جس کی بارہ شاخیں ہیں۔ لیکن اس فرقہ کے لوگ شمار میں اُس قدر کثرت سے نہیں ہیں۔ جیسے اور فرقوں کے ہیں۔ اور ان کو حقارتاً لامذہب اور دہریہ کہا جاتا ہے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ ہوتا ہے کہ بخشیار نے ان پوتھیوں کو جلوایا نہیں بلکہ برعکس اس کے وہ ان کے مضمون سے واقف ہونا چاہتا تھا۔ س۔م۔ح

[1] مصنف نے جن چھ فرقوں کی طرف اشارہ کیا ہے وہ یہ ہیں۔ اول میمانسک[2] یعنی میمانسا۔ شاستر کے پیرو جس کی بنیاد جیمنی[3] رشی سے ہے۔ اُس کی دو شاخیں ہیں ایک قدیم جو جیمنی کے اصول کی پیرو ہے۔ دوسری جدید جس کا بانی بیاس[4] جی کو بتاتے ہیں اور بیدانتی کہلاتے ہیں۔ تیسرا نیائک[5] یعنی منطقی فرقہ جس کا بانی گوتم ہوا۔ اس فرقہ کے بعض مسئلے ارسطو کے مسائل منطق سے ملتے جلتے ہیں۔ چوتھا نیے شئے شِک۔ جس کا بانی کنادمنی ہے۔ پانچواں سانکھ جس کا بانی کپل منی ہوا۔ چھٹا جوگی یعنی پاتنجل شاستر کا پیرو جس کو پاتنجل رِکھی نے قائم کیا۔ یہ دونوں فرقے موخر الذکر بہت سی رایوں میں متفق ہیں۔ ان سب فرقوں کے مسائل کی تفصیل اگر کسی کو دیکھنی ہو تو الفنسٹن صاحب کی تاریخ ہندوستان کے پہلے حصہ میں اور اس سے بھی زیادہ شیخ ابوالفضل کی آئین اکبری میں دیکھ لے۔ س م ح

---

[1] م سے ان س ا [2] ہ نے م ت ی [3] ب ی اش [4] ن ی ایک
[5] گ دیک م۔

اور قابل نفرت اور حقیر شمار کئے جاتے ہیں۔ اور یہ لوگ ایک ایسے طریق سے زندگی بسر کرتے ہیں جو انہیں سے مخصوص ہے۔

موجودات کے بارے میں ہندوؤں کے مذاہب

ہندوؤں کی تمام پوتھیوں میں فرسٹ پرنسپلز یعنی اصول و مبادی اشیاء کا ذکر ہے لیکن طرز بیان میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔

ناقابل تقسیم اجزا

چنانچہ بعضے تو یہ کہتے ہیں کہ ہر چیز چھوٹے چھوٹے ناقابل التقسیم اجسام سے مرکب ہے۔ اور یہ ناقابلیت انقسام اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ بدرجہ غایت چھوٹے ہیں۔ اور اس خیال پر وہ اپنے دوسرے بہت سے تصورات کی بنیاد رکھتے ہیں جو کسی قدر ڈی ماک ری ٹس[1] (دی مقراطیس) اور اپی کیورس کے خیالات سے مشابہ ہیں۔ لیکن وہ اپنے خیالات کو ایسے غیر منضبط اور ناتحقیق طور پر ظاہر کرتے ہیں کہ ان کا مطلب سمجھنا مشکل ہے۔ اور خواہ وہ کیسے ہی بڑے فاضل مشہور ہوں۔ ان کی اس دم نافہمی پر غور کیا جائے تو قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ آیا یہ بیہودگی اُن کتابوں کے اصل

[1] یہ مشہور یونانی حکیم جو سن عیسوی سے چار سو اکتر برس سے پہلے پیدا ہوا تھا۔ بہت سے لوگوں نے اس کی تقلید کی ہے اور علوم حکمیہ اس سے سیکھے ہیں۔ چنانچہ اپی کیورس بھی جس کا ذکر متن میں ہے اسی کا شاگرد تھا۔ اس کا یہ اعتقاد تھا کہ تمام اجسام کی بنیاد ایسے چھوٹے چھوٹے اجزا ہیں جو باعتبار اپنی طبیعتوں کے ہم شکل اور باعتبار صورتوں کے مختلف اور ایسے سخت ہیں کہ اُن کی تقسیم صرف وہم ہی سے ممکن ہے۔ وہ یہ کہ اجزا باعتبار شمار کے غیر متناہی اور ایسی خلا کے اندر جس کی کوئی حد نہیں پھیلے ہوئے اور دائم الحرکت ہیں۔ پس کبھی ایسا ہوتا ہے کہ یہ اجزاء آپس میں ٹکراتے اور کبھی خاص صورت پر اکٹھے ہو جاتے ہیں اور ان کے اس اتفاق اور اجتماع ہی سے جہاں کا وجود ہے۔ اور یہ کہ ہمارے اس جہاں کی مانند بے شمار جہان ہیں جو ایسی ہی نظم و ترتیب کے ساتھ خلا۔ غیر متناہی کے اندر موجود ہیں۔ لیکن اس کی رائے میں امورات جزئی یعنی حیوانات اور نباتات وغیرہ کے وجود کا سبب اجزاء مذکور کا اتفاقاً باہم ٹکرانا اور مجتمع ہو جانا نہیں ہے۔ اس کے شاگرد اپی کیورس کی بھی یہی رائے ہے اور اس کا قول ہے کہ ترکیب کی حالت میں یہ اجزا حقیقتاً آپس میں مل نہیں جاتے بلکہ صرف باہم چمٹ جاتے ہیں اور اجسام محسوسہ کے اندر فی الحال موجود اور ایک دوسرے سے متمیز رہتے ہیں۔ پس اجسام محسوسہ کا اتصال حقیقی اتصال نہیں ہے۔ بلکہ صرف ان اجزا کے باہم چمٹے رہنے کا نام ہے۔ ماخوذ از تاریخ التزاریخ س م ع

مصنفوں سے منسوب ہونی چاہیئے یا یہ کہ اُن کے مترجموں اور شارحوں سے زیادہ تر منسوب ہوسکتی ہے۔

مادہ اور صورت بعض کا قول ہے کہ ہر چیز مےٹر اور فارم یعنی مادہ اور صورت سے مرکب ہے۔ لیکن کوئی پنڈت مادہ اور صورت کو صاف صاف بیان نہیں کرسکتا۔ اور مادہ کی بابت تو کچھ بیان بھی کرتے ہیں مگر صورت کی نسبت بہت ہی کم تشریح کر سکتے ہیں۔ بہرحال اُن کا بیان صرف اسی قدر قابلِ فہم ہے کہ اس سے مجھے یہ ظاہر ہوگیا کہ یہ لوگ اِن دونوں میں سے کسی ایک کو اتنا بھی نہیں سمجھتے جتنا کہ یہی لفظ ہمارے مدارس میں جب کہ قوت مادیہ میں سے صورتِ نوعیہ کے ظہور کا مسئلہ بیان کیا جاتا ہے۔ طالب علموں کو ایک معمولی طور پر سمجھا دیتے جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ ہمیشہ معمولی چیزوں کی مثالیں دیتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ ملائم مٹی بطور مادہ کے ہے اور کمھار اُس کو پھرا پھرا کر، جو طرح طرح کی شکلیں بنا لیتا ہے یہ صورت ہے۔

عناصر اربعہ اور اکاش بعض کی یہ رائے ہے کہ ہر چیز عناصر اربعہ اور "تھنگ" یعنی اکاش سے مرکب ہے لیکن وہ عناصر کے استحالہ یا آپس میں مل جانے کی نسبت کچھ نہیں کہتے۔

اور تھنگ یعنی اکاش کی جو ہمارے لفظ پرائی ویشن یعنی عدم مطلق کے قریب المعنی ہے کئی قسمیں بتلاتے ہیں۔ جن کو میں خیال کرتا ہوں کہ نہ تو وہ خود سمجھتے ہیں نہ دوسرے کو سمجھا سکتے ہیں۔

نور و ظلمت بعض نور اور ظلمت ہی کو اصل اوّل مانتے ہیں اور اس رائے کی تائید میں وہ ایسے بے معنی دلائل پیش کرتے ہیں، جو صحیح فلسفہ کے خلاف محض ہیں۔ اور ایسی ایسی طول طویل قیل و قال کرتے ہیں کہ جس کو صرف عامی اور ناخواندہ لوگوں ہی کے کان سن سکتے ہیں۔

عدم مطلق بعض ایک یا چند پرِی ویشنوں (عدم مطلق) ہی کو اصل اصول تسلیم کرتے ہیں۔ جن کو وہ تھنگ سے جُدا سمجھتے ہیں اور جن کی تعداد کی نسبت ایک ایسا غیر حکیمانہ طول طویل اندازہ کرتے ہیں کہ مجھے یقین نہیں ہے کہ ایسی جزوی باتوں کی خاطر ان کے مصنفوں نے قلم اُٹھا کر کچھ لکھا ہو۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ ان کی کتابوں میں بھی

بیہودہ باتیں ہوں گی۔

سمبندھ کا نظریہ بعض قائل ہیں کہ ہر چیز اتفاق کا نتیجہ ہے یعنی جس کو پنڈت لوگ سمبندھ کہتے ہیں۔ اور اس کی نسبت بھی وہ ایسی لمبی چوڑی عجیب تقریریں کرتے ہیں جو جاہل لوگوں ہی کے لائق ہوتی ہیں۔

اصول ومبادی اشیا ان تمام اصول کی نسبت پنڈتوں کا اتفاق ہے کہ یہ ازلی و ابدی ہیں۔ اکاش سے کائنات کے پیدا ہونے کی نسبت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف اتنا ہی سمجھے ہوئے ہیں جتنا کہ بہت سے قدیم حکما کے دلوں میں خیال تھا۔ مگر البتہ وہ کہتے ہیں کہ ایک اچارج نے اس مسئلہ کی نسبت کچھ لکھا ہے (یعنی اس بحث کو کسی قدر شرح اور بسط سے تحریر کیا ہے)

طب کی کتابیں علم طب میں ہندوؤں کے پاس بہت سی چھوٹی چھوٹی کتابیں ہیں۔ لیکن بجائے اس کے کہ کوئی باترتیب کتاب ہو ان کو صرف نسخوں کے مجموعے کہنا چاہیے۔ اور ان میں سب سے پرانی اور بڑی کتابیں نظم میں لکھی ہوئی ہیں

ہندو طریقۂ علاج میں اس طرز کو بیان کرتا ہوں جس میں کہ اُن کا طریق علاج ہمارے طریقہ سے بالکل مختلف ہے۔ اور وہ اختلاف مندرجہ ذیل مسلمہ اصول پر مبنی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تپ کے بیمار کو غذا کی کچھ زیادہ ضرورت نہیں۔ اور فاقہ سب سے بڑا علاج ہے۔ اور اس مرض میں شوربے یا یخنی سے زیادہ مضر اور کوئی چیز نہیں۔ کیونکہ یہ دو چیزیں تپ والے شخص کے معدہ میں فوراً خراب ہو جاتی ہیں۔ اور اُن کے نزدیک بجز خاص خاص اور نہایت ضروری موقعوں کے مثلاً یا تو جب سرسام کا اندیشہ ہو یا جب کبھی گُردہ یا جگر یا سینہ میں ورم پیدا ہو جاوے فصد نہ لینی چاہیے۔ اس بات کا فیصلہ میں اپنے فاضل طبیبوں پر چھوڑتا ہوں کہ آیا یہ معالجہ کے طریقے درست ہیں یا نہیں مگر ہاں صرف اتنا میں بھی کہتا ہوں کہ ہندوستان میں یہ طریقے کارگر ہو جاتے ہیں۔

طبیب اور ہندو طریق علاج مغل اور دوسرے مسلمان طبیب جو ابو علی سینا اور ایورس (یعنی ابن[1] رشد) کے پیرو ہیں وہ بھی ہندوؤں کی طرح

---

[1] ابن رشد کا نام محمد تھا اور اپنے اجداد میں سے رشد نامی ایک شخص کی نسبت سے محمد ابن رشد کہلاتا تھا۔ یہ ان لوگوں کی نسل میں سے تھا جنھوں نے ۹۳ھ مطابق ۷۱۱ء میں ملک اسپین کو فتح کر کے ممالک اسلامیہ

ان طریقوں یعنی خصوصاً یخنی یا شوربے سے پرہیز کرانے کے طریقہ پر عمل کرتے ہیں۔

مگر ہندوؤں کی نسبت مغلوں میں فصد لینے کا عمل زیادہ ہے۔ کیونکہ جہاں اُن کو مندرجہ بالا اورام کا اندیشہ ہوتا ہے عموماً ایک دو مرتبہ خون نکلوا ڈالتے ہیں اور یہ عمل وہ گوآ اور پیرس کے زمانہ حال کے اطبا کی طرح جزوی طور پر نہیں کرتے بلکہ قدمائے اطبا کی طرح اٹھارہ یا بیس اونس یعنی دس گیارہ چھٹانک تک خون نکلوا ڈالتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض اوقات غش کی نوبت ہو جاتی ہے۔

پس وہ گیلین[1] (جالینوس) کی ہدایت کے موافق اور جیسا کہ میں نے اکثر دیکھا ہے۔ بیماری کو ابتدا ہی میں مغلوب کر لیتے ہیں۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ میں شامل کیا تھا۔ یہ ملک اسپین کے مشہور شہر کاردوآ (قرطبہ) میں جہاں اس کے باپ دادا قاضی رہے تھے۔ سنہ ۵۲۰ھ مطابق سنہ ۱۱۲۶ء میں پیدا ہوا تھا۔ یہ نہایت مشہور حکماء عرب میں سے تھا۔ اور طب اور فلسفہ اور فقہ اور ہندسہ میں کمال کا درجہ رکھتا تھا۔ اس کے زمانہ میں علم فلسفہ اہل عرب میں کمال کو پہنچ گیا تھا۔ اور اس کے بعد قوم عرب کی تاریخ میں کوئی بڑا فلسفی نہیں پایا جاتا اس کی اکثر تصنیفیں زبان عربی اور عبری میں ہیں۔ چونکہ اس نے کتب ارسطو کی شرحیں لکھی تھیں اس لئے شارح حکمت ارسطو کے معزز لقب سے جس کا وہ حقیقتاً مستحق تھا مشہور آفاق تھا۔ بعض آزادانہ رایوں کے ظاہر کرنے کی وجہ سے لوگوں نے اس کو الحاد سے منسوب کر کے اس کو اس کے مولد کاردوآ سے جلا وطن کرا دیا تھا۔ مگر اس کے کمال نے سلاطین وقت کی مہربانی کو پھر اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور دربار مراکش (مراکو) میں پھر آ حاضر ہوا۔ جہاں کہ وہ سنہ ۵۹۵ھ یا سنہ ۱۱۹۹ء میں مر گیا۔ (ماخوذ از انسائیکلو پیڈیا برطانیکا و تاریخ منتظم ناصری مطبوعہ طہران ۱۲۹۸ھ)

[1] کلاڈی اس گالی نس جس کو انگریزوں نے گیلین اور عربوں نے جالینوس بنایا ہے۔ ملک اٹلی کے شہر پرگمس[2] کا رہنے والا تھا۔ یہ نامور شخص سنہ ۱۳۱ء میں پیدا ہوا تھا۔ اور نوے برس کا ہو کر مرا۔ جالینوس اپنے باپ کی نسبت لکھتا ہے کہ وہ ریاضیات اور فن تعمیرات اور علم ہیئت میں بہت سربرآوردہ اور دقائق فلسفہ ارسطا طالیس سے بخوبی ماہر تھا۔ جالینوس نے سترہ برس کی عمر سے پہلے حکما کے چند مختلف طبقات[3] کے مسائل فلسفہ کی تعلیم پائی تھی اور وہ لکھتا ہے کہ جب میں اس عمر کو پہنچا تو میرے باپ نے خواب دیکھا تھا کہ اس لڑکے کو علم طب کی تعلیم ہونی چاہیے۔ مگر اس نے صرف انتیس برس کی عمر میں اول ایک اُستاد سے جس کا نام وہ بتانا نہیں چاہتا فن طب کی تحصیل شروع کی اور پھر اس زمانہ کے بعض اور مشہور

---

[1] کِ ل اڈی اس گ ال ی ن س [2] پ ر گ م س [3] گ ی نے لِ یٔ ن

فن تشریح سے ہندوؤں کی ناواقفیت | یہ بات کچھ قابل تعجب نہیں کہ ہندو علم تشریح کو بالکل نہیں سمجھتے۔ کیونکہ وہ کبھی کسی انسان یا حیوان کے جسم کو نہیں چیرتے اور جب کبھی میں کسی انسان یا حیوان کے جسم کو نہیں چیرتے اور جب کبھی میں کسی زندہ بکری یا بکری کو اس غرض سے چیرتا تھا کہ اپنے آقا کو دوران خون کا طرز اور وہ رگیں دکھلاؤں جن کو پیکیٹ نے دریافت کیا تھا اور جن میں ہو کر کیلوس کا خلاصہ قلب کے دائیں خانہ میں پہنچتا ہے۔ تو ہندو ہمارے گھر سے حیران اور خوف زدہ ہو کر بھاگ جاتے تھے۔ مگر باوجود اس کے کہ ہندو اس فن سے محض ناآشنا ہیں سکہتے ہیں کہ انسان کے جسم میں پانچ ہزار رگیں ہیں اور اس سے کم ہیں نہ زیادہ گویا کہ بڑی صحت اور غور سے اُنھوں نے ان کا شمار کیا ہوا ہے۔

ہندوؤں کا علم ہیئت | علم ہیئت کا یہ حال ہے کہ ہندو اپنے پتروں کی روسے خسوف

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ معروف حکماء سے جو فن تشریح اور علم الادویہ میں نامور تھے ان فنون کی تعلیم پائی ابھی بیس برس کی عمر بھی نہ ہوئی تھی کہ اس کا وہ پہلا رہنما اور شفیق اُستاد مر گیا۔ بعد ازیں اس نے بہت سے شہروں میں کہ جہاں جہاں علمائے فلسفہ و طب مشہور تھے سفر کئے اور آخر کار شہر اسکندریہ میں جا کر بعض اُستادوں سے فن تشریح کی تکمیل کی اور اٹھائیس برس کی عمر تک وہاں رہ کر جو علوم اُس زمانہ میں استادوں سے حاصل ہو سکتے تھے۔ وہ سب سیکھ لئے اور اپنے شہر پرگمس میں واپس آ کر انیس برس کی عمر میں بڑی شہرت پائی۔ کیونکہ یہاں اس نے ایسے ایسے زخمیوں کو اچھا کیا جن کے زخم مہلک سمجھے جاتے تھے اور چونکہ بتیس برس کی عمر تک اُس کے شہر میں کچھ بغاوت ہو گئی تھی اس لئے وہ شہر روم کو چلا گیا اور ایک دفعہ شہر پرگمس میں پھر آ کر آخر کار روم میں ہی جا ٹھیرا۔ کیونکہ وہاں کے کئی بادشاہوں کا طبیب خاص رہا تھا مگر وفات اُس کی شہر پرگمس میں ہی ہوئی۔ فن تشریح کے مختلف شعبوں میں اس حکیم نے بہت سے رسالے اور کتابیں لکھی ہیں اور اس فن میں بہت سی اصطلاحیں قائم کر گیا ہے کہ اب تک بھی وہی چلی آتی ہیں۔ اور یہ بڑے شوق اور سرگرمی سے ہمیشہ مُردہ اور زندہ حیوانوں کو چیر چیر کر دیکھتا رہتا تھا اور اگرچہ زمانہ حال کا فن تشریح اُس کی معلومات سے بہت بڑھا ہوا ہے ــ لیکن وہ اپنے وقت میں یکتائے روزگار اور اپنے تمام متقدمین سے ایسا ممتاز تھا کہ اُس قدیم زمانہ میں اُس کی وفات کو فن تشریح کی وفات کہنا کچھ بے جا نہ تھا۔

(انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا) س م ع

اور کسوف کا حال پہلے ہی بتا دیتے ہیں۔ اگرچہ ان کے بیان میں فرنگستانی اہلِ ہئیت کی سی بارکی کے ساتھ صحت نہیں ہوتی۔ مگر پھر بھی وہ اکثر صحیح ہوتا ہے۔

چاند گہن کے متعلق ہندوؤں کا عقیدہ لیکن خسوف کی نسبت بھی ان کا وہی بے معنی اعتقاد ہے جو کسوف کی نسبت ہے یعنی یہ کہ ایک کالا اور ناپاک اور شریر راجبس جس کا نام راہو ہے چاند کو پکڑ لیتا اور اُس کو اپنے اثر سے تاریک کر دیتا ہے۔

اور زیادہ تر اسی دلیل سے ہندو یہ بھی کہتے ہیں کہ چاند چار لاکھ کوس کے فاصلہ پر ہے یعنی سورج سے ڈیڑھ لاکھ میل اونچا ہے۔ اور وہ ایک بالذات نورانی جسم ہے اور اُس سے انسانوں کے دماغ میں امرت پہنچتا ہے جو دماغ سے اُتر کر آگے اور اعضا میں سرایت کرتا ہے۔ چنانچہ پھر تمام اعضا اپنے اپنے عمل میں مصروفیت کے لائق ہو جاتے ہیں۔ ان کو یہ بھی یقین ہے کہ چاند سورج اور ستارے یہ سب دیوتا ہیں۔

خیالی پہاڑ سمیر جب سورج سمیر کے پیچھے چلا جاتا ہے اُس وقت رات ہو جاتی ہے۔ سمیر ایک خیالی پہاڑ ہے جس کو فرض کر لیا گیا ہے کہ وسط زمین میں مصری کے اُلٹے کوزے کی طرح واقع ہے۔ اور معلوم نہیں کے ہزار کوس بلند ہے۔ پس جب تک کہ سورج اس پہاڑ کے پیچھے سے ہٹ کر نہیں آتا اس وقت تک دن نہیں نکلتا۔

علم جغرافیہ سے ہندوؤں کی ناواقفیت علم جغرافیہ سے بھی ہندو ایسے ہی ناواقف ہیں وہ کہتے ہیں کہ دنیا چپٹی اور مثلث شکل کی ہے اور اس میں سات ولایتیں ہیں جو باعتبار اپنے باشندوں اور اپنی خوبصورتی اور ہر ایک طرح کی تکمیل کے ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور ہر ولایت اپنے خاص سمندر سے گھری ہوئی ہے۔ اور کہتے ہیں کہ ایک سمندر دودھ کا ہے دوسرا شہد کا تیسرا گھی کا چوتھا شراب کا اور آگے اسی طرح تری اور خشکی یکے بعد دیگرے چلی آتی ہے یہاں تک کہ ساتویں ولایت دامن کوہ سمیر میں ہے جو وسط میں واقع ہے۔ اول ولایت جو سمیر کے نہایت قریب ہے اول درجہ کے دیوتاؤں سے آباد ہے دوسری میں اُن سے کم درجہ کے دیوتا ہیں۔ اور اسی طرح باقی ولایتیں ہیں جن کے باشندے ہر ایک پہلی ولایت سے رتبہ میں کم ہیں۔ اور سب سے آخر ساتویں ولایت ہے جس میں ہم انسان آباد ہیں جو ہر ولایت کے دیوتاؤں سے بہت ہی کم درجہ کے ہیں۔ ہندو یہ بھی کہتے ہیں کہ دنیا بہت

سے ہاتھیوں[1] کے سروں پر رکھی ہوئی ہے جن کی اتفاقیہ حرکت سے بھونچال آجاتا ہے۔

ہندوؤں کے علوم کے متعلق میری رائے

اگر قدیم برہمنوں کے علوم میں جن کی اس قدر شہرت ہے یہی تمام بے معنی باتیں بھری ہوئی ہیں جن کو میں نے بالتفصیل لکھا ہے تو لوگوں نے بڑا دھوکا کھایا کہ ان کے علم و عقل کی نسبت مدت دراز سے مدح سرائی کرتے چلے آتے ہیں۔

میں ان باتوں کی حقیقت پر یقین لانے میں نہایت متامل ہوں کیوں کہ اول تو ہندوؤں کا مذہب ایک ایسے زمانہ سے چلا آتا ہے جس کا حال کچھ معلوم نہیں۔ اور پھر ان کی مذہبی اور علمی کتابیں سب سنسکرت زبان میں ہیں جو مدت ہائے دراز سے ایک ایسی زبان ہو گئی ہے جس کو کوئی نہیں بولتا۔ اور اب صرف پڑھے لکھے لوگ ہی اس کو سمجھتے ہیں اور اس کی اصل نا معلوم ہے۔ بہرحال ان تمام باتوں سے بڑی قدامت اور کہنگی ثابت ہوتی ہے[2]۔

بنارس کے چند پنڈتوں سے ملاقات

جب میں دریائے گنگا سے نیچے کے علاقہ کی طرف جا رہا تھا تو بنارس سے ہو کر گذرا اور ایک سب سے بڑے پنڈت سے جو اس مشہور دارالعلم میں رہتا ہے ملا وہ ایک فقیر ہے جو اپنے علم و فضل کی وجہ سے ایسا مشہور ہے کہ شاہجہاں نے کچھ تو اس کی فضیلت کے لحاظ سے اور کچھ راجاؤں کی خاطر سے اس کے واسطے دو ہزار روپیہ سال کی پنشن مقرر کر دی تھی۔ وہ ایک موٹا تازہ اور خوبصورت آدمی ہے اور اس کی پوشاک یہ ہے کہ ایک سفید ریشمی ساڑی باندھے رہتا ہے۔ جو پنڈلیوں تک لٹکتی رہتی ہے۔ اور ایک کسی قدر بڑی سی سرخ ریشمی چادر کاندھوں پر ڈالی ہوئی ہوتی ہے۔ میں نے دہلی میں اس شخص

---

[1] ہاتھیوں کے سروں پر دنیا کے اٹھائے ہوتے ہونے کی روایت کبھی سننے میں نہیں آئی اور نہ تحقیق سے اس کی کچھ صحت معلوم ہوتی۔ البتہ سیس ناگ یعنی ہزار سر والے مقدس سانپ کے سر پر اس دنیا کا ٹھہرے ہوئے ہونا ضرور مانا جاتا ہے اور ایک عام روایت یہ بھی ضرور زبان زد ہے کہ ایک بیل کے سینگوں پر یہ پرتھوی قائم ہے۔ اور جب وہ اس بوجھ کو ایک سینگ سے دوسرے سینگ پر بدلتا ہے تو بھونچال آجاتا ہے۔ س م ح

[2] مصنف کے نزدیک یہ ایسے اسباب ہیں کہ جن سے اصلی حقائق پر ایک تاریکی کا پردہ پڑ جاتا ہے اور اس کے باعث سے لوگوں کو دھوکا ہو جاتا ہے۔ س م ح

کو بادشاہ اور اُمرا کے روبرو بھی اکثر یہی مختصر لباس پہنے دیکھا ہے۔ اور دہلی کے بازاروں میں وہ مجھے یا تو پیدل یا پالکی میں سوار جاتا ملا ہے۔ ایک سال تک وہ ہمیشہ میرے آقا کے پاس اس امید پر آتا رہا کہ وہ اورنگ زیب سے سفارش کرکے اس کی پنشن بحال کرا دے جو اورنگ زیب نے جس کو اپنی دین داری دکھانے کا بڑا شوق تھا تعصب مذہبی کی وجہ سے تخت پر بیٹھتے ہی بند کر دی تھی۔ میں نے اس مشہور فقیر سے بڑی ملاقات پیدا کر لی تھی۔ اور میری اُس سے اکثر دیر تک باتیں ہوا کرتی تھیں۔ اور جب میں اُس سے بنارس میں ملا تو وہ نہایت خلق اور مدارات سے پیش آیا اور مجھے وہاں کا کتب خانہ دکھانے لے گیا جہاں اُس نے اور بھی بڑے بڑے چھ پنڈتوں کو بُلا لیا تھا۔ جب میں نے اپنے آپکو ایسی عمدہ صحبت میں پایا تو میرا ارادہ ہوا کہ اس بات کی تحقیق کروں کہ اُن کی رائے بُت پرستی کی نسبت کیا ہے۔ میں نے اُن سے کہا کہ میں ہندوستان کو اب چھوڑنے والا ہوں جو ایک ایسی پرستش سے بدنام ہے جو معمولی سمجھ والے انسان کے نزدیک بھی خلافِ عقل ہے اور آپ جیسے اچارجوں کے شایاں نہیں ہے۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ ہمارے مندروں میں بے شک مختلف مورتیں مثلاً برہما، مہادیو، گنیش۔ اور گوری کی ہیں۔ جو ہمارے سب سے بڑے دیوتا ہیں۔ اور ہم ان کی مورتوں اور علاوہ بریں اور بہت سے دیوتاؤں کی مورتوں کا جو ان سے درجہ میں کم ہیں ہم بڑا ادب کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے آگے ڈنڈوت کرتے ہیں اور بڑی عقیدت سے پھول، چاول، گھی، زعفران، خوشبوئیں اور ایسی ہی چیزیں ان پر چڑھاتے ہیں مگر باوجود اس کے ہمارا یہ اعتقاد نہیں کہ یہ مورتیں خود برہما یا بشن ہیں۔ بلکہ یہ قریب قریب اُن کی اصلی مورتوں یا شبیہوں کے مماثل ہیں اور ہم ان کا ادب صرف اُس دیوتا کی وجہ سے کرتے ہیں جن کی یہ مورتیں ہیں۔ اور جو پوجا ہم کرتے ہیں وہ دیوتا کے واسطے ہے نہ کہ مورت کے لئے ہمارے مندروں میں مورتیں اس لئے رکھی جاتی ہیں کہ دل کو قائم رکھنے کے واسطے جب تک نظر کو کسی خاص چیز پر نہ جمایا جائے تب تک پوجا عمدہ طور سے نہیں ہو سکتی۔ لیکن حقیقت میں اعتقاد ہمارا یہی ہے کہ خدا صرف وہی ایک ذات مطلق ہے۔ اور صرف وہی سب کا مالک اور سب سے بڑھکر ہے۔ پنڈتوں نے جو جواب مجھے دیا، میں نے اُس کو کم زیادہ کرکے نہیں لکھا۔ لیکن مجھے شک ہے کہ انھوں نے اس مدعا کو عمداً ایسے قالب میں ڈھال کر بیان کیا تھا کہ جو دین

کیتھلک[۱] فرقہ والوں کے خیالات کے مشابہ ہو جائے۔ کیونکہ اور برہمنوں کے خیالات اس سے بالکل مختلف تھے۔

دنیا کی عمر پنڈتوں کے خیال میں

پھر میں نے دنیا کی عمر کی نسبت گفتگو کی اور میرے ہم صحبت پنڈتوں نے ہمارے معتقدات سے بھی بڑھکر اس کی قدامت ظاہر کی۔ یہ تو نہیں کہا کہ دنیا کی کچھ ابتدا ہی نہیں۔ مگر جو عمر انھوں نے بتلائی۔ اُس سے ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ گویا وہ اس کو قدیم سمجھتے ہیں۔ اُن کا یہ بیان تھا کہ دنیا کی عمر چار جگوں سے شمار کی جاتی ہے اور اُن کا جگ ہمارے قرنوں کی طرح سَو برس کا نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ جگوں کا شمار کروڑ برس سے کرتے ہیں۔ جو عمر اُنھوں نے ہر جگ کی علیحدہ علیحدہ طور پر بتلائی وہ مجھے ٹھیک ٹھیک یاد نہیں رہی لیکن ایسا یاد پڑتا ہے کہ پہلا جگ یعنی ست جگ پچیس[؟] لاکھ برس تک رہا۔ پھر بارہ لاکھ سے زیادہ سال تک تریتا جگ رہا۔ پھر اگر میری کچھ غلطی نہ ہو تو) آٹھ لاکھ چونسٹھ ہزار برس تک دواپر جگ رہا۔ اور یہ میں بھول گیا کہ چوتھا یعنی کل جگ جواَب ہے کتنے لاکھ برس تک رہے گا۔ پنڈتوں نے کہا کہ پہلے تین جگ اور بہت سا حصہ چوتھے جگ یعنی کل جگ کا گذر چکا ہے۔ اور جس طرح کہ ان جگوں کے خاتمہ پر دنیا قائم رہتی رہی ہے۔ چوتھے جگ کے ختم ہونے پر ایسا نہ ہوگا بلکہ دنیا "مہا پرلے" ہو کر نابود ہو جائے گی۔ اور تمام چیزیں اپنے اپنے مبدا کی طرف عود کر جائیں گی۔ جب میں نے پنڈتوں کو اس بات کے لئے مجبور کیا کہ وہ دنیا کی عمر مجھے ٹھیک ٹھیک بتلائیں تو انھوں نے کئی مرتبہ حساب لگایا مگر جب میں نے دیکھا کہ وہ بیچارے اس میں بالکل اُلجھے ہوئے ہیں اور صرف لاکھوں کی تعداد کی نسبت اُن کا اختلاف ہے تو میں نے اپنے تئیں اسی

۱؎ تعجب ہے کہ مصنف نے ہندوؤں کی پرستش کے طریقہ کو تو اعتراض کی نظر سے دیکھا لیکن اپنے طرز عبادت کی بیہودگی پر جو گرجاؤں میں حضرت مسیح اور حضرت مریم کی شبیہیں اور پطرس حواری کے جوتے کی نقل رکھتے اور ان کو مقدس جان کر اُن کی پرستش اور ہندوؤں کی طرح دھوپ دیپ کرتے اور گھنٹے بجاتے ہیں غور نہ کی اور انجیل مقدس کی اُس آیت پر عمل نہ کیا جو لکھا ہے "تو اگر اپنے بھائی کی آنکھ سے تنکا نکالنا چاہے تو اول اپنی آنکھ کا شہتیر نکال" افسوس انسان خواہ کیسا ہی عقلمند اور ذی علم کیوں نہ ہو اُس کو اپنے مذہب کے رسوم اور عقائد کی بُرائی کبھی نہیں معلوم ہوتی۔ اور اُس کی طبیعت ہمیشہ غیروں ہی کی عیب جوئی پر متوجہ اور مائل رہتی ہے اور اُن کے ہنر اور خوبیاں کبھی اُس کو بُرائی اور عیب ہی معلوم ہوتی ہیں۔ س م ح

عام واقفیت پر مطمئن کر لیا کہ یہ دنیا نہایت ہی قدیم اور اس کی عمر کا حساب بڑا ہی تعجب انگیز ہے۔ جب کوئی شخص کسی پنڈت سے وہ وجوہ پوچھتا ہے جن سے کہ دنیا کے بے حد پرانا ہونے پر وہ اپنا اعتقاد رکھتے ہیں۔ تو وہ ایک قسم کے بے فائدہ افسانے سنانے لگتا ہے۔ اور آخر یہ کہدیتا ہے کہ بید میں ایسا ہی لکھا ہے[1]۔

پنڈتوں کے نزدیک دیوتاؤں کی حقیقت پھر میں نے اُن کے دیوتاؤں کی حقیقت کی نسبت اُن سے دریافت کیا مگر اُن کا بیان نہایت منتشر پایا۔ اُنھوں نے کہا کہ ہمارے دیوتا تین قسم کے ہیں۔ نیک۔ بد۔ اور نہ نیک نہ بد۔ بعض کا اعتقاد ہے کہ دیوتا آگ سے بنے ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ نور سے۔ اور بہتوں کی یہ رائے ہے کہ وہ بیاپک ہیں۔ اور لفظ بیاپک کے معنی میں بجز اس کے کچھ نہیں سمجھا کہ خدا بیاپک ہے۔ ہماری روح بیاپک ہے۔ اور جو چیز بیاپک[2] ہے وہ لازوال ہے) اور زمان و مکان سے مبرا و منزہ ہیں۔ اُس فاضل فقیر اور اُس کے ساتھی پنڈتوں نے کہا کہ بعض پنڈت دیوتاؤں کو اجزاء ذاتِ الٰہی کہتے ہیں اور بعض کی یہ رائے ہے کہ دیوتاؤں کے مختلف اقسام ہیں جو زمین پر پھیلے ہوئے ہیں۔

لنگ شریر کا مسئلہ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے اُن سے لنگ شریر کے مسئلہ کی نسبت بھی سوال کیا تھا جس کو اُن کے بعض مصنف مانتے ہیں۔ مگر جو واقفیت مجھے اپنے پنڈت سے حاصل ہو چکی تھی اُس سے کچھ زیادہ حال معلوم نہیں ہوا۔ یعنی یہ کہ چھوٹے چھوٹے نباتات اور درختوں اور حیوانات کے بیج نئے پیدا نہیں ہوتے بلکہ ابتدائے آفرینش سے ان کا وجود چلا آتا ہے۔ اور وہ ادھر اُدھر بکھرے ہوئے اور دوسرے مادوں میں ملے جلے پڑے رہتے ہیں اور نہ صرف احتمالاً بلکہ حقیقتاً وہ بیج بالکل ویسے ہی کامل ہیں جیسے کہ خود وہ نباتات یا درخت یا حیوان جس کے وہ بیج ہیں۔ لیکن وہ اپنی اس حالت میں ایسے چھوٹے اور باریک ہیں کہ اُن کے جُدا جُدا اجزا اُسی وقت صاف طور پر نظر آسکتے ہیں جب کہ وہ اپنی مناسب جگہ پر لائے جاتیں اور وہاں پرورش کے مادہ کے پہنچنے سے بخوبی نمایاں

---

[1] جیسا یہوں بلکہ مسلمانوں کے پاس بھی بجز اس کے کہ توریت مقدس کا حوالہ دیں دنیا کی عمر کے شمار کی نسبت کوئی دلیل نہیں ہے۔ س م ح

[2] فارسی خواں ناظرین کو لفظ بیاپک "با ہمہ و بے ہمہ" کے مرادف المعنی سمجھنا چاہیے۔ س م ح

ہوں اور ترقی پائیں۔ پس ہر ایک سیب یا ناشپاتی کے درخت کا بیج لنگ شریر یعنی سیب یا ناشپاتی کا ایک چھوٹا درخت ہے جو اپنے تمام ضروری اجزا میں کامل ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس ایک گھوڑے یا ہاتھی یا آدمی کا بیج لنگ شریر یعنی ایک چھوٹا گھوڑا یا ہاتھی یا آدمی ہے جس کے واسطے صرف جان اور پرورش کے مادے کی ضرورت ہے تاکہ وہ صاف طور پر اپنی صورت مرئیہ عرفیہ کو حاصل کر سکے۔

وحدت الوجود اب میں آپ کو ایک اور مسئلہ کی نسبت ایک بحث کا حال سناتا ہوں۔ تھوڑا ہی عرصہ گذرا کہ اس مسئلہ کی بابت ہندوستان میں بڑا شور و غل تھا یہاں تک کہ بعض پنڈتوں نے اس کو شاہجہاں کے بیٹوں داراشکوہ اور سلطان شجاع کے بھی ذہن نشین کرا دیا تھا۔ آپ اس بات کو یقیناً جانتے ہیں کہ اکثر قدیم حکما لائف گوئنگ پرنسپل یعنی وحدت وجود کے مشہور و معروف مسئلہ کے قائل ہیں اور اُن کا قول ہے کہ ہم تم جتنے جان دار مخلوقات ہیں سب ایک ہی وجود واحد کے اجزا ہیں۔ چنانچہ اگر ہم غور سے ارسطو اور افلاطون کی تصانیف کو دیکھیں تو غالباً ہم پر یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ وہ بھی اسی رائے کی طرف مائل تھے۔ اور یہی عقیدہ ہندوستان کے قریباً تمام پنڈتوں کا ہے اور یہ وہی مسئلہ ہے جس کی نسبت صوفیوں اور اکثر علماء ایران کے باہم لڑائی جھگڑے رہا کرتے ہیں۔ اور جس کو گلشن[1] راز میں جو ایک فارسی نظم کی کتاب ہے بڑے زور شور سے بیان کیا گیا ہے[2] فلڈ

[1] اس کتاب کے مصنف شیخ نجم الدین محمود ہیں جو تبریز کے قریب چبیتر نام ایک گاؤں کے رہنے والے اور مشاہیر مشائخ صوفیہ سے تھے۔ یہ کتاب انھوں نے ۷۱۷ھ کے ماہ شوال میں بعض مشائخ خراسان کی فرمائش پر تصنیف کی تھی جیسا کہ خود اُن کے اس شعر سے جو سبب تالیف کتاب میں لکھا ہے ظاہر ہوتا ہے "گذشتہ ہفت دہ از ہفت صد سال بز ہجرت ناگہاں در ماہ شوال" یہ کتاب بڑے رتبہ کی سمجھی جاتی ہے۔ اور اس لئے اکثر بزرگوں نے اس کی شرحیں لکھی ہیں۔ لیکن شرح موسوم بمفاتیح الاعجاز جو ۸۷۷ھ کے خاتمہ میں لکھی گئی تھی اور جس کے مصنف شیخ شمس الدین محمد جی لاہیجانی ہیں۔ جو فقرا کے سلسلہ نوربخشیہ کے بانی سید محمود نوربخش کے اعظم خلفا میں سے تھے۔ سب سے عمدہ سمجھی گئی ہے۔ چنانچہ علامہ قاضی نوراللہ شوستری نے اپنی مشہور کتاب مجالس المومنین میں لکھا ہے۔ کہ جب مصنف نے اس شرح کو لکھکر دیکھنے کے لئے ملا عبدالرحمٰن جامی

[2] رابرٹ فلڈ قوم کا انگریز تھا جو ۱۵۷۴ء میں پیدا ہوا تھا۔ یہ اپنے زمانہ میں ایک مشہور طبیب اور ایک ایسے فرقہ حکما کا پیرو تھا جو یہ خیال رکھتے تھے کہ ہماری روحیں سیدھی اُس مبدائے فیاض سے تعلق رکھتی

کی بھی یہی رائے تھی جس کو ہمارے نامور گیسینڈی نے نہایت قابلیت کے ساتھ رد کیا ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ ہمارے ہاں کے مہوس لوگ اکثر اس کے سبب سے خراب و برباد ہوتے ہیں۔ ہندو پنڈت اس مسئلہ کو تمام حکما سے زیادہ طول دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ خدا یا اس اعلیٰ وجود نے جس کو وہ اپنی زبان میں ایشر کہتے ہیں صرف یہی نہیں کہ اپنی ذات سے روح پیدا کی ہے بلکہ عموماً دنیا کی ہر ایک مادی اور جسمانی چیز کو بھی اسی طرح اپنی ذات سے پیدا کیا ہے۔ اور اس مسئلہ خلق عالم کو وہ اس طرح پر خیال نہیں کرتے کہ علتِ تامہ کا وجود معلولات کا مستلزم ہوتا ہے۔ بلکہ اس طرح پر تصور کرتے ہیں جیسے مکڑی جب چاہتی ہے اپنے ہی اندر سے جالا تن دیتی ہے اور جب چاہتی ہے اس کو سمیٹ لیتی ہے۔ پس ان خیال بند فلسفیوں یعنی پنڈتوں کا قول ہے کہ پیدائش صرف اس کا نام ہے کہ خدا نے اپنی ہی ذات کو پھیلا دیا ہے۔ یا یہ کہ ایک مکڑی کا تار ہے جو اس نے اپنے اندر سے نکال دیا ہے۔ اور فنا یہ ہے کہ خدا پھر اپنی ذات یا اس تار کو اپنے ہی میں کھینچ لے۔ چنانچہ قیامت کے دن جس کو وہ پرلے یا مہا پرلے کہتے ہیں۔ اور جس کی نسبت ان کا یہ عقیدہ ہے کہ اس وقت تمام چیزیں نابود ہو جائیں گی۔ خدا اپنے تمام

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ نمبر ا۔ کے پاس ہرات میں بھیجا تو انھوں نے اپنے جوابی خط کے شروع میں اپنی یہ رباعی لکھکر بھیجی۔ رباعی :- اے فقر تو نور بخش ارباب نیاز، خرم ز بہار خاطرت گلشن راز، یک نظرے بر من قلیم انداز، شاید کہ برم رہ حقیقت ز مجاز۔ س م ح

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ نمبر ۲۔ ہیں اور وہاں سے گوناگوں استفاضہ معلومات اور اسرار غیبی کا کرتی رہتی ہیں۔ اس شخص کے تخیلات کا بیان جن کا وہ معتقد تھا مختصر طور پر کرنا بہت مشکل ہے چنانچہ منجملہ ان کے اس کا ایک یہ عقیدہ تھا کہ وہ اس عالم میں دو طرح کی قوتوں کو موثر سمجھتا تھا۔ ایک قوت انقباضی۔ دوسری انبساطی اور ان پر کتنے ہی جنات کو موکل جانتا تھا۔ اور ان کے خاص طور کے اجتماعات کو باعث وجود امراض قرار دیتا تھا۔ اور اس بات کا معتقد تھا کہ مکرا کوزم کو جس کا ترجمہ عالم صغیر یا انسان کیا جا سکتا ہے۔ مے کرا کوزم یعنی عالم کبیر یا نیچر سے ایک خاص مشابہت اور مناسبت ہے۔ اس کے معتقدات خواہ کیسے ہی فضول اور لایعنی تھے مگر چونکہ اس نے ان کو بہت عمدگی سے معقولات کے پیرایہ میں بیان کیا تھا۔ اس لئے اس زمانہ کے حکما کو ان کی جانب متوجہ ہونا پڑا۔ یہاں تک کہ اول کیپ لر نام ایک حکیم نے اور بعد ازاں گیسنڈی نے اس کی تردید میں ۱۶۲۹ء میں کتابیں لکھیں۔ فقط

(ماخوذ از انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا) س م ح

اُن تاروں کو جو اُس نے اپنے اندر سے نکال کر پھیلا دیئے تھے۔ بالکلیہ اپنے اندر کھینچ لے گا اس لئے ان کی رائے ہے کہ جو کچھ ہم دیکھتے یا سُنتے یا سونگھتے یا چکھتے یا چھوتے ہیں ان میں کوئی چیز واقعی نہیں بلکہ تمام دنیا صرف ایک خواب وخیال ہے۔ پس جو طرح طرح کی چیزیں بذریعہ حواس ظاہری محسوس ہوتی ہیں وہ سب کی سب ایک ہی چیز ہیں۔ یعنی وہ سب حقیقتاً خدا ہیں جیسے کہ اکائی کے عدد کو باربار دوہرانے سے دس بنتے۔ سو اور ہزار کے اعداد بن جاتے ہیں اور دراصل وہ ایک ہی عدد ہے۔ لیکن اگر تم اُن سے اس بات کی کوئی دلیل پوچھو یا ذات الٰہی کے پھیل جانے اور پھر سمٹ جانے کی کچھ تشریح کراؤ اور طرح طرح کی صورتیں معلوم ہونے کی وجہ دریافت کرو۔ یا یہ پوچھو کہ خدا جو غیر جسمانی اور بقول تمہارے بیاپک اور غیر متغیر ہے تو پھر کس طرح اس قدر اجسام متعددہ اور ارواح مختلفہ میں تقسیم ہو گیا ہے تو وہ اس کی عجیب مثالیں بیان کریں گے۔ مثلاً یہ کہ خدا بمنزلہ ایک بڑے سمندر کے ہے جس میں بہت سے بُلبلے تیرتے رہتے ہیں۔ خواہ یہ بُلبلے کہیں چلے جائیں مگر وہ ہمیشہ اُسی سمندر اور اُسی پانی میں رہتے ہیں اور اگر وہ بیٹھ جائیں تو جس پانی سے وہ بنے تھے وہ اُسی سمندر میں مل جائیں گے[1]۔ یا وہ یوں کہیں گے کہ خدا ایک ایسی روشنی کی مانند ہے جو بے شمار شیشوں پر پڑ رہی ہے۔ پس اگرچہ ہر جگہ اُس ایک ہی روشنی کا جلوہ اور ظہور ہے۔ مگر جن چیزوں پر وہ پڑتی ہے اُن کی مختلف رنگتیں اس وجہ سے ہو جاتی ہیں کہ وہ مختلف صورتوں میں سے ہو کر اُن چیزوں پر پڑتی ہے۔ غرضکہ وہ تمہیں ایسی ایسی ناقابل تشفی تشبیہیں دے کر جن کو خدا سے کچھ بھی نسبت نہیں اور جو صرف جاہلوں کے فریفتہ کرنے کے لائق ہوتی ہیں ٹال دیں گے۔ اور ان سے جواب شافی کی اُمید کرنا بے فائدہ ہے۔ اگر کوئی اُن کو یہ جواب دے کہ مثلاً جو حباب ایک پانی پر ہیں۔ اگرچہ ویسے ہی دوسرے پانی پر بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں کئی پانی ایک نہیں ہیں۔ اور اسی طرح تمام دنیا پر آفتاب کی روشنی گو ایک سی ہے۔ لیکن سب جگہ وہی نہیں ہے۔ اور علیٰ ہذالقیاس تمہارے ان تمام تصورات پر اور بھی بڑے بڑے اعتراض ہو سکتے ہیں تو وہ پھر اسی طرح تشبیہوں اور استعاروں کو لے بیٹھیں گے جیسے کہ صوفی اپنی کتاب گلشن راز کے عمدہ اشعار کی طرف رجوع کیا کرتے ہیں۔

---

[1] مترجم کہتا ہے کہ اس مضمون کو ایک شاعر نے اپنے اس شعر میں خوب ادا کیا ہے ؎

دریا سے حباب کے ہو سوا تو اور نہیں میں اور نہیں ۔ مجھ کو نہ مجھ اپنے سے سوا تو اور نہیں میں اور نہیں

حرفِ آخر

اب میں اس ساری بیوقوفی اور اُس طفلانہ خوف وہراس' اور اس متوہمانہ اتقا اور سورج کے ساتھ ہمدردی کے خیالات (جو سورج کو اُس بدطینت اور کالی بلا سے نجات دلانے کی غرض سے سورج کی نسبت ظاہر کئے جاتے ہیں) اور اُس دکھاوے کی پاٹھ پوجا اور اشنان اور پن دان اور خیرات (جو برہمنوں کو دی جاتی یا دریاؤں میں پھینکی جاتی ہے)، اور عورتوں کی اُس مجنونانہ جرأت کہ اپنے ایسے خاوندوں کی لاشوں کے ساتھ بھی جل کر مرجاتی ہیں جن سے اُن کی حیات میں وہ اکثر نفرت کرتی رہتی تھیں اور فقیروں کے اُن طرح طرح کے مجنونانہ اعمال واشغال اور سب سے اخیر میں بیدوں اور ہندؤوں کی پوتھیوں کی اُس تمام خرافات کا ذکر کرنے کے بعد آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگرچہ زمانہ حال کے نکتہ چیں اٹھائیں سفر کے مصائب اور تکالیف اٹھاتے بغیر گھر بیٹھے ہی اپنی تحریروں کے دیدہ زیب سرنامے تحریر کرنا مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ مگر میرا یہ خط جو میرے ان دور دراز سفروں اور اس قدر تحقیقات اور فکر کا ایک بے سود نتیجہ ہے۔ اگر مندرجہ ذیل الفاظ کو میں اس کا عنوان قرار دوں تو کیا میں ایسا کرنے کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں رکھتا؟ اور وہ الفاظ یہ ہیں کہ "کیسے ہی نضول اور بے معنی خیال کیوں نہ ہوں پھر بھی انسان کے دل میں جگہ پا ہی جاتے ہیں"

آپ کی بڑی عنایت ہوگی اگر آپ چےپل صاحب کے نام کا ملفوفہ خط اُن کے حوالے کردیں گے۔ یہ چیپل صاحب ہی تھے جنھوں نے پہلے پہل آپ کے نامور اور ولی دوست گیسینڈی صاحب سے میری ملاقات کرائی تھی جو میرے حق میں بہت ہی مفید ثابت ہوئی ہے۔ اُن کی اس عنایت کا میں اتنا ممنون ہوں کہ جہاں میری تقدیر مجھکو لے جائے گی مجھے محبت کے ساتھ وہ ہر جگہ یاد رہیں گے۔ میں آپ کا بھی بڑا ممنون ہوں۔ اور نہ صرف اس وجہ سے کہ آپ میرے حال پر نظرِ عنایت مبذول فرماتے رہے۔ میں عمر بھر آپ کا ادب کرتا رہوں گا۔ بلکہ اس سبب سے بھی کہ آپ اپنے متواتر خطوط میں اکثر مجھے فائدہ مند صلاحیں دیتے رہے ہیں جن سے میرے سفر میں مجھے بہت مدد ملی۔ اور میں اس وجہ سے بھی آپ کا بڑا احسان مند ہوں کہ آپ نے اپنی بے غرضانہ عنایت سے دنیا کے اس بعید حصّہ میں جہاں میرا شوق مجھکو لے آیا ہے میرے لئے عمدہ عمدہ کتابیں بھیج دی ہیں۔ حالانکہ جن لوگوں سے میں نے کتب مذکورہ کے لئے درخواست کی تھی۔ اور جن کو اُن کی قیمت کا روپیہ مقام مارسلیس میں میرے زرِ امانتی

ملہ اس سبب سے کہ اس خط میں ہندوستان کے متعلق کوئی امر درج نہ تھا اس کا ترجمہ چھوڑ دیا گیا ہے۔ بس م ح

سے مل سکتا تھا۔ اور جن پر بہ لحاظ اہمیت اور انسانیت کے یہ بات فرض تھی کہ کتب مطلوبہ میرے پاس بھیج دیتے وہ مجھے بالکل ہی بھول گئے اور میرے خطوط کو دیکھکر ہنسا کئے گویا کہ انھوں نے مجھے ایسا گیا گذرا سمجھ لیا جس کا پھر کبھی منہ ہی نہیں دیکھنا ہے۔

خط

بنام مانشیور ڈی لاما تھی لی وے

یکم جولائی ۱۶۶۳ء ازدھلی

جو دہلی اور آگرہ کے شہر اور شہنشاہ مغل کے دربار کے متعلق لکھا گیا

صاحب من! میں خوب جانتا ہوں کہ جس وقت میں فرانس کو واپس آؤں گا تو سب سے پہلے آپ مجھ سے یہ پوچھیں گے کہ بمقابلہ پیرس اُس ملک کے صدر مقام آگرہ اور دہلی کی وسعت اور آبادی اور خوبصورتی کا کیا حال ہے۔ پس آپ کے شوق کی وجہ سے میں اول انھیں امور کو بیان کئے دیتا ہوں۔ اور اُن کے ضمن میں بعض اور حالات بھی پیش کروں گا۔ جن کی نسبت میرا خیال ہے کہ آپ غالباً اُن کو بھی دلچسپ تصور کریں گے۔

یورپ اور ہندوستان کی عمارتوں کا فرق ان دونوں شہروں کی خوبصورتی کی نسبت کچھ کہنے سے پہلے یہ بیان کرنا لازم ہے کہ ہندوستان میں مقیم اہل فرنگ کو حقارت کے ساتھ یہ کہتے دیکھکر کہ ان دونوں آگرہ اور دہلی اور ہندوستان کے دوسرے شہروں کی عمارتیں فرنگستان کی طرح خوش وضع نہیں ہیں۔ مجھے حیرت ہوئی۔ وہ اس پر غور نہیں کرتے کہ عمارات کی قطع اور وضع ہر ملک کی آب و ہوا کے لحاظ سے ہوتی ہے، مثلاً جس وضع کی عمارت پیرس اور لندن یا امسٹرڈم میں فائدے اور آرام کے اعتبار سے وہاں کے لائق ہے دہلی اور آگرہ میں بالکل کارآمد نہیں ہو سکتی۔ فرض کیجئے کہ یہ شہر ہندوستان میں آجاتیں اور یہاں کے شہروہاں جا رہیں تو ان کی عمارات کو توڑ پھوڑ کر بالکل ایک نئی قطع پر بنانا ضروری ہو جائے گا۔ بلاشبہ فرنگستان کے شہر بہت خوبصورت اور اُس ملک کی سرد آب و ہوا کے موافق ہیں۔ لیکن دہلی بھی اپنی وضع پر اس گرم ملک کی آب و ہوا کے لحاظ سے خوش وضعی سے خالی نہیں ہندوستان کی گرمی اس قدر شدید ہے کہ کوئی اور تو کیا، خود بادشاہ بھی پاؤں کی حفاظت کے لئے پاتابے نہیں پہنتا۔ اور صرف ہلکے سلیپر کی طرح کی ایک چیز پہنتا ہے۔ جسے

پاپوش" کہتے ہیں۔ اور سر کی محافظت کے لئے نہایت نفیس اور نازک قسم کے کپڑے کی ایک چھوٹی سی پگڑی ہوتی ہے۔ اور دوسرا لباس بھی ایسا ہی ہلکا پھلکا ہوتا ہے۔ گرمی کے موسم میں مکان کی دیوار یا سرہانے کے تکیہ پر مشکل سے ہاتھ یا سر رکھا جاتا ہے۔ اور چھ مہینے سے زیادہ ہر ایک متنفس مکان کے باہر بغیر کسی قسم کے سایہ کے سوتا ہے۔ عوام کا یہ حال ہے کہ گلیوں اور کوچوں ہی میں پڑے رہتے ہیں۔ اور بڑے بڑے تاجر اور آسودہ حال لوگ کبھی گھر کے صحن یا باغ میں اور کبھی مکان کے چبوترے پر جس کو پہلے سے پانی چھڑک کر ٹھنڈا کر رکھتے ہیں آرام کرتے ہیں۔ اب اس حالت میں اگر بالفرض پیرس کے مشہور محلے سینٹ جیکس یا سینٹ ڈینس مع اپنے بند وضع اور بے شمار منزلوں کے مکانات کے دہلی میں آجائیں تو میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا اُن میں یہاں کوئی رہ سکے گا۔ یا رات کو جب کہ ہوا کے حبس سے گرمی کے مارے دم گھٹنے لگتا ہے کوئی سو سکے گا؟ فرض کیجئے کہ ایک شخص گھوڑے پر پھر پھرا کر گھر میں آیا ہے۔ اور گرمی اور گرد کے مارے ادھ موا ہو رہا ہے۔ اور حسب معمول پسینہ میں تر بتر ہے تو کیا ہی لطف ہو اگر اس کو تنگ و تاریک زینہ سے چڑھ کر چوتھی یا پانچویں منزل پر جانا اور پھر وہاں ایسے کمرے میں ٹھہرنا پڑے کہ جہاں مارے گرمی کے دم گھٹ جاتے۔ ہندوستان میں اس قسم کی تکلیف کے سامان نہیں ہیں۔ یہاں تو سواری سے آکر فوراً تھوڑا سا تازہ ٹھنڈا پانی یا نیبو کا شربت پی لینا اور کپڑے اُتار کر اور منہ ہاتھ دھو کر سایہ میں پلنگ پر لیٹ جانا اور ایک دو خدمت گاروں کو یہ کہنا ہوتا ہے کہ بڑے بڑے پنکھے لے کر جھلنا شروع کریں۔

شہر دہلی اب میں آپ کو دہلی کی ٹھیک ٹھیک کیفیت سناتا ہوں۔ پھر آپ خود غور کر سکیں گے کہ یہ شہر خوبصورت ہے یا نہیں۔ قریب چالیس برس گذرے کہ شہنشاہ حال کے والد شاہجہاں نے اپنی دائمی یادگار کے لئے پُرانی دلی کے پاس ایک نیا شہر آباد کیا اور اُس کا نام اپنے نام پر شاہجہاں آباد یا اختصار کے لئے "جہاں آباد" رکھا۔ اور اس کے دارالسلطنت بنانے کے لئے یہ وجہ ظاہر کی کہ گرمی کی شدت کے سبب سے آگرہ بادشاہ کے قیام کے لائق نہیں

لہ شاہجہاں نامہ میں لکھا ہے کہ اس کی آبادی شاہجہاں کے جلوس کے بارھویں سال مطابق ۱۰۴۸ھ مطابق ۱۶۳۸ء میں شروع ہوئی تھی اور خافی خاں نے اپنی کتاب منتخب اللباب میں لکھا ہے کہ تاریخوں میں سے جو شعرا نے اس کی بابت کہی تھیں بادشاہ کو یہ مادہ پسند آیا "شد شاہجہاں آباد از شاہجہاں آباد" جس کو صاحب آثار الصنادید اپنی سند پر میر یحییٰ کاشی کا نکالا ہوا بتلاتے ہیں۔ س م ع

ہے لیکن اس سبب سے کہ اس کی تعمیر کے لئے اکثر مصالحہ پُرانی دلی کے آس پاس کے کھنڈرں سے بہم پہنچایا گیا تھا پردیسی آدمی پُرانے اور نئے شہر میں تمیز نہیں کرتے اور دونوں کو دہلی ہی سمجھتے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں اکثر یہ نیا شہر اپنے بانی ہی کے نام سے بولا جاتا ہے۔ بہرحال آسانی کے لئے میں نے بھی اہلِ یورپ ہی کا طریقہ اختیار کیا ہے۔

دہلی کا حصار شہر دہلی ایک ہموار زمین پر جمنا کے کنارے جو لوائر کے برابر ایک دریا ہے ہلالی صورت میں آباد ہے۔ اور اُس طرف کے سوا جدھر دریا کی وجہ سے (جس پر کشتیوں کا پُل بندھا ہوا ہے) محفوظ ہے۔ حفاظت کے لئے سب طرف پختہ شہرپناہ بنی ہوئی ہے۔ اور اگر اُن بُرجوں سے جو سو سو قدم کے فاصلہ پر شہرپناہ کے کنارے بنے ہوتے ہیں اور اس کچے پشتے سے جو قریب چار یا پانچ فرانسیسی فٹ کے برابر اونچا ہے قطع نظر کی جائے تو یہ بہت نامکمل ہے۔ کیونکہ نہ تو اس کے گرد خندق ہے اور نہ کوئی اور بچاؤ کا سامان ہے۔

یہ حصار اگرچہ شہر اور قلعہ دونوں پر محیط ہے لیکن اُس کی وسعت اس قدر نہیں کہ جتنی لوگ خیال کرتے ہیں۔ کیونکہ میں تین گھنٹہ کے عرصہ میں اس کے گرداگرد پھر گیا ہوں حالانکہ میں خیال کرتا ہوں کہ میرے گھوڑے کی چال فی گھنٹہ ایک لیگ فرانسیسی یعنی تین میل سے زیادہ نہ تھی[1] میں اس تخمینہ میں شہر کے گرد نواح کی بہت سی آبادیوں کو جو بہت دور تک لاہوری دروازہ کی جانب بستی چلی گئی ہیں اس میں شامل نہیں کرتا۔ اور نہ پُرانی دلی[2] کے اُس

---

[1] صاحب آثار الصنادید نے کتاب مرات آفتاب نما کے حوالہ سے لکھا ہے کہ سنہ ۲۳ جلوسی مطابق سنہ ۱۰۶۰ھ موافق ۱۶۵۰ء شاہجہاں کے حکم کے بموجب مٹی اور پتھر سے چار مہینے کے عرصہ میں ڈیڑھ لاکھ روپیہ کے خرچ سے فصیل تیار ہوئی۔ مگر دوسرے برس برسات میں اکثر جگہ سے گر پڑی اس واسطے ازسرنو چونہ اور پتھر سے بنانے کا حکم ہوا۔ اور سات برس کے عرصہ میں چار لاکھ روپیہ کے خرچ سے تیار ہو گئی۔ طول اس کا چھ ہزار چھ سو چونسٹھ گز کا ہے۔ اور چار گز کی چوڑی اور نو گز کی اونچی ہے اور اس میں ستائیس برج دس گز کے قطر کے ہیں۔ سنہ ۱۸۰۳ء میں جب سرکار عالیہ انگریزی کا تسلط ہوا تو یہ اکثر جگہ سے ٹوٹ رہی تھی جس کو بہت خوبی سے درست کرایا گیا اور اجمیری دروازہ کے باہر جو غازی الدین خاں فیروز جنگ پدر نظام الملک آصف جاہ کا مقبرہ تھا جو مدرسہ کے نام سے مشہور ہے اُس کو بھی اندر لے لیا گیا۔ اور قریب سنہ ۱۸۱۱ء کے اس کے گرد بھی شہرپناہ بنائی گئی۔ س۔م۔ح

[2] صاحب آثار الصنادید کی تحقیق کے موافق پہلے اس شہر کا نام اندرپت تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس

بے شمار بقیہ کو اور ان تین چار چھوٹی چھوٹی بستیوں کو جو شہر کے نواح میں ہیں کیونکہ اُن کو شامل کر لینے سے شہر کی وسعت اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ اگر بیچوں بیچ ایک سیدھا خط کھینچا جائے تو ساڑھے چار میل سے زیادہ ہو اور اگرچہ باغات وغیرہ کے بیچ میں آجانے کی وجہ سے میں ٹھیک نہیں کہہ سکتا کہ شہر کا کُل دور کس قدر ہے لیکن کچھ شک نہیں کہ بہت ہی زیادہ ہے — قلعہ[1] جس میں شاہی محل سرا اور بادشاہی مکانات ہیں اور جن کا ذکر میں آئندہ کروں گا

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ باب میں بڑا اختلاف ہے کہ یہ نام بدل کر کب سے دہلی ہو گیا۔ مرات آفتاب نما میں لکھا ہے کہ یہ بات مشہور ہے کہ راجہ دلیپ نے جو چند رنبسیوں میں کا ایک راجہ تھا اپنے نام پر دلّی آباد کی لیکن یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی اس واسطے کہ ہندوؤں کی اگلی پوتھیوں میں باوجودیکہ راجہ دلیپ کا ذکر ہے مگر کہیں دہلی کا نام نہیں ہے۔ بلکہ جہاں لکھا ہے اندرپت ہی لکھا ہے۔ اور تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ ۔ سنہ ۳۰۷ مطابق سنہ ۴۴۰ء میں تو نوروں کے خاندان میں سے ایک راجہ نے شہر اندرپت کے ہمراہ دہلی بسایا اور اسی مصنف نے کتاب نزہۃ القلوب کے حوالہ سے لکھا ہے کہ چونکہ وہاں کی زمین نرم تھی اور ہندی میں دہلی نرم زمین کو کہتے ہیں جہاں میخ نہ تھم سکے اس سبب سے وہ بستی دہلی کے نام سے مشہور ہو گئی مگر اس سنہ میں نہ تو تونوروں کے خاندان میں حکومت تھی اور نہ اس سبب سے دہلی نام پڑ جانا قرین قیاس ہے اس واسطے یہ بات بھی قابل اعتماد نہیں۔ اور مشہور بات جو صحیح بھی معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ بقول صاحب مرآت آفتاب نما راجہ دہلو قنوج کے راجہ نے اس سبب سے کہ دلّی کے راجہ اکثر قنوج کے تابع رہے ہیں۔ اندرپت میں اپنے نام پر شہر بسایا اور جب سے اس کا نام دہلی مشہور ہوا۔ بلکہ اصلی نام دہلی کا دہلو ہے۔ جیسا کہ موافق روایت صاحب جواہر الحروف امیر خسرو نے جلال الدین فیروز شاہ کو خطاب کر کے دہلو کا لفظ اپنے اس شعر میں باندھا ہے ۔ یا یک اسپم بخش یا زاغور بفرما بارگی دہ یا بفرمان دہ کہ گردوں خنیم و دہلو روم ۔ راجہ دہلو راجہ پورس یعنی راجہ فور والی کمایوں کا ہم عصر تھا اور اسی کی لڑائی میں مارا گیا۔ اور قنوج تک راجہ فور کا عمل ہو گیا۔ اور اس کے بعد سکندر اعظم نے راجہ فور پر ستلج کے کنارے فتح پائی۔ اور گنگا کے کنارے یعنی قنوج تک عمل کر لیا۔ یہ واقعہ سنہ ۳۲۹ قبل ولادت مسیح علیہ السلام میں ہوا کہ تخمیناً یہی زمانہ دہلی شہر بسنے کا معلوم ہوتا ہے ۔ س م ح

[1] شاہجہاں نے اپنے جلوس کے بارھویں سال مطابق سنہ ۱۰۴۸ھ سنہ ۱۶۳۹ء میں شاہجہاں آباد کی آبادی کا حکم دیا اور بارھویں ذی الحجہ کو قلعہ بننا شروع ہوا۔ اُستاد حامد اور استاد احمد معمار جو اپنے فن میں یکتا تھے اس کی تعمیر کے لئے مقرر ہوئے پہلے عزت خاں کو اس کا اہتمام ملا۔ اور پانچ مہینے دو دن میں قلعہ کی بنیادیں کھدیں اور کچھ

تقریباً نصف دائرہ کی شکل کا ہے۔ اور سامنے دریائے جمنا بہتا ہے۔ اور قلعہ کی دیوار اور پانی کے مابین ایک ریتیلا وسیع میدان ہے جس میں ہاتھیوں کی لڑائی دکھائی جاتی ہے۔ اور امیروں اور سرداروں اور ہندو راجاؤں کی فوجیں بادشاہ کے ملاحظہ کے واسطے کھڑی کی جاتی ہیں جن کو بادشاہ محل کے جھروکوں میں سے دیکھا کرتا ہے۔

قلعہ کی دیوار اپنی پرانی وضع کے گول برجوں کے لحاظ سے شہرپناہ کے مشابہ ہے لیکن چونکہ یہ کچھ اینٹ اور کچھ لال پتھر کی بنی ہوئی ہے جو سنگ مرمر کے مشابہ ہے۔ اس سبب سے شہرپناہ کی بہ نسبت زیادہ خوبصورت ہے۔ اور شہرپناہ سے اونچائی چوڑائی اور مضبوطی میں بھی زیادہ ہے اور شہر کے رخ چھوٹی چھوٹی توپیں چڑھی ہوئی ہیں اور دریا کی جانب کے سوا قلعہ کے سب طرف پختہ اور عمیق خندق بنی ہوئی ہے۔ جس کی روکار کے پتھر صاف اور گھڑے ہوئے ہیں — اور جو پانی سے بھری رہتی ہے جس میں کثرت سے مچھلیاں ہیں۔ یہ عمارت اگرچہ بظاہر مضبوط نظر آتی ہے۔ لیکن اصل میں کچھ مستحکم نہیں ہے۔ اور میری دانست میں ایک متوسط طاقت کا توپ خانہ اس کو فوراً زمین کے برابر کر سکتا ہے۔ اس خندق کے قریب ہی ایک بڑا باغ ہے جو پھولوں اور پودوں سے ہمیشہ ہرا بھرا رہتا ہے۔ اور قلعہ کی عظیم الشان اور سرخ رنگ کی فصیل کے مقابل ہونے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ مصالحہ جمع ہوا۔ اور کہیں کہیں سے بنیاد اونچی بھی ہو آئی۔ پھر الہ وردی خاں کو یہ کام سپرد ہوا اور دو برس ایک مہینے گیارہ دن میں قلعہ کے سب طرف کی دیوار بارہ بارہ گز اونچی ہو گئی۔ پھر مکرمت خاں کا ذمہ ہوا۔ اور بیسویں سال جلوس یعنی قریب نو برس کے عرصہ میں سب کام تیار ہو گیا اور چوبیس ۲۴ ربیع الاول ۱۰۵۸ھ مطابق ۱۶۴۸ء یعنی تخت نشینی کے اکیسویں سال میں بادشاہ نے اس میں پہلا جلوس کیا۔ یہ ہشت پہلو بنا ہے۔ اور اس کا طول ایک ہزار گز اور عرض چھ سو گز کا ہے جس کی کل زمین چھ لاکھ گز ہوئی۔ اور اس حساب سے یہ اکبرآباد کے قلعہ سے دوگنا ہے۔ اس کی فصیل پچیس گز اونچی ہے، اور گیارہ گز گہری بنیاد ہے۔ دیوار کا عرض نیچے سے پندرہ گز اور اوپر سے دس گز کا ہے۔ اس کی خندق چوبیس گز چوڑی اور دس گز گہری بنی ہوئی ہے۔ جس کا محیط تین ہزار چھ سو گز کا ہے۔ اس قلعہ کی تعمیر میں پچاس لاکھ روپیہ خرچ ہوا تھا۔ اور کتاب مرآت آفتاب نما میں لکھا ہے کہ کروڑ روپیہ صرف میں آیا تھا۔ یعنی پچاس لاکھ قلعہ کے بننے میں۔ اور پچاس لاکھ اس کے اندر کے مکانوں کی تعمیر میں خرچ ہوا تھا۔

(از آثار الصنادید) (ص ۴۴)

کی وجہ سے بہت خوش نما معلوم ہوتا ہے ۔ اور اس باغ کے متصل ایک بادشاہی چوک ہے جس کے ایک طرف تو قلعہ کا دروازہ ہے ۔ اور دوسری جانب شہر کے دو بڑے بازار آن کر ختم ہوئے ہیں ۔ جو ملازم راجہ حسبِ معمول ہفتہ وار چوکی دینے آتے ہیں اُن کے خیمے اس چوکور میدان میں لگائے جاتے ہیں ۔ کیونکہ یہ لوگ جو ایک قسم کے چھوٹے چھوٹے بادشاہ ہیں قلعہ میں رہنے سے سخت عذر کرتے ہیں ۔ اس لئے قلعہ کے اندر کا پہرہ امرا اور منصب داروں کا ہوتا ہے اور اسی جگہ صبح کے وقت بادشاہی گھوڑے جو اس کے قریب ہی ایک بڑے اصطبل میں رہتے ہیں پھرائے جاتے ہیں ۔ اور یہیں سواروں کی فوج کا میر بخشی نئے بھرتی ہونے والے سواروں کے گھوڑوں کو دیکھتا بھالتا ہے ۔ اور اگر وہ ترکی نسل کے اور اچھے مضبوط اور پیمانہ کے پورے ہوں تو اُن کی ران پر بادشاہ کا اور اُس امیر کا داغ دلوا دیتا ہے جس کی فوج میں وہ بھرتی ہوتے ہیں ۔ اور اس سے یہ فائدہ ہے کہ انھیں گھوڑوں کو دوسرے نئے سوار مستعار لے کر حاضری کے وقت پیش نہیں کر سکتے ۔

جھوٹے غیب داں اسی جگہ انواع و اقسام کی بے شمار چیزوں کی خرید و فروخت کے لئے بازار لگتا ہے ۔ جو پیرس کے پونٹ نی آف[1] کی طرح ہر قسم کے کتھالوں، بھان متیوں، ہندو اور مسلمان نجومیوں اور رمالوں کا مرجع ہے اور یہ فاضل نجومی دھوپ میں ایک میلا سا قالین کا ٹکڑا بچھائے بیٹھے رہتے ہیں ۔ جن کے پاس علمی و ریاضی کے کچھ پرانے آلات ہوتے ہیں ۔ اور سامنے ایک بڑی سی کتاب کھلی رہتی ہے ۔ جس میں بارہ برجوں کی شکلیں بنی ہوئی ہوتی ہیں ۔ اور اس طور سے یہ راہ چلتے لوگوں کو پھسلاتے اور فریب دیتے ہیں ۔ اور عوام الناس غیب داں سمجھکر اُن سے رجوع کرتے ہیں ۔ اور یہ ایک پیسہ لے کر بیچارے حمقا کو بتاتے ہیں کہ اُن کی قسمت میں آئندہ کیا ہوتا ہے ۔ اور اُن کے ہاتھ اور چہرہ کو خوب دیکھ بھال کر اور کتاب کے ورق اُلٹ پلٹ کر یقین دلاتے ہیں کہ گویا واقعی کچھ حساب لگا رہے ہیں ۔ اور یہ لوگ جس کام کی بابت اُن سے سوال کرتے ہیں اُس کے لئے وقت اور " ساعت " یعنی مہورت بتاتے ہیں اور نادان عورتیں سر سے پاؤں تک ایک سفید چادر اوڑھکر اُن کے پاس جمع ہوتی ہیں ۔ اور اپنی تمام عمر کے معاملات کے بارے میں اُن سے پوچھ گچھ کرتی ہیں اور اپنے تمام دلی بھید اُن سے کہہ دیتی ہیں ۔ جس طرح فرانس

---

[1] ایک بڑے پُل کا نام ہے جو شہر پیرس میں ندی پر بنا ہوا ہے ۔ س م ح

میں ایک دسواں عورت اپنے پادری کے پاس جاکر توبہ کے قصد سے اپنے تمام گناہ ظاہر کردیتی ہے۔ اور یہ بیوقوف اور جاہل یقین رکھتے ہیں کہ ستاروں کی تاثیر کا بدل دینا ان لوگوں کے اختیار میں ہے۔ ان نجومیوں میں سب سے زیادہ مضحکہ خیز ایک دوغلہ پرتگیز تھا۔ جو گوآسے بھاگ آیا تھا۔ یہ مسخرہ بھی اپنا قالین بچھائے بڑی تمکنت سے بیٹھا رہتا تھا۔ اور اس کے پاس بھی بہت سے سائل آتے تھے۔ حالانکہ وہ کچھ لکھ پڑھ بھی نہ سکتا تھا۔ اور اُس کے پاس آلات نجوم کے بجائے صرف ایک پرانا جہازی قطب نما تھا۔ اور کتابوں کی جگہ رومن کیتھولک فرقہ کی نماز کی پرتگیزی زبان میں دو پرانی باتصویر کتابیں تھیں جن کی تصویروں کو کہتا تھا کہ فرنگستان میں برجوں کی صورتیں اسی طرح کی بناتے ہیں۔ ایک دن فرقہ جیسوئیٹ کے پیشوا فادر بوزی صاحب نے اس کو اس کام میں مشغول دیکھکر پوچھا کہ تو یہ کیا کرتا ہے تو اُس نے شرمندہ ہونے کی جگہ یہ جواب دیا کہ "ایسے بیوقوفوں کا نجومی ایسا ہی چاہیئے" یہ ذکر میں اُن غریب نجومیوں کا کرتا ہوں جو بازاروں میں دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن وہ منجم جو امیروں کے پاس آتے جاتے ہیں وہ اُن کو بڑا علامہ سمجھتے ہیں اور اس طرح یہ دولت مند ہو جاتے ہیں۔ تمام ایشیا میں یہ بے اصل وہم پھیلا ہوا ہے۔ اور خود بادشاہ اور بڑے بڑے امیران نجومی غیب گویوں کو بڑی بڑی تنخواہیں دیتے ہیں۔ اور بغیر ان کی اصلاح کے کوئی ادنیٰ کام بھی شروع نہیں کرتے یہ نجومی گویا آسمان میں لکھی ہوئی باتیں جانتے اور ہر ایک کام کے کرنے کے لئے مبارک گھڑی تجویز کرتے اور ہر ایک شبہ کو قرآن سے فال نکال کر حل کر دیتے ہیں۔

دہلی کے بازار

وہ دو بڑے بازار جن کا ابھی ذکر ہوا اور جو اس چوکور میدان میں آکر ملتے ہیں اُن کا عرض قریب پچیس یا تیس قدم کے ہوگا۔ اور جہاں تک کہ نظر پہنچتی ہے وہ سیدھے چلے جاتے ہیں۔ اور ان میں سے جو بازار لاہوری دروازہ کو جاتا ہے وہ بہت لمبا ہے۔ بہ لحاظ وضع عمارت یہ دونوں بازار ایک ہی سے ہیں اور جیسا کہ پیرس کا بازار معروف پلیس رائل ہے اسی طرح اُن کے بھی دونوں جانب کی دوکانیں محراب دار ہیں مگر اتنا فرق ہے کہ ایک تو ان کی عمارت خشتی ہے دوسرے یہ کہ یہ ایک منزلی ہیں۔ اور ان کی چھتیں ... یک سطح چبوترے کے کام دیتی ہیں۔ اور یہ بھی تفاوت ہے کہ پلیس رائل کی دوکانوں ... بنڈے اس قطع کے ہیں کہ اُن میں داخل ہوکر انسان بازار کے ایک سرے سے دوسرے تک جا سکتا ہے۔ اور ان کی دوکانوں کے برانڈے علیحدہ علیحدہ ہیں جن کے بیچ میں دیواریں

حائل ہیں جن میں بیٹھ کر دن کے وقت اہل حرفہ اور صرّاف اپنا اپنا کام کرتے اور بیوپاری اپنا مال خریداروں کو دکھاتے ہیں۔ ان محرابی برانڈوں کے پیچھے اسباب رکھنے کے لئے کوٹھریاں بنی ہوئی ہیں۔ جن میں رات کے وقت سب اسباب رکھ دیا جاتا ہے۔ اور اوپر بیوپاریوں کے رہنے کے لئے بالاخانے بنے ہوئے ہیں جو بازار کی طرف سے خوبصورت نظر آتے ہیں۔ اور ہوادار اور آرام کے قابل اور گرد و غبار سے محفوظ ہیں۔ اور اِن کے آگے برانڈے کی چھت جو صحن کے طور پر ہے جو لوگ ان میں رہتے ہیں وہ رات کو اُس پر سوتے ہیں۔ مگر ان اطراف میں کوٹھوں کے اوپر جو بالاخانے بنے ہوئے ہیں ---- - - - - - - - - - - - - - ۔اکثر ایسے پست ہیں کہ بازار میں سے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتے۔ متمول بیوپاری دوکانوں پر نہیں سوتے۔ بلکہ کام کاج کے بعد اپنے مکانوں کو جو شہر میں ہیں چلے جاتے ہیں۔

ان کے علاوہ پانچ بازار اور ہیں۔ اور اگرچہ اُن کی وضع قطع بھی اُنھیں کے قریب قریب ہے۔ لیکن ایسے لمبے اور سیدھے نہیں ہیں۔ اِن کے علاوہ گلیوں اور کوچوں میں جو بے شمار بازار ہیں۔ اور جو ایک دوسرے کو منقطع کرتے ہیں اُن میں سے اگرچہ اکثر کے سامنے کی عمارت محرابی طرز کی ہے مگر چونکہ وہ ایسے لوگوں کے بناتے ہوتے ہیں جن کو عمارت کے تناسب کا کچھ خیال نہ تھا۔ اس لئے ان بازاروں میں بہت کم ایسے خوش قطع اور سیدھے اور عریض ہیں جیسے کہ وہ بازار ہیں جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔

رہائشی مکان شہر کے گلی کوچوں میں جو منصب داروں اور حکام عدالت اور دولتمند تاجروں اور اور لوگوں کے مکانات ہیں۔ اُن میں بھی بہت سے اچھے خاصے خوش قطع ہیں۔ مگر اینٹ یا پتھر کے بنے ہوتے مکان بہت تھوڑے ہیں کچے اور خس پوش زیادہ ہیں۔ لیکن باوجود اس کے عموماً ہوادار اور خوش نما ہیں۔ اور اکثر مکانوں میں چوک اور باغیچے ہیں۔ بہت آرام دہ اور ہر قسم کے سامان سے آراستہ ہیں اور جو مکان خس پوش ہیں وہ بھی اچھے لمبے اور مضبوط بانس کے چھپروں سے چھائے ہوئے اور کہگل اور سفیدی کئے ہوتے ہیں۔ اور یہ بے شمار خس پوش اور چھوٹے چھوٹے مکانات جو بڑے بڑے مکانات کے ساتھ خلط ملط ہیں ان میں معمولی فوجی سوار اور اَن گنت نفر خدمتگار اور نان بائی وغیرہ جو بادشاہ اور لشکر کے ساتھ جایا کرتے ہیں رہتے ہیں۔ اور ان کے سبب سے شہر میں اکثر آگ لگ جاتی ہے۔ چنانچہ پچھلے برس تین بار ایسی آگ لگی کہ تیز ہوا کے

سبب ہے جو گرمی کے موسم میں چلا کرتی ہے۔ تقریباً ساٹھ ہزار چھپروں پر پانی پھر گیا اور چند اونٹ اور گھوڑے اور بہت سی پردہ دار عورتیں بھی جل بھن گئیں کیونکہ یہ بیچاریاں ایسی فریاد اور آپا دھاپی ہوتی ہیں۔ کہ نامحرم لوگوں سے منہ چھپانے کے سوا ان سے کچھ بن ہی نہیں آتا۔ چنانچہ جو عورتیں اس صدمہ سے ہلاک ہوئیں وہ اتنی ہمت نہ رکھتی تھیں کہ بھاگ کر بچ جائیں ان کچے اور خس پوش مکانوں کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ یہ خیال ہوتا ہے کہ سوائے اتنے فرق کے کہ آرام کے بعض سامان اس میں زیادہ ہیں۔ دہلی گویا چند دیہاتوں کا مجموعہ یا فوج کی چھاونی ہے

امراء کے مکان اکثر دریا کے کنارے اور شہر کے باہر ہیں۔ اس گرم ملک میں اسی مکان کو عمدہ سمجھتے ہیں جس میں سب طرح کا آرام ہو اور سب طرف کی اور خاص کر شمال کے جانب کی ہوا آتی ہو۔ چنانچہ وہ مکانات عمدہ سمجھے جاتے ہیں جن میں ایک اچھا صحن اور باغیچہ اور درخت اور حوض[1] اور دالان کے اندر یا دروازہ میں چھوٹے چھوٹے فوارے لگے ہوں۔ اور خوبصورت تہ خانے ہوں جن میں بڑے بڑے پنکھے لگے ہوئے ہوتے ہیں اور اپنی خنکی کی وجہ سے گرمی کے دنوں میں دوپہر سے چار یا پانچ بجے تک جب کہ ہوا ایسی گرم ہوتی ہے کہ سانس نہیں لیا جا سکتا بہت آرام کی جگہ ہوتی ہیں۔ مگر تہ خانوں کی بہ نسبت اکثر لوگ خس خانوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں جو چھوٹے چھوٹے پاکیزہ کمرے ہوتے ہیں جو ایک قسم کی گھاس کی خوشبودار جڑوں سے بنائے جاتے اور چمن کے اندر اس غرض سے حوض کے قریب لگائے جاتے ہیں کہ خدمت گار لوگ چمڑے کی ڈولچیوں سے ان پر باہر کی طرف سے آسانی کے ساتھ پانی چھڑک سکیں اور اس قطع کا مکان سب سے عمدہ خیال کیا جاتا ہے۔ جس کے چاروں طرف قدآدم اونچے دالان ہوں جن میں چاروں طرف کی ہوا آتی ہو۔ اور ایک بڑے چمن کے اندر بنا ہوا ہو۔ اور فی الواقع کوئی عمدہ مکان ایسا نہیں ہے جس میں گھر والوں کے سونے کے لئے صحن اور چبوترہ نہ ہو جہاں سے بارش یا آندھی کے وقت یا جب صبح کو سرد ہوا چلنے یا شبنم پڑنے لگتی ہے پلنگ کو سرکا کر اندر لے لیا جاتا ہے۔ یہ شبنم اگرچہ زیادہ نہیں ہوتی مگر بدن میں سرایت کر جاتی ہے۔ جس سے اکثر ہاتھ پاؤں اکڑ جاتے ہیں۔

[1] غالباً بارہ دری مراد ہے۔

اچھے گھروں میں نشست کا یہ طریقہ ہے کہ فرش کے اوپر روئی کا ایک بھاری اور قریب چار انگل کے موٹا گدیلا بچھا رہتا ہے جس پر گرمی کے دنوں میں عمدہ سفید کپڑا (چاندنی) اور جاڑوں میں ریشمین قالین بچھاتے ہیں۔ اور دالان کے صدر میں ایک دو گدیلے بچھے رہتے ہیں۔ جن پر ریشم کے ہلکے کام کی سوزنی جس پر سنہری اور روپہلی زری کی دھاریاں بنی ہوتی ہوتی ہیں پڑی رہتی ہے۔ اور صاحب خانہ اور معزز اور ممتاز لوگ جو ملاقات کو آتے ہیں اُس پر بیٹھتے ہیں۔ اور ہر ایک گدیلے پر کمخاب کا ایک گاؤتکیہ بھی لگا رہتا ہے اور اس کے علاوہ اہل مجلس کے آرام کے لئے دالان کے گرداگرد کمخاب اور مخمل اور پھول دار ریشمین کپڑے کے غلافوں کے چند اور تکیے بھی لگے رہتے ہیں۔ اور دالان کے چاروں طرف جو زمین سے قریب دو یا ڈیڑھ گز اونچے بہت معقول اور باقرینہ مختلف شکل کے طاق بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ اُن میں عمدہ عمدہ چینی کے برتن اور گلدان رکھے جاتے ہیں۔ اور دالان کی چھت منقش اور ملمع کاری کی ہوتی ہے مگر انسان یا کسی اور جان دار شے کی تصویر اُس پر نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ مذہب اسلام میں ممنوع ہے۔

یہ ہندوستان کے ایک عمدہ مکان کا قریباً صحیح نقشہ ہے۔ اور دہلی میں ایسے مکانات بہت سے موجود ہیں۔ اور میں فرنگستان کے مکانوں کی بجز سے صرف نظر کرکے بلا اندیشہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کی دارالسلطنت کی عمارتیں اگرچہ فرنگستانی عمارتوں سے کسی طرح کی بھی مشابہت نہیں رکھتیں۔ مگر تاہم خوبصورتی سے خالی نہیں۔ مگر جو چیز کہ فرنگستان کے شہروں کی زیب وزینت کا باعث ہے وہ خوش نما اور شان دار دکانیں ہیں جو دہلی میں نہیں ہیں اور اگرچہ یہ شہر ایک عالی شان اور طاقتور بادشاہ کے دربار کا مقام ہے۔ جہاں لازمی طور پر ہر قسم کی بیش قیمت اشیا کا جمع ہو جانا ایک ضروری امر ہے۔ تاہم کوئی ایسا بازار یہاں نہیں ہے جیسا ہمارا سینٹ ڈنیس ہے جس کا مقابل اور ہمسر غالباً تمام ایشیا میں نہ ہوگا۔

دہلی کی دوکانیں

یہاں بیش قیمت مال اکثر مال خانوں میں دھرا رہتا ہے۔ اور فرنگستان کی طرح دکانیں بھڑک دار اور بیش قیمت اسباب سے شاذونادر ہی آراستہ نظر آتی ہیں اور اگر ایک دکان میں پشمینہ کمخاب اور زری کار مندیلیں اور ریشمین کپڑے وغیرہ ہیں تو پاس ہی کوئی پچیس دوکانوں میں گھی تیل دال، چاول گیہوں جو وغیرہ بے شمار قسم کے اناج (جو نہ صرف ہندوؤں کی معمولی غذا ہے جو کبھی گوشت نہیں کھاتے۔ بلکہ غریب مسلمان اور بہت سے سپاہی بھی یہی کھاتے ہیں) ٹوکروں میں بھرے ہوئے دھرے نظر آتے ہیں۔

البتہ ایک بازار ایسا ہے جس میں میوہ کھلا رکھا رہتا ہے۔ اور اس میں بہت سی دکانیں ہیں جو گرمی کے موسم میں ایران، بلخ، بخارا اور سمرقند کے خشک میووں، بادام، پستہ، فندق، کشمش، سبز اور زرد آلو اور جاڑوں میں سیاہ اور سفید نہایت عمدہ تازے انگوروں (جو روئی کی تہہ میں لگائے ہوئے ان ملکوں سے آتے ہیں) ناشپاتی اور تین چار قسم کے سیب اور نہایت عمدہ سردوں سے جو جاڑوں بھر بکتے رہتے ہیں بھری رہتی ہیں مگر یہ میوے بہت مہنگے بکتے ہیں۔ چنانچہ ایک سردہ پونے چار روپیہ کو آتا ہے لیکن باایں ہمہ اہل دہلی کو سب میووں سے زیادہ مرغوب اور پسند ہے۔ امرا کے ہاں میوہ کثرت سے خریدا جاتا ہے۔ چنانچہ مجھے یاد ہے کہ میرے "آغا" کے ہاں اکثر صبح کے کھانے کے موقعہ پر کوئی پچاس روپیہ کا میوہ صرف میں آتا تھا۔

گرمی کے موسم میں دیسی خربوزہ بہت سستا ہوتا ہے۔ لیکن زیادہ لذیذ نہیں ہوتا۔ اور بجز اس کے کہ ایران سے بیج منگوا کر ایک اچھی اور کمائی ہوئی زمین میں بویا جائے جیسا کہ امرا اکثر کرتے ہیں عمدہ میسر نہیں آتا، مگر اس پر بھی اچھا اور عمدہ خربوزہ کمیاب ہے۔ کیونکہ یہاں کی زمین موافق نہیں ہے۔ اور ایک سال کے بعد یہ تخم بھی بگڑ جاتا ہے۔

گرمی کے موسم میں آم دو مہینے تک رہتے ہیں اور بہت کثرت سے اور سستے ملتے ہیں۔ لیکن دہلی میں جو آم پیدا ہوتا ہے وہ نہ تو کچھ اچھا ہی ہے اور نہ کچھ بُرا۔ اور سب سے عمدہ آم بنگالہ گولکنڈا اور گوآ سے آتا ہے۔ جو فی الواقع نہایت عمدہ ہوتا ہے۔ اور کوئی مٹھائی اس کی شیرینی اور خوشبو کو نہیں پہنچتی۔ تربوز سال بھر رہتا ہے۔ لیکن دہلی میں جو پیدا ہوتا ہے وہ نرم اور بے مزہ ہے۔ اور رنگت بھی اچھی نہیں ہوتی۔ البتہ کبھی کبھی امرا کے ہاں اچھا کھانے میں آتا ہے۔ جو باہر سے بیج منگوا کر بڑی احتیاط اور خرچ سے اگواتے ہیں۔

شہر میں حلوائیوں کی دکانیں کثرت سے ہیں۔ لیکن مٹھائی اچھی نہیں بنتی، گرد اور مکھیوں سے بھری رہتی ہے۔ نان بائی بھی بےشمار ہیں مگر ان کے تنور ہمارے ہاں کے تنوروں سے مختلف وضع کے ہیں اور بہت بُرے ہیں۔ اور اس سبب سے روٹی نہ تو عمدہ تیار ہوتی ہے اور نہ خوب سِکی ہوتی البتہ جو روٹی قلعہ میں پکتی ہے وہ کسی قدر اچھی ہوتی ہے امرا تو اپنے گھر پر ہی تیار کرا لیتے ہیں۔ اور اس وجہ سے نہایت عمدہ ہوتی ہے۔ اس میں دودھ مکھن اور انڈا خوب ڈالا جاتا ہے۔ اور اگرچہ خوب پھول جاتی ہے۔ مگر مزا جلی ہوئی کا سا

ہوتا ہے۔ اور زیادہ ترکیک جیسی ہوتی ہے اور پیرس کی "گالن" اور دوسری روٹیوں کو ہرگز نہیں پہنچتی۔ اگرچہ بازار میں کئی قسم کے کباب اور قلیہ وغیرہ بکتا ہے لیکن اس کا کچھ اعتبار نہیں کہ کس جانور کا گوشت ہے۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ کبھی کبھی اونٹ یا گھوڑے۔ یا قریب المرگ بیل کا گوشت بھی ہوتا ہے۔ غرض کوئی کھانا جو گھر میں تیار نہ ہوا ہو صحت کے لئے مفید نہیں ہے۔ دہلی کے ہر گلی کوچے میں گوشت بکتا ہے۔ لیکن بکری کے گوشت کی جگہ دھوکے سے بھیڑ کا گوشت بھی دیدیتے ہیں۔ پس اس فریب سے بچنے کے لئے ہوشیار رہنا چاہیئے۔ بیل کا گوشت اور خاص کر بھیڑ کا۔ اگرچہ مزے میں بُرا نہیں ہوتا۔ لیکن گرم زرا زیادہ ہوتا ہے۔ نفخ پیدا کرتا اور دیر ہضم ہوتا ہے۔ حلوان کا گوشت سب سے عمدہ ہوتا ہے۔ مگر چونکہ بازار میں شاذونادر ہی ملتا ہے۔ اس لئے زندہ جانور خریدنا پڑتا ہے۔ لیکن اس میں یہ بڑی دقت ہے کہ اس ملک میں صبح کا گوشت شام تک نہیں ٹھیرتا۔ دوسرے یہ کہ جانور دُبلے ملتے ہیں۔ اور اس وجہ سے گوشت بے مزہ ہوتا ہے اور قصائیوں کی دکانوں میں دُبلی بکریوں کا گوشت ملتا ہے جو اکثر سخت ہوتا ہے۔ لیکن خصوصیت سے میرا اس بارے میں شکایت کرنا نامناسب ہے۔ کیونکہ جب سے کہ میں اِن لوگوں کے رویہ سے واقف ہوگیا ہوں ایسا کم اتفاق ہوا ہے کہ مجھکو روٹی یا گوشت اچھا نہ ملا ہو چنانچہ میں خاص بادشاہی باورچی خانہ کے داروغہ کے پاس قلعہ میں اپنا نوکر بھیج دیتا ہوں اور وہ خوشی سے عمدہ کھانا دیدیتے ہیں جس پر اُن کی لاگت اگرچہ کم لگی ہوتی ہے۔ مگر میں برضامندی ایک اچھی قیمت دیدیتا ہوں چنانچہ میرا "آغا" مجھ سے یہ بات سُن کر بہت ہنسا کہ میں برسوں سے چوری اور چالاکی سے اپنا گزارہ کرتا ہوں۔ ورنہ پونے چارسو روپیہ میں جو مجھے آپ کی سرکار سے ملتے ہیں فاقوں کے مارے مرجاتا حالانکہ فرانس میں صرف آٹھ آنہ روز میں ایک پادشاہ کا سا کھانا کھا سکتا ہوں۔

مچھلی اور پرندے

خصی مرغ دہلی میں بالکل نہیں دکھائی دیتا۔ کیونکہ اس ملک کے لوگ جانوروں پر عموماً رحم کرتے ہیں۔ اگرچہ انسانوں پر رحم نہیں کرتے۔ جن کو محل سرا کے کام کے لئے خوجہ بناتے ہیں۔ لیکن پرند جانور کثرت سے بازار میں بکتے ہیں اور اچھے اور سستے بھی ہیں۔ چنانچہ ایک چھوٹی قسم کی مرغی جس کا چمڑہ سیاہ ہوتا ہے۔ اور جس کا نام میں نے "حبشی" رکھا ہے وہ بھی بکتی ہے۔ کبوتر بھی ملتے ہیں مگر بچے نہیں ملتے

کیونکہ ہندوستان کے لوگ بچوں کا مار ڈالنا بے رحمی کا کام سمجھتے ہیں۔ تیتر بھی ملتے ہیں مگر ہمارے ملک کے تیتر سے چھوٹے ہوتے ہیں۔ اور اس سبب سے کہ جال سے پکڑ کر دور سے زندہ لاتے ہیں۔ ایسے اچھے نہیں ہوتے جیسے کہ اور پرند ہوتے ہیں یہی کیفیت مرغابیوں اور خرگوشوں کی ہے جو زندہ پکڑے جا کر بغیرے کے پنجرے بھرے ہوئے شہر میں آتے ہیں۔ دہلی کی نواح کے ماہی گیر اپنے پیشہ میں ہوشیار نہیں ہیں۔ لیکن بعض اوقات اچھی مچھلی بھی بکتی ہے خصوصاً "سنگھاڑا" اور "روہو" جو اپنے ہاں کی پائک اور کارپ کی شکل کی ہوتی ہیں۔ مگر جاڑوں میں ماہی گیر مچھلی کم پکڑتے ہیں کیونکہ اس ملک کے لوگ سردی سے اس سے بھی زیادہ ڈرتے ہیں جتنا کہ اہل فرنگ گرمی سے خوف کرتے ہیں۔ اور اس موسم میں اگر اتفاق سے کوئی مچھلی آجاتی ہے تو خواجہ سرا اُس کو فوراً خرید لیتے ہیں۔ کیونکہ وہ خاص طور سے اس کے شائق ہیں اور مجھے معلوم نہیں کہ اس کا سبب کیا ہے۔ امرا کوڑے کے زور سے جو ہمیشہ اُن کے دروازہ پر لٹکتا رہتا ہے اِن کو ہر ایک موسم میں مچھلی پکڑنے کو بھیجتے ہیں۔

بادۂ فرنگ اب میرا یہ بیان سُن کر آپ غور فرما سکتے ہیں کہ کیا کوئی خوش خور شخص پیرس کو چھوڑ کر دہلی کی سیر کے لئے خوشی سے آئے گا؟ بے شک امیروں اور دولت مند لوگوں کو ہر ایک شے میسر ہے لیکن یہ صرف اُن کے ملازموں کی کثرت اور کوڑے اور روپیہ کے باعث سے ہے۔ دہلی میں متوسط الحال شخص کوئی نہیں ہے یا تو بڑے بڑے عالی رتبہ لوگ ہیں یا ایسے ہیں جن کی زندگی مصیبت سے بسر ہوتی ہے۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ میری تنخواہ بھی معقول ہے۔ اور میں خرچ بھی کرتا ہوں۔ لیکن بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ حسب دل خواہ کھانا نہیں ملتا۔ وجہ یہ کہ بازار میں اچھی چیز نہیں ملتی۔ اور اکثر وہی چیزیں ملتی ہیں۔ جن کو اُمرا نے ناپسند کر کے چھوڑ دیا ہو۔ شراب جو فرنگستان میں کھانے کا بڑا جزو سمجھی جاتی ہے۔ دہلی کی کسی دکان میں نہیں ملتی۔ اور اگرچہ یہیں انگور کی بن سکتی ہے۔ لیکن شرع اسلام اور شاستر کی رو سے برابر ممنوع ہے چنانچہ احمد آباد اور گولکنڈہ میں بعض ڈچ اور انگریزوں کے گھروں میں میں نے پی ہے جو بد مزہ نہ تھی اور سلطنت مغلیہ میں اگر کبھی عمدہ شراب ملتی ہے تو وہ شیراز یا جزائر کناری کی ہوتی ہے۔ چنانچہ شراب شیرازی تو ایران سے خشکی کی راہ سے بندر عباس میں پہنچ کر بذریعہ جہاز سورت میں آتی ہے۔ جہاں سے چھیالیس دن کے عرصہ میں دہلی میں پہنچ جاتی ہے

لہ یہ چھوٹے بڑے سات جزیرے ہیں جو شمالی حصہ بحر اٹلانٹک میں واقع ہیں۔ ان کا عرض شمالی ستائیس سے لے کر چالیس اور اُنتیس سے لے کر تیس تک اور طول غربی نصف النہار لندن سے تیرہ سے

اور جزائر کناری سے ڈچ لوگ سورت میں لاتے ہیں لیکن یہ دونوں قسم کے شراب اس قدر گراں قیمت ہیں کہ بقول اس ملک کے لوگوں کے ان کی قیمت ان کے مزے کو بے لطف کر دیتی ہے۔ چنانچہ ایک بڑا شیشہ جو تین انگریزی بوتلوں کے برابر ہوتا ہے۔ پندرہ یا سولہ روپیہ سے کم کو ہرگز نہیں آتا۔ اور جو شراب خاص اس ملک میں بنتی ہے اور جس کو یہاں عرق کہتے ہیں ایک قسم کی تیز اور تند شراب ہے۔ جو گڑ سے بھبکے میں کھینچ کر بناتے ہیں مگر اس کی فروخت کی بھی سخت ممانعت ہے اور سوائے عیسائی مذہب کے لوگوں کے علانیہ کوئی شخص نہیں پی سکتا۔ مگر یہ عرق

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ ۲۷ اور اٹھارہ سے لے کر ہیں تک ہے۔ ان کا رقبہ بحساب انگریزی میل مربع اور آبادی موافق شمار ۱۸۷۷ء حسب ذیل ہے۔

		آبادی	رقبہ
(۱)	جزیرہ ٹے ناریف	پچاسی ہزار	۸۷۷۶
(۲)	" کناری کلاں	اڑسٹھ ہزار	۷۵۸۲
(۳)	" پالا ما	تینتیس ہزار	۷۱۸۶۵
(۴)	" لیں زے روٹ	سترہ ہزار چار سو	۳۲۳۶۵
(۵)	" فیورٹی وین ٹورا	تیرہ ہزار آٹھ سو	۳۲۶۱۷
(۶)	" گومے را	گیارہ ہزار سات سو	۱۶۹۶۷
(۷)	" ہائی رو	چار ہزار چار سو	۸۲۶۲

ان میں سے پانچواں جزیرہ ساحل افریقہ کے زیادہ قریب ہے۔ اور فاصلہ صرف پچاس اور ساٹھ میل کے اندر ہے۔ ان کے سوا اور بھی بہت سے چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں۔ جو اکثر غیر آباد ہیں۔ یورپ کو پہلے پہل شہنشاہ اگسٹس کے زمانہ میں ان کا پتہ چلا۔ پلوٹارک اور بطلیموس نے بھی اپنے جغرافیوں میں چند سرسبز جزیروں کا ذکر کیا ہے لیکن وہ ایسا ناکمل ہے کہ صاف نہیں معلوم ہوتا کہ وہ جزائر ے ٹوی راس کا ذکر ہے یا کناری کا یہ سب کے سب فی الحال شاہ سپین کے قبضہ میں ہیں۔ اور لوگوں کی بلند قامتی کے لئے مشہور ہیں۔ آب و ہوا عموماً خوشگوار خشک اور صحت بخش ہے۔ اپریل سے اکتوبر تک شمالی یا شمال مشرقی ہوا چلتی رہتی ہے اور مشرقی ہوا کے ساتھ کہر پڑنی شروع ہو جاتی ہے مگر جاڑے کے موسم میں کبھی کبھی جنوبی مشرقی ہوا بھی چلتی ہے۔ جو براعظم افریقہ کی طرف سے آتی اور گرم ہوتی ہے۔ اور اس سبب سے بہت خرابیاں پھیلتی ہیں۔ اور بعض اوقات اس کے ساتھ ٹڈی بھی آتی ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ ۱۸۱۲ء میں اس قدر ٹڈی آئی تھی کہ زمین پر چار فٹ تہ چڑھ گئی تھی انگور یہاں بکثرت ہوتا ہے۔ اور سب سے بہتر شراب گوشہ شمال مغرب کے ساحل پر بنائی جاتی ہے۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹینکا)

س م ح

ولیسا ہی تند و تیز ہے جیسا کہ پولینڈ کے ملک میں اناج سے بناتے ہیں اور اگر اس کو تھوڑا سا بھی زیادہ استعمال کیا جاتے تو لا علاج اعصابی امراض اُس سے پیدا ہوتے ہیں۔ پس عقلمند آدمی یہاں یا تو صرف خالص پانی پینے کی عادت رکھے گا یا نہایت عمدہ نیبو کے شربت کی۔ جو تھوڑی سی قیمت میں میسر آ جاتا ہے۔ اور کچھ مضر نہیں کرتا۔ اصل یہ ہے کہ اس گرم ملک میں بہت ہی کم لوگوں کو شراب کی زیادہ خواہش ہوتی ہے۔ اور کچھ شبہ نہیں کہ یہ اپنی شراب نہ پینے کی عادت اور پسینہ کے بکثرت آتے رہنے کی وجہ سے بہت سی بیماریوں مثلاً نقرس سنگ مثانہ اور امراض گردہ اور زکام نزلہ اور چوتھیئے تپ کو جانتے بھی نہیں۔ اور جو لوگ ان امراض کے شاکی یہاں آتے ہیں جیسا کہ خود میرا حال مخا وہ بہت جلد بالکل اچھے ہو جاتے ہیں۔ اور اعضائے تناسل کی بیماریاں بھی جو اس ملک میں بکثرت ہیں اور ملکوں کی طرح نہ تو سخت ہی ہوتی ہیں اور نہ ویسے بُرے نتیجے ہی پیدا کرتی ہیں۔ البتہ اس ملک کے لوگ اکثر تندرست رہتے ہیں لیکن ویسی ہمت اور جرأت نہیں رکھتے جیسے کہ ہمارے سرد ملک کے لوگوں میں ہے۔ اور جسم اور طبیعت کی کمزوری اور کاہلی جو ملک کی نہایت درجہ کی گرمی کا نتیجہ ہے ایک ایسی بیماری سمجھنی چاہیئے جس میں ہر ایک شخص مبتلا ہے۔ اور جو انگلستان کے لوگوں پر جو گرمی کی برداشت کے عادی نہیں ہیں خصوصیت کے ساتھ اثر کرتی ہے۔

صناعی اور کاریگری دہلی میں ہنرمند کاریگروں کے کارخانے بالکل نہیں ہیں مگر اس کا سبب یہ نہیں کہ ہندوستانی لوگ صناعی اور کاریگری کی لیاقت نہیں رکھتے۔ کیونکہ ہندوستان کے ہر ایک حصہ میں بہت سے ہوشیار اور ذہین لوگ پائے جاتے ہیں اور بے شمار خوبصورت چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ جن کو لوگ بغیر کلوں کے بناتے ہیں۔ اور جنھوں نے شاید کسی اُستاد سے بھی تعلیم نہیں پائی ہوتی۔ اور بعض اوقات تو یہ لوگ یورپ کی چیزوں کی ایسے کامل طور سے نقل کرتے ہیں کہ اصل اور نقل میں فرق کرنا دشوار ہوتا ہے۔ چنانچہ منجملہ اس قسم کی اور اشیا کے نہایت عمدہ شکاری اور جنگی بندوقیں ہیں۔ اور سونے کے زیور تو ایسے عمدہ بناتے ہیں کہ کوئی یوروپین سنار اُن سے بڑھ کر شاید ہی بنا سکے۔

مصوری اور نقاشی کا بھی ایسا نازک اور باریک کام تیار کرتے ہیں کہ جسے دیکھکر میں اکثر حیرت میں آ گیا ہوں۔ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کی بڑی بڑی مہموں کی ایک شبیہہ جو ایک مشہور اور نامی مصور نے ایک ڈھال پر سات برس کے عرصہ میں تیار کی تھی اُس نے تو خصوصیت سے مجھ کو حیران کر دیا

اور میں نے اس کو ایک عجیب کام خیال کیا۔ مگر ہندوستانی مصور اکثر تصویروں میں تناسب اعضا اور اُن حالتوں کے ظاہر کرنے میں جو مختلف اوقات میں انسان کے چہرہ پر نمایاں ہوا کرتی ہیں کچے ہیں۔ لیکن اگر ان کو کوئی اچھا استاد اس فن کے اصول کی تعلیم دے تو یہ عیوب جلد رفع ہو سکتے ہیں۔ اور اس سے ظاہر ہے کہ ہندوستان کے اس دار السلطنت شہر میں دست کاری اور ہنرمندی کے اعلیٰ قسم کے نمونوں کا پایا نہ جانا لوگوں کی کند ذہنی اور ناقابلیت کی وجہ سے نہیں ہے اور اگر کاریگروں اور کارخانہ داروں کو کچھ ہمت دلائی جائے تو بے شک مفید اور عمدہ صنعتوں اور ہنروں کو ترقی ہو سکتی ہے۔ لیکن ان بیچاروں کو واجبی اُجرت بھی نہیں ملتی بلکہ ان کے ساتھ سختی برتی جاتی ہے۔ اور دولت مند لوگ ہر ایک چیز ارزاں قیمت پر لینی چاہتے ہیں۔ اور جب کبھی کسی امیر یا منصب دار کو کسی کاریگر کی ضرورت ہوتی ہے تو بازار سے بلوا لیتا ہے۔ اور بشرط ضرورت بیچارے جبراً کام لیتا ہے۔ اور چیز کے تیار ہو جانے پر اُس کی خوبی کے لحاظ سے نہیں بلکہ صرف اپنی اٹکل سے جو قیمت چاہتا ہے دیدیتا ہے۔ اور کاریگر کوڑوں کی مار سے بچ جانے ہی کو غنیمت سمجھتا ہے۔ پس اس حالت میں کیونکر ممکن ہے کہ کاریگر اور کارخانہ دار لوگ ایک دوسرے سے بڑھ کر ہنر دکھانے میں سعی کریں۔ بلکہ اُن کو تو شہرت اور ناموری پیدا کرنے کی کوشش کے بجائے صرف یہ فکر رہتی ہے کہ کہیں جلدی پیچھا چھوٹ جائے اور اس قدر ضروری مل جاتے جس میں اوقات بسر ہو جائے اس سبب سے صرف وہی کاریگر اپنے فن میں کسی قدر کمال پیدا کرتے ہیں جو بادشاہ یا کسی صاحبِ اقتدار امیر کے نوکر ہیں۔ اور صرف اپنے آقا کے لئے کام تیار کرتے ہیں۔

لال قلعہ قلعہ میں محل سرائے شاہی دوسرے اور محل ہیں۔ لیکن آپ یہ گمان کریں کہ ویسے ہی ہیں جیسے کہ لوترا یا اسکیوریل[1] ہیں۔ بلکہ ان کی کوئی چیز بھی فرنگستان کی عمارت کی عمارت کے مشابہ نہیں ہے اور جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا ہے مشابہ ہونا چاہیئے بھی نہیں کیونکہ ان کے لئے اس ملک کی آب و ہوا کے موافق عمدہ اور شان دار ہونا ہی کافی ہے۔

قلعہ کے دروازے قلعہ کے دروازے کی عمارت میں کوئی قابل الذکر چیز نہیں ہے بجز اس کے کہ پتھر کے دو بڑے ہاتھی بنا کر دونوں جانب کھڑے کئے ہوئے ہیں جن میں سے ایک پر چتوڑ کے مشہور و معروف راجہ جیمل کی مورت ہے اور دوسرے

---

[1] یہ بادشاہی محل ہیں جن میں سے پہلا فرانس میں اور دوسرا اسپین میں ہے۔ س م ح

پھر اُس کے بھائی فتا کی جو دونوں بڑے بہادر اور شجاع شخص تھے ۔ اور جن کی ماں اُن سے بھی زیادہ دلیر تھی ۔ اور جو شہنشاہ اکبر سے اس طرح جان توڑ کر لڑے تھے کہ ابدالاباد تک اُن کا نام رہے گا ۔ اس عظیم الشان بادشاہ نے جب ان کے شہر کو آن کر گھیر لیا تو یہ بڑے ہی استقلال کے ساتھ اُس سے مقابل ہوتے ۔ اور بجائے اس کے کہ اپنے دشمن کی جس کو اپنے زور اور قوت پر بڑا گھمنڈ تھا اطاعت قبول کریں اپنی اور اپنی ماں کی جان اپنے ملک پر قربان کر ڈالی ۔ اور یہ ان کی اس بے مثل جاں بازی ہی کی وجہ سے تو ہے کہ اُن دشمنوں نے بھی یادگار کے طور پر اُن کی مورتوں کا قایم رکھنا مناسب خیال کیا یہ ہاتھی جن پر یہ دونوں بہادر سوار ہیں بڑے شان و شکوہ کے ہیں ۔ اور ان کو دیکھکر رعب اور ادب کا ایک ایسا خیال مجھ پر چھا گیا جس کو میں بیان نہیں کر سکتا[1] ۔

اس دروازے سے قلعہ میں داخل ہو کر ایک لمبا اور وسیع راستہ ملتا ہے ۔ جس کے بیچوں بیچ پانی کی ایک نہر جاری ہے اور دونوں جانب پانچ یا چھ فرانسیسی فٹ اونچا اور چار فٹ چوڑا اُس طرح کا چبوترہ بنا ہوا ہے جیسا کہ پیرس کا پونٹ ڈی آف ہے جس کو چھوڑ کر دونوں طرف اخیر تک برابر برابر محراب دار دالان بنتے چلے گئے ہیں ۔ جن میں مختلف کارخانوں کے داروغہ اور دوسرے کم درجے کے عہدہ دار بغیر اس کے کہ گھوڑے اور آدمی جو نیچے آتے جاتے ہیں اُن سے اُن کو کچھ تکلیف پہنچے بیٹھے ہوئے اپنا اپنا کام کیا کرتے ہیں ۔ اور منصب دار جو رات کو چوکی دینے آتے ہیں وہ بھی اسی چبوترہ پر ٹھیرتے ہیں ۔

---

[1] مآثر عالمگیری میں لکھا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے گیارھویں سال جلوس مطابق سنہ ۱۰۷۹ھ میں پتھر کے دو پورے قد کے ہاتھی جو نہایت عمدہ صنعت سے بنے ہوئے اور دروازہ قلعہ کے دونوں جانب نصب تھے اور اسی وجہ سے اس دروازہ کو ہتھیا پول کہتے تھے شریعت کے لحاظ سے اٹھوائے تھے نعمت خاں عالی نے اپنی مشہور کتاب وقائع میں انی رائے نامی صیغہ حساب تنخواہ کے ایک عہدہ دار کی ہجو میں پھبتی کے طور پر جو یہ شعر لکھا ہے ع ۔ آں صورتِ مہاوتِ نیلانِ ہتھیا پول ہا را چہ نیل بند حساب و کتاب کرد اس سے بھی ان ہاتھیوں اور ہتھیا پول کا وجود ثابت ہوتا ہے ۔ اگرچہ یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ہتھیا پول قلعہ شاہجہاں آباد کے کون سے دروازہ کا نام تھا ۔ صاحب آثار الصنادید نے ان ہاتھیوں کو نقار خانہ کے دروازہ کے آگے بتایا ہے اور لکھا ہے کہ اس دروازہ کو اسی سبب سے ہتھیا پول کہتے تھے ۔ پس صحیح بات وہی ہے جو ڈاکٹر برنیر اور صاحب مآثر عالمگیری نے اپنی آنکھوں دیکھی ہوئی لکھی ہے ۔ س م ح

قلعہ کے درمیان سے ایک نہر گذرتی ہے جس نہر کا پانی اول محل سرا میں جاتا ہے۔ اور پھر وہاں سے موقعہ بموقعہ سب مکانوں میں پہنچتا ہے۔ اور اس کے بعد قلعہ کی خندق میں جا گرتا ہے اور یہ دہلی سے پندرہ یا اٹھارہ میل کے فاصلہ پر جمنا میں سے نکالی گئی ہے اور بڑی محنت سے میدان اور سخت پہاڑی زمین پر سے لائی گئی ہے[1]۔

قلعہ کے دوسرے دروازہ کے اندر کی طرف بھی ایک لمبی اور خاصی چوڑی سڑک ہے اور اس کے بھی دونوں جانب ویسے ہی چبوترے ہیں۔ لیکن محراب دار دالانوں کے بجائے دکانیں بنی ہوئی ہیں۔ اور سچ پوچھئے تو یہ ایک بازار ہے جو لداؤ چھت کی وجہ سے جس میں اوپر کی طرف روشنی اور ہوا کے لئے بڑے بڑے گول روشن دان بنے ہوئے ہیں۔ اور گرمی اور برسات میں بہت آرام دہ ہے۔ ان دونوں سڑکوں کے سوا دائیں بائیں اور بھی چھوٹی چھوٹی سڑکیں ہیں جو اُن مکانات کی طرف جاتی ہیں جہاں معمول کے موافق اُمرا باری باری ہفتہ میں ایک رات دن چوکی دیا کرتے ہیں۔ یہ مکانات جہاں اُمرا چوکی دیتے ہیں اچھے عمدہ ہیں کیونکہ یہ لوگ اُن کو اپنے خرچ سے آراستہ رکھتے ہیں۔ اور یہ سب بڑے بڑے دیوان خانے ہیں۔ اور ان کے سامنے باغیچے ہیں جن میں چھوٹی چھوٹی نہریں اور حوض اور فوارے بنے ہوتے ہیں۔ جس امیر کی نوکری ہوتی ہے اُس کے لئے کھانا بادشاہی خاصے میں سے آتا ہے

[1] صاحب آثار الصنادید نے کتاب مرآت آفتاب نما کے حوالہ سے اس نہر کی بابت یہ لکھا ہے کہ اوّل اس کو سلطان جلال الدین فیروز خلجی نے ۶۹۰ھ مطابق ۱۲۹۱ء میں پرگنہ خضر آباد میں دریا سے کاٹ کر تیس کوس تک پرگنہ سفیدوں میں جہاں اُس کی شکار گاہ تھی لاکر چھوڑ دیا تھا۔ پھر کسی بادشاہ کو اس کا خیال نہ رہا اور یہ بند ہوگئی ۹۶۹ھ مطابق ۱۵۶۱ء میں شہنشاہ اکبر کے عہد میں شہاب الدین احمد خاں صوبہ دار دہلی نے اس کو پھر صاف کرایا اور اپنی جاگیر تک لایا۔ اور نہر شہاب اس کا نام رکھا۔ مگر ایک مدت بعد پھر بند ہوگئی اور ۱۰۴۸ھ مطابق ۱۶۳۸ء میں شاہجہان کے حکم سے سفیدوں تک پھر صاف کی گئی اور وہاں سے آگے شاہجہاں آباد تک نئی کھودی گئی۔ اور جب قلعہ بن چکا تو قلعہ اور شہر میں جاری ہوئی۔ ایک عرصہ بعد اس کا پھر وہی حال ہو گیا تھا جو تخمیناً ۱۸۲۰ء مطابق ۱۲۳۶ھ میں سرکار عالیہ انگریزی نے اس کو پھر جاری کیا۔ اور آج تک یعنی جولائی ۱۸۸۵ء مطابق ماہ شوال ۱۳۰۲ھ نہایت خوبی اور صفائی سے جاری اور نہر جمن شرقی کے نام سے معروف ہے۔ س م ح

محل کے آنے کے وقت امیر کو ادائے شکر کے لئے بادشاہی محل کی طرف رخ کرکے تین دفعہ تسلیمات بجالانا یعنی زمین تک ہاتھ لے جاکر ماتھے تک لانا ہوتا ہے۔ اِن کے سوا مختلف مقامات میں سرکاری دفتروں کے لئے بہت سے دیوان خانے بنے ہوئے اور خیمے لگے ہوئے ہیں۔

کارخانجات قلعہ

ان میں سے جن بڑے دالانوں میں کاریگر بیٹھتے ہیں وہ مختلف کارخانوں کے نام سے موسوم ہیں۔ جن میں ایک ایک ماہر فن اُستاد کے تحت کام ہوتا ہے۔ کسی کارخانہ میں کارچوب اور چکن دوز اور زردوز وغیرہ کام کرتے ہیں۔ اور کسی میں سُنار اور کسی میں مصوّر اور نقّاش اور کسی میں روغن ساز اور کسی میں بڑھئی۔ اور خرادی اور کسی میں درزی اور موچی اور کسی میں دارائی اور چوڑیا اور کمخاب اور باریک ململ بننے والے جولاہے۔ جو پگڑیاں بنتے اور کمر باندھنے کے پھول دار زری کا پٹکے اور زنانے پاجاموں کے لئے ایسا نازک اور باریک کپڑا بناتے ہیں جو صرف ایک رات کے استعمال میں بیکار ہو جاتا ہے۔ یہ کپڑا جو صرف چند گھنٹے کام دیتا ہے۔ پچیس یا تیس روپیہ قیمت کا ہوتا ہے اور کبھی اس سے بھی زیادہ۔ جب کہ اس پر سوئی سے نہایت خوبصورت زری کا کام کیا گیا ہو۔ یہ تمام کاریگر علی الصبح اپنے اپنے کارخانوں میں حاضر ہوکر دن بھر کام کرتے اور شام کو اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ اور انھیں دھندوں میں اُن کی زندگی بسر ہوئی چلی جاتی ہے۔ اور جس حالت میں کوئی پیدا ہوا ہے اُس سے ترقی کرنے کے لئے کوئی بھی کوشش نہیں کرتا۔ مثلاً کارچوب و چکن دوز اور سوزن کار اپنے بیٹے کو اپنا ہی پیشہ سکھاتا ہے۔ اور سُنار کا بیٹا سُنار ہی ہوتا ہے۔ اور شہر کا طبیب اپنے فرزند کو علم طب ہی کی تعلیم دیتا ہے۔ یہاں تک کہ کوئی شخص اپنے پیشہ کے سوا دوسرے پیشہ والے کے ہاں شادی نہیں کرتا۔ اور اس رسم کی پابندی مسلمان بھی ایسی ہی سختی سے کرتے ہیں جیسا کہ ہندو جن کا شاستر یہی حکم دیتا ہے۔ اور اس کے باعث سے بہت سی خوبصورت لڑکیاں کنواری بیٹھی رہتی ہیں۔ حالانکہ اگر اُن کے والدین پیشہ اور ذات کا خیال چھوڑ دیں تو اُن کی شادی اچھی جگہ ہو سکتی ہے۔

عام وخاص اور نقارخانہ

اب ضروری ہے کہ میں عام وخاص کا ذکر کروں جو اِن مکانات میں سے گذر لینے کے بعد ملتا ہے اور فی الواقع بہت عمدہ اور عالی شان عمارت ہے۔ یہ ایک بڑا وسیع مربع مکان ہے جس کے چاروں طرف محرابیں ہیں

اور پلیس رائل سے مشابہ ہے ۔ اور صرف اس قدر فرق ہے کہ اس کے اوپر کچھ عمارت نہیں ہے ۔ اس کی محرابیں اس طرح بنی ہوئی ہیں کہ ایک محراب میں سے دوسری محراب میں جا سکتے ہیں اور ایک بڑا دروازہ جو اس کے سامنے ہے اُس پر ایک بڑا بالاخانہ بنا ہوا ہے ۔ جس کے دروازے اسی جانب ہیں اور چونکہ اس میں نفیریاں اور شہنائیاں اور نقارے وغیرہ رکھے رہتے ہیں اس کو نقار خانہ کہتے ہیں ۔ جو دن کو اور رات کو اوقاتِ معینہ پر اکٹھے بجائے جاتے اور نو وارد اہل فرنگ کے کانوں کو نہایت ہی کریہہ معلوم ہوتے ہیں ۔ کیونکہ دس بارہ نفیریاں اور اسی قدر نقارے ایک ہی دفعہ بجنے لگتے ہیں ۔ ان میں سے بڑی نفیری جس کو "قرنا" کہتے ہیں ۹ فٹ لمبی ہے ۔ جس کا نیچے کا منہ ایک فرانسیسی فٹ سے کم نہیں ہے اور لوہے یا پیتل کا سب سے چھوٹا نقارہ کم سے کم چھ فٹ قطر کا ہے ۔ پس اسی سے آپ قیاس کر سکتے ہیں کہ اس نقار خانے سے کس قدر شور و غل پیدا ہوتا ہوگا ۔ چنانچہ جب میں اوّل اوّل یہاں آیا تو شور کے مارے میرے کان بہرے ہو گئے ۔ لیکن عادت ایسی زبردست چیز ہے کہ اب رغبت سے سنتا ہوں خصوصاً رات کے وقت مکان کی چھت پر لیٹے ہوئے جب دُور سے اس کی آواز سُنائی دیتی ہے تو نہایت بھلی[له] اور سُریلی معلوم ہوتی ہے ۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ۔ کیونکہ ان کے بجانے والے بچپن ہی سے موسیقی کی تعلیم پاتے ہیں ۔ اور ان باجوں کی آواز کے اونچا نیچا کرنے اور سُریلی اور لے دار بنانے میں ایسے مشاق ہیں کہ فاصلہ سے سُنی جائے تو نہایت پیاری لگتی ہے نقار خانہ ہمیشہ ایک اونچے موقعہ پر اور بادشاہی محل سے دور رکھا جاتا ہے تاکہ بادشاہ کو اُس کی آواز سے تکلیف نہ ہو ۔ اس دروازہ کے مقابل جس پر نقار خانہ ہے صحن سے گذر کر ایک بڑا دالان ہے جس کے ستون اور چھت سنہری کام کے ہیں ۔ اور بہت اونچی کرسی کا اور بہت ہوادار اور تین طرف سے کھلا ہوا ہے اور اس دیوار کے وسط میں جو محل سرا سے اس کو جُدا کرتی ہے قدِ آدم سے کچھ اونچا ایک وسیع شہ نشین[ٹه] بنا ہوا ہے ۔ جہاں ہر روز بادشاہ دوپہر کے قریب آن کر تخت پر بیٹھتا ہے اور دائیں

له میر حسن نے اپنی بے نظیر مثنوی معروف بدر منیر میں کیا خوب کہا ہے ؎ سہانی وہ نوبت کی دھیمی صدا ۔ کہیں دور سے کان پڑتی تھی آ ۔

س م ح

ٹه آثار الصنادید میں اس کو نشیمن ظلّ الٰہی یا تخت سنگین کر کے لکھا ہے ۔ اور اس کی کیفیت یوں بیان کی ہے کہ دیوانِ عام کے مکان کے بیچوں بیچ میں شرقی دیوار سے ملا ہوا سنگ مرمر کا چار گز کا مربع تخت

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ ہے جس پر چار ستون لگا کر بالاخانہ کی طرح اُس کی چھت بنائی ہے۔ اور قدِ آدم سے زائد کرسی دی ہے۔ اور اس کے پیچھے جو سنگ مرمر کا سات گز لمبا اور ڈھائی گز چوڑا ایک طاق ہے اس پر ہر قسم کے چرند پرند کی تصویریں عجب عجب رنگین پتھروں کی بنی ہوئی ہیں۔ اور ایک آدمی کی تصویر ہے جو دوتارا بجا کر گا رہا ہے۔ یہ تصویر ملک اٹلی کے رہنے والے ا۔ فیوس نامے ایک کلاونت کی ہے۔ جس کی کہانی یوں مشہور ہے کہ وہ علم موسیقی میں اپنا نظیر نہیں رکھتا تھا۔ اور ایسا خوش آواز تھا کہ جب گانے بیٹھتا تو چرند پرند اُس کی آواز سے مست ہو کر اُس کے گرد آن بیٹھتے تھے۔ اور اس کہانی کے موافق اُسی ملک کے رہنے والے رفیل نامی ایک مصور نے جو اس فن میں بے مثل تھا اپنے خیال سے آرفیوس کے گانے کا ایک مرقع کھینچا تھا۔

یہ مصور ۱۵۲۰ء میں مرا مگر اُس کا یہ مرقع اٹلی اور فرنگستانی ملکوں میں بہت مروج اور نہایت مشہور ہے اور اب تک اُس کی نقلیں موجود ہیں۔ اور یہ وہی مرقع ہے جو پتھر کی پچی کاری میں یہاں بنایا گیا ہے اس مرقعہ کا فرنگستان کے سوا اور کہیں رواج نہیں تھا اس سے یقین ہوتا ہے کہ اس قلعہ کے بنانے میں کوئی نہ کوئی اٹلی کا رہنے والا فرنگی شریک تھا اس طاق کی بغل میں ایک دروازہ ہے اور اندر سے بھی آنے کا راستہ ہے۔ بادشاہ اس تخت پر دربار عام کے دن اجلاس کرتے تھے۔ اس تخت کے آگے ایک تخت سنگ مرمر کا بچھا ہوا ہے۔ اُمرا میں سے جس کسی کو کچھ عرض کرنا ہوتا تھا اُس پر چڑھکر بادشاہ سے عرض کرتا تھا۔ مگر بادشاہ کے بیٹھنے کا تخت اس قدر اونچا ہے کہ اس تخت کے چڑھنے پر بھی آدمی کا صرف گلا تخت تک پہنچتا ہے اس تخت کے آگے دالان در دالان ہے جو سٹرسٹھ گز لمبا اور چوبیس گز چوڑا ہے۔ اور ہر ایک دالان کے نو نو در ہیں۔ اور ان سب کے ستون سنگ سرخ کے ہیں۔ اور ان پر بہت خوبصورت محرابیں بنائی گئی ہیں۔ اور سفیدی گھونٹ کر سنہری نقاشی کی ہے۔ باہر کے دالان میں بیچ کے در چھوڑ کر سنگ مرمر کا کٹہرا لگایا ہے۔ جس پر بہت خوش نما سنہری کلسیاں تھیں۔ جو اب ایک بھی باقی نہیں۔ یہ دالان اُمرا اور وزرا اور وکلا کے حسب مرتبہ کھڑے رہنے کے لئے تھا۔ یہ دربار کا دالان درحقیقت ایک چبوترہ بنا ہوا ہے۔ جس کا ایک سو چار گز کا طول اور ساٹھ گز کا عرض ہے اس کے بیچ میں یہ دالان ہے۔ اور باقی تین طرف چبوترہ ہے جس کے گرد قدِ آدم سنگ سرخ کا کٹہرا لگا ہوا ہے۔ جس پر سنہری کلسیاں تھیں یہ جگہ چوب دار اور نقیب اور احدی وغیرہ لوگوں کے کھڑے رہنے کی تھی اور اس کو گلال باڑی کہتے تھے اور اس کے آگے دو سو چار گز لمبا اور ایک سو ساٹھ گز چوڑا صحن ہے اور اس کے چاروں طرف قرینہ اور سرنو سے مکانات بنے ہوئے ہیں۔ اور شمال کی طرف دیوان خاص میں جانے کا دروازہ ہے۔ س م ح

بائیں شہزادے کھڑے ہوتے اور خواجہ سرا مورچھل ہلاتے یا بڑے بڑے پنکھے جھلتے یا ادائے خدمات کے لئے نہایت ادب کے ساتھ دست بستہ کھڑے رہتے ہیں اور تخت کے نیچے کے مقام میں چاندی کا جنگلہ لگا ہوا ہے جس میں تمام اُمرا اور راجہ اور غیر ملکوں کے سفیر آنکھیں نیچی کئے ہوئے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ اور تخت سے کسی قدر فاصلہ پر اسی قاعدہ پر منصب دار یعنی چھوٹے امرا کھڑے رہتے ہیں۔ اور ان سے جو جگہ خالی رہتی ہے وہ اور بلکہ تمام صحن سب قسم کے لوگوں اعلیٰ اور ادنیٰ امفلس و غنی سے بھرا رہتا ہے۔ کیونکہ یہی مقام ہے جہاں رعایا کا ہر ایک متنفس اپنے عرض حال کے لئے باریاب ہو سکتا ہے۔ اور اسی وجہ سے اُس کو عام و خاص[1] کہتے ہیں اور ڈیڑھ یا دو گھنٹے تک لوگوں کا مجرا اور سلام ہوتا رہتا ہے۔ اور اس عرصہ میں کسی قدر خاصے گھوڑے سامنے کئے جاتے ہیں تاکہ بادشاہ خود ملاحظہ کر سکے کہ وہ کیسے آراستہ وپیراستہ ہیں۔ اور ان کے بعد ہاتھی آتے ہیں۔ جن کی میلی کھال خوب نہلا دھلا کر سیاہی سے رنگ دی جاتی ہے اور دو لال خط سر سے سونڈ کے اخیر تک جہاں دونوں آکر مل جاتے ہیں۔ کھینچ دیئے جاتے ہیں۔ اور زربفت کی جھول ڈال کر چاندی کے دو گھنٹے جو ایک نقرئی زنجیر میں بندھے ہوئے ہوتے ہیں پیٹھ پر سے دونوں طرف لٹکا دیئے جاتے ہیں اور سفید سرہ گائے کی دُمیں جو تبت سے آتی اور بیش قیمت ہوتی ہیں لٹکا دی جاتی ہیں جو بڑی بڑی مونچھیں سی معلوم ہوتی ہیں۔ اور دو چھوٹے ہاتھی جو وہ بھی خوب سجائے ہوئے ہوتے ہیں۔ خدمت گاروں کی طرح ان بڑے ہاتھیوں کے ساتھ رہتے ہیں اور یہ ہاتھی جھوم جھوم کر اور سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ گویا اپنے زرق برق ساز و سامان اور اپنی آن بان پر نازاں ہیں اور جب

---

[1] خافی خاں اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ چونکہ شاہجہاں سے پہلے بادشاہوں کے عہد میں دربار عام کے لئے کوئی ایسا بڑا مکان موجود نہ تھا جہاں دھوپ اور بارش سے بچاؤ ہو اس لئے شاہجہاں نے اپنے جلوس کے پہلے سال میں حکم دیا کہ قلعہ آگرہ اور لاہور اور برہان پور میں دربار عام کے لئے چالیس چالیس ستون کی تین عالی شان عمارتیں بنائی جائیں۔ اور تیار ہونے پر عام و خاص اُن کا نام رکھا۔ چنانچہ آگرہ کا عام و خاص جب تیار ہو گیا تو ملک الشعرا طالبائے کلیم نے اس کی تعریف میں یہ رباعی کہی۔ رباعی

این تازہ بنا کہ عرش ہمسایہ اوست — رفعت حرفے ز زینۂ پایۂ اوست
باغیست کہ ہر ستون سبزش سرو نست — کاسائش خاص و عام در سایۂ اوست — س م ح

تخت کے سامنے پہنچتے ہیں تو عادت جو گردن پر بیٹھا ہوا ہوتا ہے لوہے کی ایک نوک دار چیز (آنکس) چبھو کر اُن کو بڑھاوا دیتا اور زبان سے کچھ کہتا ہے۔ اور اُس وقت یہ جانور گھٹنا ٹیک کر اور سونڈ اوپر کو اُٹھا کر چنگھاڑتا ہے۔ جس کو لوگ اُس کی تسلیمات خیال کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد اور جانور پیش ہوتے ہیں۔ مثلاً سدھائے ہوئے ہرن جو لڑائے جاتے ہیں۔ نیل گائیں۔ اور گینڈے اور بنگالہ کے بڑے بڑے بھینسے جن کے سینگ ایسے بڑے ہوتے ہیں کہ اُن سے وہ شیر کے ساتھ لڑ سکتے ہیں۔ اور چیتے جن سے ہرن کا شکار کھیلا جاتا ہے اور ہر قسم کے خوبصورت شکاری کتے جو ملک اُزبک (بخارا وغیرہ) سے آتے ہیں۔ اور جن پر سرخ رنگ کی جھولیں پڑی ہوئی ہوتی ہیں پیش ہوتے ہیں۔ اور اخیر میں ہر قسم کے شکاری پرند جو تیتر۔ کلنگ اور خرگوش کو پکڑتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ہرن پر بھی چھوڑے جاتے ہیں۔ جن پر یہ نہایت تیزی کے ساتھ جھپٹتے اور پنجے اور چونچ مار مار کر اُن کو اندھا کر دیتے ہیں ان جانوروں کے پیش ہونے کے علاوہ اکثر اوقات ایک دو امیروں کے سوار بھی ملاحظہ کرائے جاتے ہیں جن کی پوشاک اس وقت روزمرہ کے لباس کی بہ نسبت ذرا مکلف ہوتی ہے۔ اور گھوڑوں پر پاکھریں پڑی ہوئی اور انواع واقسام کے زیور مثلاً ہیکل جھبے وغیرہ سے سجائے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور بادشاہ اس تماشے سے بھی اپنا دل خوش کرتا ہے کہ مُردہ بھیڑیں جن کا پیٹ صاف کر کے بھری دیا جاتا ہے۔ نوجوان اُمرا منصب دار گرز بردار۔ اور اعصا بردار اُن پر تلوار سے اپنے کرتب دکھاتے اور ایک ہی ہاتھ میں چونگ کاٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن یہ تمام اُمور دربار کے شروع میں ہوا کرتے ہیں۔ اور ان کے بعد زیادہ اہم معاملات پیش ہوتے ہیں اور بادشاہ نہایت توجہ کے ساتھ سواروں کو صرف دیکھتا ہی نہیں۔ بلکہ ان کے متعلق تفتیش حال بھی کرتا ہے۔ بلکہ جب سے لڑائی بند ہوئی ہے کوئی سوار یا پیدل ایسا نہیں جس کو بادشاہ نے بچشم خود نہ دیکھا ہو۔ اور اُس سے اپنی ذاتی واقفیت حاصل نہ کی ہو۔ چنانچہ اُس نے کسی کی تنخواہ بڑھا دی اور کسی کی کم کر دی اور کسی کو بالکل ہی موتوف کر دیا ہے۔

دادرسی

اس موقعہ پر مستغیث جو عرضیاں پیش کرتے ہیں وہ تمام وکمال بادشاہ کے ملاحظہ اور سماعت میں آتی ہیں۔ اور بادشاہ بذات خود مستغیثوں سے دریافت حال کرتا اور اکثر ستم رسیدہ لوگوں کی فوراً داد دیتا ہے اور ہفتہ میں ایک دن خلوت میں کامل دو گھنٹے تک ایسے دس غربا کی عرضیاں سنتا ہے جو مستغیثوں میں سے چُن لئے جاتے ہیں اور جن کے پیش

کرنے کا کام ایک نیک دولت مند اور مسن شخص کے سپرد ہے اور ایک دن عدل و انصاف کے کرنے میں جس کو "عدالت خانہ" کہتے ہیں دو بڑے قاضیوں کے ساتھ بیٹھکر داد رسائی کرتا اور اس میں کبھی ناغہ نہیں ہونے دیتا۔ اور اس سے بخوبی عیاں ہے کہ ایشیائی بادشاہ جن کو ہم اہل یورپ جاہل اور ناتراشیدہ خیال کرتے ہیں وہ ہمیشہ ہی اپنی رعایا کی داد دہی اور انصاف رسانی سے جو اُن پر واجب ہے غفلت نہیں کرتے۔

خوشامد لجاجت جو حالات اس دربار عام و خاص میں گذرتے ہیں اور جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے اگرچہ وہ سب معقول اور قابل احترام معلوم ہوتے ہیں لیکن جو کمینہ اور مکروہ خوشامد اور لجاجت ہمیشہ یہاں دیکھنے میں آتی ہے۔ اس کا تذکرہ بھی مجھ پر فرض ہے۔ چنانچہ جب کوئی اچھا لفظ بادشاہ کے منہ سے نکل جاتا ہے تو خواہ وہ کیسے ہی خفیف امر کی نسبت کیوں نہ ہو تمام دربار اور بڑے بڑے اُمرا آسمان کی طرف دونوں ہاتھ اُٹھا کر جس طرح کوئی خدا کی رحمت کو لیتا ہے اُس لفظ کو لے کر اور "کرامات کرامات" کہکر عرض کرتے ہیں کہ سبحان اللہ کیا ہی خوب ارشاد ہوا ہے۔ اور حقیقتاً مغلوں میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے کہ جس کو یہ بیت یاد نہ ہو اور وہ اس کو فخریہ طور پر نہ پڑھتا ہو۔

"اگر شہ روز را گوید شب ست ایں   بباید گفت اینک ماہ و پروین"

یعنی اگر بادشاہ رات کو دن بتائے تو کہدینا چاہیئے کہ دیکھئے وہ چاند اور ستارے نظر آ رہے ہیں۔ اور یہ خوشامد کا عیب کیا ادنیٰ کیا اعلیٰ سب میں موجود ہے مثلاً اگر کسی مغل کو مجھ سے معالجہ کی ضرورت پڑتی ہے تو اپنے معمول کے موافق تمام باتوں سے پہلے مجھکو یہ کہتا ہے کہ آپ تو اپنے وقت کے ارسطو اور بقراط اور بوعلی سینا ہیں۔ چنانچہ اول اول تو میں نے اِس حرکت کو روکنا چاہا اور کہا کہ جس قدر آپ میری یہ تعریف کرتے ہیں میں ہرگز اس کے لائق نہیں ہوں۔ اور مجھ کو اُن بزرگوں سے کچھ نسبت نہیں لیکن جب دیکھا کہ میرا انکسار اُن کو اور زیادہ مبالغہ کرنے پر آمادہ کرتا ہے تو مجبوراً اپنے کانوں کو اُن کی خوشامدی باتیں سننے کا ویسا ہی عادی بنالیا جیسا کہ اُن کے موسیقی کے باجوں کے سننے کا۔ اس موقعہ پر ایک لطیفہ آپ کو سناتا ہوں اس سے آپ کو یہاں کے لوگوں کا خاصہ طبعی معلوم ہو جائے گا۔ ایک پنڈت جس کی اپنے آقا سے میں نے ہی ملاقات کرائی تھی ایک روز اُس نے اپنے ایک اشلوک میں اوّل تو اُن کو اُن بڑے بڑے فتح مندوں سے جو دنیا میں شاذو نادر ہی پیدا ہوئے ہیں زیادہ بڑا بتایا۔ اور پھر سیکڑوں مہملات

امراء وا عیان تک کر اپنے کلام کے اخیر میں بڑی سنجیدگی سے یہ کہا ۔کہ جب آپ گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی سپاہ کے آگے آگے چلتے ہیں تو آپ کے قدموں کے نیچے زمین کانپنے لگتی ہے ۔کیونکہ وہ آٹھ ہاتھی جو اس کو اپنے سر پر اُٹھائے ہوئے ہیں اس غیر معمولی بوجھ کے اُٹھانے کی تاب نہیں لا سکتے" جس کو سُن کر میں بے اختیار ہنس پڑا اور اپنے "آغا" سے کہ میری طرح ان کو بھی ہنسی آگئی تھی شوخی کے ساتھ بہت سنجیدہ شکل بنا کر کہا کہ آپ ذرا سمجھ کر گھوڑے پر سوار ہوا کریں ۔ایسا نہ ہو کہ بھونچال آکر دنیا درہم برہم ہو جائے جس کے جواب میں انھوں نے فوراً یہ کہا کہ اسی وجہ سے تو میں پالکی میں سوار ہونا زیادہ پسند کرتا ہوں ۔

خلوت خانہ عام و خاص کے بڑے دالان کی بغل میں ایک خلوت خانہ ہے جسے غسل خانہ[1] کہتے ہیں ۔یہاں صرف چند ہی شخصوں کو حاضر ہونے کی اجازت ہے ۔اور یہ وسعت میں اگرچہ عام و خاص کے برابر نہیں ہے مگر وہاں کافی وسعت میں نہایت خوبصورت روغنی اور سنہری کام ہے اور ایک بڑے شہ نشیں کی طرح چار پانچ فرانسیسی فٹ کا اونچا ہے جہاں بادشاہ کرسی پر بیٹھ کر وزرا سے جو دھر اُدھر کھڑے ہوتے ہیں خلیہ میں امرا اور صوبہ داروں کے عرایض سنتا اور سلطنت کے اہم معاملات پر غور کرتا ہے اور جس طرح صبح کو عام و خاص کے دربار میں حاضر نہ ہونے کے باعث امرا پر جرمانہ کیا جاتا ہے یہاں شام کو نہ حاضر ہونے پر سزا ملتی ہے البتہ صرف میرے آغا دانشمند خاں ایک ایسے ہیں جن کو اُن کے علم و فضل اور شوق مطالعہ اور سر انجام امور ممالک غیر کی وجہ سے معافی حاصل ہے ۔لیکن چہار شنبہ کو جو اُن کی چوکی کا دن ہے اُن کو بھی اور امرا کی طرح حاضر ہونا پڑتا ہے ۔یہ دو وقتہ حاضری کی رسم نہایت پرانی ہے اور کوئی امیر بھی اس پابندی کی معقول طور پر شکایت نہیں کر سکتا کیونکہ خود بادشاہ سوائے کسی ضروری کام یا سخت بیماری کی حالت کے دونوں وقت دربار میں آنا اپنا فرض جانتا ہے ۔چنانچہ اورنگ زیب کی پچھلی خطرناک بیماری کی حالت میں بھی دربار کے دونوں

---

[1] پادشاہنامہ میں لکھا ہے کہ شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں قلعہ آگرہ میں محل سرا اور دیوان خانہ کے مابین ایک مکان تھا جس میں بادشاہ غسل کیا کرتا تھا اور خاص خاص لوگ اور وزیر اور بخشی بعض ضروری اور اہم معاملات میں وہاں حاضر ہو کر حکم حاصل کیا کرتے تھے شاہجہاں کے زمانہ میں جو نئی نئی عمارتیں بنائی گئیں تو اگرچہ بادشاہ نے اس مکان کا نام جہاں سلطنت کے نہایت مخفی اور اہم معاملات امرا و وزرا کے مشورہ سے طے کئے جاتے تھے دولت خانہ خاص رکھا لیکن لوگ اس کو بھی غسل خانہ ہی کہتے رہے اور اس لئے اگر بادشاہ سفر میں بھی ہوتا تھا تو خیام شاہی میں سے ایک خیمہ غسل خانہ کے نام سے نامزد رہتا تھا اگرچہ اس میں دربار خاص ہوتا تھا اور غسل کے کام سے کچھ علاقہ نہ رکھتا تھا ۔ م م ح

مقاموں میں نہیں تو ایک میں تو ضرور لوگ اُس کو اٹھا کرلے آتے تھے کیونکہ اُس نے رات دن میں کم از کم ایک بار لوگوں کو اپنا دیدار دکھا دینا واجب سمجھا تھا اس لئے کہ ایسا شدید جوار تھا کہ اُس کا صرف ایک دن کا دربار میں نہ آنا بھی تمام سلطنت میں فتنہ و فساد کے پھیل جانے اور شہر میں ہڑتال ہو جانے کا باعث ہو سکتا تھا۔

اگرچہ غسل خانہ کے دربار کے موقعہ پر بادشاہ اُن امور میں مصروف رہتا ہے جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔لیکن دربار عام و خاص کے دستور کے موافق یہاں بھی زیادہ تر وہی جانوروں کا ملاحظہ و مشاہدہ ہوتا رہتا ہے۔ مگر چونکہ کچھ دن باقی نہیں رہتا اور سامنے کا صحن بھی مختصر ہے اس لئے اُمرا کے رسالوں کا ملاحظہ نہیں ہو سکتا۔لیکن اس وقت کے دربار کی یہ خاص رسم ہے کہ جن منصب داروں کی چوکی دینے کی باری ہوتی ہے وہ بادشاہ کو نہایت ادب و تعظیم کے ساتھ سلام کرتے ہوتے بڑے قرینے اور ترتیب سے سامنے سے گذر جاتے ہیں۔جن کے آگے آگے لوگ "قور" ہاتھوں میں لئے ہوئے چلتے ہیں جو چند خوبصورت نقرئی چیزیں ہیں جو چاندی سے منڈھی ہوئی چھڑیوں کے سروں پر لگائی ہوئی ہوتی ہیں جن میں سے دو بڑی مچھلی کی شکل کی ہیں اور دو ایک مہیب اور خیالی جانور کی صورت کی جس کو "اژدہا" کہتے ہیں اور کچھ شیر کی شکل کی اور بعض ہاتھ کے پنجہ اور بعض ترازو کی صورت کی اور بہت سی اور بے شمار وضع کی جن کے ایک طرح کے بعیدالفہم معنی بتاتے ہیں۔ان لوگوں میں بہت سے گرزبردار بھی ہوتے ہیں جو قد آور اور وجیہ دیکھکر بھرتی کئے جاتے ہیں اور جن کا یہ کام ہے کہ دربار میں بےترتیبی نہ ہونے دیں اور بادشاہی فرمان اور احکام پہنچائیں اور جو حکم ملے نہایت جلد اُس کی تعمیل کریں۔

شاہی محل سرا

اب میں بڑی مسرت کے ساتھ آپ کو بادشاہی محل سرا کی سیر کراتا ہوں جیسا کہ قلعہ کی اور عمارات کی کرائی ہے۔لیکن کسی سیاح کو وہاں کی کیفیت چشم دیدہ بیان کرنی ناممکن ہے۔کیونکہ بادشاہ کے دہلی میں موجود نہ ہونے کے وقت مجھے کئی دفعہ وہاں جانے کا موقعہ ملا۔اور مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ ایک بڑی بیگم کے علاج کی خاطر جو شدت مرض کی وجہ سے معمول کے موافق باہر کے دروازہ تک نہیں لائی جا سکتی تھی،بہت دور تک اندر جانے کا اتفاق ہوا مگر میرے سر پر ایک کشمیری شال اس طور سے اڑھا دی گئی تھی کہ ایک لمبے سکارف (اوڑھنی) کی طرح پاؤں تک لٹکتی تھی اور ایک خواجہ سرا

ہاتھ پکڑے ہوئے مجھے اس طرح لے گیا تھا جیسے کوئی اندھے کو لئے جاتا ہے۔ اس لئے آپ کو صرف اسی پر قناعت کرنی چاہیئے جو بعض خواجہ سراؤں سے سُن کر میں نے لکھا ہے اُن کا بیان ہے کہ محل سرا میں بیگمات کے مدارج اور حیثیت اور ان کی معاش کی مناسبت سے علیحدہ علیحدہ بہت خوبصورت اور بڑے بڑے محل بنے ہوئے ہیں جن کے دروازوں کے سامنے حوض اور سب طرف باغیچے اور دلچسپ روشیں اور سایہ دار آرام گاہیں اور نہریں اور فوارے اور دن کی گرمی کے بچاؤ کی خاطر عمیق تہ خانے اور رات کو خنکی میں آرام کرنے کے لئے اونچے اونچے صُفّے اور صحن چبوترے بنے ہوئے ہیں اور ایسے دل کش مکانات ہیں کہ ان میں اس ملک کی تکلیف دہ گرمی کو مطلقاً دخل نہیں ہے۔ اور یہ لوگ ایک چھوٹے سے برج کی جو دریا کی طرف ہے۔ حد سے زیادہ تعریف کرتے ہیں جس میں آگرہ کے دونوں برجوں کی طرح سونے کے ورق چڑھے ہوئے اور لاجوردی کام کیا ہوا اور نہایت عمدہ نقش و نگار بنے ہوئے اور بڑے بڑے آئینے لگے ہوئے ہیں[1]۔

دربار اور تختِ طاؤس اب قبل اس کے کہ میں قلعہ کا بیان ختم کروں آپ کو دوبارہ عام و خاص کی طرف متوجہ کرنا اور ان سالانہ جشنوں اور درباروں کی کیفیت سُنانی چاہتا ہوں جو میں نے اُس میں ہوتے دیکھے ہیں خصوصاً وہ بڑا جشن جو لڑائی کے اختتام کے بعد ہوا تھا اور جس سے بڑھکر کوئی تماشا میں نے عمر بھر میں کبھی نہیں دیکھا اُس روز بادشاہ نہایت ہی عمدہ لباس پہنے دیوان عام و خاص کے صدر میں مرصع تخت پر بیٹھا ہوا نظر آیا اُس کی پوشاک نہایت نازک اور پھول دار ریشمی کپڑے کی تھی جس پر بہت ہی عمدہ زری کا کام کڑھا ہوا تھا اور زری کار مندیل سر پر تھی اور بڑے بڑے اور نہایت قیمتی ہیروں کا طرہ لگا ہوا تھا جس میں ایک پکھراج ایسا تھا جو لاثانی کہا جا سکتا ہے اور آفتاب کی طرح چمکتا تھا اور بڑے بڑے موتیوں کا کنٹھا گلے میں تھا جو ہندوؤں کی مالا کی طرح پیٹ تک لٹکتا تھا۔

---

[1] آثار الصنادید میں اس برج کا نام برج طلا یا مثمن برج لکھا ہے اور سرتاپا سنگ مرمر کا بنا ہے جس میں سونے کا کام اور پرچین سازی اور منبت کاری کی ہوئی ہے جو کلس سمیت باہر سے بھی سنہری ہے اور ہشت پہلو ہونے کے باعث مثمن برج کہلاتا ہے۔ تین ضلعے اس کی خواب گاہ کی عمارت کی طرف ہیں اور پانچ دریا کی جانب اور پانچوں میں سنگ مرمر کی جالیاں لگی ہوئی ہیں اور ایک نشیمن بطور برآمدے کے دریا کے رخ بنا ہوا ہے۔ س م ح

یہ تخت چھ طلائی پایوں کا ہے۔ جن کو کہتے ہیں کہ بالکل ٹھوس ہیں جن میں یاقوت اور زمرد اور ہیرے جڑے ہوئے ہیں۔ مگر میں اُن کی تعداد اور قیمت بیان نہیں کر سکتا کیونکہ کسی کو اس قدر نزدیک جانے کی اجازت نہیں کہ اُن کا شمار اور آب و تاب کا اندازہ کر سکے لیکن یقین کیجئے کہ ہیرے اور دوسرے جواہرات بہت ہی ہیں۔ اور مجھے خوب یاد ہے کہ اس کی قیمت چار کروڑ روپے جانچی گئی تھی۔ اور اُس کو اورنگ زیب کے باپ شاہجہاں نے اس لئے بنوایا تھا کہ بے شمار جواہرات جو خزانہ میں قدیم راجاؤں اور پٹھان بادشاہوں کی لوٹ اور اُن پیش کشوں کے ذریعہ سے جو ہر سال سب اُمرا کو خاص خاص موقعوں پر نذریں گذرانی لازم ہیں وقتاً فوقتاً جمع ہو گئے تھے لوگ اُن کو دیکھیں مگر اُس کی ساخت اور کاریگری ان جواہرات کے ہم پایہ نہیں ہے۔ البتہ دو مور جو موتیوں اور جواہرات سے بالکل ڈھکے ہوئے ہیں بہت ہی خوب اور نہایت عمدہ نقشے پر بنے ہیں اور ان کو ایک صناع نے بنایا تھا[لہ]۔ جس کی کاریگری

لہ ملا عبدالحمید مورخ شاہجہانی نے بادشاہنامہ میں اس تخت کی جو کیفیت بیان کی ہے دلچسپ سمجھ کر ہم اُس کو یہاں بلفظہ نقل کرتے ہیں اور وہ یہ ہے۔

"چوں بمرور ایام وکرور اعوام اقسام جواہر ثمینہ کہ ہر یک شایستہ گوشوارہ ناہید و کمر بند خورشید است در جواہر خانہ والا فراہم آمدہ بود۔ در آغاز جلوس مقدس بر ضمیر الہام پذیر منطبع گردید کہ از تحصیل چنیں تحف غریبہ و نگاہداشتن ایں نفائیس عجیبہ مطمح نظر دور بین جز دولت آرائی و زینت افزائی امرے دیگر نیست پس در جائے بکار باید برد کہ ہم تماشائیان از حسن جہاں افروز ایں نتائج بحر و کان بہرہ برگیرند و ہم کارگاہ سلطنت را فروغے تازہ پدید آید۔ حکم شد کہ سوائے جواہر خاصہ کہ در جواہر خانہ مشکوئے مینو مثال مے باشد از قسم لعل و یاقوت و الماس و مروارید قیمتی و زمرد کہ" صد لک روپیہ قیمت آنست ہر چہ در تحویل خازنان بیوتات است از نظر اطہر بگذرانند و جواہر ثمینہ گراں سنگ را کہ پنجاہ ہزار مثقال است و مبلغ ہشتاد و شش لک روپیہ بہائے آں شدہ بود انتخاب نمودہ بہ بے بدل خاں داروغہ زرگر خانہ حوالہ فرمودند تا بیک لک تولہ طلائے ناب کہ دو صد پنجاہ ہزار مثقال ست و مبلغ چہاردہ لک روپیہ قیمت آں تختے بطول سہ گز و ربع و عرض دو نیم گز و ارتفاع پنج گز سرکاری نمودہ بجواہر مذکورہ ترصیع نمایند و مقرر شد کہ سقف آں لار درون بیشتر میناکار و لختے مرصع و از بیرون بہ لعل و یاقوت و جز آں مرصع مغرق ساختہ بہ زمرداین اساطین دمازدہ گانہ برافرازد و بالائے آں دو پیکر طاؤس مکلل بزواہر جواہر و درمیان ہر دو طاؤس درختے بجواہر آب دار ترتیب دہد۔ در مدت ہفت سال ایں تخت عرش مثال بہ مبلغ صد لک روپیہ کہ سہ صد و سی و سہ ہزار تومان عراق و چہار کرور خانی طائفہ ماورالنہر است

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) صورت اتمام یافت۔ از جملہ یازدہ تختہ مرصع کہ بر دور آن برائے تکیہ نصب شدہ اند تختہ میانگی کہ خاقان سلیمان مکان بر آن دست حق پرست گذاشتہ تکیہ زدہ می نشینند یک لک روپیہ قیمت دارد و از جواہری کہ درین تخت نشاندہ اند لعلے است در وسط آن قیمت یک لک روپیہ کہ شاہ عباس والی ایران مصحوب زینل بیگ برسم ارمغان نزد حضرت جنت مکانی ارسال داشتہ بود و آن حضرت در جلدوے فتح دکن بخاقان مالک ستان حضرت صاحبقران ثانی

دست عطای افضل خان بدکن فرستادہ بودند نخست اسم سامی قطب الدنیا والدین حضرت صاحبقران اول و میرزا شاہ رخ و میرزا الغ بیگ بر آن منقوش بود بعد از آنکہ بانقلاب ایام انقضائے عوام بدست شاہ عباس افتاد او نیز نام خود را بر آن مرتسم گردانید چون بحضرت جنت مکانی رسید نام نامی خود را با نام سامی پدر بزرگوار بر آن نگاشتند اکنون باسم گرامی بادشاہ ہفت اقلیم شہنشاہ تخت و دیہیم آب و تاب تازہ زیب و زینت بے اندازہ دارد۔ بامر خاقانی این مثنوی حاجی محمد جان قدسی کہ ختمش بر تاریخ است بر مینا سے سبز درون تخت کار شدہ اند۔ مثنوی

زہے فرخندہ تخت پادشاہی — کہ شد سامان بتائید الٰہی
فلک روزے کہ می کردش مکمل — زر خورشید را بگداخت اوّل
بحکم کارفرما صرف شد پاک — بہ میناکاریش مینائے افلاک
جز این تخت از زر و گوہر چہ مقصود — وجود بحر و کان را حکمت این بود
زیاقوتش کہ در قیمت بہا نیست — لب لعل بتان را دل بجا نیست
ہوا تا پایہ اش مہرے کشیدہ — گہر افسر بسر خاتم بدیدہ
بجز عرش عالیم از زند شد چنین پاک — کہ شد از گنج خالی کیسۂ خاک
رساند گر فلک خود را بپایش — دہد خورشید و مہ را رونمایش
سرافرازے کہ سر بر پایش سود — ز گردون پایۂ بر تخت افزود
خراج بحر و کان پیرایۂ او — پناہ عرش و کرسی سایۂ او
زلال آب جوہر گشتہ الوان — چراغ عالمی ہر دانۂ آن
حاطرافش بود گلہائے مینا — فروزان ہمچو چراغ از طور سینا
چو کوتہ کرد از فرازش کوتہی دست — نگین خواہش ہم بر پایہ اش بست
شب تار از فروغ لعل و گوہر — تواند صد فلک را داد اختر

اور ہنرمندی حیرت کے لائق تھی اور جو اصل میں فرانس کا رہنے والا تھا اور جس نے یورپ کے بہت سے رئیسوں کو جھوٹے جواہرات دیدے کر جن کو وہ ایک خاص حکمت سے تیار کرتا تھا خوب لوٹا تھا اور پھر بھاگ کر شہنشاہ مغل کے ہاں آ کر پناہ لی تھی اور یہاں بھی خوب دولت کمائی تھی۔

تخت کے نیچے کے چبوترے پر جس کے گرد چاندی کا کٹہرا لگا ہوا اور اوپر زری کی جھالر کا ایک پر زرو بیش شامیانہ تنا ہوا تھا۔ امرا نہایت مکلف پوشاکیں پہنے کھڑے تھے اور مکان کے ستون زربفت سے منڈھے ہوئے اور ریشمی مشجر کے شامیانے جن میں ریشم اور زری کے پھندنے لگے ہوئے تھے تنے ہوئے اور نہایت عمدہ ریشمی قالین بچھے ہوئے تھے اور باہر ایک خیمہ جسے اسپک[1] کہتے ہیں اور جو اس مکان سے بھی بڑا ہے اس کی چھت کے ساتھ ملا کر لگایا ہوا تھا جو صحن کے نصف تک پھیلا ہوا اور چاروں طرف سے چاندی کی پتیوں سے منڈھے ہوئے کٹہرے سے گھرا ہوا تھا اس کی چوبیں بھی چاندی سے منڈھی ہوئی تھیں جن میں سے تین ایسی بلند تھیں جیسے جہاز کا مستول اور باقی چھوٹی تھیں اس عالی شان خیمہ کے باہر کی طرف سرخ رنگ کا کپڑا تھا اور اندر کی جانب مچھلی پٹن کی نہایت عمدہ چھینٹ تھی جو اسی غرض سے بنائی گئی تھی۔ اور جس کے بیل بوٹے ایسے عمدہ اور رنگ ایسے تیز اور شاداب تھے کہ ایک تختہ گلزار معلوم ہوتا تھا۔ اور چونکہ سب امرا کو حکم دیا گیا تھا کہ عام و خاص کی غلام گردش کی ایک ایک محراب کی زیبائش و آرائش وہ اپنے اپنے خرچ سے کریں اس لئے بادشاہ کی زیادہ تر رضامندی حاصل کرنے کے خیال سے ہر ایک

[illegible]

بہ دہر شاہ جہاں را بوسہ بر پاسے	ازاں شد پایۂ قدرش فلک سائے
کند شاہ جہاں بختی جواں بخت	خراج عالمی را صرف یک تخت
خداوندے کہ عرش و کرسی افراخت	تواند قدرش تختے چنیں ساخت
اگر باقیست تا کون و مکاں را	بود بر تخت جا شاہجہاں را
بود تختے چنیں بہر زجایش	خراج ہفت کشور زیر پایش
چو تاریخش زباں پرسید از دل	بگفت اورنگ شاہنشاہ عادل

دیگرے ایں تاریخ یافتہ عز سریر ہمایوں صاحبقران ۱۰۴۴ھ (س م ح)

[1] فارسی میں لبک بڑے خیمہ کو کہتے ہیں۔ غیاث اللغات (س م ح)

نے دو سرے سے بڑھ کر اُن کی زیب و زینت میں کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام دعلیا اوپر سے نیچے تک کمخواب اور زربفت میں غرق اور فرش نہایت بیش قیمت قالینوں سے آراستہ و پیراستہ ہو گیا۔

جشن شاہانہ جشن کے تیسرے دن اول بادشاہ اور اُس کے بعد اکثر اُمرا بہت تکلف کے ساتھ بڑی بڑی ترازوؤں میں جن کے پلڑے اور بٹے سونے کے تھے تولے گئے اور مجھے یاد ہے کہ یہ دیکھ کر کہ اورنگ زیب کا وزن سال گذشتہ کی بہ نسبت ایک سیر زیادہ ہے تمام دربار نے نہایت ہی مسرت ظاہر کی۔ اس قسم کے جشن ہر سال ہوا کرتے ہیں لیکن اس شان و شوکت کا جشن کبھی نہیں ہوا۔ اور نہ اس قدر کبھی خرچ ہوا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ بادشاہ کا اس کر و فر کے ساتھ جشن کرنے سے یہ مقصود تھا کہ سوداگروں کو جن کا کمخواب وغیرہ لڑائی کی وجہ سے پانچ سال کے عرصہ سے بکنے میں نہیں آیا تھا کچھ فائدہ ہو جائے۔ اس جشن میں اُمرا کو بہت خرچ پڑا آخر کار اُس کا ایک حصہ فوج کے غریب سواروں کے سر تھوپا گیا جن کو اپنے اپنے امیر کے حکم سے مجبوراً قباؤں کے واسطے کمخواب خریدنا پڑا۔

ان سالانہ جشنوں کے موقعہ پر ایک قدیم دستور ہے جس کو اُمرا بالکل پسند نہیں کرتے یعنی اُن کو ایک عمدہ پیش کش نذر کرنا پڑتی ہے جس کی قیمت بمناسبت اُن کی تنخواہوں کے کم یا زیادہ ہوتی ہے اور بعض امرا نہایت ہی عمدہ عمدہ چیزیں پیش کرتے ہیں اور یہ نذرانے کبھی بغرض نمائش اور کبھی اس مطلب سے کہ بادشاہ اُس دست بُرد کی تحقیق و تفتیش کے حکم دینے سے جو اُنھوں نے اپنے برسرعہدہ ہونے یا صوبہ داری کے زمانہ میں کی تھی باز رہے اور بعض اوقات اُس کے خوش کرنے اور اس طرح اپنی تنخواہ بڑھوا لینے کے لئے دیئے جاتے ہیں۔ چنانچہ بعض تو عمدہ موتی اور ہیرے اور زمرد اور یاقوت پیش کرتے ہیں اور بعض سونے کے مرصع برتن اور بعض بہت سی اشرفیاں جو بارہ بارہ روپیہ کی قیمت کی ہوتی ہیں۔ چنانچہ ایک ایسے ہی جشن کے موقعہ پر جو اورنگ زیب وزیر ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ رشتہ داری کی وجہ سے جعفر خاں کی نو تعمیر حویلی دیکھنے کے بہانے اُس کے ہاں گیا تو اُس نے ڈھائی لاکھ روپیہ کی اشرفیاں اور کچھ عمدہ موتی اور ایک لعل جس کی قیمت ایک لاکھ روپیہ آنکی گئی تھی نذر کیا۔ مگر شاہجہاں نے جو جواہرات کے پرکھنے میں سب لوگوں سے زیادہ مہارت رکھتا تھا اُس کی قیمت ساڑھے بارہ سو روپیہ سے بھی کم

تمیز کی جس کوشش کر بڑے بڑے جوہری جنہوں نے اس کے جانچنے میں بالکل دھوکا کھایا تھا حیران رہ گئے۔

مینا بازار

کبھی کبھی ان جشنوں کے وقت محل سرا میں ایک فرضی بازار بھی لگا کرتا ہے جس میں امرا اور بڑے بڑے منصب داروں کی خوبصورت اور ولایتی بیبیاں دوکانیں لگا کر بیٹھتی اور عمدہ کمخواب اور نئی قیمتی وضع اور عمدہ زردوزی کام کی چیزیں اور زری کار مندلیں اور سفید باریک کپڑے جو امیرزادیوں کے استعمال میں آتے ہیں اور دوسری بیش قیمت چیزیں فروخت کرنے کو رکھتی ہیں اور بادشاہ اور اُس کی بیگمیں شاہزادیاں اور دوسری عالی رُتبہ خاتونیں خریدار بنتی ہیں۔ اور اگر کسی امیر کی بیٹی خوبصورت اور حسین ہوتی ہے تو اُس کی ماں اُس کو ضرور اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ تاکہ بادشاہ کی نظر پڑ جائے اور بیگمات سے بھی تعارف ہو جائے۔ اس میلہ کا بڑا لطف یہ ہے کہ ہنسی اور مذاق کے طور پر خود بادشاہ ایک ایک پیسے کے لئے جھگڑتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ بیگم صاحب بہت گراں فروش ہیں دوسری جگہ سے اس سے اچھی اور سستی چیز مل سکتی ہے ہم ایک کوڑی بھی زیادہ نہ دیں گے اُدھر وہ کوشش کرتی ہے کہ اپنا مال زیادہ قیمت کو بیچے اور جب دیکھتی ہے کہ بادشاہ زیادہ قیمت نہیں لگاتا تو گفتگو میں اکثر ایسی بڑھ جاتی ہے کہ یہ کہہ اٹھتی ہے کہ آپ اپنے برف بیچنے کی فکر کریں ان چیزوں کی قیمت آپ کیا جانیں اور یہ آپ کے لائق نہیں ہیں بہتر ہے کہ کسی اور جگہ تلاش کریں اور بیگمیں بادشاہ سے بھی زیادہ ارزاں خریدنا چاہتی ہیں غرض کہ دونوں طرف سے ایسی گفتگو بڑھ جاتی ہے کہ ایک جھگڑے کا سوانگ سا معلوم ہوتا ہے۔ مگر آخرکار سودا طے ہو جاتا ہے۔ اور بادشاہ اور بادشاہزادیاں اور بیگمیں جو چیزیں اِدھر اُدھر سے خریدتی ہیں اُن کی قیمت فوراً دے دیتی ہیں اور روپیوں کی جگہ اشرفیاں اس طور سے ہاتھ سے ڈال دیتی ہیں کہ گویا دوکان دار یا اُس کی بیٹی کے حسن و جمال نے اُن کو ایسا محو کر دیا ہے کہ روپیوں اور اشرفیوں کی تمیز ہی نہیں رہی اور ویسی ہی بے پروائی سے دوکان دار اُن کو اُٹھا لیتی ہے اور اسی طرح سے یہ جلسہ دل لگی اور چہل میں ختم ہو جاتا ہے۔

شاہجہاں عورتوں کی طرف ذرا زیادہ مائل تھا۔ اگرچہ بعض امرا کو ناگوار گذرتا تھا مگر وہ ہر ایک جشن کے موقعہ پر یہ سوانگ کرایا ہی کرتا اور فی الواقع یہاں تک اعتدال سے گذر جاتا تھا کہ اس موقعہ پر اُن عورتوں کو بھی محل میں بلا لیتا اور رات بھر وہیں رکھتا تھا جن کو کنچنی

کہلاتی ہیں۔ جس کے معنی ہیں سونے سے لمع کی ہوئی اور پھول کی طرح کھلی ہوئی، گو یہ عورتیں بازاری نہ تھیں بلکہ باعزت ہوتی تھیں جو بیاہ شادی کے موقعہ پر امرا اور منصب داروں کے ہاں صرف ناچنے گانے کے لئے جاتی تھیں۔ ان کنچنیوں میں اگرچہ اکثر صاحب حسن و جمال ہیں اور لباس و پوشاک بھی عمدہ رکھتی ہیں اور گانے میں بھی ان کو کمال ہے اور ناچنے میں تو اپنے اعضا کو اس خوبی سے لچکاتی اور اس سرعت اور تیزی سے ناچتی ہیں کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور تال و سم بھی درست رہتی ہیں مگر پھر بھی کسبی ہیں۔

شاہجہاں اسی پر قناعت نہ کرتا تھا کہ یہ عورتیں اس میلہ میں آئیں بلکہ بدھ کے روز جو معمول کے موافق دربار میں سلام کو آتی تھیں تو اکثر رات بھر کے لئے ٹھیر لیتا اور ان کے ناچنے گانے سے حظ اٹھاتا تھا لیکن اورنگ زیب باپ سے زیادہ سنجیدہ ہے۔ اور اس نے ان کا محل میں آنا بالکل بند کر دیا ہے مگر معمول کے موافق چہار شنبہ کو دربار میں حاضر ہونے سے منع نہیں کیا۔ اور صرف دور سے سلام کر کے رخصت ہو جاتی ہیں۔

اب چونکہ میں جشن اور مینا بازار اور کنچنیوں کا ذکر کر رہا ہوں تو ایک واقعہ کے بیان کرنے سے باز نہیں رہ سکتا جو ہمارے ایک ہم وطن برنارڈو نامی سے تعلق رکھتا ہے۔ اور چونکہ میرے نزدیک بھی پلوٹارک[1] کا یہ قول صحیح ہے کہ "جزوی اور خفیف باتوں کو پوشیدہ رکھنا نہیں چاہئے۔ کیونکہ اکثر

---

[1] پلوٹارک قدیم زمانہ کا ایک مشہور مصنف ہے یہ کرونیا کا رہنے والا تھا جو یونان کے ضلع بوٹیا میں ایک شہر ہے اس کی پیدائش کا زمانہ ٹھیک معلوم نہیں مگر خیال کیا گیا ہے کہ شہنشاہ کلاڈیس رومی کے اخیر زمانہ سلطنت یعنی اڑتالیس سے لے کر پچاس سنہ ع تک کسی سال میں پیدا ہوا تھا یہ ایک اعلیٰ خاندان میں سے تھا اور اس نے امونیئس حکیم سے فلسفہ کے وہ اصول سیکھے جو نفس ناطقہ اور قوائے عقلی سے متعلق ہیں اور اس میں بڑی شہرت حاصل کی۔ علم اخلاق اور علم رجال میں اس کی بہت سی تصنیفات ہیں اور اس کی عمدگی خیالات اور عبارت علمی اور اس خاص طرز کی خوبی کا اثر جو اس کی تمام تحریروں میں پائی جاتی ہے پڑھنے والوں کی زبان تک محدود نہیں رہتا تھا بلکہ دل تک پہنچتا اور گرویدہ کر لیتا تھا۔ اس کی تصنیفات میں سے جس کتاب نے اس کو حیات جاودانی بخشی وہ روم اور یونان کے چھیالیس مشہور و معروف لوگوں کا تذکرہ ہے جس کے بہت سے ترجمے فرانسیسی۔ انگریزی اور جرمن وغیرہ میں ہوتے ہیں۔ اس کی وفات کا سال بھی معلوم نہیں مگر قیاس کیا گیا ہے کہ شہنشاہ ہیڈرین رومی کے پانچویں سنہ جلوس میں ستر برس کی عمر میں مرا تھا (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا) م م ع

اوقات اُن سے ایک قوم کے رسوم و عادات اور ذہن و ذکا کے باب میں صحت کے ساتھ رائے قائم کرنے میں بڑی بڑی باتوں کی بہ نسبت زیادہ مدد ملتی ہے "اس لئے اگرچہ یہ ایک ہنسی کا قصہ ہے مگر تاہم سننے کے لائق ہے!

"بنارس" جہانگیر کے اخیر زمانہ میں ایک نامی اور فی الواقع ایک نہایت کامل طبیب اور جراح تھا اور بادشاہ اُس پر بہت مہربانی کرتا تھا۔ چنانچہ اکثر اوقات بادشاہ کے ساتھ کھانے پینے میں بھی شریک ہوجاتا تھا اور دونوں حد سے زیادہ شراب پی لیتے تھے اور بادشاہ اور طبیب دونوں ایک ہی طرح کے مزاج کے تھے۔ اور بادشاہ کا یہ حال تھا کہ شب و روز عیش و نشاط میں مشغول رہتا تھا اور سلطنت کا کام کاج اپنی مشہور و معروف بیگم نورجہاں کو سونپ رکھا تھا جس کی نسبت اُس کا یہ قول تھا کہ "اُس کی عقل و دانائی سلطنت کے انتظام کے لئے کافی ہے مجھے دخل دینے کی حاجت نہیں" برنارڈ کی معمولی تنخواہ اگرچہ پچپن روپیہ روز تھی مگر شاہی محل سرائیں اور اُمرا کے ہاں معالجہ کے لئے جانے کے باعث، اور نیز اس سبب سے کہ لوگ نہ صرف اس کے طبیب ہونے کی وجہ سے بلکہ بادشاہ کے مزاج میں دخل کے سبب سے ایک دوسرے سے بڑھ کر اُس کی تواضع کرتے تھے اُس کو بہت کچھ حاصل ہوجاتا تھا مگر وہ روپیہ کی کچھ بھی قدر نہ کرتا تھا اور ایک ہاتھ سے لیتا اور دوسرے ہاتھ سے دیدیتا تھا اور اس لئے سب لوگ اُس کو عزیز جانتے تھے خصوصاً کنچن "جن کو اُس نے بہت کچھ کھلایا تھا۔ پس اُس کے ہاں ہمیشہ رات کو ان عورتوں کا جمگھٹ ہوتا تھا یہ اُن میں سے ایک نوخیز عورت پر جو نہایت حسین اور ناچنے میں مشہور تھی فریفتہ ہوگیا اور ہر چند طرح طرح کی کوششیں کیں۔ لیکن اُس عورت کی ماں اس خیال سے کہ کم عمری کی وجہ سے اُس کے حسن و جمال اور تندرستی میں فرق نہ آجائے ایک لحظہ اُس کو اپنی نظر سے علیحدہ نہ ہونے دیتی تھی۔ اسی حالت میں جب کہ برنارڈ معشوق کے وصال سے مایوس ہورہا تھا ایک دن جہانگیر نے جو سر دربار اُس کے ایک بے نظیر علاج کے صلہ میں اُس کو انعام دینا چاہا تو اُس نے عرض کیا امیدوار ہوں کہ حضور معلیٰ اس انعام سے معاف رکھیں اور بجائے اس کے میری یہ التجا منظور فرمائیں کہ یہ نوجوان کنچنی جو اربابِ نشاط کے ساتھ سلام کو حاضر ہوئی ہے مجھے عنایت ہو۔ تمام دربار اُس کے اس عذر اور ایسی درخواست کے کرنے سے جو اُس کے عیسائی اور اس کنچنی کے مسلمان ہونے کی وجہ سے شاہدی قابلِ قبول معلوم ہوتی تھی مسکرایا

لیکن جہانگیر نے جس کو دین اور مذہب کا کچھ بھی خیال نہ تھا ایک بڑا قہقہہ مارا اور حکم دیا کہ اس گنجنی کو اس کے کاندھے پر بٹھا دو اور کہو کہ لے جائے۔ چنانچہ فوراً بھرے دربار میں یہ اُس کے کاندھے پر بٹھا دی گئی اور وہ اس انعام کو لے کر خوشی خوشی گھر کو چلتا ہوا۔

ہاتھیوں کی لڑائی

جشن کا اختتام ہمیشہ ایک ایسے تماشے پر ہوتا ہے جس سے یورپ میں کوئی بھی واقف نہیں یعنی ہاتھیوں کی لڑائی پر جو عام خلقت کے سامنے جمنا کی ریتی میں لڑائے جاتے ہیں۔ اور بادشاہ اور بیگمات اور تمام اُمرا قلعہ کے جھروکوں میں سے یہ تماشا دیکھتے ہیں۔ چنانچہ ایک خام دیوار تین یا چار فٹ چوڑی اور پانچ یا چھ فٹ اونچی بنائی جاتی ہے اور اُس کے دونوں جانب سے دو قوی ہیکل ہاتھی جن پر دو دو آدمی سوار ہوتے ہیں، مقابل کئے جاتے ہیں۔ دوسرا آدمی اس لئے ہوتا ہے کہ اگر ہاتھی کی گردن پر سے ایک گر پڑے تو دوسرا آنکس سے اُس کو چلائے۔ اور یہ لوگ کبھی تو اُن کو بڑھاوا دے کر اور کبھی بُرا بھلا کہہ کر اور پاؤں سے ٹھوکے دے کر آگے بڑھاتے ہیں یہاں تک کہ یہ بیچارے جانور دیوار کے پاس پہنچ کر ایک دوسرے پر حملہ کرتے اور ایسی ٹکر لگاتے ہیں کہ دیکھ کر خوف آتا اور سر اور سونڈ اور دانتوں کے زخموں سے اُن کا زندہ رہنا تعجب معلوم ہوتا ہے۔ یہ لڑائی اکثر رہ رہ کر ہوتی اور مٹی کی دیوار آخر کار گر جاتی ہے۔ اور زبردست اور دلیر ہاتھی اس کو چیر کر حریف پر حملہ کرتا اور اس کو بھگا دیتا ہے اور ایسا پیچھے دوڑتا ہے کہ آتش بازی کی چرخیاں کہ اندر جو ان کے بیچ میں چھوڑی جاتی ہیں حریف سے الگ نہیں ہوتا کیونکہ یہ جانور بالطبع ڈرپوک ہے اور خصوصاً آگ سے بہت ڈرتا ہے اور یہی سبب ہے کہ جب سے آتشی ہتھیار لڑائی میں برتے جانے لگے ہیں ہاتھی لڑائی میں بہت کم کارآمد رہ گئے ہیں۔ اور اگرچہ سراندیپ کے ہاتھی سب سے زیادہ دلیر ہوتے ہیں۔ مگر خواہ کہیں کے ہوں میدان جنگ میں لے جانے سے پہلے برسوں تک ڈر نکالنے کے لئے اُن کے کانوں کے پاس بندوقیں اور ٹانگوں میں پٹاخے چھوڑے جاتے ہیں۔

ان عظیم الشان جانوروں کی لڑائی کا خاتمہ بڑی بے دردی پر ہوتا ہے یعنی اکثر یہ ہوتا ہے کہ ہاتھی اپنے حریف کے مہاوت کو اپنی سونڈ سے پکڑ کر نیچے گرا لیتا اور فوراً پاؤں سے کچل ڈالتا ہے۔ مہاوتوں کا کام ایسا خطرناک ہے کہ یہ بدنصیب آدمی اپنے جورو بچوں سے اس طرح پر رخصت ہوتے ہیں کہ گویا مرنے کو جاتے ہیں۔ لیکن اُن کے دل کو اس خیال

سے کسی قدر تسلی رہتی ہے کہ اگر زندہ بچے اور بادشاہ اُن کی کارگذاری سے راضی ہوا تو نہ صرف اُن کی تنخواہ بڑھ جائے گی بلکہ ہاتھی سے اُترتے ہی پچاس روپے کے پیسوں کی ایک تھیلی مل جائے گی اور اگر کام آگئے تو اُن کی تنخواہ اُن کی بیوی کو ملتی رہے گی اور بیٹا اُن کی جگہ نوکر ہو جائے گا۔ اس تماشے میں مہاوتوں ہی کی جان نہیں جاتی بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان غضبناک جانوروں سے بچنے کے لئے ایسی سخت بھگدڑ پڑتی ہے اور پیدل اور سوار اس طرح بھاگتے ہیں کہ بعض آدمی گر کر لوگوں یا خود ہاتھیوں کے پاؤں سے کچل جاتے ہیں۔ چنانچہ جب دوسری بار مجھکو اس تماشے کے دیکھنے کا اتفاق ہوا تو صرف اپنے گھوڑے کی خوبی اور دو خدمتگاروں کی کوشش کی بدولت میں بچ سکا تھا۔

جامع مسجد دہلی

اب موقعہ ہے کہ میں قلعہ کا ذکر چھوڑوں اور پھر شہر کی طرف رجوع کروں جس کی دو عمارتوں کا ذکر کرنا اب تک باقی ہے۔ چنانچہ اُن میں سے ایک تو بڑی[1] مسجد ہے جو وسط شہر میں ایک مرتفع پہاڑی پر واقع ہونے کے سبب

---

[1] اس مسجد کی بنیاد ۱۰ شوال ۱۰۶۰ھ مطابق ۱۶۵۰ء شاہجہاں کے چوبیسویں سال جلوس میں رکھی گئی تھی اور ہر روز پانچ ہزار راج مزدور بیلدار اور سنگ تراش کام کرتے تھے اور باوجود اس اہتمام کے چھ برس میں دس لاکھ روپیہ کے خرچ سے تیار ہوئی اس کے تین گنبد ہیں، نوّے گز طول اور تیس گز کے عرض میں اور اندر کو سات محرابیں ہیں اور باہر صحن کی طرف گیارہ دروازے جن میں ایک تو بہت بلند ہے اور پانچ پانچ اِدھر اُدھر والے ذرا نیچے ہیں اور بڑے دروازہ پر کلمہ "یا ہادی" بطور طغرا اور باقی دروازوں پر شاہجہاں کے نام کا کتبہ اور تاریخ تعمیر اور زر مصارف جس کو نوراللہ خوشنویس نے خط نسخ سے لکھا تھا سنگ موسیٰ کی پچی کاری سے بنا ہوا ہے اور دروازوں کے دونوں طرف نہایت بلند اور خوشنما مینار ہیں جن میں اوپر جانے کے لئے زینے اور سروں پر بارہ دری کی بُرجیاں بہت دلکشا بنی ہوئی ہیں۔ شمالی منارہ بجلی کے صدمہ سے گر پڑا تھا اور عمارت اور صحن کا فرش بھی جو تمام سنگ سرخ کا ہے۔ جابجا سے بگڑ گیا تھا مگر سرکار عالیہ انگریزی نے ۱۲۳۳ھ مطابق سنہ ۱۸۱۷ء میں اُس مینار کو بنوا دیا اور فرش بھی درست کرا دیا۔ اس مسجد میں چونکہ کوئی مکبر بنا ہوا نہ تھا اور اس وجہ سے امام کی آواز تکبیر سب نمازیوں کو نہیں پہنچ سکتی تھی اس واسطے شاہزادہ مرزا سلیم ابن معین الدین محمد اکبر شاہ بادشاہ نے [illegible]ھ مطابق [illegible]ء میں بڑے دروازے کے بیچ میں ایک مکبر سنگ باسی کا بہت خوشنما بنوا دیا ہے۔ مسجد کے اندر تمام فرش سنگ مرمر کا ہے اور اس میں سنگ موسیٰ کی پچی کاری سے مصلے بنائے ہیں محراب بھی سنگ مرمر کا ہے

بہت دور سے نظر آتی ہے اور اُس کی بنیاد رکھنے سے پہلے پہاڑی کی سطح کو خوب ہموار کر دیا گیا اور چاروں طرف چوکور میدان کھول دیا گیا تھا جہاں مسجد کی چاروں سمتوں سے چار بڑے بازار آن کر ملتے ہیں۔ چنانچہ اُن میں سے ایک تو صدر دروازہ کے سامنے ہے اور دوسرا عقب میں اور وہ دونوں بغلی دروازوں کے محاذی اور اندر جانے کے لئے تینوں ضلعوں میں کوئی پچیس کہیں بتیس تیس پتھر کی خوبصورت سیڑھیاں بنتی چلی گئی ہیں اور پشت کی جانب پہاڑی کی اونچائی تک پتھر گھڑ کر اور خوب صاف کر کے لگائے گئے ہیں جن سے پہاڑی کی ناہمواری چھپ کر عمارت خوبصورت ہو گئی ہے۔ اس کے تینوں دروازے سنگ سرخ سے بنے ہیں اور نہایت عالی شان ہیں اور اُن کے کواڑوں پر تانبے یا پیتل کی پتیاں جڑی ہوئی

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ خوش قطع بنا ہوا ہے۔ شمالی دالان میں کچھ تبرکات جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے رکھے ہیں اور وہ مقام درگاہ آثار شریف کہلاتا ہے۔ مسجد کا صحن ایک سو چھتیس گز کے عرض و طول کا ہے اور اُس کے بیچ میں پندرہ اور بارہ گز کا سنگ مرمر کا حوض ہے جس میں فوارہ لگا ہوا ہے۔ صحن کے چاروں طرف بڑے بڑے دالان اور حجرے اور مکانات بنے ہوئے ہیں۔ اور چاروں کونوں پر بارہ دری کے چار برج ہیں۔ جنوبی اور شرقی دالان کے سامنے دائرہ ہندی نماز کا وقت دیکھنے کو بنا ہوا ہے اور مسجد کے تینوں دروازوں میں برنجی کواڑ چڑھے ہوئے ہیں۔ جنوبی دروازہ پر رہنے کے لائق حجرے بنے ہوئے ہیں۔ اور تینتیس سیڑھیاں ہیں جن پر تیسرے پہر کو مجمع عام ہوتا ہے۔ اور بساطی اور فالودہ والے اور کبابی اور اصیل مرغ بیچنے والے اور شوقین جوان انڈے لڑانے والے آن کر جمع ہوتے ہیں۔ شمالی دروازہ میں بھی رہنے کے حجرے بنے ہوتے ہیں اور اس طرف اُنتالیس سیڑھیاں ہیں۔ اگرچہ اس طرف بھی کبابی بیچنے اور سودے والے دوکانیں لگاتے ہیں لیکن بڑا تماشا اس طرف مداریوں اور قصہ خوانوں کا ہوتا ہے۔ قصہ خوان مونڈھا بچھا کر بیٹھتا ہے اور داستان امیر حمزہ یا قصہ حاتم طائی اور کبھی داستان بوستان خیال سناتا ہے جس کے سننے کو سیکڑوں آدمی جمع ہوتے ہیں ایک طرف مداری تماشا کرتا ہے اور بھان متی کا کھیل ہوتا ہے اور بوڑھے کو جوان اور جوان کو بوڑھا بناتا ہے۔ شرقی دروازہ پر بھی مکانات بنے ہوتے ہیں اور اس کے آگے پینتیس سیڑھیاں ہیں جن پر ہر روز گوری لگتی ہے۔ جو گویا ہر روز کا میلا ہے۔ بزاز طرح طرح کے کپڑے انگلیوں پر ڈالتے ہیں اور شوقین جوان طرح طرح کے خوش آواز جانور پنجروں میں لئے ہوئے سیر کرتے پھرتے ہیں۔ ایک طرف کبوتر والے کبوتر بیچتے ہیں ایک جانب گھوڑے والے گھوڑے لئے کھڑے ہیں

(آثار الصنادید)

ہیں مگر صدر دروازہ بس پر سفید سنگ مرمر کی چھوٹی چھوٹی برجیاں بنی ہوتی ہیں اور بہت خوشنما معلوم ہوتی ہیں زیادہ شان دار ہے مسجد کے پیچھے کے حصے میں تین بڑے بڑے گنبد ہیں جن کے اندر اور باہر سفید سنگ مرمر لگا ہوا ہے اور بیچ کا گنبد دونوں کی بہ نسبت بہت بڑا اور اونچا ہے اور مسجد کا صرف یہی حصہ مسقف ہے باقی گنبدوں سے لے کر صدر دروازہ تک بالکل کھلا ہوا ہے جو گرمی کی وجہ سے کھلا رکھنا ضروری ہے اور مسجد کے اندرونی حصہ میں سفید سنگ مرمر کا (جس پر سنگ موسیٰ کی تحریر سے محطے بنے ہوتے ہیں) اور بیرونی حصہ میں سنگ سرخ کی سلوں کا فرش ہے۔

میں مانتا ہوں کہ یہ عمارت بموجب اُن اصول کے جن کو ہم لوگ پسند کرتے ہیں نہیں بنی لیکن میں اُس میں کچھ عیب بھی نہیں پاتا اس کے ہر ایک حصہ کی تقسیم عمدہ طور پر ہے اور تعمیر بھی عمدہ ہے اور تناسب کا بخوبی لحاظ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ مجھے امید ہے کہ اگر پیرس میں کوئی گرجا اس کے نقشے پر بنایا جائے تو اپنی نرالی اور عجیب وضع کے لحاظ سے سب لوگوں کو پسند آئے۔ تینوں گنبدوں اور چھوٹی برجیوں کے سوا جو سنگ مرمر کی ہیں باقی عمارت سنگ سرخ سے بنی ہے - - - - - - - - - - - جو سنگ مرمر کی بہ نسبت ذرا نرم ہے اور امتداد زمانہ سے اُس میں سے ورق جھڑنے لگ جاتے ہیں۔ ہندوستان کے لوگوں کا یہ قول ہے کہ جس کان سے یہ پتھر نکلتا ہے کچھ مدت بعد اُس میں پھر پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر یہ بات سچ ہے تو نہایت عجیب ہے اور غلط یا صحیح اس کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ برسات کے دنوں میں کان میں پانی بھر جاتا ہے مگر میں اس امر کی نسبت کوئی قطعی رائے نہیں دے سکتا۔

بادشاہ ہر جمعہ کو جو مسلمان ملکوں میں ہمارے اتوار کی طرح مقدس سمجھا جاتا ہے اس مسجد میں نماز پڑھنے کو جاتا ہے اور جس راستہ سے اُس کا گذر ہوتا ہے اُس میں پہلے سے گرمی اور گرد و غبار کے فرو ہو جانے کے لئے چھڑکاؤ کر دیا جاتا ہے اور قلعہ کے دروازے سے لے کر مسجد تک تین یا چار سو سپاہی دو رویہ صف باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں جن کے پاس چھوٹی چھوٹی مگر بہت خوبصورت بندوقیں ہوتی ہیں جن پر سرخ بانات کا غلاف ہوتا ہے۔ اور اُس کے سرے پر ایک چھوٹا سا پھریرا۔ اور پانچ یا چھ عمدہ سوار قلعہ کے دروازہ پر اس غرض سے موجود رہتے ہیں کہ سواری کے وقت راستہ کھلا اور صاف رکھیں اور وہ اتنے فاصلہ سے آگے آگے چلتے ہیں کہ اُن کی گرد سے بادشاہ کو تکلیف نہ پہنچے اور جب یہ سب تیاری ہو جاتی ہے

تو بادشاہ قلعہ سے کبھی تو ہاتھی پر جو خوب سجایا ہوا اور جس پر سنہری اور منقش کام کی عماری کسی ہوئی ہوتی ہے سوار ہو کر نکلتا ہے۔ اور کبھی سنہری اور لاجوردی کام کے تخت رواں پر جو کمخاب یا ارغوانی رنگ کی مخمل وغیرہ سے منڈھے ہوئے ڈنڈوں پر بندھا ہوا ہوتا ہے اور جس کو آٹھ چیدہ اور بھاری بھاری وردیوں والے کہار کاندھے پر اٹھاتے ہیں سوار ہوتا ہے۔ اور پیچھے پیچھے بہت سے امرا ہوتے ہیں جو بعض تو گھوڑوں پر اور بعضے پالکیوں میں سوار ہوتے ہیں اور انھیں میں ملے جلے بہت سے منصب دار اور چاندی کی چھڑیوں والے چوب دار وغیرہ ہوتے ہیں۔ میں اس سواری کو سلطان روم کی باشان و شوکت سواری سے تشبیہ نہیں دے سکتا اور نہ بادشاہان یورپ کے جنگی طرز کے جلوس سے کیونکہ اس کا تجمل اور شان شوکت کچھ اور ہی طرح کی ہے مگر کچھ کم شاہانہ نہیں ہے۔

کاروان سرا دوسری قابل الذکر عمارت وہ کاروان سرا ہے جو شاہجہاں کی بڑی بیٹی معروف بیگم صاحب نے جن کا ہم نے گذشتہ لڑائی کی تاریخ میں بہت کچھ ذکر کیا ہے بنوائی تھی نہ صرف اس شاہزادی نے بلکہ اور امرا نے بھی بڑے بادشاہ کے خوش کرنے کو شہر کی رونق بڑھانے میں بہت روپیہ صرف کیا ہے۔ یہ ہمارے پلیس رایل کی طرح ایک بڑی اور محراب دار مربع عمارت ہے جس میں برابر برابر کوٹھریاں اور ان کے آگے علیحدہ علیحدہ براندے ہیں اور یہ دو منزلہ ہے اور جیسے علیحدہ علیحدہ کوٹھریاں اور براندے نیچے ہیں ویسے ہی اوپر کی منزل میں بھی ہیں اور ایرانی اور تورانی اور دوسرے پردیسی دولتمند تاجر حفاظت کی جگہ سمجھ کر اس میں آن کر ٹھیرتے ہیں۔ کیونکہ رات کو اس کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ کاش پیرس میں بھی دس بیس جگہ ایسی عمارتیں ہوتیں تاکہ پردیسی آدمیوں کو وہاں پہنچتے ہی محفوظ اور معقول مکان کے حاصل کرنے میں اس قدر حیرانی نہ ہوتی جس قدر کہ اب ہوتی ہے۔ یہ تاجر تاوقتیکہ دوست آشناؤں سے مل کر زیادہ آرام کا مکان مل جائے اسی میں ٹھیرتے ہیں اس کے علاوہ یہ ہر قسم کے مال تجارت کے ٹھیرنے اور پردیسی سوداگروں کے اترنے کے لئے ایک عمدہ اور آسائش کا مقام ہے۔

پیرس اور دہلی کا مقابلہ میرا خیال ہے کہ اس موقعہ پر آپ مجھ سے یہ ضرور دریافت کریں گے کہ اس شہر کی عام آبادی کی تعداد اور آسودہ حال لوگوں کا شمار پیرس کے مقابلہ میں کیا ہے۔ پس دہلی کا ذکر ختم کرنے سے پہلے میں اسی کو بیان

کرتا ہوں واضح ہو کہ پیرس کے تمام مکانات کے سہ منزلہ اور چہ منزلہ ہونے اور قریبًا سب طرح کے لوگوں سے معمور ہونے اور اسی طرح اس کے تین یا چار شہروں کے برابر ہونے اور سڑکوں اور گلی کوچوں کے عورت اور مرد اور پیدلوں اور سواروں اور انواع و اقسام کی گاڑیوں سے بھرے رہنے اور اس میں بڑے بڑے چوکوں اور باغوں اور میدانوں کے بہت کم ہونے کی وجہ سے پیرس مجھکو آدمیوں کے ایک بن کی مانند معلوم ہوتا ہے۔ اور اس وجہ سے مجھے یقین نہیں کہ جیسے آدمی اُس میں ہیں اُتنے ہی دہلی میں بھی ہوں مگر جب ہندستان کے اس دارالسلطنت کی وسعت اور بے شمار دوکانوں اور اس بات پر خیال کرتا ہوں کہ اُمرا کے علاوہ پینتیس ہزار سوار سے اس میں کبھی کم نہیں رہتے جو قریبًا سب کے سب عیال دار اور صاحب اولاد اور سب کے پاس بہت سے نوکر چاکر ہیں جو اپنے آقاؤں کی طرح علیحدہ علیحدہ مکانوں میں رہتے ہیں اور کوئی ایسا گھر نہیں جس میں عورتیں اور لڑکے بالے موجود نہ ہوں اور شام کو جب ذرا گرمی کم ہو جاتی ہے اور لوگ باہر نکلتے ہیں تو تمام سڑکیں اور گلی کوچے باوجود اپنی وسعت کے خلقت سے بھرے ہوئے نظر آتے ہیں اور پہیہ دار سواریاں (جن سے جگہ رُک جاتی ہے) بہت ہی کم دکھائی دیتی ہیں تو ٹھیک طرح سے بتانا میرے لئے مشکل ہے کہ دہلی اور پیرس کی آبادی میں کیا نسبت ہے۔ لیکن میرے قیاس میں اگر پیرس کے برابر یہاں آدمی نہیں تو کچھ زیادہ کم بھی نہ ہوں گے۔ البتہ اگر آسودہ حال لوگوں پر نظر کی جائے تو بے شک پیرس میں اور اس میں ایک نمایاں تفاوت معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ پیرس میں دس میں سے سات یا آٹھ آدمی کپڑے لتے سے درست اور معقول صورت نظر آتے ہیں لیکن دہلی میں صرف دو یا تین آدمی ایسے دکھائی دیتے ہیں اور باقی غریب اور پھٹے پُرانے کپڑوں میں دکھائی دیتے ہیں جو بیچارے فوجی ملازمت کی خاطر یہاں چلے آتے ہیں لیکن میں اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ مجھے اکثر ایسے لوگوں سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوتا ہے جو اچھے وجیہ اور عمدہ اور ستھرا لباس پہنے اور عمدہ گھوڑوں پر چڑھے ہوئے اور نوکر خدمتگار ساتھ لئے ہوئے ہوتے ہیں۔

اُمرا کی سواری جس وقت اُمرا اور راجہ اور منصب دار لوگ چوکی دینے یا دربار میں حاضر ہونے کو آتے ہیں تو اُس چوک سے جو قلعہ کے سامنے ہے کوئی زیادہ بارونق مقام نظر نہیں آتا۔ چنانچہ چاروں طرف سے بہت سے منصب دار معہ ساز و سامان سے درست

وہ گھوڑوں پر چڑھے ہوئے اور چار خوش پوشاک خدمت گار ساتھ لئے ہوئے جن میں سے دو پنکھے اور دو راستہ کھلا رکھنے کے لئے آگے آگے رہتے ہیں آتے ہیں۔ اُمرا اور راجہ بعضے تو گھوڑوں پر اور بعضے عمدہ ہاتھیوں پر اور اکثر مکتب پالکیوں میں جس کو چھ چھ کہار لگے ہوئے ہوتے ہیں نہ بغت کا تکیہ لگائے پان چباتے آتے ہیں۔ جس سے یہ مقصود ہوتا ہے کہ منہ خوشبودار اور ہونٹ سرخ ہو جائیں۔ اور پالکی کے ایک طرف تو ایک خدمت گار دانت خلال اور چاندی یا چینی کا اُگالدان جس کا حقہ کے ساتھ ہونا ضروری ہے لئے ہوئے ہوتا ہے اور دوسری جانب دو خدمت گار ہوتے ہیں جو اپنے آسائش پسند آقا کو پنکھا جھلتے یا گرد و غبار اور مکھیاں اُڑانے کو مورچھل ہلاتے ہیں اور تین چار پیادے راستہ کھلا رکھنے کے لئے آگے آگے دوڑتے ہیں اور کچھ منتخب اور وجیہ خوش لباس سوار جوان گھوڑوں پر چڑھے ہوئے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔

مضافاتِ شہر دہلی کے نواح کی زمین نہایت زرخیز ہے اور اُس میں ایکھ۔ گیہوں، جو، نیل، دھان، باجرہ، جوار، مونگ، ماش، اور موٹھ وغیرہ جو عام لوگوں کی خوراک ہے بافراط پیدا ہوتے ہیں۔ دہلی سے چھ میل آگرہ کے راستہ پر ایک مقام ہے جس کو مسلمان "قطب الدین" کہتے ہیں اور یہاں ایک بہت قدیم عمارت[۱] ہے جو کبھی

---

[۱] مصنف کا مقصود غالباً وہ دہرا ہے جس کو ہندوستان کے مشہور راجہ پرتھی راج عرف رائے پتھورا نے سمت ۱۲۴۰ بکرماجیتی مطابق ۱۱۸۳ء اور ۵۷۹ھ میں اپنے قلعہ کے ساتھ بنوایا تھا اور ۵۸۹ھ مطابق ۱۱۹۳ء اور موافق سمت ۱۲۵۰ بکرماجیتی میں معز الدین بن سام عرف شہاب الدین غوری کے سپہ سالار قطب الدین ایبک نے جو آخر کار دہلی کا بادشاہ ہوا اور سلطان قطب الدین کہلایا۔ دہلی کو فتح کیا تو اس کو مسجد بنا دیا اور شرقی دروازہ پر فتح کی تاریخ اور اپنے نام کا کتبہ کھدوایا مگر کوئی ایسے حروف جن کی طرف مصنف نے اشارہ کیا ہے اس پر کہیں کندہ نہیں ہیں البتہ اس کے صحن میں ایک لاٹھ ہے جو سر سے پاؤں تک لوہے کی ڈھلی ہوئی ہے اور جو زمین پر سے بائیس فٹ چھ انچ بلند اور نیچے کی جڑ کی موٹائی کا محیط پانچ فٹ تین انچ ہے اور اس کی نسبت یہ کہانی مشہور ہے جو بالکل غلط ہے کہ راجہ پتھورا کے وقت میں پنڈتوں نے اس کو باسک ناگ کے سر پر اس غرض سے گڑوایا تھا کہ راجہ پتھورا کے خاندان کی عملداری کبھی نہ ٹلے۔ اس پر سنسکرت زبان اور ناگری حروف میں تین اشلوک کندہ ہیں۔ جن کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ سندھ کے راجہ نے راجہ دھاوا سے لڑنے کو فوج جمع کی تھی۔ بعد

ہندوؤں کا دھرا تھا اور اُس پر ایسے حروف میں کچھ کھدا ہوا ہے جو ہندوستان کی مروجہ زبانوں کے حروف میں سے کسی سے بھی نہیں ملتے اور نہ کوئی شخص اُن کو پڑھ سکتا ہے۔

شہر کے دوسری جانب ایک بادشاہی باغ ہے جس کو "شالا مار"[1] کہتے ہیں اور جو ایک بہت خوبصورت اور عالی شان عمارت ہے لیکن "فونٹن بلو" اور "سینٹ جرمین" اور "ورسیلیس" کے مقابلہ کا نہیں۔ یقین کیجئے کہ دہلی کے نواح میں ایسے محل اور عالی شان مکانات نہیں ہیں جیسے کہ سینٹ کلوڈ، چینٹ لی، میوڈان، لانیکور، یا روئل ہیں اور نہ

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ لڑائی کے راجہ ڈہاما نے فتح پائی اور یہ لاٹھ بطور یادگار اپنی فتح کے بنائی مگر اس کے بننے سے پہلے مرگیا۔ صاحب آثار الصنادید لکھتے ہیں کہ جیمس پرنسپ صاحب نے لکھا ہے کہ اس راجہ کا اور کچھ حال معلوم نہیں ہوا بجز اس کے کہ ہستنا پور کے راجاؤں میں کا ایک راجہ ہے اور اس قسم کے ناگری حرف تیسری یا چوتھی صدی عیسوی میں مروج تھے اور اس سبب سے انہوں نے خیال کیا ہے کہ یہ لاٹھ پانچویں صدی سے بہت ورے بلکہ آٹھویں صدی میں بنی تھی مگر ہم اس کو تسلیم نہیں کرتے کیونکہ راجاؤں کی تاریخ ۱۱۹۳ء سے مسلمانوں کی عملداری ہونے تک بہت تمام ملتی ہے اور ان تاریخوں میں اس راجہ کا ذکر نہیں ہے۔ علاوہ اس کے اس لاٹھ پر سمت کندہ نہ ہونے سے یقین پڑتا ہے کہ بکرماجیت سے پہلے کی ہے کیونکہ بکرماجیت کے بعد سمت لکھنے کا اور کوئی نہ کوئی سنہ مقرر کرنے کا بالکل رواج ہوگیا تھا۔ اس کے سوا اُس زمانہ میں ہستنا پور کے راجاؤں کا راج بالکل جاتا رہا تھا۔ ان دلیلوں سے ہمارے نزدیک یہ لاٹھ راجہ میدہاری عرف راجہ ڈہاوا کی بنائی ہوئی ہے۔ جو راجہ یدہشٹر کی اولاد میں سے انیسواں راجہ ہے اور اگرچہ یہ راجہ اندرپت میں آ بسے تھے ورنہ قدیم تخت گاہ اُن کا ہستنا پور ہی تھا اور اسی سبب سے ہستنا پور کے راجہ کہلاتے تھے۔ مذہب اس راجہ کا بشنوی تھا اور اس لاٹھ کے کتبہ سے بھی یہی مذہب معلوم ہوتا ہے۔ تاریخ کی مروجہ کتابوں سے ظاہر ہے کہ راجہ میدہاری ایک ہزار نو سو پانچ برس قبل حضرت مسیح علیہ السلام مسند نشین ہوا۔ لیکن انگریزی مورخوں نے جو صحیح حساب راجہ یدہشٹر کی مسند نشینی کا نکالا ہے۔ اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ راجہ آٹھ سو پچانوے سال قبل حضرت مسیح علیہ السلام مسند نشین ہوا تھا۔ اور اس سبب سے ہمارے ماننے میں یہ لاٹھ نویں صدی میں قبل حضرت مسیح علیہ السلام بنی۔ لیکن ناتمام پڑی رہی اور ایک مدت بعد کسی راجہ نے راجہ ڈہاوا کا فتح نامہ جس مقصد سے اُس راجہ نے اس کو بنایا تھا کھدوا کر لاٹھ کو نصب کردیا۔ اور کچھ عجب نہیں کہ یہ بات تیسری یا چوتھی صدی عیسوی میں ہوئی ہو جب اسے چھوڑا

[1] اس لفظ کی تحقیق اس کتاب کے اس مقام میں جہاں کشمیر کے باغ شالا مار کا ذکر ہے کی گئی ہے۔ س م ح

ویسے مختصر باغات ہیں جن کے مالک غیر ملازم شرفا اور زمانہ ٹھہرا اور سوداگر ہوں۔ لیکن یہ کچھ جائے تعجب نہیں کیونکہ یہاں کی رعایا میں سے کسی کو بھی حق ملکیت زمین حاصل نہیں ہے۔

دہلی اور آگرہ کے درمیانی راستے

دہلی اور آگرہ کے مابین جو ڈیڑھ سو یا ایک سو اسّی میل کا فاصلہ ہے اُس میں نہ تو کوئی عمدہ شہر ہے (حالانکہ فرانس میں مسافر کو اس قدر مسافت کے اندر کئی شہر دکھائی دیتے ہیں) اور نہ کوئی اور دلچسپ مقام ہے البتہ متھرا جہاں ہندوؤں کا ایک قدیم اور عالی شان مندر دیکھنے کے لئے اب بھی موجود ہے اور چند خوبصورت کاروان سرائیں جو ایک ایک منزل کے فاصلہ پر بنی ہوئی ہیں قابل الذکر مقام ہیں اور اس راستے کے دونوں طرف سایہ کے لئے دو رویہ قطار میں درخت لگے ہوئے اور ایک ایک کوس کے فاصلہ پر رہنمائی کی خاطر پختہ منارے اور مسافروں کے پانی پینے اور درختوں کے پودوں کی سیرابی کے لئے پختہ کنوئیں بنے ہوئے ہیں[۱]

شہر آگرہ عرف اکبرآباد

ہم نے دہلی کی جو کیفیت بیان کی ہے اُسی پر آگرہ کو قیاس کر لیجئے یعنی وہ اور وہاں کا قلعہ اور اور عمارتیں بھی جمنا ہی کے کنارے پر ہیں لیکن اس وجہ سے کہ اکبر کے زمانے سے (جس نے اُس کو آباد کر کے اپنے نام پر اس کا نام[۲] اکبرآباد رکھا تھا) بادشاہان ہندوستان اکثر وہیں رہتے رہے ہیں۔ اس کو وسعت اور کثرت عمارت میں جن کو اُمرا اور راجاؤں اور غیر ملازم شرفا نے عمدہ پتھر یا اینٹ سے تعمیر کرایا ہے۔ دہلی پر فوقیت حاصل ہے اور کاروان سرائیں بھی اس میں وہاں کی نسبت زیادہ ہیں۔ اور دو مقبرے ایسے عمدہ اور مشہور و معروف یہاں ہیں کہ جن پر یہ ناز کر سکتا

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ ۔ نے اس لاٹھ کے قریب قلعہ اور مندر بنایا تب یہ لاٹھ مندر کے صحن میں اور جب اس کو توڑ قطب الدین ایبک نے مسجد بنائی تب مسجد کے صحن میں آگئی ۔ چنانچہ اب تک وہیں موجود ہے معلوم ہوتا ہے کہ "اکثر نیمہ لی ار سے غالباً اسی لاٹھ کے حروف کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ ۱۲ س م ح

[۱] یہ سڑک شہنشاہ جہانگیر نے اپنے جلوس کے چودھویں سال مطابق ۱۰۲۹ھ میں اکبرآباد سے لاہور تک بنوائی تھی ۔ اس کے بعض بعض منارے اب تک بھی کہیں کہیں موجود و درقائم ہیں ۔ س م ح

[۲] یہ صحیح نہیں ہے بلکہ اکبر اور جہانگیر کے وقت تک آگرہ ہی کہلاتا تھا اور بقول روایت صاحب بادشاہنامہ شاہجہاں نے اپنے جلوس کے پہلے دن یہ نام جو بے معنی تھا بدل کر اکبرآباد نام رکھا تھا چنانچہ اسی روز سے اکبرآباد ہی مشہور ہے ۔ ۱۲ س م ح۔

ہے۔ اور جن کا بیان میں آیندہ کروں گا لیکن اس کی شہر پناہ نہیں ہے اور بعض اور امور میں بھی دہلی سے گھٹا ہوا ہے۔ اور چونکہ پہلے سے کسی مجوزہ نقشہ پر نہیں بنایا گیا اس لئے دہلی کے سے متحد الوضع اور سیدھے اور وسیع بازار جن سے اس کو امتیاز حاصل ہے۔ اس میں نہیں ہیں البتہ چار یا پانچ بازار بہت طولانی ہیں اور اُن کی عمارتیں اچھی ہیں مگر اُن میں بھی زیادہ بیچ ہیں اور اُن کے سوا سب چھوٹے چھوٹے تنگ اور بے قاعدہ ہیں جن میں بہت سے گوشے اور پیچ و خم ہیں اور اس سبب سے جب بادشاہ کا قیام یہاں ہوتا ہے تو اُن میں عجیب کشمکش اور دھکا پیل رہتی ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ ان دونوں شہروں میں جو بڑی بڑی مابہ الامتیاز باتیں ہیں وہ میں نے سب بیان کر دی ہیں مگر اُن پر ایک بات اور اضافہ کرتا ہوں کہ آگرہ کو اگر کسی بلند مقام سے کھڑے ہو کر دیکھیں تو گاؤں کی شکل کا معلوم ہوتا ہے۔ اور اس کا منظر گاؤں کی طرز کا اور خوش نما ہے کیونکہ اُمرا کا معمول ہے کہ اپنے مکانوں کے صحنوں اور باغوں میں سایہ کے لئے بڑے بڑے درخت لگواتے ہیں اور امرا اور راجہ اور دوسرے دولت مند لوگوں کے بڑے بڑے مکانوں کے مابین ایک دوسرے سے فصل کے لئے نہایت فرحت بخش پھول پھلواری اور درخت اور بیل بوٹے لگے ہوئے ہیں اور اُن میں ہندو مہاجنوں کی اونچی اونچی پتھر کی حویلیاں ایسی معلوم ہوتی ہیں جیسے کسی جنگل کے اندر کوئی پُرانی گڑھی۔

ایک گرمی سے جلے بھُنے ملک میں کہ جہاں تازگی اور آرام حاصل کرنے کو آنکھیں خود بخود سبزے کی متلاشی ہوتی ہیں اگرچہ ایک ایسا منظر بے شبہ دل کو ایک خاص طرح کی فرحت دیتا ہے مگر یہ خیال کر کے کہ دنیا کا ایک نہایت عمدہ اور خوش نما نظارہ دیکھنے میں آئے گا آپ کو پیرس کے چھوڑنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ تو یقیناً آپ کو پونٹ ڈی آف پر بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اگر آپ ذرا دن کو اُس پر جا کر بیٹھیں اور دیکھیں کہ خلقت اور گاڑیوں کا کیا عجیب و غریب جمگٹ اور طرح طرح کی چیزیں اور بھیڑ بھاڑ نظر سے گذرتی ہے اور پھر رات کو بیٹھ کر ملاحظہ کریں تو بے شک میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ فرمایئے اس سے زیادہ دلچسپ نظارہ اور کہاں دکھائی دے سکتا ہے۔ اور اس پر سے مکانات کی بے شمار کھڑکیوں میں سے جو صاف اور دھیمی دھیمی روشنی نظر آتی ہے ذرا دیکھئے تو وہ کیا لطف دکھاتی ہے اور جو بھیڑ بھاڑ اور گاڑیوں اور لوگوں کا ہجوم دن کو رہتا

ہے وہی آدھی رات کو بھی نظر آتا ہے اور ممالک ایشیا کے برخلاف جہاں ایسا ہونا کبھی ممکن نہیں۔ پیرس میں دیانت دار اہلِ شہر کی بیبیاں اور بیٹیاں چور اچکوں کے خوف اور کیچڑ وغیرہ کی تکلیف کے بغیر بے تکلف بازاروں اور گلی کوچوں میں ٹہلتی پھرتی اور جہاں تک نظر جا سکتی ہے خواہ کوئی اور کیسا ہی موسم کیوں نہ ہو چاروں طرف لالٹینوں کی قطاریں روشن اور جگمگاتی نظر آتی ہیں۔

مشفقِ من پیرس میں پونٹ نی آف پر کھڑے ہو کر بے شک آپ میری ذمہ داری پر دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ دنیا میں انسان کا بنایا ہوا اس سے زیادہ خوش نما کوئی منظر نہیں ہے۔ لیکن چلین اسپا ان کی میں نہیں کہتا کیونکہ میں نے اُن کو نہیں دیکھا اور اس کی خوبی اُس وقت اور بھی بڑھ جائے گی جب کہ لوار کی تعمیر ختم ہو جائے گی اور لوگوں کے قول کے برخلاف جو اس کے نقشے کو دیکھ کر کہتے تھے کہ یہ صرف کاغذ ہی کا نمونہ دکھائی دیتا رہے گا۔ حقیقتاً وجود میں آ جائے گا۔

انسان کے بنائے ہوئے منظر کی قید میں نے اس لئے لگائی ہے کہ دنیا کے عمدہ مناظر کے ذکر کے موقعہ پر اس لفظ کے نام معنوں کے لحاظ سے قسطنطنیہ کے اس قدرتی منظر کو جو سمندر کی بڑی کھاڑی میں ہے اس طرح نظر آتا ہے کہ ایک طرف تو قسطنطنیہ ہے اور دوسری جانب پوائنٹ ڈیل سپیل سے مستثنیٰ کر دینا نہ ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ جب پہلے پہل میں نے قسطنطنیہ کے اس لمبے چوڑے منظر کو دیکھا تو میری طبیعت پر ایسی خوشی غالب ہوئی جو کبھی نہیں بھول سکتی اور میں نے اس کو ایک جادو کا بنایا ہوا ایمفی تھیٹر[1] خیال کیا۔

---

[1] لیٹن زبان میں ایمفی بیضوی شکل کو کہتے ہیں۔ پس چونکہ یہ تھیٹر یعنی تماشا گاہ بیضوی شکل کے بنائے جاتے تھے تاکہ لوگ اردگرد بیٹھ کر آسانی کے ساتھ قریب سے تماشا دیکھ سکیں۔ اس لئے ان کا نام ایمفی تھیٹر جس کا نام کولی سی ایم ہے۔ اور جس کو بنے ہوئے بہت عرصہ ہوا مگر مصالحہ کی خوبی کی وجہ سے ایسا ہے کہ اس کو کھنڈر کہنا مشکل ہے بلکہ اب تک شہرِ روم کی نہایت عالی شان عمارات میں سے ہے۔ اس وادی میں بنا ہوا ہے جو شہرِ روم کی سات پہاڑیوں کے بیچ میں ہے۔ یہ عمارت زینوں کی طرح اوپر تلے درجہ بدرجہ بنی ہوئی ہے کہ تماشائی اپنے اپنے رتبے کے موافق اپنی اپنی جگہ جو ان کے لئے مخصوص تھی بیٹھ کر تماشا دیکھ سکیں۔ چنانچہ سب سے اول درجے کے چبوترہ پر شہنشاہ تخت پر اور ممبرانِ سینٹ اور بڑے بڑے مجسٹریٹ اور وہ مقدس کنواری عورتیں جو معبدوں کی

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ خدمت پر متعین رہتی تھیں سونے چاندی اور ہاتھی دانت کی کرسیوں پر بیٹھتی تھیں۔ اور ان سے پیچھے کے چبوترہ پر وہ بہادر اور نام دار سپاہی بیٹھتے تھے جن کو نائٹ کہتے تھے اور ان کے بعد عام لوگوں کی نشست تھی اور سب سے اوپر اور اخیر کے چبوترہ پر عام شریف زادیاں جو تماشا کرنے والوں کے برہنہ ہونے کی وجہ سے قریب سے دیکھنا پسند نہ کرتی تھیں بیٹھتی تھیں غرض اسی طرح ملاح کلوں کے چلانے والے اور تماشا خانہ کے دوسرے اہل خدمت اس کے دونوں دروازوں کی چھتوں پر بیٹھتے تھے۔ اس عمارت کا عظمت و شان اس سے سمجھ لینا چاہیئے کہ جب کبھی یہ تماشائیوں سے بالکل بھری ہوئی ہوتی تھی تو ستاسی ہزار سے کم بیٹھنے والے نہ ہوتے تھے۔ اس عمارت کے بیچ کا میدان ارینا کہلاتا تھا کیونکہ خون کی بدبو روکنے کی غرض سے اس میں ابتدائی زمانہ میں ارینا یعنی ریت بچھائی جاتی تھی مگر پھر یہاں تک تکلف بڑھ گیا کہ ریت کی عوض مختلف دھاتوں کا برادہ اور شنگرف بلکہ پسے ہوئے جواہرات کی تہہ بچھائے گئے۔ لیکن ایک ملائم قسم کے سفید پتھر کا چورا بچھایا جانا جس سے ارینا کی سطح برف جیسی معلوم ہونے لگتی تھی۔ زیادہ پُرلطف خیال کیا جاتا تھا۔ اور چھت نہ ہونے کی وجہ سے جب اس پر ارغوانی رنگ کا ایک بڑا ریشمی زری کار شامیانہ تانا جاتا تھا تو اُس میں سے دھوپ کی شعاع جو ارینا کے سفید اور شفاف سطح اور رومی عہدہ داروں کے سفید چغوں پر پڑتی تھی تو نہایت ہی کیفیت دکھاتی تھی۔ ارینا کے گرداگرد پانی کی نہر بنی ہوئی تھی جس میں سے پانی چھوڑکر ارینا میں تماشا کرنے کے لئے جہازے آتے تھے۔ یہ تماشا خانے رومیوں کی سلطنت جمہوری کے اخیر زمانہ کی ایجاد تھے اور چونکہ قدیم اہل روم ہر قسم کے خون ریز اور خوفناک تماشوں کے دیکھنے کے بے اعتدالی کے ساتھ شایق تھے اس لئے اُن کے حکام اس شوق کو اس جنگی جوش کے ترقی دینے کی غرض سے جس نے ان کو دنیا کا مالک بنایا ہوا تھا جاری رکھتے تھے۔ سب سے پہلا تماشا دو سو ساٹھ برس قبل مسیح علیہ السلام شہر روم میں ہوا تھا اور ۲۵۰ء میں جب کہ رومیوں نے کارتھیج والوں پر فتح پائی اور اُن کے ہاں کی لوٹ میں ہاتھی بھی آئے تو وہ بھی اس تماشا خانہ میں داخل کئے گئے اور اس طرح سے ان میں وحشی حیوانات کے داخل کئے جانے کی ابتدا ہوئی اور رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ جانوروں کے باہم لڑانے ہی پہ منحصر نہ رہا بلکہ ملک میں لوگوں کا ایک ایسا گروہ پیدا ہوگیا جن کا یہ پیشہ تھا کہ انعام حاصل کرنے کی غرض سے باہم ہتھیاروں سے لڑتے اور ایک دوسرے کو قتل کرتے تھے۔ یہ لوگ گلیڈی ایٹر کہلاتے تھے اور اُن کے ساتھ وہ تمام خونخوار درندے بھی شامل کئے جاتے تھے جو تماشے کی رونق بڑھانے کے لئے افریقہ اور ایشیا کے جنگلوں سے پکڑے آتے تھے قیصر جولیس اور پامپی کے زمانہ میں یہ وحشیانہ اور خوفناک تماشے قابل

…رت کثرت سے کٹے جاتے تھے، تماشائی لوگ اکثر اس غرض سے اول وقت پر آتے تھے کہ بڑے بڑے اراکین سلطنت کو آتا ہوا دیکھیں جن کے آنے پر تحسین یا آفرین کا نعرہ بلند ہوتا تھا جو اُن کے افعال …ہر دلعزیزی پسندی یا ناپسندی پر موقوف تھا۔ اور جب شہنشاہ آتا تو لوگ یہ فقرہ کہکر چلاتے کہ "اے سب …کے مالک اور سب سے اعلیٰ اور سب سے خوش حال تیرے لئے خوشی اور فتح ہمیشہ ہو" جب بادشاہ آن کر بیٹھ جاتا تو طرح طرح کے تماشے ہونے لگتے چنانچہ کبھی نہریں سے ارینا میں پانی چھوڑ دیا جاتا اور ایک جہاز آتا اور تباہ ہوکر اُس میں سے ایک غول عجیب وغریب جانوروں کا نکل پڑتا۔ بعض اوقات زمین پھٹ کر درخت نکلتے اور اُن پر سنہری میوے لگے ہوتے ہوتے۔ کبھی انیوتس کلالوت کا پُرانا عشقیہ قصہ بطور اصل کے دکھایا جاتا۔ اور یہ درخت اُس خوش آواز عاشق کے راگ اور دو تارے کے ساتھ ساتھ چلتے مگر تعجب یہ ہے کہ تماشے کے مکمل کرنے کے لئے آرفیوس کی طرح آخر میں سچ مچ اس شخص کو جو آرفیوس بنتا تھا ریچھوں سے پھڑوا دیا جاتا تھا اور اس کے بعد خونخوار اور اشتعال پسند رومی ارینا کے دروازے کھول دیتے اور قسم قسم کے وحشی درندے چاروں طرف سے باہم لڑتے اور ایک دوسرے کو پھاڑ کھانے کے لئے چھوڑ دیتے جاتے اور لوگ نہایت بے رحمانہ شوق کے ساتھ اُن کے حملوں اور بچاؤ کے طریقوں پر غور کرتے اور بےدردی ان غریب حیوانات کے چیخنے اور شور و غل مچانے پر ترس کھانے کی جگہ نہایت خوش ہوتے اور اگر کبھی اتفاق سے کوئی جانور پر غالب آجاتا اور سب کا خاتمہ کر دیتا تو چاروں طرف سے انعام کے طور پر یہ صدا بلند ہوتی کہ اس بہادر کو چھوڑ دو تاکہ اپنے وطن میں آرام سے رہے۔ یہ لوگ اسی پر اکتفا نہ کرتے تھے بلکہ ان جانوروں سے انسان لڑائے جاتے تھے جو کوئی زرہ پہنے اور کوئی شکاری وضع میں ہوتا تھا اور بعض صرف خالی ہاتھ ہی اپنی پھرتی اور چالاکی سے حریف پر غالب آتے تھے۔ لیکن اس پر بھی اس وحشت کا خاتمہ نہ تھا بلکہ اہل روم انسان کو مرتا دیکھنا چاہتے تھے اور اس غرض سے گنہگار لوگ اور بیچارے عیسائی مذہب کے آدمی ان درندوں کا شکار کرائے جاتے تھے۔ اس کے بعد لاشیں اُٹھائی جاتی تھیں اور تمام ارنیا میں وہ جواہرات اور سفید پتھر کا چورا جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے خون کی بدبو رفع کرنے کے لئے بچھا دیا جاتا تھا۔ اور سب سے عمدہ تماشے کی نوبت آتی تھی۔ یعنی گلیڈی ایٹروں کی لڑائی شروع ہوتی تھی جن میں سے کسی کے پاس تلوار اور کسی کے ہاتھ میں نیزہ اور کوئی ہلکی اور کوئی بھاری زرہ پہنے ہوتے۔ کوئی گاڑی میں کوئی پیدل کوئی گھوڑے پر سوار آتا تھا۔ اور ارنیا میں داخل ہوکر سب کے سب ہم آواز شہنشاہ کو یوں سلام کرتے تھے "مرحبا قیصر مرنے والے تجھکو سلام کرتے ہیں" ان پیشہ وروں میں بعض عام لوگ بھی اپنی خوشی سے شامل ہوکر کچھ روپے لے کر لڑتے تھے جن میں سے کبھی کوئی بچ بھی جاتا

لیکن اگرچہ اس منظر میں جو خوبی کی باتیں ہیں وہ سب قدرت کی مصنوعات ہیں اور پیرس میں جو کچھ ہے وہ قریب ساری انسان کی صنعت ہے مگر میری رائے میں پہلے کی بہ نسبت پچھلا زیادہ دلچسپ ہے۔ کیونکہ یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ شہر ایک بڑی سلطنت کا دارالحکومت اور ایک ذی قدرت بادشاہ کا جائے قیام ہے۔ دہلی، آگرہ اور قسطنطنیہ کی سب طرح کی خوبیوں کو تسلیم کرنے کے باوجود میں انصافاً یہ کہہ سکتا ہوں کہ دنیا کے شہروں میں پیرس سب سے زیادہ متمول اور خوبصورت اور ہر ایک طرح سے متقدم ہے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ: تھا مگر ایسا بہت کم ہوتا تھا کیونکہ رومی مغلوب پر رحم کرنا نہ جانتے تھے۔ یہ لوگ کبھی ایک ایک کبھی اکٹھے ہو کر لڑتے اور جب کوئی اپنے حریف کو زخمی کرتا تو تماشائیوں کی طرف دیکھ کر کہتا "اس کے کاری زخم لگا" اور اس کے مار ڈالنے یا چھوڑ دینے کی اجازت چاہتا چنانچہ تماشائی اپنا انگوٹھا اگر اوپر کو اٹھاتے تو چھوڑ دینے کا اور اگر نیچے کو کرتے تو مار ڈالنے کا اشارہ سمجھا جاتا۔ اور بیچارہ مغلوب اگر اپنی گردن آخری ضرب کے لئے پیش کرنے میں تامل کرتا تو لعن طعن کا شور بلند ہوتا اور لوگ پکار کر کہتے کہ "لوہا حاصل کرو" یعنی لوہے کے تھپیا۔ کے سامنے جاؤ۔ اور مقدس کنواریاں اور رحم دل مائیں اور سینٹ کے دانا ممبر اس کو ایک کھیل سمجھتے تھے اور کسی کو بھی یہ خیال نہ آتا تھا کہ یہ کیا حرکت کی جاتی ہے۔ گزشتہ صدی میں عیسائی مذہب کے ایک درویش کی برکت سے یہ وحشیانہ اور برے کھیل موقوف ہوئے۔ اگرچہ اس بیچارہ کی جان اس میں گئی یعنی وہ عین تماشہ کے وقت ارینا میں آگھسا اور لوگوں سے مخاطب ہو کر بولا کہ "اس طرح خون بہانے سے باز آؤ اور جس خدا نے تم کو تمہارے دشمنوں پر غالب کیا ہے اس کی رحم کا عوض کشت و خون کے تماشوں کے رواج دینے سے مت کرو" جس پر چاروں طرف سے غل ہوا کہ یہ وعظ کی جگہ نہیں ہے پیچھے ہٹ جا اور گلیڈی ایٹروں نے دھکے دے کر اسے پیچھے ہٹا دیا۔ مگر وہ بہادر اور باستقلال شخص پھر ان کے بیچ میں آگیا اور لڑنے سے روکنے لگا۔ جس پر "بغاوت بغاوت" کا شور مچا اور حاکم نے بھی اپنی آواز اس میں شامل کی اور گلیڈی ایٹروں نے اس بیچارے کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور چاروں طرف سے اینٹ پتھر اور جو کچھ ملا لوگوں نے اس مظلوم پر برسایا۔ لیکن اس عجیب واقعہ کے بعد لوگوں کو یہ خیال آیا کہ یہ کیا حرکت کی گئی اور سب کے دل بدل گئے اور انہوں نے سمجھ لیا کہ درحقیقت ہم لوگ بے رحمی اور گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں اور اس روز کے بعد یہ تماشا پھر کبھی نہ ہوا۔

(ماخوذ از انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا و کتاب گولڈن ڈیڈس) م م ت

عیسائی گرجا اور کالج آگرہ میں ایک گرجا بھی ہے جس کو جیسوئیٹ فرقہ کے لوگوں نے بنایا تھا اور ایک اور مکان ہے جس کو وہ کالج کہتے ہیں جس میں پچیس یا تیس عیسائی گھرانوں کے بچوں کو عقائد مذہبی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مگر مجھے معلوم نہیں کہ یہ عیسائی خاندان یہاں کس طرح جمع ہو گئے ہیں شاید ان جیسوئیٹ پادریوں کے فیاضانہ اور مہربانہ سلوک نے ان کو یہاں سکونت اختیار کر لینے پر مائل کیا ہے۔ جس زمانہ میں پرتگیزوں کا ہندوستان میں بڑا زور تھا ان جیسوئیٹ لوگوں کو جو ایک مذہبی گروہ ہے شہنشاہ اکبر نے آگرہ میں آباد کر لیا تھا اور ان کی اعانت کے لئے کچھ سالانہ مقرر کر دینے کے علاوہ لاہور اور آگرہ میں گرجا تعمیر کر لینے کی بھی اجازت دیدی تھی اور جہانگیر تو اپنے باپ سے بھی بڑھ کر ان کا مربی تھا مگر شاہجہاں کے عہد میں ان کو بہت تکلیف پہنچی اس نے ان کا سالانہ بند کر دیا اور لاہور کا گرجا تو بالکل ہی مسمار کرا دیا اور آگرہ کے گرجا کا بھی بہت سا حصہ مع اس منارے کے جس پر گھنٹہ لگا ہوا تھا اور جس کی آواز تمام شہر میں سنی جاتی تھی گروا دیا۔ جہانگیر کے زمانہ میں ان لوگوں کو امید تھی کہ ہمارا مذہب کچھ نہ کچھ یہاں پھیل جائے گا کیونکہ جہانگیر حقیقت میں قرآن کے مسائل کو نہایت ناپسند کرتا تھا اور ہمارے مذہب کے مسائل کو ایسے بتاتے تھے کہ ان پر اپنا تعجب ظاہر کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے دو بھتیجوں کو جن کا ختنہ بھی ہو چکا تھا اور شاہی محل میں ان کی پرورش پائی تھی عیسائی ہو جانے کی اجازت دیدی تھی اور بہانہ یہ کیا تھا کہ ان کے ماں باپ عیسائی تھے۔ (کیونکہ اس کی ماں ایک دولت مند آرمنی کی بیوی تھی جو جہانگیر کی خواہش کے موافق محل میں داخل ہو گئی تھی) اور یہ لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ جہانگیر کے عیسائی ہو جانے کا قصد اس درجہ کو پہنچ گیا تھا کہ اس نے تمام دربار کو عیسائی لباس پہنانے کا دلیرانہ ارادہ کیا اور ایک دن خلوت میں یہ لباس پہن کر اپنے ایک بڑے امیر کو بلایا اور اس کی اس باب میں رائے دریافت کی مگر اس نے ایسا اندیشہ ناک جواب دیا کہ جہانگیر نے ڈر کر یہ ارادہ چھوڑ دیا اور اس تمام قصہ کو ہنسی کے پیرایہ میں اڑا دیا۔ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ جہانگیر نے انتقال کے وقت عیسائی ہو کر مرنا چاہا تھا اور ہم کو بلانے کا حکم دیا تھا مگر لوگوں نے یہ پیغام ہم تک مطلق نہ پہنچایا۔ لیکن اور لوگ اس امر سے بالکل انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جہانگیر زندگی میں کسی مذہب و ملت کا پابند نہ تھا

ویسا ہی اخیر وقت میں بھی نہ تھا اور باپ کی طرح اُس کا بھی ارادہ تھا کہ اپنے کو پیغمبر بنا کر ایک نیا مذہب جاری کرے۔ میں نے ایک مسلمان شخص کی زبانی جس کا باپ جہانگیر کا ملازم اور اُس کے امور خانگی سے تعلق رکھتا تھا سُنا ہے کہ ایک دفعہ بادشاہ نے شراب کی ترنگ میں کئی بڑے بڑے ملاؤں اور ایک پادری متوطن فلارنس کو جس کی تند خوئی کی وجہ سے جہانگیر نے اس کا نام - پادری آتش - رکھ چھوڑا تھا بلوایا اور جب اُس نے آکر بادشاہ کے حکم کے موافق بڑے زور سے دین اسلام کے بطلان اور اپنے مذہب کی تائید میں گفتگو کی تو بادشاہ نے کہا کہ مسلمان عالموں اور جیسوئیٹ پادریوں میں جو نزاع ہے اُس کے تصفیہ کے لئے یہ عمدہ موقعہ ہے اور حکم دیا کہ ایک گڑھا کھود کر اُس میں آگ جلائی جائے اور پادری اپنی انجیل اور ایک ملا اپنا قرآن بغل میں لے کر اُس میں کود پڑیں دونوں میں سے جو بچ جائے گا میں اُس کا مذہب قبول کروں گا۔ چنانچہ پادری آتش نے تو اس امتحان کو قبول کر لیا لیکن ملا لوگ ڈر گئے اور بادشاہ دونوں پر رحم کر کے اس آزمایش سے باز آیا۔ یہ قصہ جھوٹ ہو یا سچ مگر اس میں شک نہیں کہ جہانگیر کے دربار میں جیسوئیٹ لوگوں کی بڑی عزت و حرمت تھی اور اس وجہ سے اُن کو دین عیسوی کے یہاں پھیل جانے کی قوی امید تھی مگر اس زمانہ کے بعد باستثناء اُس ربط و ضبط کے جو داراشکوہ اور نادر بوزی کے باہم تھا اس قسم کی اُمید کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی۔

عیسائی مبلغ اب چونکہ اس جگہ بغیر قصد کے مشنری لوگوں کا ذکر آگیا ہے تو میں اجازت چاہتا ہوں کہ ایک بڑے خط کے لکھنے سے پہلے جو آپ کو لکھنے کا ارادہ ہے اس اہم معاملہ میں مقدمہ کے طور پر چند باتیں بیان کروں میری دانست میں ان لوگوں کا مقصد پسندیدہ ہے اور اس کام کے لئے جو یہ ایسے دور دراز ملک میں آتے ہیں بےشک تعریف کے لایق ہیں خصوصاً کیپوشین اور جیسوئیٹ فرقوں کے لوگ جو اپنے عقاید مذہبی کو ہر قسم کے لوگوں پر نہایت مسکینی کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں اور بے تمیزی اور تعصب کو دخل نہیں دیتے اور عیسائی مذہب کے ہر ایک شخص سے خواہ وہ کاتھلک فرقہ کا ہو یا یونان یا ارمینا کے چرچ کا مقلد ہو۔ اور نسطورین ہو یا جیسکوبٹ محبت اور فیاضی سے پیش آتے ہیں۔ اور پردیسی اور مفلوک الحال عیسائیوں کے پشت پناہ اور باعث تسلی ہیں۔ اور اپنے علم و فضل اور قابل تقلید خوش اوقاتی سے غیر مذہب کے بے ایمان اور عیاش لوگوں کے لئے شرم

کا باعث ہیں مگر بدقسمتی سے بعض ایسے بھی ہیں جو اپنے نہایت مذموم افعال سے مذہب کو بدنام کرتے ہیں جن کا بجائے مشن کے مقدس کام کے اپنے اپنے کان ونٹوں (خانقاہوں) ہی میں بند رہنا خوب ہے کیونکہ ان کا دین ومذہب صرف ایک دکھاوا ہے اور بجائے اس کے کہ لوگوں کو ان سے ہدایت ہو اُلٹے اُن کی گمراہی کا باعث ہیں لیکن سب ایسے نہیں اور نہ اصل مدعا کے لئے مضر ہیں اور اس کام کے لئے اگر ایسے لوگ تجویز ہوا کریں جو علم وعمل میں ممتاز ہوں تو میں قطعًا پسند کرتا ہوں اور میرے نزدیک یہ لوگ نہایت ضروری اور عیسائیوں کے لئے باعث فخر ہیں اور عیسائیوں پر واجب ہے کہ تمام عالم میں اپنے دین کی تعلیم وتلقین کے لئے ایسے لوگ بہم پہنچائیں جو اپنے نیک ارادوں اور عمدہ افعال واطوار میں حواریوں کا نمونہ ہوں مگر کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ میں اس خوش فہمی میں اس قدر محو ہو گیا ہوں کہ میں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ جس قدر حواریوں کے ایک دفعہ کے وعظ سے ایک اثرِ عظیم مترتب ہوتا تھا اُتنا ہی اس زمانہ کے مشنری لوگوں کے وعظ سے بھی ممکن ہے۔ کیونکہ بُت پرست اور کافر لوگوں کے ساتھ ملتے جلتے رہنے کے باعث اُن کے دلوں کی تاریکی سے مجھے اس قدر واقفیت ہو گئی ہے کہ ہرگز یقین نہیں کہ دو یا تین ہزار آدمی ایک دن میں ایمان لے آئیں خصوصًا مسلمان بادشاہوں اور اُن کی مسلمان رعایا سے تو کسی طرح کبھی تبدیل مذہب کی اُمید نہیں اور چونکہ ممالک ایشیا کے وہ سب مقامات میرے دیکھے ہوئے ہیں جہاں مشنری لوگ مقیم ہیں اس لئے میں اپنے تجربہ کی رو سے کہہ سکتا ہوں کہ ان لوگوں کی خیرات اور تلقین کا اثر مشرکوں ہی پر ہونا ممکن ہے اور یقین نہیں کہ دس برس میں بھی ایک مسلمان عیسائی ہو جائے۔ یہ سچ ہے کہ مسلمان انجیل کو مانتے ہیں اور مسیح علیہ السلام کا ذکر بغیر نہایت ادب وتعظیم کے نہیں کرتے اور بلا لفظ 'حضرت' صرف 'عیسیٰ' کبھی نہیں کہتے اور ہماری طرح اس کا بھی اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ معجزانہ طور پر کنواری ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے اور یہ کہ وہ 'کلمۃ اللہ' اور 'روح اللہ' تھے لیکن یہ اُمید کرنا عبث ہے کہ وہ اپنا وہ دین جس میں پیدا ہوتے ہیں چھوڑ دیں اور اپنے پیغمبر کے برحق نہ ہونے کو مان لیں مگر باوجود ان سب باتوں کے پھر بھی فرنگستان کے عیسائیوں کو چاہئے کہ مشنری لوگوں کی ہر ایک طرح سے مدد کریں اور اُن کی دعا اور اپنی طاقت اور دولت اپنے نجات دہندہ عیسیٰ علیہ السلام کے جلال کے بڑھانے میں صرف ہونی چاہئے مگر اس خرچ کا متکفل اہل یورپ ہی کو ہونا چاہئے۔ کیونکہ مشنری لوگوں پر

ن کا بوجھ ڈالنا مناسب نہیں۔ اور اس بات کی نہایت احتیاط رکھنی چاہیئے کہ یہ لوگ حتیاج کی وجہ سے کسی ذلیل اور حقیر کام کے کر بیٹھنے پر مجبور نہ ہوں اور صرف اُن کی فارغ لبالی ہی مطلوب نہیں بلکہ وہ ایک ایسی جماعت ہونی چاہیئے جو مستعد اور ہوشیار اور نیک کردار اور ہمیشہ اثبات حق کے لئے ساعی اور نیکی کرنے کے موقعوں کی متلاشی اور جہاں کہیں موقعہ پائے اپنے خدا کے باغ (دنیا) میں کمال مستعدی اور شوق سے محنت کرنے کی خواہشمند ہو اگرچہ یہ کام ہر ایک عیسائی ملک پر واجب ہے مگر کسی طرح کی لغو اور بےبنیاد باتوں پر یقین کر کے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ تبدیل مذہب کا معاملہ ایک آسان کام ہے

مشنری لوگوں کو اپنے کام کی ترقی کے لئے ایک اور بڑا افسوس سدِ راہ سے مقابلہ کی ضرورت ہے اور وہ خود عیسائیوں کا وہ خلاف ادب طریقہ ہے جو باوجود اس اعتقاد رکھنے کے کہ خدا تعالیٰ ہماری قربان گاہ پر بطور خاص موجود ہے اپنے گرجاؤں میں برتتے ہیں بخلاف مسلمانوں کے جو نماز کے وقت مسجدوں میں باہم گفتگو کرنا تو کیا سر تک نہیں ہلاتے اور خدا کا خوف اور ادب ان کے دل پر چھایا ہوا دکھائی دیتا ہے۔[1]

ڈچ تاجروں کی کوٹھی آگرہ میں ڈچ لوگوں کی جو کے غلہ کی ایک تجارتی کوٹھی بھی ہے جس میں اُن کے چار یا پانچ آدمی رہتے ہیں یہ پہلے بانات اور چھوٹے بڑے آئینوں اور سادہ اور سنہری اور روپہلی لیس اور آہنی چیزوں اور نیل کی تجارت کرتے تھے جو آگرہ کے قرب و جوار میں بکثرت پیدا ہوتا ہے۔ خصوصًا بیانہ میں جو آگرہ سے دو منزل ہے اور جہاں ان کی ایک اور کوٹھی ہے اور سال بھر میں ایک دفعہ وہاں جایا کرتے ہیں۔ اور اب نہ صرف جلالپور بلکہ لکھنؤ سے بھی جو آگرہ سے سات یا آٹھ منزل ہے اور وہاں بھی اُن کی ایک کوٹھی ہے اور سب موسموں میں ان کے گماشتے وہاں جاتے ہیں بہت سا کپڑا خریدتے رہتے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اب زمانہ سابق کا سا فائدہ نہیں رہا اور غالبًا اس کے دو سبب ہیں ایک یہ کہ ان کے مقابلہ میں ارمنی لوگوں کی تجارت بہت بڑھ گئی ہے۔ دوسرا یہ کہ آگرہ سورت سے (جو اِن کی اصل قیام گاہ ہے) بہت دور ہے اس سے

---

[1] اور یہ دلی کیفیت غالبًا اس جبر کا نتیجہ ہے جس کے متعلق مصنف کہہ آیا ہے کہ "یہ خون ریز مذہب بزور شمشیر پھیلا" اور خود کے اعتراف کے مطابق محبت اور رضامندی سے پھیلنے والے دین کے پیروؤں میں خاص اپنی عبادت گاہوں میں "خلاف ادب طریقے" رائج ہیں۔

علاوہ ان کے کاروانوں کو جو خراب راہ اور پہاڑوں سے بچنے کے لئے جو راستہ میں پڑتے ہیں گوالیار اور برہان پور کی سیدھی سڑک چھوڑ کر احمد آباد کے راستہ مختلف راجاؤں کی عملداریوں میں سے ہوکر آتے ہیں اکثر اوقات حادثوں کا سامنا ہوتا ہے لیکن باوجود ان دقتوں کے میری دانست میں انگریزوں کی طرح آگرہ سے یہ اپنی کوٹھی کبھی نہیں اٹھائیں گے کیونکہ ان کو اب بھی گرم مصالحوں کی قسم کی جنسوں میں بہت منفعت رہتی ہے اور ایک یہ بھی فائدہ ہے کہ ان کے اعتباری آدمی دربار شاہی کے قرب میں رہتے ہیں اور اگر بنگالہ، پٹنہ سورت یا احمد آباد میں جہاں ان کی کوٹھیاں ہیں صوبہ دار یا کوئی اور عہدہ دار کسی طرح کا ظلم یا ناانصافی ان کے ساتھ کرتا ہے تو فوراً اس کی شکایت دربار میں کر سکتے ہیں۔

روضہ تاج محل اب میں اپنے اس خط کو دو عجیب مقبروں کے ذکر پر جن کی وجہ سے آگرہ کو دہلی پر فوقیت حاصل ہے ختم کرتا ہوں۔ ان میں سے ایک مقبرہ تو اکبر کا ہے جس کو اس کے بیٹے جہانگیر نے تعمیر کرایا تھا اور دوسرا شاہجہاں کی بیگم "تاج محل" کا جو حسن و جمال میں لاثانی تھی اور بادشاہ اس پر ایسا فریفتہ تھا کہ کبھی اس کو اپنے سے جدا نہ کرتا تھا یہاں تک کہ اس کی وفات کے وقت شدت غم سے قریب تھا کہ اس کے ساتھ خود بھی چل بسے۔ میں اکبر کے مقبرہ کا زیادہ ذکر کرنا نہیں چاہتا کیونکہ اس میں جو خوبیاں ہیں وہ تاج محل کے مقبرہ میں جس کا میں ابھی ذکر کرنے والا ہوں کامل طور پر موجود ہیں۔ آگرہ سے نکل کر مشرق کی طرف آپ اگر جائیں تو ایک لمبا چوڑا راستہ دیکھیں گے جس پر فرش لگا ہوا ہے اور تھوڑا تھوڑا بلند ہوتا گیا ہے۔ جس کے ایک طرف تو ایک چوکور باغ کے ایک ضلع کی جو وسعت میں ہمارے پلیتں رائل سے بہت زیادہ ہے ایک لمبی اور اونچی دیوار ہے اور دوسری جانب تعمیر مکانات کی ایک قطار بنتی چلی گئی ہے جو ان محراب دار برانڈوں سے مشابہ ہیں جو دہلی کے بڑے بازاروں کی دوکانوں کے آگے بنے ہوئے ہیں اور جن کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں اور جب آپ اس دیوار کے نصف میں پہنچیں گے تو دائیں کو یعنی ان مکانات کی جانب آپ کو ایک بڑا دروازہ ملے گا جو اچھا خاصہ بنا ہوا ہے اور جو ایک کاروانسرا کا دروازہ ہے۔ اور اس کے مقابل یعنی دیوار کی طرف باغ کے دروازہ کی مربع اور وسیع عمارت ہے جس میں سے ہوکر باغ میں جاتے ہیں اور جس کے دونوں طرف پتھر کے دو بڑے حوض بنے ہوتے ہیں۔ یہ مستطیل شکل کی عمارت ہے اور ایک ایسے پتھر سے بنی

ہوتی ہے جو سرخ سنگ[1] مرمر کے مشابہ ہے لیکن ویسا سخت نہیں ہے۔ اس عمارت کا پیش دالان سینٹ لوئیس کی عمارت کے پیش دالان کی بہ نسبت جو سینٹ انٹونی کے کوچہ میں ہے میری دانست میں زیادہ لمبا اور اپنی وضع میں زیادہ عالی شان ہے مگر بلندی میں اُسی قدر ہے اس کے ستون اور مرغول اور کارنسیں اگرچہ فی الواقع عمارت کے اُن اوضاع خمسہ کے مطابق نہیں ہیں جو ہمارے فرانس کی عمارتوں میں احتیاط کے ساتھ ملحوظ رکھی جاتی ہیں۔ کیونکہ یہ عمارت ایک خاص اور نرالی ہی وضع کی ہے لیکن تاہم دلچسپی سے خالی نہیں اور میری رائے میں یہ بلعموم اس قابل ہے کہ ہماری فن عمارت کی کتابوں میں جگہ پائے اگرچہ قریبًا یہ تمام عمارات صدہا قسم کے مختلف الوضع دالانوں اور محرابوں اور غلام گردشوں پر مشتمل ہے جو نیچے اوپر بنی ہوئی ہیں۔ مگر باوجود اس کے بہت عظیم الشان ہے اور اس کا نقشہ اور تعمیر دونوں بہت دلچسپ ہیں۔ اور کوئی جگہ اس میں ایسی نہیں جو بدنما ہو بلکہ ہر ایک مقام نہایت خوش نما اور ایسا ہے کہ آنکھیں دیکھنے سے سیر نہیں ہوتیں۔ چنانچہ سب سے اخیر دفعہ جو میں نے اس کو جاکر دیکھا تو میرے ساتھ ایک فرانسیس سوداگر بھی تھا۔ اور میری طرح اس کی بھی یہی رائے تھی کہ یہ ایک ایسی عمارت ہے کہ جس کی تعریف کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ مگر میں کچھ نہ بولا کیونکہ مجھے خوف تھا کہ شاید ہندوستان میں مدت سے رہنے کے سبب میرا مذاق بگڑ گیا ہو لیکن میرا رفیق جو تازہ وارد تھا جب اُس نے یہ کہا کہ تمام فرنگستان میں ایسا حیرت افزا اور عظیم الشان مکان میں نے کوئی نہیں دیکھا تو میری نہایت تسلی ہوئی۔

دروازہ کی عمارت میں اگر آپ داخل ہوں تو اپنے کو ایک بہت اونچے گنبد کے نیچے پائیں گے جس کے سب طرف غلام گردش اور نیچے دونوں جانب دو دالان ہیں جو آٹھ یا دس فرانسیسی فٹ اونچے ہیں اور جیسے ہی محراب میں سے آپ داخل ہوں گے ویسی ہی دوسری جانب پائیں گے جس میں سے گذر کر ایک ایسی روش پر پہنچتے ہیں جو آخر تک تمام باغ کو برابر دو حصوں میں تقسیم کرتی چلی گئی ہے۔ یہ روش جو آٹھ فرانسیسی فٹ کے قریب اونچی ہے اس قدر چکلی ہے کہ چھ گاڑیاں برابر برابر چل سکتی ہیں اور سرے سے لے کر اخیر تک بڑی بڑی چوکور سخت پتھروں کی سلوں کا فرش لگا ہوا ہے اور بیچوں بیچ نہر بنی ہوئی ہے جس کی روکار

---

[1] ولایت میں ایسے چکنے پتھر کو مرمر (ماربل) بولتے ہیں اور تعبیر باعتبار رنگ کر لیتے ہیں جیسے مرمر سفید و مرمر سیاہ اور مرمر سرخ جن کو ہم سنگ مرمر اور سنگ موسیٰ وغیرہ بولتے ہیں۔ م م م

کے پتھر تمام گھڑے ہوئے اور زیبائش کے لئے تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر فوارے لگے ہوئے ہیں اور کوئی بیس یا پچیس قدم چل کر اور پشت کی طرف منہ پھیر کر اس دروازے کی عمارت کو دیکھنا خالی از کیفیت نہیں۔ کیونکہ دروازہ کی عمارت کی طرف بھی اگرچہ بیرونی رخ جیسی نہیں لیکن نہایت ہی بلند اور اُسی وضع کی ہے۔ دروازہ کی عمارت کے دونوں جانب باغ کی دیوار کے ساتھ ساتھ تھوڑی سی کرسی دے کر لمبی اور چوڑی غلام گردشیں بنتی چلی گئی ہیں جن کے محرابی دروازے چھوٹے ستونوں پر قائم ہیں اور برسات کے موسم میں غربا اور مساکین خیرات کے لینے کو جو ہمیشہ کے لئے شاہجہاں کی طرف سے جاری کی ہوئی ہے ہفتہ میں تین بار ان میں آکر جمع ہوتے ہیں۔ اب آپ پھر اُسی بڑی روش پر آئیں یہاں سے آپ کو ٹھیک سامنے وہ بڑا گنبد نظر آئے گا جس میں بیگم کی قبر ہے اور جس کے دائیں بائیں چبوترے سے ذرا نیچے باغ کی روشیں درختوں سے ڈھکی ہوئی اور چمن پھولوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ اس گنبد کے دونوں جانب سنگ سرخ سے ویسی ہی دو بڑی عمارتیں بنی ہوئی ہیں۔ جیسی دروازہ کی عمارت ہے اور یہ دونوں پشت کی طرف باغ کی دیوار سے ملی ہوئی ہیں اور ان میں جانے کے لئے تین تین محراب دار دروازے ہیں۔ ان کے بعض حصے بالاخانوں کی طرح ایک دوسرے پر واقع ہیں جن میں جا کر معلوم ہوتا ہے کہ گویا بڑی بڑی اونچی غلام گردشیں ہیں ان عمارتوں کے اندر کے فرش اور چھت اور دیواروں میں آرائشی کام بنے ہوتے ہیں اور چونکہ وہ قریبًا ویسے ہی ہیں جیسے کہ خود مقبرہ کے اندر کے زیبائشی کام ہیں اس لئے میں اُن کا بیان کرنا غیر ضروری جانتا ہوں اس بڑی روش اور روضہ کے مابین ایک اچھا وسیع صحن ہے جس کو میں تشبیہًا "واٹر پارٹیر[۱]" کہتا ہوں کیونکہ پتھر جو اُس کے فرش میں لگے ہوئے ہیں وہ تراش کر اور طرح طرح کی شکلوں کے بنا کر اس طرح سے لگائے گئے ہیں گویا پانی سے بھری ہوئی کیاریوں کے گرد "باکس" لگا ہوا ہے یہ عمارت سفید سنگ مرمر کا ایک بڑا گنبد ہے اور قریبًا اسی قدر اونچا ہے جس قدر کہ وال ڈی گریس[۲] ہے اور

---

[۱] پارٹیر کے لغوی معنی ہموار اور سطح زمین کے ہیں مگر اصطلاح میں اُس قسم کی چمن بندی کو کہتے ہیں۔ جو طرح طرح کی چھوٹی چھوٹی کیاریاں بنا کر امتیاز کے لئے اُن کے ادھر اُدھر سبز گھاس وغیرہ جما دی جاتی ہے جس کے عوض فرنگستان میں باکس جو ڈوڈونیا کی طرح کی ایک بوٹی ہے لگاتے اور اُس کو تراش کر کیاریوں کے اردگرد مختلف شکل کے حاشیے اور جدولیں بناتے ہیں۔ س م ع

[۲] شہر پیرس کے ایک گرجا کا نام ہے۔ س م ع

اس کے گرداگرد سنگ مرمر کی چھوٹی چھوٹی بُرجیاں ہیں جو علی الترتیب نیچے اور اوپر بنتی چلی گئی ہیں۔ یہ کل عمارت چار بڑی محرابوں پر قائم ہے جن میں سے تین بالکل کھلی ہیں۔ اور چوتھی ایک مکان کی دیوار سے جس میں ایک غلام گردش بنی ہوئی ہے بند کردی گئی ہے جس میں کئی ملاّ ممتاز محل کو ثواب پہنچانے کی خاطر ظاہرا دلی ارادت کے ساتھ بیٹھے ہوئے قرآن پڑھا کرتے ہیں جو اسی غرض سے یہاں مقرر ہیں ان میں سے ہر ایک محراب اس طرح پر سجائی گئی ہے کہ سفید سنگ مرمر میں سیاہ سنگ مرمر (سنگ موسٰی) کے بڑے بڑے عربی حروف بنا کر جمائے ہوئے ہیں جو نہایت خوشنما ہیں اور گنبد کا کالسہ اوراوپر سے نیچے تک تمام دیواروں کی روکار سنگِ مرمر کی ہے اور کوئی جگہ ایسی نہیں جو صنعت اور ہنرمندی سے خالی اور ایک خاص اور ذاتی حسن نہ رکھتی ہو اور مقبرہ کی تمام دیوار کی روکاریں جو سنگ مرمر کی ہے زبرجد اور یشب اور عقیق اور دوسری قسم کے بیش قیمت اور کمیاب پتھروں اور اس قسم کے پتھروں سے جیسے کہ فلارنس میں گرانڈڈیوک کے گرجا میں ہیں بے شمار وضع کی اور نہایت خوبصورت اور پُر نزاکت پچی کاری جس سے بڑھ کر انسان کے ذہن میں نہیں آسکتی کی ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ فرش میں بھی جو سنگ مرمر اور سنگ موسٰی کی چوکور سلوں کا ہے یہ پتھر جڑے ہوئے ہیں۔ اور گنبد کے اندر ایک چھوٹا سا حجرہ ہے جس میں تاج محل کی قبر ہے جو سال بھر میں صرف ایک بار بڑے تکلفات سے کھولا جاتا ہے اور چونکہ اس کے تقدس کی وجہ سے کوئی عیسائی شخص اندر جانے نہیں پاتا اس لئے میں بھی دیکھ نہیں سکا۔ لیکن سُنا ہے کہ اُس کی زیب وزینت اور آرائش و زیبائش بہت ہی اعلیٰ قسم کی ہے۔ اب آپ سے صرف اس چبوترہ کا ذکر کرنا باقی ہے جو گنبد سے لے کر باغ کی حد تک بنا ہوا ہے جو کوئی پچیس قدم چوڑا اور اس سے کسی قدر زیادہ اونچا ہے۔ اس چبوترہ پر سے دریائے جمنا نیچے بہتا ہوا اور بے شمار سرسبز باغ جو دور تک چلے گئے ہیں۔ اور شہر آگرہ کا ایک حصّہ اور قلعہ اور اُمرا کے خوبصورت مکانات جو دوسرے کنارہ پر بنے ہوئے ہیں تمام نظر آتے ہیں۔ اور جب کہ یہ چبوترہ اس باغ کا ایک ضلع ہے تو اس کا تصفیہ میں آپ ہی پر چھوڑتا ہوں کہ میں جو یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ مقبرہ ایک حیرت افزا عمارت ہے کیا یہ سچ نہیں ہے؟ یہ ممکن ہے کہ میری طبیعت نے ہندوستانی مذاق پیدا کرلیا ہو۔ لیکن میں یہ یقینی طور پر کہتا ہوں کہ یہ روضہ اہرام مصر کی بہ نسبت جو اَن گھڑ پتھروں کے ڈھیر ہیں اور مکرر دیکھنے

پر بھی مجھے کچھ پسند نہیں آئے اور جو باہر کی طرف سے بجز اس کے کہ زینہ کی طرح نیچے اوپر رکھکر پتھروں کا ڈھیر لگا دیا ہے کچھ نہیں ہیں اور جن کے اندر بھی کوئی ایسی بات نہیں جس سے انسان کی کچھ ہنرمندی اور ایجاد ثابت ہو دنیا کے عجائبات میں شمار کئے جانے کا زیادہ تر مستحق ہے۔[۱]

---

[۱] یہ بے نظیر و عجیب و غریب عمارت شاہجہاں کے پانچویں سال جلوس کے ابتدا میں ہی شروع ہوئی تھی اور سولھویں سال جلوس مطابق ۱۰۵۲ھ میں بن کر ختم ہوئی بادشاہنامہ میں لکھا ہے کہ پچاس لاکھ روپیہ اس پر خرچ ہوا اس کی مرمت اور خدام کی تنخواہ اور بیگم کے ختم فاتحہ کے خرچ کے لئے ایک لاکھ روپیہ سال کی آمدنی کے دیہات اور دو لاکھ روپیہ سال کی آمدنی کی دوکانیں اور سرائیں جو اس کے آس پاس بنائی گئی تھیں اور جن سے مل جل کر یہ ایک اچھا شہر بس گیا تھا اور جس کا نام ممتاز محل کے نام پر ممتاز آباد رکھا گیا تھا بادشاہ نے وقف کردی تھیں۔ س م ح نقط

تقریظ

جناب خلیفہ سید محمد حسن خاں صاحب

وزیر اعظم ریاست پٹیالہ

انسان جب مرجاتا ہے تو زندہ نہیں کہلاتا! مگر اہلِ تصنیف کی زندگی عجیب زندگی اور اُن کی موت عجیب موت ہے کہ مرنے پر بھی زندہ کہلاتے اور زندوں کی طرح بولتے چالتے اور چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اس کتاب کے مصنف ڈاکٹر فرانسس برنیر ہی کو دیکھو کہ باوجودیکہ دو سو برس کے قریب ہوتے کہ انتقال کر گئے مگر زندہ ہے۔ دنیا سے گئے گو ایک زمانہ گذرا مگر موجود ہے! زبان کو بند ہوتے عرصہ ہوا مگر بولتا ہے۔ اس کا کاغذی لباس پہنے ملکوں ملکوں سیر کرتے پھرنا اور اہلِ علم کی خلوت کی صحبتوں میں بیٹھنا اور چپ چاپ آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کرنا اور کبھی اپنی اصل فرانسیسی اور کبھی انگریزی اور کبھی ہندوستانی بولی بولنا۔ اور بولنا بھی قلم کی زبان سے جس میں یہ خوبی ہے کہ آواز نہیں اور سُنائی ہر کسی کو دیتا ہے۔ اس امر کی دلیل ہے کہ اُس نے اُس چشمہ کا پانی پیا ہے کہ جس کسی کو خوش قسمتی سے اُس کا ایک قطرہ بھی نصیب ہو گیا ہے وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ یہ وہ چشمہ نہیں جس کو لوگ آبِ حیات کا چشمہ کہتے اور یہ سمجھتے ہیں کہ اُس کا پانی پی لینے سے انسان ہمیشہ زندہ رہ سکتا ہے۔ کیونکہ وہ تو صرف ایک خیالی چشمہ ہے نہ اُس کو کبھی کسی نے دیکھا اور نہ اُس کا پانی پیا۔ مگر جس چشمہ کا ہم ذکر کرتے ہیں وہ حقیقی اور سب کی آنکھوں کے سامنے موجود ہے اور اُس کا آبِ حیات سے زیادہ زندگی بخش پانی ہر خوش قسمت شخص کو میسر آ سکتا ہے۔ یہ چشمہ دوات ہے اور اس کا زندگی بخش پانی اس کی روشنائی ہے۔ جو اہلِ تصنیف ہمیشہ قلم کے پمپ کے ذریعہ سے اس میں سے نکالتے اور آبِ حیات کی طرح خود پیتے اور لوگوں کو پلاتے ہیں۔ پس مبارک ہیں وہ جنھوں نے اس چشمہ کا پانی پیا ہے اور مبارک ہے اُن کی زندگی جو دنیا کی زندگی کے برخلاف بے خلل و غش اور بے کلفت زندگی ہے مگر فاضل ڈاکٹر کو خوش نصیبی سے عمر بڑھانے کا ایک اور نسخہ بھی وہ مجرب اور تیر بہدف ہاتھ آیا ہے۔ اور یہ اُس کا استعمال بھی اس خوبی

سے کرتا ہے کہ خطا کرہی نہیں سکتا یعنی جب دیکھتا ہے کہ پہلا قالب کسی قدر دیرینہ اور بوسیدہ ہو چلا ہے تو کسی نہ کسی ڈھب سے اُس کو بدل ڈالتا اور نیا اختیار کرلیتا ہے۔ اور تاریخ کے مسئلہ کو جو اب تک صرف ایک بات ہی بات تھی اور انسان کا مرکر دوسرے قالب میں چلا جانا دیکھا کسی نے بھی نہ تھا اپنے عمل سے ثابت کر دکھاتا ہے۔ چنانچہ پہلے پہل مسٹر اِڈنگ براک صاحب کی اعانت سے اپنی ہمسایہ قوم انگریز کا قالب اختیار کیا اور اُس عقلمند قوم کے لوگوں نے مورخ اور جہاں دیدہ جان کر قدر شناسی کی راہ سے اس کو اپنے سر اور آنکھوں پر بٹھایا اور اس کی مفید اور تجربہ آمیز باتوں اور دلچسپ اور عبرت خیز حکایتوں کو اپنے دل و دماغ میں جگہ دی اب ہمارے نہایت صاحب علم وفضل و جامع الکمالات دوست جناب کرنل ہنری مور صاحب بہادر سی۔ بی۔ و سی۔ ایس۔ آئی ترجمان جناب کمانڈر انچیف بہادر ہندوستان اور میرے چھوٹے بھائی مشیر الدولہ ممتاز الملک خلیفہ سید محمد حسین صاحب میر منشی ریاست پٹیالہ کی امداد سے ہندوستانی روپ بدل لیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں وہ اُردو بولنا سیکھ لیا کہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ پیرس کا رہنے والا ہے یا دلّی کا۔ پس میرے عزیز ہم وطنوں تم کو بھی لازم ہے کہ انگریزوں کی طرح تم بھی اِس دانا اور تجربہ کار حکیم کی جس نے تمھاری خاطر تمھارا ہی روپ بدل لیا ہے اور تمھاری ہی بولی سیکھ لی ہے جان و دل سے خاطر و مدارات کرو اور اپنے ملک کے اگلے بادشاہوں اور راجاؤں اور امیروں اور ہر ایک درجہ کے لوگوں کی باتیں جو اُس کی آنکھوں دیکھی ہوئی ہیں اس کی زبان سے سنو! یہ تم کو بلا رو رعایت سچ سچ بتائے گا کہ اب سے دو سو برس پہلے تمھارے ملک کی کیا حالت تھی۔ سلطنت اور حکومت کا کیا طریقہ تھا۔ زراعت اور تجارت اور صناعت کا کیا حال تھا۔ ملک کی دولت مندی کی کیا کیفیت تھی! راستے پُرامن تھے یا خطرناک اور سفر کے ذریعے کیا اور کیسے تھے۔ سلطنت یا خود رعایا کی طرف سے تعلیم عام کا کچھ انتظام تھا یا نہیں! عدالت اور انصاف کی کیا صورت تھی؟ اور اس کے لئے کچھ قوانین اور قاعدے مقرر تھے یا نہ تھے۔ اور اُن کی تعمیل کیسی ہوتی تھی۔ آزادی رائے جس میں مذہب کی آزادی بھی آگئی رعایا کو حاصل تھی یا نہیں۔ اور لوگوں کی طرز معاشرت اور اخلاق و عادات کا کیا حال تھا۔ ملک کی آمدنی ملک ہی کے کاموں میں خرچ ہوتی تھی یا بادشاہ کے ذاتی اور عیش و آرام کے کاموں میں، فوج کی کیا حالت تھی اور اُس کا نظم و نسق کیسا اور کس ڈھنگ پر تھا اور صف آرائی اور جنگ آزمائی کے کیا طریقے تھے۔ بادشاہ دربار کس طرح کرتا تھا۔ اور اُس کی شان اور جلوس کیسا اور کس طور کا تھا۔ اور یہ باتیں تم کو یہ

ایسی تشریح اور تفصیل سے سُناتے گا کہ گویا اُن کا مرقع تمھارے سامنے کر دے گا جس سے تم اُس وقت اور اس وقت کی حالت کا بخوبی موازنہ کر سکو گے۔ اور سمجھ سکو گے کہ سلطنت مغلیہ کے زمانہ میں جس کی نادیدہ تعریفوں اور خوبیوں کو سُن کر غالبًا تم اپنے دل میں خیال کرتے ہو گے کہ وہ ہندوستان اور ہندوستانیوں کے لئے نہایت ہی عمدہ اور خیر و برکت کا زمانہ تھا تمھارے ملک اور ملک والوں کی کیا حالت تھی۔ اور اب کوئین وکٹوریہ بادشاہِ انگلستان اور قیصرِ ہند کے مبارک عہد میں جو تمھاری آنکھوں کے سامنے ہے کیا حالت اور صورت ہے۔ والسلام

السید محمد حسن عفی عنہ
۲۵ - نومبر ۱۸۸۵ء